وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ
وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ
وقائع بابر
ظہیر الدین محمد بابر

وقائع بابر

مصنف
ظہیر الدین محمد بابر

مترجم فارسی
عبدالرحیم خان خاناں

مترجم اردو
یونس جعفری

حواشی و جزیات
حسن بیگ

شہر بانو پبلی شرز
۱۷ میتھون روڈ کریکاڈی کے وائی ون ون ٹی ایس
برطانیہ

آئی بی ایس این ۶-۰-۹۵۵۴۳۸۳-۰
آئی بی ایس این ۱-۰-۹۵۵۴۳۸۳-۰-۹۷۸

ناشر .... شہر بانو پبلی شرز

رسال اشاعت ۲۰۰۷

طابع : شمس پرنٹنگ سروس فون : ۲۶۲۴۵۷۹ (۲۱ ۹۲)
سرورق : عمران الدین
انشاو تزئین : ریاض الدین

ذخیرہ کتب:۔
انڈس پبلی کیشنز
۲۵ فرید چیمبرز، عبداللہ ہارون روڈ کراچی
فون:۵۶۶۰۲۴۲(۲۱-۹۲)

۱۰۰۰ روپے (ہندستانی)
۳۵ ڈالر
۳۰ پاؤنڈ

انتساب

مرزا محمود علی بیگ، والد گرامی کے نام جنہوں نے قصے کہانیاں سنا سنا کر مجھ میں تاریخ کا ذوق پیدا کیا۔

سالار جنگ (حیدر آباد دکن) کے مخطوطہ وقائع میں یہ تین پند کتاب کے شروع میں درج ہیں۔

عربی

یہ ہمارے کارنامے ہیں، جو ہماری محنت کو ثابت کرتے ہیں۔
جب ہم نہ ہوں تو ہمارے کام کو یاد رکھنا۔

ترکی

اس نابغہ روزگار نے دنیا پر اپنا سایہ کیا۔ تھوڑے عرصے میں بہت کچھ حاصل کیا اور اصلاح کی، وہ وقت کا سورج تھا اور ڈوبتے سورج کے سائے لمبے ہوتے ہیں چاہے تھوڑے عرصے کے لئے ہوں (کمال پاشازادے)

فارسی

جب ہم نہ ہوں تو ہم کو زمین میں نہیں لوگوں کے دلوں میں تلاش کرنا (جلال الدین رومی)

مجکانہ ہوا کچ ہوس مانِک وموتی
فقر اہلی غہ بس بو لغوسی پانی وروتی

مجھ کو نہ ہوئی کچھ ہوسِ گوہر وموتی
کافی ہے فقیروں کو فقط پانی وروٹی

(بابر کا ترکی ہندی شعر اور اردو ترجمہ۔ ماخوذ از محمد صابر)

بابر فرصت کے لمحات میں، جو اس کی زندگی میں مختصر ہی تھے۔ ایک رقعہ ہاتھ میں ہے، وقائع سامنے رکھے ہیں
انگور، سیب، انار اور دوسرے پھل معائنے کے لئے موجود ہیں۔ یہ یقیناً وہ پھل ہونگے جن کی فصل اس کے حکم پر ہندستان میں لاکر لگائی گئی۔

(تصویر وکٹوریہ اور البرٹ میوزیم ۲۶۹۴۳-۰۔ڈی)

خانخاناں ساقی بزم سخن عبد الرحیم
کز شراب نطق بخشد قوت جاں تربیت
(نظیری)

عبد الرحیم ساقی محفل خان خاناں
بخشے قوت گویائی وتربیت جان جاناں

(برٹش میوزیم ۲۹۸۸=اوآر)

اکبر اپنے چونتیسویں سال جلوس میں کشمیر کی سیر اور وہاں سے کابل اپنی بچپن کی یادیں تازہ کرنے کے لئے گیا۔ واپسی میں بگرام میں قیام پر (۲۵ محرم ۹۹۸/۲۴ نومبر ۱۵۸۹) کو عبد الرحیم خان خاناں نے وقائع کا فارسی ترجمہ واقعات بابری کے نام سے اکبر کو پیش کیا۔ یہ ترجمہ اکبری حکم پر کیا گیا تھا۔ اس سے پہلا ترجمہ نامکمل تھا۔ اس ترجمے کو پیش کرنے پر عبد الرحیم کی بے حد تعریف کی گئی

(اکبر نامہ ج۳ ص ۸۶۲)

خان خاناں کا دوہہ
چاہ گئی چنتا مٹی منوا بے پرواہ
جن کو کچھ نہ چاہیے وے ساہن کے ساہ
(حسن عزیز جاوید)

فہرست

صفحہ نمبر

ماوراءالنہر

کابل

ہندُستان

جزیات

نقشہ جات

بخط۔ باباعبدالغنی (مراکش)

سخنہائے گفتنی

بابر ایک باصلاحیت، مستقل مزاج اور دھن کا پکا انسان تھا۔ اس نے ہندستان میں ایک عظیم سلطنت کی بنیاد ڈالی جو تقریباً تین سو سال قائم رہی۔ یہ تاریخ ہندستان کا درخشاں باب ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک عملی انسان تھا۔ حالات سے سمجھوتہ کرنے کا گر اس کو خوب آتا تھا۔ شاعر، ادیب، فقیہہ اور تنقید نگار بھی۔ مصطلحات شاعری کو اس نے سیکھا اور ترکی شاعری کے اصول و قوائد پر رسالہ بھی تحریر کیا۔ ترکی شعرا پر تنقید بھی کی۔ عمر بھر خواجہ عبیداللہ احرار کی تعظیم و تکریم کے علاوہ دوسرے علما اور صوفیوں سے بھی شرف نیاز حاصل کیا۔ جہاں بھی گیا اُس ملک کی سیر و تفریح کے علاوہ وہاں کی تاریخ و جغرافیے سے متعلق معلومات، وہاں رہنے بسنے والے انسانوں کی عادات، وہاں کے جانوروں، پرندوں، پھلوں، پھولوں کا بغور مطالعہ کیا اور ان کو اپنی کتاب میں بیان کیا۔ ساری عمر گھوڑوں کی پیٹھ پر یا باغوں میں بسر کی۔ جگہ جگہ باغات لگائے۔ باغوں کی طرح اندازی جدید طرز میں کی۔ دوسرے ممالک سے پھل اور پودے لا کر ان کو نئی جگہ لگایا۔

بابر سے میرا تعارف ۱۹۷۶ء میں بابر نامہ کے ذریعہ ہوا۔ کُتب خان خاناں نامہ (۱۹۹۱ء) اور بیرم خاں (۱۹۹۲ء) کی اشاعت کے بعد میرا ارادہ بابر نامے کی اشاعت کا تھا لیکن کراچی کے حالات نے ۱۹۹۵ میں ہجرت پر مجبور کیا۔ میں حوادث زمانہ میں گم ہوگیا۔ میرا کتب خانہ مجھ سے جدا ہوگیا۔ ان حالات کو سمیٹتے سمیٹتے چھ سات سال کا عرصہ بیت گیا۔ جب میں بابر کی طرف واپس آیا تو یہ احساس پختہ ہوتا گیا کہ ہم اپنی تاریخ و تمدن سے لاعلم ہیں۔ ہم اپنی تہذیب سے بے خبر ہیں۔ ہمارے پاس اپنی کتب نہیں۔ غیر ہمیں کتابیں لکھ کر دے دیتے ہیں ہم ان کو پڑھ کر ہی خوش ہیں۔ اس میں ایک بڑا حصہ اس پالیسی کا ہے جس نے ''پڑھو فارسی، بیچو تیل'' کو پھیلایا۔

فارسی علم، ادب و تاریخ کے انگریزی تراجم کسی مقصد کے تحت کئے گئے تھے۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لئے تاریخ کو ''اپنی'' راہ پر لگانا جائز تھا۔ ہماری کتابیں غیروں کی زبان میں گم ہوگئیں۔ ہم اپنی کتابیں بھول گئے اور غیروں کی لکھی کتابوں پر تکیہ کرنے لگے۔ اپنی کتب کا حصول مشکل و مہنگا، جب کہ انگریزی ترجموں کا حصول آسان و سستا۔ بابر ہم سے چھوٹ گیا۔ غیروں نے اس کے مشاہدات، مطالعہ، انداز حکمرانی اور جمالیاتی ذوق کے سبب اسے اپنالیا۔

بابری اخلاف کی حکومت عام طور پر خاندان مغلیہ کہلاتی ہے، یہ درست نہیں، کیونکہ بابر ترک تھا اور اپنے ترک ہونے پر فخر بھی کرتا تھا۔ اس حکومت کو خاندان بابری کہنا چاہیے لیکن لفظ مغل اور خاندان مغلیہ ہمارے علم و ادب میں رچ بس گیا ہے۔ مغلیہ حکومت کے آثار میں ایک بڑا ورثہ اردو زبان کا ہے یہ صحیح ہے کہ اردو اس سے پہلے بھی فوجی بازاروں میں بولی جاتی تھی لیکن مغلوں نے اس کو رواج دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اردو زبان ہی میں بابر نامے اور دوسری تواریخ کا فقدان ہے۔ دنیا کی تمام بڑی زبانوں

میں بابرنامے نہ صرف موجود ہیں بلکہ آئے دن ان کے نئے ایڈیشن بھی شائع ہو رہے ہیں۔ لیکن اردو زبان میں اس پر کوئی کام نہیں ہوا۔ رشید اختر ندوی نے تو خود ہی اعتراف کیا ہے کہ کتاب نامکمل ہے[1]۔ صرف ایک ترجمہ ہی کسی طور پر مکمل کہا جاسکتا ہے، وہ مرزا نصیر الدین حیدر کی تزک بابری ہے[2]۔ یہ انہوں نے ۱۸۹۸ء میں مکمل کر لی تھی، لیکن ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ ان کی صاحبزادی نجستہ سلطانہ بیگم اور صاحبزادے مرزا اعظم شاہ گورگانی نے اس کو ۱۹۲۴ء میں دہلی سے شائع کیا۔ اس کے حواشی زیادہ تر ارسکن کی تقلید تھے[3]، جو ۱۸۲۶ء میں شائع ہو چکی تھی۔ نجستہ اور آعظم کو شاید علم ہی نہیں تھا کہ ان سے چھ ہزار میل دور سَرے کے ایک گاؤں میں ایک بڑی بی، اپنے ''قلعے'' میں بیٹھ کر اپنے آپ کو ترکی پڑھاتے ہوئے ترکی سے انگریزی میں بابرنامہ شائع کر چکی ہیں[4]۔ ان بڑی بی اینٹ بیورج کا احسان ہے کہ انہوں نے بابرنامہ عام کیا، کوئی بیس سال تک اس پر محنت کی اور اس کو ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۱ء تک چار حصوں میں شائع کیا۔ مرزا نصیر الدین حیدر کا ترجمہ جب شائع ہوا تو پرانا ہو چکا تھا۔ اس کے حواشی نہ باامروز نہیں تھے۔ ایک جگہ تو انہوں نے خود ہی لکھا ہے کہ ''جان لیڈن نے نوٹ بھی دیا ہے لیکن ہم اس کو سمجھ نہ سکے[5]۔ ۱۹۶۲ء میں کراچی سے اسی بابرنامے کا دوسرا ایڈیشن عبید اللہ قدسی کی ادارت میں شائع ہوا لیکن اس میں کوئی قابل قدر اضافہ یا تصحیح نہیں کی گئی[6]۔ ابھی حال ہی میں الفیصل نے لاہور سے اس کو پھر چھاپا ہے[7]۔ ان کوششوں کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کے بابرنامے کی تصحیح و حواشی میں اضافہ کیا گیا ہو۔

تلاش نسخہ جات بابری کے سلسلے میں انصار الدین ابراہیم تاشقندی نے بابرنامے کے تنقیدی متن کی نشاندہی کی۔ (آپ نے اردو لکھنو میں سیکھی اور تاشقند میں اردو کی تعلیم دیتے ہیں) بابرنامے کا تنقیدی متن دنیا کے مشرقی کونے جاپان کے شہر کیوٹو کی جامعہ سے ۱۹۹۵ میں شائع ہوا[8]۔ آئی جی مانو صاحب نے اس کو تین ترکی اور ایک فارسی نسخے کی مدد سے ترکی نسخ میں شائع کیا۔ انہوں نے اس بارے ہمارے سر کو جھکا دیا ہے۔

ترک اقوام نے اپنا رسم الخط چھوڑ کر اپنی زبان کا حلیہ ہی بدل دیا ہے۔ کریلیک خط میں جو بابرنامے ملتے ہیں وہ بھی غلطیوں سے پر ہیں[9]۔ لیکن حال ہی میں جو بابرنامہ کریلیک خط میں شائع ہوا اس پر میں اظہار رائے نہیں کرسکتا[10]۔ ترکی زبان کی لغات بھی کسی مشرقی رسم الخط میں رائج نہیں ہیں۔ ترکی زبان کی ایک مختصر فرہنگ ڈاکٹر محمد صابر کی عنایت سے دستیاب ہوئی جو مشرقی ترکی (کاشغر) کے الفاظ پر مشتمل ہے[11]، ۱۸۸۰ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔ پچھلے سو ڈیڑھ سو سال میں جو ترکی لغات شائع ہوئیں وہ لاطینی روسی اور کریلیک رسم الخط میں ہیں۔ مسلسل سرگرانی کے بعد ایک ترکی لغت نسخ میں لبنان سے دستیاب ہوئی[12]۔

بابرنامے کے دو[13] فارسی تراجم میں سے خان خاناں عبد الرحیم کا ترجمہ کتب خانوں میں عام ہے۔ اس کی بے شمار نقول تیار ہوئی ہیں۔ ہمارے خطاط صاحبان نے اپنی کارکردگی اور روایتی لاپرواہی سے ان نسخوں میں جگہ جگہ کمزوریاں پیدا کر دی ہیں۔ یہ کوتاہیاں فارسی اشاعت میں بھی موجود ہیں جو بمبئی سے ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی[14]۔ مجھے علم تھا کہ جامعہ کراچی میں فارسی نسخوں کا تنقیدی متن تیار ہے لیکن کوشش کے باوجود اس تک میری رسائی ممکن نہیں ہو سکی۔ لندن کی برٹش لائبریری میں بابرنامے کے تقریباً دس مخطوطات ہیں ان میں سے ایک نسخہ موسوی علی خاں کاتب کا املا کردہ مجھے پسند آیا کہ وہ پڑھے لکھے اور سلطان حسین مرزا، بادشاہ ہرات کے اخلاف تھے۔ یہ نسخہ ہی اس اشاعت کا اصل ماخذ ہے۔ دنیا کے دوسرے کونے جامعہ ہارورڈ میں ٹھیکسٹن صاحب بہادر نے بھی فارسی متن ترکی لاطینی متن اور اس سے انگریزی کا ترجمہ شائع کیا[15]۔ اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ فارسی اور ترکی مخطوطوں کے موازنے اور مطابقت پر مشتمل اردو ترجمہ اور جدید حواشی شامل ہوں۔ یونس جعفری دلی میں فارسی کے استاد رہے ہیں۔ دلی کالج سے بطور ریڈر رٹائر ہوئے، انہوں نے یہ ترجمہ ۲۰۰۳ء کے اوائل میں اپنے ذمے لیا اور ستمبر ۲۰۰۴ء میں یہ اختتام کو پہنچا۔ حواشی و صحت کے لئے کتب کا حصول آسان نہ تھا۔ اسکاٹ لینڈ

۱۔ ندوی، رشید اختر، تزک بابری

۲۔ نصیر الدین حیدر، مرزا، ترجمہ تزک بابری

۳۔ ارسکن، ولیم ولیڈن، جان

۴۔ بیورج، اینٹ، ترجمہ بابرنامہ

۵۔ نصیر الدین حیدر، مرزا ص ۱۱۸ نوٹ ۲

۶۔ عبید اللہ قدسی، کراچی

۷۔ عبید اللہ قدسی، الفیصل لاہور

۸۔ آئی جی مانو، بابرنامہ

۹۔ انصار الدین ابراہیمو، تاشقند ۲۰۰۱ ص ۲۷

۱۰۔ سعید بیگ حسن

۱۱۔ شاہ، روبرٹ بارکلے

۱۲۔ ریڈ ہاؤس، بیروت ۱۹۹۶

۱۳۔ پہلا ترجمہ پائندہ حسن اور محمد قلی نے ۱۵۸۳ میں کیا تھا۔ ترجمہ نامکمل ہے۔

۱۴۔ بابر، ظہیر الدین محمد بابرنامہ، مرزا محمد شیرازی

۱۵۔ ٹھیکسٹن، وہیلر، ایم، ہارورڈ یونیورسٹی ۱۹۹۳

کے ایک کونے میں کتابوں، مضامین ومخطوطات کا مجھ تک مسلسل پہنچنا میرے دوست اور بھائی اختر مسلم کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ان کا ڈیرہ آج کل لاہور میں ہے۔ وہ حواشی ومنابع تک رسائی کا عظیم ذریعہ ہیں۔

ترکستان۔ ترکی زبان کی مشکلات اس کی فارسی سے مطابقت، اور بابر کے وطن کو دیکھنے کے لئے ترکستان کا سفر ضروری تھا۔ یہ علاقہ اب چھ مصنوعی ریاستوں میں منقسم ہے۔ ان میں سے تین ازبکستان، تاجکستان اور کرغیزستان کا تعلق بابر سے رہا تھا۔ یہ علاقہ اور اس کا ماحول ہم سے مصنوعی طور پر دور اور وہاں آمدورفت کا سلسلہ تقریباً مفقود ہے۔ زبان سے ناواقفیت نے بھی مشکلات میں اضافہ کیا ہے۔ وہاں سفر بابر کی زندگی نیز اس کے احوال وآثار کو سمجھنے کے لئے اہم ثابت ہوا۔ یہ سفر ۲۰۰۲ء میں ہوا۔ ترکوں سے ملاقاتیں رہیں۔ ان گنت حضرات کا تعاون شامل حال رہا۔ تاشقند میں سعید بیگ صاحب نے بابرنامہ کریلیک رسم الخط میں حال ہی میں شائع کیا ہے[1]۔ انصارالدین نے خط بابری کی نشاندہی کی اور دو مضامین روسی سے اردو میں ترجمہ کر کے دیئے، تاشقند کی مجھے سیر بھی کرائی۔ یحیہ عبدالرحمٰن نے کئی ترکی الفاظ کے سمجھنے میں میری مدد کی۔ ذاکر جان مشرب اندجان کے میئر رہ چکے ہیں سیاسی آدمی ہیں اندجان کے باغ بابر کو بنانے میں ان کا اہم حصہ ہے، اس وجہ سے ان کی شہرت اسلام کریم تک پہنچی ہوئی ہے۔ سیف الدین جلیل تاریخ کے پروفیسر اور میرے اخسی کنت کے راہ نما تھے۔ عبدالمنان نصرالدین خجند یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف، ان سے شیخ مصلحت کے بارے میں تبادلہ خیال رہا۔ حاجی نذیر جان، ایک میوزیم کے ڈائیریکٹر اور مصنف ہیں، ان سے خجند کی تاریخ کی تفصیلات ملیں۔ خجند میں فرحت غفور اور ان کی بیٹیوں ماہین اور مائیشہ کی مہمانداری نے لطف دیا۔

شفاعت جو بابر فنڈ کے تاشقند دفتر کی نگراں اور اردو کی طالبہ ہیں، نے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کی سیر کرائی۔ یہاں کے ڈائیریکٹر ابراہیم نعمت اللہ صاحب لندن پلٹ ہیں لیکن ابھی ان کو اس حقیقت سے آگاہی نہیں کہ کتب خانوں کی عزت وشہرت مخطوطوں کو طالبوں کو دکھانے میں ہے چھپانے میں نہیں۔ جوزہ ذاکر نائب ڈائریکٹر خجند میوزیم نے بابر کے پتھر پر کندہ شعر کے متعلق معلومات بہم پہنچائی۔ عبدالرحمٰن رحیم نے خجند کی سیر کرائی۔ یہ سفر اتنا آسان ودلچسپ نہ ہوتا اگر رستم مسلم، انور رہیرولن، ساگندی کو، شفقت، سیف اللہ اور نذیرہ آپا (یہ جگت آپا ہیں) راہنمائی نہ کرتے۔

فرغنہ کے لوگ انتہائی ملنسار، مہمان نواز، دوست اور ہمدرد ہیں۔ جلد ہی گھل مل جاتے ہیں، اپنی محفلوں میں شریک کرتے ہیں اور مشرقی روایات کے مطابق انعام وتحائف دینے میں بڑے فراغ دل واقع ہوئے ہیں۔

یہاں کے دو دلچسپ واقعات کا ذکر ضروری ہے۔ ۲۰۰۲ء میں میں نے انصار الدین کو خط لکھا کہ میں ازبکستان آرہا ہوں۔ ان سے خط برقی سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن ان کا کوئی جواب نہیں آیا۔ ترکستان کی سیر وتفریح رہی انصارالدین اور دوسرے حضرات سے ملاقات رہی مگر کم وقت زیادہ مصروفیات کی وجہ سے اس خط کا کوئی ذکر نہ ہوسکا۔ دو سال بعد انصارالدین کا خط برقی آیا کہ مجھے خوشی ہے کہ آپ آرہے ہیں۔ یعنی ۲۰۰۶ء میں آخران کو وہ خط مل ہی گیا۔ ازبکستان میں خطوط کی جانچ پڑتال واحتساب ایک مرکز پر ہوتے ہیں۔ خط نہ ملنا، دیر سے ملنا عام سی بات ہے۔

تاشقند کا ائرپورٹ ایک سنسان جگہ ہے۔ مسافر اکادکا ہوتے ہیں۔ یہاں ایک پاکستانی تاجر سے ملاقات ہوگئی۔ باتوں باتوں میں سیاسی باتیں بھی آگئیں، جس پر انہوں نے کہا ہم یہاں سیاسی باتیں نہیں کرتے کہ دیواروں میں اسلام کریم کے کان ہیں۔

ترکی کے نیکدت توسن سے کبھی میری ملاقات نہیں ہوئی۔ لیکن خط برقی کے ذریعہ رابطہ رہا۔ ان کی نشاندہی پر ہی رسالہ عروض و دیوان بابر حاصل ہوئے۔

افغانستان۔ ۲۰۰۱ء سے میں انتظار میں تھا کہ کسی طرح افغانستان کے حالات سنبھلیں تو سفر کا انتظام کیا جائے۔ بابر کابل میں تقریباً بائیس سال (قمری) تک مقیم رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر ہی اس کی قسمت پلٹی اور حالات بہتر ہوئے تھے۔ ۲۰۰۶ء کے شروع میں کابل جانے کا انتظام ہو سکا۔ یوسف اختر اور عامر خالد کی ہمت افزائی سے یہ ممکن ہوا۔ حکیم اختر کے توسط سے رحیم اللہ یوسف زئی سے تعارف ہوا جن سے افغانستان کے اندرونی حالات پر تفصیلی خبریں حاصل ہوئیں۔ پشاور سے بذریعہ کار سفر کی ابتدا ہوئی۔ افغانستان کا حال برا ہے۔ بڑے شہر تباہ ہو چکے ہیں۔ گاؤں، دیہات میں پچھلے پانچ سو سالوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں کا سفر ممکن نہیں۔ بابر کے باغ صفا اور جلال آباد سے جنوب کا علاقہ خطرناک ہے۔ سوات تا کابل غیر ملکیوں کے لئے شجر ممنوعہ ہے۔ ہرات تا کابل پہاڑی راستے کے لئے ٹریول ایجنٹ حامی نہیں بھرتے۔ صرف آمو دریا تا ہندوکش کے حالات قابل سفر ہیں۔ ہندوکش سے جنوبی علاقے اس بارود کی طرح ہیں جس میں ایک چنگاری کافی ہے۔

کابل میں انگریزی و فارسی کتب اور ان کی نقلیں ایک دو دکانوں پر مل جاتی ہیں۔ سب سے مشہور دکان شاہ محمد صاحب کی ہے۔ شاہ صاحب کتاب تو بیچتے ہیں لیکن ساتھ کھال بھی کھینچتے ہیں۔ کابل میں باغ بابر کی مرمت ہو رہی ہے۔ گورا پرستی کی وجہ سے ٹھیکہ آغا خاں ٹرسٹ کے پاس ہے۔ اس کے ارکیٹیکٹ رتیش صاحب انگلستان کے تعلیم یافتہ ہیں۔ دلی والے ہیں لیکن غلامی کا طوق ابھی تک گردن میں پڑا ہے۔ انسان کی جلد دیکھ کر بات کرتے ہیں، سفید چمڑی کے آگے پیچھے اور گندمی جلد والے مسافروں سے دور بھاگتے ہیں۔ افغانستان ڈالر کی آمد سے بہت مہنگا ہو گیا ہے۔ کاروں کے علاوہ ہر چیز کے دام چڑھے ہوئے ہیں۔ ایک طرف غربت کا دور دورہ ہے دوسری طرف ناشتے کی ہر چیز بھی باہر سے آتی ہے۔ یقین نہیں آتا کہ یہ وہ ہی افغانستان ہے جس کا ایک سفر میں نے ۱۹۷۳ء میں کیا تھا۔ افغانستان کے اس سفر میں اگر میرے ہمنوا گل محمد فقیر اللہ کا ساتھ نہ ہوتا تو اندرون افغانستان کے حالات دیکھنے اور سمجھنے کا موقع نہیں ملتا۔ پاکستانی کسٹم کی لوٹ کھسوٹ جو پہلے کراچی اور لاہور میں ہوا کرتی تھی اب تورخم پر اس کی مشق ستم جاری ہے۔ میرے سفر افغانستان کے دوران میرے گھر والے بہت پریشان رہے۔ شہناز بیگم، طاہر علی بیگ، بدر بانو، مہ پارہ بانو اور سمیرہ احمد نے نہ معلوم کتنی راتیں جاگ کر گزاریں، مجھے ان سے معذرت ہے۔ لیکن فرید احمد نے عملی طور پر اس سفر کو آسان بنانے کی جو کوششیں کی وہ واقعی قابل تحسین ہیں، جس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

پاکستان۔ بابر نے موجودہ پاکستان کے شمال میں باجوڑ، جنوب مغرب میں تخی سرور اور مشرق میں سیالکوٹ تک کا سفر اختیار کیا تھا۔ بابر شناس مصنفین بابر کے اس حصے کی تفصیل میں نہیں جاتے۔ اس لئے ان علاقاجات کا سفر ضروری تھا۔ پاکستان میں بابر شناسوں کی کمی نہیں ان سب سے ملاقات کی کوشش کی۔ عارف نوشاہی نے رسالہ والدیہ فارسی نثر میں تصحیح کر کے شائع کیا[16]۔ ان کی کتاب احوال و سخنان[17] عبید اللہ احرار پر ایک جامع کتاب ہے۔ ادارہ تحقیق فارسی اسلام آباد کے ڈائیرکٹر ایران زادہ کی مدد سے فقہ بابری کے دو نسخہ جات کی نقلیں ملیں[18]۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا ماحضر اور مضامین مددگار ثابت ہوئے۔ خار باجوڑ کے رشید خاں کی مہمان نوازی کا لطف اٹھایا۔ بیگم محمد نبی خاں کے ساتھ پنڈی و پشاور سفر کیا۔ تیمور اور راشد صاحب کی مہربانی سے خیبر پاس اور تورخم کا دورہ ہوا۔ ساجد حسین، غلام رضا اور منیر نبی خاں میرے پرہالہ کے سفر کے ساتھی تھے۔ تنویر نبی خاں نے باجوڑ کی سیر کرائی۔ انور کی ڈرائیوری میں بہاول پور و سیالکوٹ کی گلیاں ناپیں۔ کراچی میں ڈاکٹر ریاض السلام کی راہنمائی شامل حال رہی۔ ڈاکٹر تفہیمی نے ایک سنگ میل کی نشان دہی کی۔ ڈاکٹر صابر سے تزک بابری کے نایاب بمبئی ایڈیشن کی کاپی ملی[14]۔ اس کے علاوہ ان کے مضامین بھی مددگار ثابت ہوئے۔ جلیل نبی خاں کے تعاون سے بابری ہتھیاروں پر کتاب[19] اور لکھنو کی مہذب اللغات کی پندرہ جلدیں دستیاب ہوئیں[20]۔ معین الدین عقیل

١٦۔ عارف نوشاہی، والدیہ

١٧۔ عارف نوشاہی، احوال و سخنان

١٨۔ بابر، ظہیر الدین محمد، فقہ بابری وفتاوائے بابری

١٩۔ پنت

٢٠۔ مہذب اللغات

صاحب نے بابر سے متعلق مختلف کتابچے عنایت کیئے اور لفظ میچاق پر معلومات بہم پہنچائیں۔ ذکیہ خانم صاحبہ نے بابر کے ہندستانی پرندوں کا پورا حصہ دیکھا اور اس کی تصحیح کی۔

ہندستان۔ ہندستان حاصل کرنا بابر کی دیرینہ خواہش اور اپنے جدامجد امیر تیمور کے کارناموں کو زندہ کرنا تھا۔ ہندستان کے تین سفر ہوئے۔ وقائع میں ہندستان کا ذکر ایک تہائی کتاب پر مشتمل ہے۔ یہ ملک نہیں بلکہ براعظم ہے۔ یہاں کے بابری طول وعرض ایک سفر میں ناپنا انتہائی دشوار ہے۔ اگر کسی بھی صورت آپ کا تعلق پاکستان سے ہو تو ہندستان کا ویزا حاصل کرنا دشوار ہے۔ سنا ہے یہی صورت ہندستانی کا پاکستانی ویزا کے لئے ہے۔ رگھون صاحب جو شوقین تاریخ داں ہیں، نے ہندستان کے ویزے کی مشکلات حل کیں، میں ان کا شکر گزار ہوں۔ حیدرآباد دکن میں سالار جنگ میوزیم لائبریری میں بابری ترکی مخطوطہ[21] اور مرزا نصیر الدین حیدر کا اردو[22] ترجمہ موجود ہے۔ اردو ترجمے کی نقل فدا علی ڈپٹی کیپر کی عنایت سے ملی۔ رانا سانگاہ کے حوالے سے اودے پور کا سفر ہوا۔ بمبئی کا شائع شدہ واقعات بابری کے مخطوطے کا تعلق بھی یہاں سے ہی ہے۔ ڈاکٹر امتیاز احمد ڈائریکٹر خدا بخش لائبریری کے تعاون سے تاریخ خاندان تیموریہ دیکھی۔ خواجہ احرار کی ایک قلمی تصویر بھی یہاں موجود ہے۔ ایودھیا کا سفر پولیس پہرے اور ہندتوا سرگرمیوں کی وجہ سے ناکام و نامکمل رہا۔ گوالیار کا ذکر بابر نے خوب کیا ہے، یہ آج کل بھی سیر کی عمدہ جگہ ہے۔ آگرے میں بابر نے کئی باغ لگائے تھے۔ آگرہ و دھولپور کے باغات و دیگر آثار بابری ڈاکٹر ناتھ کے ساتھ دیکھے۔ ان کی کئی تصانیف و مضامین بابر سے متعلق ہیں۔ ان کی کتاب مغل آرکی ٹکچر کی چار جلدوں میں سے پہلی جلد میں آثار بابر کا ذکر ہے[22]۔ میرے سفر بہار، لکھنو، فتح پور سیکری و گوالیار میں یونس جعفری کا ساتھ رہا۔ رام پور رضا لائبریری کے ڈائریکٹر ڈاکٹر صدیقی کے تعاون سے بابر کے ہندستانی دیوان کے نسخے کی کاپی ملی[23]۔ علی گڑھ کے حکیم ظل الرحمٰن نے کئی مضامین و کتب ارسال کیں۔ پانی پت اب بڑا شہر ہو گیا ہے اور اس کا میدان اب وہ میدان نہیں رہا، وہاں تین جنگوں کی یاد میں آثار بنا دیئے گئے ہیں۔ شاہد ظفر خاں نے دلی کا طائراتی دورہ کرایا۔ مسرور احمد خاں کی لائبریری اب ندوۃ العلماء لکھنو میں ہے، اس سے استفادہ کیا۔ دلی کے نیشنل میوزیم کی لائبریری میں بابر نامے کا ایک عمدہ نقاش مخطوطہ ہے جو بابر نامے کے عمدہ مخطوطات میں شمار ہوتا ہے، اس کی تصاویر اب علیحدہ علیحدہ کر دی گئی ہیں۔ یہ اکبری دور کے فن مصوری کا نادر نمونہ ہے۔

بابر نے اپنے حالات زندگی کو "وقائع" کے نام سے یاد کیا ہے[24]۔ اسی لئے عبدالرحیم خان خاناں نے فارسی ترجمے کو "واقعات بابری" کا نام دیا۔ ہندستان میں ترکی زبان غیر معروف تھی، حالانکہ بابر فارسی سے واقف تھا اور اس کے فارسی میں کہے گئے اشعار بھی ہیں، یہاں کے مسلمانوں میں فارسی کا رواج بھی زیادہ تھا، لیکن اس نے اپنے حالات زندگی اپنی مادری زبان ترکی میں تحریر کیئے، ظاہر ہے ترکی زبان میں انشا پردازی پر اسے عبور تھا۔ ترکستانی ادب میں وقائع ایک تاریخی یادداشت ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ بابر کے اپنے ہاتھ کا لکھا نسخہ موجود نہیں، شاید وہ ہندستان کی اس آندھی میں ضائع ہو گیا جس کا ذکر بابر نے ۹۳۵ھ میں کیا ہے اور کچھ ہمایوں کی دربدری میں گم ہو گیا۔ مغلیہ حکومت میں استحکام آجانے کے بعد دور اکبر میں ضرورت محسوس کی گئی کہ خواص کی زبان فارسی میں اس کا ترجمہ ہو۔ اکبر کے حکم کے بموجب اور علامی ابوالفضل کو تاریخی مواد فراہم کرنے کے لئے عبدالرحیم خان خاناں نے اس کا فارسی ترجمہ کیا، جو آج بھی ملتا ہے۔ انگریزوں نے اپنے شک کے بموجب اس میں خرابیاں نکالنے کی کوشش کی ہے۔ ایک مضمون میں تو اس کو عبدالرحیم کا ترجمہ ماننے سے انکار کیا ہے، جس کی بعد میں تردید کی گئی[25]۔ محمد حسین آزاد نے بھی خیالی پلاؤ پکایا ہے کہ ترجمہ خاں خاناں کا اپنا نہیں تھا، لیکن خود یہ بھی لکھا ہے وہ ترکی میں رواں تھا[26]۔ خاں خاناں کی زباں دانی معروف ہے اور اس میں شک کی گنجائش نہیں، ایسٹ انڈیا کمپنی کے پہلے

۲۱۔ بابر، ظہیر الدین محمد، بابرنامہ ترکی مخطوطہ

۲۲۔ رام ناتھ، مغل آرکی ٹکچر

۲۳۔ بابر، ظہیر الدین محمد، دیوان رام پور

۲۴۔ ورق ۳۴۰

۲۵۔ بیورج، ہنری، امپیریل اینڈ ایشیاٹک کوارٹرلی، جولائی، اکتوبر ۱۹۰۰ء ص ۱۱۴۔۱۲۳، ۳۱۰۔۳۱۷

۲۶۔ محمد حسین آزاد، دربار اکبری نئی دہلی ص ۶۵۴

جاسوس ہاکنس نے برہان پور میں خاں خاناں کے دربار میں ان سے تین گھنٹے تک ترکی زبان میں ہی بات کی تھی اوران کی ترکی دانی کی تعریف بھی [۲۵] حالانکہ ہاکنس کو کسی طرح بھی ترکی عالم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ وقائع کے ترکی مخطوطات کتب خانوں میں ملتے ہیں لیکن ہر نسخے میں کوئی نہ کوئی کمزوری ہے، مثلاً ہمایوں کے ترکی نسخے میں جو آج کل ایڈنبرا میں ہے، تیس صفحات غائب ہیں۔ سالار جنگ کے نسخے کی مکمل تاریخ موجود نہیں، روسی مخطوطات فارسی متن کا التاتر کی زبان میں ترجمہ سمجھے جاتے ہیں [۲۷]۔ حال ہی میں تہران کے شاہی کتب خانے میں بابر کی کتب کا ایک مجموعہ ملا ہے [۲۸]۔ اس میں ترکی وقائع سیاہ روشنائی سے اوراس کا فارسی ترجمہ سرخ روشنائی میں درج ہے۔ وقائع کا نسخہ نامکمل ہے۔ فارسی ترجمہ بھی خان خاناں کے مقابلے میں علمی طور پر کم تر ہے [۲۹]۔ ان وجوہات کی بنا پر ہی خاں خاناں کے ترجمہ کی عظمت اور تاریخی حیثیت کو دنیا کا کوئی نسخہ بھی نہیں پہنچتا۔ اس مخطوطے میں کمزوریوں کی وجہ ایک تو ہماری اپنی عادات سے پیدا ہوئی کہ لکھتے وقت نقطوں اور اعراب کو پورا نہیں لگایا جاتا اس کی مثال خواجہ احرار کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط میں دیکھی جاسکتی ہے [۳۰]، دوسرے بار بار نقل اور کاتبوں کی روایتی لاپرواہی سے املا کی غلطیاں آگئی ہیں۔ اس لئے مختلف ترکی وفارسی متون کا مقابلہ اور تصحیح وقت کی ضرورت تھی۔

اردو کتب میں عام طور پر اشاریہ شامل نہیں ہوتا، جس کی وجہ سے کتاب کی اہمیت کم ہوجاتی ہے۔ مجھے سعید کلیانوی کی محنت کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ انہوں نے وقائع کا اشاریہ ترتیب دیا۔ کتاب کی ابتدا سے اختتام تک ہر قدم پر شمس الدین نے محنت اور لگن سے ساتھ دیا۔ ان کے صبر کے بغیر کتاب کی تکمیل نہ ہوتی۔ بے شمار حضرات کے مشورے، ہدایات اور خواہشات اس کتاب کی تیاری میں شامل حال رہے ہیں لیکن غلطیوں اور خرابیوں کی ذمہ داری صرف میری ہے۔ وہ قاری جو تاریخ کے نوارد ہیں اور جو سفر ناموں میں دلچسپی رکھتے ہیں ان سے درخواست ہے کہ ضمیمے ''بابر کی تلاش میں'' پہلے پڑھیں کہ اس میں شامل مضامین کے مطالعے سے بابر نامے کا پس منظر و پیش منظر سمجھنے میں مدد ملے گی۔

اردو کے قاری کی روانی کو پیش نظر رکھتے ہوئے جہاں تک ممکن ہوسکا ہے نام اور جگہوں، دونوں کے لئے رائج املا استعمال کیا گیا ہے جیسے مرزا یا فرغنہ، بعض الفاظ کی ہجے اگر معیاری نہ ہوں تو پیش نظر روانی اور آسانی تھی۔ مشرقی ناموں کے عام طور پر کوئی معنی ہوتے ہیں۔ ترکی نام روسی زمانے میں عام طور پر بگاڑ دیے گئے تھے۔ اس تبدیلی سے مشرقی کان ان آوازوں کو قبول نہیں کرتے اور ان کے معنی بھی ختم ہوجاتے ہیں جیسے بابا جان کو باباجانوو کردیا۔ اس لئے کوشش یہ رہی ہے کہ اصلی بامعنی نام ہی لکھا جائے۔

حسن بیگ

۲۷۔ بیورج، اینٹ، بابر نامہ ص ۴۹

۲۸۔ بابر، ظہیر الدین محمد، وقائع بابری

۲۹۔ آئی جی مانو، کلیکٹڈ ورکس ص ۱۸۹۔ اس مخطوطے کا ذکر پہلے توغان نے لاہور کے ایک جلسے میں کیا (۱۹۵۷) جو اوری اینٹل کالج میگزین میں چھپا (۱۹۵۸)۔ بعض جگہ اس کو کلیات کہا گیا ہے، لیکن اس میں دیوان شامل نہیں۔ اس مخطوطے میں کچھ ترکی الفاظ کی تصحیح حاشیہ پر کی گئی ہے۔ مبین کے کئی صفحات غائب ہیں۔ رسالہ عروض کے صفحات آگے پیچھے ہیں اور نامکمل بھی۔ وقائع میں بھی کئی سالوں کے حالات غائب ہیں۔ صرف رسالہ اوزان ہی ایک بابری کتاب ہے جس کا متن اس مخطوطے کے علاوہ اب تک کہیں اور دستیاب نہیں، لیکن آئی جی مانو کے مطابق یہ ۴۹۸ اوزان ہیں ۵۰۴ نہیں۔ میری نظر میں اس مخطوطے کو نامکمل مجموعہ کتب بابر کہنا چاہیے۔

۳۰۔ گروس، جو این۔ دی لیٹرز آوف خواجہ عبید اللہ احرار اینڈ ہز اسوسی ایٹز، برل، لائیڈن ۲۰۰۲ ورق ۴ ب

کمچک پاس۔ فرغنہ کا پہاڑوں میں سے راستہ۔ میدانی راستہ تاجکستان سے ہوکر گزرتا ہے جو ازبکستان کے لئے، بند ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
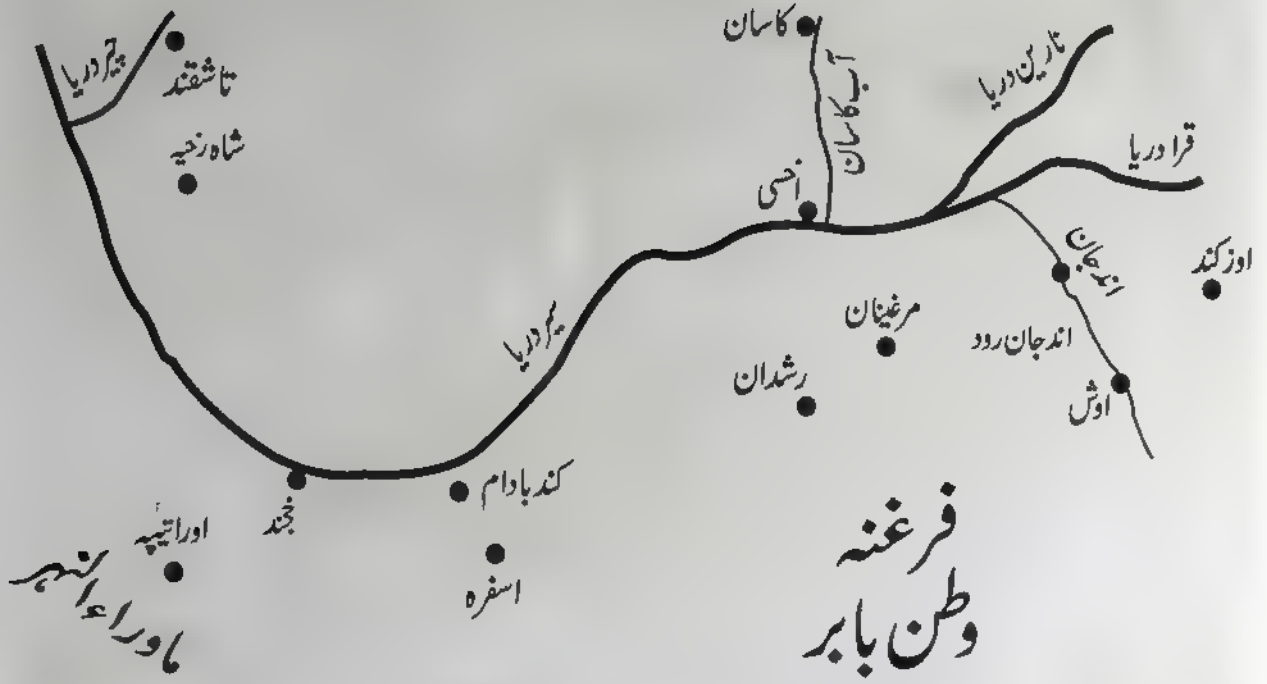
واقعات ۸۹۹ھ

(۱۲ اکتوبر ۱۴۹۳ء ـ ۲ اکتوبر ۱۴۹۴ء)

(ورق ا) میں ریاست فرغنہ میں رمضان ۸۹۹ ہجری، عمر کے بارھویں سال میں بادشاہ ہوا۔[1]

فرغنہ

فرغنہ اقلیم پنجم[2] میں ہے۔ یہ آباد دنیا کے کنارے پر واقع ہے۔ اس کے شمال میں کاشغر، مغرب میں سمرقند، جنوب میں بدخشاں کے پہاڑ اور شمال میں ویرانی ہے۔ گو اس سے قبل یہاں آبادی تھی جیسے المالیغ[3]، الماتو[4] اور یانگی[5] لیکن ازبکوں اور مغلوں کی بربادیوں کی وجہ سے ویرانی ہوگئی ہے۔ اور کہیں کوئی آبادی باقی نہیں رہی۔

فرغنہ ایک چھوٹی ریاست ہے۔ لیکن اس میں میوے اور غلے کثرت سے ہوتے ہیں۔ اس کے تین طرف پہاڑ ہیں صرف مغرب میں سمرقند و خجند کی طرف پہاڑ نہیں اور حملہ آور اس طرف سے داخل ہو سکتے ہیں لیکن باقی طرف سے حملہ نہیں ہو سکتا۔

دریائے سیحوں[6] شمال مشرق سے فرغنہ میں داخل ہوتا ہے، درمیان سے گزر کر (ورق ۲) خجند کے شمال اور فناکت[7] کے جنوب سے گزرتا ہوا شمال کی جانب رخ کرتا ہوا ترکستان کی جانب چلا جاتا ہے اور کسی دریا سے متصل ہوئے بغیر ترکستان میں اس کا بیشتر پانی ریت میں جذب اور یہ دریا ناپید ہو جاتا ہے۔

اس ریاست میں سات قصبے ہیں۔ پانچ دریا کے جنوب میں اور دو شمال کی طرف، جو قصبے جنوب میں آباد ہیں ان میں ایک اندجان ہے۔

اندجان:

یہ ریاست کے درمیان میں واقع ہے۔ فرغنہ کا دارالحکومت ہے۔ یہاں میوے اور غلے بہت ہوتے ہیں۔ یہاں کے انگور اور خربوزے تو بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ خربوزے کی فصل کھیت میں فروخت کرنے کا یہاں رواج نہیں[8]۔ اندجان سے بہتر ناشپاتی کہیں اور نہیں ہوتی۔ ماوراء النہر[9] میں سمرقند اور کش[10] کے علاوہ کوئی قلعہ وسعت میں قلعہ اندجان کے برابر نہیں۔ قلعہ اندجان کے تین دروازے ہیں۔ یہ شہر کے جنوب میں واقع ہیں۔ قلعہ میں نو نہروں سے پانی آتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ کوئی نہر اس سے باہر نہیں نکلتی۔ قلعہ کے اطراف پتھر کی فصیل کے ساتھ کنکروں سے بنی خندق کے برابر ایک بڑی سڑک گزرتی ہے۔ قلعہ کے چاروں طرف خالی جگہ ہے۔ قلعہ اور شہر کے درمیان یہ سڑک ہی حد ہے۔

یہاں شکار کثرت سے ملتا ہے۔ مرغ زریں[11] تو بہت تیار ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک مرغ زریں کا سبزی کے ساتھ تیار سالن چار لوگوں نے سیر ہو کر کھایا پھر بھی وہ اسے ختم نہ کر سکے اس ریاست کے سب لوگ ترک ہیں۔ عام شہری اور بازاری لوگوں میں کوئی شخص ایسا نہیں جو ترکی نہ جانتا ہو۔ میر علی شیر نوائی[12] کی تصانیف اسی زبان میں ہیں۔ حالانکہ اس کی نشو و نما ہرات میں ہوئی جہاں فارسی زبان کا رواج ہے۔ خواجہ یوسف[13]

۱۔ بابر ۶ محرم ۸۸۸ھ / ۱۴ فروری ۱۴۸۳ء کو پیدا ہوا۔ خواجہ عبید اللہ احرار نے نام ظہیر الدین محمد رکھا۔ امیر تیمور کے پوتے الغ بیگ کے درباری عالم مولانا منیر مرغینانی نے تاریخ پیدائش شش محرم سے نکالی (تاریخ رشیدی ص ۱۷۳)۔ ماثر رحیمی میں تاریخ پیدائش سے متعلق یہ شعر درج ہے۔

چوں در شش محرم زاد آں شہ مکرم   تاریخ مولدش ہم آمد شش محرم

اور اس شعر کو مولانا حامی قراکولی کا بتایا ہے۔ (جلد ا صفحہ ۴۸۸) مولانا مرغینانی خاص طور پر بلائے گئے ہونگے کہ بہن کی پیدائش کے پانچ سال بعد اولاد نرینہ ہوئی۔ بچے کا نام اگر مشکل یا طویل ہو تو عام طور پر ایک مختصر نام رکھ لیا جاتا ہے، جو کہنے میں آسان اور دوہرانے میں سہل ہو اس لئے ظہیر الدین محمد کے ساتھ بابر لگا۔ بابر ظاہر ہے کہ بچہ نڈر اور بہادر ہوگا جو اسکی آئندہ زندگی نے ثابت کیا۔ تاریخ رشیدی کا یہ کہنا کہ اس زمانے میں تیموری جاہل اور اجڈ تھے۔ اور ان کے لئے ظہیر الدین کہنا مشکل تھا۔ (ص ۱۷۳) قابل فہم نہیں کیونکہ تیمور اور اسکے کئی بیٹوں کے نام و لقب اسی طرح تھے۔ شجاع الدین تیمور، قطب الدین عمر شیخ، معز الدین میران شاہ و معین الدین شاہ رخ (تھیکسٹن۔ سنچری ص ۴۳۹)

یہاں بابر نے اپنے آپ کو "بادشاہ" کہا ہے۔ اس زمانے میں تیموری اپنے آپ کو امیر یا سلطان کہلاتے تھے۔ لیکن کیونکہ بابر یہ الفاظ فتح ہندوستان کے بعد لکھ رہا ہے اس لئے اس نے بادشاہ لکھا ہے

۲۔ اقلیم پنجم۔ محمد موسیٰ الخوارزمی اور البیرونی دنیا کو سات اقلیم میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس میں سے پانچ اقلیم قابل آبادی ہیں۔ اس کے باہر انتہائی شمالی اور جنوبی علاقے ہیں۔ اس تقسیم کا مقصد نہ

موسیقار بھی اندجان کا رہنے والا تھا۔ اندجان کی ہوا تعفن سے پاک نہیں۔ اس لئے یہاں آشوب چشم دورم چشم[14] کی وبا عام ہے۔ طبیب اس کو چرب[15] کہتے ہیں۔

اوش:

ایک دوسرا قصبہ اوش ہے۔ یہ اندجان سے چار فرسنگ[16] کے فاصلے پر ہے۔ یہ اس کے جنوب مشرق میں کچھ مشرق کی طرف زیادہ ہے۔ یہاں کی آب و ہوا عمدہ ہے۔ آب رواں کثرت سے ہے۔ یہاں بہار کا موسم بھی خوب ہوتا ہے۔ اوش کی تعریف میں بہت سے اقوال بیان کئے جاتے ہیں۔ اوش کے قلعے کے جنوب مشرق میں ایک خوبصورت پہاڑ ہے جو براکوہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر سلطان محمود خاں[17] نے حجرہ تعمیر کرایا تھا۔ میں نے ۹۰۲ (۱۴۹۶ء) میں اس سے نیچے ایک بارہ دری تعمیر کی۔ اگرچہ حجرہ بارہ دری سے زیادہ بلندی پر ہے لیکن بارہ دری زیادہ بہتر جگہ پر ہے کہ تمام شہر اور اس کے مضافات یہاں سے نظر آتے ہیں۔

دریائے اندجان اوش کے باہر سے گزرتا ہوا اندجان جاتا ہے۔ اس دریا کے دونوں کناروں پر باغات لگائے گئے ہیں۔ اس قصبہ کے تمام باغ اسی دریا پر واقع ہیں۔ یہاں بنفشہ بہت عمدہ ہوتی ہے۔ (ورق ۳) اور آب رواں بھی موجود ہے۔ بہار کے موسم میں یہاں لالہ وگل خوب کھلتے ہیں۔ اس پہاڑ کے دامن میں شہر و باغ کے درمیان ایک مسجد ہے، جس کا نام جوزا ہے۔ پہاڑ کی طرف سے ایک بڑی نہر آتی ہے۔ مسجد جوزا کے صحن میں نشیب کی طرف جو میدان ہے اس میں تین وسیع تالاب ہیں۔ جو مسافر وراہ گیر اس طرف سے گزرتا ہے یہاں آرام ضرور کرتا ہے۔ اوش کے بدمعاش لوگوں کی ایک دل لگی یہ ہے کہ جو شخص اس میدان میں سو جاتا ہے اس پر ان نہروں کا پانی چھڑک دیتے ہیں۔

عمر شیخ مرزا کے آخری عہد میں ایک سرخ وسفید دھاری دار پتھر اس پہاڑ سے نکالا گیا تھا۔ اس پتھر سے چھتری کے دستے، پیٹی کے بکسوئے اور اسی قسم کی دوسری اشیا بنائی جاتی ہیں۔ یہ خوبصورت پتھر ہے۔

ولایت فرغنہ میں آب وہوا کی صفائی اور پاکیزگی کے لحاظ سے اوش سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔

مرغینان:

ایک اور قصبہ مرغینان ہے۔ یہ اندجان کے مغرب میں سات فرسنگ کی دوری پر واقع ہے۔ قصبہ عمدہ ہے۔ یہاں انار اور خوبانی جیسے پھل اچھے ہوتے ہیں۔ یہاں انار کی ایک قسم ہوتی ہے جسے کلاں دانہ کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ شیریں ہوتا ہے مگر اس میں مزا پکی خوبانی کا ہوتا ہے۔ اس کو سمنان[18] کے انار پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔ ایک آڑو ہوتا ہے جس کی گٹھلی نکال کر اس میں بادام کی گری بھر کر خشک کر لیتے ہیں۔ اس کو سبحانی کہتے ہیں۔ یہ بہت لذیذ ہوتی ہے۔

یہاں جانوروں کا شکار بہت ہے۔ قرب وجوار میں ہرن کی ایک قسم ہوتی ہے جسے آہوئے وراق کہتے ہیں۔ یہاں کے سب لوگ (ورق ۴) تاجیک نسل کے ہیں۔ بہت ہی پر جوش ولڑاکو۔ سمرقند اور بخارا میں اکثر مرغینانی ہی دنگئی ہوتے ہیں۔

موضوع رشدان مرغینان کے مضافات میں واقع ہے۔ ہدایہ[19] نامی کتاب کا مصنف اسی جگہ کا باشندہ تھا۔

اسفرہ:

ایک اور قصبہ اسفرہ ہے۔ جو پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ یہاں آب رواں کے چشمے اور پرفضا باغیچے بکثرت موجود ہیں۔ یہ قصبہ مرغینان کے جنوب مغرب میں ہے۔ اس کے اور مرغینان کے درمیان نو فرسنگ کا فاصلہ ہے۔ یہاں گھنے جنگلات بہت ہوتے ہیں۔ اور باغیچوں میں بادام کے درخت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہاں کے لوگ کوہستانی اور تاجیک نسل کے ہیں۔ اس قصبے کی جنوبی جانب ایک فرسخ شرعی پر کوہستانی

صرف شہروں اور علاقوں کے جغرافیہ کا تعین کرتا تھا۔ بلکہ قبلے کی صحیح سمت معلوم کرنا بھی۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ)

۳۔ المالیغ۔ چنگیز خاں کے بیٹے چغتائی کی سلطنت کا دارالخلافہ جس کا انتقال ۶۳۹/۱۲۴۱ میں ہوا۔ یہ اس کی سلطنت کے ایک کونے میں واقع تھا۔ اس وقت منگول خانہ بدوش تھے اور شہروں میں رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لئے بڑے شہروں سے دور چغتائی نے اس کو دارالخلافہ بنانا پسند کیا۔ چغتائی سلطنت جب ماوراءالنہر اور مغلستان میں تقسیم ہوئی تو یہ مغلستان کا دارالخلافہ ہو گیا تھا۔ المالیغ کے لفظی معنیٰ سیب کے درختوں کے جھنڈ کے ہیں۔ (مرزا حیدر ص ۳۶۴ اور نوٹ ۱)

۴۔ الماتو۔ یہ جگہ دریائے ایلی کے جنوب میں کرغیزستان میں واقع ہے۔ بابر کے ماموں سلطان محمود خاں نے اپنے آخری زمانے (۹۱۴/۱۵۰۸) میں اس کو خیر آباد کہا تھا۔ الماتو کو لفظی معنیٰ ہیں۔ وہ زمین جہاں سیب کثرت سے پیدا ہوں (مرزا حیدر ص ۱۸۲ اور نوٹ ۱)

۵۔ یانگی۔ اس کو کتابوں میں اطرار لکھتے ہیں۔ (بابر)

اطرار۔ یہ تاریخی شہر تھا۔ جو سیر دریا کے مشرقی کنارے پر واقع تھا۔ چنگیز خاں نے مغرب کی طرف اسلامی دنیا پر جب حملہ کیا تو اطرار میں پہلے تباہی ہوئی تھی۔ ۶۱۵/۱۲۱۸ میں اطرار کے خوارزمی حاکم نے کچھ تاجروں کو جاسوسی کے جرم میں قتل کروادیا جس کا بدلہ لینے کے لئے چنگیز خاں نے یہاں پر حملہ کیا اور قتل عام شروع کر دیا۔ (چنگیز خاں ص ۱۲۲) ۸۰۷/۱۴۰۵ میں امیر تیمور چین پر حملہ کرنے کے لئے یہاں قیام پذیر ہوئے۔ سردی کا موسم تھا۔ پہلے نزلہ ہوا پھر کھانسی اور پھر منہ سے خون آنے لگا اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔ (رائز اینڈ رول اوف تمرلین ص ۱۲۸، احمد ابن عرب شاہ ص ۲۳۱-۲۳۳)

۶۔ دریا سیحوں۔ اس کو خجند اور سیر دریا بھی کہتے ہیں۔

۷۔ فناکت۔ اس کو اب شاہ رخیہ کہتے ہیں۔ (بابر)

۸۔ حیدر مرزا دوغلت تاریخ رشیدی میں بھی یہی بات کہتا ہے کہ کاشغر اور ختان میں خزاں کے موسم میں بھی پھل سڑکوں کے ساتھ ساتھ اُگے ہوتے تھے۔ جو چاہتا توڑ کر استعمال کر سکتا تھا۔ اوران کو بیچنے کا رواج نہ تھا۔ (ص ۳۰۲)

مرتب کے فرغنہ کے سفر کے دوران کئی اصحاب نے اس بات کی تصدیق کی اور بے شمار جگہ اب بھی انگور کی بیلیں سڑک کے ساتھ ساتھ گھروں کے آگے لگی ہوتی ہیں۔

پشتوں کے درمیان ایک چٹان ہے۔ جسے سنگ آئینہ کہتے ہیں۔ یہ لمبائی میں تقریباً دس گز ہے اور اونچائی میں بعض جگہ پر قد آدم کے برابر اور بعض جگہ آدمی کی کمر تک۔ اس میں ہر چیز آئینے کی طرح دکھائی دیتی ہے۔

ولایت اسفرہ چار اضلاع پر مشتمل ہے۔ جو پہاڑ کے دامن میں واقع ہیں۔ ان کے نام اسفرہ۔ داروخ، سوخ اور ہشیار ہیں۔ محمد شیبانی خاں [20] نے سلطان محمود خاں اور الچہ خاں [21] کو شکست دے کر جب تاشقند اور شاہ رخیہ پر قبضہ کیا تو میں اسی پہاڑ کے دامن میں سوخ اور ہشیار نامی مقامات پر وقت گزاری کے لئے ایک سال تک پریشانی کی حالت میں مقیم رہا۔ اور اس کے بعد ہی میں نے کابل کی طرف روانہ ہونے کا ارادہ کیا۔

خجند:

ایک اور قصبہ خجند ہے۔ یہ اندجان کے مغربی جانب پچیس فرسنگ کی دوری پر واقع ہے۔ جس کا شمار قدیم شہروں میں ہوتا ہے۔ شیخ مصلحت [22] اور خواجہ کمال خجند [23] کے ہی باشندے تھے۔ یہاں کے میوہ جات بہت عمدہ ہوتے ہیں اور انار تو اپنی خوبی کے باعث مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ سمرقند کے سیب اور خجند کے انار کا دنیا میں جواب نہیں۔ لیکن اب مرغینان کا انار بہتر ہے۔ اس کا قلعہ بلند مقام پر ہے۔ دریائے سیحون اس کے شمال کی جانب سے گزرتا ہے اور قلعہ سے ایک تیر کی دوری پر واقع ہے۔ قلعہ اور دریا کے شمال میں منوغل نامی پہاڑ ہے جہاں بہت سی کانیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فیروزہ کی کان کے علاوہ بھی دیگر کانیں پائی جاتی ہیں۔ اس میں سانپ بھی بہت ہیں۔ خجند کا شکار بھی بہت عمدہ ہے۔ سفید ہرن، پہاڑی بکرے، بارہ سنگھے، صحرائی پرندے اور خرگوش بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ یہاں کی فضا میں تعفن بہت ہے۔ جس کی وجہ سے آشوب چشم جیسی بیماری پھیلتی ہے۔ چنانچہ اس جگہ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہاں تو چڑیوں تک کو یہ بیماری لگ گئی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ یہاں کی فضا میں تعفن کی وجہ اس کا شمالی پہاڑ ہے۔ کند بادام اسی قصبے کے تابع ہے۔ اگر چہ یہ کوئی بڑا قصبہ نہیں لیکن چونکہ یہاں کا بادام بہت عمدہ ہوتا ہے۔ اسی لئے اس نام سے مشہور ہے۔ یہاں کا بادام ہرمز [24] اور ہندوستان جاتا ہے۔ یہ خجند کے مشرق میں پانچ چھ فرسنگ کے فاصلے پر آباد ہے۔ خجند اور کند بادام کے درمیان ہادرویش نامی بیاباں ہے۔ یہاں کے میدانوں میں ہر وقت ہوا چلتی رہتی ہے۔ اور مرغینان تک جو اس کی مشرق سمت میں واقع ہے پہنچتی ہے۔ نیز خجند میں بھی جو اس کے مغرب میں ہے۔ ہمیشہ یہی ہوا چلتی ہے۔ یہ ہوا رفتار میں بہت تیز ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ چند درویش یہاں کے دشت میں ہوا کے تند و تیز جھونکوں کے باعث ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے۔ اور جب انہوں نے ایک دوسرے کو نہیں پایا تو ہادرویش ہادرویش پکارتے رہے اور یہ کہتے کہتے سب کے سب ہلاک ہو گئے۔ چنانچہ اس وقت سے ہی اس دشت کو ہادرویش [25] کہتے ہیں۔

اخسی:

دریائے سیحون کی شمالی جانب جو قصبات آباد ہیں ان میں سے ایک اخسی ہے جسے کتابوں میں اخسیکت لکھتے ہیں۔ اور اسی لئے اثیر الدین، شاعر کو اثیر اخسیکتی [26] کہتے ہیں۔ ولایت فرغنہ میں اندجان کے بعد اس سے بڑا کوئی قصبہ نہیں [27] یہ اندجان سے مغرب کی جانب نو فرسنگ کی دوری پر واقع ہے۔ عمر شیخ مرزا نے اسے اپنا پائے تخت بنایا تھا۔ دریائے سیحون یہاں کے قلعے کے نیچے سے گزرتا ہے۔ یہ قلعہ پہاڑ کے شگاف میں بلندی پر بنا ہوا ہے۔ جس کے اطراف میں خندق نہیں بلکہ گہری کھائیاں ہیں۔ جس وقت عمر شیخ نے اس کو اپنا پائے تخت بنایا تو انہوں نے بھی ایک دو مرتبہ قلعے کے باہر کھائیاں کھدوائیں فرغنہ میں اس جیسا کوئی محکم قلعہ نہیں۔ اس کے محلات قلعے سے ایک فرسنگ شرعی دوری پر واقع ہیں۔ کہاوت ہے گاؤں کہاں اور پیڑ کہاں [28] جو غالباً اخسی کے بارے

۹۔ ماوراء النہر۔ یہ خوبصورت عربی نام ہے۔ جس کے معنی دریائے جیحوں (یا آموں) کے پار (ماوراء) کا علاقہ ہے۔

۱۰۔ کش۔ ایک شہر جو سمرقند کے جنوب میں واقعہ ہے۔ آجکل اس کو شہر سبز کہتے ہیں۔ یہاں امیر تیمور کی پیدائش ہوئی اور یہاں کا قلعہ بھی انہوں نے ہی بنوایا تھا۔ جو ۷۸۳/۱۳۸۱ میں موسم سرما میں مکمل ہوا۔ (تھمکسٹن، بنجری ص ۲۳۸) اب اس کا صرف کھنڈر باقی ہے۔ یہاں پر ہی امیر تیمور نے اپنے لئے زمین دوز حجرہ اور قبر تیار کروائی تھی جو قائم ہے۔ حالانکہ ان کو دفن سمرقند میں کیا گیا ہے۔ امیر تیمور کا ارادہ شہر سبز کو پایہ تخت بنانے کا تھا۔

۱۱۔ مرغ زریں۔ یہ مرغ کی قسم جو وزن و حجم میں گھریلو مرغ سے چھوٹا ہوتا ہے۔ خوبصورت وخوشنما۔ دم لمبی اور پتلی۔ یہ تھوڑی دور ہوا میں اڑ سکتا ہے۔ لیکن چلنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ سخت جان اور مشکل حالات میں زندہ رہ سکتا ہے۔ حالات سے سمجھوتہ کرنے والا پرندہ ہے۔ عام طور پر ایک نر کا وزن ایک ہزار گرام اور مادہ کا آٹھ سو گرام ہوتا ہے۔ ایک نر کے ساتھ کئی کئی مادہ ہوتے ہیں۔ یہ چین اور جنوبی ایشیا کا ساکن ہے لیکن اب دنیا میں زیادہ تر خنک ممالک میں پایا جاتا ہے۔ شاہراہ ریشم کی تجارت کے ساتھ ساتھ یہ وسط ایشیا اور مشرق یورپ میں پھیلا وہاں سے یورپ اور امریکہ کی آب ہوا کو بھی اس نے اپنایا۔ اس کی تقریباً ۳۴ قسمیں دنیا میں پائی جاتی ہے۔ اس کا شکار عام طور پر کیا جاتا ہے۔ اس شکار کے شوق کی وجہ سے انسان نے اس کو پالا اور اس کی نسل کو پھیلایا۔ اس کو پال کر شکار کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ (پیٹر روبرٹ سن، اے نیچرل ہسٹری اوف دی فیزنٹ۔ سوان ہل پریس۔ لندن ۱۹۹۷) بابر کے زمانے میں یہ زیادہ تر جنگلی ہوا کرتا تھا۔ اور پہاڑوں میں ملتا تھا۔ آجکل فرغنہ میں خال خال نظر آتا ہے۔ زیادہ تر عجائب گھروں میں محفوظ ہے۔ پاک و ہند میں پہاڑی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ مانسہرہ (سوات) میں اس کی نسل کو بچانے اور اس کی پرورش کے لئے ایک مرکز قائم ہے۔ (قریشی اے اے۔ ڈان ۲۱ اگست ۲۰۰۳)

بابرنامے کا ترکی مخطوطہ جو ہمایوں کے پاس تھا۔ اس میں کچھ ترکی الفاظ کے فارسی معنی جگہ جگہ لکھے ہوئے ہیں۔ ہمایوں کو ترکی آتی تھی۔ لیکن مرزا سلطان جن کے پاس یہ نسخہ رہا تھا۔ وہ شاید ترکی سے ناواقف تھے۔ انہوں نے قیر غاول کے نیچے خط شکستہ میں مرغ دشتی اس کے معنی لکھ رکھے ہیں۔ یہ نسخہ آجکل ایڈنبرا میں ہے۔ اس پرندے کو فارسی میں مرغ بہشتی بھی کہتے ہیں۔ اور پشتو میں کوک زریں۔

میں ہی کہی گئی ہے۔ یہاں کا خربوزہ بہت عمدہ ہوتا ہے۔ یہاں خربوزے کی ایک قسم ہوتی ہے۔ جسے میر تیموری کہتے ہیں۔ شاید کہ دنیا میں ایسا خربوزہ کہیں اور پیدا ہوتا ہو۔ بخارا کا خربوزہ خود اپنی جگہ مشہور ہے لیکن جب میں نے سمرقند کو فتح کیا تھا۔ وہاں اخسی اور بخارا کے خربوزے کو لا کر مقابلہ کیا تو دیکھا کہ اخسی کے خربوزے سے ان کا کوئی مقابلہ نہیں۔ شکار کے لئے جانور بہت اچھے ہوتے ہیں۔ دریا کے پار اخسی کی جانب صحرا ہے وہاں سفید ہرن کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اندجان کی جانب جو جنگل ہے وہاں بارہ سنگھے (ورق ۵) صحرائی پرندے اور خرگوش بہت پائے جاتے ہیں جو فربہ ہوتے ہیں۔

کاسان:

دیگر قصبہ کاسان ہے۔ یہ چھوٹا قصبہ ہے۔ اور اخسی کی شمالی جانب واقع ہے۔ جس طرح اندجان کا پانی اوش سے آتا ہے اسی طرح اخسی کا پانی کاسان سے یہاں پہنچتا ہے۔ یہ پرفضا اور باصفا مقام ہے۔ جس میں بہت سے باغیچے ہیں۔ باغیچوں کے باصفا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دریا کے کنارے پر ہیں۔ اس لئے اس کو پوستین پیش برہ کہتے ہیں[۲۹]۔ باصفا باغات کی وجہ سے اوش اور کاسان کے لوگوں میں باہمی چشمک چلی آتی ہے۔

ولایت فرغنہ کے گرداگرد جو پہاڑ ہیں ان میں کئی سبزہ زار صحت افزا مقامات ہیں۔ ان پہاڑوں میں تابولغو لکڑی بہت عمدہ ہوتی ہے۔ اس کا پوست سرخ ہوتا ہے۔ وہ یہاں کے علاوہ کہیں اور نہیں پائی جاتی اور وہ بھی خاص طور پر درہ برغیہ میں جہاں تابولغو لکڑی بہت زیادہ دیکھی گئی ہے اور اس ملک کے اکثر پہاڑوں میں پائی جاتی ہے۔ ماوراء النہر اور ترکستان میں شاید یہ لکڑی فرغنہ کے علاوہ کہیں اور نہ ملتی ہو۔ عصا اور پرندوں کے پنجرے اس سے بنائے جاتے ہیں۔ اور اسی کو تراش کا تیر بھی بنائے جاتے ہیں۔ یہ لکڑی اتنی عمدہ ہوتی ہے کہ لوگ تبرک سمجھ کر اسے دور دراز مقامات پر لے جاتے ہیں۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ یبروح الصنم[۳۰] ان پہاڑوں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے بارے میں آج تک سننے میں نہیں آیا، ایک قسم کے پودوں کے بارے میں سنا گیا ہے کہ یتی کینت کے پہاڑوں میں پائے جاتے ہیں۔ جسے وہاں کے لوگ ایق اوتی کہتے ہیں۔ اپنی خاصیت کے اعتبار سے یہی شاید مہر گیاہ ہے[۳۱]۔ کیونکہ لوگ اس کا نام یہی لیتے ہیں۔ یہاں کے پہاڑوں میں فیروزہ اور لوہے کی کانیں ہیں۔

اگر فرغنہ کے محاصل انصاف سے لئے جائیں تو تین ہزار آدمی اس پر پل سکتے ہیں۔

عمر شیخ مرزا

چونکہ عمر شیخ مرزا بلند ہمت اولوالعزم حکمران تھے۔ اس لئے ملک گیری ہر وقت لاحق رہتی تھی۔ چنانچہ کئی مرتبہ انہوں نے سمرقند پر لشکر کشی کی بعض موقعوں پر انہیں شکست ہوئی اور کبھی وہ قطعی ناکام بھی واپس آئے۔ انہوں نے کئی مرتبہ اپنے خسر یونس[۳۱] خاں کو اپنے پاس آنے کی درخواست کی۔ چنانچہ وہ جب بھی آئے ہر دفعہ کسی نہ کسی جاگیر سے نوازے گئے۔ لیکن انہوں نے عمر شیخ کی مہمات میں کبھی ان کا ساتھ نہ دیا۔ کبھی تو وہ ان کے ساتھ دغا کرنے کے لئے اور کبھی مغل قبائل کی مخالفت کی غرض سے حدود مملکت میں نہیں رہ سکے اس لئے واپس مغلستان چلے جاتے تھے۔ آخری مرتبہ جب عمر شیخ نے انہیں اپنے پاس بلایا تو اس وقت ولایت تاشقند[۳۲] پر جسے کتابوں میں شاش اور کہیں چاچ لکھتے ہیں اور کمان چاچی اسی نسبت سے مشہور ہے، عمر شیخ مرزا کا قبضہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہ ولایت ان کو دے دی اور اسی وقت سے یعنی ۹۰۸ھ (۱۵۰۳ء) سے ولایت تاشقند اور شاہ رخیہ چغتائی خوانین کے تحت تصرف تھیں۔ اس وقت وہاں کے حکمران مغل قبائل کے سردار یونس خاں کا بڑا لڑکا یعنی میرے

۱۲۔ علی شیر نوائی۔ ترکی زبان کا شاعر اعظم جس کا اثر آج بھی ترکی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ ازبکستان کا یہ عظیم شاعر ہے اور اس کے نام پر ایک بہت بڑا میوزیم تاشقند میں ہے اور جگہ جگہ اس کے مجسمے اور تصاویر لگی ہوئی ہیں۔ اس کے خمسہ اور دیوان مشہور ہیں۔ اس کا زمانہ ۸۴۴/۱۴۴۱ سے ۹۰۶/۱۵۰۱ کا ہے۔ بابر آگے چل کر اس کا تفصیلی ذکر کرے گا۔ (دیکھئے ۹۱۱ھ کے حالات)

۱۳۔ خواجہ یوسف اندجانی۔ موسیقار بایسنغر مرزا (۷۹۹/۱۳۹۷ تا ۸۳۷/۱۴۳۳) کا درباری گویا تھا۔ اس کی آواز دلوں کو مسحور کر دیتی تھی۔

بقول مومن:

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

(مومن ایک مطالعہ ص ۳۵)

شاہ رخ نے شیراز سے کئی دفعہ بایسنغر کو یوسف کو بھیجنے کو کہا لیکن بایسنغر کے کان پر جوں نہ رینگی۔ آخر شاہ رخ نے اس کو حاصل کرنے کے لئے ایک لاکھ دینار روانہ کئے۔ اس کے جواب میں بایسنغر نے لکھا

ہم اپنے یوسف کو نہیں بیچتے۔ اپنی کالی چاندی اپنے پاس رکھو

(میر دولت شاہ سمرقندی ص ۳۹۱)

۱۴۔ آشوب چشم اور ورم چشم۔ ایک ہی مرض کے نام ہیں۔ یہ مرض آنکھ دکھ آنے اور اس میں سوجن آنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ (اجمل ص ۹۰) بابر کا کہنا کہ یہ مرض ہوا میں خرابی کی وجہ سے ایک سے دوسرے کو لگتا ہے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وبائی امراض اس زمانے میں معلوم تھے۔ علی بن عباس المجوسی (وفات ۹۹۴ء) ایک ایرانی طبیب نے وبائی امراض ایک رسالے میں بیان کئے ہیں۔ (مین فریڈ اولیمن ص ۸۸)

۱۵۔ چرب۔ آنکھ دکھ کر نہ صرف سرخ ہو جاتی ہے۔ بلکہ سوج بھی جاتی ہے۔ شاید اسی لئے خان خاناں نے یہاں چرب یعنی موٹا (فارسی لغت اسٹائنگیس) کا لفظ استعمال کیا ہے۔

۱۶۔ فرسنگ۔ خان خاناں نے یغاچ کا ترجمہ فرسنگ کیا ہے۔ مختلف ترجموں نے اس فاصلے کی پیمائش میں تھوڑا تھوڑا فرق بتایا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مطابق یہ دونوں چھ کلومیٹر یا چار میل کے برابر ہیں۔ آجکل ایران میں بھی ایک فرسنگ چھ کلومیٹر ہی ہے۔ مارچ ۲۰۰۴ کے میرے سفر ازبکستان میں اندجان سے اوش کا فاصلہ ۵۰ کلومیٹر ہے۔ یعنی ایک یغاچ ۱۲ کلومیٹر (۷.۵ میل) ہوا۔

اندجان میں باغ بابر کا کتب خانہ

دریائے اسفرہ

اوش میں براکوہ کی چوٹی پر نماز گاہ

ماموں سلطان محمود خاں تھے۔ عمر شیخ مرزا کے بڑے بھائی سمرقند کے بادشاہ تھے۔ سلطان احمد مرزا اور مغل قبائل کے سردار سلطان محمود خاں کو عمر شیخ مرزا ایذا پہنچاتے رہتے۔ چنانچہ مذکورہ بالا سال کے دوران دونوں نے مفاہمت (ورق ۶) کر کے سلطان احمد مرزا نے دریائے خجند کی جنوبی جانب سے اور سلطان محمود خاں نے شمال کی جانب سے شیخ عمر مرزا پر حملہ کر دیا۔ اس اثنا میں عجیب واقعہ پیش آیا۔

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ قلعہ اخسی کھائی کے پاس پہاڑی پر ایک بلند مقام پر بنا ہوا ہے۔ اور اس کی عمارات اس کھائی کے کنارے پر تھیں۔ اسی سال پیر کے دن ماہ رمضان کی چار تاریخ کو عمر شیخ مرزا اس کھائی کی بلندی سے کبوتر اور کبوتروں کے کھانچے کے ساتھ گرے اور ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اس وقت ان کی عمر انتالیس سال تھی۔ اس کی ولادت بمقام سمرقند ۸۶۰ھ (۱۴۵۶ء) میں ہوئی تھی۔ وہ سلطان ابوسعید کے چوتھے لڑکے تھے۔ سلطان احمد مرزا، سلطان محمد مرزا اور سلطان محمود مرزا سے چھوٹے تھے۔ سلطان ابوسعید مرزا سلطان محمد مرزا کے لڑکے تھے۔ اور سلطان محمد مرزا میراں شاہ کے فرزند تھے۔ مرزا (میران شاہ) تیمور بیگ کا تیسرا بیٹا تھا۔ جو سن و سال میں عمر شیخ مرزا اور جہانگیر سے چھوٹا تھا اور شاہرخ مرزا سے بڑا۔ سلطان ابوسعید مرزا نے کابل کا علاقہ اول عمر شیخ مرزا کے سپرد کر کے بابائے کابلی کو ان کا اتالیق مقرر کیا اور ان کو اس طرف جانے کی اجازت دی۔ درہ گز تک پہنچے تھے کہ واپس بلا لیا کہ امیر زادگان کی مراسم ختنہ کے جشن[۳۳] میں شرکت کر سکیں۔ ان مراسم کے بعد اس نسبت سے کہ تیمور بیگ نے اپنے بیٹے عمر شیخ مرزا کو ولایت فرغنہ عطا کی تھی ابوسعید مرزا نے ان کو اندجان دیا اور تیمور تاش کو ان کا اتالیق مقرر کر کے اس طرف رخصت کیا۔ عمر شیخ مرزا پستہ قد تھے۔ ریش گرد اور چہرہ ارغوانی۔ بہت ہی کامل الوجود۔ کپڑے بہت چست پہنتے تھے۔ اسی لئے جس وقت وہ کمر پر پٹکا باندھتے تو پیٹ کو اندر کی طرف بھینچ لیتے اور پٹکا کسنے کے بعد وہ خود کو ڈھیلا چھوڑ دیتے۔ اکثر اوقات ان کے ٹیلے کے بند ٹوٹ جاتے۔ وہ کھانے اور پہننے میں بہت بے تکلف تھے۔ اپنی دستار کو چار تہہ دیتے کیونکہ اس زمانے میں یہی چلن تھا۔ ان کی دستار میں کوئی سلوٹ نہ ہوتی۔ اس پر وہ کلغی لگاتے تھے۔ گرمی کے دنوں میں جب دربار نہ ہوتا تو مغلئی ٹوپی پہنتے تھے۔ حنفی مسلک اور خوش گفتار آدمی تھے۔ اور پنج وقتہ نماز بھی ترک نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے تمام قضائے عمری نمازیں تک ادا کر لی تھی۔ بیشتر اوقات کلام مجید کی تلاوت کرتے۔ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار[۳۴] سے بہت عقیدت وارادت تھی۔ انکی صحبت سے وہ بہت زیادہ مشرف و فیضاب ہوئے تھے۔ حضرت خواجہ بھی انہیں اپنا فرزند سمجھتے تھے۔ وہ تحریر روانی سے پڑھ سکتے تھے۔ انھوں نے بہت سی مثنویاں اور تاریخ کی کتابیں پڑھ رکھی تھی۔ شاہنامہ فردوسی اکثر پڑھتے تھے۔ اگر چہ شعر گوئی کے لئے طبیعت موزوں تھی مگر شاعری اور شعرا کی جانب توجہ نہ تھی۔ عدل و انصاف کے معاملے میں نہایت سخت تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب کہ ایک کاروان خطا[۳۵] کی جانب سے آ رہا تھا تو اندجان کے مشرقی پہاڑوں میں اتنی شدید برف باری ہوئی کہ پورا کاروان اس میں دب گیا اور دو آدمیوں کے علاوہ کوئی زندہ نہ بچا۔ جب انہیں اس حادثے کی اطلاع ملی تو انہوں نے فوراً محصل بھیج کر اور اہلیان کارواں کا کل مال و اسباب ضبط کرنے کا حکم دیا۔ اگر چہ اس مال کا کوئی وارث نہ تھا۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے پوری احتیاط سے کل مال کا اندراج کیا اور اس کی پوری طرح نگہداشت بھی کی۔ ایک دو سال کے بعد انہوں نے خراسان اور سمرقند سے مالکوں کے وارثین کو بلایا اور پورا مال بے کم و کاشت ان کے حوالے کر دیا۔

وہ بہت سخی و فراخ دل انسان تھے۔ اور جتنا سخی تھے اتنا ہی خوش خلق و خوش مزاج (ورق ۷) خوش بیان۔ خوش سخن۔ شیریں زبان۔ جری اور دلیر تھے۔ دو مرتبہ بہت سے نوجوانوں کو تہ تیغ کر کے ان کے نرغے میں سے صاف نکل آئے۔ یہ واقعہ ایک مرتبہ دروازہ اخسی میں اور دوسری مرتبہ دروازہ شاہ رخیہ میں پیش آیا۔ اوسط

ایک اور پیمانہ فرسخ شرعی ہے جو فرسنگ سے تھوڑا چھوٹا ہے۔ یعنی ۹ء۵ کلومیٹر کے برابر۔

۱۷۔ سلطان محمود خاں بابر کے بڑے سوتیلے ماموں جن کو شیبانی خاں (نوٹ ۲۰) نے بیوی بچوں سمیت قتل کر دیا تھا۔ لب دریائے خجند ان کی تاریخ (۹۱۴ھ) وفات ہے (تاریخ رشیدی ص ۱۲۰) ان کے بنائے ہوئے ہجرے کا ذکر بابر نے اوش کے بیان میں کیا ہے۔ اب یہ ہجرہ باقی نہیں رہا۔ مرتب نے اپنے سفر کرغیزستان میں اس کو تلاش کیا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

۱۸۔ سمنان۔ شمالی ایران کا ایک شہر جو اب تہران اور مشہد کی ریلوے لائن پر واقع ہے۔ عباسیوں کے عروج (۱۳۱/۹- ۷۴۸) میں ایک گاؤں تھا۔ چوتھی صدی ہجری اور دسویں صدی عیسوی میں بڑھ کر بڑا شہر ہو گیا۔ عمدہ باغات و بہترین کھیتی باڑی یہاں ہوتی تھی۔ یہ صوفی علاؤالدولہ سمانی کی آخری آرام گاہ اور خانقاہ بھی ہے۔ یہ تیموری سلطان شاہ رخ نے تعمیر کی تھی (انسائیکلوپیڈیا اسلام) حدود عالم میں بھی ذکر ہے کہ یہ ایک عمدہ اور سرسبز علاقہ ہے۔ جہاں کے پھل اور علاقوں کے مقابلے میں انتہائی بہترین ہوتے ہیں۔ (ص ۱۳۵)

۹۔ ہدایہ۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب جس کے مصنف شیخ برہان الدین علی ہیں۔ (۵۳۰/۱۱۳۵- ۵۹۳/۱۱۹۷) اس کتاب کا ایک نسخہ اس لائبریری میں محفوظ ہے جو تاشقند میں ہے اور جہاں حضرت عثمان کا کوفی خط میں لکھا قرآن بھی محفوظ ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ فارسی سے انگریزی میں وارن ہیسٹنگز نے چارلس ہیملٹن سے کروایا تھا۔ یہ لندن سے ۱۷۹۱ء میں شائع ہوا اصل کتاب ہدایہ ہے جو برہان الدین کی نظر میں بہت مفصل تھی۔ اس پر خود انہوں نے ہدایہ بطور شرح کے لکھی (انسائیکلوپیڈیا اسلام)۔ رشدان میں اب ان کا مقبرہ بن گیا ہے۔ اس کے علاوہ مرغینان میں ایک باغ ان کے نام پر ہے۔ جہاں باغ کے درمیان ایک گنبد کے نیچے ہدایہ کا ایک پتھر کا ماڈل بطور کھلی کتاب بنا کر رکھا گیا ہے۔

۲۰۔ محمد شیبانی خاں چنگیز کے بیٹے جوچی اور اس کے بیٹے شیبان کی اولاد میں سے تھا ۸۵۵/۱۴۵۱ میں پیدا ہوا اولو العزم شخص تھا۔ بابر کو اس کی وجہ سے بہت پریشانیاں اٹھانا پڑیں سمرقند، ماوراءالنہر، خوارزم اور بلخ اس نے فتح کئے اس کے بعد خراساں اور ہرات سے سلطان حسین مرزا کے بیٹوں کا خاتمہ کیا۔ اس نے جس سلطنت کی بنیاد رکھی اس نے سولھویں صدی میں ماوراءالنہر اور بلخ پر حکومت کی۔ مرو میں شاہ اسماعیل صفوی سے مقابلہ میں ۹۱۶/۱۵۱۰ میں اس کا قتل ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۶۱ سال تھی (تاریخ رشیدی ص ۱۲۶)

درجے کے تیرانداز تھے۔ اس کے گھونسے کی مار بہت سخت تھی۔ چنانچہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ انہوں نے کسی کو گھونسہ مارا ہو اور وہ اس کی ضرب سے گرا نہ ہو۔ ملک گیری کی جو فکر انہیں دامن گیر رہتی تھی اس کی وجہ سے انہوں نے صلح و آشتی، جنگ وجدال، دوستی ودشمنی میں کئی مرتبہ تبدیلیاں کیں۔ ابتدا میں شراب کثرت سے پیا کرتے تھے۔ اور آخری زمانے میں ہفتے میں ایک یا دو بار۔ شعر و سخن کی محفل بھی گرم کرتے خود بھی خوش ذوق تھے چنانچہ جب سخن گوئی پر آتے تو موقع و محل کی مناسبت سے خوب شعر خوانی کرتے۔ معجون (افیون) کا استعمال بہت زیادہ کر دیا تھا۔ چنانچہ جب وہ افیون کی چسکی لگا لیتے تو ان کا دماغ بگڑ جاتا۔ اس وجہ سے جسم پر کئی داغ لگے ہوئے تھے۔ چوسر ہمیشہ کھیلتے کبھی کبھی تو جوئے میں بڑی بڑی رقمیں داؤ پر لگا دیتے تھے۔ انہوں نے تین جنگیں لڑیں پہلی تو دریائے سیحوں کے کنارے قلعہ سیکر تیکو نامی مقام پر یونس خاں سے کی جس میں وہ مغلوب ہو کر گرفتار ہوئے۔ یہ موضع اس نام سے اس بنا پر موسوم ہوا کہ اس جگہ بکرے با آسانی چھلانگ لگا کر دریا پار کر سکتے ہیں۔ یونس خاں نے ان سے بھلائی کا سلوک کیا اور انہیں اپنی ولایت میں جانے کی اجازت دے دی۔ اس ملک کی تاریخ میں یہ جنگ تکہ سیکر تیکو کے نام سے جانی جاتی ہے۔

دوسری جنگ انہوں نے ترکستان میں دریائے اریس کے کنارے ان ازبکوں سے کی جو سمرقند کے گرد و نواح سے تاخت و تاراج کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ انہوں نے یخ بستہ دریائے اریس کو پار کر کے ان ازبکوں کو اچھی طرح شکست دی۔ اور جو مال و اسیر وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے، اس مال اور ان قیدیوں کو ان کے مالکوں کے حوالے کرایا۔ اس معاملے میں انہوں نے ذرا بھی لالچ سے کام نہیں لیا۔ تیسری جنگ انہوں نے سلطان احمد مرزا سے شاہ رخیہ اور اوراتیپہ کے بیچ خواص نامی مقام پر کی جس میں انہیں شکست ہوئی۔ ان کے والد نے اپنی ولایت میں سے فرغنہ ان کو دی تھی۔ تاشقند اور سیرام کی ریاستیں ان کے بڑے بھائی سلطان احمد مرزا نے دی تھیں۔ شاہ رخیہ پر انہوں نے فریب سے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ ولایت کچھ عرصے تک ان کے قبضہ میں رہی۔ آخر میں تاشقند اور شاہ رخیہ کی ریاستیں ان کے ہاتھ سے نکل گئی تھیں۔ بس یہی ولایت فرغنہ۔ خجند اور اوراتیپہ جس کا اصلی نام اسروشنہ اور اسروش ہے، باقی رہ گئی تھیں۔ بعض لوگ خجند کو فرغنہ میں شامل نہیں کرتے۔

جب سلطان احمد مرزا نے تاشقند پہنچ کر مغلوں پر حملہ کیا تو جنگ دریائے چر[۳۶] کے کنارے لڑی گئی۔ جس میں انہوں نے شکست کھائی[۳۷]۔ اوراتیپہ میں حافظ بیگ دولدائی متمکن تھا۔ اس نے یہ ریاست مرزا کو دے دی۔ اس وقت سے اسروشنہ علاقہ عمر شیخ مرزا کے تصرف میں تھا۔

اولادِ عمر شیخ مرزا

ان کے تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ ان کے بیٹوں میں سب سے بڑا بیٹا میں ظہیر الدین محمد بابر ہوں۔ میری والدہ قتلق نگار خانم تھیں۔ ان کا دوسرا بیٹا جہانگیر مرزا تھا۔ جو عمر میں مجھ سے دو سال چھوٹا تھا۔ اس کی والدہ کا نام فاطمہ سلطان تھا۔ جو قوم مغل کے دس ہزاری امیر کی بیٹی تھیں۔ ان کا تیسرا بیٹا ناصر مرزا (ورق ۸) تھا۔ جو عمر میں مجھ سے چار سال چھوٹا تھا۔ اس کی والدہ، حرم، اندجاں کی رہنے والی تھیں جن کا نام امید تھا۔

خان زادہ بیگم

ساری بیٹیوں سے بڑی۔ خان زادہ بیگم میری حقیقی بہن تھیں۔ اور عمر میں مجھ سے پانچ سال بڑی تھیں۔ دوسری مرتبہ سمرقند پر قبضہ کرنے کے لئے جب میں نے حملہ کیا تو اگرچہ سرپل پر مجھے شکست ہوئی لیکن اس کے باوجود میں پانچ ماہ تک قلعے پر قابض رہا۔ جب اطراف وجوانب کے حکمرانوں اور سرداروں سے مجھے کسی قسم کی کوئی مدد نہیں ملی تو مایوس ہو کر میں نے قلعہ خالی کر دیا۔ اور باہر آ گیا۔ اس بھاگ دوڑ میں خانزادہ بیگم محمد شیبانی خاں

۲۱۔ الچہ خاں۔ ان کا پورا نام سلطان احمد خاں تھا۔ یہ بابر کے چھوٹے سوتیلے ماموں تھے۔ شیبانی خاں سے شکست کے بعد مغلستان واپسی پر ان پر فالج کا حملہ ہوا جس سے جانبر نہ ہو سکے اور ۹۰۹/۱۵۰۳ میں انتقال کیا۔ حیدر مرزا دوغلت کے مطابق بہت مذہبی اور دیندار مسلمان تھے (ص ۱۲۳)

۲۲۔ شیخ مصلحت: حضرت شیخ مصلح الدین کا مقبرہ خجند شہر کے عین وسط میں واقعہ ہے۔ آپ کی قبر کے اوپر لکڑی کا عمدہ کام ہے۔ آپ کے برابر کی مسجد نئی اور شاندار بنا دی گئی ہے۔ آپ کا اصلی نام شیخ بدیع الدین نوری ہے اور لقب مصلح الدین آپ کے آباؤ اجداد کا واسطہ دختر امام محمد باقر سے جا ملتا ہے۔ آپ قطب الوقت تھے۔ آپ کا انتقال ۶۱۶/۱۲۱۹ میں ہوا۔ آپ کے مزار کے احاطے میں مسجد کے برابر ایک کمرے میں آپ کی تاریخ وفات دیوار پر کندہ ہے۔ آپ غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کے مرید تھے۔ امیر تیمور نے ۱۳۹۰/۸۹۰ میں یہاں کی زیارت کی اور دس ہزار دینار مقبرے کی درستی اور مرمت کے لئے دیئے (امیر تیمور ان ورلڈ ہسٹری ص ۶۱) بابر یہاں ۹۰۳/۱۴۹۷ میں رہا تھا۔ نذیر جان کے مطابق آپکو پیرم پادشاہ مردولی بھی کہا جاتا تھا آپ نے چنگیز خان کے لشکر کے قتل عام سے خجندیوں کو بچانے میں کردار ادا کیا تھا (تیمور ملک ص ۳۳)۔ آپ پر کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی اسکا نام مناقب ہے، یہ مخطوطے کی شکل میں ہے۔ (یہولو، دستاویزات تاجکستان سائنس اکیڈمی، پی ایچ ۷۔ مذکور از نذیر جان ص ۲۹۲)

۲۳۔ مولانا کمال خجندی: فارسی شاعر تھے شیخ الاسلام بھی ہوئے لیکن علماء پر تنقید جاری رکھی اور قصیدوں سے اجتناب کیا (انسائیکلوپیڈیا اوف اسلام) مولانا جامی نے نفحات الانس میں تحریر کیا ہے کہ کمال خجندی بڑے درویش تھے انکا کلام اپنی درویش صفتی پر پردہ ڈالنے اور روحانی درجات کو کم ظاہر کرنے کے لئے تھا کمال خجندی خواجہ عبید اللہ نامی بزرگ کے معتقدین میں سے تھے۔ کمال خجندی اوائل عمر میں تبریز چلے گئے تھے اور وہیں بس گئے وہ ان کو پسند بھی تھا۔ جلائیر سلطان اویس (۷۷۶/۱۳۷۴ سے ۷۸۴/۱۳۸۲) نے ان کو بہت مراعات دیں تھی اور ایک خانقاہ بھی بنا کر دی تھی مولانا جامی کہتے ہیں کہ ان کے انتقال کے بعد جب حجرے میں داخل ہوئے تو صرف ایک چٹائی تھی۔ جس پر وہ سوتے اور بیٹھتے تھے اور ایک پتھر جس کو وہ تکیے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ تبریز میں اپنی علمیت کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے۔ ۷۸۷/۱۳۸۵ میں توقتمش خاں نے تبریز کو برباد کر کے کمال

کے ہتھے چڑھ گئیں۔اس نے ان سے نکاح کر لیا[38] چنانچہ خرم شاہ نامی لڑکا ان ہی کے بطن سے پیدا ہوا۔ بڑا ہی قبول صورت پیارا بچہ تھا۔اس کے باپ نے ولایت بلخ اس کے نام کر دی تھی۔ باپ کی وفات کے ایک دو سال بعد وہ بھی واصل بحق ہوا۔شاہ اسمٰعیل[39] نے جب مرو پر قبضہ کرنے کے لئے حملہ کیا تو اس وقت خانزادہ بیگم وہیں تھیں۔ میری خاطر شاہ اسمٰعیل میری بہن کے ساتھ خوش اسلوبی سے پیش آیا۔اور عزت واحترام کے ساتھ اس نے میری بہن کو میرے پاس بھیج دیا۔دس سال کی جدائی کے بعد میری ان سے قندوز میں ملاقات ہوئی۔ جب مجھے اور محمد کوکلتاش کو ان کے آنے کی اطلاع ملی تو ہم دوڑے دوڑے گئے ان کے پاس پہنچے۔خانزادہ بیگم اور ان کے ہمراہ جو لوگ تھے۔انہوں نے ہمیں نہیں پہچانا۔جب میں نے انہیں بتایا تو تھوڑی دیر بعد وہ مجھے پہچان گئیں۔

دوسری لڑکی مہر بانو تھیں۔وہ اور ناصر مرزا ایک ہی ماں سے پیدا ہوئے تھے۔وہ مجھ سے عمر میں دو سال چھوٹی تھیں۔ایک شہر بانو بیگم۔ناصر مرزا کی دوسری سگی بہن مجھ سے آٹھ برس چھوٹی تھیں۔ایک اور لڑکی یادگار سلطان بیگم تھیں۔ان کی والدہ کا نام آغا سلطان تھا۔یہ حرم تھیں۔ان کے بعد اگلی لڑکی رقیہ سلطان بیگم مخدوم سلطان بیگم کے بطن سے تھیں۔جنہیں لوگ قرا کوز بیگم کہتے ہیں۔آخری دو کی پیدائش مرزا کے انتقال کے بعد ہوئی تھی۔

یادگار سلطان بیگم کی سرپرستی میری نانی ایسن دولت بیگم[40] نے قبول کر لی تھی۔جس وقت شیبانی خاں نے اخسی و اندجان پر قبضہ کیا تو اس وقت یادگار سلطان بیگم حمزہ سلطان کے لڑکے عبداللطیف کی منظور نظر ہوئیں۔جس وقت ختلان میں حمزہ سلطان اور دیگر سلاطین پر میں نے حملہ کر کے حصار فتح کیا۔اس کے بعد یادگار سلطان بیگم میرے پاس آئیں اور میرے ہمراہ ہوگئیں۔میرے فرصت کے زمانے میں رقیہ سلطان بیگم پر جانی بیگ سلطان کی نظر پڑ گئی۔ایک دو لڑکے اس سے پیدا ہوئے جو زندہ نہیں رہے اسی زمانے میں اطلاع ملی کہ وہ واصل بحق ہوئیں۔

ننھیال

(عمر شیخ مرزا کی بیوی اور میری ماں) قتلق نگار خانم تھیں۔جو یونس خاں کی دوسری بیٹی تھیں۔اور سلطان محمود خاں و سلطان احمد خاں کی بڑی بہن۔یونس خاں، چغتائی خاں کی نسل سے ہیں۔جو چنگیز خاں کے دوسرے بیٹے تھے۔ان کا سلسلہ نسب اس طرح ہے یونس خاں ابن ویس خاں ابن شیر علی اوغلاں ابن محمد خاں ابن خواجہ خضر خاں ابن تغلق تیمور خاں ابن ایسن بوغا خاں ابن دوا خاں ابن براق خاں ابن یسون توا ابن چغتائی خاں ابن چنگیز خاں،اب جب کے یہ ذکر نکل ہی آیا ہے تو اس ضمن میں یہاں مختصر طور پر خوانین کے حالات بیان کرنا مناسب ہو گا۔یونس خاں و ایسن بوغا خاں، ویس خاں کے لڑکے تھے یونس خاں کی والدہ کا وطن ترکستان تھا وہ شیخ نور الدین بیگ کی بیٹی یا پوتی تھیں جن کا شمار قپچاق کے امرا میں ہوتا تھا اور تیمور بیگ کی ان پر نظر عنایت تھی۔ویس خاں کی وفات کے بعد مغل قبیلہ دو گروہوں میں تقسیم ہوگیا۔ان میں سے بعض تو یونس خاں کی طرف ہوگئے اور بیشتر (ورق ۹) ایس بوغا خاں کی جانب چلے گئے۔اس سے قبل یونس خاں کی بڑی بہن کی شادی الغ بیگ مرزا نے اپنے بیٹے عبدالعزیز مرزا سے کر دی تھی اس موقع پر ایرزان، بارین قبیلے کا ایک دس ہزاری امیر اور میرک ترکمان قبیلہ چراس کا ایک دس ہزاری امیر یونس خاں کو اور قبیلہ مغل میں سے چار ہزار افراد کو ہمراہ لے کر الغ بیگ مرزا[41] کے سامنے حاضر ہوئے تاکہ ان سے مدد لے کر دوسری مرتبہ قبیلہ مغل کو مطیع کر لیں مگر مرزا نے انتہائی بے مروتی سے کام لیا۔اس نے بعض کو تو قید کر لیا اور بعض کو مختلف ولایتوں میں منتشر کر دیا۔چنانچہ ایرزان کی تباہی[42] مغل قبیلے میں تاریخ بن گئی خاں کو عراق کی جانب روانہ کر دیا چنانچہ ایک سال سے زیادہ مدت تک وہ تبریز میں رہا۔اس وقت وہاں کا کا فرمانروا جہاں شاہ بارانی قراقو ینلو تھا۔وہاں سے وہ شیراز گیا جہاں مرزا شاہرخ کا دوسرا بیٹا ابراہیم مرزا

خجندی کو اپنے ساتھ لیا اور سرائے لے گیا۔جہاں وہ چار سال رہے اس کے بعد تبریز واپس آگئے جہاں ان کا انتقال ۸۰۳/۱۴۰۰ میں ہوا۔ان کی قبر پر یہ کتبہ درج ہے۔(ص ۸۰۹)

کمال از کعبہ رفتی بر در یار
ہزارت آفریں مردانہ رفتی

مولانا کا مشہور شعر ہے۔

این چہ مجلس بهت این چہ مقامست اینجا
عمر باقی لب ساقی لب جامست اینجا

(ای جی براؤن۔لیٹریری ہسٹری اوف پرشیا کیمرج 1951 جلد ۳ ص ۳۴۱)

کمال خجندی کا ایک مجسمہ خجند شہر کی بڑی شاہراہ پر لگا ہوا ہے اس کے سامنے زمین پر ایک نقشہ بنایا گیا ہے جس میں ان مقامات کی نشاندہی ہے جہاں کا سفر انہوں نے کیا۔

۲۴۔ہرمز۔بندرگاہ جو ایران کے جنوب میں خلیج فارس میں واقع تھی۔کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی جب شاہ رخ کے سفیر کی حیثیت سے ۱۴۴۲ء میں ہندوستان کے سفر پر روانہ ہوئے تو وہ دو مہینے یہاں ٹھہرے انہوں نے لکھا ہے کہ اس بندرگاہ کے مقابلے پر دنیا میں کوئی اور بندرگاہ نہیں۔مسافر دنیا جہاں سے یہاں آتے ہیں اور مختلف اقسام کی اشیا کی خرید و فروخت اور عشر یہاں ہوتا ہے۔ہر چیز آسانی سے بغیر زیادہ تلاش کے مل جاتی ہے۔دنیا کے مختلف مذاہب کے لوگ کافروں کو ملا کر یہاں بے شمار ہیں۔لیکن سب کے ساتھ برابری کا سلوک ہوتا ہے۔اس لئے اس بندرگاہ کو دار الاماں کہا جاتا ہے۔(ھیکسٹن۔ایم ۶۹)

۲۵۔ہادرویش۔مددے درویش۔یہ بیابان اب موجود نہیں ہے۔دریائے سیر پر ایک بند باندھا گیا ہے۔جس کو قراقرم کہتے ہیں۔اس کی وجہ سے ہر جگہ پانی پہنچ گیا ہے۔اور خجند سے کند بادام تک سڑک کے دونوں طرف کھیت اور پھلوں کے باغات ہیں۔یہاں اب وہ ہوا بھی نہیں چلتی جس کا بابر نے ذکر کیا ہے۔خجند سے کند بادام تک ہم نے گاڑی روک کر ہوا کا جائزہ لیا۔خنک باد صبا تو ضرور تھی۔لیکن ہوا کے جھکڑوں کا اب خاتمہ ہوگیا ہے۔

۲۶۔اثیر الدین اخسیکتی۔فارسی کے شاعر تھے۔چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی میں خراساں میں جان و مال محفوظ نہیں تھا۔اس لئے یہ مغرب کی طرف ہجرت کر گئے۔اور ۵۷۰/۱۱۷۴ میں سلجوق سلطان ارسلان کے دربار میں اپنے جوہر دکھاتے تھے۔(انسائیکلو پیڈیا اسلام)

حکمران تھا۔ پانچ چھ مہینے کے بعد ابراہیم مرزا کا انتقال سل ہوگیا۔ اور اس کی جگہ اس کا بیٹا عبداللہ مرزا تخت نشین ہوا۔ خاں نے اس کی حاکمیت کو قبول کرلیا اور اس کی ولایات میں ۱۷، ۱۸ سال مقیم رہا۔ جس وقت الغ بیگ مرزا اور اس کے لڑکوں کے درمیان تنازع پیدا ہوا تو ایسن بوغا خاں نے موقع پا کر فرغنہ پر حملہ کر کے کند بادام تک تاراج کردیا وہاں کے تمام لوگوں کو قید کرلیا۔ جب سلطان ابوسعید مرزا نے تخت سلطنت حاصل کیا۔ تو اس نے لشکر کشی کر کے یانگی کے اس پار مغلستان میں اشپرہ کے مقام پر ایسن بوغا کو مکمل طور پر مغلوب کرلیا۔ اس (ایسن بوغا) کے فتنے کو رفع دفع کرنے کی غرض سے سلطان ابوسعید مرزا نے یونس خاں کو اس بنا پر کہ عبدالعزیز مرزا نے یونس خاں کی بہن سے نکاح کیا ہوا تھا عراق سے اپنے پاس آنے کی دعوت دی اور ضیافت کا اہتمام کر کے دوستی کا عہدہ و پیمان کرلیا اور مغل قبائل و خاں کے درمیان صلح و آشتی کرا کے انہیں رخصت کیا۔ اس وقت ساغریچی کے تمام دس ہزاری امرا ایسن بوغا خاں سے ناراض ہو کر مغلستان چلے گئے چنانچہ یونس خاں ان کے پاس گیا۔ اس وقت ساغریچی کے امرا میں شیر حاجی بیگ سب سے بڑا امیر تھا۔ یونس خاں نے اس کی بیٹی ایسن دولت بیگم سے شادی کرلی اور مغل دستور کے مطابق اس (حاجی شیر بیگ) نے یونس خاں اور ایسن دولت بیگم کو سفید نمدے پر بٹھا کر یونس خاں کو اپنا سردار تسلیم کرلیا۔ ایسن دولت بیگم کے بطن سے خاں کے گھر میں تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔

مہر نگار خانم

ان میں سب سے بڑی مہر نگار خانم تھی۔ جس سے سلطان ابوسعید مرزا نے اپنے لڑکے سلطان احمد مرزا کی شادی کی۔ مرزا سے اس کے ہاں کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی۔ اس کے بعد اس وقت جب کہ شیبانی خاں معطل و سرگرداں تھا۔ وہ اس کے تحت تصرف آگئیں۔ جس وقت میں کابل پہنچا تو انہوں نے شاہ بیگم کے ساتھ خراسان کی جانب رخ کیا، جہاں سے وہ کابل پہنچیں۔ جس وقت شیبانی خاں نے قندہار میں ناصر مرزا کا مقابلہ کیا تو میں نے لمغان کی جانب جانے کا ارادہ کیا۔ خاں مرزا، شاہ بیگم اور مہر نگار خانم نے بدخشاں کی جانب رخ کیا۔ جس وقت مبارک شاہ نے خان مرزا کو قلعہ ظفر میں طلب کیا تھا اس وقت راستے میں لٹیرے ابا بکر کاشغری سے اس کا مقابلہ ہوگیا۔ شاہ بیگم مہر نگار خانم اور دیگر تمام افراد کے اہل و عیال قید کرلئے گئے۔ چنانچہ اس بدکردار ظالم کی قید میں ہی انہوں نے اس دار فانی سے عالم بقا کی جانب کوچ کیا۔

قتلق نگار خانم:

دوسری بیٹی میری والدہ قتلق نگار خانم تھیں۔ وہ اکثر یورشوں اور زمانہ سرگردانی و تعطلی میں (ورق ۱۰) میرے ساتھ رہیں۔ جب میں نے کابل فتح کرلیا تو اس کے پانچ چھ سال بعد ۹۱۱ھ (۱۵۰۵ء) میں وہ واصل بحق ہوگئیں۔

خوب نگار خانم:

تیسری بیٹی خوب نگار خانم تھیں جن کی شادی محمد حسین گورگان دوغلت سے ہوئی تھی، جن کے بطن سے ایک لڑکی اور ایک لڑکے کی ولادت ہوئی۔ لڑکی سے عبید خاں نے شادی کرلی۔ جس وقت میں نے سمرقند اور بخارا پر فتح پائی تو وہ لڑکی وہیں تھی۔ کیونکہ وہ بھاگ نہ سکی اس لئے وہیں رہ گئی۔ اور جب اس کا چچا سید محمد مرزا دوغلت سلطان سعید خاں کا ایلچی بن کر میرے پاس سمرقند آیا تو وہ اس کے ہمراہ کاشغر چلی گئی جہاں سلطان سعید خاں سے اسکی شادی ہوگئی۔ خوب نگار خانم کا بیٹا حیدر مرزا[۴۳] تھا جب اس کے باپ کو ازبکوں نے قتل کردیا تو وہ میرے پاس آیا اور تین چار سال تک میرے ساتھ رہا اس کے بعد اس نے مجھ سے رخصت لی اور خاں کے پاس کاشغر چلا گیا۔

۲۷۔ اخسی۔ اب تو ایک مٹی کا ڈھیر ہے۔ دریائے سیر کے شمالی کنارے پر اس کے کھنڈر بیچ میں سڑک بن جانے سے دو حصوں میں تقسیم ہوگئے ہیں۔ قلعہ کچی دیوار اور اینٹیں کہیں کہیں نظر آتی ہیں۔ جگہ جگہ مٹی کے برتن کے ٹکڑے بھی ملتے ہیں۔ دریا سیر کی وجہ سے کسی قسم کی بربادی یا آس پاس علاقے میں خشک سالی کے کوئی آثار نہیں چاروں طرف کھیت و درخت موجود ہیں۔ اس علاقے میں زلزلے کافی آتے رہتے ہیں۔ شاید اس وجہ سے بربادی ہوئی۔

۲۸۔ غالباً درخت گاؤں سے دور واقع ہوئے ہیں۔

۲۹۔ پوستین پیش برہ: پوستین بھیڑ کے کوٹ کو کہتے ہیں۔ اس پر جو بیل بوٹے بنائے یا کاڑھے جاتے ہیں۔ اس کی مثال دی ہے۔ جیسے کوٹ کی سجاوٹ

۳۰۔ یبروح الصنم اور مہر گیاہ۔ دونوں ایک ہی پودے کے نام ہیں۔ پہلا عربی ہے اور دوسرا فارسی۔ یہ دوا، خواب آور و قہ آور ہے۔ اس کا استعمال جوڑوں کے درد، دیوانہ پن اور عرق النساء میں بھی ہوتا ہے۔ اس پودے کو اُگانے اور دوا کو بنانے کے عجیب و غریب طریقے زمانہ وسطیٰ میں رائج تھے۔ جواب ترک کر دیئے گئے ہیں۔ (اسلامک میڈیسن ص ۱۰۹)

۳۱۔ یونس خاں۔ چنگیز خاں کے دوسرے بیٹے چغتائی کی اولاد اور مغلوں میں سردار قبیلے اور اس وقت وہاں کے فرماں روا اور رشتے میں میرے نانا تھے۔ (بابر)

۳۲۔ تاشقند۔ اب یہ ازبکستان کا دارالحکومت ہے۔ چاچ اور شاش اس کے پرانے نام ہیں۔ کمان چاچی یہاں کی مشہور کمان ہے۔ جس کی مانگ چاروں طرف تھی۔ (نذیر جان۔ تیمور ملک ص ۳۳۰)

۳۳۔ ختنہ کا جشن۔ ابوسعید مرزا (بابر کے دادا) کے ہاں ۸۷۰ھ میں بایسنغر مرزا کی پیدائش ہوئی۔ اس کی خوشی اور دوسرے مرزا زادگان کا جشن ایک ساتھ منایا گیا۔ باغ زغان کو سجایا گیا۔ بڑے محراب و در بنا کر سجائے گے ماہر دستکاروں نے اپنے اپنے فن کے مظاہرے کئے۔ جس میں سب سے مشہور خواجہ علی ارزگان تھے جو اصفہان سے آئے اور شیشے پر نقاشی کے لاجواب نمونے پیش کئے۔ اس کے علاوہ بے شمار دعوتیں اور محفلیں سجائی گئیں۔ یہ جشن شوال سے ذوالحجہ تک جاری رہا۔ اور ۵ ذوالحجہ کو ایک بڑی دعوت اور ختنہ کی رسم کے بعد ختم ہوا (خواند امیر ص ۸۴)

۳۴۔ خواجہ عبیداللہ احرار۔ صوفی سلسلہ نقشبندیہ کے علم بردار۔ نقشبندیہ سلسلہ میں خانقاہیں نہیں ہوتیں اور ان کا ایک اصول

اندجان کے باغ بابر پر سیف الدین جلیل، ذاکر جان مشرب مولف اور ترجمان

اخسی کے کھنڈرات

اخسی کے کھنڈرات سے سیر دریا اور کھیت کا منظر

باز گردد باصل خود همه چیز
زر مانی نقره وارزیز

(کھراسونا، چاندی اور قلعی ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے)

کہا جاتا ہے کہ اس نے اب توبہ کرلی ہے۔ خوش خطی، تصویر کشی، تیر و پیکان اور زہ گیر سازی[۴۴] میں اسے مہارت ہے۔ طبع موزوں ہے۔ اس کی درخواست میرے پاس پہنچی تھی۔ انشا نگاری بھی بری نہیں[۴۵]

شاہ بیگم:

یونس خاں کی دوسری بیوی شاہ بدخشاں شاہ سلطان محمد کی بیٹی شاہ بیگم تھی اگرچہ اس کی بیویاں تو اور بھی تھی مگر اولاد شاہ بیگم اور ایسن دولت بیگم سے ہی ہوئی شاہ بدخشاں نے اپنا سلسلہ نسب سکندر فیلقوس تک پہنچایا تھا کہا جاتا ہے کہ اسی شاہ کی دوسری بیٹی سے جو شاہ بیگم کی بڑی بہن تھی سلطان ابوسعید مرزا نے شادی کی تھی اور ابا بکر مرزا کی ولادت اسی کے بطن سے ہوئی تھی۔ شاہ بیگم کے بطن سے خاں کے دو لڑکوں اور دو لڑکیوں کی ولادت ہوئی تھی۔ سلطان محمود خاں ان تینوں سے بڑا اور ان تین لڑکیوں مہر، قتلق اور خوب نگار خانم سے چھوٹا تھا جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ سمرقند اور اس کے گردونواح میں بعض جگہ اسے خانیکہ خاں کہتے ہیں سلطان محمود خاں سے چھوٹا سلطان احمد خاں تھا جو الچہ خاں کے لقب سے مشہور تھا۔ الچہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ قلماقی اور مغل زبانوں میں الاچی اس شخص کو کہتے ہیں جو قاتل ہو۔ اور چونکہ قوم قلماق کو کئی مرتبہ فتح کرکے اس نے وہاں کے لوگوں کو قتل کیا تھا۔ اسی لئے اس کو الاچی کہا جاتا تھا جو کثرت استعمال سے الچہ ہوگیا۔ چنانچہ ان خاں سرداروں کا ذکر مناسب جگہ پر کیا جائے گا۔ اور ان کی واقعات وحالات کا ذکر بھی ساتھ ہی ہوگا۔

سلطان نگار خانم:

سلطان نگار دونوں لڑکوں سے چھوٹی اور ایک لڑکی سے بڑی تھی ان کی شادی سلطان محمود مرزا ابن ابوسعید مرزا سے ہوئی ان کے بطن سے مرزا کے گھر میں ایک لڑکے کی ولادت ہوئی تھی جس کا نام سلطان ویس تھا اس ذکر آگے کیا جائے گا۔ سلطان محمود کی وفات کے بعد سلطان نگار خانم اپنے لڑکے کو لے کر اور اس کی اطلاع کسی کو دیئے بغیر اپنے بھائی کے پاس چلی گئی۔ چند سال بعد انکی شادی ادیک سلطان سے ہوگئی ادیک سلطان کا شمار قزاق سلاطین میں ہوتا تھا جو چنگیز خاں کے بڑے لڑکے جوچی خاں کی نسل سے تھا[۴۷] جس وقت شیبانی خاں نے خوانین کو زیر کرکے تاشقند اور شاہ رخیہ پر قبضہ کرلیا تو وہ دس بارہ مغل ملازمین کے ساتھ فرار ہوکر ادیک سلطان کے پاس (ورق ۱۱) پہنچیں۔ ادیک سلطان سے ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے ایک تو انہوں نے شیبانی کے سلاطین میں سے ایک کو دے دی اور دوسری سلطان سعید خاں کے لڑکے رشید سلطان سے بیاہ دی۔ ادیک سلطان کے انتقال کے بعد قزاق قبیلے کے سردار قاسم خاں نے ان سے نکاح کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ قزاق قبیلے کے خوانین و سلاطین میں سے کسی شخص نے بھی قبیلے کو قاسم خاں کی طرح منظم نہیں کیا۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ اس کی فوج تین ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ جب قاسم خاں کا انتقال ہوگیا تو خانم سلطان سعید خاں کے پاس کاشغر آگئی۔

دولت سلطان خانم

دولت سلطان خانم سب سے چھوٹی تھی جو تاشقند کی تباہی میں شیبانی کے لڑکے تیمور سلطان کے نکاح میں آئی۔ اس سے ایک لڑکی کی ولادت ہوئی تھی وہ دونوں میرے ساتھ سمرقند آئیں اور تین چار سال بدخشان میں رہیں اس کے بعد وہ سعید خاں کے پاس کاشغر چلی گئیں۔

زندگی خلوت در انجمن ہے۔ آپ رمضان ۸۰۶/۱۴۰۴ میں باغستان گاؤں میں پیدا ہوئے جو آجکل تاشقند کے تحت ہے آپ کے والد محمد بغداد سے تشریف لائے تھے۔ اور ماں کا تعلق شیخ طہور سے تھا۔ جو باغستان کے ہی رہنے والے تھے۔

ابتدائی تعلیم تاشقند میں ہی حاصل کی پھر اپنے چچا خواجہ ابراہیم کے ساتھ سمرقند آئے، ہرات گئے اور حصار پہنچ کر نقشبندیہ طریقے کی تعلیم مولانا یعقوب چرخی سے حاصل کی جو خواجہ بہاء الدین کے خلیفہ تھے۔ ابوسعید مرزا کے زمانے میں ۸۵۵/۵۲۔۱۴۵۱ میں سمرقند میں بس گئے۔ ابوسعید مرزا اور ان کی اولاد پر ان کا گہرا اثر تھا۔ ان کے کہنے پر ابوسعید نے شریعت نافذ کی تھی اور دوسرے ٹیکس معاف کردیے تھے۔ یہ اپنے زمانے میں بہت مالدار تھے۔ اور لامحدود جائداد کے مالک۔ ابوسعید ہر کام ان سے پوچھ کر کرتا تھا۔ ان کا انتقال ۸۹۵/۱۴۹۰ میں کاموگراں گاؤں میں ہوا اور دفن محلہ کفش کے قبرستان میں جو اب خواجہ احرار کے نام سے مشہور ہے۔ خواجہ کی تصنیف میں فقرات العارفین، رسالہ والدیہ اور رسالہ خواریہ ہیں۔ بابر خود ان کا بہت معتقد تھا اور کئی جگہ ان کا ذکر بھی کیا ہے۔

خواجہ پر ایک کتاب رشحات عین الحیات فخر الدین علی صفی سبزواری نے ۹۰۹/ ۱۵۳۴ میں لکھی۔ مصنف نے ذوالقعدہ ۸۸۹/ ۱۴۸۴ اور ربیع الثانی ۸۹۳/۱۴۸۸ کو خواجہ سے ملاقات میں تحریر کی۔ اس میں خواجہ کے اجداد، زندگی، تعلیمات، کرامات اور ان کے شاگردوں کا ذکر ہے۔ (براؤن ج ۳ ص ۴۴۱) اب خواجہ پر ایک کتاب احوال و سخنان کے عنوان سے فارسی میں عارف نوشاہی صاحب کی ادارت میں شائع ہوگئی ہے۔ (۱۳۸۰) نقشبندیہ کا یہ سلسلہ خواجہ بہاء الدین نقشبند کے نام پر ہے جن کا مزار بخارا سے ۱۵ کلومیٹر پہلے ہے۔ ان کا انتقال ۷۹۲/۱۳۸۹ میں ہوا۔ ان کا مزار مرجع خلائق ہے۔ اس سے پہلے یہ سلسلہ خواجگان کہلاتا تھا۔ اور اس کی ابتدا شیخ یوسف ہمدانی (انتقال ۵۵۳/ ۱۱۴۰ سے ہوئی تھی۔ ریاض السلام ص ۱۲۴ صوفی ازم ان ساؤتھ ایشیا)

۳۵۔ خطا۔ شمالی چین کا پرانا نام جو منگولوں کے زمانے سے چلا آرہا ہے۔ ولایت نے اس کو بگاڑ کر کیتھے کردیا۔

۳۶۔ دریائے چر۔ تاشقند کے پاس سے گزر کر دریائے سیر میں مل جاتا ہے۔ اب اس کا نام دریائے چرچیک ہے۔

۳۷۔ یہ جنگ ۸۹۳/۱۴۸۸ میں ہوئی تھی۔ سلطان احمد مرزا کے مقابل سلطان محمود خاں تھے۔
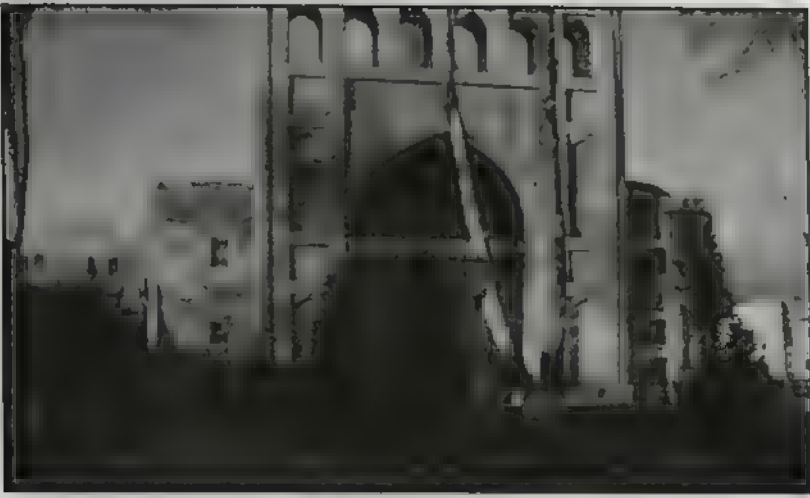
بابر کے نانا یونس خاں کا مقبرہ تاشقند میں

مولف بابر کی نئی بنائی ہوئی حویلی اندجان میں

شیخ مصلح الدین کا مرقد خجند میں

بقیہ ازواج وحرم عمر شیخ مرزا:

عمر شیخ مرزا کی دیگر حرمات میں سے ایک خواجہ حسین کی لڑکی الوس آغا تھی۔ اس کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا چھوٹی عمر میں انتقال ہو گیا۔ ڈیڑھ سال بعد انہوں نے اس کو چھوڑ دیا۔ ایک اور بیوی فاطمہ سلطان آغا تھیں، جس کا شمار مغل قبیلے کے دس ہزاری امرا کی نسل سے ہوتا تھا (عمر شیخ) مرزا نے سب سے پہلے ان سے شادی کی تھی۔ ایک اور بیوی قرا کوز بیگم تھیں جن سے احزان میں شادی ہوئی تھی، بڑی پیاری سی بی بی تھیں۔ مرزا کو خوش کرنے کے لئے اپنا سلسلہ نسب سلطان ابوسعید مرزا کے بڑے بھائی منوچہر مرزا سے ملاتی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی مرزا کی دیگر ازواج تھیں۔ جن میں سے ایک امید آغاچہ تھیں ان کا انتقال مرزا کی وفات سے پہلے ہی ہو گیا تھا دوسری تون سلطان تھیں جو مرزا کے آخری عہد تک زندہ رہیں وہ مغل نسل سے تھیں۔ ایک اور آغا سلطان تھی۔

امرا

خدائی بردی تیمورتاش:

ان کے امرا میں ایک خدائی بردی تیمورتاش تھا، وہ حاکم ہرات آق بوغائی بیگ کے بڑے بھائی کی نسل سے تھا۔ جس وقت سلطان ابوسعید مرزا نے جوکی مرزا کا شاہ رخیہ میں محاصرہ کر رکھا تھا اس وقت اس نے ولایت فرغنہ عمر شیخ مرزا کو عطا کر کے اسے خدائی بردی تیمورتاش کی سرپرستی میں دے دیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر پچیس سال تھی، اگرچہ ابھی عمر زیادہ نہ تھی لیکن اس کا قاعدہ وقانون اور نظم ونسق بہت عمدہ تھا۔ ایک دو سال بعد جب کہ اس وقت ابراہیم بیگ چک نے اوش کے نواح پر حملہ کیا تو خدائی بردی تیمورتاش نے اس کا تعاقب کر کے جنگ کی جس میں اسے شکست ہوئی اور شہادت نصیب ہوئی۔ اس وقت سلطان احمد مرزا ایلاق اور اتیپہ میں صحت افزا مقام پر تھا جو سمرقند سے اٹھارہ فرسنگ کے فاصلے پر مشرقی جانب واقع اور آق قیغائی کے نام سے مشہور ہے سلطان ابوسعید مرزا بابا خاکی میں تھا یہ جگہ ہرات سے بارہ فرسنگ کی دوری پر مشرقی جانب ہے۔ اس خبر کو عبدالوہاب شغاول کے ذریعے پہنچا کر مرزا کو دوڑایا۔ چنانچہ مرزا نے ایک سو ستائیس فرسنگ کے فاصلے کو چار دن میں طے کیا۔

حافظ محمد بیگ دولدائی:

ان میں سے ایک اور سلطان ملک کاشغری کا بیٹا اور احمد حاجی بیگ کا چھوٹا بھائی حافظ محمد بیگ دولدائی تھا۔ خدائی بردی بیگ کی وفات کے بعد اسے اندرون خانہ امور کا مختار بنا کر بھیجا گیا تھا (ورق ۱۲) سلطان ابوسعید مرزا کی وفات کے بعد چونکہ اندجان کے امرا کے ساتھ اس کی ہمنشینی سازگار نہ رہی اس لئے وہ سلطان احمد مرزا کے پاس سمرقند چلا گیا۔ جس وقت سلطان احمد مرزا کی شکست کی خبر عمر شیخ مرزا کے پاس پہنچی وہ اس وقت اوراتیپہ کا فرمانروا تھا۔ اور جب عمر شیخ مرزا سمرقند کی تسخیر کے ارادے سے اس طرف پہنچے تو اس نے مرزا کی ملازمت اختیار کر لی۔ مرزا نے بھی اندجان کی حکومت اس کی تحویل میں دے دی۔ آخر میں وہ سلطان محمود خاں کے پاس چلا گیا۔ خاں نے مرزا خاں کو اس کے سپرد کر دیا۔ اور دیرک کا علاقہ اسے دے دیا۔ میرے کابل پر قبضہ کرنے سے پہل اس نے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا اور مشہد کی راہ سے اس طرف روانہ ہوا مگر راستے میں ہی واصل بحق ہوا کم سخن، نادار اور بے حیثیت انسان تھا۔

خواجہ حسین بیگ

خوش مزاج اور سیدھا سادہ آدمی تھا۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق میخواری کے وقت تو یوق جو مغلی نغمے کی ایک قسم ہے، خوب گاتا تھا۔

۳۸۔ بابر کو دشمن سے یہ رشتہ ظاہر ہے پسند نہیں تھا۔ اس لئے اس پیرائے میں ذکر کیا ہے۔ یہ بابر کی ایک ہی سگی اور پانچ سال بڑی بہن تھی۔ حیدر مرزا دوغلت کہتے ہیں کہ ایک معاہدہ ہوا تھا۔ (ص ۱۷۵) گلبدن بیگم کہتی ہیں۔ کہ مجبوری تھی۔ (ورق ۳) اور محمد صالح تو یہاں تک جاتے ہیں۔ کہ دونوں کے درمیان محبت تھی۔ (بیورج ص ۱۸ انوٹ ۲) ان سب بیانات کا موازانہ کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ بہن نے سترہ سالہ بھائی کو جو پانچ مہینے سے سمرقند میں محصور تھا، بچانے کے لئے خود ہی قربانی دی۔ دونوں بہن بھائی کے قرب کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی بعید نہیں تھا۔ بابر خود ۹۰۷ھ کے بیان میں کہتا ہے۔ کہ شیبانی خاں سے معاہدہ کے بعد اس نے سمرقند چھوڑا۔

۳۹۔ شاہ اسمٰعیل صفوی۔ شاہ ایران ۱۴۹۹/۹۰۵ میں ایران میں صفوی حکومت کی بنیاد رکھی۔ قزلباش ترکمانوں کو ساتھ ملا کر پورے ایران کو فتح کیا۔ یہ اثنا عشری حکومت دوسنیوں، عثمانیوں اور ازبکوں کے درمیان قائم ہوئی۔ بابر نے اس کے ساتھ مل کر ماوراءالنہر کو فتح کرنے کی کوشش کی جو کامیاب نہ ہو سکی۔

۴۰۔ ایسن دولت بیگم۔ مردانی اصول پرست مسلمان خاتون تھیں۔ ۱۴۶۸/۸۷۳ میں ابوسعید مرزا کے قتل کے بعد ان کے ایک امیر شیخ جمال الدین خرنے یونس خاں اور ایسن دولت بیگم کو دھوکہ سے پکڑ لیا۔ ایسن دولت بیگم کو بطور تحفہ اپنے ماتحت خواجہ کلاں کو دے دیا۔ بظاہر تو بیگم نے کوئی اعتراض نہ کیا لیکن جب خواجہ کلاں ان کے کمرہ میں آیا تو اپنی خواتین نوکرانیوں کے ساتھ ملکر چھریاں مار کر اسکو ہلاک کر دیا اور لاش کو باہر پھینک دیا۔ پوچھ گچھ پر انہوں نے جواب دیا کے میں یونس خاں کی بیوی ہوں اور اسلامی قانون کے تحت کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ اگر جمال الدین چاہے تو مجھے قتل کر دے۔ (تاریخ رشیدی ص ۹۴)

۴۱۔ الغ بیگ مرزا ایک انصاف پسند اور قابل سلطان تھا۔ امیر تیمور کا پوتا تھا۔ سمرقند میں اپنے باپ کے زمانے میں چالیس سال حکومت کی۔ فلکیات کا ماہر تھا۔ اور زیچ گورگانی اسکی تخلیق ہے۔ سمرقند میں ایک عمدہ مدرسہ بھی تعمیر کیا (دولت شاہ۔ تذکرہ الشعرا ورق ۲۰۴) اس کی قبر امیر تیمور کے پائنتی میں ہے۔ اس کی رصدگاہ سمرقند میں دوبارہ تعمیر کر دی گئی ہے۔ ۱۹۰۸ میں ویاتکن نے ابوسعید مخدوم کے مخطوطوں کی مدد سے پہاڑی کو صاف کر کے رصدگاہ کی بنیادیں نکالیں اور اس پر عمارت تعمیر کی۔ (سمرقند۔ ازبکستان کا سرکاری معلوماتی کتابچہ ص ۳۹)

۴۲۔ ایرزان کی تباہی ۲۹/۸۳۲۔۱۴۲۸ میں ہوئی

مزید بیگ:

ایک اور امیر شیخ مزید بیگ تھا اوّل اسے میرا اتالیق مقرر کیا گیا تھا۔ نظم وضبط اور آئین میں وہ بہت اچھا تھا۔ اس سے قبل وہ بابر مرزا کی خدمت میں رہ چکا تھا۔ عمر شیخ مرزا کی سرکار میں اس سے بڑا کوئی امیر نہ تھا۔ ریاکار انسان تھا جس کے مختلف رخ تھے۔

بیر علی مزید بیگ قوچین

ایک اور بیر علی مزید بیگ قوچین تھا۔ اس نے دو مرتبہ بغاوت کی پہلی بار اخسی میں اور دوسری مرتبہ تاشقند میں وہ منافق، ریاکار، نمک حرام اور ناکارہ آدمی تھا۔

امیر حسن یعقوب بیگ:

ایک اور امیر حسن یعقوب بیگ تھا۔ زندہ دل، خوش طبع اور چست وچالاک انسان تھا۔ اور یہ شعر اسی کا ہے

باز آئی اے ہمای کہ بی طوطی خطت

کے نزدیک شد کہ زاغ برد استخوان من

(اے ہما واپس آ کیونکہ، تیری اس طوطی کے بغیر جس کے گردن کے گرد حلقہ ہے۔ قریب ہے کہ کوا میری ہڈیاں اڑا کر لے جائے)[48]

دلیر انسان تھا اور تیر اندازی خوب کرتا تھا، چوگان بھی اچھی کھیلتا تھا۔ اس میں مردانہ شان تھی۔ غوک پلہ[49] خوب لگاتا تھا۔ عمر شیخ مرزا کی رحلت کے بعد وہ میرے گھر میں صاحب اختیار ہوگیا۔ تنگ دل، پست ہمت اور فتنہ جو انسان تھا۔

قاسم بیگ قوچین:

ایک اور امیر قاسم بیگ قوچین تھا۔ اس کا شمار اندجان کی فوج کے قدیم امرا میں ہوتا تھا۔ حسن بیگ کے بعد میرے گھر میں وہ صاحب اختیار تھا۔ آخر عمر تک اس کے اختیار واعتبار میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ اضافہ ہی ہوتا رہا۔ مردانہ شان وشوکت کا آدمی تھا۔ ایک مرتبہ جب کہ کاسان کے نواح میں ازبک حملہ کرتے ہوئے گزر رہے تھے تو وہ ان کے پیچھے سے ان کے سر پر آن پہنچا اور حملہ کر دیا اور انہیں اچھی طرح زیر کر لیا، اس نے عمر شیخ مرزا کے زمانے میں بھی تلوار خوب چلائی تھی جنگ یاسی کچیت (جولائی ۱۴۹۹ء) میں بھی اس نے جوانمردی کے خوب جوہر دکھائے تھے۔ اور جس وقت میں نے گوریلا جنگ کے زمانے میں یہ ارادہ کیا کہ کوہستان مسیحا سے گزر کر سلطان محمود خاں کے پاس پہنچوں تو قاسم بیگ علیحدہ ہو کر خسرو شاہ کے پاس چلا گیا۔ ۹۱۰ھ (۱۵۰۴ء) میں جب کہ میں خسرو شاہ کے ساتھ کابل میں مقیم تھا، اور اس شہر کا محاصرہ کئے ہوئے تھا اس وقت قاسم بیگ واپس آیا اور میں نے اپنے گزشتہ رویے کے مطابق اس کے ساتھ رعایت وشفقت کی اور جس وقت میں نے درہ خوش میں واقع ترکمان ہزارہ پر حملہ کیا تو قاسم بیگ کو انعام میں ولایت بنگش اس وجہ سے بخش دی کہ اس نے پیرانہ سالی کے باوجود بہت سے جوانوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اس کے بعد جب میں کابل آیا تو میں نے قاسم بیگ کو ہمایوں کا اتالیق مقرر کیا زمین داور کا علاقہ فتح ہونے کے وقت وہ واصل بحق ہوا۔ (ورق ۱۳) مرد، مسلم، دیندار اور متقی آدمی تھا شبہ کی بنا کھانے سے پرہیز کرتا تھا۔ اس کی رائے اور تدبیر بہت اچھی ہوتی تھی ہنسی مذاق بہت کرتا تھا۔ اگرچہ پڑھا لکھا نہ تھا مگر اس کے باوجود طبیعت میں ظرافت تھی۔

۴۳۔ یہ حیدر مرزا بابر کے خالہ زاد بھائی اور صاحب تاریخ رشیدی ہیں۔ حیدر مرزا نے تفصیل دی ہے۔ کہ بابر نے ۹۱۴/ ۱۵۰۸ میں اس کو بھیج کر بلایا کابل میں اس کا استقبال شیرم طغائی نے کیا۔ انکو رہنے کے لئے عمدہ حویلی ملی اور بابر اس کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ ترغیب دیا کرتا تھا۔ بابر نے اسکو اپنے بیٹے کی طرح رکھا۔ اور یہ سلسلہ ۹۱۸/ ۱۵۱۲ تک جاری رہا۔ (تاریخ رشیدی ص ۲۲۷۔۲۳۰) ان کے بابر کے چھوڑ کر جانے پر بابر نے جو شعر کہا وہی بات ذوق نے کیا خوب کہی۔

آخر گل اپنی خاک میکدہ ہوئی۔

پہنچی وہی پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

(ذوق ایک مطالعہ ص ۲۱۴)

۴۴۔ زگیر۔ انگشتانہ جیسا ہوتا ہے۔ تیر اندازی کے وقت اس کو انگوٹھے میں پہن لیتے ہیں۔ یہ حیوان کے سینگ اور ہڈی سے بنتا ہے۔ (نصیر الدین حیدر ص ۱۱)

رالف پین گالوے نے زگیر اور اس کے استعمال کی بہت تعریف کی ہے۔ یہ انگوٹھے میں اس طرح پہنا جاتا ہے کہ کمان کی ڈوری اس میں پھنس جاتی ہے۔ کیونکہ زگیر کا ایک لب آگے نکلا ہوتا ہے۔ تیر چلاتے وقت ڈوری کو اس زگیر کے لب میں پھنسا کر پیچھے کھینچا جاتا ہے۔ مصنف کے مطابق کمان کی ڈوری بہ آسانی لب میں اٹک کر پیچھے آجاتی ہے۔ تیر چلاتے وقت انگوٹھے کو تھوڑا سا موڑنے پر ڈوری زگیر سے نکلتی ہے اور تیر کو پھینکتی ہے۔ تیر اس سے نکل کر زیادہ دور جاتا ہے۔ اس میں تیر کش کم محنت اور زیادہ آسانی سے تیر پھینک سکتا ہے۔ انگوٹھے کو کوئی تکلیف بھی نہیں ہوتی ہے۔ مصنف نے یہ لکھا ہے۔ کہ مشرقی تیر کش اسی وجہ سے زیادہ مہلک تھے۔ اور مشرقی طریقہ تیر کشی زیادہ سہل اور کارگر ہے۔ (ص ۱۲)

زگیر اور اس کو انگوٹھے میں پہننے کا طریقہ

باباقلی بیگ:

ایک اور امیر باباقلی بیگ تھا جو شیخ علی بہادر کی نسل سے تھا شیخ مزید بیگ کی وفات کے بعد اسے میرا اتالیق مقرر کیا گیا۔ جس وقت سلطان احمد مرزا نے اندجان پر لشکرکشی کی اور اتیپہ کا علاقہ اس کو دے دیا۔ سلطان محمود مرزا کے انتقال بعد جس وقت وہ سمرقند سے فرار ہوکر آرہا تھا تو سلطان علی مرزا نے اوراتیپہ سے نکل کر اس کے ساتھ جنگ کی اور اسے شکست دے کر قتل کردیا۔ اس کا نظم ونسق بہت اچھا تھا۔ ملازمین کی خوب نگہداشت کرتا تھا۔ نماز نہیں پڑھتا تھا اور روزہ بھی نہیں رکھتا تھا۔ ظالم آدمی تھا اور سلوک کافرانہ۔

علی دوست طغائی:

ایک اور علی دوست طغائی تھا ساغریچی کے دس ہزاری امرا میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ میری نانی ایسن دولت بیگم کے رشتہ داروں میں سے تھا۔ عمر شیخ مرزا کے عہد سے اس کی بہت دل داری کی جاتی تھی۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا وہ بہت کام کا آدمی ہے۔ لیکن ان چند سال کے دوران جس وقت کہ وہ میرے ساتھ تھا اس نے کوئی ایسا جوہر نہیں دکھایا کہ جسے کارنامہ کہا جاسکے۔ سلطان ابوسعید مرزا کی خدمت کرچکا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ جادو کے اثر سے موسم کا رخ بدل سکتا ہے۔ میر شکار تھا۔ اس کے اخلاق واطوار میں بعض باتیں تو بالکل ہی ناکارہ وفضول تھیں۔ حیلہ گر، فتنہ جو، منافق وخود پسند، منہ زور اور سرکش آدمی تھا۔

ویس لاغری:

ایک اور امیر ویس لاغری تھا۔ یہ سمرقند کا باشندہ اور توقچی قوم کا فرد تھا۔ آخر میں وہ عمر شیخ مرزا کا مقرب ہوگیا۔ گوریلا جنگوں میں میرے ساتھ شریک رہتا تھا۔ اس کی رائے وتدبیر بہت عمدہ تھی۔ کچھ حد تک فتنہ پسند بھی تھا۔

میر غیاث طغائی:

ایک اور امیر علی دوست کا چھوٹا بھائی میر غیاث طغائی تھا ابوسعید مرزا کے گھر میں مغل خاندان کے امیرزادوں میں کوئی اس سے بڑھ کر امیر نہیں تھا۔ مرزا سلطان ابوسعید نے اپنی چہار گوشہ مہر اس کے حوالے کرر کھی تھی آخری دنوں میں وہ عمر شیخ مرزا کے پاس چلا گیا اور اس کا بہت اچھا مقرب بن گیا۔ وہ ویس لاغری کا بھی مصاحب رہا تھا کاسان کا علاقہ جب سلطان محمود خاں کے حوالے کردیا گیا تو آخر عمر تک وہ خاں کی خدمت میں ملازم رہا۔ اس کے ساتھ نرمی رعایت کا سلوک کیا، وہ بڑا خوش مزاج اور شوخ طبیعت انسان تھا اس کے ساتھ ہی فسق وفجور میں بھی بے باک۔

امیر علی درویش خراسانی:

ایک اور امیر علی درویش خراسانی تھا۔ وہ خراسان کے چیلوں میں شامل اور سلطان ابوسعید مرزا کی خدمت کیا کرتا تھا جس وقت سمرقند اور خراسان کے علاقے سلطان ابوسعید مرزا کے انتظام میں آگئے تو اس نے وہاں کے رسالوں کا اس کو افسر مقرر کیا۔ اس لئے وہ امیر چہرہائے سمرقند اور چہرہائے خراساں مشہور تھا۔ میرے سامنے اس نے سمرقند کے دروازے پر خوب حملے کئے۔ بڑا ہی جری انسان تھا خط نستعلیق یکساں اور رواں لکھتا تھا۔ خوشامد بہت زیادہ کرتا۔ اس کے مزاج پر کنجوسی کا غلبہ تھا۔

قنبر علی مغل:

ایک اور امیر قنبر علی مغل تھا وہ داروغہ اصطبل تھا۔ جس وقت اس کا باپ ولایت میں داخل ہوا تو کچھ عرصے تک جانوروں کی کھال اتارنے کا کام کرتا رہا۔ اسی بنا پر وہ قنبر علی سلاخ (کھال اتارنے والا) مشہور ہو

۴۵۔ حیدر مرزا کی تعلیم وتربیت۔ تاریخ رشیدی (ص ۴) میں درج ہے کہ ان کی تعلیم وتربیت ان ۲۴ سالوں کے دوران ہوئی جو انہوں نے سلطان سعید خان والی کاشغر کے پاس گزارے۔ وہ ۹۲۰/ ۱۵۱۴ میں وہاں گئے تھے۔ والی کاشغر نے استاد مقرر کئے تھے۔ جو ان کو خطاطی۔ انشا، شاعری، تصویر کشی، سکھاتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ مہر بنانا، سنار کا کام، سائیس کا کام اور ہتھیار بنانا بھی سکھائے گئے۔ تیر کمان بنانا اور نیزوں کے سر کو تیز کرنا اور تلوار وخنجر کی دیکھ بھال کرنا بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ ریاستی انتظامات حکومت چلانا، لڑائی اور حملوں کی تیاری کرنا، اس کے علاوہ تیر اندازی اور شکاری بازوں کو پالنا اور سدھانا اور ان سے شکار کرنا۔ سعید خاں نے خود اپنی نگرانی میں ان کی تربیت کی۔

۴۶۔ قزاق۔ جوچی کی اولاد دشت قپچق سے بکھر کر ادھر ادھر مارے مارے پھرتے تھے۔ لیکن جب دوبارہ متحد ہوئے تو آوارہ گردی کی وجہ سے قزاق کہلائے جانے لگے اور اسی نام سے مشہور ہوئے (تاریخ رشیدی ص ۲۷۲) مرزا حیدر کے مطابق قزاق نسل تیز رفتاری سے کم ہو رہی تھی۔ لیکن یہ اب بھی ہیں۔ جیسا کہ ملک قزاقستان کے نام سے ظاہر ہے۔ میرے سفر میں میرا ڈرائیور بھی قزاق تھا۔ اور اسکا نام سرکے تھا۔ ترکی زبان میں قزاق کے معنی وہ شخص جس کا کوئی گھر نہ ہو، آوارہ پھرنے والا ہیں (سنگلاخ ص ۲۰۳)

۴۷۔ یہ بابر مرزا دوسرے ہیں۔ امیر، صوفی، شاعر اور انصاف پسند حکمراں۔ یہ تیمور کے بیٹے شاہ رخ کے پوتے تھے۔ ان کی حکومت گیارہ سال رہی (۸۲۶/ ۱۴۲۲ تا ۸۶۱/ ۱۴۵۶) ظہیرالدین بابر جب ہرات گئے تو ان کے طرب خانے میں بھی گئے تھے۔ (۹۱۲ھ کے واقعات) یہ بابر قلندر کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ ان کا مشہور شعر ہے۔

نو روز ونو بہار و گل وی و دلبراں
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اس شعر کو غلطی سے ظہیر الدین بابر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ (روضۃ السلاطین ص ۳۹)

۴۸۔ ہما وہ خیالی پرندہ ہے جس کا سایہ اگر کسی کے سر پر پڑ جائے تو وہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔ وہ بے ضرر پرندہ ہے۔ اور ہڈیاں کھا کر بھی گزارہ کرلیتا ہے۔ شاعر یہاں یہ خواہش ظاہر کررہا ہے۔ کہ اے ہما واپس آ اور میرے سر پر اپنا سایہ کر، اگر نہ آیا تو میں برباد ہو جاؤں گا کہ میری گردن پہلے ہی حلقہ میں ہے۔ اور جلد ہی

گیا۔ یونس خاں کی خدمت میں آفتابہ برداری کرتا۔ آخری دنوں میں اسے امرا میں شامل کر لیا گیا۔ مجھ سے بھی اس نے بڑی مراعات حاصل کیں، جب جنگ کا وقت آیا (ورق ۱۴) تو اس میں سستی اور کوتاہی آ گئی وہ باتونی بہت تھا اور بے کار اور بہکی بہکی باتیں بھی کرتا تھا، کم حوصلہ اور کوڑھ مغز۔

تخت نشینی:

جس وقت عمر شیخ مرزا کے ساتھ واقعہ پیش آیا تو میں اندجان کے چار باغ میں تھا۔ جس وقت منگل کے دن بتاریخ پنجم ماہ رمضان یہ خبر اندجان میں میرے پاس آئی تو میں عالم پریشانی میں گھوڑے پر سوار ہوا اور وہ ملازمین جو اس وقت وہاں موجود تھے انہیں ساتھ لے کر میں نے قلعے کی جانب جانے کا عزم کیا۔ منزل پر پہنچنے کے بعد میں مرزا دروازے سے شہر میں داخل ہوا۔ شیرم طغائی جلاد نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور ہم نماز گاہ کی جانب روانہ ہوئے اس کے دل میں شاید یہ خیال آیا تھا کہ سلطان احمد مرزا ایک بڑا بادشاہ ہے وہ جیسے ہی اپنا لشکر عظیم لے کر آئے گا۔ میرے اقربا میری مملکت اس کے حوالے کر دیں گے۔ چنانچہ وہ اوز کند اور اس کے اطراف پہاڑوں کی جانب روانہ ہوا کہ اگر امرا مملکت کو دشمن کے حوالے کر دیں تو میں ان کے ہاتھوں گرفتار نہ ہو جاؤں اور اپنے ماموؤں الچہ خاں یا سلطان محمود خاں کے پاس جا سکوں۔

خواجہ مولانا قاضی ولد سلطان احمد قاضی جو شیخ برہان الدین قلیچ کی نسل سے ہیں اور جن کا سلسلہ نسب والدہ کی طرف سے سلطان ایلیک ماضی تک پہنچتا ہے نیز ان کا خاندان اس ولایت میں مرجع خلائق ہے۔ وہ یہاں کے شیخ الاسلام بھی ہیں (ان کا ذکر بعد میں آئے گا) اور وہ امرا جو قلعے میں تھے کو یہ اطلاع ملی تو انہوں نے خواجہ محمد درزی کو روانہ کیا (یہ شخص عمر شیخ کا ہوا خواہ اور اس کی بیٹی کا اتالیق بھی تھا۔) اس نے تمام شکوک و شبہات ہمارے دلوں سے زائل کئے۔ ہم نماز گاہ کی جانب روانہ ہوئے ہی تھے کہ وہ ہمیں اپنے ساتھ لے کر واپس آ گیا اور ہم قلعے میں اترے۔ مولانا قاضی اور امرا میرے پاس آئے جب گفتگو اور صلح و مشورے میں متفق ہو گئے تو انہوں نے قلعے کے برج اور فصیلوں کی مرمت کی۔

حسن یعقوب، قاسم قوچین اور بعض دیگر امرا کہ جو مرغینان اور اس کے اطراف میں یلغار کے لئے بھیجے گئے تھے ایک دو روز بعد واپس آ کر میری خدمت میں حاضر ہوئے اور سب متفق ہو کر قلعے کی حفاظت میں مشغول ہو گئے۔

سلطان احمد مرزا کا حملہ:

اس اثنا میں سلطان احمد مرزا نے اور اتیپہ، خجند اور مرغینان پر قبضہ کر کے اندجان سے چار کوس کے فاصلے پر قبا نامی مقام پر پڑاؤ کیا۔ اس وقت درویش گاؤ نامی شخص کو جس کا شمار اندجان کے سربرآوردہ لوگوں میں ہوتا تھا اور جس نے بعض نامناسب باتیں کہی تھیں، کو قتل کی سزا دی گئی جس کے باعث تمام لوگ مطیع و فرمانبردار ہو گئے۔ خواجہ قاضی اوزن حسن اور خواجہ حسین کو میں نے سلطان احمد مرزا کے پاس بھیجا اس مضمون کے ساتھ کہ یہ تو ظاہر ہے کہ مملکت میں وہ اپنا ایک نمائندہ ملازم مقرر کریں گے اور میں بھی ایک ملازم اور آپکا فرزند ہوں اگر یہ کام میرے سپرد کر دیا جائے تو یہ انہی کے حق میں بہتر ہوگا اور آسانی کے ساتھ فیصلہ ہو جائے گا۔

سلطان احمد مرزا بے بضاعت، کم سخن اور سادہ لوح انسان تھا اگر کسی مشکل سے دوچار ہوتا تو وہ اپنے امرا کی مدد کے بغیر فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اس کے امرا نے حمایت نہ کی اور سخت جواب دے کر آگے کی جانب کوچ کر گئے۔

سلطان احمد مرزا کی واپسی:

حق سبحانہ تعالی نے اپنی قدرت کاملہ سے خلق کی منت کے بغیر میرے کاموں کو درست کر دیا۔ یہاں

میری ہڈیاں تک کو لے جائے گا۔ پھر تجھے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

۴۹۔ غوک پلہ۔ مرزا نصیر الدین حیدر کے مطابق یہ ایک کھیل ہے۔ ان کے خیال میں کوڑی ذقن کھیل کی طرح (ص ۱۴)

ذقن تھوڑی کو کہتے ہیں اصل لفظ زغند ہے جس کے معنی جست لگانا یا چھلانگ لگانا ہے۔ سید احمد دہلوی اس کھیل کو اس طرح بیان کرتے ہیں (۳:۵۸۸)

لڑکے دو گروہوں میں بٹ کر اپنا اپنا سردار مقرر کر لیتے ہیں اور اس کے ساتھ ایک دوسرے سے اپنا جوڑ بھی۔ دونوں گروہ آمنے سامنے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بیٹھ جاتے ہیں۔ سردار ایک کوڑی کسی لڑکے کے ہاتھ میں چھپا دیتا ہے۔ دوسرے گروہ کے متر کو چہرے اور جسم کی حرکات سے یہ معلوم کرنا ہوتا ہے۔ کہ کوڑی کس کے پاس ہے۔ اگر کوڑی ٹھیک نہ نکلے تو سب لڑکے ایک زغند لگاتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ جب ایک گروہ زغند لگاتے ہوئے دوسرے کی حد سے باہر نکل جائیں تو وہ گروہ جیت جاتا ہے۔ اور جیتنے والے لڑکے اپنے اپنے جوڑے سے جیتے ہوئے فاصلے کی چڈی لیتے ہیں۔

بھی اس نے حالات ساز گار کردیئے۔ وہ اپنی آمد سے پریشان ہوگئے اور بے نیل ومراد واپس چلے گئے۔ (ورق ۱۵) اس کا ایک سبب یہ ہوا کہ قبا ایسی جگہ واقع ہے جہاں دلدل پائی جاتی ہے اور پل کے بغیر اس کو پار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ لشکر بہت زیادہ تھا چنانچہ پل ٹوٹ گیا اور اسی وجہ سے، بہت سے گھوڑے اور خچر اس دلدل میں گر کر تلف وہلاک ہوگئے اس واقعے سے تین چار سال قبل دریائے چیر پر انہیں شکست ہوئی تھی اس حادثے نے اس کی یاد بھی تازہ کردی۔ اسی لئے اہل لشکر پر خوف طاری ہوگیا۔

دوسری وجہ یہ ہوئی کہ اس وقت گھوڑوں میں ایسی وبا پھیلی کہ وہ کثرت سے مرنے لگے اور اسی وجہ سے اصطبل کے اصطبل خالی ہوگئے۔ اس کے علاوہ یہ وجہ بھی ہوئی کہ سپاہ ورعیت نے ہمیں ایسا یک دل ویک خیال پایا انہوں نے بھی فیصلہ کرلیا کہ جب تک ان کے جان وتن میں ذرا بھی رمق باقی ہے جان کی بازی لگانے میں دریغ نہ کریں گے اور خود کو دشمن کے حوالے نہ کریں گے۔ اس بنا پر ان کے لئے ضروری ہوگیا کہ اندجان سے ایک فرسنگ کے فاصلے پر پہنچ کر درویش محمد ترخان کو بطور وکیل بھیجا ادھر اندرون (قلعہ) سے حسن یعقوب نمازگاہ کے نواح میں پہنچ گیا۔ دونوں وکیلوں کی ملاقات ہوئی اور باہمی طور پر صلح کر کے واپس آگئے

سلطان محمود خاں کا حملہ:

دریائے خجند کے شمالی جانب سے سلطان محمود خاں حملے کے ارادے سے آگے بڑھا اور اخسی کا محاصرہ کرلیا۔ اس وقت جہانگیر مرزا وہاں موجود تھا اور امرا میں علی درویش بیگ، مرزا قلی کوکلتاش، محمد باقر بیگ اور شیخ عبداللہ ایشک آغا مقیم تھے۔ ان کے علاوہ ویس لاغری اور میر غیاث طغائی بھی وہاں موجود تھے مگر انہیں چونکہ اُن امرا کا خوف تھا اسی لئے وہ ویس لاغری کی ولایت کاسان چلے گئے۔ اور چونکہ ویس لاغری ناصر مرزا کا اتالیق و سرپرست تھا۔ اس لئے وہ بھی کاسان میں تھا۔ جس وقت خاں اخسی کے نواح میں پہنچا تو ان امرا نے اس کی خدمت میں جا کر کاسان اس کے حوالے کردیا میر غیاث، خاں کی خدمت ہی میں رہا۔ ویس لاغری، ناصر مرزا کو ساتھ لے کر سلطان احمد مرزا کے پاس چلا گیا اور خود کو محمد مزید ترخاں کے حوالے کردیا۔ خاں نے اخسی کی جانب رخ کیا اور کئی مرتبہ جنگ کی غرض سے حملہ آور ہوا مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی اخسی کے امرا اور جوانوں نے بہادری کے خوب جوہر دکھائے۔ اس دوران سلطان محمود خاں بیمار ہوگیا اور وہ جنگ وجدال سے تنگ آگیا تھا اس لئے اپنی ولایت کی جانب واپس چلا گیا۔

ابا بکر کاشغری کا حملہ:

ابا بکر دوغلت کاشغری نے کسی کے آگے سر نہیں جھکایا تھا اور چند سال سے کاشغر وختن کا فرمانروا چلا آرہا تھا اس کے دل میں بھی ولایت کو بڑھانے کا سودا سمایا چنانچہ اوزکند کے قریب پہنچ کر قلعہ تعمیر کیا اور اس ولایت کو تباہ کرنے میں مشغول ہوگیا خواجہ قاضی کو اس مقصد کے لئے متعین کیا گیا کہ وہ وہاں جا کر کاشغری کا قلع قمع کریں۔ جب وہ اس کے نزدیک پہنچے اور کاشغری نے دیکھا کہ وہ اس فوج کا مدمقابل نہیں ہوسکتا تو اس نے خواجہ قاضی کو ثالث بنا کر سیکڑوں حیلوں اور بہانوں سے اپنی جان بچائی۔ اس وقت جب کہ یہ عظیم واقعات پیش آرہے تھے عمر شیخ مرزا کے باقی ماندہ امرا اور نوجوان نے باہمی طور پر اتفاق کر کے اپنی مردانگی کے خوب جوہر دکھائے اور مرزا کی والدہ شاہ سلطان بیگم، جہانگیر مرزا اہل حرم وامرا اخسی سے اندجان چلے گئے عزاداری کے مراسم ادا کرنے کے لئے انہوں نے غربا ومساکین کے لئے دسترخوان کھول دیا۔ ان مہمات سے فارغ (ورق ۱۶) ہونے کے بعد ولایت کے نظم ونسق اور ربط وضبط میں مشغول ہوگئے۔ انداجان کی حکومت اور اندرون خانہ امور کی خود مختاری حسن یعقوب کو سونپی گئی۔ ولایت اوش کی صوبہ داری قاسم قوچین کو دی گئی اخسی اور مرغینان

ولایت پراوزون حسن اور علی دوست طغائی کو متعین کیا گیا۔ عمر شیخ مرزا کے دیگر امرا اور جوانوں کو حسب حال مال ،ولایت زمین جاگیر، وظیفہ اور تنخواہ وغیرہ سے نوازا گیا۔

سلطان احمد مرزا جس وقت واپس جارہا تھا تو تین منزلیں طے کرنے کے بعد اس کی طبیعت بگڑنے لگی اسے شدید بخار ہوگیا، اوراتیپہ کے نواح میں جب وہ اقسونامی مقام پر پہنچا تو ماہ شوال کے درمیان ۸۹۹ ہجری میں چوالیس سال کی عمر میں اس عالم فانی سے کوچ کیا۔

سلطان احمد مرزا

اس کی ولادت ۸۵۵ ہجری (۱۴۵۱ء) میں اس وقت ہوئی جب سلطان ابوسعید مرزا نے تخت سلطنت پر قبضہ کرلیا تھا۔ وہ مزکورہ سلطان کے تمام لڑکوں میں سب سے بڑا تھا اس کی والدہ اور وہ بوغا ترخان کی بیٹی اور درویش محمد ترخان کی بڑی بہن تھیں۔ سلطان ابوسعید مرزا کی تمام زوجات میں ان کا درجہ سب سے بڑا تھا۔

وہ دراز قد اور قوی ہیکل انسان تھا۔ اس کی چگی ڈاڑھی بھوری تھی اور چہرہ سرخ۔ ڈاڑھی کے نام پر بس چند بال تھے اور گال بالکل صاف گفتگو میں بڑا ہی خوش مزاج تھا۔ دستور زمانہ کے مطابق وہ اپنی دستار کو چار پیچ دیتا اور طرۂ دستار کو پیشانی پر ابرو تک لٹکاتا تھا۔

عقیدے کے اعتبار سے حنفی مسلک کا پیرو اور پاکیزہ اعتقاد کا آدمی تھا۔ پانچوں وقت کی نماز باقاعدہ ادا کرتا جو کبھی ترک نہ ہوتی۔ محافل عیش ونوش میں بھی اس کی نماز ترک نہ ہوتی۔ حضرت خواجہ عبید اللہ سے عقیدت وارادت تھی۔ وہی اس کے سرپرست اور پشت پناہ تھے۔ ادب واحترام کا بہت پاس کرتا۔ کہا جاتا ہے کہ جس وقت حضرت خواجہ کی مجلس میں حاضر ہوتا تو اس طرح ادب سے بیٹھتا کہ کبھی زانو تک نہ بدلتا۔ ایک مرتبہ خلاف عادت حضرت خواجہ کی صحبت میں اس نے ایک زانو سے دوسرا زانو بدلا، جب مرزا اپنی جگہ سے اٹھا تو حضرت خواجہ نے فرمایا کہ مرزا جہاں بیٹھا ہوا تھا اس جگہ کو اچھی طرح دیکھیں، دیکھا تو وہاں ایک ہڈی پڑی تھی۔ پڑھا لکھا قطعی نہ تھا بالکل ناخواندہ تھا۔ اگرچہ وہ شہر میں پلا بڑھا تھا مگر ترکوں کی طرح بالکل سیدھا، ذہانت سے قطعی محروم، مگر آدمی عدل پسند تھا اس کام میں بھی حضرت خواجہ کے قدم کی برکت تھی۔ اکثر معاملات کا فیصلہ شریعت کے مطابق کرتا تھا۔ اپنے عہد وقول میں بالکل راست ودرست تھا۔ اس کے فعل سے کوئی بات خلاف شریعت ظاہر نہیں ہوئی۔ اس میں ہمت وشجاعت بھی تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس نے کوئی معرکہ سر کیا ہو۔ مگر کہنے والے کہتے ہیں کہ بعض جنگوں میں اس کی شجاعت وبہادری کے جوہر نمایاں ہوئے تھے تیر اچھی طرح چلاتا تھا۔ اس کا تیر اور نیزہ اکثر نشانے پر ہی لگتا۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اس نے اس میدان کے اس سرے سے گھوڑا دوڑایا اور دستوں پر نصب حلقے کو صاف اڑا کر لے گیا۔ آخری دنوں میں بہت موٹا ہوگیا تھا۔ تیتر، اور پودنوں کو شکاری جانوروں سے پکڑواتا۔ اس کا نشانہ کم ہی چوکتا۔ (ورق ۱۷) اس نے بہت سے باز اور دوسرے شکاری پرندے پال رکھے تھے۔ وہ ان سے بھی شکار کرتا۔ الغ بیگ مرزا کے بعد اس جیسا کوئی بادشاہ میر شکار نہ تھا۔ بہت زیادہ باشرم وحیادار انسان تھا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے خلوت میں بھی محرم ومصاحبوں سے اپنے پاؤں تک کو پوشیدہ رکھتا۔ جب کبھی شراب پینے پر آتا تو بیس تیس روز تک پیتا رہتا۔ اور جب سیر ہوجاتا تو بیس تیس دن تک اسے ہاتھ تک نہ لگاتا کبھی اس کی مجلس کی ایک ہی نشست میں پورا دن اور پوری رات گزر جاتے۔ جس میں وہ دل کھول کر پیتا تھا، اور جن دنوں میں وہ پینے سے باز رہتا تو دسترخوان پر سیر ہوکر کھاتا، طبیعت پر بخل وامساک غالب تھا۔ کم سخن تھا اور امرا کے دست اختیار میں رہتا۔ اس نے چار مرتبہ جنگ کی ایک مرتبہ شیخ جمال ارغوں کے چھوٹے بھائی نعمت ارغوں سے زامین کے نواح میں اقارتوزی نامی مقام پر جس میں وہ غالب رہا، اس کی دوسری جنگ عمر شیخ مرزا سے خواص

نامی مقام پر ہوئی۔ اس میں بھی وہ غالب رہا۔ تیسری جنگ تاشقند کے نواح میں دریائے چیر کے کنارے سلطان محمود خاں سے ہوئی۔ درحقیقت یہ جنگ نہ تھی۔ بلکہ غارت گری تھی جس میں مغل سپاہ ایک دو کی تعداد میں لشکر کے عقب میں پہنچتے اور وہاں لوٹ مار کرتے۔ اگرچہ لشکر کثیر تعداد میں موجود تھا مگر نہ جنگ ہوئی اور نہ جدال۔ کسی ایک نے دوسرے کی خبر تک نہ لی اور نہ ہی کوئی سپاہ کا مقابلہ ہوا لشکر بھاگ نکلا بہت سے سپاہی چیر دریا میں ڈوب گئے۔ اس نے ایک بار حیدر کوکلتاش سے یارایلاق کے مقام پر جنگ کی جس میں وہ غالب رہا۔ اس کی مملکت سمرقند اور بخارا پر مشتمل تھی۔ جو اسے اپنے باپ سے ترکے میں ملی تھی۔ جب عبدالقدوس نے شیخ جمال کو قتل کیا تو تاشقند، شاہ رخیہ اور سیرام پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔ آخر میں تاشقند اور سیرام اس نے اپنے برادر خورد عمر شیخ مرزا کے حوالے کر دیا۔ خجند اور اوراتیپہ پر بھی کچھ عرصے تک اس کا قبضہ رہا۔ اس کے بچوں میں دو لڑکے اور پانچ لڑکیاں تھیں لڑکوں کی چھوٹی عمر میں ہی وفات ہو گئی۔ لڑکیوں میں سے چار قتق بیگم کے بطن سے تھیں۔ جن میں سب سے بڑی رابعہ سلطان بیگم تھیں۔ جنہیں اقرا کوز (سیاہ چشم) کہا جاتا تھا۔ ان کی شادی اس نے اپنی حیات میں ہی سلطان محمود خاں سے کر دی تھی اور رخصتی بھی کر دی تھی۔ اس کے بطن سے سلطان محمود خاں کے گھر میں ایک لڑکے کی ولادت ہوئی جس کا نام بابا خاں رکھا گیا۔ بڑا ہی پیارا اور نازنین بچہ تھا۔ جس وقت سلطان محمود خاں کو ازبکوں نے شہر خجند میں شہید کیا تو اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس جیسے بہت سے بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ سلطان محمود خاں کی موت کے بعد جانی بیگ سلطان نے ان سے شادی کر لی تھی۔

دوسری بیٹی صالحہ سلطان بیگم تھی، جو آق بیگم (گوری بیگم) کہلاتی تھیں۔ سلطان محمود مرزا نے سلطان احمد مرزا کی وفات کے بعد ان کی شادی اپنے بڑے لڑکے سلطان مسعود مرزا سے کر دی تھی۔ آخر میں وہ کاشغر میں شاہ بیگم اور مہر نگار خانم کے ساتھ گرفتار ہوئی۔

تیسری لڑکی عائشہ سلطان بیگم تھیں۔ پانچ سال کی عمر میں جب میں سمرقند آیا تھا تو میری نسبت ان کے ساتھ طے کر دی گئی تھی۔ اس کے بعد قتل وغارت گری کے باعث جب وہ خجند پہنچیں تو میں نے ان سے شادی کر لی جس وقت دوسری مرتبہ میں نے سمرقند پر قبضہ کیا تو ان کے بطن سے ایک لڑکی کی ولادت ہوئی جو چند روز بعد ہی واصل بحق ہوئی۔ تاشقند کی تباہی سے قبل اپنی بڑی بہن کی شہ پر انہوں نے مجھ سے ترک تعلق کر لیا۔

سلطانم بیگم چوتھی بیٹی تھی۔ جو سلطان علی مرزا کی حرم رہ چکی تھی۔ اس کے بعد تیمور سلطان اور اس کے بعد مہدی سلطان (ورق ۱۸) کے نکاح میں آئی۔

سب سے چھوٹی معصومہ سلطان بیگم تھی۔ ان کی ولادت سلطان حبیبہ بیگم کے بطن سے ہوئی تھی۔ وہ ارغوں قبیلے کی فرد اور سلطان ارغوں کی بھتیجی تھیں۔ جس وقت میں خراسان پہنچا تو ان سے ملاقات کر کے میں بہت خوش ہوا۔ میں نے وہیں ان سے نسبت دی اور کابل پہنچ کر ان سے شادی کر لی۔ ان کے بطن سے ایک لڑکی کی ولادت ہوئی لیکن زچگی کے وقت وہ واصل بحق ہوئیں۔ بیٹی کو ماں کا نام دے دیا گیا۔ کیونکہ اب یہی ان کی نشانی باقی رہ گئی تھیں

سلطان احمد مرزا کی بیگمات اور حرمیں:

سلطان ابوسعید مرزا نے یونس خاں کی بیٹی مہر نگار خانم کی نسبت سلطان احمد مرزا سے کی تھی وہ میری والدہ کی حقیقی بڑی بہن تھیں۔ مرزا کی دیگر ازواج ترخانوں میں سے تھیں۔ جن کا نام ترخاناں بیگم تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک اور زوجہ قتق بیگم تھیں۔ جو رشتہ میں ترخان بیگم کی رضاعی بہن تھیں۔ سلطان احمد مرزا ان کا عاشق دلدادہ تھا اور وہ بھی اس پر والہ وشیفتہ۔ مرزا پر ان کا بہت زیادہ غلبہ واثر تھا۔ شراب نوشی کی شوقین تھی۔ جب تک وہ زندہ رہیں مرزا نے حرم کی کسی بھی خاتون کی جانب رخ نہیں کیا۔ آخر میں اسے قتل کر دیا اور اس بدنامی سے

نجات پائی۔ایک اور زوجہ خانزادہ بیگم تھی۔ جو ترمذ کے خوان زادوں کی نسل سے تھی۔جس وقت میں پانچ سال کی عمر میں سلطان احمد مرزا کے پاس سمرقند آیا تھا مرزا نے ان سے شادی رچائی تھی ابھی ان کا گھونگٹ پڑا ہوا تھا مرزا نے ترکوں کے رواج کے مطابق مجھے رونمائی کی اجازت دے دی تھی[۵۰] ایک اور زوجہ احمد حاجی بیگ کی نواسی لطیف بیگم تھی۔مرزا کی وفات کے بعد حمزہ سلطان نے ان سے شادی کر لی تھی۔ان کے بطن سے حمزہ سلطان کے تین لڑکوں کی ولادت ہوئی۔حمزہ سلطان اور تیمور سلطان میرے ساتھ جنگ آزما تھے تو میں نے انہیں شکست دے کر حصار پر قبضہ کرلیا تو یہ دیگر سلطان زادگان کے ساتھ میری حراست میں آگئے،لیکن میں نے ان سب کو آزاد کر دیا۔ایک اور زوجہ سلطان ارغون کی بھتیجی حبیبہ سلطان تھیں۔

امرا

جانی بیگ دولدائی:

ان کے امرا میں ایک سلطان ملک کا برادر خورد جانی بیگ دولدائی تھا۔سلطان ابوسعید مرزا نے سمرقند کی حکومت اور سلطان احمد مرزا کے محل کی دربانی اسے سونپی تھی۔اس کے اطوار اخلاق عجیب تھے جن کے بارے میں طرح طرح باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ جس وقت وہ سمرقند کا حاکم تھا تو وہاں ایک ازبک ایلچی آیا تھا جو ازبکوں میں اپنی زورمندی وطاقت کے باعث مشہور تھا۔ازبک کسی تندومند زور آور آدمی کو بوغا (سانڈ) کہتے ہیں۔جانی بیگ نے اس سے پوچھا کہ کیا تجھے بوغا کہتے ہیں اگر تو بوغا ہے تو، تجھے بھی دیکھ لیں۔ اگر چہ اس ایلچی نے ہر چند ٹالنا چاہا مگر وہ نہ مانا اور اس سے زور آزمائی کر کے زمین پر دے مارا۔آدمی دلیر تھا۔

احمد حاجی بیگ:

سلطان ملک کاشغری کا بیٹا احمد حاجی بیگ بھی ایک امیر تھا۔سلطان ابوسعید مرزا نے کچھ مدت کے لئے ہرات کی حکومت اسے سونپ دی تھی۔اس کی وفات کے بعد جانی بیگ کو اس کا مقام ومرتبہ دے کر سمرقند بھیج دیا گیا۔خوش طبع ودلیر انسان تھا۔تخلص وفائی کرتا تھا۔صاحب دیوان شاعر تھا۔اس کے اشعار بھی برے نہ تھے۔یہ شعر اسی کا ہے:

مستم ای محتسب امروز زمن دست بدار
احتسابم بکن ان روز کہ یابی ہشیار

(میں مست ہوں اے محتسب آج مجھے معاف رکھ۔میرا احساب اس روز کرنا جب تو مجھے ہوشیار پائے)

میر علی شیر نوائی جس وقت ہرات سے سمرقند آرہا تھا تو وہ اس کے ہمراہ تھا اس کے بعد جب سلطان حسین مرزا بادشاہ بن گیا۔(ورق ۱۹) تو علی شیر ہرات چلا آیا اور بہت زیادہ مراعات حاصل کیں۔ تپچاق نسل کے گھوڑوں[۵۱] کو بہت اچھی طرح رکھتا تھا۔اور ان پر خوب سواری کرتا۔اس نسل کے بیشتر گھوڑے اس کے ہی اصطبل کے تھے اگر چہ باہمت ودلیر انسان تھا۔لیکن اس کی سرداری اس کے مردانگی کے ہم پلہ نہ تھی۔ انتہائی لاپرواہ قسم کا آدمی تھا۔اس کے کاموں اور مہمات کا بندوبست اس کے نوکر چاکر کرتے تھے۔جس وقت بایسنغر مرزا نے سلطان علی مرزا سے بخارا میں جنگ کی تو اس میں وہ مغلوب ہو کر گرفتار ہوا۔اور درویش محمد ترخان کے خون کرنے کے الزام میں بے عزتی سے قتل کیا گیا۔

درویش محمد ترخان:

ابوالعلی ترخان کا لڑکا درویش محمد ترخان ایک اور امیر تھا۔وہ سلطان احمد مرزا اور سلطان محمود مرزا کا حقیقی

۵۰۔رونمائی کی رسم۔شادی کی رسموں میں سے ایک رسم جس میں گھونگٹ بچے سے اٹھوایا جاتا تھا۔فرغنہ میں اب اس کا رواج نہیں رہا۔

رونمائی پاکستان وہند میں بطور رسم کبھی رائج نہیں رہی۔چنانچہ سید احمد دہلوی نے اپنی کتاب ''رسوم دہلی'' میں اس کا ذکر نہیں کیا،لیکن گھونگٹ اٹھانا عام فہم ہے۔شادی بیاہ کا ایک گیت ہے۔

گھونگٹ والی گھونگٹ کھول
اے ہریالی گھونگھٹ کھول

(فرہنگ آصفیہ ۳:۱۴۵)

ہندوستان و پاکستان میں گھونگٹ رفتہ رفتہ اٹھا کرتا تھا۔

مشتاق، بے قرار ہیں دیدار کے لئے
گھونگٹ تو اپنے مکھڑے سے ظالم ذرا ہٹا

(فسانہ آزاد)

(مہذب اللغات ۱۱ ۴۸)

۵۱۔گھوڑے۔پہلی جنگ عظیم ۱۸۔۱۹۱۴ تک گھوڑے جنگوں میں کام آتے رہے۔اس سے پہلے تو جنگوں میں گھوڑوں کا حصہ بہت زیادہ ہوتا تھا۔

دنیا میں سب سے بہتر گھوڑے عربی نسل کے ہوتے ہیں۔ان کی خوبصورتی سڈول جسم۔متناسب اعضا اور درمیانہ قد مشہور ہے۔ان کی رفتار تیز،ان کی چھلانگیں اونچی اور لمبی اور ان کی قوت برداشت نہ قابل یقین ہوتی ہے۔بوقت ضرورت کم خوراک پر بھی گزارہ کر لیتے ہیں اور عادتاً اطاعت گزار نرم خو اور سوار کے اشارے پر بے دھڑک جنگ میں کود جانے والے۔اگر سوار گر جائے تو اس کی دیکھ بھال بھی کرتے ہیں۔(تاریخ رپورٹس ص ۱۵۸)

دوسرے نمبر پر ترکستان کے گھوڑے ہیں۔یہ قد میں عرب گھوڑوں سے اونچے اور جسامت میں بڑے ہوتے ہیں۔ان کی خصوصیات میں ان کی طاقت اور تیز رفتاری شامل ہیں۔عربی گھوڑوں کے مقابلے میں ترکستان کے گھوڑوں کا جسم لمبوترا ہوتا ہے۔سینہ گولائی لئے ہوئے نہیں ہوتا۔ٹانگیں لمبی اور ان پر گوشت کم ہوتا ہے ان کا سر بڑا ہوتا ہے۔ان کا پچھلا حصہ انتہائی طاقتور اور کندھے مضبوط ہوتے ہیں۔ان کی ہڈیاں زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔ان میں قوت برداشت بے انتہا ہوتی ہے۔ رفتار تیز ہوتے ہیں اور یہ اپنا سفر کئی دن تک کم سے کم خوراک میں کر سکتے ہیں۔ان گھوڑوں کی پرورش وسط ایشیا کے جنوبی

ماموں تھا وہ مرزا کے تمام امرا میں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ معتبر تھا۔ حقیقی مسلمان درویش صفت انسان تھا جانوروں کی پرورش و نگہداری کے فن سے خوب واقف تھا۔ سلطان علی مرزا اور بایسنغر مرزا کے درمیان جنگ میں اس وقت جب کہ اس کی امارت عروج پر تھی ذلت ورسوائی کی حالت میں فوت ہوا۔

عبدالعلی ترخان:

ایک اور امیر عبدالعلی ترخان تھا۔ اس کی درویش محمد ترخان کے ساتھ قریبی رشتہ داری تھی کیونکہ درویش محمد ترخان کی چھوٹی بہن اس سے منسوب تھی اور وہی باقی ترخان کی ماں تھی۔ اگر چہ درویش محمد ترخان اپنے جاہ ومرتبے میں اس سے بڑا تھا مگر وہ اس فرعون کو خاطر میں نہ لاتا تھا، کچھ عرصے تک وہ بخارا کا حکمران رہا۔ اس کے خدام و حشم کی تعداد تین ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ وہ اچھے نوکر وملازم رکھتا اور ان کی خوب نگہداری کرتا، اس کی تجسس وخبر گیری وجستجو، پرستش وکاوش کے اطوار اور دیوان، درگاہ مہمان نوازی و مجلس کے آداب شاہانہ تھے۔ ضابطہ کا پابند، ظالم، فاسق اور خودسر آدمی تھا۔ شیبانی خاں اگر چہ اس کا نوکر نہ تھا مگر عرصے تک اس کے ساتھ رہا تھا۔ ادنی سلاطین میں سے اکثر نے اس کی ملازمت اختیار کی تھی۔ اور یہی امر شیبانی خاں کی ترقی اور تمام خاندانوں کی تباہی اسی عبدالعلی ترخان کی وجہ سے ہوئی۔

یوسف اوغلاقچی:

ایک اور امیر سید یوسف اوغلاقچی تھا اس کا دادا مغل قبائل میں سے تھا، اس کے باپ کو الغ بیگ مرزا نے بہت سی مراعات دے رکھی تھیں اس کی رائے وتدبیر بہت عمدہ تھی۔ دلیر آدمی تھا قوبوز[52] خوب بجاتا تھا۔ پہلی مرتبہ جب وہ کابل آیا تو میرے ساتھ رہا۔ میں نے اسے بہت مراعات دیں۔ درحقیقت وہ ان کا مستحق تھا۔ پہلی مرتبہ جب میں نے ہندوستان پر لشکر کشی کا عزم کیا تو سید یوسف کو کابل میں چھوڑ آیا تھا۔ وہ اسی سال واصل بحق ہوا۔

درویش بیگ:

درویش بیگ ایک اور امیر تھا جو ایکو تیموری[53] کی نسل سے تھا۔ تیمور بیگ نے اسے بہت سی مراعات دی تھیں۔ وہ حضرات خواجہ عبیداللہ احرار کا عقیدت مند تھا۔ علم موسیقی سے بھی واقف تھا۔ موسیقی کے ساز خوب بجاتا تھا۔ طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل تھی۔ جس وقت سلطان احمد مرزا کو دریائے چیر کے کنارے شکست ہوئی تو وہ اس دریا میں غرق ہو گیا۔

محمد مزید ترخان:

محمد مزید ترخان ایک اور امیر تھا جو درویش محمد (ورق ۲۰) ترخان کا حقیقی چھوٹا بھائی تھا۔ وہ کئی سال تک ترکستان کا حاکم رہا تھا۔ جب تک کہ اس پر شیبانی خاں نے قبضہ نہ کر لیا۔ اس کی رائے وتدبیر بہت اچھی تھی لیکن گستاخ وفاسق آدمی تھا۔ دوسری اور تیسری مرتبہ جب میں نے سمرقند پر قبضہ کیا تو وہ میرے پاس آیا۔ میں نے بھی ہر مرتبہ اسے بہت سی مراعات دیں۔ کول ملک[54] کی جنگ میں مارا گیا۔

باقی ترخان:

باقی ترخان ایک اور امیر تھا۔ وہ سلطان احمد مرزا کا پھپی زاد بھائی اور عبدالعلی ترخان کا بیٹا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد بخارا کی حکومت اسے دے دی گئی تھی۔ سلطان علی مرزا کے عہد حکومت میں وہ بہت بڑا آدمی بن گیا تھا۔ چنانچہ اس کے خدم وحشم کی تعداد پانچ چھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن سلطان علی مرزا کا وہ زیادہ مطیع وفرمانبردار نہ تھا۔ اس نے شیبانی خاں سے قلعہ دبوسی میں جنگ کی اور شکست کھائی۔ اسے شکست دے کر شیبانی خاں نے

علاقے بحر کیسپین سے بحیرہ ارل تک خاص طور پر خراساں۔ خیوا اور بخارا میں ہوتی ہے۔ (تاریخی ریونیس ص ۳۱۰)

بابر نے تیچاق گھوڑوں کا ذکر کئی جگہ کیا ہے۔ تیچاق ایک مشرقی ترکی لفظ ہے۔ (تاریخ رشیدی ص ۲۶۰ نوٹ ۳) شاہ نے تو یہ بھی کہا ہے کہ ان گھوڑوں کی گردن لمبی ہوتی ہے۔ (ص ۱۷) اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ تیچاق ترکستان کا گھوڑا ہے۔ لیڈن کے مطابق تیچاق گھوڑوں کو عمدہ چالیں بھی سکھائی جاتی ہیں۔ (ص ۲۴ نوٹ ۱) (مرزا نصیرالدین حیدر ص ۲۲)

ترقی اردو بورڈ کی لغت (ج ۴) میں یہ لفظ "تیچاق" ہے اور اس کے معنی "اعلی قسم کا گھوڑا جس میں قوت برداشت بہت ہوتی ہے" دیا ہوا ہے جب کے شاہ (ص ۱۱۱) میں یہ توپچاق ہے۔

گلبدن بیگم نے ہمایوں نامے میں لکھا ہے کہ جب ماہم بیگم کابل سے ہندوستان آئیں تو مغلانیاں تیچاق گھوڑوں پر سوار تھیں۔ (ورق ۱۴ ا ے) اس پر اینٹ بیورج نے نوٹ دیا ہے کہ یہ گھوڑے اپنی رفتار اور خوبصورتی اور چال کے لئے مشہور ہیں۔ (ص ۱۰۴)

وسط ایشیا ویسے بھی گھوڑوں کی جاگیر کے طور پر مشہور ہے۔ (ہارلان، ص ۳۵) ترکستان کے گھوڑے عربی گھوڑوں کے اجداد ہی ہیں (ترکمانستان گائیڈ) آجکل ترکمانستان میں عمدہ نسل کا گھوڑا اخال تکہ کہلاتا ہے۔ اخال تکہ اور تیچاق میں کئی اقدار مشترک ہیں۔ اخال تکہ کی گردن لمبی ہوتی ہے اور جسم پر کافی پیچھے ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ گردن کھڑی ہے۔ ان کا جسم پتلا، ٹانگیں لمبی ہوتی ہیں۔ اور اخال تکہ خاص طور پر لمبے فاصلوں کو طے کرنے کے لئے مشہور ہیں۔ (الزبیتھ پیلو، انسائیکلو پیڈیا اوف ہورس ص ۷۵)

اگر ہم ان مشرقی گھوڑوں کا مقابلہ یورپ کے گھوڑوں سے کریں تو ان کی عمدہ کارکردگی کا بہتر اندازہ ہو سکتا ہے۔ مرزا ابو طالب کا شمار انگلستان کے پہلے ہندوستانی سیاحوں میں ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انگلستان کے حیوانات بہت قوی الجثہ ہوتے ہیں۔ گھوڑے بوجھ کھینچنے کے کام آتے ہیں۔ یہ تیز نہیں دوڑ سکتے۔ سواری کے گھوڑے صورت میں اچھے نہیں ہوتے ہیں۔ (سفرنامہ فرنگ ص ۱۸۸) صلیبی جنگوں میں مسیحی سوار بڑے اور وزنی گھوڑوں پر زرہ بکتر پہن کر آتے تھے۔ ان کے مقابلے میں مسلمان سوار ہلکے اور تیز رفتار گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے۔ (عرب ہورس ان یورپ ص ۱۷) اسی لئے

بخارا کی جانب رخ کیا اور اس پر قبضہ کرلیا۔ اسے شکاری پرندے پالنے کا بہت شوق تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے سات سو شکاری جانور پال رکھے تھے اس کے اخلاق و اطوار ایسے نہ تھے جنہیں بیان کیا جاسکے۔ امیر زادہ تھا وودولت مندی میں پلا بڑھا تھا۔ اس کا باپ چونکہ شیبانی خاں کے ساتھ نیکی و بھلائی کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اسی لئے وہ اس کے پاس گیا۔ اس نمک حرام اور بے مروت شخص نے ان احسانات کے بدلے اس کے ساتھ کسی شفقت و مہربانی کا سلوک نہ کیا۔ چنانچہ بحالت ذلت و خواری ولایت اخسی میں اس دنیا سے کوچ کیا۔

سلطان حسین ارغون:

سلطان حسین ارغون ایک اور امیر تھا۔ چونکہ قراکول پر کچھ عرصہ تک اس کی حکومت رہی تھی اسی لئے وہ سلطان حسین قراکولی کے نام سے ہی مشہور ہو گیا تھا۔ اس کی رائے و تدبیر بہت عمدہ تھی۔ وہ بہت عرصے تک میرے ساتھ رہا۔

قل محمد بغدادقوچین:

قل محمد بغدادقوچین ایک اور امیر تھا۔ جو بہت شجیع اور بہادر انسان تھا۔

عبدالکریم اشرت:

عبدالکریم اشرت ایک اور امیر تھا جو نسلاً اویغور [55] قبیلہ کا فرد تھا۔ اور سلطان احمد مرزا کا داروغہ دیوان، فراخ دل اور بہادر آدمی تھا۔

سلطان محمود مرزا کی بادشاہت:

سلطان احمد مرزا کی وفات کے بعد امرا نے متفق ہو کر ایک قاصد کوہستاں کے راستے سے سلطان محمود مرزا کے پاس بھیجا اور اسے آنے کی دعوت دی۔ منوچہر مرزا (یعنی سلطان ابوسعید مرزا کے بڑے بھائی) کے لڑکے ملک محمد مرزا نے حکومت کے لالچ میں کچھ اوباش اور لفنگے اپنے گرد جمع کر لئے۔ انہیں ساتھ لے کر وہ فوجی چھاؤنی سے الگ ہو گیا اور سمرقند جا پہنچا۔ مگر اسے وہاں کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی البتہ اپنے اور چند بے گناہ ساتھیوں کے قتل کا سبب ہوا۔ سلطان محمود مرزا کو جیسے ہی یہ خبر ملی وہ بلا توقف سمرقند پہنچ گیا۔ اور بلا زحمت تخت سلطنت پر متمکن ہو گیا۔ سلطان محمود مرزا نے بعض اقدامات ایسے کیئے جن کے باعث اعلیٰ و ادنیٰ سپاہ و رعیت کے افراد متنفر ہو کر فرار اختیار کرنے لگے۔ پہلا قدم تو اس کا یہ تھا کہ اس نے ملک محمد مرزا کو جو اس کا چچازاد بھائی اور داماد تھا چار دیگر مرزاؤں کے ساتھ کوک سرائے میں [56] بھیج دیا۔ ان میں سے دو کو تو اس نے چھوڑ دیا ملک محمد مرزا کو ایک اور مرزا کے ساتھ شہید کر دیا۔ اگر چہ ملک محمد مرزا کا تھوڑا سا قصور تھا مگر دوسرا مرزا تو بے گناہ تھا۔ دوسرا قدم یہ کہ چونکہ وہ خود ظالم و فاسق آدمی تھا، اسی لئے اس کے تمام امیر اور نوکر بھی ظالم و فاسق تھے۔ اہل حصار بالخصوص وہ جماعت جس کا تعلق خسرو شاہ سے تھا سب کے سب میخواری اور زناکاری میں اس حد تک غرق تھے کہ خسرو شاہ کے نوکروں (ورق ۲۱) میں سے ایک شخص دوسرے شخص کی بیوی کو گھسیٹ کر زبردستی اپنے ساتھ لے گیا۔ جب اس عورت کے شوہر نے خسرو شاہ فریاد سے کر کے دادرسی چاہی تو اس نے کہا کہ وہ عورت اتنے سال تک تیرے ساتھ رہی اب چند روز تو اسے اس کے ساتھ رہنے دے۔ اگر چہ اس کا نظم نسق بہت عمدہ تھا۔ اس نے اپنا دیوان اشعار مرتب کیا تھا اور علم سیاق [57] سے بھی خوب واقف تھا مگر طبیعت ظلم و فسق و فجور کی جانب مائل تھی۔ سمرقند پہنچتے ہی اس نے نظم و نسق اور آمد و خرچ کی بنیاد دوسرے طریقے پر رکھی۔ اس نے حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کے متعلقین کے ساتھ بھی جور و ستم کا سلوک کرنا شروع کر دیا۔ اس سے قبل بہت سے فقرا و مساکین آپ کی حمایت

مسلم سوار پلٹ کر حملہ کرتے تھے اور بار بار جھپٹ کر آتے تھے۔ لیکن مسیحی سواروں کو ان حرکات میں دقت ہوتی تھی۔

گھوڑوں کی ہندوستان تجارتی درآمد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب ابن بطوطہ ہندوستان آیا (۷۳۴/۱۳۳۳) تو اس کے قافلے میں چار ہزار گھوڑے شامل تھے۔ (ابراہیم نعمت اللہ۔ ابن بطوطہ ص ۱۴۳)۔ مارکوپولو نے بھی ہندوستان میں گھوڑوں کی درآمد کا ذکر کیا ہے (ص ۵۳) اس نے ایران و چین کا سفر تیرھویں صدی میں کیا تھا۔

۵۲۔ قوبوز۔ ستار کی طرح کا موسیقی کا ساز، یہ مسلمانوں کے ساتھ مشرق وسطی سے وسطی ایشیا میں آیا۔ شمالی افریقہ کا العود اور اسپین کا قطارہ اس کی جدید طرزیں ہیں۔ (میوزیکل ص ۴۷)

۵۳۔ ایگو تیمور ترخاں ارغوں (وفات ۷۹۳/۱۳۹۱) امیر تیمور کا دوست تھا۔ (اینٹ بیورج ص ۳۹ نوٹ ۴)

۵۴۔ کول ملک کی جنگ ۹۱۸/1512 میں ہوئی۔

۵۵۔ اویغور۔ ایک ترکی قبیلہ۔ ان کی حکومت آٹھویں صدی عیسوی میں جھیل بالکش کے پاس تھی۔ (تھیکسٹن ص ۵۷ نوٹ ۶۴)

۵۶۔ کوک سرائے۔ شہر سمرقند کا قلعہ جہاں بادشاہان، سلاطین اور باغیوں کو تخت یا تختہ کے لئے لایا جاتا تھا اب اس جگہ چوراہا ہے۔ قلعہ کے ایک باورچی خانے کا حصہ ہوٹل افراسیاب کی تعمیر کے دوران برآمد ہوا جس کو ایک سے خانے کے بیچ میں لے لیا گیا ہے۔ باورچی خانے کے تین تنور اور فرش قائم ہے۔ کمزور اعتقاد کے نشہ باز اب تنور میں ازبکی سوم ڈالتے ہیں اور شاید مرادیں بھی مانگتے ہیں۔

۵۷۔ علم سیاق۔ علم حساب۔

سے ظلم وتعدی سے نجات پاتے تھے۔ اس کا دست جور و تعدی حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کی آل اولاد تک دراز ہونے لگا۔ صرف اہل شہر و بازار کے نوعمر لڑکوں سے ہی نہیں بلکہ ترک سپاہ کے بچوں کو بھی پکڑ کر لوگ ان کے ساتھ منہ کالا کرنے لگے تھے، اسی لئے کوئی شخص گھر سے نکلنے کی جرات نہ کرتا۔ وہ لوگ جو پچیس سال تک سلطان احمد مرزا کے عہد حکومت میں رفاہ فراغت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے اور اکثر معاملات حضرت خواجہ کے وجود مبارک کے باعث عدل و شریعت کے مطابق طے پاتے تھے اس جور و ستم اور فسق و فجور سے تنگ آ گئے چنانچہ وضیع و شریف اور مسکین و فقیر لوگ زبان سے کوسنے اور ہاتھ اٹھا کر اس کے حق میں بد دعا کرنے لگے۔

حزر کن زدر ددرو نهای ریش — که ریش درون عاقبت سر کند
بهم بر مکن ناتوانی دلی — که آهی جهانی بهم بر کند

(وہ لوگ جن کے دل چاک ہیں ان کی آہ سے بچ۔ کیونکہ جن کے دل چاک ہیں ان کی بد دعا آخر کار اثر کرتی ہے۔ جس حد تک ممکن ہو سکے کسی کے دل کو آزار مت پہنچا۔ کیونکہ ایک آہ ساری دنیا کو تہ و بالا کر سکتی ہے)۔

سمرقند میں اس کی حکومت پانچ چھ ماہ سے زیادہ قائم نہ رہ سکی۔

واقعات ۹۰۰ ھ

(۲ اکتوبر ۱۴۹۴ ۔ ۲۰ ستمبر ۱۴۹۵ء)

اس سال سلطان محمود مرزا کی جانب سے عبدالقدوس نامی ایلچی میرے پاس آیا۔ وہ اس کے بڑے لڑکے سلطان مسعود مرزا کی شادی کا تحفہ لے کر آیا تھا جس کی اس نے باقاعدہ بڑی دھوم دھام سے اپنے بڑے بھائی کی دوسری لڑکی آق بیگم سے شادی کی تھی۔ تحفے کے سامان میں پستہ و بادام کی شکل کی ڈلیاں سونے اور چاندی سے بنائی گئی تھی۔ اس ایلچی کی بظاہر حسن یعقوب سے کوئی رشتہ داری تھی۔ لیکن در پردہ اس کو ملانے کی کوشش۔ حسن یعقوب نے ہر بات کا جواب نرمی سے دیا اور یہ ظاہر کیا کہ اس کا رجحان اس ہی کی جانب ہے اور اسے اپنے پاس سے رخصت کیا۔

پانچ چھ ماہ بعد حسن یعقوب کے مزاج میں فتور آ گیا۔ اور وہ میرے نزدیکی لوگوں کے ساتھ بدمعاشی پر اتر آیا۔ بات یہاں تک پہنچ گئی کہ اس نے مجھے نظرانداز کر کے جہانگیر مرزا کو بادشاہ بنانا چاہا۔ حسن یعقوب کا سلوک امرا کے ساتھ بھی اچھا نہ تھا۔ اس کے اس ارادے سے تمام لوگ واقف ہو چکے تھے۔ چنانچہ خواجہ قاضی، قاسم قوچین، علی دوست، اوزون حسن و دیگر حکومت کے خیر خواہ میری نانی ایسن دولت بیگم کے پاس آئے اور یہ بات طے پائی کہ حسن یعقوب کو معزول کر کے فتنے کو خاموش کر دینا چاہئے۔ رائے و تدبیر کے اعتبار سے میری نانی ایسن دولت بیگم جیسی عورتیں کم ہوں گی۔ وہ بہت دور اندیش اور مدبر خاتون تھیں۔ اکثر کام ان کے مشورے سے ہی کئے جاتے تھے[1]۔ حسن یعقوب اندرون قلعہ تھا۔ اور میری والدہ اور نانی قلعہ سنگین میں مقیم تھیں۔ چنانچہ اس ارادے سے میں سوار ہو کر قلعہ کی جانب روانہ ہوا۔ اس (ورق ۲۲) وقت وہ شکار کھیلنے گیا ہوا تھا۔ جیسے ہی اسے میری آمد کی خبر ہوئی اس نے وہیں سے سمرقند کی جانب رخ کیا۔ وہ امرا جو اس کے ساتھ تھے۔ انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ جن میں محمد باقر بیگ، سلطان محمود دولدائی (سلطان محمد دولدئی کا باپ) اور دیگر امرا شامل تھے۔ ان میں سے بعض کو سمرقند جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اندجان کی حکومت اور درون خانہ امور کی مختاری قاسم قوچین کو سونپی گئی۔ حسن یعقوب اگرچہ سمرقند کے ارادے سے روانہ ہوا تھا۔ مگر ابھی کند بادام تک ہی پہنچا تھا کہ چند روز بعد اپنے فاسد خیالات کی بنا پر اس نے اخسی کو لینے کا ارادہ کیا اور کوکند اور چین کے نواح میں پہنچ گیا۔ یہ خبر پا کر میں نے بعض جوان امرا کو اس پر حملہ کرنے کے لیے منتخب کیا۔ چنانچہ جن امرا کو حملے کے لئے منتخب کیا تھا انہوں نے ایک قراول دستہ تیار کیا۔ حسن یعقوب کو جیسے ہی اس کی اطلاع ملی اس نے راتوں رات اس دستہ کا محاصرہ کر کے تیروں سے یورش شروع کر دی۔ رات کی تاریکی میں حسن یعقوب کے آدمیوں میں سے ہی ایک کا تیر اسی کو لگا۔ اور اس سے قبل کہ وہ فرار ہوتا اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔

چو بد کردی مباش ایمن ز آفات
کہ واجب شد طبیعت را مکافات

(جب تو نے برائی کی ہے تو بلا سے خود کو محفوظ نہ سمجھ، کیونکہ قدرت کی طرف سے اس کا بدلہ ملنا ضروری ہے۔)

اسی سال میں نے مشتبہ کھانوں سے گریز کرنا شروع کر دیا۔ صرف کھانے ہی نہیں بلکہ چھری، کانٹے اور دسترخوان کے استعمال میں بھی احتیاط سے کام لیا جانے لگا۔ نماز تہجد بھی کم ہی ترک ہوتی۔

[1] اس سال ہجری حساب سے بابر کی عمر بارہ سال تھی۔ حکومت کے سارے فیصلے ایسن دولت بیگم ہی کرتی تھیں۔

سلطان محمود مرزا

ربیع الآخر (جنوری ۱۴۹۵) میں سلطان محمود مرزا سخت بیمار ہوا۔ اور چھ دن میں ہی اس عالم فانی سے کوچ کر گیا۔ اس وقت اس کی عمر تینتالیس سال تھی۔

سلطان محمود مرزا کی ولادت ۸۵۷ ہجری (۱۴۵۳ء) میں ہوئی تھی۔ وہ سلطان ابوسعید مرزا کا تیسرا لڑکا تھا اور سلطان احمد مرزا کا حقیقی بھائی۔ وہ پستہ قد آدمی تھا۔ ڈاڑھی چھدری تھی۔ بے ہنگم اور بے فیض آدمی تھا۔ وہ نماز ترک نہیں کرتا تھا۔ اس کا نظم ونسق بہت عمدہ تھا۔ علم سیاق خوب جانتا تھا۔ اس کی ولایت کا ایک درہم و دینار بھی اسے اطلاع کئے بغیر خرچ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ملازمین کے سامان خورد ونوش میں ہرگز کمی نہیں آنے دیتا تھا۔ ان تمام امور میں ایک معقول ضابطہ واصول تھا۔ جو نظم ونسق اس نے مرتب کیا تھا۔ اس سے کوئی بھی سپاہی اور رعیت کا فرد قطعی تجاوز نہیں کر سکتا تھا۔ ابتدا میں وہ پرندوں کا شکار کرنے کے لئے بہت تگ ودو کرتا تھا۔ مگر آخر میں ہانکے کے ذریعے جانوروں کا شکار زیادہ کرنے لگا تھا۔ ظلم وستم اور فسق وفجور سے اسے دلی خوشی ہوتی تھی۔ مسلسل شراب پیتا تھا۔ حسین امرد بہت پال رکھے تھے۔ اس کی قلمرو میں جہاں کہیں بھی خوبصورت بے ریش لڑکا نظر آجاتا وہ کسی نہ کسی طرح اسے حاصل کر کے اس کے ساتھ اغلام کرتا۔ وہ اپنے امرا کے لڑکوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ اپنے لڑکوں کے امرا کے بچوں اور اپنے بچوں اور اپنے دودھ شریک بھائیوں سے بھی اس فعل کا مرتکب ہوتا۔ یہ بدفعلی اس کے زمانے میں ایسی عام ہوگئی تھی کہ کوئی بھی شخص ایسا نظر نہیں آتا تھا جس کے پاس کوئی امرد نہ ہو۔ امرد پرستی کو درست اور اس فعل سے اجتناب کو عیب سمجھا جانے لگا تھا۔ اس کے ظلم وستم اور فسق وفجور کا ہی نتیجہ تھا کہ اس کے لڑکے جوانی میں ہی چل بسے۔ طبیعت میں شاعری کی جانب بھی رجحان تھا۔ اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ لیکن اشعار بہت (ورق ۲۳) ست و بے مزہ کہتا، اس طرح کا کلام کہنے سے نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ اپنے عقیدے میں بھی وہ راسخ نہ تھا حضرت خواجہ عبیداللہ کی عزت نہیں کرتا تھا۔ بزدل آدمی تھا۔ جس میں شرم وحیا بھی کم تھی۔ چند مسخرے اپنے گرد جمع کر رکھے تھے۔ جو ایوان میں سرعام لوگوں کے سامنے گری ہوئی حرکات کرتے اور بیہودہ نقلیں اتارتے۔ اس کی زبان بھی صاف نہیں تھی۔ اسی وجہ سے اس کی بات فوراً سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اس نے سلطان حسین مرزا کے ساتھ دو مرتبہ جنگ کی۔ پہلی جنگ استرآباد میں ہوئی۔ جس میں وہ شکست سے دوچار ہوا اور دوسری جنگ اندخود کے نواح میں چکمان کے مقام پر ہوئی۔ یہاں بھی اس نے شکست کھائی۔ دو مرتبہ اس نے بدخشاں کے جنوب میں کافرستان پر جہاد کیا۔ اسی وجہ سے فرامین کے طغروں میں اسے سلطان محمود غازی لکھا گیا ہے۔

سلطان ابوسعید مرزا نے اس کو استرآباد کا علاقہ دے دیا تھا۔ عراق میں تباہی[۲] کے بعد وہ خراسان چلا آیا۔ انہی دنوں حصار کے حاکم قنبر علی بیگ نے سلطان ابوسعید کے حکم سے ہندی فوج لے کر ابوسعید کے عقب میں عراق سے خراسان گیا اور سلطان محمود مرزا سے جاملا۔ خراسان کے لوگوں کو جیسے ہی سلطان حسین مرزا[۳] کے آنے کی خبر ملی انہوں نے سلطان محمود مرزا کے خلاف یورش کردی اور اس کو وہاں سے نکال باہر کیا۔ وہاں سے وہ سلطان احمد مرزا کے پاس سمرقند گیا۔ چند ماہ بعد احمد مشتاق، سید بدر، خسرو شاہ اور بعض دیگر امرا سلطان محمود مرزا کو لے کر وہاں سے حصار قنبر علی بیگ کے پاس پہنچے۔ جس کی وجہ سے وہ قہلغہ[۴] اور وہ ولایات جو کوہ کوتین کے جنوب میں واقع ہیں، یعنی ترمذ، چغانیان، حصار، ختلان، قندوز، بدخشان سے کوہ ہندوکش تک سلطان محمود مرزا کے تحت تصرف آگئے۔ اور اس کے بڑے بھائی سلطان احمد مرزا کی وفات کے بعد بھائی کی ولایات

۲۔ عراق میں تباہی: اس سے مراد سلطان ابوسعید مرزا کی ایران میں شکست اور ان کا قتل ہے۔ مرزا ابوسعید عراق (ایران) امیر حسن بیگ سے مقابلہ کرنے گئے تھے۔ کچھ آفات سماوی اور کچھ امیروں کی دغا بازی سے پکڑے گئے (خواند امیر ص ۹۳) اور ۸۷۳/۶۹-۱۴۶۸ میں قتل کر دیے گئے (تاریخ رشیدی ص ۹۳/ بیرم خاں ص ۵)

۳۔ سلطان ابوسعید کے بعد خراساں پر سلطان حسین مرزا کی حکومت قائم ہوئی (دولت شاہ، تذکرۃ الشعراء، ص ۵۴۴)

۴۔ قہلغہ۔ کش (شہر سبز) کے جنوب میں واقعہ ہے۔ بابر یہاں جن جگہوں کا ذکر کرتا ہے وہ آج کل شمالی افغانستان اور جنوبی تاجکستان واز بکستان میں شامل ہیں۔

۵۔ پاشا بیگم۔ یہ علی شکر بیگ کی بیٹی اور بیرم خاں کی پردادی ہیں (بیرم خاں ص ۶)

پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔

اولاد:

اس کے پانچ لڑکے اور گیارہ لڑکیاں تھیں۔ سلطان مسعود مرزا اس کا بڑا بیٹا تھا۔ اس کی ماں خوانزادہ بیگم، میر بزرگ ترمذی کی بیٹی تھی۔ دوسرے لڑکے کا نام بایسنغر مرزا تھا۔ اس کی ماں پاشا۵ بیگم تھی۔ تیسرا لڑکا سلطان علی مرزا تھا۔ جس کی ماں ازبک نسل تھی اور اس کا نام زہرہ بیگی آغا تھا۔ جو اس کی داشتہ تھی۔ چوتھا لڑکا سلطان حسین مرزا تھا۔ اس کی ماں خانزادہ بیگم، میر بزرگ کی پوتی تھی۔ یہ لڑکا مرزا کی حیات میں ہی تیرہ سال کی عمر میں خدا کو پیارا ہو گیا۔ پانچواں لڑکا سلطان ویس مرزا تھا۔ اس کی والدہ یونس خاں کی بیٹی اور میری والدہ سلطان نگار خانم کی چھوٹی بہن تھی۔ ان چاروں مرزاؤں کے حالات آئندہ سال کے واقعات کے تحت بیان کئے جائیں گے۔

تین لڑکیوں کی ولادت بایسنغر مرزا کی والدہ کے بطن سے ہوئی تھی۔ وہ اس کے حقیقی بہنیں تھیں۔ اس میں سے سب سے بڑی لڑکی کی شادی سلطان محمود مرزا نے اپنے چچا منوچہر مرزا کے لڑکے ملک محمد مرزا سے کر دی تھی۔ اور پانچ لڑکیاں میر بزرگ کی پوتی خانزادہ بیگم کے بطن سے تھیں۔ سلطان محمود مرزا کی وفات کے بعد ان میں سے سب سے بڑی لڑکی کی شادی ابا بکر کاشغری کے ساتھ کر دی گئی۔ دوسری لڑکی کا نام بیگہ بیگم تھا۔ سلطان حسین مرزا نے اس کی شادی اس وقت جب اس نے حصار کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اپنے لڑکے حیدر مرزا سے جو سلطان ابو سعید مرزا کی بیٹی پاینده سلطان بیگم کے بطن سے تھا، کر دی۔ اس کے بعد اس نے اس کے ساتھ صلح کا معاہدہ کر کے حصار کا محاصرہ اٹھا لیا۔ تیسری لڑکی آق بیگم تھی۔ (ورق ۲۴) اس کی چوتھی لڑکی کی نسبت عمر شیخ مرزا نے اپنے چھوٹے لڑکے جہانگیر مرزا سے اس وقت کی تھی، جب کے سلطان حسین مرزا نے قندوز پر چڑھائی کی تھی اور عمر شیخ مرزا نے اسے (جہانگیر مرزا) کو لشکر کے ہمراہ مدد کے لئے روانہ کیا تھا۔ سنہ ۹۱۰ ہجری (۱۵۰۴۔ ۱۵۰۵ء) میں جس وقت باقی چغانیانی نے دریائے آمو کے کنارے پہنچ کر میری ملازمت اختیار کی تو یہ بیگمات اپنی ماؤں کے ساتھ ترمذ میں تھیں۔ یہ بھی باقی چغانیانی کی خواتین کے ہمراہ آئیں اور انہی کے ساتھ روانہ ہو گئیں۔ کہمرد پہنچ کر جہانگیر مرزا نے اس سے شادی کر لی۔ جس کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی۔ اس وقت سے وہ اپنی نانی خوانزادہ بیگم کے ساتھ ولایت بدخشان میں ہے۔ پانچویں لڑکی زینت سلطان بیگم تھی۔ جس وقت میں نے کابل فتح کر لیا تو اپنی والدہ قتلق نگار خانم کی سعی و کوشش کے بعد میں نے اس سے شادی کر لی۔ لیکن یہ رشتہ ازدواج سازگار ثابت نہ ہوا کیونکہ دو سال بعد چیچک کے مرض میں مبتلا ہو کر وہ اس عالم فانی سے کوچ کر گئی۔ چھٹی لڑکی مخدوم سلطان بیگم تھی جو سلطان علی مرزا کی حقیقی بہن تھی۔ اور عمر میں اس سے بڑی تھی۔ اب وہ بدخشان میں مقیم ہے اس کی اور دیگر لڑکیاں زینت سلطان اور محب سلطان اس کے حرم کے بطن سے تھیں۔

بیگمات:

اس کی سب سے بڑی بیگم میر بزگ ترمذی کی لڑکی خانزادہ بیگم تھی۔ جس کو وہ بہت زیادہ چاہتا تھا۔ سلطان مسعود مرزا کی ولادت اسی کے بطن سے ہوئی تھی۔ بیگم کی وفات کا اسے بہت زیادہ صدمہ ہوا۔ اس کے بعد میر بزگ کی پوتی خوانزادہ کی بھتیجی سے اس کی شادی کر دی گئی۔ اس کا نام بھی خوانزادہ ہی تھا۔ اس کے بطن سے پانچ لڑکیوں اور ایک لڑکے کی ولادت ہوئی۔ اس کی تیسری زوجہ پاشا بیگم علی شکر بیگ بہارلو کی بیٹی تھی۔ جس کا شمار ترکمان قبیلے قراقوینلو کے امرا میں ہوتا تھا۔ پاشا بیگم کی پہلی شادی جہاں شاہ بارانی قراقوینلو کے لڑکے محمدی مرزا سے ہو چکی تھی۔ جس وقت اوزون حسن آق قوینلو نے جہان شاہ کے لڑکوں کو عراق اور آذربائیجان کے علاقے سے بے دخل کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ تو علی شکر بیگ کے لڑکے چار، پانچ ہزار ترکمان قراقوینلو خاندان کے ہمراہ سلطان

ابوسعید مرزا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔اور ابوسعید کے قتل کے بعد ماوراء النہر میں آگئے اور انہی ولایات میں رہ گئے۔جس وقت سلطان محمود مرزا سمرقند سے حصار پہنچا تو یہ اس کے ملازم ہو گئے۔[6] مرزا نے پاشا بیگم سے شادی اس ہی وقت کر لی تھی۔اس کے بطن سے ایک لڑکا اور تین لڑکیاں ہوئیں۔اس کی چوتھی بیوی کا نام سلطان نگار خانم تھا۔جس کے نسب کے بارے میں واقعات خانان میں تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے۔

اس کے پاس بہت سی حرمیں بھی تھیں۔اس عورتوں میں زہرہ بیگی آغا سب سے زیادہ منہ چڑھی تھی۔وہ اوزبک نسل کی تھی۔جسے اس نے سلطان ابوسعید مرزا کی حیات ہی میں حاصل کر لیا تھا۔اس کے بطن سے ایک لڑکے اور ایک لڑکی کی ولادت ہوئی۔حرم عورتوں کے علاوہ اس کی سریتیں[7] بھی بہت تھیں۔ان میں سے دو نے دو لڑکیوں کو جنم دیا تھا،ان کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

امرا

امیر خسرو شاہ:

ان میں پہلا امیر خسرو شاہ تھا۔وہ ترکستان کا باشندہ اور قپچاق[8] قبیلے کا فرد تھا۔بچپن میں وہ ترخان امرا کے پاس رہ چکا تھا۔اس کے بعد اس نے مزید بیگ کی ملازمت اختیار کر لی اور اس سے بہت سی مراعات حاصل کیں۔عراق میں تباہی کے وقت وہ سلطان محمود مرزا کے ساتھ رہا۔جس وقت وہ وہاں سے واپس آ رہا تھا تو چونکہ اس نے قابل قدر خدمات انجام دی تھیں اسی لئے مرزا نے اسے بہت سی مراعات دیں اور آخر میں تو وہ بہت بڑا امیر بن گیا۔(ورق ۲۵) سلطان محمود مرزا کے عہد میں اس کے نوکروں کی تعداد پانچ چھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔بدخشان کے علاوہ دریائے آموسے کوہ ہندوکش تک کے علاقے پر اس کی حکومت اور قبضہ تھا۔جس کا پورا لگان وہی وصول کرتا۔اس کا دسترخوان وسیع تھا،اور خود بھی سخی تھا۔ترک ہونے کے باوجود کمانے میں بڑا محنتی تھا اور جو کچھ کماتا اسے دل کھول کر خرچ بھی کرتا۔سلطان محمود مرزا کے بعد اس کے لڑکوں کے عہد میں اس نے بہت زیادہ ترقی کی۔چنانچہ اس کے ملازمین کی تعداد بیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔اگر چہ نماز پڑھتا تھا مگر سیاہ قلب اور فاسق آدمی تھا۔بے عقل و شعور،بے وفا اور نمک حرام تھا۔اس چند روزہ دنیا فانی کے خاطر اس نے اپنے ایک ولی نعمت کے لڑکے کو جس کی اس نے خود خدمت کی تھی اور اسے اپنے ساتھ بھی رکھا تھا،اندھا کر دیا اور دوسرے کو مار ڈالا۔بارگاہ خالق باری میں گناہ گار اور مخلوق کی نظروں میں وہ مردود تھا اور تا قیامت وہ لعنت و ملامت کا مستحق و سزاوار ہو کر رہ گیا۔اس جہان فانی کے لئے اس نے کیا کیا سوائے بداعمالیوں کے،اور اس قدر وسیع و آباد مملکت،عظیم لشکر اور ساز و سامان کے باوجود اس کے ہاتھ ایک چوزہ تک نہ لگا۔اس کا ذکر اس کتاب میں آئندہ آئے گا۔

پیر محمد ایلچی بوغا قوچین:

ایک اور امیر،پیر محمد ایلچی قوچین تھا۔دروازہ بلخ پر ہزار اسپ نامی جنگ[9] میں سلطان ابوسعید مرزا کے سامنے خوب گھونسم گھونسا لڑا تھا۔دلیر آدمی تھا۔اور ہمیشہ محمود مرزا کی خدمت میں حاضر رہتا۔مرزا بھی اس کے مشورے پر عمل کرتا۔جس وقت سلطان حسین مرزا نے قندوز کا محاصرہ کر لیا تو خسرو شاہ کے خلاف کم فوج اور قلیل لشکر سے شب خوں مارا لیکن کچھ کر نہ سکا جب اس کا تعاقب کیا گیا تو دریا میں کود گیا،اور اس میں غرق ہو گیا۔

ایوب بیگ چک مغل:

ایک اور امیر ایوب تھا۔وہ سلطان ابوسعید مرزا کا ملازم اور خراسان کے نوجوانوں کی فوج میں شامل تھا۔بہادر انسان تھا۔اور سلطان بایسنغر مرزا کی سرکار کا مختار۔خورد و نوش اور پوشاک میں اسراف کرتا۔مسخرہ اور

۶۔قراقو ینلو کی ہجرت۔پیر علی بیگ بن علی شکر بیگ اور دوسرے سردار قراقو ینلو سلطان محمود مرزا کے پاس حصار شادمان آگئے تھے (بیرم خاں،ص ۶)

۷۔سریتیں۔داشتائیں

۸۔قپچاق۔ایک ترکی قبیلہ اور ایک دشت کا نام بھی۔اس قبیلے کا ذکر کیمک قبائل کے ذکر میں آتا ہے۔حدود عالم کے مطابق قپچاق قبیلہ کیمک سے الگ ہو گیا تھا۔کیمک قبائل دریائے ارتش کے پاس آباد تھے،جو سائبیریا کے وسط سے گزرتا ہے۔یہ قبائل دریائے ارتش سے بحیرہ اسود کی طرف ہجرت کر گئے۔اسی لئے بحیرہ کیسپین (قزوین) اور بحیرہ اسود کا اوپری علاقہ دشت قپچاق کہلاتا ہے۔جو لوگ دشت قپچاق کے جنوبی علاقوں میں بسے ہوئے تھے ان کے تجارتی تعلقات مسلم ممالک سے زیادہ تھے اور ان ہی میں اسلام زیادہ پھیلا (حدود عالم ص ۱۰۱،۳۱۵، انسائیکلوپیڈیا اسلام)

۹۔یہ جنگ ۸۵۸/۱۴۵۴ میں سلطان ابوسعید مرزا اور امیر پیر درویش ہزار اسپی کے درمیان بلخ میں ہوئی تھی جہاں امیر بھائیوں کا خاتمہ ہو گیا تھا (خواند امیر ۴:۵۲)

فضول گو آدمی تھا۔ سلطان محمود مرزا اسے بے حیا کہہ کر مخاطب کرتا۔

ولی:

ایک اور ولی تھا خسرو کا چھوٹا بھائی، وہ اپنے ملازمین کی خوب نگہداشت کرتا۔ سلطان مسعود مرزا کی آنکھوں میں سلائی پھرائے جانے اور بایسغر مرزا کے قتل کئے جانے کا باعث یہی شخص تھا۔ وہ ہر ایک کی برائی کرتا۔ بدزبان، فحش گو، خود پسند اور تیز وطرار قسم کا آدمی تھا۔ اپنے علاوہ اسے کسی کا کوئی کام پسند نہ آتا تھا۔ جس وقت ولایت قندوز میں کیلکاری اور روشی کے نواح میں خسرو شاہ کو اس کے ملازمین سے علیحدہ کر کے اسے جانے کی اجازت دی، تو وہ بھی ازبکوں کے خوف سے اندراب اور سیراب کی جانب چلا گیا اور وہاں کے اطراف میں آباد قبائل نے اس کو لوٹ لیا اس کے بعد یہ قبائل کابل آگئے، تو وہ محمد شیبانی خاں کے پاس برہنہ پا آیا جس نے سمرقند میں اس کی گردن ماردیئے جانے کا حکم دیا۔

شیخ عبداللہ برلاس:

ایک اور امیر شیخ عبداللہ برلاس تھا۔ شاہ سلطان محمد کی ایک بیٹی اس کے گھر میں تھی۔ جو رشتے میں سلطان محمود خاں اور ابا بکر مرزا کی خالہ تھی۔ بھلا اور صحیح النسب آدمی تھا۔ لباس (ورق ۲۶) چست اور کلیوں دار پہنتا تھا۔

محمود برلاس:

ایک اور امیر، محمود برلاس تھا۔ جو نواندک کے برلاس قبائل میں سے تھا۔ وہ سلطان ابو سعید مرزا کے امرا میں بھی رہ چکا ہے۔

جب ابو سعید مرزا نے عراق کا علاقہ مسخر کر لیا تو اس نے کرمان محمود برلاس کو دے دیا۔ جس وقت ابا بکر مرزا، مزید بیگ ارغون اور قراقو ینلو قبیلے کے ترکمان امرا نے متحد ہو کر سلطان محمود مرزا پر حملے کے ارادے سے حصار کی جانب رخ کیا اور مرزا اپنے بھائی کے پاس سمرقند چلا گیا تو محمود برلاس نے حصار ان کے حوالے نہ کیا بلکہ اس کی اچھی طرح حفاظت ونگہداشت کی۔ وہ شعر بھی کہتا تھا اور اس نے دیوان بھی مرتب کیا تھا۔

بایسنغر مرزا:

سلطان محمود مرزا کی وفات کو خسرو شاہ نے پوشیدہ رکھ کر اس کے خزانے پر قبضہ کر لیا۔ مگر ایسی خبر لوگوں سے کس طرح پوشیدہ رہ سکتی تھی۔ چنانچہ آن کے آن میں یہ خبر پورے اہل شہر میں پھیل گئی۔ سمرقند کے لوگوں کے سامنے گویا یہ عید کا دن تھا۔ سپاہ و رعیت کے لوگ تو چاہتے تھے کہ خسرو شاہ پر یورش کر دیں مگر حاجی احمد بیگ اور ترخان امرا نے اس فتنے کو دبا دیا اور خسرو شاہ کو وہاں سے نکال کر حصار کی جانب روانہ کر دیا۔

سلطان محمود مرزا نے اپنے زمانہ حیات میں اپنے بڑے لڑکے سلطان مسعود مرزا کو حصار اور بایسنغر مرزا کو بخارا کا علاقہ دے کر انہیں اپنی اپنی مملکت کی جانب روانہ کر دیا تھا۔ چنانچہ اس کی وفات کے وقت کوئی بھی اس کے پاس موجود نہ تھا۔ خسرو شاہ کو حکومت سے بے دخل کرنے کے بعد سمرقند وحصار کے امرا نے متفق ہو کر بایسنغر مرزا کے پاس بخارا کی طرف قاصد روانہ کیا۔ اور اسے وہاں سے بلا کر سمرقند میں اس کی تخت نشینی کرائی۔ جس وقت بایسنغر مرزا تخت سلطنت پر متمکن ہوا تو اس وقت اس کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ اسی زمانے میں سلطان محمود خاں نے سلطان جنید برلاس اور سمرقند کے بعض اکابر کے اشتعال دلانے پر سمرقند کو فتح کرنے کے ارادے سے لشکر کشی کا ارادہ کیا اور کنبایی کے نواح تک پہنچ گیا۔ ادھر بایسنغر مرزا بھی اپنی کثیر فوج لے کر اور سامان جنگ سے مسلح ہو کر سمرقند سے نکل کر باہر آیا کنبایی کے نواح میں دونوں کی جنگ ہوئی۔ حیدر کوکلداش مغل فوج کا رکن اعلیٰ اور اپنے

دستے کا ہراول تھا۔اس نے اپنی پوری فوج کے ساتھ گھوڑوں پر سے اتر کر دشمن پر تیروں کی بارش شروع کر دی۔ ان جوانوں نے جو سمرقند اور حصار کے حامی و طرفدار تھے ان لوگوں کو جو حیدر کوکلداش کی قیادت میں گھوڑوں سے اتر کر پیادہ ہوئے تھے۔ اپنے گھوڑوں کے سموں تلے روند ڈالا۔ سردار لشکر کی گرفتاری کے بعد یہ جنگ جاری نہ رہ سکی اور شکست ہوئی۔ بہت سے مغل مارے گئے۔ بایسنغر مرزا نے بھی اپنی موجودگی میں بہت سے لوگوں کے سر قلم کرائے۔ اور چونکہ کثرت سے لوگ مارے گئے تھے۔ اسی لئے بایسنغر کا خیمہ تین جگہ منتقل کیا گیا۔

اسی اثنا میں ابراہیم سارو نے جو مینگلیغ [10] قوم کا فرد تھا۔ اور میرے والد کی خدمت میں بچپن سے رہنے کے باعث مرتبہ امارت تک پہنچ گیا تھا۔ لیکن پھر اپنے غلط رویے کے باعث مردود قرار دیا گیا تھا۔ قلعہ اسفرہ میں داخل ہوا اور بایسنغر مرزا کے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ اور میری مخالفت پر اتر آیا۔

جنگ اسفرہ:

ماہ شعبان میں اُس کا فتنہ دفع کرنے کے ارادے سے میں نے سواروں کا لشکر آراستہ کیا۔ (ورق ۲۷) اور اس مہینے کے آخر میں اسفرہ کا محاصرہ کر لیا۔ میرے جوانوں نے وہاں اس دیوار کے نزدیک جو قدیم قلعے کے پہلو میں اٹھائی گئی تھی اور جہاں نئے قلعے کی بنیاد رکھی گئی تھی، پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا اس روز سید قاسم ایشک آغا نے سب سے زیادہ دشمنوں کا قتل کیا اور آگے بڑھ کر اس نے خوب اپنی تلوار کے جوہر دکھائے۔ سلطان احمد تنبل نے بھی اچھی طرح شمشیر کے وار کئے اور محمد دوست طغائی نے بھی اپنی تلوار کا لوہا منوایا۔ لیکن الوش بہادری (خوان نعمت شاہی) سید قاسم کے حصے میں آیا۔

الوش بہادری:

مغل خاندان کی عہد قدیم سے یہ رسم چلی آ رہی ہے کہ دعوت و تقریب کے وقت جس شخص نے جنگ میں اپنی تلوار کے جوہر دکھائے اسے یہ خوان نعمت عطا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جس وقت میں شاہ رخیہ گیا اور وہاں میں نے اپنے ماموں سے ملاقات کی اس وقت الوش بہادری سید قاسم نے حاصل کی تھی۔ جنگ کے پہلے ہی دن میرے اتالیق خدا بردی کی وفات تخش کمان [11] کا تیر لگنے سے ہوگئی۔ ہم نے چونکہ جنگ بغیر زرہ بکتر کے کی تھی اس لئے بہت سے جوان مارے گئے اور کافی تعداد میں زخمی ہوئے۔ ابراہیم سارو کے تیراندازوں میں ایک سپاہی صلیبی کمان چلانا اچھی طرح جانتا تھا۔ ایسا اچھا نشانہ باز میں نے نہیں دیکھا تھا اس نے ہمارے بہت سے لوگوں کو زخمی کیا۔ جب قلعہ فتح ہو گیا تو اس نے میری ملازمت اختیار کر لی۔ محاصرہ نے طول پکڑا تو میں نے حکم دیا کہ تین جگہ سرکوب [12] نصب کئے جائیں اور ان سے قلعہ میں گولے پھینکے جائیں۔ نیز قلعہ فتح کرنے کے تمام اسباب و وسائل فراہم کرنے میں پوری جدوجہد اور کوشش سے کام لیں۔ قلعہ کا محاصرہ چالیس دن تک جاری رہا۔ آخر ابراہیم سارو تنگ آ گیا اور خواجہ مولانا قاضی کے توسط سے اس نے میری اطاعت قبول کر لی اور ماہ شوال (جون ۱۴۹۵ء) میں شمشیر و ترکش گردن میں لٹکا کر [13] وہ میری خدمت میں حاضر ہوا اور میری نوکری اختیار کر کے قلعہ میرے حوالے کر دیا۔

خجند کو واپسی:

خجند بھی عرصہ دراز تک عمر شیخ مرزا کی عملداری میں تھا۔ اور چونکہ لڑائی جھگڑوں کے زمانے میں مرزا کی حکومت میں ناپائیداری کے آثار پیدا ہو چلے تھے، سلطان احمد مرزا نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ کیونکہ یہ موقعہ تھا اس لئے میں نے اس پر حملہ کر دیا اس وقت خجند میں میر مغل کا باپ عبدالوہاب شغاول موجود تھا۔ میرے وہاں پہنچتے ہی اس نے قلعہ میرے حوالے کر دیا۔ ان ہی دنوں سلطان محمود خاں نے شاہ رخیہ کی جانب رخ کیا۔ اس سے قبل جس وقت سلطان احمد مرزا اندجان کے نواح میں پہنچا تو خاں بھی وہاں آ موجود ہوا اور دونوں نے اخسی کا محاصرہ

۱۰۔ مینگلیغ۔ جنگ ہزار، لیغ اس کی صفت۔ جیسے آج کل کہا جاتا ہے ایوب کپڑے والا، صفدر بمبئی والا وغیرہ (شاہ، لغت ترکی)

۱۱۔ تخش کمان۔ یہ کمانیں صلیب کی شکل کی ہوتی تھیں۔ بابر اس کے علاوہ ناوک کمان (۹۰۶ھ ورق ۷۶) اور کمان گروہہ (۹۱۱ھ ورق ۱۴۴) کا بھی ذکر کرتا ہے۔ یہ کمانیں سولھویں صدی میں عام استعمال میں تھیں اور ہو سکتا ہے اس سے پہلے بھی عام ہوں۔

امین الدین (کلیات الرامی، ۱۴تھے، ۲۷۷) نے تخش کمان کے مختلف حصوں کے نام دیئے ہیں۔ اس کے مطابق تخش کمان سے کئی تیر بھی چلائے جا سکتے ہیں اس نے ان کی تعداد سات تک بتائی ہے۔ کچھ کمانوں میں تیر رکھنے کا خانہ بھی ہوتا تھا۔ اس کے مطابق کچھ کمانیں فولاد کی بھی بنی ہوتی تھیں۔ الف پین گالوے نے ایک چینی صلیبی کمان کا ذکر کیا ہے جو انتہائی کارگزار تھی۔ اس کے خانہ میں دس تیر رہتے تھے اور پندرہ سیکنڈ میں ایک کے بعد ایک تیر مسلسل چلائے جا سکتے تھے (ص ۲۳۷)

محمد بدامی (ہدایت الرامی، ۱۴تھے ۶۸ب ۲۷) جو سید میر علوی کے نام سے زیادہ مشہور ہیں، نے ناوک کمان کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا تیر چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کو ایک نلکی میں رکھ کر چلایا جاتا ہے۔ یہ نلکی لکڑی یا دھات کی بنی ہوئی ہوتی ہے اور کمان کے تنے پر لگائی جاتی ہے۔ اسی نلکی سے آگے چل کر بندوق کی نالی ایجاد کی گئی۔ ناوک کمان بہت کارآمد ہوتی تھی۔ اس کا زخم گہرا ہوتا تھا اور اس کی رفتار سبک اسی لئے اس کو تیر کاری کہا جاتا تھا۔ جہاں یہ تیر لگتا کام کر جاتا ہے۔

آفریں تجھ کو ایک ناوک میں
جگر و دل نگار ہیں دونوں

(زکی) سید احمد دہلوی ۲:۵۴۳)

ناوک تیر و کمان کو چلانے کے لئے خاص تربیت کی ضرورت ہوتی تھی ورنہ کمان چلانے والے کا ہاتھ زخمی ہو سکتا تھا۔ اس کی کئی قسمیں بھی بیان کی گئی ہیں، جیسے ناوک مجرا، ناوک مشدود اور ناوک فرنگی۔

رامی کے معنی تیرانداز کے ہیں۔ کمان گروہہ کے متعلق تفصیلات نہیں ملتیں۔

(ہنری بیورج، اوری اینٹل کراس بوز، اے کیو آر، ۱۹۱۱:۳۴۴ اور پنت ۱۹۸۹:۳۵)

ترکستان کے علاقوں میں کمان چاچی، کمان افراسیاب اور کمان رستم کا ذکر بھی ملتا ہے۔ یہ سب کمانیں کمان

کرلیا، جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

جس وقت میرے اور ان کے درمیان فاصلہ کم ہوا تو میرے دل میں یہ بات آئی کہ چونکہ وہ میرے لئے باپ اور بڑے بھائی کی جگہ ہیں اسی لئے اگر گذشتہ کدورت دور ہو جائے تو بہتر ہے اس خیال کے دل میں آتے ہی میں نے شاہ رخیہ کے باہر اس باغ میں جسے حیدر بیگ نے لگایا تھا، خاں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت خاں اس چودری میں بیٹھا تھا جس کی بنیاد اس نے خود رکھی تھی۔ اس میں داخل ہوتے ہی میں نے تین دفعہ جھک کر سلام کیا۔ خاں نے بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر میرا احترام واستقبال کیا۔ ہم دونوں ہی اکھٹے اٹھے۔

اس نے مجھے اپنے پاس بلایا (ورق ۲۸) اور اپنے پہلو میں بٹھایا۔ وہ بہت شفقت و مہربانی سے پیش آیا۔ دو ایک روز قیام کے بعد اس کی طرف سے مطمئن ہو کر میں اخسی و اندجان کی جانب روانہ ہوا۔ اخسی پہنچ کر میں نے اپنے والد (مرحوم) کے مزار کا طواف کیا۔ نماز جمعہ کے وقت اخسی سے نکل میں بند سالار کے راستے سے مغرب اور عشا کی نماز کے درمیان اندجان پہنچا۔ اس راستے کی مسافت نو فرسنگ ہے۔

قوم چکرک سے محصول:

ولایت اندجان کے صحرانشین قبائل میں ایک قبیلہ چکرک ہے۔ اس قبیلے کی آبادی کافی ہے تقریباً پانچ چھ ہزار خاندان ہوں گے جو ولایت کاشغر اور فرغنہ کے درمیان کوہستانی علاقے میں آباد ہیں۔ ان کے پاس گھوڑے اور بھیڑیں ہیں۔ اس کوہستانی علاقے میں گائے بیل کی جگہ یاک پالتے ہیں۔ اس کے پاس یاک بھی کافی ہیں۔ جس جگہ وہ آباد ہیں وہاں چونکہ پہاڑ بکثرت اور مضبوط ہیں اس لئے ان میں خراج دینے کا رواج نہیں ان سے خراج وصول کرنے کے لئے قاسم بیگ کو سردار لشکر بنا کر چکرک قبیلے کی طرف روانہ کیا گیا تاکہ اس قبیلے سے مال حاصل کر کے لشکر کے لئے کچھ سامان مہیا کیا جاسکے۔ قاسم بیگ وہاں پہنچا اور تقریباً بیس ہزار بھیڑیں اور ہزار پندرہ سو کے درمیان گھوڑے لے کر آیا جنہیں لوگوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

اورتیپہ پر لشکر کشی

جب چکرک سے میرا لشکر واپس آگیا تو میں نے اورتیپہ کی جانب بڑھنے کا ارادہ کیا۔ یہ علاقہ ایک مدت تک عمر شیخ مرزا کے تحت تھا۔ جس سال مرزا کا انتقال ہوا تو یہ علاقہ ہاتھ سے نکل گیا۔ اس وقت اس پر سلطان علی مرزا کا قبضہ تھا۔ جو بایسنغر مرزا کی جانب سے وہاں حکمراں تھا۔ سلطان علی مرزا کو جب اس کی اطلاع ملی تو میسخا کے کوہستانی علاقے میں چلا گیا اور اپنے اتالیق شیخ ذوالنون کو اورا تیپہ میں چھوڑ کر خود خجند پار نکل گیا۔

راستے میں ہی خلیفہ کو شیخ ذوالنون کے پاس ایلچی بنا کر بھیجا۔ اس بے وقوف احمق آدمی نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ بلکہ خلیفہ کو پکڑوا کر قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ چونکہ مشیت الٰہی نہ تھی کہ اسے قتل کیا جائے اس لئے اس نے بھاگ کر نجات پائی۔ ہزاروں مصیبتوں اور مشقتوں کے بعد وہ تین دن بعد پیادہ اور برہنہ اورا تیپہ کے نواح میں مجھ سے آکر ملا۔ لوگ اناج اور جو کچھ ان کے پاس تھا سب اٹھا چکے تھے۔ اسی وجہ سے ہم واپس چلے اور چند روز بعد اندجان آگئے۔ ہمارے وہاں سے آنے کے بعد خاں کے لوگوں نے اورتیپہ کی جانب رخ کیا۔ چونکہ وہاں کے لوگ ان کا مقابلہ نہ کر سکے، اس لئے ہار کر باہر نکل آئے۔ خاں نے اورا تیپہ محمد حسین گورگان[14] کے حوالے کر دیا۔ اس وقت سے ۹۰۸ھ/۱۵۰۳ء ہجری تک اس پر محمد حسین گورگان کا تسلط رہا۔

سامانی کے تحت بیان کی جاتی ہیں۔ اس کمان کے پانچ حصے ہوتے ہیں، قبضہ، خانہ، نیم خانہ، گرشہزا اور زہ۔ تفصیل کے لئے، دیکھیں تصویر (نذیر جان ص ۳۳۰)

ترکی کمان اور اس کے پانچ حصے (نذیر جان ص:۳۳۰)

۱۲۔ سرکوب۔ مٹی یا لکڑی کا پشتہ جو قلعہ کی اونچائی کے برابر ہو تاکہ اس پر سے قلعے کے اندر گولے پھینکے جاسکیں۔

۱۳۔ ترکش اور تلوار گردن میں لٹکا کر آنا سے مراد اپنی شکست تسلیم کرنا اور جان بخشی چاہنا ہے۔

۱۴۔ محمد حسین گورگان۔ تاریخ رشیدی کے مصنف مرزا حیدر دوغلت کے والد۔ گورگانی کے معنی مغلی زبان میں داماد کے ہیں۔ امیر تیمور کے نام کے ساتھ گورگانی لگنے کے بعد اس خطاب کا رواج ہو گیا تھا۔

واقعات ۹۰۱ھ

(۲۱ ستمبر ۱۴۹۴ء - ۸ ستمبر ۱۴۹۵ء)

سلطان حسین مرزا کی حصار پر لشکر کشی:

اس سال سلطان حسین مرزا نے خراسان سے حصار پر لشکر کشی کی اور موسم سرما میں وہ ترمذ چلا گیا۔ سلطان مسعود مرزا نے بھی اپنا لشکر جمع کیا اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ترمذ آپہنچا۔ خسرو شاہ نے بھی قندوز کو محکم کر کے اپنے برادر خورد ولی کو لشکر کے ساتھ سلطان حسین مرزا کے مقابلے کے لئے روانہ کیا۔ دونوں لشکروں نے موسم سرما کا بیشتر زمانہ دریا کے کنارے گزارا۔ کیونکہ وہ اسے پار نہیں کر سکے۔ سلطان حسین مرزا ایک آزمودہ کار و تجربہ کار بادشاہ تھا۔ وہ دریا کے کنارے کنارے اوپر قندوز کی جانب روانہ ہوا۔ اور مقابل کے لشکر کو اپنی طرف سے غافل کر کے پانچ (ورق ۲۹) چھ سو سوار عبداللطیف بخشی کی سرکردگی میں کلف نامی گزرگاہ (گھاٹ) پار کرنے کے لئے بھیجے۔ اس سے قبل کہ دشمن کو خبر ہو عبداللطیف بخشی نے ان لوگوں کی مدد سے جو اس کے ساتھ متعین کئے گئے تھے دریا پار کر کے اس کے کنارے کو مستحکم کر لیا۔ جب اس کی اطلاع سلطان مسعود مرزا کو ہوئی تو اس کے باوجود کہ خسرو شاہ کے بھائی ولی نے ہر چند چاہا کہ ان لوگوں کا تعاقب کیا جائے جو دریا پار کر گئے ہیں مگر سلطان مسعود مرزا نے یا تو اپنی بددلی کے باعث یا باقی چغانیانی کی سعی و کوشش کی وجہ سے جو ولی کا مخالف تھا اس لشکر کا تعاقب نہ کیا۔ اور ایسا تباہ و برباد ہوا کہ وہ اور اس کے سپاہی سب واپس حصار آ گئے۔

سلطان حسین مرزا نے دریا پار کر کے بدیع الزماں مرزا، ابراہیم حسین مرزا، ذوالنون ارغون اور محمد ولی بیگ کو خسرو شاہ پر یلغار کرنے کے لئے منتخب کیا۔ مظفر حسین مرزا اور محمد برندوق کو ختلان پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا اور خود حصار کی طرف چلا آیا۔ ابھی وہ شہر کے نزدیک پہنچا ہی تھا۔ کہ اہلیان شہر کو اس کے آنے کی اطلاع ہو گئی۔ سلطان مسعود مرزا نے بربنا مصلحت حصار میں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور دریائے کمرود کے کنارے کنارے اوپر کی جانب روانہ ہو کر براہ سرتاق وہ اپنے بھائی بایسنغر مرزا کے پاس سمرقند چلا گیا۔ ولی نے بھی خود کو ختلان میں محصور کر لیا۔ حصار کے قلعے کو باقی چغانیان محمود برلاس اور قوچ بیگ کے باپ سلطان احمد نے مضبوط کر لیا۔ سلطان حسین مرزا کو جب اس کی اطلاع ملی تو اس نے ابوالحسن مرزا اور بعض جوانوں کو پیچھے سے اوپر کی جانب کمرود درے کی طرف سلطان مسعود مرزا کے پیچھے بھیجا۔ وہاں پہنچ کر وہ ایسی مصیبت میں پھنس گئے جس سے نکل آنا ان کے بس سے باہر تھا۔ لیکن مرزا بیگ فرنگی باز نے اپنی تلوار کی کارکردگی دکھائی۔

حمزہ سلطان اور مہدی سلطان نے چند سال قبل شیبانی خاں سے علیحدہ ہو کر سلطان محمود مرزا کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ اس افراتفری کے عالم میں انہوں نے اپنے تمام ازبک ساتھیوں نیز محمد دوغلت و سلطان حسین دوغلت اور سب مغلوں کو ساتھ لے کر جو ولایت حصار میں مقیم تھے خود کو قراتگین میں محصور کر لیا۔ ادھر سلطان حسین مرزا نے ابراہیم ترخان، یعقوب ایوب اور بعض دوسرے عساکر کو حمزہ سلطان اور مغلوں کی سرکوبی کے لئے قراتگین کی جانب روانہ کیا۔ اور اپنی جمعیت کے ساتھ پیچھے سے وہاں پہنچ کر ان کے ساتھ برسر جنگ و پیکار ہوا۔ حملہ آوروں نے یہاں سلطان حسین مرزا کو زیر کر کے اور اس کے اکثر امرا کو گھوڑوں کی پیٹھ سے اتار کر انہیں پیدل چھوڑ دیا۔

یہاں سے نکل کر حمزہ سلطان، مہدی سلطان، حمزہ سلطان کے لڑکے مماق سلطان، محمد دوغلت (جو آخر

میں محمد حصاری کے نام سے مشہور ہوگیا تھا) سلطان حسین دوغلت، اس سے وابستہ ازبکوں اور ان مغلوں نے جو حصار میں تھے ملازمین سلطان محمود مرزا کے ذریعے اپنا پیغام بھجوایا اور ماہ رمضان میں مجھ سے ملاقات کرنے کے لئے اندجان پہنچ گئے۔ سلاطین تیموریہ کے دستور کے مطابق میں توشک پر بیٹھا ہوا تھا، حمزہ سلطان، مہدی سلطان اور مماق سلطان جیسے ہی وارد ہوئے میں ان کی تعظیم کے لئے اپنی جگہ سے اٹھا اور توشک سے اتر کر ان سلاطین کا استقبال کیا اور انہیں اپنی دائیں جانب گپے پر بٹھایا۔ وہ مغل بھی جن کا سردار محمد حصاری تھا (ورق ۳۰) وہاں پہنچ گئے اور سب نے ملازمت اختیار کرلی۔

سلطان حسین مرزا نے آگے بڑھ کر حصار کے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ نقب زنی، قلعہ کوبی، سنگ باری اور گولہ سازی میں وہ ایسا منہمک ہوا کہ اسے دن رات کا ہوش نہ رہا۔ چار پانچ جگہ اس نے نقبیں لگوائیں۔ وہ سرنگ جو اس نے شہر کے دروازے کی طرف لگائی تھی کافی آگے تک پہنچ گئی شہر والوں نے بھی نقب لگا کر اسکا حال معلوم کرلیا۔ جو لوگ قلعے میں تھے انہوں نے اوپر سے اس کو آگ دکھائی جس کی وجہ سے ہر طرف دھواں پھیلنے لگا۔ چنانچہ لوگوں نے نقب کے دہانوں کو مضبوطی سے بند کردیا۔ جیسے ہی دہانے بند کئے گئے تو دھواں اوپر کی جانب قلعے کے لوگوں کی طرف اٹھنے لگا۔ جس کی وجہ سے قلعے کے لوگوں کے مرنے کو نوبت آ گئی۔ لوگ وہاں سے نکل کر باہر کی طرف بھاگے اور بالآخر گھڑوں سے پانی لاکر انہوں نے نقب کے اوپر پانی پھینکنا شروع کیا اور جو لوگ قلعے کے باہر تھے انہیں نقب کے پاس سے بھگا دیا۔

ایک مرتبہ پھر کچھ پھرتیلے نوجوان وہاں آن پہنچے اور جو جوان نقب پر موجود تھے انہیں وہاں سے ہٹا دیا۔ اس کے علاوہ وہ جگہ جہاں سے مرزا اتر کر نیچے آیا تھا وہاں شمال کی جانب سے اس کثرت سے گولہ اندازی و سنگ باری کی گئی کہ ایک برج اندر سے بالکل خالی ہوگیا اور عشا کی نماز کے وقت اس کے ٹکڑے اڑ گئے۔ بعض جوانوں نے عجلت سے کام لیا۔ جنگ کرنے کی اجازت چاہی لیکن چونکہ رات کا وقت تھا اسی لئے مرزا نے انہیں اجازت نہیں دی۔ صبح ہونے تک قلعے والوں نے برج مکمل طور پر مرمت کرلیا۔ اس لئے صبح بھی وہ جنگ کرنے کے قابل نہ رہے۔ ان دو ڈھائی مہینوں میں سوائے دھونس جتانے نقب لگانے، سرکوب اٹھانے اور سنگ باری کے علاوہ کچھ جم کر لڑائی نہ ہوسکی۔

بدیع الزمان مرزا اور وہ دستہ جسے خسرو شاہ کے خلاف روانہ کیا گیا تھا۔ جس وقت قندوز سے تین چار فرسنگ کے فاصلے پر اترا تو خسرو شاہ لوگوں کے ساتھ قندوز سے باہر نکل آیا۔ رات بسر کرکے اگلے دن بدیع الزمان مرزا کے لشکر کی طرف بڑھا۔ مرزایان اور سردار امرا کی تعداد اتنی کثیر تھی کہ اگر وہ لشکر خسرو شاہ کے دوگنا نہیں تو ڈیڑھ گنا ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں۔ حزم و احتیاط سے کام لیتے ہوئے وہ خندق سے باہر نہیں نکلے۔ خسرو شاہ کے ملازمین میں کارآمد و ناکارہ خورد و کلاں کل ملا کر چار پانچ ہزار آدمی ہوں گے۔ اس نے اس دنیائے بے ثبات اور اس ناپائیدار نوکری کی خاطر اس قدر برائی اور بدنامی اختیار کرکے اور ظلم و ستم کو اپنا شعار بنا کر ایسی وسیع و عریض ولایات پر قبضہ کرنے اور اتنے زیادہ ملازم رکھنے کا منصوبہ تیار کیا تھا آخر میں تو ان کی تعداد بیس تیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اور جن علاقوں اور پرگنوں پر اس کی حکومت تھی وہ اس کے اپنے بادشاہ اور شاہزادگان سے کئی گنا زیادہ ہوگئی تھی۔ اس نے ساری عمر میں جو کارنامہ انجام دیا تھا بس یہی تھا اور اتنا ہی نام اس کے پیروکاروں نے کمایا تھا۔ جن کی سرداری و مردانگی کا کبھی ہر طرف شہرہ تھا۔ اور لوگ جو کبھی خندقوں سے باہر نکل آنے میں ماہر سمجھے جاتے تھے اب ان کا شمار بزدلوں میں کیا جاتا ہے۔ اور ان کی ڈرپوکی کے افسانے ہر طرف مشہور ہیں۔

بدیع الزمان وہاں سے کوچ کرکے طالقان پہنچا اور الغو باغ میں قیام پذیر ہوا۔ اس وقت خسرو شاہ قلعہ قندوز میں تھا۔ اس نے اپنے برادر خورد ولی کو عمدہ مسلح سپاہ کے ہمراہ اشکمش (ورق ۳۱) فلول اور اس طرف واقع

پہاڑوں کے دامن کی جانب روانہ کیا تا کہ باہر سے مرزا کو ہراسان اور پریشان کریں۔ ادھر محب علی قورچی عمدہ مسلح جوانوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھا اور دریائے ختلان کے کنارے سپاہیوں کے ساتھ ٹکر لی۔ اور انہیں نیچا دکھا کر کچھ کو گھوڑوں سے اتار دیا اور کچھ کے سر کاٹ لئے۔ اس کی دیکھا دیکھی سید یم علی دربان اس کا برادر خورد قلی بیگ، بہلول ایوب اور کچھ آزمودہ کار جوانوں کو ساتھ لے کر کوہ عنبر کے دامن میں پہنچے اور خواجہ چنگال نامی مقام پر خراسانیوں کی کوچگاہ پر حملہ کر دیا۔ جس میں انہوں نے سید یم علی قلی بابا اور جوانوں کے پورے ایک دستے کو ان کے گھوڑوں سے اتار کر پیدل کر دیا۔

سلطان حسین مرزا کو جب یہ خبر پہنچی اس وقت حصار میں مسلسل بارش ہو رہی تھی جس کی وجہ سے لشکر تشویش و پریشانی سے دوچار تھا، چنانچہ اس نے صلح کی تجویز کی۔ قلعے کے اندر سے محمود برلاس باہر آیا اور باہر سے حاجی بکاول آگے بڑھا۔ ان کے ساتھ بھولے بھٹکے قوال و سازندے بھی پہنچ گئے اور سلطان محمود مرزا کی بڑی بیٹی کو (جو خانزادہ کے بطن سے تھی) سلطان ابوسعید مرزا کے نواسے حیدر مرزا (جو پائیدہ سلطان بیگم کے بطن سے تھا) سے بیاہ کر اس نے حصار سے کوچ کیا اور قندوز پہنچا۔ یہاں پہنچ کر اس نے کچھ لوگوں کو سزا دینے کے لئے قندوز کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن بدیع الزمان نے بیچ میں پڑ کر خسرو شاہ اور سلطان حسین مرزا کے درمیان صلح کرا دی۔ جو جوان اندرون و بیرون قلعہ سے قید کئے گئے تھے ایک دوسرے کو واپس کر دیئے گئے خسرو شاہ کے اس قدر عظیم حکمران بن جانے اور اپنی بساط سے باہر نمایاں کام انجام دینے کا سبب یہ ہی تھا، کہ سلطان حسین مرزا دو مرتبہ حملہ آور ہوا اور دونوں بار اسے گرفتار نہ کر سکا۔

سلطان حسین مرزا بلخ پہنچا تو اس نے ماوراء النہر کی بہتر نگرانی کے خیال سے بلخ کا علاقہ بدیع الزمان کے حوالے کر دیا۔ اور بدیع الزمان کی مملکت استر آباد مظفر حسین کو عطا کر دی۔ اور دونوں کو ایک ہی مجلس میں دو زانو ہونے کا حکم دیا۔ بدیع الزمان مرزا کو یہ سخت شاق گزرا اور سالوں تک سرکشی و فتنہ گری کا سبب ہوا۔

ترخانوں کی بغاوت:

اسی ماہ رمضان کے دوران سمرقند میں ترخانوں[1] نے فتنہ برپا کر دیا۔ جس کی تفصیل یہ ہے بایسنغر مرزا حصار کے امرا اور اس کی سپاہ سے جس قدر میل جول رکھتا تھا۔ اتنا سمرقند کی سپاہ اور وہاں کے امرا اسے پسند نہ تھے۔ شیخ عبداللہ برلاس صاحب اختیار اور بڑا سردار تھا اس کے لڑکے مرزا کے اتنے نزدیک تھے کہ لوگ ان کے رشتوں کو عاشقی و معشوقی سے منسوب کرتے تھے۔ ترخان امرا اور بعض امرائے سمرقند اس وجہ سے ناراض تھے۔ چنانچہ درویش محمد خاں بخارا سے آیا اور سلطان علی مرزا کو قرشی سے ساتھ لے کر اسے تخت شاہی پر متمکن کیا۔ یہاں سے وہ باغ نو کی جانب روانہ ہوئے، جہاں بایسنغر مرزا اس وقت موجود تھا اسے وہاں گرفتار کر کے اور نوکروں سے دور رکھ کر قلعے میں لایا گیا۔ دونوں مرزازادوں کو یک جا بٹھایا گیا۔ عصر کی نماز کے قریب انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ (بایسنغر مرزا) کو کوک سرائے بھیج دیا جائے۔ بایسنغر مرزا طہارت کے بہانے سے (ورق ۳۲) اس حویلی کی طرف جو بوستان سرائے کے مشرق و شمال کے درمیان واقع ہے۔ پہنچ کر اس مکان میں داخل ہوا۔ جہاں ترخانی موجود تھے۔ محمد قلی قوچین اور حسن شربتی اس کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ اتفاق سے اس مکان کی پشت پر جہاں بایسنغر مرزا طہارت کے بہانے سے پہنچا تھا۔ دروازہ بنا ہوا تھا۔ جس پر اینٹوں سے تیغہ چن دیا گیا تھا۔ یہاں سے راستہ حویلی سے باہر جاتا تھا۔ اس تیغے کو فوراً گرا کر اور وہاں سے باہر نکل کر وہ تہی فصل کی جانب بڑھے۔ قلعے کی فیصل سے تھوڑے سے فاصلے پر اس جگہ کو پار کر کے جہاں پانی فوارے کی طرح ابل رہا تھا۔ باہر کی فیصل پر آئے، کنگوروں کے درمیان سے چھلانگ لگا کر دریا میں کود گئے یہاں سے وہ خواجہ کفشیر نامی علاقہ میں خواجکا خواجہ[2] کے گھر میں پر پہنچے۔

۱۔ ترخان ۔ یہ ایک خطاب ہے۔ جو خاندان کے سردار کی حیثیت سے چنگیز خاں نے قتلق کو دیا تھا۔ قتلق ان دو گڈریوں میں سے ایک تھا۔ جس نے چنگیز خاں کو یہ خبر پہنچائی تھی کہ وانگ خاں اس کو دھوکے سے گرفتار کرنے والا ہے۔ اس خفیہ خبر کے پہنچانے کے صلہ میں نہ صرف ترخاں کا خطاب ملا بلکہ اس کے ساتھ اور بہت مراعات بھی دی گئیں جیسے سزاؤں سے معافی اور ٹیکس سے چھوٹ۔ (ترکستان ص ۳۶۸، پال رت چینکی، چنگیز خاں ص ۶۹) قتلق ترخاں کی اولاد میں غیاث الدین ترخاں تھے۔ جو امیر تیمور کے زمانے میں تھے۔ اور ان کے قریب تھے۔ غیاث الدین کی تین بیٹیاں تیمور کے بیٹوں اور پوتوں کو بیاہی گئی تھیں۔ جس میں سب سے مشہور بیگم گوہر شاد ہیں۔ جو شاہ رخ کی بیوی تھیں۔ (مانز، دی رائز اینڈ رول اوف تمرلین ص ۱۸۶ نوٹ ۳۱) ان بیگم کا ہرات کو بنانے میں بہت بڑا حصہ تھا۔

۲۔ یہ خواجہ عبیداللہ احرار کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کا نام شمس الدین محمد عبد اللہ تھا۔ اور یہ خواجہ کلاں بھی کہلاتے تھے۔ (احوال، بختان ص ۶۷)

ان جوانوں کو جو دروازے پر پہرہ دے رہے تھے تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ مرزا فرار ہو گیا ہے۔ اگلے دن صبح ترخانی جمع ہو کر خواجکا خواجہ کے گھر پر پہنچے اور خواجہ سے اسے طلب کیا۔ مگر خواجہ نے اسے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ خواجہ کے ساتھ زبردستی بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ خواجہ کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ ان پر زور آزمائی نہیں کی جا سکتی تھی۔ ایک دو روز بعد خواجہ ابوالمکارم، احمد حاجی بعض امرا سپاہی اور اہلیان شہر جو بایسنغر مرزا کے حامی تھے، نے خواجہ کے دروازے پر ہجوم کر کے مرزا کو وہاں سے باہر نکال لیا۔ اور سلطان علی مرزا اور ترخانیوں پر جو قلعہ میں تھے حملہ کر دیا۔ وہ ایک دن بھی قلعے پر اپنا قبضہ برقرار نہ رکھ سکے۔ محمد مزید ترخان گرفتار ہوا۔ بایسنغر مرزا اس وقت احمد حاجی بیگ کے گھر میں تھا۔ درویش محمد ترخان کو وہاں لایا گیا۔ اس سے ایک دو باتیں پوچھی گئی جن کا وہ صحیح جواب نہ دے سکا کیونکہ اس نے وہ کام کیا تھا اس لئے اسے قتل کئے جانے کا حکم دیا۔ بے بسی کے عالم میں وہ ایک ستون سے چپک گیا،[3] اس حالت میں جب کہ ستون کو مضبوطی سے پکڑے ہوا تھا۔ اسے موت کی سزا دی گئی۔ سلطان علی مرزا کے لئے حکم دیا گیا۔ اسے کوک سرائے لے جا کر وہاں اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر دیں۔

تیمور بیگ نے جو شاندار عمارت تعمیر کرائی تھیں۔ ان میں سے ایک کوک سرائے ہے۔ یہ سمرقند کے قلعے میں واقع ہے۔ اس عمارت کے بارے میں یہ خاص بات ہے کہ آل تیمور بیگ میں سے جو کوئی سر ابھارتا ہے اور تخت سلطنت پر بیٹھتا ہے تو وہ یہیں تخت نشین ہوتا ہے اور جو کوئی سلطنت کی دعویداری میں اپنا سر گنواتا ہے تو اسی جگہ اس کا سر قلم ہوتا ہے اور یہ جو بطور کنایہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شہزادے کو کوک سرائے لے گئے اس کے معنی ہوتے ہیں کہ اسے قتل کر دیا چنانچہ سلطان علی مرزا کو بھی کوک سسرائے لایا گیا۔ اور اس کی آنکھوں میں سلائی پھیری گئی[4] جراح نے دانستہ یا نادانستہ کام صحیح نہیں کیا۔ سلطان علی مرزا کی آنکھوں کو کوئی گزند نہ پہنچا۔ فوری طور پر سلطان علی مرزا نے ظاہر نہ ہونے دیا اور خواجہ یحیٰی[5] کے گھر آ گیا۔ دو تین دن بعد وہاں سے فرار ہو کر وہ بخارا ترخانیوں کے پاس پہنچا۔ حضرت خواجہ کا بڑا لڑکا بڑے بھائی کا طرف دار اور چھوٹا لڑکا چھوٹے بھائی کے پشت پناہ ہو گئے۔ چند روز بعد خواجہ یحیٰی بھی بخارا پہنچ گئے۔ بایسنغر مرزا نے اپنا لشکر تیار کیا۔ اور سلطان علی مرزا پر حملہ کرنے کے لئے بخارا کی طرف روانہ ہوا۔ جیسے ہی وہ بخارا کے نزدیک پہنچا سلطان علی مرزا اور ترخانی امرا مستعد ہو کر مقابلے کیلئے آ گئے مختصر سی جنگ بھی ہوئی جس میں سلطان علی مرزا نے فتح حاصل کی اور بایسنغر مرزا شکست سے دوچار ہوا۔ احمد حاجی بیگ (ورق ۳۳) اور کئی عمدہ نوجوانون گرفتار ہوئے بیشتر کو انہوں نے قتل کر دیا۔ احمد حاجی بیگ کو اس الزام میں کہ اس نے درویش محمد ترخان کا خون کیا تھا اس کے غلاموں اور کنیزوں نے نہایت بے عزتی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ سلطان علی مرزا وقت بایسنغر کے تعاقب میں سمرقند کی جانب روانہ ہوا۔

سمرقند پر حملہ:

اس واقعے کی اطلاع ہمیں ماہ شوال کے دوران اندجان میں ہوئی۔ چنانچہ ہم بھی سمرقند کے دعویدار ہونے کی حیثیت سے اسی مہینے لشکر کے ہمراہ اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ سلطان حسین مرزا حصار اور قندوز سے واپس جا چکا تھا۔ سلطان مسعود اور خسرو شاہ اپنی جگہ پر مطمئن تھے سلطان مسعود مرزا بھی سمرقند کے لالچ میں شہر سبز پہنچا۔ خسرو شاہ نے اپنے برادر خورد ولی کو مرزا کے ہمراہ کر دیا۔ تین چار ماہ کے عرصے میں سمرقند کا تین چار طرف سے محاصرہ کر لیا گیا۔ سلطان علی مرزا کی جانب سے خواجہ یحیٰی میرے پاس آیا اور اس نے اتفاق و یکجہتی کی باتیں کیں۔ قرار یہ پایا کہ ایک دوسرے سے ملاقات کر لی جائے۔ میں سمرقند سے دو تین فرسخ شرقی سغد سے نیچے اپنے لشکر کے ساتھ چلا گیا۔ سلطان علی اپنے لشکر کے ہمراہ آیا۔ چار پانچ آدمی اس کی طرف سے اور چار پانچ آدمی

[3] ترکوں اور عربوں میں رسم تھی کہ ستون اور خیمے کی چوب کو مقدس جانتے تھے۔ مجرم اس سے لپٹ جاتا تھا (مرزا نصیر الدین حیدر ص ۳۹ نوٹ ۵)

[4] آنکھوں پر سلائی پھیرنے کا مقصد آنکھ کے قرنیہ کو نقصان پہنچانا ہے تاکہ شعاعیں اندر داخل نہ ہو سکیں۔ جس نے بھی سلائی پھیری اس سے پورا نقصان نہ ہو سکا، دانستہ یا نادانستہ۔

[5] خواجہ یحیٰی حضرت عبیداللہ احرار کے چھوٹے صاحب زادے تھے۔ ان کا نام قطب الدین تھا۔ شیبانی خاں نے انکو دو بیٹوں سمیت قتل کروا دیا تھا۔ (۹۰۲ھ)

(عارف، احوال و بختان ص ۶۷)

میری طرف سے تھے۔میں نے دریائے کوہک کو درمیان سے پار کیا گھوڑوں پر سوار ایک دوسرے سے ہماری ملاقات ہوئی۔احوال پرسی کر کے وہ دریا کے اس پار چلے گئے اور میں اس طرف واپس آ گیا۔

میں نے ملا بنائی[۶] اور محمد صالح[۷] کو وہاں خواجہ یحیٰی کی خدمت میں پایا۔محمد صالح کو میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔البتہ ملا بنائی بہت عرصے تک میری خدمت میں رہ چکا تھا۔

چونکہ موسم سرما نزدیک آ چکا تھا اور سمرقند کے لوگ بھی بہت نقصان برداشت کر چکے تھے اسی لئے میں اندجان کی طرف آ گیا۔اور سلطان علی مرزا بخارا چلا گیا۔سلطان مسعود مرزا کا شیخ عبداللہ برلاس کی لڑکی کی جانب بہت جھکاؤ تھا چنانچہ اس (سلطان مسعود مرزا) نے اس سے شادی کر لی۔اور ملک گیری کے خیال کو ترک کر کے واپس حصار آ گیا۔دراصل سمرقند کی جانب آنے کا اصل مقصد یہ لڑکی ہی تھی۔جب میں شیراز اور کنبایی کے نزدیک تھا۔تو مہدی سلطان میرے خوف سے فرار ہو کر سمرقند پہنچ گیا اور حمزہ سلطان مجھ سے اجازت لے کر زامین سے سمرقند کی جانب روانہ ہوا۔

۶۔ملا بنائی شاعر اور موسیقار،ان کا ذکر ۹۱۱ھ کے حالات میں آئے گا۔ان میں اور علی شیر بیگ نوائی میں چشمک تھی۔

۷۔محمد صالح۔شاعر ان کا حال بھی ۹۱۱ھ کے حالات میں ہے۔یہ اپنی مثنوی شیبانی نامہ کی وجہ سے مشہور ہیں۔

واقعات ۹۰۲ھ

(۹ ستمبر ۱۴۹۶ء - ۲۹ اگست ۱۴۹۷ء)

اس سال موسم سرما میں بایسنغر مرزا کے کام مجموعی طور پر ترقی پذیر تھے۔ عبدالکریم اشرت کوفن کے گردونواح میں سلطان علی مرزا کی فوج کے ساتھ پہنچا۔ ادھر سمرقند کی طرف سے مہدی سلطان اور بایسنغر کے سپاہی یلغار کرتے ہوئے میدان کارزار میں آئے۔ عبدالکریم اشرت اور مہدی سلطان ایک دوسرے کے مدمقابل ہوئے۔ مہدی سلطان کی چرکسی[1] تلوار کی نوک چبھنے سے عبدالکریم کا گھوڑا گر پڑا، جیسے ہی اس نے زمین سے اٹھنا چاہا مہدی سلطان نے بڑھ کو تلوار ماری اور اس کا ہاتھ پہنچے سے قلم کر دیا۔ اسے گرفتار کر کے اس کے یلغاری ساتھیوں کو خوب زدوکوب کیا۔

جب ان سلاطین نے سمرقند کی حالت دگرگوں دیکھی اور مرزا کی سرکار ڈگمگاتی دیکھی تو از روئے دور اندیشی وہ شیبانی خاں کے پاس چلے گئے۔ اپنی اتنی کامیابی پر سمرقند کے لوگ جواب تنگ آچکے تھے پوری جوش و ولولے کے ساتھ سلطان علی مرزا کے خلاف صف آرا ہو کر مقابلے کے لئے سامنے آگئے۔ بایسنغر مرزا سرپل پہنچ گیا اور سلطان علی مرزا خواجہ کاروزن نامی مقام پر اتر گیا۔ اس اثنا میں خواجہ منیر اوشی کے اشتعال دلانے پر خواجہ ابوالمکارم، اندجان کے امرا میں سے ویس لاغری، محمد باقر، قاسم دولدائی اور بایسنغر مرزا کے افراد خاندان (ورق ۳۴) کی ایک جماعت نے بخارا پر یورش کردی۔ ابھی شہر کے نزدیک پہنچے ہی تھے کہ بخارا کے لوگ خبردار ہو گئے۔ چنانچہ اس وجہ سے انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نصیب نہ ہوئی اور ناکام واپس آگئے۔

سمرقند پر دوسرا حملہ

جس وقت میں نے سلطان علی مرزا سے ملاقات کی تھی تو ہمارے درمیان قرار پایا تھا کہ گرمیوں کے موسم میں وہ بخارا سے اور میں اندجان سے سمرقند کا محاصرہ کریں گے اس وعدے کے مطابق میں ماہ رمضان (مئی ۱۴۹۷ء) میں اندجان سے سوار ہوا۔ جب یار ییلاق کے نواح میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ مرزازادگان مقابلے کے لئے تیار بیٹھے ہیں، میں نے تومون خواجہ مغل کو دو تین سو قزاق جوانوں کے ساتھ یلغار کے لئے علیحدہ کیا۔ وہ جیسے ہی نزدیک پہنچے تو بایسنغر مرزا کو ان کے آنے کی اطلاع ملی وہ سراسیمہ ہو کر واپس چلا گیا۔ ان جوانوں نے اس رات اپنے خیموں سے نکل کر بہت سے لوگوں کو اپنے تیروں کا نشانہ بنایا اور متعدد قیدیوں نیز کثیر مال غنیمت کے ساتھ واپس آئے۔

ایک دو روز بعد ہم قلعہ شیراز[2] پہنچ گئے۔ اس وقت شیراز پر قاسم دولدائی کا قبضہ تھا۔ اس کا داروغہ شیراز کی نگہبانی نہ کر سکا۔ چنانچہ اس نے قلعہ ہمارے حوالے کر دیا۔ جس کا عہدیدار ابراہیم سارو کو مقرر کیا گیا۔ اگلے دن نماز عیدالفطر وہاں ادا کر کے ہم سمرقند کی جانب روانہ ہوئے اور آبیاری نامی جگہ پر پانی کے ذخیروں کے پاس اترے۔ اسی دن قاسم دولدائی نے اولیس لاغری، سلطان محمد سیغل کے پوتے حسن اور محمد ویس تین چار سو سپاہیوں کی جمعیت کے ہمراہ میری خدمت میں حاضر ہوئے، ان کی گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ ہم نے جیسے ہی کوچ کیا بایسنغر مرزا واپس چلا گیا اور اب ہم امیرزادگان اس سے علیحدہ ہو کر اپنے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ آخر میں معلوم ہوا کہ بایسنغر مرزا سے شیراز کو بچانے کا وعدہ کر کے جدا ہوئے تھے۔ لیکن جب شیراز شہر کی ایسی دگرگوں حالت دیکھی تو وہ بحالت مجبوری میری طرف آئے۔ ہم قرالولاق نامی مقام پر اترے تو میرے ساتھی ان

(۱)۔ چرکس۔ ایک قبیلہ اور علاقہ کا نام جو بحیرہ قزوین (بحیرہ کیسپین) اور بحر اسود کے درمیان واقع ہے۔ (حدود عالم ۴۴۶) مہدی سلطان کی یہ تلوار اسی علاقہ سے متعلق ہوگی۔ محمد صالح مصنف شیبانی نامہ کے مطابق دوسرے ازبک بھی چرکسی تلوار استعمال کرتے تھے (ایٹ ۶۵ نوٹ ۲)

(۲)۔ قلعہ شیراز۔ سمرقند سے ۲۵ میل شمال میں واقع ہے (ارسکن، ے موآرس، ص ۴۲ نوٹ ۲)

چند مغلوں کو پکڑ کر لائے جنہوں نے چند دیہاتوں میں لوٹ مار کی تھی۔ قاسم بیگ نے سزا دینے کی غرض سے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ ان میں سے دو تین کے ٹکڑے ٹکڑے کریں۔ (چار، پانچ سال بعد جب کہ ہم مسیحا سے خاں (ماموں) کی طرف جا رہے تھے تو قاسم بیگ اس ڈر سے کہ اس سے یہاں بدلہ نہ لیا جائے ہم سے علیحدہ ہو کر حصار چلا گیا۔) قرابولاق سے کوچ کر کے اور دریا کے اس پار جا کر ہم نے یام کے نواح میں پڑاؤ کیا۔ اسی روز بعض امرا بایسنغر کے لوگوں سے جا ٹکرائے انہوں نے سلطان تنبل کے گلے میں نیزے کی نوک ماری لیکن وہ اپنے گھوڑے سے نہیں گرا۔ خواجہ کلاں کے بڑے بھائی خواجگی ملا صدر کے گلے میں جیسے ہی تیر لگا وہ جان بحق ہوا۔ یہ بہت عمدہ جوان تھا۔ میرے والد نے اسے بہت سی مراعات دے رکھی تھیں اور اپنا مہر دار مقرر کیا تھا۔ طالب علمانہ زندگی بسر کرتا تھا اور فن لغت پر حاوی تھا۔ میر شکار تھا۔ اور اچھا انشا پرداز۔

جس وقت ہم یام کے نواح میں تھے تو اس وقت بہت سے لوگ کاروباری وغیر کاروباری لشکر بازار میں اپنے مال کا لین دین کر رہے تھے کہ اچانک عصر کے وقت شور و غوغا بلند ہوا اور تمام مسلمانوں کا مال و اسباب لوٹ لیا گیا۔ لشکر کے نظم و ضبط کے لئے حکم صادر کیا گیا کہ لوگوں کے مال و اسباب کو کوئی شخص اپنے پاس نہ رکھے اور سب واپس کیا جائے۔ چنانچہ اگلے دن صبح ابھی ایک پہر بھی نہ گزری تھی کہ اہالی لشکر میں سے کسی کے پاس تاگے کا تار تو کیا کوئی سوئی تک نہ تھی اور ہر چیز اس کے مالک کو واپس کر دی گئی تھی۔ (ورق ۳۵) یہاں سے کوچ کر کے ہم سمرقند کی مشرقی جانب یورتی خاں کی خیمہ گاہ میں اترے۔ سمرقند یہاں سے تین فرسنگ کے فاصلے پر ہے۔ پینتالیس دن تک ہم وہاں مقیم رہے۔ جس وقت ہم وہاں قیام پذیر تھے تو اندرون قلعہ اور باہر کے من چلے جوانوں کے درمیان خیابان میں کئی مرتبہ لڑائیاں رہیں۔ ایک مرتبہ ابراہیم بیگ چک کے چہرے پر تلوار لگی۔ چنانچہ اسی دن سے اسے ابراہیم چاپق[3] کہا جانے لگا۔ دوسری مرتبہ خیابان میں ہی پل مغاک کے پاس ابوالقاسم گرز سے حملہ آور ہوا۔ اس کے بعد ایک بار پھر خیابان میں ہی پرما کے قریب چپقلش ہوئی، جس میں میر شاہ قوچین نے گرز سے وار کیا۔ اس کی گردن میں تلوار اس طرح لگی کہ آدھی گردن ہی کٹ گئی، لیکن شکر ہے کہ شہ رگ پر نہ لگی۔[4]

ان ہی دنوں جب کہ ہم یورت خاں کی خیمہ گاہ میں مقیم تھے قلعے کے لوگوں نے فریب دینے کی خاطر قاصد بھیجا۔ جس نے یہ پیغام دیا کہ رات کو غار عاشقان پہنچ جانا، ہم قلعہ تمہارے حوالے کر دیں گے۔ ہم اس خیال سے کہ ہمیں قلعہ مل جائے گا راتوں رات گھوڑوں پر سوار پل مغاک پہنچ گئے۔ عمدہ جوان سواروں اور پیادہ سپاہ کی ایک جماعت مقررہ جگہ پر بھیجی گئی۔ اہل قلعہ نے ہمارے چار پانچ پیادہ سپاہی پکڑ لئے، جنہیں دیکھ کر ہمارے جوان سمجھ گئے کہ گڑبڑ ہے۔ ان میں سے ایک کا نام حاجی تھا، جس نے بچپن سے میری خدمت کی تھی۔ دوسرے کو محمود کوندر سنگک کہتے تھے۔ وہ سب کے سب مارے گئے۔ ان دنوں جب کہ اس خیمہ گاہ میں ہم مقیم تھے سمرقند سے اتنے شہری اور کاروباری لوگ آ گئے تھے کہ وہاں دو شہر بس گئے تھے اور جو چیز شہر سے آ سکتی تھی اب وہ لشکر بازار میں بھی ملنے لگی تھی۔ اس عرصے میں سمرقند کے علاوہ تمام قلعوں، پہاڑوں اور میدانوں پر ہمارا قبضہ ہو گیا۔ شاہ دار پہاڑ کے دامن میں ارگت نامی قلعہ کے لوگوں نے قبضہ نہیں چھوڑا۔ وقت کے تقاضے کے تحت ہم وہاں گئے اہل قلعہ مقابلہ نہ کر سکے۔ چنانچہ خواجہ قاضی کو درمیان میں لا کر وہ ہمارے پاس آئے۔ ہم نے بھی ان کا قصور معاف کر دیا اور سمرقند کے محاصرے کی جانب واپس آ گئے۔

(۳)۔ چاپق۔ مرزا نصیر الدین حیدر نے چاپق کے معنی چرا ہوا چہرہ لکھے ہیں (ص ۴۱) شاہ کی لغت میں چاپقو کے معنی اس لکڑی کے تختے کے ہیں جس پر رکھ کر کسی چیز کے ٹکڑے کیے جائیں (ص ۹۴)

(۴)۔ تلوار کا ہاتھ اوچھا لگا ہوگا گہرا نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میر شاہ قوچین کے اس طرف شہ رگ پیدائشی طور پر موجود نہ ہو۔

واقعات ۹۰۳ھ

(۳۰ اگست ۱۴۹۷ء - ۱۸ اگست ۱۴۹۸ء)

ہم باغ میدان کی پشت پر واقع سبزہ زار قلبہ میں اترے۔ سمرقند سے بہت سے سپاہی اور شہری پل محمد چپ کے نواح میں پہنچ کر حملہ کر چکے تھے۔ اس وقت ہمارے جوان تیار نہ تھے جب تک وہ تیار ہوں بابا قلی اور سلطان علی کو ان کے گھوڑوں سے اتار کر قلعے میں لے جا چکے تھے۔ چند روز بعد ہم کوچ کر کے کوہک پہاڑ کے کنارے قلبہ نامی مقام پر اترے اہل قلعہ نے سید یوسف بیگ کو اس دن قلعے سے باہر نکال دیا اور وہ اسی دن ہمارے خیمہ گاہ میں پہنچ کر خدمت بجالایا۔ ہم چونکہ ایک خیمہ گاہ سے کوچ کر کے دوسری خیمہ گاہ میں چلے آئے تھے اسی لئے سمرقند کے لوگ یہ خیال کر کے کہ ہم واپس چلے گئے ہیں تمام سپاہی اور شہری پل مرزا سے دروازہ شیخ زادہ تک اور وہاں سے پل محمد چپ تک جمع ہو گئے۔ میں نے حکم دیا کہ جوان مسلح ہو کر گھوڑوں پر سوار ہوں، چنانچہ انہوں نے پل مرزا اور اور پل محمد چپ دونوں ہی جانب حملہ کر دیا۔ خداوند تعالیٰ نے میرے کام کو درست کر دیا اور دشمن کو شکست نصیب ہوئی۔ ہمارے سپاہیوں نے بڑے بڑے امرا اور اچھے اچھے جوانوں کو گھوڑوں سے اتار دیا، ان میں ایک حافظ دولدائی کا لڑکا محمد مسکین تھا۔ اس کے تلوار ایسی لگی (ورق ۳۶) کہ انگشت شہادت کٹ گئی۔ دوسرا حسن نبیرہ تھا جسے اس کے برادر خورد محمد قاسم نبیرہ نے گھوڑے سے اتارا اور لے آیا۔ ان کے علاوہ اس طرح کے اور بھی سپاہی اور جوان تھے جنہیں لوگ اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کے علاوہ شہر کے سربرآوردہ لوگوں میں سے دیوانہ جامہ باف اور کل قاشوق لائے گئے۔ کیونکہ سنگ پھینکنے والوں میں یہی نمایاں تھے۔ اس لئے حکم دیا گیا کہ انہیں ان پیادوں کے قصاص میں دردناک طور پر قتل کیا جائے جو غار عاشقان میں مارے گئے تھے۔ اس جنگ میں سمرقند کے لوگوں کو مکمل شکست ہوئی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے قلعے سے نکلنا بند کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہمارے آدمی خندق کے کنارے تک چلے جاتے اور وہاں سے غلام اور کنیزیں پکڑ کر لے آتے۔

آفتاب برج میزان میں منتقل ہو چکا تھا اور سردی شدید ہونے لگی تھی۔ امرا کو صلاح ومشورے کے لئے بلایا گیا۔ اتفاق اس بات پر ہوا کہ شہر کے لوگ اس قدر زبون اور بدحال ہو چکے ہیں کہ خدا کی عنایت سے آج کل میں ہم شہر پر قبضہ کر لیں گے۔ ہم یہاں چونکہ سردی کی زحمت برداشت کر رہے ہیں اس لئے بہتر ہے کہ شہر کے نزدیک سے اٹھ کر کسی گرم قلعے میں چلے جائیں۔ کیونکہ ہم اگر یہاں سے واپس جانے پر مجبور ہوئے تو ایسی صورت میں تکلیف کم ہوگی۔ سردی کا موسم گزارنے کے لئے مصلحت اسی امر میں سمجھی گئی کہ قلعہ خواجہ دیدار میں جا کر بسا جائے۔ چنانچہ وہاں سے کوچ کر کے ہم اس سبزہ زار میں اترے جو قلعہ خواجہ دیدار کے سامنے ہے۔ قلعے میں رہنے کے لئے ہم نے مکان ودالان وغیرہ متعین کئے اور وہاں کاریگر اور منتظم مقرر کر کے چند روز سبزہ زار میں گزارے۔

اس اثنا میں بایسنغر مرزا نے ترکستان میں شیبانی خان کے پاس قاصد روانہ کئے اور اسے مدد کے لئے بلایا۔ شیبانی خان ترکستان سے یلغار کرتا ہوا اسی روز صبح ہماری خیمہ گاہ کے مقابل آ کر رک گیا۔ اس وقت ہمارا لشکر یکجا نہیں تھا۔ ان میں سے کچھ موسم سرما انتظامات کے لئے رباط خواجہ عمر کی طرف بعض کابدنامی مقام پر اور کچھ شیراز کی جانب گئے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود جو بھی لشکر وہاں موجود تھا اسے آمادہ کر کے ہم نے بھی پیش قدمی کی شیبانی خاں مقابلہ نہ کر سکا۔ چنانچہ سمرقند کی جانب رخ کیا اور اس کے نواح میں پہنچ گیا۔ کیونکہ بایسنغر مرزا کی

مرضی کے مطابق مدعا پورا نہیں ہوا تھا اسی لئے وہ اس کے ساتھ سرد مہری سے پیش آیا چونکہ اس کا کوئی کام بن نہ سکا تھا اسی لئے ناامید ہو کر وہ چند روز بعد واپس ترکستان چلا گیا۔ بایسنغر مرزا نے سات ماہ تک محاصرہ کی تکلیف اٹھائی ایک آس جو شیبانی خاں سے وابستہ تھی وہ بھی پوری نہ ہوسکی، چنانچہ مایوس ہو کر دو سو تین سو بھوکے ننگے آدمیوں کو ساتھ لے کر خسرو شاہ کے پاس قندوز کی جانب روانہ ہوا۔ ترمذ کے نواح میں اس وقت جب کہ وہ آمو دریا پار کر رہا تھا تو وہاں کے حاکم سید اکبر حسین کو جو مسعود مرزا کا رشتہ دار اور معتمد تھا جیسے ہی اس امر کی اطلاع ہوئی اس کے تعاقب میں وہاں پہنچا۔ اس وقت بایسنغر مرزا دریا پار کر چکا تھا لیکن جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے انہیں گرفتار اور ان کے مال واسباب پر قبضہ کرلیا۔ میرم ترخاں وہیں دریا میں ڈوب گیا۔ بایسنغر مرزا کا خواص محمد طاہر بھی گرفتار ہوا جب بایسنغر مرزا خسرو شاہ کے پاس پہنچا تو وہ اس کے ساتھ خوش اسلوبی سے پیش آیا۔

سلطان حسین مرزا اور بدیع الزماں مرزا کی لڑائی

سلطان حسین مرزا اور بدیع الزمان کے درمیان جو کینہ ودشمنی ایک عرصے سے چلی آرہی تھی وہ اس سال جنگ کی صورت میں نمایاں ہوئی۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

سلطان حسین مرزا نے گذشتہ سال بلخ بدیع الزمان اور استر آباد مظفر حسین کے حوالے کیے تھے اور دونوں کو اپنے سامنے دوزانوں کروایا تھا اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ (ورق ۳۷) اس وقت سے بہت سے ایلچیوں کی آمدورفت جاری رہی۔ علی شیر بیگ بھی ایلچی کی حیثیت سے گیا۔ ہر چند کوشش کی گئی کہ استر آباد کا علاقہ بدیع الزماں اپنے برادر خورد کے حوالے کردے۔ مگر وہ اس پر راضی نہ ہوا۔ اس نے یہ دلیل پیش کی کہ جس وقت میرے لڑکے محمد مومن کی ختنہ کی تقریب ہوئی تھی تو یہ علاقہ سلطان حسین مرزا نے محمد مومن کو دیا تھا۔

ایک روز مرزا اور علی شیر بیگ کے درمیان ایسی گفتگو ہوئی جس سے مرزا کی تیز فہمی اور علی شیر بیگ کی رقت قلب کا اندازہ ہوتا تھا علی شیر بیگ نے بہت سی راز کی باتیں مرزا کے کان میں کہیں اور یہ تاکید کی کہ ان باتوں کو وہ بھول جائے مرزا نے فوراً کہا کہ کون سی باتیں! اس بات کا علی شیر بیگ کو بہت قلق ہوا اور اسکی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے آخر کار باپ اور بیٹے کے درمیان بات یہاں تک پہنچی کے باپ نے باپ پر بلخ میں اور بیٹے نے بیٹے پر استر آباد میں حملہ کردیا۔ یعنی مظفر حسین اور محمد مومن مرزا کے درمیان نزاع کے باعث مظفر حسین مرزا کے باپ سلطان حسین مرزا نے محمد مومن مرزا کے باپ بدیع الزمان مرزا پر حملہ کرنے کے لئے بلخ فوج روانہ کردی۔ ادھر مظفر حسین نے بدیع الزمان کے لڑکے محمد مومن مرزا پر حملہ کردیا۔ گرزوان کے دامن پر واقع پلچراغ کے سبزہ زار میں نیچے سے سلطان حسین مرزا اور اوپر سے بدیع الزمان مرزا ایک دوسرے کے مقابل ہوئے۔ بدھ کے دن ماہ رمضان کی پہلی تاریخ (۳ مئی ۱۴۹۷ء) کو سلطان حسین مرزا کے کچھ امرا اور سپاہ کے ایک دستے کو ساتھ لے کر ابوالحسن مرزا نے پیش قدمی کی لیکن ایسا کوئی تصادم نہ ہو جسے جنگ کہا جاسکے مگر بدیع الزمان کو پھر بھی شکست ہوگئی۔ اس کے بہت سے عمدہ جوان گرفتار کر لئے گئے۔ سلطان حسین مرزا نے حکم دیا کہ سب کی گردن اڑا دی جائیں، نہ صرف یہاں بلکہ جہاں کہیں اس کے کسی بھی لڑکے نے سرکشی کی اس نے اسے شکست دی تو اس نے نوکروں میں سے جو لوگ بھی اس کے ساتھ گئے اُن کو حکم دیا کہ اِن کے سرتن سے جدا کردئے جائیں۔ آخر ایسا وہ کیونکہ نہ کرتا جب کہ وہ حق پر بھی تھا یہ تمام امیر زادگان فسق وفساد اور عیش وعشرت میں ایسے منہمک تھے کہ انہوں نے اپنے باپ جیسے تجربہ کار آزمودہ بادشاہ کا بھی پاس نہ کیا جو اتنا طویل سفر طے کر کے آیا تھا۔ رمضان جیسے مبارک مہینے کے شروع ہونے میں بس ایک رات ہی درمیان میں رہ گئی تھی، ان کے دلوں میں خوف خدا تک نہ آیا اور وہ اب بھی میخواری کی محفل اور عیش وعشرت کی بساط آراستہ کیے ہوئے تھے۔ یہ قطعی امر ہے کہ جیسا کوئی کرے گا

امیر تیمور کا مقبرہ، گور امیر سمرقند

سمرقند

بابر کے زمانے میں

(نقل از اصل سمرقند میوزیم)

الغ بیگ رصدگاہ

مزار قثم بن عباس

مسجد خواجہ خضر

شیخ زادہ دروازہ

دروازہ آہن گراں

بی بی خانم مزار

مسجد

شیر دور مدرسہ

ریگستان

طلا کاری مسجد

الغ بیگ مدرسہ

بوستان سرائے

کوک سرائے

کرک

دروازہ فیروزہ

مزار امیر تیمور

چار سو دروازہ

مدرسہ دیوان بیگی

خواجہ احرار

دروازہ سوزن گراں

گزارستان یا احرار دروازہ

ویسا ہی وہ بھرے گا۔ اور جو شخص بھی اس طرح حد سے زیادہ تجاوز کرے گا تو اسی طرح پشیمانی سے دو چار ہوگا۔ بدیع الزمان مرزا کی جو چند سال استر آباد میں حکومت رہی اس کے دوران اس کے گرد ایسے جوان اور دوسرے لوگ جمع ہو گئے تھے جن کی زندگی زیب و زینت سے پوری طرح آراستہ تھی۔ سونے اور چاندی کے ظروف ان کے پاس بہت زیادہ ہو گئے تھے دیگر ساز و سامان اور تپچاق کے گھوڑوں کی تعداد بیشمار تھی۔ لیکن اب ہر چیز اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ چنانچہ جس وقت وہ اپنے برادر خورد کے ہمراہ پہاڑی راستوں سے گزر رہا تھا تو ایک نشیبی گھاٹی میں بری طرح پھنس گیا۔ وہ خود تو بامشکل تمام وہاں سے نکل آیا مگر اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے۔

سلطان حسین مرزا اپنے لڑکے کو شکست دے کر بلخ پہنچا۔ جہاں بدیع الزمان مرزا نے شیخ علی طغائی کو حاکم مقرر کر رکھا تھا، وہ تاب نہ لا سکا، اور باہر نکل آیا۔ سلطان حسین مرزا نے (ورق ۳۸) بلخ ابراہیم حسین مرزا کی تحویل میں دے کر اور اس کے ساتھ محمد ولی بیگ نیز اپنے خدمت گار شاہ حسین کو مقرر کیا اور واپس خراسان چلا گیا۔

بدیع الزمان شکست سے دو چار ہونے کے بعد ہراساں و دل شکستہ پیر و جوان اور سوار و پیادہ سپاہ کے ساتھ خسرو شاہ کے پاس قندز پہنچا۔ جس نے دل کھول کر مہمان نوازی کا سلوک کیا اور اس نے کثیر مقدار میں گھوڑے، اونٹ، ڈیرے، خیمے اور آلات جنگ وغیرہ اس کے لئے اور اس دستے کے لئے جو اس کے ہمراہ تھا فراہم کیے اور اس قدر خاطر داری سے پیش آیا کہ جن لوگوں نے بھی دیکھا یہی کہا کہ موجودہ اسلحہ اور گزشتہ سامان جنگ میں وہی فرق ہے۔ جو سونے اور چاندی کے ظروف کے درمیان پایا جاتا ہے۔

سلطان مسعود مرزا اور خسرو شاہ کے درمیان بے اعتدالیوں اور تکبرات کے باعث ایسی دشمنی و عداوت پیدا ہو چکی تھی کہ اس نے ولی اور باقی کو بدیع الزمان کے ہمراہ کر کے سلطان مسعود مرزا پر یورش کے لئے حصار کی جانب روانہ کر دیا لیکن اس نے انہیں قلعے کے نزدیک تک نہ آنے دیا۔ اطراف و نواح میں دونوں کے درمیان ایک دو بار شمشیر زنی کی واردات بھی ہوئی۔ ایک مرتبہ حصار کی شمالی جانب شاہین خانہ میں محب علی قورچی اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہو کر آگے بڑھا اور تلوار کے خوب جوہر دکھائے۔ ایک مقام پر تو وہ اپنے گھوڑے سے گر بھی گیا اور دشمن کی سپاہ نے اسے پکڑ لیا لیکن دوسری طرف سے اس کے ساتھیوں نے اپنے بل پر اسے ان کے نرغے سے آزاد کرا لیا مگر چند روز بعد منافقانہ صلح کر کے وہاں سے وہ واپس آ گئے۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد بدیع الزمان مرزا قندھار اور زمین داور کے راستے سے ذوالنون ارغون اور اس کے لڑکے شاہ شجاع ارغون کے پاس پہنچا۔ ذوالنون نے اپنی بخیلی کے باوجود اس کی خوب پذیرائی کی۔ اور پہلی ہی پیشکش میں چار ہزار بھیڑیں اس کی نذر کیں۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جس روز سلطان حسین مرزا نے بدیع الزّمان کو شکست دی وہ چہار شنبہ (بدھ) کا دن تھا۔ اور چہار شنبہ (بدھ) کے دن ہی استر آباد میں مظفر حسین مرزا نے محمد مومن مرزا پر فتح پائی۔ اور اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جس شخص نے مومن کو اس کے گھوڑے پر سے اتارا اور پکڑ کر لایا اس کا نام بھی چہار شنبہ ہی تھا۔

بایسنغر مرزا کے جانے کی اطلاع جیسے ہی ہمیں ملی، ہم خواجہ دیدار سے سوار ہو کر سمرقند کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں سر برآوردہ لوگ امرا اور جوان ایک کے بعد ایک ہمارے استقبال کے لئے آئے۔ وہاں پہنچ کر ہم بستان سرائے[1] میں اترے۔ خداوند تعالیٰ کی عنایت سے ماہ ربیع الاول (نومبر ۱۴۹۷ء) کے آخر میں ہم نے شہر و ولایت سمرقند پر قبضہ کر لیا۔

سمرقند

دنیا کے شہروں میں سمرقند کے برابر پاکیزہ و لطیف شہر کم ہی ہوں گے۔ اس کا شمار اقلیم پنجم میں ہوتا ہے۔ اس کا عرض البلد ۴۰ درجہ و ۶ دقیقہ اور طول البلد ۹۹ درجہ و[2] دقیقہ ہے۔ شہر کا نام سمرقند[2] ہے اور اس کی ولایات[3] کو ماوراء

۱۔ بوستان سرائے۔ کوک سرائے کی طرح بوستاں سرائے بھی قلعہ سمرقند کے ایک محل کا نام ہے۔

۲۔ سمرقند کا نیا شہر ۳۹ درجہ ۴ دقیقہ عرض البلد اور ۶۶ درجہ ۵۸ دقیقہ طول البلد ہے

۳۔ سمرقند۔ یونانی تاریخ دانوں نے اس کا نام مرکنڈا تحریر کیا ہے۔ اور یہی نام ایرین نے بھی اپنایا ہے (ایرین ۱۹۸) لیکن یہ نام سمرقند کی ہی بگڑی ہوئی شکل ہے (سمرقند۔ کتابچہ ص ۶۴)

النہر کہتے ہیں۔ اس بنا پر کہ کسی غنیم کا اس پر قابو پانا آسان نہیں اسے بلدۂ محفوظ[۴] بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں کے لوگ امیر المومنین حضرت عثمان کے عہد خلافت میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ قثم بن عباس جن کا شمار تابعین اصحاب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوتا ہے، یہاں پہنچے تھے۔ ان کا مزار آہنی دروازے کے قریب اور مزار شاہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس شہر کی بنیاد سکندر[۶] رکھی تھے۔ مغل اور ترک قبائل اسے سیمیز کنت[۷] کہتے ہیں۔ تیمور بیگ نے اسے اپنا پائے تخت بنایا تھا اور اس جیسے عظیم فرمان روا سے قبل کسی بھی حکمران نے (ورق ۳۹) اسے اپنا دارلحکومت قرار نہیں دیا۔ میں نے حکم دیا کہ قلعے کی فصیل کے اوپر سے پیائش کریں۔ قدم پیائی کے ذریعے اس کی پیائش دس ہزار چھ سو قدم بتائی گئی۔ یہاں کے تمام لوگ سنّی مسلک، پاک مذہب، پابند شریعت اور دین دار مسلمان ہیں۔ حضرت رسالت مآب کے زمانے کے بعد جس قدر ائمہ اسلام ماوراء النہر میں گزرے ہیں شاید ہی کسی دوسری ولایت میں ان کی اتنی تعداد پائی جاتی ہو۔ شیخ ابوالمنصور ماتریدی[۸] جو علم لکلام کے اماموں میں سے ہیں وہ ماترید کے رہنے والے تھے ماترید سمرقند کے ایک محلّہ کا نام ہے۔ آئمہ کلام کے دو فرقے ہیں۔ ایک ماتریدیہ[۹] اور دوسرا اشعریہ[۱۰]۔ ماتریدیہ شیخ ابوالمنصور سے منسوب ہے خواجہ اسمٰعیل خرتنک، صاحب صحیح بخاری[۱۱] بھی ماوراء النہر کے ہی باشندے تھے۔

صاحب ہدایہ[۱۲] (حنفی مسلک میں اس سے زیادہ معتبر شاید ہی کوئی کتاب ہو) مرغینان کے رہنے والے تھے جو ولایت فرغنہ میں واقع ہے۔ اگرچہ یہ ولایت آباد دنیا کے کنارے پر واقع ہے مگر وراء النہر میں شامل ہے۔

اس کے مشرق میں فرغنہ و کاشغر، مغرب میں بخارا اور خوارزم، شمال میں تاشقند و شاہ رخیہ (جسے شاش نیز بناکت بھی لکھتے ہیں) اور جنوب میں بلخ و ترمذ واقع ہیں۔

دریائے کوہک اس کے شمال سے گزرتا ہے جو سمرقند سے دو فرسنگ کے فاصلے پر ہے۔ اس دریا اور سمرقند کے درمیان ایک پشتہ ہے جسے کوہک کہتے ہیں۔ چونکہ یہ دریا اس پشتے کے نیچے سے نکل کر آتا ہے اس لئے دریائے کوہک کے نام سے مشہور ہے۔ اس دریا سے ایک بڑی ندی نکلتی ہے جو ندی نہیں بلکہ دریا ہے جسے ''آب درغم'' کہا جاتا ہے۔ یہ سمرقند کے جنوب کے جانب سے گزرتا ہے اور اس شہر سے ایک کوس شرعی کے فاصلے پر ہے۔ سمرقند کے باغات، محلات اور چند اضلاع کی آب پاشی اسی سے ہوتی ہے۔ قراکول جو یہاں سے تقریباً تیس چالیس فرسنگ دور ہے دریائے کوہک سے ہی سیراب ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ دریا اتنا بڑا ہے مگر زراعت و آبادکاری کے لئے قطعی ناکافی۔ گرمی کے موسم میں تو پانی تین چار مہینے تک بخارا پہنچتا ہی نہیں۔ یہاں کے انگور، خربوزے، سیب اور انار ہی نہیں بلکہ تمام میوے، بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ سمرقند کے میوجات میں سیب اور صاحبی (ایک قسم کا انگور) تو بہت ہی مشہور ہیں۔ موسم سرما میں سردی بھی شدید ہوتی ہے۔ برف بھی پڑتی ہے مگر اتنی نہیں جتنی کابل میں۔ گرمی کے دنوں میں یہاں موسم اچھا رہتا ہے مگر کابل جتنا نہیں۔ یہاں تیمور بیگ[۱۳] اور الغ بیگ[۱۴] کے عہد کی شاندار عمارات نیز باغات اور محلات بھی ہیں۔ سمرقند کے قلعے میں تیمور بیگ نے ایک چار منزلہ محل تعمیر کرایا تھا جو کوک سرائے کے نام سے مشہور ہے، جس کی عمارت بہت شاندار ہے۔[۱۵] اندرون قلعہ آہنی دروازے کے نزدیک اس نے نماز جمعہ کے لئے مسجد بھی تعمیر کرائی تھی جس کے لئے عمدہ سنگ تراش و کاریگر ہندوستان سے کام کرنے کے لئے یہاں بلائے گئے تھے۔ مسجد کی محراب پر یہ آیت ''**واذیرفع ابراھیم القواعد الیٰ اخرہ**'' ایسے جلی خط میں لکھی گئی ہے کہ اسے ایک فرسنگ کے فاصلے سے پڑھا جاسکتا ہے۔ اس کی عمارت بہت شاندار ہے۔ سمرقند کے مشرق میں اس نے دو باغ لگوائے تھے۔ ان میں سے ایک باغ جو ذرا دور واقع ہے۔ باغ بولدی (بلندی) کے نام سے مشہور ہے اور جو ذرا نزدیک ہے وہ باغ دلکشا کہلاتا ہے۔ باغ دلکشا میں بھی اس نے ایک بڑا محل تعمیر کرایا تھا۔ جس کی دیواروں پر ان جنگوں کی تصویر کشی کی گئی ہے جو اس نے ہندستان میں کی تھیں۔[۱۷] ان کے علاوہ اس نے پشتہ کوہک کے دامن پر دریائے سیاہ گل (کالی مٹی) (ورق ۴۰) کے کنارے

۴۔ سمرقند اور شہروں کے مقابلے میں محفوظ ہے

۵۔ حضرت قثم بن عباس صحابی اور حضور کے چچازاد بھائی تھے۔ حضرت علی نے اپنی خلافت کے زمانے میں ان کو پہلے حاکم مدینہ اور پھر حاکم مکہ اور طائف بنایا تھا۔ جب سعید بن عثمان بن عفان نے ۵۶ ہجری/۶۷۶ عیسوی میں ماوراء النہر پر حملہ کیا تو حضرت قثم بن عباس ان کے ساتھ تھے۔ ۶۷۷/۵۷ میں سمرقند کے محاصرے کے دوران ان کا وصال ہوا۔ (انسائیکلو پیڈا اوف اسلام) اب ان کا مزار شاہ زنداں کہلاتا ہے۔ اور اس کے اطراف بہت بڑا قبرستان آباد ہوگیا ہے انگنت مزارات اور قبریں اس کے آس پاس موجود ہیں۔ زیارت کی مشہور جگہ ہے۔

۶۔ سکندر مقدونی نے یہاں ۳۹۷ قبل مسیح حملہ کیا۔ مرکنڈا کا قلعہ بھی تھا جس کو اس نے مسمار کیا اور قتل عام کیا (ایرین ۲۱۰) اس سے پہلے سکندر کی فوج کو یہاں شکست ہو چکی تھی۔ اسپتامین نے سکندر کی فوج کو ایک دریائی جزیرے میں محدود کر کے گھیر کر شکست دی تھی (ایرین ص ۲۱۰ سمرقند کتابچہ ص ۶۴)

۷۔ سیمیز کنت۔ مالدار شہر (سمرقند کتابچہ ص ۶۳)

۸۔ شیخ ابوالمنصور ماتریدی۔ علم الکلام کے استاد اور حنفی مسلک کے پیرو۔ محلہ ماترید، جو سمرقند میں ہے، پیدا ہوئے شاید تاریخ پیدائش ۸۷۰/۲۵۷ ہے۔ تمام عمر سمرقند میں گزار دی۔ امام بخاری کو اپنا امام مانتے تھے۔ آپ کا انتقال ۹۴۴/۳۳۳ میں ہوا۔ سمرقند کے محلے ماترید میں ہی دفن ہیں۔ مزار حال ہی میں تعمیر کیا گیا ہے۔ بیچ میں ایک چوکور عمارت ہے اور چاروں طرف باغ لگایا جا رہا ہے۔

۹۔ ماتریدیہ۔ دینی مسائل کو عقلی دلائل سے ثابت کرنے کا ایک دبستان جو شیخ ابوالمنصور ماتریدی نے پیش کیا

عباسی دور میں فرقہ معتزلہ نے کافی بدعات پیدا کرنے کی کوشش کی تھی اس کے جواب میں دو علما نے ان بدعات کو رفع کرنے میں انتہائی شاندار خدمات انجام دیں۔ ابوالمنصور ماتریدی کا دائرہ کار ماوراء النہر میں تھا۔ آپ نے معتزلہ کی تاویلات قران مجید کی تردید میں تاویلات القرآن کے عنوان سے ایک ایسی کتاب لکھی جس کی نظیر نہیں (اردو دائرہ معارف اسلامیہ)

۱۰۔ اشعری۔ علم الکلام کا دوسرا دبستان جس کے امام ابوالحسن علی بن اسماعیل الاشعری ہیں جو شافعی مسلک کے عالم ہیں۔ الماتریدی علم کو وہ شہرت و مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو الاشعری کے علم الکلام کو۔ بلاد اسلامیہ میں جہاں فقہ حنفی رائج ہوا وہاں بھی

جسے لوگ آب رحمت بھی کہتے ہیں ایک باغ لگوایا تھا جس کا نام نقش جہاں تھا۔ جس وقت میں نے اس باغ کو دیکھا تھا تو وہ بالکل ویران ہو چکا تھا۔ بس نام ہی باقی رہ گیا تھا۔ سمرقند کے جنوب میں قلعے کے نزدیک باغ چنار ہے۔ جس جگہ یہ شہر ختم ہوتا ہے وہاں باغ شمال اور باغ بہشت واقع ہیں۔ محمد سلطان مرزا ولد جہانگیر مرزا ابن تیمور بیگ نے سمرقند کے قلعہ سنگین کے باہر مدرسہ تعمیر کرایا تھا جس میں تیمور بیگ کی قبر[18] کے علاوہ ان لوگوں کے مزارات بھی ہیں جنہوں نے اس جگہ حکومت کی تھی۔ الغ بیگ کی عمارت میں سے قلعہ سمرقند کے اندر مدرسہ[19] اور خانقاہ ہے۔ اس خانقاہ کا گنبد اتنا بڑا ہے کہ دنیا میں اتنے بڑے گنبد کم ہی ہوں گے۔ اسی مدرسے سے اور خانقاہ کے نزدیک اس نے شاید ایک بہت عمدہ حمام بھی بنوایا تھا جو حمام مرزا کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے فرش پر ہر قسم کا پتھر استعمال کیا گیا ہے، شاید کہ خراسان اور سمرقند میں اس جیسا کوئی اور حمام ہو۔ مدرسے کے جنوب میں اس نے مسجد مقطع تعمیر کرائی تھی اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ چوبی قطعات کو مرتب کر کے ان پر اسلیمی اور خطائی نقش ونگار مرتسم کیے گئے ہیں۔ چنانچہ اس کی تمام دیواریں اور چھتیں اسی طرز پر بنائی گئی ہیں۔ مسجد مدرسہ کے قبلے اور قبلہ مسجد میں نمایاں فرق ہے۔ غالباً اس مسجد کی سمت قبلے کے متعین کرنے میں منجموں کے طریقہ کار پر عمل کیا گیا ہے۔ پشتہ کوہک کے دامن میں رصد خانے کی شاندار عمارت ہے جس میں ستاروں کی گردش درج کرنے کے آلات نصب ہیں۔ یہ تین منزلہ عمارت ہے، الغ بیگ مرزا نے اس رصدگاہ میں زیج گورگانی مرتب کی تھی جو آج بھی دنیا میں مستعمل ہے اور اس کے مقابلے میں دیگر جنتریاں کم ہی استعمال ہوتی ہیں۔ اس سے قبل زیج ایلخانی کا رواج تھا جسے خواجہ نصیر الدین[21] نے بعہد ہلاکو خاں مراغہ[22] کی رصدگاہ میں مرتب کیا تھا۔

دنیا میں غالباً سات آٹھ سے زیادہ رصدگاہیں قائم نہیں ہوئیں۔ ان میں سے ایک خلیفہ مامون[23] نے تعمیر کرائی تھی، وہاں جو جنتری تیار ہوئی تھی اسے مورخین نے زیج مامونی لکھا ہے۔ ایک رصدگاہ بطلیموس نے تیار کرائی تھی۔ ہندوستان میں بعہد ہندو راجہ بکرماجیت اجین اور دھار میں (جو ملک مالوہ کہلاتا ہے اور اب مانڈو کے نام سے مشہور ہے) رصدگاہیں تعمیر کرائی گئی تھیں۔ چنانچہ اس وقت وہاں ہندو وہی جنتری استعمال کرتے ہیں۔ یہ جنتری ایک ہزار پانچ سو چوراسی سال قبل تیار کی گئی تھی جو دوسری جنتریوں کے مقابلے ناقص ہے۔[24]

الغ بیگ مرزا نے پشتہ کوہک کی مغربی جانب ایک باغ لگایا تھا جو باغ میدان کے نام سے مشہور ہے۔ اس باغ میں اس نے ایک عالیشان عمارت تعمیر کرائی تھی جسے چہل ستون کہتے ہیں۔ اس کی تمام منزلوں میں سنگی ستون نصب کیے گئے ہیں۔ اس عمارت میں چار برج ہیں جو چار مینار کی شکل میں ابھارے گئے ہیں۔ ان میں اوپر جانے کے لئے راستہ بنا ہوا ہے۔ اس عمارت میں ہر جگہ سنگی ستون ہی استعمال کئے گئے ہیں۔ اس میں سے بعض پر کھرے نقوش ابھار کر بل کھاتے سانپ کی طرح تراشا گیا ہے۔ بالائی منزل کی چاروں طرف ایوان میں بھی تمام ستون سنگی ہی ہیں۔ ان کے درمیان چودری ہے۔ اس عمارت کی کرسی اور فرش بھی سنگی ہے

اس عمارت سے علیحدہ پشتہ کوہک پر ایک باغیچہ ہے جس میں ایک وسیع ایوان اور اس کے اندر ایک عظیم سنگی تخت نصب کیا گیا ہے۔ اس کا طول تقریباً چودہ (ورق ۴۱) یا پندرہ گز عرض سات آٹھ گز اور بلندی ایک گز ہے۔ اتنا وسیع وعریض پتھر کسی دور دراز مقام سے لایا گیا تھا۔ اس کے درمیان درز آ گئی ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ درز یہاں لانے کے بعد ہی اس میں پڑی ہے۔ اسی باغیچہ میں ایک چودری ہے، چونکہ اس کا تمام کام چینی کا ہے اسی لئے اسے چینی خانہ کہتے ہیں۔ یہاں چینی خشت پارے استعمال کرنے کے لئے کسی شخص کو خطا بھیجا گیا تھا جو انہیں یہاں لے کر آیا۔ سمرقند کے قلعے میں ایک اور قدیم عمارت ہے جو مسجد لقلقہ کے نام سے مشہور ہے۔ مسجد کے اندر اگر زور سے لات ماریں تو لق لق کی آواز نکلتی ہے۔ اس کے بھید سے کوئی شخص واقف نہیں ہے۔
سلطان احمد مرزا کے زمانے میں بھی اعلیٰ وادنیٰ مراتب کے امرا نے بہت سے باغ اور باغیچے لگوائے تھے۔

اشعری کی پیروی کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ اشعری علم الکلام کا پرانا ہونا اور کثرت تصانیف ہے اس کے علاوہ دونوں کلاموں میں فرق اصولی نہیں فروعی ہوتا ہے۔ اشعری اور ماتریدی دونوں ہی ایک مشترکہ مدمقابل معتزلہ سے برسر پیکار رہے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ) ابن بطوطہ جب ۷۳۴/۱۳۳۳ میں خوارزم (ارگنج) پہنچا تو اس نے کئی اصحاب کا ذکر کیا ہے جو معتزلہ تھے لیکن ڈر کر اس کا کھل کر اظہار نہیں کرتے تھے (ابراہیم نعمت اللہ۔ ابن بطوطہ ص ۹۷)

۱۱۔ محمد بن اسماعیل بخاری بعد نماز جمعہ بخارا میں پیدا ہوئے۔ تحصیل علم اور حدیث جمع کرنے کے لئے اسلامی دنیا میں جگہ جگہ سفر کئے۔ آپ کی یادداشت غضب کی تھی۔ چھ لاکھ حدیثوں میں سے سات ہزار کے قریب صحیح بخاری میں جمع کیں۔ یہ قرآن کے بعد دوسری اہم کتاب ہے۔ آپ نے واپس آ کر بخارا میں قیام کیا لیکن امیر بخارا سے نہ بنی کیونکہ آپ نے اس کے ساتھ اپنی مجلس میں خصوصی برتاؤ پسند نہ کیا۔ اس نے مختلف الزامات لگا کر آپ کو شہر بدر کر دیا۔ آپ کے رشتہ دار خرتنک میں تھے وہاں آپ تھوڑے عرصے رہے۔ سمرقند بلاوے پر جا رہے تھے کہ انتقال فرمایا (پیدائش ۱۳ شوال ۱۹۴ھ / ۸۱۰ء وفات یکم شوال ۲۵۶ھ / ۸۷۰ء) (صحیح بخاری ۸۴) آپ کا مزار سمرقند سے بیس کلومیٹر شمال میں چیلک کے علاقے میں ہے مزار اور مسجد نئی تعمیر کی گئی ہے اور بہت معروف زیارت کی جگہ ہے۔

۱۲۔ صاحب ہدایہ کے لئے دیکھیے حواشی ۸۹۹ھ نوٹ ۱۹۔

۱۳۔ امیر تیمور صاحب قران۔ قران دو مبارک چیزوں کے اجتماع کو کہتے ہیں۔ امیر تیمور زہرہ اور مشتری کے اجتماع کے وقت پیدا ہوئے تھے۔ یہ قران بہت مدت میں ہوتا ہے اور ان کا اجتماع مبارک سمجھا جاتا ہے اور قران والے کی حکومت عرصہ دراز تک قائم رہتی ہے۔ حج کی ایک قسم بھی حج قران ہے جس میں حج اور عمرہ ایک ساتھ کیا جائے۔

شرمندہ ہوئے ہیں طالع خورشید وماہ دونوں
خوبی نے تیرے منہ کی ظالم قران کیا ہے
(میر)

فرہنگ آصفیہ ۳، ۳۷۸

۱۴۔ الغ بیگ کے لئے دیکھیے حواشی ۸۹۹ھ نوٹ ۳۷

۱۵۔ کوک سرائے کی باقیات ایک چوراہہ ہے اور اسکا ایک باورچی خانہ جس کے تین تندور ہوٹل افراسیاب کے شراب خانے میں ہیں۔

جن میں چہار باغ، درویش محمد ترخان کا بنایا ہوا، پرفضا اور خوش منظر ہے۔ یہ چہار باغ، باغ میدان سے ذرا نیچے ایک بلند مقام پر قلبہ نامی سبزہ زار سے متصل اسی طرح لگایا گیا ہے کہ پورا سبزہ زار اس کے قدموں میں نظر آتا ہے۔ باغ میں اوپر نیچے کئی طبقے ہیں جن پر سیدھی روشیں چلی گئی ہیں۔ اس میں تارون، سرو اور سپندار کے درخت لگائے گئے ہیں۔ نہایت ہی دل کش و خوش منظر جگہ ہے۔ اس میں بس اگر کوئی عیب ہے تو یہی ہے کہ پانی رواں نہیں ہے۔

سمرقند بھی عجیب آراستہ و مرتب شہر ہے، اس کی ایک خصوصیت یہ ہے جو شاید دوسرے شہروں میں کم ہی ہو کہ یہاں صنعت و حرفت کی جگہیں مخلوط، ملی جلی نہیں بلکہ ہر حرفے اور پیشے کا علیحدہ بازار ہے۔ گویا یہ یہاں کی رسم ہے۔ یہاں کے نان بائی اور باورچی بہت اچھے ہیں۔ پوری دنیا میں سمرقند کا کاغذ ہی سب سے عمدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ کاغذ سازی کے کارخانے سیاہ آب کے کنارے ہیں جسے آب رحمت بھی کہتے ہیں، کان گل کے مقام پر لگے ہوئے ہیں۔ سمرقند کی دوسری خاص چیز سرخ مخمل ہے جسے اطراف و جوانب میں لے جاتے ہیں۔

سمرقند کے گرد و نواح میں سبزہ زار، بہت عمدہ ہیں۔ ان میں سے ایک مشہور سبزہ زار، کان گل ہے جو سمرقند کے شمال مشرق میں ایک کوس شرعی کے فاصلے پر واقع ہے۔ سیہ آب معروف بہ آب رحمت کان گل کے درمیان سے جاری ہوتا ہے۔ اس میں تقریباً سات آٹھ چکی پانی ہوگا۔ اس دریا کے اطراف میں تالاب بہت ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس سبزہ زار کا اصل نام کان آبگیر تھا لیکن تاریخ کی کتابوں میں اسے کان گل ہی لکھا ہے۔ سلاطین سمرقند نے ہمیشہ اس سبزہ زار کو اپنے تحت تصرف رکھا ہے۔ وہ ہر سال یہاں آتے ہیں اور ایک دو ماہ گزار کر جاتے ہیں۔ اس سبزہ زار سے بالاتر مشرق و جنوب کے درمیان ایک اور سبزہ زار ہے جو یورت خاں (خاں کی خیمہ گاہ) کہلاتا ہے۔ یہ سمرقند کے مشرق میں ہے اور اس شہر سے ایک کوس شرعی کے فاصلے پر واقع ہے۔ سیاہ آب یہاں سے گزر کر کان گل کی طرف جاتا ہے۔ یورت خاں میں یہ دریا اس طرح چکر لیتا ہے کہ بس ایک لشکر اتر سکتا ہے۔

یہاں سے نکلنے کے راستے تنگ ہیں۔ اس سبزہ زار کی یہ خصوصیت دیکھتے ہوئے سمرقند کا محاصرہ کرنے کے لئے میں نے کئی مرتبہ یہاں پڑاؤ کیا۔

یہاں ایک اور سبزہ زار ہے، جس کا نام قروغ بودنہ ہے۔ یہ باغ دل کشا اور سمرقند کے درمیان ہے۔ ایک اور سبزہ زار کول مغاک ہے جو سمرقند سے دو کوس شرعی کے فاصلے پر اس شہر کے شمال مغرب میں ہے۔ یہ سبزہ زار اس طرح (ورق ۴۲) ہے کہ اس کے ایک طرف بہت بڑا تالاب (کول) ہے اس وجہ سے اس سبزہ زار کو لوگ کول مغاک کہتے ہیں۔ محاصرہ سمرقند کے دوران جس وقت میں خیمہ گاہ خاں یورت میں مقیم تھا تو سلطان علی مرزا اسی کول مغاک میں پڑاؤ کیے ہوئے تھا۔

دیگر سبزہ زار قلبہ ہے جو دوسرے سبزہ زاروں کے مقابلے میں ذرا چھوٹا ہے اس کے شمال میں موضع قلبہ ہے اور جنوب میں دریائے کوہک، باغ میدان اور چار باغ درویش محمد ترخاں ہیں۔ اور مشرق میں پشتہ کوہک ہے۔

سمرقند:۔ سمرقند کے صوبجات (ولایات) اور تومانات (دس ہزار کی آبادی پر مشتمل اضلاع) بھی عمدہ ہیں۔ اس کی ولایات میں اگر کوئی ولایت اس کے ہم پلہ ہوسکتی ہے تو وہ بخارا ہے جو اس شہر کے مغرب میں پچیس فرسنگ کے فاصلے پر ہے۔ بخارا بھی چند تومانات پر مشتمل ہے اور ایک طرح کا شہر ہی ہے۔[۲۵] یہاں پھل بہت زیادہ ہوتے ہیں اور خربوزے، تو بہت ہی عمدہ ہوتے ہیں۔ پورے خطہ ماوراء النہر میں اس کثرت سے اور اتنا عمدہ خربوزہ اور کہیں نہیں پایا جاتا اگرچہ ولایت فرغنہ کے ضلع اخسی میں ایک قسم کا خربوزہ ہوتا ہے جسے میر تیموری کہتے ہیں جو بخارا کے خربوزے سے کہیں زیادہ شیریں ولطیف ہوتا ہے مگر بخارا میں ہر قسم کے خربوزے کثرت سے اور عمدہ ہوتے ہیں۔ دوسرا یہاں کا پھل، آلو بخارا ہے چنانچہ اس جیسا پھل کسی دوسری جگہ نہیں ہوتا۔ اس کا چھلکا اتار کر اور خشک کر کے لوگ بطور تبرک ایک ولایت سے دوسری ولایت لے جاتے ہیں[۲۶] کہ یہ بہت عمدہ ملیّن دوا ہے۔

۱۶۔ جب ابراہیم اور اسماعیل کعبہ کی بنیاد رکھ رہے تھے تو یہ دعا مانگ رہے تھے کہ اے اللہ تو یہ خدمت قبول فرما۔ تو ہی جاننے اور سننے والا ہے (۲:۱۲۷) اس مسجد کو اب مسجد بی بی خانم کہتے ہیں۔ اسکو مرمت کی ضرورت ہے۔

۱۷۔ امیر تیمور نے ہندستان پر حملہ ۸۰۰۔۸۰۱ ہجری ۱۳۹۸۔۱۳۹۹ء میں کیا تھا (سعادت نامہ ص ۵۷)

۱۸۔ اسکو آجکل گور امیر کہتے ہیں۔ اب بھی شاندار عمارت ہے

۱۹۔ مدرسہ الغ بیگ واقع ریگستان سمرقند۔

۲۰۔ زیج یا جنتری وہ جدول جس میں ستاروں کی حرکات اور سکنات اور ان کے متعلق معلومات درج ہوں۔ یہ عام طور پر سالانہ شائع کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس سے چاند اور سورج کے متعلق بھی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ چاند کے نکلنے کی تاریخ۔ قبلہ کا تعین بھی کیا جاسکتا ہے۔ منجم اس کو زائچہ بنانے کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں۔

زیج گورگانی الغ بیگ کی ترتیب کردہ ہے۔

۲۱۔ نصیر الدین ابو جعفر محمد طوسی عالم۔ فلسفی اور سائنس داں تھے۔ طوس میں ۵۹۷ھ/۱۲۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے بطلیموس کی زیج میں کئی تصحیحات کیں۔ ان کی زیج تقریباً دو سو سال تک رائج رہی۔ (انسائیکلوپیڈیا اسلام)

۲۲۔ مراغہ آذربائیجان میں ہے۔

۲۳۔ مامون الرشید خلافت عباسیہ کے ساتویں خلیفہ شوال ۱۷۰ھ/اپریل ۷۸۷ء میں پیدا ہوئے۔ عباسی خلفاء میں یہ سب سے زیادہ ذی فہم تھے۔

۲۴ بابر نے جو رصدگاہیں گنائیں ان کے علاوہ بواہد خاندان نے جن کا دارالخلافہ شیراز تھا چوتھی صدی ہجری میں علم ہیئت میں کافی دلچسپی ظاہر کی اور کچھ تعمیرات بھی اس سلسلے میں کیں۔ خلیفہ الحکم نے جو ۳۸۶۔۴۱۱ھ/۹۹۶-۱۰۲۱ء میں فاطمی خلیفہ تھا، نے مصر میں ایک رصدگاہ بنوائی۔ اسی سلسلہ میں ابن سینا ۳۷۰-۴۲۸ھ/ ۹۸۰-۱۰۳۷ء اور البیرونی ۳۶۲۔۴۴۲ھ / ۹۷۳۔۱۰۵۰ء کا کام بھی لائق تحسین ہے۔

۲۵۔ بخارا میں بھی الغ بیگ نے دو مدرسے تعمیر کرائے تھے ایک بخارا شہر میں اور ایک غجدوان میں۔ لیکن بخارا کی اصل اہمیت سولھویں صدی ہجری میں ہوئی جب عبید اللہ خاں یہاں کا حاکم ہوا اور اس کو دارالخلافہ بنایا اور مختلف عمارات، نہریں بنا کائیں اور تجارات یہاں بہت بڑھ گئی۔ یہاں اب اندازاً ۱۴۰ عمارات آثار قدیمہ ہیں جس میں ایک بہت مشہور خواجہ بہاالدین نقشبند کا مزار

مزار امام بخاری، محمد بن اسماعیل کا مرقد سمرقند سے بیس کلومیٹر
شمال میں زیارت کی مشہور جگہ ہے

مسجد خواجہ خضر سمرقند میں داخل ہوتے ہی پہاڑی پر ہے

مرقد خواجہ عبیداللہ احرار، سمرقند

مرغ اور قاز کی پرورش بھی خوب کی جاتی ہے۔ ماوراء النہر میں بخارا کی شراب سے زیادہ کہیں کی شراب تیز نہیں ہوتی۔ سمرقند میں جتنی شرابیں ہوسکتی ہیں ان میں سے بس بخارا ہی کی شراب میں استعمال کرتا ہوں۔

ولایت دیگر، کش ہے۔ جو سمرقند کے جنوب میں یہاں سے نو فرسنگ کے فاصلے پر واقع ہے۔ کش اور سمرقند کے درمیان ایک پہاڑی درہ ہے جسے لوگ عام زبان میں اہتماک دبانی (درہ) کہتے ہیں۔ وہ پتھر جس پر سنگتراش کام کرتے ہیں سب اسی پہاڑ سے لے کر جاتے ہیں۔ بہاروں کے موسم میں صحرا اور شہر کے درودیوار سب سبز ہوجاتے ہیں اسی لئے اسے شہر سبز بھی کہتے ہیں۔[۲۷] یہ شہر چونکہ تیمور بیگ کی جائے پیدائش ہے اسی لئے اس نے اسی شہر کو پائے تخت بنانے کی بہت کوشش کی اور اس کے لئے اس نے بہت زیادہ اہتمام بھی کیا۔ اس نے یہاں بہت سی عمارات تعمیر کرائیں۔ اس دیوان میں جہاں اس کی نشستگاہ بھی ہے اس نے ایک عظیم پیشطاق بنوایا۔ ایوان میں دائیں اور بائیں جانب امرائے لشکر اور امرائے دیوان کی نشست معاملات وحالات دریافت کرنے کے لئے ہوتی تھیں۔ اس نے پیش طاق اور بھی بنوائے تھے جو اس سے ذرا چھوٹے تھے۔ اور یہ ان لوگوں کے بیٹھنے کے لئے تھے جن سے ان کی رائے پوچھنا مقصود تھا۔ اس دیوان خانے کے ہر ضلعے میں اس نے چھوٹی چھوٹی محرابیں بھی بنوائی تھیں جن کے بارے میں کہتے ہیں کہ دنیا میں ایسی محرابیں کم ہی ہوں گی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ طاق کسریٰ[۲۸] سے یہ محرابیں کہیں بہتر ہیں۔

تیمور بیگ نے کش میں ایک مدرسہ اور مقبرہ بھی تعمیر کرایا تھا۔ جہانگیر مرزا[۲۹] کا مزار اور اس کی بعض اولاد کے مقابر بھی یہیں ہیں۔ چونکہ شہر کش اس قابل نہ تھا کہ وہ سمرقند کی برابری کرسکے بالآخر اس نے اپنے پائے تخت کے لئے شہر سمرقند کو ہی منتخب کیا۔

قرشی:۔ ولایت دیگر، قرشی ہے۔ جسے نسف اور نخشب بھی کہتے ہیں۔ ''قرشی'' مغلئی لفظ ہے۔ مغلوں کی زبان میں قبرستان کو قرشی کہتے ہیں۔ یہ شہر چنگیز خان کے تسلط کے بعد ہی اس نام سے مشہور ہوا ہوگا۔ پانی کی یہاں قلت ہے۔ (ورق ۴۳) یہاں بہار کا موسم عمدہ ہوتا ہے۔ غلّے اور خربوزے کی فصل اچھی ہوتی ہے۔ یہ شہر سمرقند کے جنوب میں کچھ حد تک مغرب کی جانب اٹھارہ فرسنگ کے فاصلے پر ہے۔[۳۰] یہاں باغری قرا کی[۳۱] شکل کا پرندہ ہوتا ہے جسے قیل قویروغ کہتے ہیں۔ چونکہ ولایت قرشی میں یہ بکثرت پایا جاتا ہے۔ اس لئے اس کا نام قرشی پرندہ مشہور ہوگیا ہے۔

خزار ایک اور ولایت ہے۔ بخارا اور سمرقند کے درمیان ایک ولایت کرمینہ ہے۔

قراکول:۔ ایک اور ولایت قراکول ہے۔ یہ دریا کے سب سے آخر میں ہے اور بخارا سے سات فرسنگ کے فاصلے پر مغرب اور شمال کے درمیان اس کے تومانات عمدہ ہیں۔ اس میں ایک تومان سغد ہے جو سمرقند سے ہی ملحق ہے۔ اسی کے ایک سرے پر یار یلاق ہے اور دوسرے پر بخارا اور دونوں کے درمیان ایک فرسنگ بھی ایسا راستہ نہیں جہاں کوئی گاؤں اور کوئی آبادی نہ ہو۔ چنانچہ یہ مشہور ہے کہ تیمور بیگ نے کہا تھا کہ میرے پاس ایک باغ ہے جس کا طول تیس فرسنگ ہے۔ یہ بات اس نے ان ہی تومانات کے بارے میں کہی تھی۔

شادوار:۔ ایک اور ضلع شادوار ہے۔ جو شہر اور اس کے محلات سے متصل ہے۔ بہت ہی عمدہ جگہ ہے۔ اس کے ایک طرف پہاڑ ہے جو شہر سبز اور سمرقند کے درمیان واقع ہے۔ اس کے اکثر گاؤں اس پہاڑ کے دامن پر ہی آباد ہیں۔ اس کے ایک طرف کوہک دریا ہے، خوش فضا، پرصفا مقام ہے، جہاں پانی کی فراوانی ہے اور ہر نعمت ارزاں۔ پورا ضلع ہی بہت عمدہ ہے۔ جن مسافروں نے مصر اور شام کا سفر کیا ہے۔ وہ اس جیسی حسین ودلکش جگہ بتا نہیں پاتے۔ اگرچہ سمرقند میں اور بھی تومانات ہیں لیکن وہ ان کے برابر نہیں جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ہے جو شہر سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ (بخارا۔ ازبکستان نقشہ سازی کا محکمہ) عبیداللہ خاں ۱۵۳۳ء میں حاکم ہوا تھا۔

۲۶۔ ابن بطوطہ نے اس علاقے (خوارزم وماوراء النہر) کا سفر ۷۳۴/۱۳۳۳ میں کیا۔ اس نے بھی آلو بخارا اور خربوزے کی تعریف کی ہے۔ آلو بخارے کو خشک کرکے درآمد کا اس وقت بھی رواج تھا (ابراہیم نعمت اللہ۔ ابن بطوطہ ص ۹۹، ۱۰۳)

۲۷۔ کش اب شہر سبز کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں کی عمارات پر بخارا کے امیر عبداللہ خاں دوم نے کافی غصہ اتارا تھا لیکن بعد میں اپنی بے وقوفی پر نالاں بھی ہوا۔ یہاں کی عمارات میں آق سرائے محل کے کھنڈرات باقی ہیں لیکن ان سے بھی شان ٹپکتی ہے۔
امیر تیمور نے اپنے دفن کے لئے جو زمین دوز حجرہ بنوایا تھا وہ ۱۹۶۳ء میں دریافت کیا گیا ہے۔ (سنٹرل ایشیاء لونلی پلینٹ ص ۳۰۲)

۲۸۔ طاق کسریٰ اور ایوان کسریٰ ایرانی بادشاہ خسرو پرویز (۵۳۱۔۵۷۹ء) کے بنوائے ہوئے ہیں۔ یہ بغداد سے بیس میل دور دریائے دجلہ کے الٹے کنارے پر واقع ہیں۔ خسرو پرویز وہ ساسانی حکمراں تھا جس نے حضورؐ کا نامہ پھاڑ دیا تھا۔

۲۹۔ یہ جہانگیر مرزا، امیر تیمور کے دوسرے بیٹے تھے۔ بیس سال کی عمر میں اپنے باپ کے سامنے ان کا انتقال ہوگیا تھا (تاریخ رشیدی ص ۴۷) ان کا مقبرہ شہر سبز میں ہے اور مرمت طلب ہے۔

۳۰۔ قرشی۔ یہ شہر سبز سے ۱۲۳ کلومیٹر مغرب کی طرف واقع ہے۔ راستہ ہموار اور سڑک کے دونوں طرف شہوت کے درخت ہیں

۳۱۔ باغری قرا کو فارسی میں باقر قرہ شن زار کہتے ہیں (فارسی لغت اریان پور) اردو میں اس کے لئے بھٹ تیتر (اردو لغت، فیروز سنز) جبکہ اسٹینڈرڈ ڈکشنری ہیں اسکا ترجمہ صرف تیتر ہے۔ بھٹ تیتر کی ۱۲ قسمیں معلوم ہیں۔ (پاکستان کے دلچسپ پرندے ص ۶۷) قیل قویروغ اب یہاں تقریباً ناپید ہے۔ زیادہ شکار کی وجہ سے اس کی نسل مشکل ہی سے نظر آتی ہے۔ سمرقند کے ایک ریسٹورانٹ میں ایک پنجرے میں یہ نظر آیا۔

تیمور بیگ نے سمرقند کی حکومت جہانگیر مرزا کو دی تھی۔ اس کی وفات کے بعد وہ حکومت اس کے بڑے لڑکے محمد سلطان کو دے دی گئی۔ شاہرخ مرزا نے ماوراء النہر کی کل ولایات اپنے بڑے لڑکے الغ بیگ مرزا کو دے دیں جوالغ بیگ سے اس کے لڑکے عبداللطیف مرزا نے حاصل کر لیں۔ اس پنج روزہ دنیائے فانی کے لئے دانشمند باپ کو اس کے بیٹے نے شہید کر دیا۔ الغ بیگ مرزا کی تاریخ وفات اس طرح بیان کی گئی ہے:

الغ بیگ بحر علوم وخرد　　　　که دنیا ودین راازوبود پشت
زعباس شهد شهادت چشید　　　　شدش حرف تاریخ عباس کشت

(الغ بیگ علم وعقل کا سمندر، دنیا اور دین کا پشت پناہ تھا اسکو شہادت عباس کے ہاتھ سے ملی جسکی تاریخ عباس کشت نکلتی ہے۔)

لیکن اس نے بھی پانچ چھ ماہ سے زیادہ حکومت نہیں کی۔ چنانچہ اس کے بارے میں یہ بہت مشہور ہے:

پدر کش پادشاهی رانشاید
اگر شاید بجز شش مه نیاید

(باپ کے قاتل کو بادشاہی زیب نہیں دیتی، اور اگر زیب دے بھی تو چھ ماہ سے زایدہ دوام پذیر نہیں ہوتی)

عبداللطیف خسرو جمشید [۳۳] فر که بود　در سلک بندگانش فریدون وزردهشت
بابا حسین کشت شب جمعه اش به تیر　تاریخش این نویس که "بابا حسین کشت" [۳۴]

(عبدالطیف شان میں خسرو جمشید ہے اسکے بندے فریدوں وزردہشت بابا حسین نے جمعے کو اسکو تیر مارا اسکی تاریخ بابا حسین کشت سے نکلتی ہے)

عبداللطیف مرزا کے بعد شاہرخ مرزا کا نواسہ عبداللہ مرزا ابن ابراہیم مرزا جوالغ بیگ کا داماد بھی تھا تخت نشین ہوا۔ جس نے ڈیڑھ سال اور زیادہ سے زیادہ تقریباً دو سال حکومت کی۔ اس کے بعد سلطان ابوسعید مرزا نے حکومت پر قبضہ کر لیا، جو اس نے اپنی ہی زندگی میں اپنے بڑے لڑکے سلطان احمد مرزا کو سونپ دی۔ سلطان ابوسعید مرزا کے بعد سلطان احمد مرزا نے حکمرانی کی۔ اس کی وفات کے بعد سلطان محمود مرزا سمرقند کے تخت پر متمکن ہوا۔ (ورق ۴۴) سلطان محمود مرزا کے بعد بایسنغر مرزا نے فرماں روائی کی۔ ترخانیوں کی شورش میں بایسنغر مرزا نے یہ حکومت دوبارہ حاصل کر لی۔ جس کا ذکر اس کتاب تاریخ میں گزر چکا ہے بایسنغر مرزا سے یہ حکومت میں نے حاصل کی آئندہ کی کیفیت آگے بیان کی جائے گی

بابر کی سمرقند پر حکمرانی

تخت سلطنت پر متمکن ہونے کے بعد ایام گزشتہ کی طرح میں نے امرا کے ساتھ رعایت وعنایت کا سلوک اختیار کیا۔ میرے ساتھ جو امرا تھے ان کے مرتبے کے مطابق ان پر عنایات کی گئیں اور ان کے ساتھ شفقت سے پیش آیا۔ سلطان احمد تنبل کے ساتھ زیادہ رعایت کی گئی۔ امرا کے جرگے میں چونکہ وہ میرے زیادہ قریب تھا اسی لئے میں نے اسے بڑے امرا کے حلقے میں شامل کر لیا۔

سات ماہ تک محاصرہ کرنے کے بعد میں نے سمرقند پر بڑی مشکل سے فتح تو حاصل کر لی مگر اہل لشکر کو سمرقند کے علاوہ مال غنیمت نام کی کوئی چیز ہاتھ نہ لگی۔ دیگر تمام ولایات بھی میرے دست اختیار میں آ گئی تھیں۔ لیکن ان ولایات کے لئے جو ہمارے اور سلطان علی مرزا کے درمیان باعث تنازع تھیں ان پر حملہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ولایات جو اس قدر برباد ہو چکی ہوں وہاں سے کوئی چیز کیسے میسر آ سکتی تھی۔ ہمارے لشکر کے ہاتھ جو مال غنیمت لگا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔

جس وقت سمرقند فتح ہوا تو اس قدر تباہ ہو چکا تھا کہ وہاں سے کوئی چیز حاصل کرنا تو در کنار، ضرورت اس امر کی تھی کہ لوگوں کو بیج اور پیشگی روپیہ دیا جائے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ لشکر کے لوگوں نے بہت زیادہ تنگی وعسرت برداشت کی۔

۳۲۔ بابر نے یہاں لفظ "مرنگ قرشی" لکھا ہے۔ خان خاناں نے اس کو قائم رکھا۔ ترکی زبان میں مرغ ایک خاص پرندے کے علاوہ کسی عام پرندے کے لئے بھی بولا جا سکتا ہے اور مرنگ کسی عام چھوٹے پرندے کے لئے (کتاب معانی لہجہ۔ مکتبہ لبنان)

۳۳۔ خسرو جمشید۔ خسرو ایک لقب کے طور پر ہر شان وشوکت والے بادشاہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ خسرو جمشید شاہ نامہ فردوسی کا ایک عظیم خیالی بادشاہ ہے۔ وہ سات سو سال تک حکومت کرتا ہے۔ انسانوں پر بھی اور پرندوں، جنوں اور پریوں پر بھی۔ اس کے علاوہ جنگی ہتھیار بنانا۔ جنگوں میں لڑائی کے داؤں پیچ اور مختلف دوسرے تراکیب بھی اس کو آتے ہیں۔ وہ جہاں چاہتا ہے ہوائی تخت پر اڑ کر پہنچ جاتا ہے۔ اس کے زمانے میں ہی ایران میں نوروز کی ابتدا ہوئی جو اب تک ہر سال کے شروع میں منایا جاتا ہے۔ آخر میں وہ دہاک سے شکست کھاتا ہے اور قتل ہو جاتا ہے۔ لٹریری ہسٹری اوف پرشیا۔ براؤن۔ پہلی جلد ص ۱۱۴)

۳۴۔ عبدالطیف مرزا کا مزار سمرقند میں گور امیر کے پیچھے ایک محلہ کے اندر واقع ہے۔ دونوں دروازوں پر لوہے کے جنگلے کے پھاٹک ہیں جو بند ہیں۔ یہاں ویرانی ہے۔ اس کا انتقال ۸۵۴/ ۱۴۵۰ میں ہوا۔

ہمارے پاس بھی امرا کو دینے کے لئے کچھ نہ تھا۔ انہیں اب گھر کی یاد ستانے لگی تھی۔ اور کچھ تو ایک ایک دو دو کر کے فرار بھی ہونے لگے۔ پہلا شخص جس نے راہ فرار اختیار کی وہ خاں قلی بیان قلی اور دوسرا ابراہیم بیگ چک۔ مغل تو سب ہی فرار ہو گئے۔ اس کے بعد سلطان احمد تنبل بھی بھاگ گیا۔

اس فتنے کو فرو کرنے کے لئے خواجہ قاضی احمد کو اوزون حسن کے پاس بھیجا گیا کیونکہ وہ خواجہ صاحب کا معتمد اور ان کے ساتھ خلوص سے پیش آتا تھا۔ موصوف کو بھیجے جانے کا مقصد یہ تھا کہ اوزون حسن سے اتفاق کر کے بعض مفرورین کو سزا دی جائے اور کچھ کو میرے پاس واپس لایا جائے۔ فتنے کی اس آگ کو مشتعل کرنے والا اور وہ گروہ جس نے میرے پاس سے راہ فرار اختیار کی تھی انہیں شہ دینے والا اوزون حسن نمک حرام ہی تھا۔ چنانچہ سلطان احمد تنبل کے فرار ہونے کے بعد سب ہی علانیہ نمک حرامی پر اتر آئے۔

اس سال جس کے دوران سمرقند کی تسخیر کے لئے پوری جدّ وجہد سے لشکر کشی کی جارہی تھی، اگرچہ سلطان محمود خاں کی جانب سے چنداں مدد نہیں ملی مگر سمرقند کی فتح کے بعد اب اس کی نظریں اندجان پر لگی ہوئی تھیں۔ اس وقت جب کہ میری سپاہ کا بیشتر دستہ اور تمام لشکر مغل فرار ہو کر اخسی و اندجان پہنچ چکا تھا، اوزون حسن اور سلطان احمد تنبل اُس ولایت کو جہانگیر مرزا کے لئے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے، لیکن چند وجوہ کی بنا پر اس کو ان کے حوالے کر دینا ممکن نہ تھا۔ اس میں سے ایک وجہ تو یہ تھی کہ خاں سے کوئی ایسا وعدہ نہیں کیا گیا تھا کہ یہ علاقہ انہیں دے دیا جائے گا، لیکن چونکہ خاں نے اس کا مطالبہ کیا تھا تو ایسی صورت میں جب کہ خاں کا مطالبہ ہو تو ان کے لئے بھی ضروری تھا کہ وہ یہ قول دیں کہ یہ علاقہ جہانگیر مرزا کو ہی دیا جائے گا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جو لوگ فرار ہو کر اُس ولایت میں پہنچ گئے تھے اب اس کی طمع حکم کے طور پر کر رہے تھے۔ اس سے پہلے بات ہوئی ہوتی تو ان کے حکم کو قبول کرنے کا کوئی جواز ہو سکتا تھا۔ تمام مغل لشکر اندرجان کے سپاہی اور امرا میں سے بعض جو میرے نزدیک تھے سب (ورق ۴۵) اندرجان پہنچ گئے۔ میرے ہمراہ سمرقند میں اچھے برے اور چھوٹے بڑے امیر ہزار نفر ہی رہ گئے۔

اب جب کہ ان کی درخواست ان کی مرضی کے مطابق قبول نہ ہوئی تو ان لوگوں کو جو فرار ہو کر وہاں پہنچے تھے انہوں نے اپنا ہمنوا کر لیا۔ وہ جو خوف زدہ ہو کر مفرور ہوئے تھے خدا سے چاہتے تھے کہ کوئی ایسا حادثہ رونما ہو۔ چنانچہ اخسی سے اندجان پر لشکر کشی کر کے انہوں نے اپنی بد طینتی اور سرکشی کو کاملاً آشکار و عیاں کر دیا۔

تولون خواجہ مارین قبیلے میں بڑا دلیر، خودسر، جنگجو اور نامور شخص تھا۔ میرے والد عمر شیخ مرزا نے اسے بہت زیادہ مراعات دی تھیں، میں نے اس کی خود تربیت کی تھی اور اسے اپنا امیر بنایا تھا۔ چونکہ مغل قبائل کے لوگ سمرقند سے فرار ہونے لگے تو تولون خواجہ کو میں نے ان کے پاس بھیجا تا کہ انہیں اطمینان دلا کر ان کے دلوں سے خوف و دہشت دور کر دے اور انہیں سمجھائے کہ وہ خوف زدہ ہو کر اس طرح سرگردان نہ ہوں۔ چند فتنہ جو نمک حراموں نے لوگوں کے دلوں میں ایسی بدگمانی پیدا کر دی کہ کسی وعدہ وعید اور نصیحت و تنبیہ کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تولون خواجہ کا گزر میان دو آبے سے ہوا جسے باطلک اور چینی کہتے ہیں۔ اوزن حسن اور سلطان احمد تنبل نے خواجہ تولون پر حملہ کرنے کے لئے ایک دستے کو روانہ کیا۔ جس نے اس کو غافل پا کر گرفتار کر لیا اور قتل کر ڈالا، اوزون حسن اور احمد تنبل نے جہانگیر مرزا کو ساتھ لے کر اندجان کا محاصرہ کر لیا۔

جس وقت لشکر کے ہمراہ میں اندجاں سے روانہ ہوا تو اندجان میں علی دوست طغائی کو اور اخسی میں اوزون حسن کو مقرر کر دیا تھا۔ اس کے بعد خواجہ قاضی بھی چلے گئے تھے۔ محاصرے میں سمرقند سے فرار ہونے والوں میں بہت سے جوان بھی شامل تھے۔ خواجہ قاضی نے قلعہ اندجان بچانے کے لئے ابتدائی دور میں میری خیر خواہی کی خاطر اپنی اٹھارہ ہزار بھیڑیں ان لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیں جو قلعے میں تھے اور ان کے اہل و عیال کو جو ہمارے طرف دار تھے۔ جس وقت محاصرہ جاری تھا میری ماؤں اور خواجہ قاضی کے خطوط مسلسل میرے پاس آرہے تھے۔

جن کا مفہوم یہ تھا کہ ہم بری طرح نرغے میں گرفتار ہیں ہمارے پاس آجاؤ تو اچھا ہوگا ورنہ کام خراب ہوا ہی چاہتا ہے۔ سمرقند کو اندجان کے بل پر فتح کیا گیا ہے۔ اگر اندجان قبضے میں رہے تو خداوند تعالیٰ سب کام ٹھیک کر دے گا اور سمرقند کو دوبارہ حاصل کیا جاسکے گا۔ چنانچہ اس مضمون پر مشتمل مراسلات یکے بعد دیگر میرے پاس آتے رہے۔

علالت

میں اس عرصے میں اچانک بیمار ہوگیا اگرچہ صحت یاب ہونا شروع ہوگیا تھا لیکن نقاہت باقی تھی۔ اس کیفیت میں اپنی صحت کی جانب اچھی طرح توجہ نہ دے سکا۔ مرض عود کر آیا اور اس قدر سخت بیمار ہوا کہ چار روز تک میری زبان سے آواز تک نہ نکلی۔ کمزوری ایسی کہ روئی نچوڑ کر میرے منہ میں پانی ٹپکایا جارہا تھا۔ ادنیٰ واعلیٰ درجے کے امرا اور نوجوان سپاہی جو ہمراہ تھے میری زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ ہر شخص کو اپنی ہی فکر تھی۔ اس حالت میں اوزن حسن کا ایلچی آیا جو اپنے ساتھ پریشان کن پیغام لایا تھا۔ امرانے غلطی کی، اور مجھے بیماری کی حالت میں دکھا کر اسے رخصت کر دیا (ورق ۴۶) چار پانچ روز بعد میری حالت کچھ بہتر ہوگئی۔ لیکن زبان میں ابھی لکنت باقی تھی۔

چند روز بعد جب میری والدہ، نانی ایسن دولت اور میرے استاد پیر یعنی جناب مولانا قاضی کے خطوط اس نوعیت پر مشتمل ملے اور مجھے اہتمام سے طلب کیا گیا تو کس کا دل چاہے کہ وہاں رکے۔ چنانچہ ماہ رجب (مارچ ۱۴۹۸ء) میں ہفتے کے دن سمرقند سے اندجان کی جانب روانہ ہوا۔ اس مرتبہ سمرقند میں میں چند روز فرماں روا کی حیثیت سے مقیم رہا۔ یہاں سے خجند کی طرف روانہ ہوا اور ہفتے کے روز ہی وہاں پہنچا۔ اسی دن اندجان سے ایک شخص آیا اور یہ خبر لایا کہ اب سے سات روز قبل یعنی اس ہفتے کے دن جب میں سمرقند سے روانہ ہوا تھا علی دوست طغائی نے قلعہ اندجان دشمن کے حوالے کر دیا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ میرے امرانے اوزن حسن کے نوکر کو میری علالت کی حالت دکھا کر واپس جانے کی اجازت دے دی تو اس وقت اس نے وہاں جا کر یہ کہہ دیا کہ باشاہ کی زبان بند ہو چکی ہے اور روئی سے اس کے منہ میں پانی ٹپکایا جارہا ہے۔ یہی بات اس نے علی دوست طغائی کو قسم کھا کر بتا دی۔ اس وقت علی دوست دروازہ خاکان پر تھا۔ یہ بات سن کر اس کے پیرا کھڑ گئے۔ اس نے دشمنوں کو بلایا، شرط ومعاہدہ کر کے قلعہ ان کے حوالے کر دیا۔ سامان رسد اور جنگجو آدمیوں کی قلعہ میں کمی نہ تھی۔ اس منافق، بزدل کا مقصد نمک حرامی تھا اور جو باتیں کہی گئی تھیں وہ محض اس کا خود ساختہ بہانہ تھا۔ اندجان پر قبضہ کرنے کے بعد جب دشمنوں نے میرے خجند پہنچنے کے بارے میں سنا تو انہوں نے خواجہ مولانا قاضی کو بے عزّتی سے قلعے کے دروازے پر گلے میں پھندا ڈال کر شہید کر دیا۔

خواجہ قاضی

خواجہ قاضی کا اصلی نام عبداللہ تھا مگر وہ خواجہ قاضی کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کا نسب والد کی طرف سے شیخ برہان الدین قلیج اور والدہ کی طرف سے سلطان ایلیک ماضی تک پہنچتا تھا۔ شیخ الاسلام اور قاضی کی حیثیت سے وارد ہوئے تھے۔ خواجہ قاضی خود حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کے دست مبارک پر بیعت اور ان ہی کے تربیت یافتہ تھے۔ خواجہ قاضی کے ولی ہونے میں مجھے ذرا بھی شک وشبہ نہیں۔ ان کے ولی ہونے کی اس سے بہتر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ جن لوگوں نے ان کی جان لینے کا قصد کیا ان کا تھوڑے ہی عرصے میں نام ونشان تک باقی نہ رہا۔ خواجہ قاضی بھی عجب انسان تھے خوف ہراس تو ان میں ذرا بھی نہ تھا۔ ایسا دلیر و بے باک آدمی تو دیکھا ہی نہیں۔ یہ صفت بھی ان کے ولی ہونے کی دلیل ہے۔ لوگ خواہ کتنے ہی بہادر وجری کیوں نہ ہوں لیکن کچھ نہ کچھ خوف تو ان کے دلوں میں رہتا ہی ہے۔ مگر خواجہ قاضی کے دل میں ذرہ برابر بھی خوف وہراس نہ تھا۔ ان کے قتل

کیئے جانے کے بعد ان تمام لوگوں کو جو ان سے منسوب تھے جن میں ان کے نوکر چاکر اور قوم و قبیلے کے افراد شامل تھے گرفتار کر کے تاخت و تاراج کر دیا گیا۔

میری والدہ، نانی اور ان لوگوں کے اہل خاندان جو میرے ساتھ تھے کو میرے پاس خجند بھیجد یا گیا۔ ہم نے اندجان کی خاطر سمرقند سے ہاتھ دھوئے اب اندجان بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ اور ہم انجانوں کی اب یہ حالت تھی کہ نہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔ عجب آزمائش و مصیبت کا وقت تھا کیونکہ جب سے مجھے فرمان روائی ملی تھی اس طرح نوکروں اور ولایت سے کبھی الگ نہ ہوا تھا۔ اور جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا اس طرح کے آلام و مصائب سے کبھی دوچار نہ ہوا تھا۔ ہمیں خجند آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ خلیفہ کو جس کی میرے گھر میں آمد تھی (ورق ۴۷) بعض منافق برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے محمد حسین مرزا اور بعض دوسرے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ خلیفہ کو تاشقند کی جانب روانہ کر دیا جائے۔ ادھر قاسم بیگ کو بھی خاں کے پاس مدد کے لئے تاشقند بھیج دیا گیا اور اس سے اندجان پہنچنے کی درخواست کی گئی۔ خاں لشکر کے ہمراہ وادی آہنگران میں پہنچ گیا۔ جس وقت اس نے کندرلیگ سرحد پر پڑاؤ کیا تو میں خجند سے وہاں پہنچ گیا اور اپنے خان دادا سے ملاقات کی کندرلیگ کو فتح کر کے ہم اخسی پہنچے اسی طرح دشمنوں کے پاس جو بھی لشکر موجود تھا اسے جمع کر کے انہوں نے اخسی کی جانب رخ کیا۔

اس وقت باپ کے لوگوں نے میری آمد کی امید پر قلعے کو محکم کر لیا مگر خاں نے وہاں پہنچنے میں تساہل سے کام لیا دشمنوں نے زبردستی اس پر قبضہ کر لیا۔ اگرچہ خاں کے اخلاق و اطوار بہت اچھے تھے مگر سپاہگری و سرداری کے آداب سے بے بہرہ تھا۔ جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اگر وہ ایک کوچ اور آگے بڑھ گیا ہوتا تو عین ممکن تھا کہ جنگ کئے بغیر ہی وہ ولایت ہمارے ہاتھ آ جاتی۔ ایسے موقعے پر اس نے مخالفین کی قربت آمیز باتوں پر دھیان دیا اور صلح کی بات درمیان میں لانے کی غرض سے اس نے خواجہ ابوالمکارم، تنبل بیگ کے بڑے بھائی تلبہ کو جو خاں کا حاجب دربار تھا ایلچی بنا کر روانہ کیا۔ اس وفد نے اپنی جان بچانے کی خاطر جھوٹ سچ کے قلابے ایسے ملائے کہ خاں اور وہ لوگ جو درمیان میں تھے تھوڑی سی رشوت لے کر راضی ہو گئے۔ چنانچہ خاں نے اسی پر اکتفا کیا اور واپس آ گیا۔

وہ امرا قرابت دار اور جوان جو میرے ہمراہ تھے ان کے خاندان کے اکثر افراد اندجان میں مقیم تھے جس کے نقصان سے وہ مایوس ہو چکے تھے۔ اسی لئے ادنیٰ و اعلیٰ درجے کے امرا جوانوں میں سے سات سو آٹھ سو افراد مجھ سے علیحدہ ہو گئے۔ جو امرا مجھ سے علیحدہ ہوئے تھے ان میں علی درویش بیگ، علی مزید قوچین، محمد باقر بیگ، حاجب دربان، شیخ عبداللہ، ایشیک آغا اور میریم لاغری وغیرہ شامل تھے۔ وہ لوگ جو میرے ساتھ رہے اور جنہوں نے جلاوطنی کی صعوبت و مشقت برداشت کی ان میں اچھے برے سب ملا کر تقریباً دو سو سے زیادہ اور تین سو سے کم ہوں گے۔ اس وقت میرے ساتھ امرا میں: قاسم بیگ قوچین، ویس لاغری، ابراہیم ساروی، منگلیغ بیگ، شریم طغائی، شیدی قرا بیگ اور قرابت داروں میں میر شاہ قوچین، سید قاسم، ایشیک آقا، جلایر قاسم، عجب محمد، علی دوست طغائی محمد علی بشیر، خدائی بردی توغچی، یارک طغائی، سلطان قلی، بابا قلی، پیرویس شیخ ویس، یار علی بلال [۳۵] و قاسم میر آخور اور وحید رکابدار تھے۔

یہ مجھ پر سخت مصیبت کا وقت تھا۔ اور اپنی اس حالت زار پر میں نے بہت زیادہ گریہ و زاری کی۔ میں خجند چلا آیا۔ یہاں میرے پاس میری والدہ، نانی اور بعض لوگوں کے اہل و عیال کو بھیج دیا گیا جو میرے ساتھ رہ رہے تھے۔

اس سال رمضان کا مہینہ میں نے خجند میں ہی گذارا۔ یہاں سے میں نے ایک شخص کو سلطان محمود خاں کے پاس روانہ کیا اور اس سے مدد حاصل کر کے سمرقند کی جانب روانہ ہوا۔ اس نے اپنے لڑکے سلطان محمد خاں اور احمد بیگ کو پانچ چھ ہزار افراد کے ساتھ سمرقند کی مہم پر مقرر کیا اور خاں خود بھی سوار ہو کر اورا تیپہ تک آیا۔ یہاں خاں سے ملاقات کر کے یار ییلاق کے راستے سے میں سمرقند کی جانب روانہ ہوا۔ سلطان محمد اور احمد بیگ پہلے ہی دوسرے

۳۵۔ یار علی بلال۔ یہ خان خاناں عبدالرحیم خاں مترجم بابر نامہ کے پردادا ہیں۔ ان کا نام بیرک بیگ بھی تھا۔ ان کا ذکر ماثر رحیمی میں اسی نام سے ہے (ص ۶۱)۔ بابر نے کئی جگہ ان کا ذکر کیا ہے تفصیل کے لئے دیکھیں خان خاناں نامہ (ص ج)۔

راستے سے وہاں پہنچ چکے تھے۔ میں بورکہ ییلاق کے راستے سے سنگ زار نامی قلعے پر پہنچا جہاں یار ییلاق کے داروغہ (ورق ۴۸) کی عمل داری تھی۔ سلطان محمد اور احمد بیگ کو جیسے ہی یہ خبر ملی کہ شیبانی خاں نے شیراز اور اس کے نواح میں تاخت و تاراج کا بازار گرم کیا ہوا ہے تو وہ واپس چلے گئے۔ میں نے بھی مجبوراً اس جگہ کو خیر باد کہا اور خجند چلا آیا۔

جب دل میں حکمرانی کی فکر اور ملک گیری کا عزم و ارادہ ہو تو ایک دو مرتبہ پیشرفت نہ ہونے سے ناکام ہو کر تو نہیں بیٹھا جا سکتا۔ چنانچہ اندجان کی تسخیر کے خیال سے میں خاں کی مدد حاصل کرنے کی خاطر تاشقند کی جانب روانہ ہوا گزشتہ سات آٹھ سال کے دوران میں نے شاہ بیگم اور اپنے عزیز و اقارب کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ اسی بہانے سے وہاں میری ان سے ملاقات ہو گئی۔ چند روز بعد خاں نے سید محمد مرزا دوغلت، ایوب بیگ چک اور جان حسن بارین کو سات آٹھ سو افراد کے ساتھ مدد کے لئے متعین کیا۔ چنانچہ اس مدد کے سہارے میں روانہ ہوا، خجند میں توقف کئے بغیر وہاں سے گزر کر یلغار کرتا ہوا کند بادام کو بائیں جانب چھوڑ کر راتوں رات قلعہ نسوخ کے پاس پہنچ گیا۔ جو خجند سے دس فرسنگ کے فاصلے پر ہے۔ اس قلعے پر سیڑھیاں لگا کر چوری چھپے اس کو فتح کر لیا۔ اس وقت وہاں خربوزہ پک چکا تھا۔ نسوخ میں خربوزے کی ایک قسم ہوتی ہے جسے اسمٰعیل شیخی کہتے ہیں۔ اس کا چھلکا زرد اور سخت ہوتا ہے۔ بیج سیب کے بیج کے برابر اور گودا بھی چار انگل کا۔ عجب خوش مزہ خربوزہ ہوتا ہے۔ اس طرح کا خربوزہ اس کے گرد و نواح میں نہیں پایا جاتا۔ اگلے روز صبح امرا نے عرض کیا ہمارے افراد کی تعداد بہت کم ہے۔ ایک قلعے کو فتح کر کے ہمارے کام میں کیا پیشرفت ہو سکتی ہے۔ درحقیقت صورت حال بھی یہی تھی۔ جب میں نے وہاں کے قلعے کو مستحکم کرنے میں مصلحت نہ دیکھی تو پھر واپس خجند چلا آیا۔

اسی سال خسرو شاہ نے مرزا بایسنغر کے ہمراہ لشکر کشی کی۔ چغانیان آ کر اس نے مکر و فریب سے سلطان مسعود مرزا کے پاس اپنا ایلچی بھیجا کہ آؤ ہم سمرقند کی جانب رخ کریں، اگر سمرقند فتح ہو گیا تو ایک مرزا سمرقند میں تخت نشین ہو گا اور دوسرا حصار میں۔ مرزا کے امرا، اقربا اور سپاہی اُس سے آزردہ خاطر تھے اس لئے کہ اس نے شیخ عبداللہ برلاس کو جو رشتے میں (بایسنغر) مرزا کا سسر ہوتا تھا اور سلطان مسعود مرزا کے پاس آ گیا تھا، بہت سی مراعات دے رکھی تھی۔ حصار ایک مختصر ولایت ہے لیکن اس میں سے اس کا وظیفہ ایک ہزار تومان فلوس (تانبے کا سکہ) مقرر کر دیا تھا اور ولایت ختلان تو مکمل ہی اس کے حوالے کر دی تھی اور اس جگہ جو سلطان مسعود مرزا کے اقربا اور امرا کی جاگیرات تھیں، ان سب پر اس نے قبضہ کر لیا اور اس کے لڑکوں کا اس کے دولت خانے میں کلی و جزوی طور پر عمل و دخل ہو گیا۔ جو لوگ مرزا سے آزردہ خاطر تھے وہ اس سے فرار ہو کر آہستہ آہستہ مرزا بایسنغر کے پاس آنے لگے۔

اپنی فریب آمیز باتوں سے سلطان مسعود مرزا کو غافل کر کے چغانیان سے یلغار کرتے ہوئے خسرو شاہ اور بایسنغر مرزا قلعہ حصار تک پہنچ گئے۔ چنانچہ اس وقت جب کہ صبح کا نقارہ بجنے والا تھا انہوں نے قلعہ حصار پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت سلطان مسعود مرزا چونکہ قلعے سے باہر شہر کے محلات میں دولت سرا نامی محل میں تھا (جسے اس کے والد نے بنوایا تھا) اسی لئے وہ قلعے میں نہ آ سکا اور باہر کے باہر ہی فرار ہو گیا، اور شیخ عبداللہ برلاس کے ساتھ ختلان کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں ہی وہ اس سے علیحدہ ہو کر اوباج گھاٹ پر دریا پار کر کے سلطان حسین مرزا کے پاس پہنچ گیا۔ خسرو شاہ نے حصار کو فتح کرتے ہی (ورق ۴۹) بایسنغر مرزا کی تاج پوشی کی اور ختلان اپنے بھائی کو دے دیا۔ چند روز بعد نظیر بہادر کو تین چار ہزار فوج کے ساتھ بلخ بھیجا۔ پھر خود بھی بلخ کی طرف روانہ ہوا۔ اور وہاں کا محاصرہ کر لیا۔ بلخ پر ابراہیم حسین مرزا کا قبضہ تھا۔ سلطان حسین مرزا کے امرا بھی وہاں موجود تھے۔ خسرو شاہ نے اپنے بھائی ولی کو لشکر عظیم کے ہمراہ شبرغان کا محاصرہ اور اس کے گرد و نواح کو تاخت و تاراج کرنے کے لئے روانہ کیا۔ لیکن جب وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ تو اس نے اپنے آدمیوں کو جو ہمراہ تھے ان قبائل کی غارت گری کے لئے روانہ

کر دیا جو چول زردک میں رہتے تھے۔ چنانچہ وہ لوگ اس علاقے میں تاخت وتاراج کر کے اپنے ہمراہ ایک ہزار سے زیادہ بھیڑیں اور تین ہزار اونٹ لے کر آئے۔ ولی نے وہاں سے ولایت سان اور چار یک کو تاخت وتاراج کیا اور ان لوگوں کو قید کیا جنہوں نے خود کو پہاڑوں میں محکم کر رکھا تھا پھر بلخ اپنے بھائی کے پاس پہنچ گیا۔

جن دنوں میں خسرو شاہ نے بلخ کا محاصرہ کر رکھا تھا اس نے ایک دن اپنے ملازم نظر بہادر کو، جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ نہروں کو توڑنے اور تباہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ تنگری بیردی سامانچی جس کو سلطان حسین مرزا نے بہت مراعات دی تھیں ستر اسی جوانوں کو ساتھ لے کر باہر نکل آئے اور نظر بہادر کا مقابلہ کر کے اسے زیر کرلیا۔ اس کا سر تن سے جدا کر کے قلعے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے اپنی مردانگی کے جوہر دکھا کر نمایاں کارنامے انجام دیئے۔

اسی سال سلطان حسین مرزا نے ذوالنون ارغون اور اس کے لڑکے شاہ شجاع کی سرکوبی کے لئے (جس نے بدیع الزماں مرزا کی نوکری اور اپنی لڑکی کی شادی اس کے ساتھ کردی تھی) اس بنا پر لشکر کشی کی کہ دونوں علاقے میں فتنہ وفساد برپا کئے ہوئے تھے، چنانچہ اپنے لشکر کے ہمراہ وہ قلعہ بست پہنچا جہاں اس کے لشکر کو کسی بھی طرف سے غلہ نہ ملا اور نزدیک تھا کہ اہل لشکر بھوک سے مرنے لگیں اور تنگ آ کر وہ محاصرہ اٹھالے کہ بست کے داروغہ نے قلعہ اس کے حوالے کردیا۔ چنانچہ مرزا قلعہ بست کے ذخیرے کی مدد سے واپس خراسان آگیا۔

سلطان حسین مرزا جیسے عظیم فرمان روا نے اس قدر وساز وسامان اور طمطراق کے ساتھ کئی مرتبہ قندوز، حصار اور قندہار پر لشکر کی مگر ہر مرتبہ ناکام واپس آیا اسی لئے اس کے بیٹے اور امرا ایسے دلیر ہوگئے کہ اس سے سرکش ہو کر اس کے خلاف بغاوت پر اتر آئے۔ چنانچہ اس نے اپنے ہی لڑکے محمد حسین مرزا کے شر کو رفع کرنے کے لئے جس نے استر آباد پر قبضہ کرلیا تھا اور بدسلوکی پر اتر آیا تھا محمد ولی بیگ کی سرداری میں ایک لشکر روانہ کیا۔ وہ ابھی نشین نامی سبزہ زار میں ہی مقیم تھا کہ بدیع الزمان مرزا اور ذوالنون کا لڑکا شاہ بیگ اچانک اس پر حملہ آور ہوئے۔ حسن اتفاق سے سلطان مسعود مرزا حصار کو ہار کر سلطان حسین مرزا کے پاس آرہا تھا اور اسی دن وہاں پہنچا تھا نیز وہ لشکر جو استر آباد کی جانب روانہ ہوا تھا وہ بھی وہاں پہنچ گیا اور مرزا سے آن ملا۔ اگر چہ دونوں لشکر روبرو تھے مگر اس کے باوجود جنگ نہ ہوسکی۔ بدیع الزمان مرزا اور شاہ بیگ فرار ہوگئے۔ سلطان حسین مرزا نے سلطان مسعود مرزا کے ساتھ عمدہ سلوک کیا۔ سلطان حسین مرزا نے اس کو داماد بنا کر اپنے سامنے ادب سے دوزانو بٹھایا۔ خسرو شاہ کے برادر خود، باقی چغانیانی جو اس سے قبل سلطان حسین مرزا کی ملازمت اختیار کرچکا تھا سلطان مسعود مرزا کی شہ پر خراسان میں نہ رکا اور کوئی بہانہ بنا کر بغیر سلطان حسین مرزا کو بتائے خسرو شاہ کے پاس پہنچ گیا۔

خسرو شاہ نے پہلے ہی بایسنغر (ورق ۵۰) مرزا کو حصار میں بلالیا تھا۔ ان ہی دنوں الغ بیگ مرزا[۳۶] کا لڑکا میران شاہ مرزا اپنے باپ سے باغی ہو کر ہزارہ پہنچ گیا جہاں اس نے بہت بے راہ روی سے کام لیا مگر وہ وہاں زیادہ رک نہ سکا چنانچہ وہ بھی خسرو شاہ کے پاس پہنچ گیا۔ بعض کوتاہ اندیش اس فکر میں تھے کہ تینوں شہزادوں کو قتل کر کے خطبہ خسرو شاہ کے نام پڑھوایا جائے۔ لیکن خسرو شاہ کی اتنی ہمت نہ ہوئی تو اس نے سلطان مسعود مرزا کو جس کو بچپن سے ہی اپنی نگہداشت میں پروان چڑھا کر جوان کیا تھا، اپنے پاس بلایا اور اس پانچ روزہ دنیا کی خاطر (جس نے نہ کبھی وفا کی ہے اور نہ کسی کے ساتھ کرے گی) اس کی آنکھوں میں نشتر مار کر اندھا کردیا۔ اس کے بعض رضاعی بھائی، خیر خواہ اور قدیم ملازم اس خیال سے کہ سلطان مسعود مرزا کو سلطان علی مرزا کے پاس سمرقند لے جائیں، کش میں اترے۔ لیکن وہاں کے لوگ بھی اس کی جان کے دشمن ہوگئے۔ چنانچہ وہ وہاں سے بھاگے اور چار جو گھاٹ پار کر کے سلطان حسین مرزا کے پاس پہنچے۔

جو کوئی بھی ایسی خراب حرکت کا مرتکب ہو اور جو بھی اس کا اہتمام کرے اس پر سو، ہزار مرتبہ لعنت اور

۳۶۔ الغ بیگ۔ یہ الغ بیگ بن ابوسعید مرزا ہیں جو کابل کے حکمراں اور بابر کے چچا تھے۔

روز قیامت کے بپا ہونے تک جو کوئی بھی خسروشاہ کے اس فعل کے بارے میں سنے گا اس پر لعنت بھیجے گا اور جو کوئی سنے اور اس پر لعنت نہ کرے، وہ بھی لعنت کا مستحق و سزاوار ہوگا۔ اس پست حرکت کے مرتکب ہونے کے بعد خسروشاہ نے بایسنغر مرزا کو تخت نشین کرا کے اسے حصار جانے کی اجازت دی اور سید کامل کو میران شاہ مرزا کی مدد کے طور پر ہمراہ کر کے بامیان بھیج دیا۔

مزار امیر تیمور، پائنتی الغ بیگ کا مزار ہے
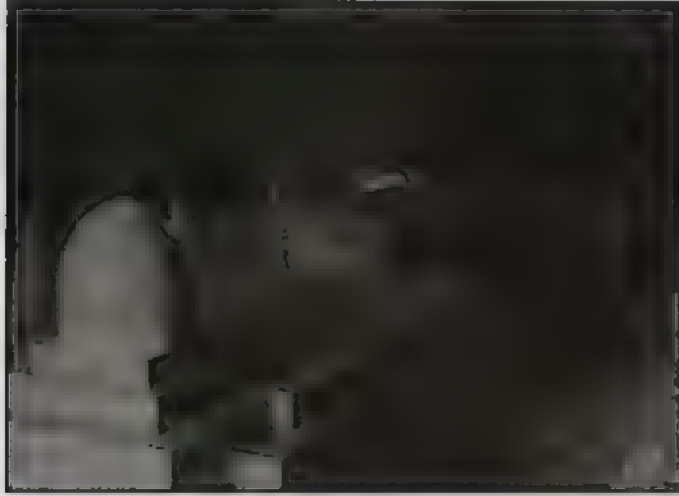
عبداللطیف کا سنسان مزار۔ انہوں نے اپنے باپ الغ بیگ کو قتل کروا دیا تھا،
سمرقند میں گور امیر کے پیچھے۔

واقعات ۹۰۴ھ

(۱۹ اگست ۱۴۹۸ء - ۷ اگست ۱۴۹۹ء)

سمرقند اور اندجان کی جانب ہم نے دوبارہ رخ کیا لیکن جب کامیابی نصیب نہ ہوئی تو وہاں سے واپس خجند پہنچ گئے۔ یہ بڑا افسردہ علاقہ ہے جہاں دو سو آدمیوں کی گزراوقات مشکل سے ہوتی ہے۔ جس شخص کے بلند وبالا ارادے ہوں وہ اس پر بھلا کیسے قناعت کرسکتا تھا، چنانچہ محمد حسین گورکان دوغلت کے پاس جو اس وقت اوراتیپہ میں تھا سمرقند کی تسخیر کے ارادے سے قاصد بھیجے گئے اور اس سے گفتگو کی گئی کہ پشاغر نامی سبزہ زار کے وہ گاؤں جو حضرت خواجہ (عبید اللہ احرار) کی ملکیت ہیں اور اس دورۂ معطلی میں اس کے تحت تصرف آگئے ہیں عارضی طور پر موسم سرما گزارنے کے لئے دے دیئے جائیں تاکہ وہاں رہ کر ولایت سمرقند پر دست اندازی کریں اور وہاں سے جو کچھ ہاتھ آئے اس کا حصہ بخرا کرلیا جائے۔ محمد حسین اس پر راضی ہوگیا چنانچہ خجند سے سوار ہوکر میں پشاغر کی جانب روانہ ہوا۔ جس وقت میں زامین پہنچا تو بخار میں مبتلا تھا، لیکن اس حالت میں ہی وہاں سے سوار ہوکر روانہ ہوا۔ یلغار کرتا اور کوہستانی راہ سے گزرتا ہوا اس خیال سے میں رباط خواجہ پہنچ گیا کہ شاید پہرہ دار غافل ہوں اور ہم سیڑھیاں لگا کر اس قلعے میں داخل ہوکر جو تومان شادوار کے دروغہ کا مسکن ہے، قبضہ کرلیں۔ صبح کا وقت ہو چکا تھا اور لوگ بیدار ہوگئے تھے۔ چنانچہ کسی جگہ توقف کئے بغیر سبزازار پشاغر میں پہنچ گئے۔ بخار کے باوجود میں نے تیرہ چودہ فرسنگ کا فاصلہ بڑی ہی مشقت وجانفشانی سے طے کیا۔ چندروز بعد ابراہیم سارو، ویس لاغری، شیریم طغائی بعض امرا اور اہل خانہ ونزدیکی جوانوں کو یلغار کے لئے متعین کیا تاکہ وہاں جاکر یار ییلاق کے قلعوں کو گفتگو کے ذریعے یا بزورزبردستی حاصل کرلیں۔ ان دنوں یار ییلاق پر سیّد یوسف بیگ کا قبضہ تھا۔ میرے سمرقند سے (ورق ۵۱) روانہ ہونے کے وقت وہ وہیں رک گیا تھا۔ سلطان علی مرزا نے بھی اس کے ساتھ بہت سی رعایتیں کی تھیں۔ یوسف بیگ مرزا نے اپنے برادرخورد اور اپنے لڑکے کو یار ییلاق کے قلعوں کے بندوبست کے لئے روانہ کیا۔ احمد یوسف جس کا اس وقت حکومت سیالکوٹ پر تسلط ہے اُس وقت انہی قلعوں میں تھا۔ ہمارے امرا اور جوانوں نے پورے موسم سرما میں ان میں بعض قلعے فتح کرلئے۔ ان میں سے کچھ پر جنگ کرکے بزورزبردستی قبضہ کیا اور کچھ کو عیاری، چالاکی اور چوری چھپے اپنے تحت تصرّف لئے آئے۔ اس ولایت میں ایک بھی گاؤں ایسا نہیں جس میں مغلوں اور ازبک کی وجہ سے قلعہ تعمیر نہ کیا گیا ہو۔ اس عرصے میں سلطان علی مرزا کو سیّد یوسف بیگ، اپنے برادرخورد اور اس کے لڑکے سے ہماری طرف سے بدگمانی ہوگئی۔ چنانچہ ان کو خراسان کی طرف روانہ کردیا۔ یہ پوری سردی کا موسم اسی کشاکش میں گزرا۔ جب گرمی کا زمانہ آیا تو انہوں نے، خواجہ یحییٰ کو صلح کے لئے بھیجا۔ ادھر ہمارے پاس دوسو سے زیادہ اور تین سو سے کم ہی جوان ہونگے اور ہر طرف طاقتور دشمن۔ چنانچہ لشکرکشی کرتے کرتے، شیراز و کاہد کے نواح تک پہنچ گئے اور کچھ نے اندجان کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ اس وقت قسمت نے ذرا بھی یاوری نہ کی۔ میں سمرقند کی جانب بھی گیا وہاں بھی کچھ پیش نہ گئی۔ چنانچہ ضرورت کے تحت ایک طرح کی صلح کرکے میں پشاغر واپس آگیا۔ خجند معمولی جگہ ہے جہاں کسی سردار کی گزربسر مشکل سے ہی ہوسکتی ہے۔ ڈیڑھ سال سے زیادہ بلکہ تقریباً دوسال ہمارا وہیں قیام رہا۔ وہاں کے سیدھے سچے مسلمانوں نے جس حد تک ممکن ہوسکتا تھا، ہمارے مصارف برداشت کئے اور خدمت انجام دینے میں کوئی کوتاہی نہ کی اب وہاں جائیں تو کس منہ سے جائیں اور اگر وہاں پہنچ بھی جائیں تو کیا کریں۔

بارق قہ نہ مسکنی میّسر　　　تورماق قہ نہ مامنی مقرر

نہ جانے کے لئے اپنے میسر ہے کوئی مامن　　　نہ رہنے کے لئے اپنے مقرر ہے کوئی مسکن

آخراسی تردد وپریشانی کی حالت میں ان سبزہ زاروں کی جانب روانگی ہوئی جواوراتیپہ کے جنوب میں ہیں۔ چندروزاسی کے گردونواح میں یونہی حیرانی وسرگردانی میں گذر گئے۔ کیونکہ ہم خودنہیں جانتے تھے کہ کیا کریں، یہیں پڑے رہیں یا آگے کوچ کریں۔

خواجہ ابولمکارم سے ملاقات

اس اثنا میں ایک دن خواجہ ابولمکارم جو ہماری طرح ہی جلاوطن وسرگرداں تھا مجھ سے ملاقات کرنے کے لئے آیا۔ اپنے حالات کے بارے میں میں نے اس سے اِستفسار کیا۔ وہ بہت متاثر ہوااور ہماری حالت پر اسے بہت رحم آیا، اور سورۂ فاتحہ پڑھ کر چلا گیا۔ اس کی حالت کا مجھ پر بھی اثر ہوااور اس پر بھی انتہائی ترس آیا۔ اسی روز جب کہ نمازِ عصر کا وقت تنگ ہو چلا تھا دّرے کے دامن میں ایک سوار دکھائی دیا جو علی دوست طغائی کا یولچوق نامی ملازم تھا۔ وہ جس پیغام کے ساتھ بھیجا گیا تھااس کا مضمون یہ تھا کہ ''اگرچہ میں عظیم جرائم کا مرتکب ہوا ہوں لیکن عین توقع ہے کہ از روئے عنایت معاف کردیا جاؤں۔ آپ اس طرف توجہ فرمائیں تا کہ مرغینان آپ کے حوالے کر کے ایک طرح کی غلامی اور خدمتگاری اختیار کروں اور اس طرح میرے قصور معاف ہوں اور شرمندگی دور ہو۔''

یہ خبر پاتے ہی بغیر سوچے سمجھے، بلاتوقف اسی وقت جبکہ غروب آفتاب ہورہا تھا مرغینان کی جانب یلغار کرتا ہوا روانہ ہوا۔ یہاں سے مرغینان کا فاصلہ تقریباً چوبیس پچیس فرسنگ ہوگا۔ (ورق ۵۲) اس رات صبح تک اور صبح سے نماز ظہر تک کسی جگہ توقف کئے بغیر ہم چلتے ہی رہے۔ ظہر کے وقت ہم تنگ آب نامی موضع میں جو خجند کے تابع ہے اترے گھوڑوں کو آرام پہنچا کر اور انہیں دانہ دے کر آدھی رات کا نقارہ بجنے کے وقت ہم تنگ آب سے سوار ہوئے۔ اس رات صبح تک، دوسرے دن غروب آفتاب تک اور دوسری رات کو صبح سے پیشتر اس وقت جبکہ مرغینان ایک فرسنگ رہ گیا تھا ویس بیگ اور دوسروں نے تردّد اور پس وپیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ علی دوست وہ شخص جس نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے۔ اس کے اور ہمارے درمیان ایک دومرتبہ نہ کوئی قاصد آیا ہے اور نہ گیا۔ اس کے ساتھ نہ کوئی گفتگو ہوئی ہے اور نہ ہی کوئی شرط ومعاہدہ طے پایا ہے۔ پھر بھی ہم نہ جانے کس امید پر چلے جارہے ہیں۔ امر واقعی یہ ہے کہ ان کا تردد بلاوجہ نہ تھا ہم کچھ وقت کے لئے وہاں رکے اور باہم صلح ومشورہ کیا اور یہ قرار پایا کہ ہمارے اس شک وتردد کا سبب یہ ہے کہ ہم تین دن اور رات آرام وتوقف کئے بغیر چوبیس پچیس فرسنگ کا راستہ طے کر کے آئے ہیں، نہ گھوڑوں میں دم رہا ہے اور نا ہی انسانوں میں جان۔ یہاں سے کس طرح واپس جایا جائے اور جب واپس جائیں بھی تو کدھر جائیں۔ جب ہم اتنا راستہ طے کر کے آہی چکے ہیں تو چاہیے کہ آگے ہی چلیں۔ کوئی چیز خدا کی مرضی کے بغیر نہیں ہوتی۔ بات یہیں ختم کر کے اور خدا پر توکل کرتے ہوئے ہم روانہ ہوئے۔ نماز چاشت کا وقت تھا کہ قلعۂ مرغینان کے دروازے پر پہنچے۔ علی دوست دروازے کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے دروازہ نہیں کھولا اور عہد وپیماں کے بعد خدمت بجالایا۔ علی دوست سے ملاقات کرنے کے بعد قلعے کے اندر ایک مناسب حویلی میں ہم اترے۔ اس وقت میرے ساتھ خورد وکلاں دوسو چالیس افراد تھے۔ اوزون حسن اور سلطان احمد تنبل چونکہ اس ولایت کے لوگوں پر ظلم برپا کئے ہوئے تھے اور بدسلوکی پر اتر آئے تھے اسی لئے اس ولایت کے لوگوں نے مجھے آنے کی دعوت دی۔ مرغینان میں وارد ہونے کے دوتین دن بعد قاسم بیگ نے پشاغر کے ان لوگوں کو جنہوں نے میری ملازمت اختیار کی تھی اور علی دوست کے

ملازمین کو جمع کر کے جنوب اندجان اور اس کے نواح میں روانہ کیا تا کہ وہاں اشپاریوں اور چیکراک جیسے کوہستانی لوگوں کو دریائے خجند پار کر کے جس طرح بھی ہو سکے اپنی طرف کر لیں۔ چند روز بعد اوزون حسن اور سلطان احمد تنبل نے جہانگیر مرزا کو پکڑ کر جس قدر سپاہ ان کے پاس تھی اور مغلوں کو نیز اخسی اور اندجان سے جو کوئی لشکر آسکتا تھا اسے شامل کر کے مرغینان کا محاصرہ کرنے کا ارادہ کیا اور روانہ ہو گئے۔ وہ اس جگہ سے ایک کوس شرعی کے فاصلے پر اس کی مشرقی جانب واقع موضع سپان میں پہنچ کر ایک دو روز کے بعد خود کو مرتب و مسلح کر کے مرغینان کے نواح میں پہنچ گئے۔ اگر چہ قاسم بیگ سارو اور ویس لاغری اور دیگر سرداروں کو دو طرفہ یلغار کرنے کے لئے روانہ کر دیا گیا مگر اس کے باوجود چند جوان جو میرے ساتھ رہ گئے تھے کو تیار کر کے میں مقابلہ پر نکل آیا۔ انہوں نے دشمن کو نواح سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ (ورق ۵۳) اس روز خلیل چہرہ دستار پیچ خوب لڑا۔

چنانچہ اس کے بعد ان میں اتنی ہمت و سکت باقی نہ رہی کہ قلعے کے پاس تک آسکیں۔ جس وقت قاسم بیگ اندجان کے جنوب میں واقع کوہستان کی جانب گیا شپاری، توروق قبائل نیز گرد و نواح کے لوگ، کوہ وصحرا کے دہقان اور تمام قبائل ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ ان کے علاوہ دشمن کے سپاہی بھی ایک ایک دو دو فرار ہو کر ہماری طرف آنے لگے۔ ابراہیم سارو اور ویس لاغری جو اس طرف دریا پار کر کے اخسی چلے گئے تھے وہاں انہوں نے قلعہ پاپ اور مزید ایک دو قلعوں کو مطیع کر لیا۔ اوزون حسن اور تنبل چونکہ ظالم و فاسق اور کافرانہ کردار کے حامل تھے اس لئے اہل رعیت اور ولایت کے لوگ ان سے عاجز و تنگ آچکے تھے۔ اخسی کے سر برآوردہ لوگوں میں سے حسن دیگچہ نے اپنے ایک گروہ کو ساتھ لیا نیز ایک جماعت اوباشوں اور لفنگوں کی تیار کی۔ انہوں نے ان لوگوں کو جو اخسی کے قلعہ سنگین میں تھے اپنی لاٹھیوں سے مارتے مارتے قلعہ کے اندرونی حصار میں پہنچا دیا۔ پھر ابراہیم سارو، ویس لاغری اور سیدی قرا کو بلا کر ان کو اخسی کے سنگین قلعے میں داخل کر دیا۔ سلطان محمود خاں نے حیدر کوکلتاش کے بیٹے بندہ علی، حاجی غازی منغیت کو (جو انہی دنوں شیبانی خاں کے پاس سے بھاگ کر خاں کے پاس آیا تھا) تومان بارین کے امرا کے ساتھ ہماری مدد کے لئے متعین کیا۔ اس وقت یہ سب یہاں موجود تھے۔ جب یہ خبر اوزون حسن کے پاس پہنچی تو اس نے گھبرا کر ان ملازمین کو جن کو اس نے مراعات دی تھیں اور اپنے کارآمد جوانوں کو قلعۂ اخسی کی مدد کے لئے متعین کیا۔ صبح کے وقت وہ دریا کے کنارے پہنچے۔ ہمارے لشکر اور لشکر مغل کو جیسے ہی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اپنے ایک دستے کو حکم دیا کہ اپنے گھوڑوں کے سامان اتار کر دریا کے پار چلے جائیں۔ وہ لوگ جو مدد کے لئے آئے تھے ایسے مضطرب و سراسیمہ ہوئے کہ اپنی کشتیوں کو بہاؤ کے خلاف نہ لے جا سکے بلکہ جہاں سے انہوں نے دریا پار کیا تھا اسی جگہ واپس پہنچ گئے۔ چنانچہ وہ قلعے تو سر نہ کر سکے البتہ خود نیچے آرہے۔ ہمارے اور مغلوں کے لشکر بھی گھوڑوں کی ننگی پیٹ پر سوار ہو کر آنا شروع ہو گئے جو کشتی میں سوار تھے وہ ذرا بھی جنگ نہ کر سکے۔ قارلوغارج بخشی نے مغل بیگ کے لڑکوں میں سے ایک کو اپنے پاس بلایا اور اس کے ہاتھ کو پکڑ کر اس پر تلوار کی زبردست ضرب لگائی اور قتل کر دیا۔ آخر اس سے کیا فائدہ ہوا۔ کشتی میں سوار اکثر لوگ مارے گئے ان کے قتل کا سبب ان کی یہی حرکت تھی۔ وہ لوگ جو اس وقت دریا میں تھے انہیں فوراً خشکی پر لایا گیا اور سب کو قتل کر دیا گیا۔ اوزون حسن کے معتبر لوگوں میں قارلوغارج بخشی، خلیل دیوانہ اور قاضی غلام شامل تھے۔ ان میں سے قاضی غلام نے اپنے غلام ہونے کا بہانہ بنا کر خلاصی پائی۔ اور اس کے معتبر لوگوں میں ستر اسی با استعداد جوان تھے جن میں سے سیّد علی جواب میرے معتبر لوگوں میں ہے، حیدر علی قلی اور قلکہ کاشغری جیسے پانچ چھ جوان بچ کر نکل سکے (باقی سب مارے گئے) یہ خبر سن کر اوزون حسن اور سلطان احمد تنبل مرغینان کے نواح میں نہ رک سکے اور اندجان کی طرف روانہ ہو گئے جو پہلے ہی بری طرح تباہ ہو چکا تھا یہاں اوزون حسن کا بہنوئی ناصر بیگ حاکم تھا۔ اسے اگر اوزون حسن ثانی نہیں کہا جا سکتا تو ثالث ہونے

میں تو کوئی کلام ہی نہیں۔ تجربے کار آدمی تھا جس میں مردانہ ہمت وجرأت بھی تھی۔ جب اس نے یہ کیفیت دیکھی اور ان (اوزن حسن اور سلطان احمد تنبل) کی تباہی کا اسے علم ہوگیا تو اس نے قلعہ اندجان کو محکم کر کے اپنا قاصد میرے پاس بھیجا۔ (ورق ۵۴) جب وہ اندجان پہنچے اور انہیں قلعہ اندجان محکم ہونے کی اطلاع ملی تو وہ کسی ایک فیصلے پر متفق نہ ہو سکے۔ چنانچہ تباہ و برباد اوزون حسن کوچ کر کے اخسی کی جانب چلا گیا۔ سلطان احمد تنبل اپنی ولایت اوش میں پہنچ گیا۔ جہانگیر مرزا، جس کو اوزون حسن کے قرابت داروں اور جوانوں نے کچھ عرصے سے قید کر رکھا تھا تنبل کے پاس پہنچ گیا جو ابھی اوش میں داخل نہیں ہوا تھا۔

فتح اندجان

اندجان کے محکم کرنے کی خبر جب میرے پاس پہنچی تو بلا توقف سورج نکلنے کے وقت میں مرغینان سے سوار ہوا۔ جس وقت میں وہاں پہنچا تو دن نکل چکا تھا۔ میں نے ناصر بیگ اور اس کے دونوں لڑکوں دوست بیگ اور میرم بیگ سے ملاقات کی۔ ان کا حال پوچھا اور ان کے ساتھ عنایت وشفقت سے پیش آیا میرے والد کی وہ ولایت جو تقریباً دو سال قبل میرے ہاتھ سے نکل چکی تھی عنایت الٰہی سے ماہ ذیقعد ۹۰۴ھ (جون ۱۴۹۹ء) پھر میرے ہاتھ آگئیں۔ احمد تنبل جس کے ہمراہ جہانگیر مرزا اوش کی جانب چلا گیا تھا۔ جیسے ہی اس شہر میں داخل ہوا تو وہاں کے اوباشوں اور بدمعاشوں نے لاٹھیاں مار مار کر سیدھا کر دیا کہ انہیں اوش چھوڑ کر بھاگتے ہی بن پڑی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے قلعہ میرے لئے محفوظ کر لیا۔ اور میرے پاس قاصد روانہ کیا۔ جہانگیر اور تنبل اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ آشفتہ حال اوزکند پہنچے۔ اوزون حسن جب اندجان میں نہ رک سکا تو اخسی کی جانب چلا گیا۔ ادھر سے خبر آئی کہ وہ قلعے میں داخل ہوگیا ہے چونکہ سرغنہ وہی تھا اسی لئے اس خبر کے آتے ہی ہم اندجان میں چار پانچ دن سے زیادہ توقف نہ کر سکے اور اخسی کی جانب روانہ ہوگئے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو اپنی لاچاری کے باعث وہ کچھ نہ کر سکا۔ چنانچہ عہد و پیمان کر کے اور امان پا کر اس نے قلعہ ہمارے حوالے کر دیا۔ ہم چند روز وہاں مقیم رہے اور اخسی و کاسان کے اہم معاملات، نظم ونسق کو درست کیا۔ ان مغل امرا کو جو ہمارے ساتھ یلغار کے لئے آئے تھے واپس جانے کی اجازت دے کر اوزن حسن اور اس کے خاندان و دیگر متعلقین کو ساتھ لے کر اندجان آگئے۔ چونکہ یہ معاہدہ ہوگیا تھا کہ اس کے جان و مال کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا اسی لئے قراتیکین کے راستے سے اسے حصار جانے کی اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ وہ تو اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ اس طرف چلا گیا اور باقی تمام نوکر جو اس سے علیحدہ ہوگئے تھے وہیں رہ گئے۔ ہماری معطلی کے زمانے میں ہم سے اور خواجہ سے وابستہ افراد کو لوٹنے اور قتل کرنے والے یہی لوگ تھے۔ بعض امرا کی رائے سے یہ بات طے پائی کہ اس ساری تباہی کا سرچشمہ اور مومن و مسلمان جو ہم سے وابستہ تھے ان کی بربادی کا سبب یہی گروہ تھا۔ جب یہ افراد اپنے آقاؤں کے وفادار نہ ہو سکے۔ تو ہمارے ساتھ کیا وفا کریں گے۔ اگر انہیں گرفتار کر لیا جائے یا لوٹ لیا جائے تو اس میں کیا عیب ہے۔ بالخصوص اس صورت میں جبکہ وہ ہمارے سامنے ہمارے ہی گھوڑوں پر سوار ہوں، ہمارے ہی لباس پہنیں اور ہماری ہی بھیڑیں ذبح کر کے کھائیں۔ ان کی اس حرکت کو کون برداشت کر سکتا تھا۔ اگر رحم کھا کر انہیں گرفتار و تاراج نہ کیا جائے تو انہیں یہی حکم دیا جائے کہ وہ اس گروہ کا جس نے میرا ساتھ دیا ہے ساز وسامان ان کے حوالے کر دیں جسے وہ گروہ پہچانتا بھی ہے۔ اور جب تک سامان واپس نہ ہو انہیں حراست میں رکھا جائے۔ یہ بات معقول تھی۔ چنانچہ حکم صادر ہوا کہ (ورق ۵۵) وہ لوگ جو ہمارے ہمراہ ہیں اپنے مال کو جسے وہ پہچانتے ہوں حاصل کر لیں۔ اگرچہ حکم معقول تھا لیکن قدرے قبل از وقت دیا گیا تھا۔ جس وقت جہانگیر مرزا قریب ہی ہو، اس وقت لوگوں کو ڈرانا دھمکانا بے محل تھا کیوں کہ ملک گیری و مملکت داری میں اگرچہ بعض کام معقول ہوتے ہیں لیکن ہر کام کے لاکھوں پہلوؤں پر غور و فکر کرنا بھی لازم و ضروری ہے۔ بغیر سوچے سمجھے یہی ایک

حکم جاری کردینے سے کتنے فتنے اور فساد بپانہ ہوئے۔ اندجان سے دوبارہ نکالے جانے کا سبب یہی حکم صادر کیا جاناتھا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ مغل قبائل میں بدگمانی پیدا ہوگئی اور وہ رباطک اور چینی سے (جسے میان دوآب بھی کہتے ہیں) اوزکند کی جانب کوچ کرگئے اور وہاں سے انہوں نے تنبل کے پاس اپنا قاصد بھیجا۔ میری والدہ کی خدمت میں ڈیڑھ دو ہزار کے قریب مغل تھے۔ اتنے ہی حمزہ سلطان، مہدی سلطان اور محمد دوغلت کے ہمراہ حصار سے آگئے۔ قبائل ہمیشہ تباہی و بربادی کرتے ہیں۔ اس وقت تک پانچ مرتبہ میرے ساتھ بغاوت کرچکے ہیں جس کا سبب یہ نہ تھا کہ میں ان کا ہم قبیلہ نہ تھا بلکہ اس قسم کی حرکات تو وہ اپنے سرداروں سے بھی کرچکے تھے۔ یہ بغاوت کی خبر سلطان قلی چناق ولد خدابردی بوقاق (جس کو میں نے بہت سی مراعات دی تھیں) لے کر آیا۔ اس نے اچھا ہی کیا کہ اپنے قبیلے اور طائفے سے علیحدہ ہوکر یہ خبر مجھے پہنچادی۔ اگرچہ ابتدا میں اس نے بہت سے اچھے کام انجام دیئے۔ لیکن بعد میں اس سے کچھ ایسی ناشائستہ حرکات سرزد ہوگئیں (جن کا ذکر آگے آئے گا) کہ انہوں نے اس کی سیکڑوں خوبیوں پر پردہ ڈال دیا۔ اور یہ حرکات اس وجہ سے سرزد ہوئیں کہ بالآخر وہ مغل تھا۔ جیسے ہی وہ خبر لے کر آیا امرا کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا گیا جنہوں نے عرض کیا کہ یہ ایک چھوٹی سی بات ہے، جس کے لئے بادشاہ کو سوار ہوکر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ قاسم بیگ ہی تمام امرا اور اہل لشکر کو اپنی سرکردگی میں لے جائے۔ بات یہ طے ہوئی لیکن جس کو انہوں نے معمولی سمجھا وہ بات غلط ثابت ہوئی۔ قاسم بیگ اسی روز امرا اور اہل لشکر کو جمع کر کے روانہ ہوا، راستے میں رات کے وقت جہاں کہیں انہوں نے قیام کیا ہوگا وہاں تنبل، مغل قبائل کے ہمراہ ہوگیا۔ اگلے دن صبح جیسے ہی ہمارے لشکر نے یاسی گھاٹ سے دریائے ایلامش پار کیا، دشمن سامنے سے نمودار ہوگیا۔ دونوں کے درمیان خوب لڑائی ہوئی۔ قاسم بیگ نے خود محمد ارغون کا مقابلہ کیا۔ اس نے دوتین مرتبہ ایسے پے درپے تیر چلائے کہ اس کو سرابھارنے کی مجال تک نہ ہوئی۔ بہت سے جوانوں نے مردانگی کے جوہر دکھائے مگر آخر میں شکست نصیب ہوئی۔ قاسم بیگ، علی دوست طغائی ابراہیم سارو ویس لاغری، سیّد قرا اور دیگر امرا نیز ان کے تین چار قرابت دار تو دشمن کے چنگل سے بچ نکلے لیکن بیشتر امرا اور ان کے نزدیکی لوگ، دشمن کی گرفت میں آگئے۔ جو لوگ دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہوئے ان میں علی درویش بیگ، میرم لاغری، طغائی بیگ لڑکا توقہ بیگ، طغائی بیگ، محمد دوست، علی دوست میر شاہ توچین اور میریم دیوان شامل تھے۔ اس جنگ میں دنوں طرف سے سب نوجوانوں نے عجیب نبرد آزمائی کی۔ ہماری طرف سے ابراہیم سارو کے چھوٹے بھائی صمد (ورق ۵۶) اور ان کی طرف سے مغل قبائل میں سے شہسوار نامی مغل ایک درّے میں آمنے سامنے ہوئے۔ شہسوار کا وار ایسا کارگر گیا کہ اس کی تلوار صمد کی خود کو چیرتی ہوئی اس کے سر پر جالگی۔ مگر اس کاری زخم کے باوجود صمد نے بھی شمشیر کی وہ ضرب ماری کہ ہتھیلی کے برابر شہسوار کے سر کی ہڈی اس کی شمشیر پر لگ کر آگئی۔ شہسوار کے سر پر خود نہ تھی مگر اس کے سر کی ایسی اودیدی کی گئی کہ اس کا زخم بھر گیا۔ اِس طرف کوئی ایسا نہ تھا کہ صمد کے زخم کی اودیدی کرسکے چنانچہ تین چار دن بعد اسی زخم کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوگئی اور اس طرح اس نے خونریزی جنگوں اور مصائب و آلام سے نجات پائی۔ [1]ملک پر قبضہ کرلینے کے چند روز بعد ہی یہ شکست عجب نامناسب وقت پر ہوئی تھی۔ قنبر علی مغل ہمارا ایک رکن اعظم تھا۔ جس وقت اندجان پر قبضہ ہوا تو وہ وہاں نہیں تھا بلکہ اپنی ولایت کی جانب چلا گیا تھا۔ اسی اثناء میں تنبل اپنے ساتھ جہانگیر کو لے کر آیا اور اس سبزہ زار میں اترا جو پشتہ عیش نامی مقام پر واقع ہے۔ ایک دو مرتبہ اپنے لشکر کو آراستہ کر کے چہل دختران مقام سے اس نے سبزہ زار عیش کے دامن تک پیشقدمی کی۔ ہمارے جوان بھی محلات و باغات میں سے مسلح و آراستہ ہوکر مقابل آئے لیکن اُن میں مزید آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بلکہ سبزہ زار عیش کے دامن سے ہی دوسری جانب واپس چلے گئے۔ جس وقت وہ (تنبل) پشتہ عیش کی جانب آرہا تھا تو اس کے نواح میں میرم لاغری اور توقہ اس کے چنگل میں پھنس گئے جنہیں اس نے قتل کردیا۔ تقریباً ایک ماہ تک وہ پشتۂ عیش کے گردونواح میں سرگرداں رہا۔ بالآخر ناکام اوش کی جانب روانہ ہوگیا جو ابراہیم سارو کی تحویل میں دے دیا گیا تھا اور جسے اس کے مقیم نے محکم کرلیا تھا۔

ا۔ صمد کے جو زخم لگا وہ گہرا تھا کہ تلوار نے پہلے خود کو کاٹا پھر سر کی ہڈی کو توڑ کر دماغ کو زد پہنچی۔ شہسوار خود پہنے ہوئے نہیں تھا اور صمد زخمی تھا اس لئے شہسوار کا گھاؤ ہڈی کو کاٹنے تک محدود رہا۔ دماغ میں چوٹ نہیں آئی ہوگی یا معمولی ہوگی۔ اس وجہ سے بھی شہسوار بچ گیا اور صمد نہ بچ سکا۔ آویدی کے متعلق تفصیل ۹۰۵ نوٹ ۲ دیکھیں۔

واقعات ۹۰۵ھ

(۸ اگست ۱۴۹۹ء ۔ ۲۷ جولائی ۱۵۰۰ء)

اوش کے اطراف جنگ

ولایات کے سوار و پیادہ لشکر کے لئے وہاں کے تحصیلداروں اور سرداروں کو تاکید کے ساتھ پیغام بھیجا گیا۔ اس کے علاوہ قنبر علی اور دوسرے سرداروں کے لئے قاصد دوڑائے گئے جو اپنی ولایت کی جانب چلے گئے تھے ڈھالوں، سیڑھیوں، کدالوں اور کلہاڑیوں وغیرہ نیز لشکر کے دیگر ساز و سامان کا اہتمام کرنے کے لئے تحصیلداروں کو معیّن کیا گیا۔ اہل ولایت جب لشکر میں شامل ہو گئے اور وہ سوار و پیادہ اور نوکر و سپاہی جو اپنے کاموں اور مہمات کے لئے اطراف و جوانب میں چلے گئے تھے ایک جگہ جمع ہو گئے تو خدا پر توکل کر کے میں بتاریخ ۱۸ محرم چار باغ حافظ کی طرف روانہ ہوا۔ ایک دو روز وہیں قیام کیا اور جو اسلحہ و ساز و سامان تیار نہ تھا اسے تیار کر کے برانغار، جوانغار، قول، ہراول،[1] سوار اور پیادہ دستے ترتیب دے کر ہم اوش کی جانب مخالفین سے برسرِ پیکار ہونے کے لئے روانہ ہوئے۔ جس وقت اوش کے نزدیک پہنچے تو معلوم ہوا کہ مخالفین اس کے نواح میں اپنی جگہ قائم نہ رہ سکے اور پسپا ہو کر رباط سرسنگ کی جانب جو اوش کے شمال میں ہے پہنچ گئے ہیں۔ اس رات ہم لات کند میں فروکش ہوئے۔ اگلے دن صبح جب ہم اوش سے گزر رہے تھے تو ہمیں اطلاع ملی کہ مخالفین اندجان کی طرف چلے گئے ہیں۔ ہم نے بھی اوزکند کے نزدیک اپنے یلغاریوں کو خود سے جدا کیا۔ مخالفین جو اندجان کی طرف جا رہے تھے راتوں رات خندق کے کنارے اترے، ابھی وہ قلعے کی دیوار پر سیڑھیاں لگا ہی رہے تھے کہ جو لوگ اندرونِ قلعہ تھے سمجھ گئے۔ اسی وجہ سے وہ کچھ نہ کر سکے اور واپس آ گئے۔ ہمارے یلغاری بھی اوزکند کے اطراف میں پہنچے تاکہ وہاں لوٹ مار کر سکیں لیکن کوئی خاص چیز ان کے ہاتھ نہ لگی اس لئے واپس آ گئے۔ اوش کے قلعوں میں قلعہ مادو (ورق ۵۷) ایک محکم قلعہ ہے۔ تنبل کے برادر خورد خلیل نے اس قلعے کو ڈھائی سو آدمیوں کے ساتھ رہ کر محکم کر لیا تھا۔ واپس ہوتے وقت ہم نے قلعہ مادو پر جنگ کے ارادے سے زور آزمائی شروع کی۔ یہ بہت محکم قلعہ ہے، جو شمال کی جانب سے نہایت بلندی پر واقع ہے اور جس کے نیچے بہت تیز بہاؤ سے ندی گزرتی ہے، اگر اس ندی پر سے تیر چلایا جائے تو ہو سکتا ہے کہ فصیل (کے کنگورے) تک پہنچ جائے۔ اس کا نالہ بھی اُسی طرف ہے، سامنے کے رخ پر نیچے کی جانب گلی کی مانند دونوں طرف اونچی اونچی دیواریں پانی کے پاس تک چلی گئی ہیں۔ جدھر قلعے کے پشتے ہیں وہاں خندق بنی ہوئی ہے۔ چونکہ ندی قلعے کے پاس ہی بہتی ہے اس لئے اس کنارے پر پڑے ہوئے دیگچی کے برابر پتھر قلعے کی دیوار پر چن دیئے گئے ہیں۔ قلعہ مادو سے جتنے بڑے بڑے پتھر گرائے گئے اتنے بڑے پتھر کسی بھی جنگ میں جو قلعے پر ہوئی ہو، نہیں گرائے گئے۔ کتہ بیگ کا بڑا بھائی عبدالقدوس گُہر فصیل کے نیچے پہنچ گیا تھا۔ اس وقت فصیل پر سے اس طرح پتھر برسائے گئے کہ ان میں سے ایک بھی زمین پر آ کر نہیں گرا بلکہ لڑھکتا ہوا سیدھا خندق کے کنارے ہی خاکریز (مٹی کے ٹیلے) تک پہنچا۔ لیکن اس سنگ اندازی سے اسے ذرا بھی تشویش نہیں ہوئی۔ چنانچہ گھوڑے پر سوار ہو کر وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ لیکن دوسرے نالے پر یار علی بلال کے سر پر ایسا پتھر آ کر لگا کہ اس کی ضرب سے اس کے سر میں سخت چوٹ آئی جس کی آخر آویدی کرنی پڑی۔[2] اس سنگ باری کی وجہ سے بہت سے لوگ مارے گئے۔ اگلے دن صبح پھر حملہ کیا گیا، چاشت سے پہلے ہی نالے پر قبضہ ہو گیا۔ جنگ رات تک جاری رہی۔ نالے پر قبضہ ہو جانے کے بعد وہ

۱۔ فوجی ترتیب اس طرح سے ہوتی تھی

	ہراول	
جوانغار یا میسرہ	قول یا قلب	برانغار یا میمنہ

۲۔ بابر نے یہاں لفظ آویدی استعمال کیا ہے۔ ابوالقاسم زہراوی کے ہاں تقویر کرتا ہے (التصریف ۱۹۶) بابر کے اس طرح ذکر کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جراح اس قسم کی جراحت سے بخوبی واقف تھے۔ اس میں دو ممکنات ہیں پہلی تو یہ کہ کھوپڑی کی ہڈی چیخ گئی تھی اس میں سوراخ کر کے کرچیاں نکالی گئیں یا چٹخی ہوئی ہڈی کے نیچے جو خون جمع ہو گیا تھا سوراخ کر کے اس کا اخراج کیا گیا۔ کیونکہ اس جراحت کے بعد بھی وہ زندہ رہے۔ مخزن الجواہر طبی لغت میں تقویر گول کاٹنے یا تراشنے کو کہتے ہیں (ص ۲۳۶)

جنگ کی تاب نہ لا سکے۔ چنانچہ اگلے روز امان مانگ کر باہر نکل آئے۔ تنبل کے برادر خورد خلیل کو جو سردار لشکر تھا ستر اسی افراد کے ساتھ اسیر بنا کر اندجان بھیج دیا گیا تاکہ وہاں انہیں حفاظت سے رکھا جاسکے۔ ہمارے امرا وقرابت دار اور عمدہ جوان بھی قید ہوئے۔ بہرصورت یہ کام کسی طرح ہو ہی گیا۔ مادو پر قبضہ کر کے اور وہاں سے نکل کر ہم نے اونجوتوپہ میں پڑاؤ کیا جو اوش کا ایک گاؤں ہے۔ اُس طرف سے تنبل اندجان سے واپس آتے ہوئے آب خان نامی مقام پر جس کا شمار ضلع رباط سرسنگ کے دیہات میں ہوتا ہے، قیام کیا۔ اس وقت دونوں لشکروں کے درمیان تقریباً ایک فرسنگ کا فاصلہ ہوگا۔ انہی دنوں قنبر علی اپنی علالت کے وجہ سے اوش چلا گیا تھا۔ تیس چالیس روز تک انجوتوپہ میں قیام رہا۔ اگرچہ لشکروں کے درمیان جنگ تو نہیں ہوئی لیکن جو لوگ ہمارے لئے اور ان کے لئے غلّہ لاتے تھے ان کے درمیان بیکار کی وارداتیں ہوتی رہیں۔ اس عرصے کے دوران راتوں کو لشکرگاہ کے اطراف میں سخت احتیاط سے کام لیا جاتا تھا۔ خندقیں بنا دی گئی تھیں اور جہاں خندقیں نہیں تھیں وہاں درختوں کے تنوں سے بندش کر دی گئی تھی، چنانچہ جو بھی سپاہی خندق کے قریب آتے وہ سب مسلح ہوتے۔ اس قدر احتیاط کے بعد بھی ہر تین چار دن بعد رات کے وقت لشکر میں ایک شور وغوغا بپا ہوتا اور کچھ سوار وہاں آجاتے۔ اس واقعے سے ایک روز قبل اس وقت جبکہ غلّہ لانے والوں میں سے سیّد بیگ طغائی غلّہ لینے کے لئے گیا ہوا تھا دشمن کے آدمی پہلے سے زیادہ مستعد ہو کر اچانک نمودار ہوئے اور نبرد آزمائی میں انہوں نے سیّد بیگ کو پکڑ لیا۔

اسی سال خسروشاہ نے بلخ پر حملہ کرنے کے لئے بایسنغر کو اپنے پاس آنے کی دعوت دی۔ وہ قندوز تک اسے اپنے ساتھ لایا اور گھوڑے پر سوار ہو کر اس کے ہمراہ بلخ کی جانب روانہ ہوگیا۔ اوج نامی مقام پر پہنچ کر اس بدبخت، نمک حرام نے سلطنت کے لالچ میں (ورق ۵۸) (جس کے لئے اُس جیسا پست اور نکما آدمی حقدار نہیں کہ اس کا نہ کوئی خاندان تھا نہ کوئی نسب۔ نہ اس میں کوئی ہنر تھا اور نا کوئی حسب۔ نہ اس میں تدبیر تھی اور نا ہی شجاعت۔ نہ انصاف تھا اور نا ہی عدل۔) بایسنغر مرزا کو اس کے امرا کے ساتھ گرفتار کر لیا اور بتاریخ دس محرم ایسے خوش طبع و بافضیلت اور حسب ونسب سے آراستہ شاہزادے کو چلّہ کمان کے پھندے سے شہید کر دیا۔[۳] اس کے ساتھ ہی اس نے اس کے چند امیروں اور قرابت داروں کو بھی قتل کر دیا۔

بایسنغر مرزا

بایسنغر کی ولادت ۸۸۲ ہجری (۱۴۷۷ء) کے دوران ولایت حصار میں ہوئی تھی۔ وہ سلطان محمود مرزا کا دوسرا بیٹا تھا سلطان مسعود مرزا سے چھوٹا۔ سلطان علی مرزا، سلطان حسین مرزا اور سلطان ویس عرف خاں مرزا سے وہ عمر میں بڑا تھا۔ اس کی والدہ پاشا بیگم تھیں۔ اس جوان کی آنکھیں بڑی بڑی، چہرہ گول، قد میانہ، ترکمانوں کے سے خدوخال اور رنگ ملیح تھا۔ عادات واطوار کے اعتبار سے عدل پسند، خوش طبع اور بافضیلت شاہزادہ تھا۔ اس کا استاد سیّد محمد شیعہ مسلک کا پیرو تھا جس کا طعنہ بایسنغر مرزا کو بھی دیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آخر میں سمرقند پہنچ کر اس نے اپنا مسلک تبدیل کر لیا تھا اور پاک عقیدہ مسلمان ہو گیا تھا۔ شراب کا بہت زیادہ حریص تھا۔ جس وقت پیتا نہیں تھا نماز پڑھا کرتا تھا۔ داد و دہش میں معتدل تھا۔ خط نسخ ونستعلیق عمدہ لکھتا تھا نقاشی میں بھی اس کا ہاتھ بُرا نہ تھا۔ تفنن طبع کے لئے شعر بھی کہتا تھا اور عادی تخلّص کرتا تھا۔ مگر اشعار کی تعداد اتنی نہیں کہ دیوان مرتب کیا جاسکے۔ یہ مطلع اسی کا ہے

سایہ وار ازناتوانی جابجامی اوفتم
گر نگیرم روی دیواری زپامی اوفتم

(نقاہت کے باعث سائے کی طرح جگہ جگہ گرتا پڑتا ہوں۔ اگر کسی دیوار کی گھر کا سہارا نہ لوں تو زمین پر آرہا ہوں)

۳۔ چلّہ کمان۔ یعنی پھانسی کے لئے کمان کی ڈور استعمال کی۔

۴۔ توراداز پیادے۔ ڈھال بردار سپاہی (اسٹائین گاس ص ۳۳۴)

سمرقند میں اس کی غزلیں اس قدر زبان زد عام و خاص ہیں کہ کوئی گھر ایسا نہیں جس میں اس کے اشعار نہ پڑھے جاتے ہوں۔

بایسنغر مرزا کی جنگیں

اس نے دو جنگیں کیں۔ پہلی سلطان محمود خاں سے تخت نشینی کے ابتدائی دنوں میں سلطان جنید برلاس اور دیگر امرا کے برانگیختہ کئے جانے کے باعث ہوئی۔ چنانچہ اس نے سمرقند کا دعویدار بننے کی غرض سے اس پر لشکر کشی کی۔ وہ اوزاق کوتل سے گزر کر رباط سغد اور کنبائی تک پہنچ گیا۔ بایسنغر مرزا نے سمرقند سے نکل کر کنبائی پر جنگ کی اور اسے پوری طرح زیر کرلیا۔ اس کے حکم پر تین چار ہزار مغلوں کا قتل کیا گیا۔ اس جنگ میں کوکلداش بھی جو خاں کے حل وعقد کا مختار تھا مارا گیا۔ اس نے دوسری جنگ بخارا میں سلطان علی مرزا سے کی جس میں وہ مغلوب ہوا۔ بایسنغر مرزا کے والد سلطان محمود مرزا نے اسے بخارا عطا کیا تھا۔ جب ان کا انتقال ہوگیا تو مرحوم کے امرا نے جمع ہوکر متفقہ طور سمرقند میں اسے تخت شاہی پر متمکن کیا۔ بخارا ابھی کچھ عرصے تک اس کی قلمرو میں شامل رہا۔ لیکن بعد میں ترخانیوں کی سرکشی کے باعث اس کے دست اقتدار سے نکل گیا۔ جس وقت میں نے سمرقند پر قبضہ کیا تو وہ خسروشاہ کی طرف مائل ہوکر اس کے پاس چلا گیا۔ خسروشاہ نے حصار پر قبضہ کرکے اسے اس کی تحویل میں دے دیا تھا۔ اس کی اولاد میں سے کوئی زندہ نہ رہا۔ جس وقت وہ خسروشاہ کے پاس جارہا تھا تو اس نے اپنے چچازاد سلطان خلیل مرزا کی لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی منکوحہ یا دوسری عورت حرم میں داخل نہ تھی۔ وہ ایسا با استقلال حکمران نہ تھا کہ اپنے آدمیوں میں سے کسی کو ترقی دے کر معتبر امیر مقرر کرسکے۔ اس کے امرا وہی تھے جو اس کے والد اور چچا (ورق ۵۹) کے امیر رہ چکے تھے۔

بایسنغر مرزا کا سانحہ گذر جانے کے بعد قوچ بیگ کے باپ سلطان احمد قراول نے اپنے بھائیوں، قرابت داروں، افراد خاندان اور متعلقین کے ہمراہ ولایت قراتکین سے گزر کر اپنی آمد کی اطلاع ہمیں دی۔ ادھر قنبر علی جواڈش میں بیماری کے باعث نحیف ونزار ہوگیا تھا اب تندرست ہوکر ہمارے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس وقت سلطان احمد قراول کی آمد کو میں نے مدد غیبی سمجھا۔ چنانچہ اسے نیک فال جان کر اگلے روز لشکر ترتیب دے کر ہم غنیم پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہوئے۔ وہ آب خان میں نہ رک سکا اور اپنی لشکر گاہ سے اس طرح کوچ کیا کہ دریاں، چادریں اور بوریے بستر جیسی بہت سی چیزیں ہماری سپاہ کے ہاتھ لگیں۔ اسی وجہ سے ہم نے اس کی لشکر گاہ میں پہنچ کر آرام کیا۔ اسی رات تنبل نے جہانگیر مرزا کو اپنے ساتھ لیا اور ہماری بائیں جانب سے گزرتا ہوا خونان نامی گاؤں میں پہنچ گیا جو اندجان کی جانب ہم سے تین فرسنگ کے فاصلے پر تھا۔ اگلے روز صبح ہم نے بھی برانغار، جوانغار، قول اور ہراول کو ترتیب دے کر، گھوڑوں پر ساز کس کر، سپاہ کو مسلح، صفوں کو مرتب اور توراداز[۴] پیادوں کو آگے رکھ کر غنیم کی طرف رخ کیا۔ ہماری برانغار میں علی دوست طغائی اپنی تابع فوج کے ساتھ تھا۔ جوانغار میں ابراہیم سارو، ویس لاغری، سید قرا، محمد علی مبشر، خواجہ کلاں کا بڑا بھائی کیچک بیگ اور سلطان احمد قراول کے بعض قرابت دار شامل تھے، جوانغار میں قوچ بیگ اور اس کے دستے کا نام درج کیا گیا تھا۔ قول میں قاسم بیگ میرے آگے تھا۔ ہراول میں قنبر علی اور اس کے بعض قرابت دار تھے۔ ہماری طرف سے لشکر، خونان کے مشرق وجنوب میں واقع موضع سقا میں جو خونان سے ایک کروہ فاصلے پر ہے پہنچ گیا۔ موضع خونان سے غنیم اپنے لشکر کو آراستہ کرکے آن پہنچا۔ چنانچہ ہم بھی تیزی سے آگے روانہ ہوئے۔ حزم واحتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے توراداز اور پیادہ سپاہ کو اس طرح مرتب کیا کہ حملے کے وقت وہ عقب میں رہے۔ خداوند تعالیٰ کی عنایت سے ان کی ضرورت پیش نہ آئی اس سے پہلے کہ ان کی جوانغار سپاہ پہنچے ہمارے برانغار جوانوں نے پیشدستی کی۔ خواجہ کلاں کے بھائی کیچک بیگ نے جوانمردی کے خوب جوہر دکھائے۔ کیچک بیگ کے بعد محمد مبشر نے نبرد آزمائی کی۔ ہماری اتنی ہی جانبازی کی دشمن تاب نہ لاسکا اور

میدان سے بھاگ نکلا۔ چنانچہ برانغار اور ہراول کے دستوں کی تو یہ نوبت ہی نہیں آئی کہ وہ جنگ کریں۔ ہمارے سپاہی دشمن کے بہت سے جوانوں کو گرفتار کر کے لائے۔ حکم دیا گیا کہ سب کو قتل کر دیا جائے۔ ہمارے امرا میں سے قاسم بیگ اور اس سے زیادہ علی دوست نے حزم و احتیاط اور سرداری کا پاس کرتے ہوئے دشمن کا تعاقب کرنے میں مصلحت نہ سمجھی۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ دشمن کے بہت سے آدمی ہمارے ہاتھ نہ لگ سکے۔ اسی موضع خونان میں ہم نے پڑاؤ کیا۔ دشمن کے ساتھ یہ سب سے پہلی صف بہ صف جنگ تھی جس میں خداوند تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے فتح و فیروزی مجھے عطا کی اور اس کو ہم نے اپنے لئے نیک فال سمجھا۔ اگلے دن صبح میری حقیقی دادی یعنی میرے والد کی والدہ شاہ سلطان بیگم اس خیال کے پیش نظر اندجان سے تشریف لائیں کہ اگر جہانگیر مرزا گرفتار ہو جائے تو اس کی رہائی کے لئے مجھ سے درخواست کریں۔ چونکہ موسم سرما نزدیک آ چکا تھا اسی لئے باہر غلہ اور چارہ نہیں مل رہا تھا۔ اوز کند کی جانب جانے میں مصلحت نہ دیکھ کر ہم واپس اندجان آ گئے۔ چند روز بعد صلاح و مشورہ کیا گیا۔ (ورق ٦٠) تمام گفتگو کے بعد یہ قرار پایا کہ اگر ہم سردی کا زمانہ اندجان میں گزاریں تو اس سے دشمن کے آدمیوں کو تو ذرا بھی نقصان نہ پہنچے گا البتہ اس بات کا احتمال تھا کہ چوری اور راہزنی کے ذریعے وہ اپنے کام مرتب اور اپنی مہم کو جاری رکھ سکیں گے۔ اسی لئے ایسی جگہ پر موسم سرما بسر کیا جائے کہ ہمارے لشکر کے لوگوں کو غلے سے سیر ہونے میں کمی واقع نہ ہو اور دشمن کے آمیوں کا اس طرح سدّ باب کیا جائے کہ وہ تنگ آ جائیں۔ اس مصلحت کی بنا پر ہم نے اندجان سے رباطلک اور چینی (جسے میانہ دوآب بھی کہتے ہیں) کی جانب موسم سرما گزارنے کے ارادے سے کوچ کیا۔ یہاں ارمیان و نوشاب نامی دیہات کے نواح میں پہنچ کر مذکورہ دیہات کے اردگرد ہم نے اپنے خیمے گاڑ دیئے۔ اس جگہ کے گرد و نواح میں شکار خوب کیا جاتا ہے اور یہ خوشگوار مقام ہے۔ دریائے ایلامیش کے کنارے جنگلوں میں پہاڑی بکرے، بارہ سنگھے اور خنزیر کثرت سے ہوتے ہیں۔ اس جنگل میں جہاں کہیں درختوں کے جھنڈ ہیں وہاں ایسے خرگوش کثرت سے ملتے ہیں جن کی جلد رنگین ہوتی ہے۔ یہاں کی لومڑیاں دوسری جگہوں کے نسبت زیادہ تیز بھاگتی ہیں۔ ان دنوں جبکہ ہم یہاں موسم سرما گزار رہے تھے ہر دوسرے تیسرے دن گھوڑوں پر سوار ہوتے اور اس وسیع جنگل کو چیرتے ہوئے ہر مرتبہ پہاڑی بکرے اور بارہ سنگھے شکار کر کے لاتے۔ جس جگہ چھدرے جنگل ہیں وہاں مرغ زریں کا شکار باز کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ یہاں کا مرغ زریں بہت فربہ ہوتا ہے۔ موسم سرما کے دوران ہم یہاں جب تک رہے اس پرندے کا گوشت ہمیں بکثرت ملتا رہا۔ جس وقت اس خوش فضا مقام پر ہم موسم سرما گزار رہے تھے تو خدائی بردی تو غچی جس کو میں نے حال ہی میں مراعات دے کر مرتبہ امارت تک پہنچایا تھا دو تین مرتبہ نیچے اتر کر آیا اور تنبل کے راہزنوں کو زیر کر کے اور ان کے سر کاٹ کر اپنے ساتھ لایا۔ اندجان اور اوش کے نواح سے آئے ہوئے جوانوں نے بھی راہزنوں کو اپنی عیاری کا نشانہ بنا کر ان کے گھوڑے گھیر لائے اور دشمن کے آدمیوں کو قتل کر کے انہیں کمزور و ناتواں کر دیا۔ اگر ہم نے پورا موسم سرما وہاں گزارا ہوتا تو اس امر کا احتمال تھا کہ موسم گرما کے آنے تک وہ بغیر جنگ و جدال کئے ہی تباہ و برباد ہو جاتے۔ اس وقت جبکہ ہم دشمن کو کافی زبون و ناتواں کر چکے تھے قنبر علی نے ہم سے اپنی ولایت جانے کی اجازت چاہی، ہر چند حالات کی نزاکت اس کے ذہن نشین کرائی گئی مگر جتنا اسے جانے سے باز رکھا گیا اس نے اتنا ہی زیادہ اصرار کیا۔ عجب سبک سر اور متلون مزاج آدمی تھا۔ چنانچہ ضروری یہی سمجھا گیا کہ اسے اسکی ولایت جانے کی رخصت دیدی جائے۔ خجند اس کی پہلی ولایت تھی۔ جس وقت اندجان پر قبضہ ہو گیا تو اسفرہ اور کند بادام کے علاقے بھی اس میں شامل کر دیئے گئے۔ میرے امرا میں اس کے نوکروں کی جتنی کثیر تعداد تھی اور اس کی ولایت میں جس قدر اضلاع شامل تھے اتنے ملازم کسی بھی امیر کے زیر دست نہ تھے اور نا ہی کسی کی ولایت اتنی وسیع تھی۔ اس پر فضا مقام پر ہمارا چالیس پچاس دن تک قیام رہا۔ قنبر علی کے معاملے کو مد نظر رکھتے ہوئے لشکر کے دیگر لوگوں کو بھی رخصت دے دی گئی اور ہم خود بھی اندجان چلے آئے۔ جس وقت ہم موسم سرما گزار رہے تھے تو تنبل کے

آدمی بھی چین سے نہیں بیٹھے۔ ان کی تاشقند میں خاں کے پاس مسلسل آمدورفت جاری تھی۔ سلطان محمود کا اتالیق احمد بیگ، جس نے سلطان محمود خان کے لڑکے سے بہت سی مراعات حاصل کی تھیں، ان کا سردار تھا اور تنبل کا حقیقی چچا۔ تنبل کا حقیقی بڑا بھائی بیگ تیلبہ، خاں کا حاجب دربار تھا۔ اس دونوں کی مسلسل آمدورفت نے خان کو اس بات کے لئے آمادہ کرلیا کہ تنبل کو مدد بھیجی جائے۔ جس میں بیگ تیلبہ کا بہت بڑا ہاتھ تھا (ورق ٦١) تیلبہ بیگ کی پیدائش مغلستان میں ہوئی تھی اور مغلوں میں رہ کر ہی اس کی پرورش ہوئی۔ اسے نہ تو کبھی شہر کے تمدن کی ہوا لگی تھی اور نا ہی اس نے بادشاہوں کی ملازمت اختیار کی تھی، وہ تو بس خانان ولایت کا ہی خدمت گزار رہا تھا۔ اس نے افراد خاندان اور اہل وعیال کو تاشقند میں چھوڑا اور اپنے برادر خورد تنبل کے ہمراہ آگے روانہ ہوا۔ انہی دنوں عجیب حادثہ پیش آیا۔ قاسم بیگ عجب کو عارضی طور پر اخسی میں متعین کیا گیا تھا وہ اپنے چند آدمیوں کے ہمراہ راہزنوں کا تعاقب کررہا تھا۔ ان کا پیچھا کرتے کرتے وہ بے چراتا نامی جگہ سے دریائے خجند پار کرگیا۔ جہاں اس کا مقابلہ تنبل کے آدمیوں سے ہوگیا۔ جو کثیر تعداد میں تھے۔ چنانچہ ان کے ہاتھوں وہ گرفتار ہوا۔ جب تنبل کو ہمارے لشکر کے روانہ ہونے کی اطلاع ملی اور خاں سے مدد ملنے کا یقین ہوگیا تو وہ اوزکند سے دوآبے میں داخل ہوا۔ اسی اثنا میں کاسان سے یہ مصدقہ خبر پہنچی کہ خاں نے تنبل کی مدد کے لئے اپنے لڑکے سلطان محمد خانیکہ عرف سلطانیم کو احمد بیگ کے ساتھ متعین کردیا ہے اور پانچ چھ ہزار افراد اس کے ہمراہ کردیئے ہیں جو ارچہ کنت کے راستے سے گزر کر آگے آچکے ہیں اور کاسان کا انہوں نے محاصرہ کرلیا ہے۔ ہم بھی ان لوگوں کی آمد کے منتظر نہیں رہے جو ہم سے دور تھے بلکہ ان ہی لوگوں پر اکتفا کرکے جو وہاں موجود تھے۔ موسم سرما کے ایک سرد (دن) خداوند تعالیٰ پر توکل کرکے بلاتوقف اندجان سے بندسالار کے راستے سے سلطانیم اور احمد بیگ کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ رات ہم نے کہیں بھی قیام نہ کیا۔ بس صبح کے وقت اخسی میں ہی جا کر دم لیا۔ وہ رات انتہائی سرد تھی جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے ہاتھ پیر شل اور کان کسی کملائے ہوئے سیب کی طرح سن ہوگئے تھے۔ ہم نے اخسی میں بھی قیام نہ کیا بلکہ وہاں یارک طغائی کو قاسم عجب کی جگہ عارضی طور پر متعین کرکے کاسان کی جانب روانہ ہوگئے۔ اس اثنا میں خبر آئی کہ احمد بیگ کو چونکہ ہماری آمد کی اطلاع ہوگئی ہے اسی لئے وہ سلطانیم کو ساتھ لے کر سرگردان پریشاں واپس چلا گیا ہے۔ تنبل کو شاید معلوم ہوگیا تھا کہ ہم گھوڑوں پر سوار چلے آرہے ہیں، اسی لئے وہ یلغار کرتا ہوا اپنے بھائی کی مدد کے لئے پہنچا۔ ظہر و عصر کے درمیان کا وقت تھا کہ تنبل کے سپاہی نوکند کی جانب سے نمودار ہوئے۔ اپنے بڑے بھائی کے اس طرح واپس آنے اور ہمارے اس تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے سے وہ حیران وسراسیمہ اپنی جگہ رک گیا۔ ہر طرف یہی چرچا تھا کہ ان کی قضا انہیں یہاں اس حال میں لے کر آئی ہے۔ اور یہ ہی ان کی ہار کا باعث ہے کہ ان کے گھوڑوں نے اس طرح گردنیں ڈال دی ہیں۔ اگر دست خدا ہمارے سر پر رہے اور ہمارے کام سیدھے ہوتے چلے جائیں تو ان میں سے ایک بھی بچ کر نہ جاسکے گا۔ اس پر ویس لاغری اور بعض دوسرے لوگوں نے کہا کہ آج کا دن تو گزر گیا، اگر آج ہم نے اُس پر قابو نہیں پایا تو کل وہ کہاں بچ سکے گا۔ کل جیسے ہی صبح نمودار ہوگی وہ جہاں کہیں بھی ہوگا ہم اس سے نبرد آزما ہولیں گے۔ یہ بات کہنے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ انہیں اس امر میں صلاح نظر نہیں آرہی تھی کہ آج دست اندازی کی جائے دشمن اس طرح قابو میں ہو اور ہاتھ سے نکل جائے تو یہ وہی مثل ہوئی کہ دام میں آئے دشمن کو گرفتار نہ کیا تو ساری عمر پشیمانی ہی پشیمانی ہے:

کارها را به وقت باید جست
کار بی وقت سست باشد سست

(کام کی جستجو وقت پر ہی کرنی چاہئے۔ بے وقت کے کام میں سستی ہی سستی رہتی ہے۔)

صبح تک کے وقت کو غنیمت جان کر ہم اُس رات کسی جگہ آرام کئے بغیر چلتے ہی رہے اور چلتے چلتے قلعہ

ارخیان میں پہنچ گئے۔ اسی صبح ہم دشمن کی طرف روانہ ہوئے۔ جسے ہم نے وہاں نہ پایا۔ ہم نے اس کا تعاقب کیا مگر قلعہ ارخیان کا محاصرہ کرنے میں مصلحت نہ دیکھی۔ چنانچہ غزنہ نمگان کے مغرب میں اس سے ایک کروہ دور ہم نے پڑاؤ کیا۔ (ورق ۶۲) تیس چالیس دن ہم یہیں لشکر گاہ میں مقیم رہے۔ تنبل، قلعہ ارخیان میں ہی تھا۔ آہستہ آہستہ ہمارے اور اس کے لوگوں کی آمدورفت شروع ہوئی۔ گھوڑسوار آدھے راستے تک جاتے اور واپس آجاتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے شب خوں بھی مارا، لشکر گاہ کے باہر سے ہی بس تیراندازی کر کے واپس چلے گئے کیونکہ لشکر گاہ کے گرد خندق بنادی گئی تھی اور درختوں کے تنوں سے روک لگا کر بہت احتیاط سے کام لیا جا رہا تھا۔ جس کی وجہ سے انہیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ جن دنوں ہم لشکر گاہ میں مقیم تھے تو قنبر علی رنجیدہ خاطر ہو کر اپنی ولایت کی طرف جانے ہی والا تھا۔ ایک مرتبہ تو سوار ہو کر وہ روانہ بھی ہو گیا تھا۔ چنانچہ امرا کو اس کے پیچھے روانہ کیا اور بڑی کوششوں سے راضی کر کے اسے واپس لایا گیا۔ اس اثناء میں سیّد یوسف مُجمی نے سلطان احمد کے پاس اپنا آدمی بھیجا اور بعض امور میں اس سے رجوع کیا۔ اندجان کے پہاڑی دامنوں میں دو ٹیلوں کے نام مجم اور اویغور ہیں مجم کا ضلعدار سیّد یوسف تھا۔ آخر میں تو اس کا شمار میرے گھر کے سربرآوردہ افراد میں ہونے لگا تھا اور اس کا مرتبہ شہردار سے بھی بلند تر ہو گیا تھا اور وہ امیری کا دعویٰ کرنے لگا تھا۔ اگرچہ اسے کسی نے بھی درجۂ امارت پر متعین نہیں کیا تھا۔ عجب منافق آدمی، کمینہ اور بے پیندی کا لوٹا تھا۔ جب میرا اندجان پر قبضہ ہو گیا تو اس وقت سے اب تک تنبل سے سرکش ہو کر دو تین مرتبہ میرے پاس آچکا تھا اور مجھ سے نافرمان ہو کر تنبل کے پاس بھی چلا گیا ہوگا۔ اس مرتبہ وہ مجھ سے آخری بار جدا ہوا تھا۔ چونکہ ابتدا سے ہی اس کے قوم وقبیلے کی تعداد بہت زیادہ تھی اسی لئے ہم نے یہ چاہا کہ وہ تنبل کے ساتھ نہ رہے اور ہم راستے میں ہی اسے پکڑ لیں۔ چنانچہ اس ارادے سے ہم سوار ہوئے۔ ایک دن بیچ ہم پش خاران نامی مقام پر پہنچے۔ تنبل کے آدمی اس عرصے میں وہاں کے قلعے میں داخل ہو چکے تھے۔ میرے جوامیر یلغار کے لئے گئے تھے ان میں علی درویش بیگ، قوچ بیگ اور اس کے بھائی شامل تھے۔ وہ پش خاران کے دروازے تک گئے اور وہاں خوب چپقلش ہوئی۔ قوچ بیگ نے اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر خوب بہادری کے جوہر دکھائے اور ان میں سے بیشتر کو اپنے مقصد میں کامیابی بھی ہوئی۔ چنانچہ پش خاران سے ایک کروہ کے فاصلے پر انہوں نے ایک بلند جگہ پر قیام کیا۔ تنبل نے جہانگیر کو اپنے ساتھ لیا اور قلعہ پش خاران کو پیچھے چھوڑ کر وہ بھی وہاں قیام پذیر ہوا۔

جہانگیر مرزا سے صلح

تین چار دن بعد ہمارے امرا جو ہم سے مختلف رائے رکھتے تھے۔ جن میں علی دوست وقنبر علی سلاخ اور ان کے توابع ولواحقین شامل تھے صلح کے لئے باہمی طور پر مشورہ کرنے لگے۔ میرے خیر خواہوں کو اس کا قطعی علم نہ تھا اور اس صلح کے لئے ہم بالکل راضی نہ تھے۔ کیونکہ یہ کمین لوگ بھی میرے دو سربرآوردہ امیر رہ چکے تھے۔ اگر ہم ان کی بات کی طرف متوجہ نہ ہوتے اور صلح نہ کرتے تو دیگر امور کے وقوع پذیر ہونے کا احتمال تھا۔ چنانچہ وقت کا تقاضا یہی تھا کہ اسی طرح صلح کر لی جائے۔ صلح اس طرح کی گئی کہ دریائے خجند سے اخسی کی جانب جتنی ولایات ہیں وہ جہانگیر مرزا سے متعلق رہیں گی اور جو ولایات اندجان کی طرف واقع ہیں ان کا تعلق مجھ سے رہے گا۔ اوزکند سے بھی وہ اپنے اہل وعیال کو نکال کر ہمارے دیوان کے حوالے کر دیں گے۔ جب میری اور جہانگیر مرزا کی ولایات کے بارے میں باہمی فیصلہ ہو جائے گا تو ہم باہمی طور پر سمرقند کی جانب روانہ ہونگے اور جیسے ہی تخت سمرقند تسخیر ہو جائے گا تو اندجان جہانگیر مرزا کے حوالے کر دیا جائے گا۔ چنانچہ بات قرار پا گئی۔ ماہ رجب کے آخر میں صبح کے وقت جہانگیر مرزا اور تنبل میری خدمت میں حاضر ہوئے۔ جیسا کہ قرار پایا تھا اس کے مطابق معاہدے ہوئے اور شرطیں طے کی گئیں۔ جہانگیر مرزا کو اخسی کی جانب رخصت کر کے میں خود اندجان واپس آگیا۔ وہاں پہنچتے ہی (ورق ۶۳)

تنبل کے برادر خورد خلیل اور ان دیگر تمام لوگوں کو جو قید میں تھے رہا کر دیا گیا اور ہر ایک کو خلعت پہنا کر رخصت کیا گیا۔ انہوں نے بھی ہمارے امراء قرابت داروں کو جیسے طغائی بیگ، محمد دوست، میر شاہ قوچین، سیدی بیگ، قاسم عجب، میر ویس اور میر دیوانہ وغیرہ کو جوان کی قید میں تھے آزاد کر کے روانہ کر دیا۔ ہمارے اندجان پہنچنے کے بعد علی دوست کا طور طریقہ یکسر بدل گیا۔ جو لوگ میرے ساتھ جنگوں اور مصائب میں شریک رہے تھے ان کے ساتھ وہ بدسلوکی پر اتر آیا۔ پہلے تو اس نے خلیفہ کو رخصت کیا۔ اس کے بعد اس نے ابراہیم سارو اور ویس لاغری کو بے جرم و بلا وجہ گرفتار کر لیا۔ انہیں تاخت و تاراج اور ان کی ولایات سے بے دخل کر کے انہیں رخصت کر دیا۔ وہ قاسم بیگ سے ہمیشہ لڑتا رہتا تھا۔ جس کی بظاہر وہ یہ دلیل دیتا کہ خلیفہ اور ابراہیم چونکہ خواجہ قاضی کے خیر خواہ ہیں اسی لئے وہ مجھ سے انتقام لیں گے۔ اس کے لڑکے محمد دوست نے بھی شاہانہ طور طریقہ اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی گفتگو، دستر خوان کی وسعت، دیوانی امور اور کارخانہ جات میں سلاطین کے درباروں کی سی رونق و شان نظر آتی تھی۔ یہ دونوں باپ بیٹے چونکہ تنبل پر تکیہ کئے ہوئے تھے اسی لئے ان سے ایسی حرکات سرزد ہو رہی تھیں۔ اس وقت میرے پاس اس قدر اختیار و اقتدار نہ تھا کہ اس طرح کی نامعقول حرکات سے انہیں باز رکھ سکوں، چونکہ تنبل جیسا میرا دشمن ان کی حمایت پر بیٹھا ہوا تھا اسی لئے وہ من مانی کر رہے تھے۔ عجب نازک وقت تھا اور میں کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ اس عرصے میں باپ بیٹے کے ہاتھوں میں نے بہت ہی ذلت و خواری برداشت کی۔

پہلی شادی

سلطان احمد مرزا نے اپنی لڑکی عائشہ سلطان بیگم سے میرے والد اور چچا کے زمانہ حیات میں مجھ سے نسبت کر دی تھی، ان دنوں وہ خجند میں مقیم تھیں۔ ماہ شعبان میں میں انہیں اپنے گھر لے کر آیا۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں میرا میلان طبع ان کی جانب برا نہ تھا لیکن چونکہ یہ میری پہلی شادی تھی اسی لئے ہم دونوں کے درمیان شرم و حجاب کے پردے حائل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں دس یا پندرہ یا بیس دن کے بعد ان سے رجوع کرتا۔ لیکن آخر میں وہ پہلی سی محبت نہ رہی اور حجاب کا مزید اضافہ ہو گیا۔ اب میں تیس چالیس دن کے بعد ہی رجوع کرتا۔ اس پر میری والدہ خانم زبردستی سرزنش کر کے اور ناراض ہو کر مجھے ان کے پاس جانے کے لئے تنبیہ کرتیں۔

پہلا عشق

ان ہی دنوں مجھے ایک بازاری لڑکا نظر آیا جس کا نام بابری تھا۔ میرے اور اس کے نام میں ایک نسبت بھی تھی۔ میں نے اس کی جانب عجب میلان پایا۔ میلان ہی نہیں بلکہ میں اس کا عاشق زار و شیدائی ہو گیا۔ اس سے قبل میں کسی کی طرف اس طرح مائل نہیں ہوا تھا۔ یہی نہیں بلکہ جہاں کہیں مہر و محبت کی گفتگو و شنید ہوتی میں اس کی طرف متوجہ نہ ہوتا اور نہ ہی خود اس طرح کی کوئی گفتگو کرتا۔ البتہ ایسے موقعوں پر ایک دو بیت فارسی میں ضرور موزوں کر لیتا۔ یہ بیت ان میں سے ایک ہے:

هیچ کس چون من خراب و عاشق و رسوا مباد

هیچ محبوبی چو تو بی رحم و بی پروا مباد

(کوئی شخص میری طرح برباد، عاشق اور رسوا نہ ہو۔ کوئی محبوب تیری طرح بے رحم اور بے پروا نہ ہو۔)

بابری کبھی کبھی میرے پاس آتا۔ لیکن حیا و حجاب کے باعث میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا، تو بھلا اس سے بات کرنے کا کیا امکان ہوتا اور اس کے چلے جانے پر کیا گلے اور کیا شکوے کرنے کا موقع فراہم ہو سکتا تھا اور یہ بھلا کس میں ہمت تھی جو اس سے کہے کہ ملاقات کی خاطر وہ آتا رہا کرے۔ ایک روز اس عشق و عاشقی کے دوران اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ میں ایک کوچے سے گزر رہا تھا کہ ایک جگہ بابری

اچانک میرے بالکل سامنے آ گیا۔ شرم کے باعث میری ایسی حالت ہوئی کہ نزدیک تھا کہ جان ہی تن سے نکل جائے۔ اس کی طرف دیکھنے (ورق ۶۴) یا بات کرنے کی تو کیا مجال ہوتی۔ البتہ بہت زیادہ شرم وحجاب کے باعث بامشکل تمام جب میں وہاں سے گزر رہا تھا تو محمد صالح[۵] کا یہ شعر میرے ذہن میں آ گیا:

شوم شرمنده هر گـه یار خود را در گذر بینم
رفیقان سوی من بینندو من سوی دگر بینم

(جب کبھی میں یار کو راستے میں دیکھ لیتا ہوں تو دوست میری طرف دیکھتے ہیں اور میں کسی اور طرف دیکھتا ہوں)

یہ بیت عجب حسب حال واقع ہوئی۔ طغیان عشق ومحبت اور جوش جوانی وجنوں کے سبب میں برہنہ سر و برہنہ پا کوچہ وباغ اور باغیچہ کے چکر لگاتا رہتا۔ اس وقت نہ میرا کسی آشنا و بیگانے کے طرف التفات تھا اور نا ہی کچھ اپنا خیال۔

عاشق اولغا بیخود و دیوانه بولدوم بیلمادیم
کیم پری رخسارلار عاشقی غه بوایر مسیش خواص

(میں عشق میں سرشار بیخود و دیوانہ وار سرگرداں رہتا۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ایک پری رخسار نے مجھے اس حال کو پہنچا دیا ہے۔)

کبھی دیوانہ وار پشتہ کوہ پر کبھی دشت وصحرا میں، کبھی باغات ومحلات کے کوچے میں حیران وپریشان چکر لگاتا رہتا۔ اس دشت نوردی وکوچہ گردی کا مجھے اختیار نہ تھا

نی بارور غه قو بتیم بارنی تورار طاقتیم
بیزنی بو حالت قه سین قیلدینگ ای کونکول

(نہ کہیں بیٹھ جانے سے چین ملتا اور نہ چلنے سے قرار آتا اور نا ہی کسی جگہ رک جانے سے سکون میسّر آتا۔ میری یہ کیفیت میرے اپنے دہر کے ہاتھوں ہوئی تھی)

اسی سال سلطان علی مرزا اور محمد مزید ترخاں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے جس کہ وجہ یہ تھی کہ ترخانیوں نے بہت زیادہ اختیار واعتماد حاصل کر لیا تھا بخارا کا جتنا بھی محصول تھا وہ باقی (ترخان) ہی وصول کرتا وہ سرکار بخارا میں سے کسی کو ایک پائی دینے کے لئے تیار نہ تھا ادھر محمد مزید ترخان کا سمرقند پر عمل ودخل تھا، اس نے وہاں کی تمام ولایات پر اپنے لڑکوں اور متعلقوں اور عزیزوں کے لئے قبضہ کر رکھا تھا۔ شہر سے ایک معمولی رقم کے علاوہ جو بطور وظیفہ مقرر کر دی گئی تھی ایک درم بھی کسی راہ سے سلطان علی مرزا کو نہیں پہنچ رہا تھا۔ لیکن اب وہ جوان ہو چکا تھا۔ ان کے اس طرح کے سلوک کو وہ کب تک برداشت کرتا۔ اس نے اپنے چند قرابت داروں کو جمع کر کے محمد مزید ترخان سے مقابلے کا قصد کیا۔ محمد مزید ترخان بھی اس کے اس ارادے کو بھانپ گیا۔ چنانچہ وہ بھی اپنے متعلقوں اور عزیزوں اور امرا کے ہمراہ جو اس سے وابستہ تھے جیسے سلطان حسین ارغون، پیر احمد، اوزدن حسن کا برادر خورد خواجہ حسین، قرابراس، صالح محمد نیز دیگر امیروں اور جوانوں کو ساتھ لے کر شہر کے باہر نکل آیا۔ اس وقت خاں نے خاں مرزا، سلطان محمود خاں، محمد حسین دوغلت، احمد بیگ اور بہت سے مغول کو اپنے ساتھ لے کر سمرقند پر متعین کر دیا۔ حافظ بیگ دولدائی اور اس کا لڑکا طاہر بیگ (خاں مرزا کا استاد) اس کے ساتھ تھے۔ ہندو بیگ کا پوتا حسن اور بعض دیگر جوان اس نسبت سے کہ وہ حافظ بیگ اور طاہر بیگ کے قرابت دار تھے سلطان علی مرزا کے پاس سے فرار ہو کر خاں مرزا کے پاس پہنچ گئے۔ محمد مزید ترخان نے مغل امرا سے ملاقات کی جو نہ صرف خوشگوار واقع نہ ہوئی بلکہ مغل امرا نے محمد مزید ترخان کو گرفتار کرنے کا بھی ارادہ کر لیا۔ جس سے واقف ہونے کے بعد وہ کسی بہانے سے لشکر مغل سے علیحدہ ہو گیا۔ لشکر مغل کے بھی وہاں پیر نہ جم سکے۔ جس وقت وہ سبزہ زار یار ییلاق میں قیام پزیر تھے، سلطان علی مرزا سمرقند سے یلغار کرتا ہوا خاں مرزا اور لشکر مغل کے سر پر آن پہنچا۔ اگرچہ ان کے درمیان جنگ نہ ہو سکی البتہ تباہ حال وہ وہاں سے فرار ہو گئے۔ سلطان علی مرزا نے اپنے آخری زمانے میں اگر کوئی کارنامہ انجام دیا تو بس یہی تھا۔ (ورق ۶۵) محمد مزید ترخان اور وہ

۵۔ محمد صالح۔ شاعر کے لئے دیکھیں نوٹ ۵۴ حالات ۹۱۱ ہجری

مرزا جو اس کے ساتھ تھے انہوں نے مایوس ہو کر عبدالوہاب کے لڑکے میر مغل کو، (جو اس سے پہلے بھی میرے ساتھ رہ چکا تھا اور اندجان کے محاصرے میں وہ خواجہ قاضی کے ساتھ اتحاد و یکجہتی سے پیش آیا تھا اور اس کی خاطر اپنی جان تک کی بازی اس نے لگا دی تھی) میرے پاس بھیجا اور مجھے اپنے پاس آنے کی دعوت دی۔ چونکہ اس قضیے میں ہم بھی خسارے سے دوچار ہوئے تھے اسی لئے بربنا مصلحت صلح کر کے ہم نے سمرقند کی طرف جانے کا عزم کیا۔ ہم نے میر مغل کو فوراً جہانگیر مرزا کے پاس ڈاک چوکی سے روانہ کیا اور خود سمرقند کی جانب جانے کے لئے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ ماہ ذیقعدہ میں ہمارے سواروں کا لشکر سمرقند پہنچا اور دو روز راہ میں رک کر ہم قبا نامی مقام پر پہنچ کر قیام پذیر ہوئے۔ عصر کی نماز کے وقت ہمیں اطلاع ملی کہ تنبل کا برادر خورد خلیل آن پہنچا ہے اور اس نے قلعہ اوش پر چوری چھپے قبضہ کر لیا ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ قیدی جن کا سردار تنبل کا برادر خورد خلیل تھا جب رہا کر دیئے گئے (اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے) تو تنبل نے خلیل کو ان کے بیوی بچوں کو لانے کے لئے اوزکند بھیجا۔ وہ اس بہانے سے وہاں پہنچا اور یہ حیلہ بنا کر کہ آج آتا ہوں، کل آتا ہوں وہاں سے روانہ ہوا۔ جس وقت ہم اپنے لشکر کے ہمراہ گھوڑوں پر سفر کر رہے تھے تو اس نے موقع پا کر اوراوش کو خالی دیکھ کر راتوں رات اس کے قلعے پر چوری سے قبضہ کر لیا۔ جیسے ہی یہ خبر ہم تک پہنچی تو ہم نے وہاں قیام کرنے اور ان کے ساتھ جنگ کرنے میں کچھ وجوہات کی بنا مصلحت نہ سمجھی اور سمرقند کی جانب روانہ ہو گئے۔ جنگ نہ کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ میرے نامور جنگجو اپنے لشکر کو مسلح کرنے کے لئے اس وقت منتشر تھے اور جہاں کہیں جس کا گھر تھا وہ وہاں چلا گیا تھا۔ ہم نے ان کی صلح پر اعتماد تو کر لیا مگر ان کے مکر و فریب سے لاعلم رہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ علی دوست اور قنبر علی جیسے بڑے امیروں سے ایسی حرکات سرزد ہوئی تھیں کہ ان پر میرا اعتماد نہ رہا تھا۔ چنانچہ اس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ ان کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ ان تمام امرا نے جن کا سردار محمد مزید ترخان تھا مجھے بلانے کے لئے میر مغل کو میرے پاس بھیجا تھا۔ جب سمرقند جیسا مقام پائے تخت ہو تو بھلا پھر کس کی غرض تھی کہ وہ اندجان جیسی جگہ کے لئے اپنا وقت ضائع کرتا۔

قبا سے ہم نے مرغینان کی جانب کوچ کیا جو قوچ بیگ کے باپ سلطان احمد بیگ کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اس جگہ سے اپنی وابستگی کے باعث وہ ہمارے ساتھ نہ آ سکا اور یہیں مقیم رہا۔ البتہ اس کا لڑکا قوچ بیگ اور بھائی بندوں میں سے دو ایک میرے ہمراہ ہو گئے۔

اسفرہ کے سامنے سے ہو کر ہم مجن نامی گاؤں پہنچے جو اسفرہ کے ہی تابع ہے اور یہاں قیام پذیر ہوئے۔ یہ محض حسن اتفاق تھا کہ قاسم بیگ اپنے گروہ کے ساتھ، علی دوست اپنے دستے کے ہمراہ اور سید قاسم بہت سے جوانوں کی معیت میں اچانک اسی رات وہاں قیام کرنے کی خاطر اس طرح پہنچ گئے گویا وہ ڈاک چوکی کے لئے وہاں اترے ہوں۔ وہ سب میرے ساتھ ہو گئے۔ چنانچہ وہاں سے ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر دشت خاں سے گزر کر پل جویان کے راستے سے اوراتیپہ پہنچ گئے۔

تنبل پر اعتماد کرتے ہوئے قنبر علی اپنی ولایت، خجند سے لشکر سے متعلق گفتگو کرنے کے لئے اخسی پہنچا۔ جیسے ہی وہ وہاں وارد ہوا تنبل نے قید کر کے اسے اپنے ساتھ لیا اور اس کی ولایات کی جانب روانہ ہو گیا۔ ترکی زبان کی ضرب المثل ہے، جس کے فارسی میں معنی ہیں۔

"باور مکن دوست خود را که گاه پر خواهد کرد پوست ترا"

(اپنے دوست پر بھروسہ مت کر، کہیں وہ تیری کھال میں بھوسا نہ بھر دے)

جس وقت وہ خجند کی راہ پر گامزن تھے (ورق ٦٦) قنبر علی پیادہ پا فرار ہو کر بصد مشکل کئی دن بعد اوراتیپہ پہنچا۔ جس وقت ہم اوراتیپہ میں مقیم تھے تو خبر آئی کہ شیبانی خاں نے قلعہ دبو میں باقی خاں کے لڑکے کو شکست دے دی اور بخارا کی جانب روانہ ہو گیا ہے۔ اوراتیپہ سے ہم ییلاق بورکہ کے راستے سے سنگزار پہنچے۔

وہاں کے داروغہ نے یہاں کا قلعہ ہمارے حوالے کر دیا۔ قنبر علی گرفتار کر کے چونکہ یہاں لایا جا چکا تھا اسی لئے ہم اسے یہاں چھوڑ کر آگے روانہ ہو گئے۔

جس وقت ہم خیمہ گاہ خاں (یورت خاں) نامی مقام پر پہنچے اور قیام کے لئے اترے تو وہ امرائے سمرقند جن کا سردار محمد مزید ترخان تھا میری خدمت میں حاضر ہوئے۔ تسخیر سمرقند کی کیفیت کے بارے میں مشورہ کیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ خواجہ یحییٰ بھی یہاں آپکی حکمرانی کا متمنی ہے۔ اگر اسے راضی کر لیا جائے تو سمرقند بے جنگ وجدال آسانی سے ہاتھ آجائے گا۔ چنانچہ اس مقصد کے تحت خواجہ یحییٰ کے پاس کئی مرتبہ آدمی بھیجے گئے۔ اور ان سے گفتگو بھی ہوئی لیکن خواجہ یحییٰ نے ہمیں کوئی فیصلہ کن اطلاع نہیں دی کہ جسے سن کر ہم سمرقند میں داخل ہو جاتے مگر ایسی کوئی بات بھی نہیں کہی جس سے میں مایوس ہو جاتا۔ خیمہ گاہ خان سے کوچ کر کے ہم درغم (نہر) پہنچے۔ اس جگہ کے نزدیک سے خواجہ یحییٰ کے پاس ہم نے خوجہ محمد علی کتابدار کو بھیجا۔ وہ یہ خبر لایا کہ آجائیں میں شہر ان کے حوالے کر دوں گا۔ درغم سے راتوں رات سوار ہو کر ہم نے شہر کی جانب رخ کیا۔ سلطان محمد دولدائی کا باپ سلطان محمود دولدائی ہماری خیمہ گاہ سے فرار ہو گیا اور اس واقعے کی خبر انہیں کر دی۔ چنانچہ جب انہیں اطلاع ملی تو ہم جو کچھ کرنا چاہتے تھے وہ نہ کر سکے۔ اسی بنا پر وہاں سے واپس پھر درغم پہنچے اور وہیں قیام پذیر ہوئے۔

ابراہیم سارو منگلیغ کے ساتھ میں نے بہت مراعات کی تھیں اسے علی دوست گرفتار کر کے لایا تھا جس وقت میں یار ییلاق سبزہ زار میں مقیم تھا وہ یوسف بیگ کے لڑکے کے ساتھ میری خدمت میں حاضر ہوا۔ ہمارے وہ تمام امرا اور قرابت دار جو علی دوست کے اس وجہ سے مخالف تھے کہ وہ ان میں سے بعض کو بے دخل اور چند کو تباہ و تاراج اور کچھ کو گرفتار کر چکا تھا۔ وہ سب ایک ایک کر کے میرے گرد جمع ہو گئے جس کے باعث علی دوست کمزور ہو گیا۔ اس نے کیونکہ تنبل پر تکیہ کیا تھا اس لئے مجھ پر اور خیر خواہوں پر اس کے جور و ستم جاری تھے۔ میرا دل تو اس کمینے سے قطعی بیزار ہو چکا تھا اور وہ بھی پشیمانی و بدگمانی کے باعث میرے روبرو نہیں آسکتا تھا۔ اس نے مجھ سے رخصت چاہی گویا کہ اس نے مجھ پر یہ احسان کیا، چنانچہ اسے رخصت دے دی گئی۔ مجھ سے رخصت ہوتے ہی علی دوست اور دوست محمد براہ راست تنبل کے پاس پہنچے اور اس کے مقرب بن گئے۔ ان دونوں باپ اور بیٹے کی طرف سے سرکشی و بدخواہی کے بہت سے واقعات رونما ہوئے۔ ایک دو سال بعد علی دوست ہاتھ میں ناسور کی سوزش کے باعث چل بسا۔ محمد دوست ازبکوں کے ساتھ مل گیا۔ مجموعی طور پر وہ برا آدمی نہ تھا مگر ان کے ساتھ بھی اس نے نمکحرمی کی اور وہاں سے فرار ہو کر اندجان کے دامن کوہ پر پہنچ گیا اور وہاں سرکشی و فتنہ انگیزی شروع کر دی۔ آخر کار ازبکوں کے چنگل میں پھنس گیا۔ جنہوں نے اس کی آنکھوں میں سلائی پھروا دی اور یہ بات اس پر صادق آئی کہ "فلاں کے نمک کی آہ اس کی آنکھوں پر پڑی"۔

بخارا اور سمرقند پر شیبانی خاں کا قبضہ

انہیں رخصت کرنے کے بعد غوری برلاس کو چند جوانوں کے ہمراہ خبر لینے کے لئے بخارا بھیجا گیا۔ وہاں سے یہ خبر آئی کہ شیبانی خاں نے بخارا پر قبضہ کر لیا ہے اور سمرقند کی جانب روانہ ہو چکا ہے۔ جب ہم نے یہ دیکھا کہ وہاں گرد و نواح میں رہنے میں مصلحت نہیں تو کش کی جانب رخ کیا۔ جہاں اکثر امرائے سمرقند کے خاندان پہلے ہی مقیم تھے۔ جب ہم کش پہنچ گئے تو ایک دو ہفتہ بعد خبر آئی کہ سلطان علی مرزا نے سمرقند (ورق ۶۷) کو شیبانی خاں کے حوالے کر دیا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ سلطان علی مرزا کی ماں زہرہ بیگی آغا نے اپنی نادانی اور حماقت کے باعث مخفی طور پر شیبانی خاں کے پاس اپنے آدمی کو پیغام دے کر بھیجا۔ جس کا مضمون یہ تھا کہ۔

اگر شیبانی خاں مجھے اپنی بیوی بنالے تو میرا بیٹا (سلطان علی مرزا) سمرقند شیبانی خاں کے حوالے کر دے گا۔ سلطان علی مرزا کے باپ کی حیثیت سے شیبانی خاں سلطان علی کو یہ ولایت واپس کر دے۔

اس تدبیر سے ابو یوسف ارغون باخبر تھا۔ یہی نہیں بلکہ یہ مشورہ بھی اسی نے دیا تھا۔

واقعات ۹۰۶ھ

(۲۸ جولائی ۱۵۰۰ء ۔ ۱۷ جولائی ۱۵۰۱ء)

سلطان علی مرزا کا قتل

شیبانی خاں اس عورت[۱] کی دعوت پر باغ میدان میں آکر اترا۔ سلطان علی مرزا نے اپنے سرداروں، جوانوں اور ملازموں کو خبر نہ کی اور انہیں کچھ بتائے بغیر ہی دوپہر کے وقت چند ملازمین کے ساتھ دروازہ چہار راہ سے نکل کر باغ میدان میں شیبانی خاں کے پاس پہنچ گیا۔ خاں نے اس ملاقات پر کسی گرم جوشی کا اظہار نہ کیا اور اسے اپنے سے نیچی جگہ پر بٹھایا۔ خواجہ یحیٰی کو جب مرزا کے آنے کی اطلاع ہوئی تو مضطرب ہو کر وہ بھی ان کے پاس پہنچا۔ خواجہ کو دیکھ کر شیبانی خاں اپنی جگہ سے اٹھا نہیں اور شکایت آمیز لہجے میں گفتگو شروع کی۔ لیکن جب خواجہ چلنے کے لئے کھڑا ہوا تو وہ تپاک سے خواجہ کی تعظیم کے لئے اپنی جگہ اٹھ کھڑا ہوا۔

خواجہ علی بے کے لڑکے جان علی کو جو اس وقت رباط خواجہ میں تھا، شیبانی خاں کے پاس مرزا کے پہنچنے کی اطلاع ملی تو وہ بھی شیبانی خاں کے پاس آن پہنچا۔ اس بدبخت عورت نے چوں کی ناقص العقل تھی شوہر کے لالچ میں اپنے لڑکے کے گھربار کو گنوایا۔ شیبانی خاں نے اس کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہ کی۔ بلکہ اسے کنیز و داشتہ کے برابر بھی نہ سمجھا۔ سلطان علی مرزا اپنی آمد پر پریشان و پشیمان اور اپنے اس اقدام پر حیران تھا۔ اس کے بعض قریبی لوگ مرزا کی اس کیفیت کو سمجھ گئے۔ انہوں نے سوچا کہ مرزا کو ساتھ لے کر فرار ہو جائیں مگر وہ اس پر راضی نہ ہوا۔ چونکہ اجل قریب آ ہی گئی تھی اسی لئے اس کی خلاصی نہیں ہوئی۔ وہ تیمور سلطان کے پاس جا کر اترا۔ چار پانچ روز بعد اسے قلبہ نامی سبزہ زار میں قتل کر دیا گیا۔ اس پانچ روزہ فانی زندگی کی خاطر وہ اپنے سر پہ بدنامی لے کر گیا اور ایک عورت کی باتوں میں آکر خود کو نیک لوگوں کے زمرے سے خارج کر لیا۔ ایسے شخص کے واقعات اس سے زیادہ بیان نہیں کئے جا سکتے اور اس طرح کی نازیبا حرکات کے بارے میں اس سے زیادہ نہیں سنا جا سکتا۔

سلطان علی مرزا کو قتل کرنے کے بعد اس نے جان علی کو بھی مرزا کی راہ میں روانہ کیا۔ خواجہ یحیٰی سے بھی چونکہ شیبانی خاں کو خدشہ تھا اسی لئے اس نے خواجہ اور ان کے دو لڑکوں محمد ذکریا اور خواجہ باقی کو خراساں کی جانب بھیج کر پیچھے سے چند ازبک روانہ کئے جنہوں نے خواجہ کو اس کے دونوں جوان لڑکوں کے ساتھ کاردزن کے نواح میں شہید کر دیا۔ اس پر شیبانی خاں کہ یہ کہنا تھا کہ میں نے خواجہ کا قتل نہیں کیا بلکہ اس میں قنبر بے اور کوپک بے کا ہاتھ تھا۔ اس کا یہ اعتراف اصل حقیقت سے بدتر تھا۔ کیونکہ مثل ہے کہ عذر گناہ بدتر از گناہ اگر امرا اس طرح کی حرکات بغیر پوچھے کریں تو پھر خانی اور شاہی کا کیا فائدہ۔

جیسے ہی ازبکوں نے سمرقند پر قبضہ کیا ہم نے کش سے حصار کی جانب رخ کیا۔ محمد مزید ترخاں اور امرائے سمرقند (ورق ۶۸) اپنے اہل و عیال و دیگر افراد خاندان کے ہمراہ ہمارے ساتھ روانہ ہوئے لیکن جب ہم چلتوی چغانیان نامی سبزہ زار میں اترے تو محمد مزید ترخان اور اس کے امرا ہم سے علیحدہ ہو کر خسرو شاہ کے پاس چلے گئے اور اس کی ملازمت اختیار کر لی۔

ہم شہر و ولایت سے محروم نہیں جانتے تھے کہ کہاں جائیں اور کس جگہ رہیں۔ خسرو شاہ کے ہاتھوں ہمارے خاندان پر کیا گزری تھی یہ جانتے ہوئے بھی ہمارے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ اس کی ولایت سے گزریں۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ قراتگین اور آلای سے گزر کر میں الچہ خان کے پاس جنہیں میں خاں دادا

[۱] یعنی سلطان علی مرزا کی ماں زہرہ بیگی آغا

کہتا ہوں چلا جاؤں، لیکن یہ بھی نصیب نہ ہوا۔ کمرود سے اوپر ہی اوپر گزر کر ہم نے سرہ تاق پار کیا۔ جس وقت ہم نواندک کے نواح میں پہنچے تو خسرو شاہ کا ملازم نو گھوڑے اور نو پارچہ خلعت لے کر حاضر ہوا۔ جس وقت ہم کمرود کے دھانے پر تھے تو وہاں پر حسین ملازم شیر علی چہرہ فرار ہو کر خسرو شاہ کے بھائی ولی کے پاس پہنچ گیا۔ اگلے دن صبح قوچ بیگ ہم سے علیحدہ ہو کر حصار کی جانب چلا گیا۔ درۂ کمرود میں پہنچ کر ہم اوپر کی جانب روانہ ہوئے۔ تنگ راستوں اور سیدھی چٹانوں کی تیز ڈھلانوں کے باعث ہمارے بہت سے اونٹ اور گھوڑے پیچھے ہی رہ گئے۔ تین چار منزلیں طے کر کے ہم نے سرتاق پہاڑی کو سر کیا۔ پہاڑی بھی کیسی تنگ و بلند جو کبھی دیکھی نہیں تھی اور اس سے پہلے ہرگز ایسے تنگ اور ڈھلوان راستوں سے نہ گزرے تھے۔ بمشکل تمام خطرناک تنگ اور ڈھلواں راستے سے گزر کر قان کے نواح میں پہنچے، جس کی پہاڑیوں کے درمیان ایک بہت ہی بڑی اور عجیب و غریب جھیل ہے، جس کا رقبہ تقریباً ایک کوس شرعی ہوگا۔

یہاں یہ خبر آئی کہ ابراہیم ترخان نے قلعہ شیراز[2] مستحکم کر لیا ہے اور وہاں وہ متمکن ہے۔ سبزہ زار یار ییلاق کے قلعوں کو قمبر علی اور ابوالقاسم کوہ بر نے مستحکم کر کے ان پر قبضہ کر لیا ہے۔ وہ اس سے قبل خواجہ دیدار میں تھے۔ اور جب ازبک سمرقند پر قابض ہوئے تو وہ وہاں نہ رک سکے اور یار ییلاق سبزہ زار میں آگئے۔

ہم فان کو اپنی دائیں جانب چھوڑتے ہوئے کشتود کی جانب روانہ ہوئے۔ حاکم فان اپنی کرم فرمائی، سخاوت، خدمت گزاری وانسانیت کے لئے مشہور تھا۔ جس وقت سلطان حسین مرزا نے حصار کی جانب رخ کیا اور سلطان مسعود مرزا اپنے برادر خورد بایسنغر مرزا کے پاس سمرقند پہنچنے کے لئے اس علاقے سے گزرا تو حاکم فان نے ستر اسی گھوڑے بطور پیشکش دینے کے علاوہ دیگر خدمات بھی بہتر طریقے سے انجام دی تھیں۔ وہ خود تو میری خدمت میں حاضر نہ ہوا لیکن ایک مریل گھوڑا مجھے بھی پیش کیا۔ جو لوگ اپنی سخاوت و جواں مردی کے لئے مشہور تھے۔ جب ہماری نوبت آئی تو خسیس ہو چکے تھے۔ وہ گروہ جس کی مروّت کے چرچے رہا کرتے تھے اب وہ اپنی اس خصوصیت کو فراموش کر چکے تھے۔ وہ خسرو شاہ جو اپنی جود و سخا کے لئے معروف تھا اس نے بدیع الزمان مرزا کی کس طرح خدمت کی اس کی کیفیت اوپر گزر چکی ہے۔ باقی خاں ترخان اور دیگر امرا کے ساتھ بھی وہ بڑی شرافت و دریا دلی سے پیش آیا۔ اس کی ولایت سے مجھے دو مرتبہ گزرنے کا اتفاق ہوا۔ حسن سلوک کا تو کیا ذکر اس نے ہمارے ساتھ وہ رویہ تک اختیار نہ کیا جو اسے ہمارے ادنیٰ ملازمین کے ساتھ کرنا چاہئے تھا۔ اس نے تو ہمیں ہمارے نوکروں کے برابر تک نہ سمجھا۔ (ورق ٦٩)

کیم کو روتبورای کونگول اهل جهان دین یخشیلیق

کیم کـه اندین یخشی یوق کو زنوتمه اندین یخشیلیق

(کی کس کے ساتھ اے دل اہل جہاں نے نکی

جو آپ ہی برا ہا اس سے امید کیسی [3])

فان سے گزرنے کے فوراً بعد ہی ہم قلعہ کشتود میں مقیم ازبکوں کی طرف بڑھے لیکن یہ قلعہ پہلے ہی سے ویران پڑا تھا اور اس عرصے میں کوئی حاکم بھی وہاں مقرر نہیں کیا گیا تھا۔ یہاں سے گزرنے کے بعد دریائے کوہک کے کنارے اترے۔ یاری نامی جگہ کے قریب سے ہم نے دریائے کوہک کو پل کے ذریعے پار کیا۔ بعض امرا کو قاسم بیگ کی قیادت میں بھیجا گیا تا کہ قلعہ رباط خواجہ پر چپکے سے قبضہ کر لیں۔ یاری کو پار کر کے اور کوہ شفقار خانہ سے گزر کر ہم یار ییلاق سبزہ زار میں پہنچے۔ جن امرا کو رباط خواجہ کی جانب بھیجا گیا تھا انہوں نے زینے لگانے

٢۔ قلعہ شیراز کا پہلے بھی ذکر آ چکا ہے۔ ۹۰۵ھ کے حالات میں نوٹ نمبر ٢

٣۔ یہ منظوم ترجمہ مرزا نصیر الدین حیدر کا ہے

شروع کر دیئے۔ ابھی وہ ان زینوں پر ہی تھے کہ اہل قلعہ سمجھ گئے یا انہیں بتا دیا گیا اسی لئے ہمارے امرا اس پر قبضہ نہ کر سکے اور ناکام واپس آ گئے۔

قنبر علی اس وقت سنگزار میں تھا۔ وہ ہم سے ملاقات کے لئے آیا۔ ابو القاسم کوہ بر اور ابراہیم ترخان نے اپنے لوگوں کو ہماری خدمت میں روانہ کیا جنہوں نے خلوص کا اظہار کیا۔ یار ییلاق کے گاؤں سے ہم قلعہ اسفندک پہنچے۔ اس وقت خواجہ دیدار کے نواح میں شیبانی خاں گھات لگائے بیٹھا تھا۔ تین چار ہزار ازبک اس کے ساتھ تھے۔ تقریباً اتنے ہی سپاہی دوسرے جگہ سے یہاں آ کر جمع ہو گئے تھے۔ سمرقند کا عہدہ دارو جانی خاں وفا کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ قلعے میں پانچ چھ سو آدمی تھے حمزہ سلطان اور مہدی سلطان اپنے تابع اور لواحقین کے ساتھ سمرقند کے نزدیک نوروز میں مقیم تھے۔ ہمارے پاس اچھے برے ملا کر کل دو سو چالیس افراد ہوں گے۔

تمام امرا اور جوانوں سے مشورہ کیا گیا۔ اس بات پر اتفاق ہوا کہ شیبانی خاں نے چونکہ سمرقند پر حال ہی میں قبضہ کیا ہے اس لئے وہاں کے لوگوں میں اس سے اور اس کو وہاں کو لوگوں سے ابھی انسیت نہیں ہوئی ہوگی۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اگر کچھ کر سکتے ہیں تو ہم ہی کر سکتے ہیں۔ اگر زینے لگا کر ہم چپکے سے سمرقند پر قبضہ کر لیں تو وہاں کے ہمارے اپنے ہی ہیں۔ ان کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں ہے اگر وہ ہماری مدد نہ بھی کریں تو وہ ازبکوں کی خاطر جنگ نہ کریں گے۔ سمرقند پر قبضہ کرنے کے بعد دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔ وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا۔

اس فیصلے پر پہنچ کر، نماز ظہر کے بعد ہم یار ییلاق سے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ ہمارا بیشتر سفر رات کے وقت ہی رہا۔ آدھی رات کے وقت ہم خان یورتی میں پہنچے۔ اس رات وہاں کے لوگوں کو ہمارے آنے کی خبر ہو گئی۔ چنانچہ ہم قلعے کے نزدیک پہنچے بغیر ہی واپس خان یورتی میں آ گئے۔ جب صبح ہو گئی تو ہم نے رباط خواجہ سے ذرا نیچے اتر کر دریائے کوہک کو پار کیا اور پھر یار ییلاق پہنچ گئے۔

ایک روز قلعہ اسفندک میں کچھ اہل قبیلہ جیسے دوست ناصر نویان کوکلداش، قاسم کوکلداش، خان قلی، کریم داد، شیخ درویش، خسرو کوکلداش، میرم ناصر وغیرہ حاضر تھے اور میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے کہا آؤ اور قیاس کرو کہ اگر خدا چاہے تو ہم سمرقند پر کب قبضہ کر لیں گے؟ ان میں سے بعض نے کہا کہ بہار کے موسم میں (اس وقت خزاں کا موسم تھا) کسی نے کہا ایک مہینے میں اور بعض نے بیس چالیس دن، نویان کوکلداش نے کہا کہ ہم اسے چودہ دن میں فتح کر لیں گے۔ خداوند تعالیٰ نے اس کی بات سچ کر دکھائی اور ہم نے چودہ دن میں سمرقند پر قبضہ کر لیا۔ انہیں دنوں میں نے عجیب (ورق ۷۰) خواب دیکھا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت خواجہ عبید اللہ تشریف لائے ہیں۔ میں نے آپ کے استقبال کے لئے پیش قدمی کی۔ حضرت خواجہ صاحب تشریف فرما ہوئے۔ آپ کے سامنے دستر خوان بظاہر ذرا بے پروائی سے بچھایا گیا۔ چنانچہ اس وجہ سے آپ کے ذہن میں کوئی بات آئی۔ آپ نے میری طرف دیکھا اور اشارہ فرمایا۔ میں نے بھی اشارے سے کہا کہ اس میں میرا نہیں بلکہ قصور اس کا ہے جس نے دستر خوان بچھایا ہے۔ حضرت خواجہ عبید اللہ کو میرا یہ عذر معقول لگا۔ آپ وہاں سے اٹھے میں بھی آپ کے ساتھ وہاں سے نکل کر گھر کے دالان میں آیا۔ حضرت خواجہ نے میرا دایاں یا بایاں بازو پکڑ کر مجھے اس طرح اٹھایا کہ میرا ایک پاؤں زمین سے اٹھ گیا۔ آپ نے ترکی زبان میں فرمایا: شیخ مصلحت بردی (شیخ مصلحت نے دیا) چنانچہ اگلے چند ہی دن میں ہم نے سمرقند فتح کر لیا۔[۲]

۲۔ شیخ مصلحت کے لئے دیکھیں ۸۹۹ھ کے حالات میں نوٹ نمبر ۲۲

دوبارہ فتح سمرقند

ایک دو روز بعد ہم قلعہ اسفندک سے دسمند قلعے کی جانب روانہ ہوئے۔ (اس کے باوجود کہ ہم ایک مرتبہ سمرقند کے نواح میں پہنچ گئے اور چونکہ وہاں کے لوگوں کو ہماری آمد کی خبر ہو گئی تو واپس آ گئے۔) لیکن پھر خدا

پر بھروسہ کر کے اسی خیال کے پیش نظر نماز ظہر کے بعد دسمند سے ہم نے سمرقند پر یلغار کی۔ خواجہ ابولکارم ہمارے ساتھ تھا۔ آدھی رات کے وقت خیابان کے پل مغاک پر ہم پہنچے۔ ستر اسی عمدہ جوان ہم نے پہلے ہی الگ سے وہاں بھیج دیئے تھے۔ غار عاشقان کے سامنے انہوں نے زینے لگائے اور قلعے میں داخل ہو گئے۔ اور ان لوگوں کے سروں پر پہنچ کر جو دروازہ فیروز پر موجود تھے دروازے پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے اطلاع کیلئے ہمارے پاس آدمی بھیجا۔ کسی کو بھی اس بات کی کانوں کان خبر نہیں۔ یہاں سے دروازہ فیروزہ پر پہنچ کر انہوں نے فاضل ترخان کو پکڑ لیا۔ جو وہاں کے ترخانون میں سے نہیں بلکہ ترکستان کے سوداگر ترخانون میں سے تھا اور جس نے ترکستان میں شیبانی خاں کی خدمت کی تھی اور اس سے مراعات حاصل کی تھیں۔ انہوں نے اسے اس کے چند نوکروں کے ساتھ قتل کر ڈالا۔ اور کلہاڑے سے تالا توڑ کر دروازہ کھول دیا۔ اسی وقت دروازہ فیروزہ سے ہم اندر داخل ہو گئے۔ ابوالقاسم کوہ برا گرچہ خود تو نہیں آیا لیکن اس نے تیس چالیس ملازمین کو اپنے چھوٹے بھائی احمد قاسم کے ساتھ بھیج دیا۔ ابراہیم ترخان کے آدمیوں میں سے کوئی بھی وہاں موجود نہ تھا۔ البتہ شہر میں وارد اور خانقاہ میں داخل ہونے کے بعد اس کا برادر خورد خواجہ احمد ترخان اپنے چند نوکروں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ شہر کے لوگ ابھی محو خواب تھے دوکانداروں نے اپنی دوکانوں میں سے جھانک کر دیکھا اور مجھے پہچان کر دعائیں دینے لگے۔ تھوڑی دیر گزر جانے کے بعد شہر کے لوگوں کو خبر ہو گئی۔ ہمارے آدمیوں اور شہر کے لوگوں کی خوشی و مسّرت کے باعث عجیب کیفیت تھی۔ انہوں نے گلی اور کوچوں میں ازبکوں کو باؤلے کتوں کی طرح پتھر اور ڈنڈے مار مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا، تقریباً چار پانچ سو ازبک اسی طرح مارے گئے۔ جس وقت میں واپس آ رہا تھا اس وقت داروغہ شہر جان وفا خواجہ یحییٰ کے مکانات میں تھا۔ وہ وہاں سے فرار ہو کر شہر سے باہر نکل کر شیبانی خاں کے پاس چلا گیا۔ دروازہ فیروزہ سے داخل ہو کر میں مدرسہ و خانقاہ کی طرف روانہ ہوا اور خانقاہ کی محراب کے نیچے جا کر بیٹھ گیا۔ صبح ہوتے ہی ہر طرف ایک شور و غوغا بپا ہو گیا۔ بعض دوکانداروں اور بیوپاریوں کو جیسے ہی خبر ہوئی مسرّت و شادمانی سے سرشار دوڑے دوڑے آئے اور جو کچھ اس وقت کھانے کو موجود تھا پیش کر کے دعائیں دینے لگے (ورق ۷۱) اتنے میں خبر آئی کہ آہنی دروازے پر ازبک جنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے اسی وقت گھوڑوں پر سوار ہو کر دروازۂ آہنی کی جانب رخ کیا۔ اس وقت میرے ساتھ دس پندرہ یا بیس آدمی ہوں گے۔ چونکہ شہر تازہ تازہ فتح ہوا تھا اس لئے شہر کی اوباش ہر طرف غارت گری کا بازار گرم کئے ہوئے تھے۔

جس وقت میں وہاں پہنچا تو وہ ازبکوں کو دروازۂ آہنین سے باہر نکال چکے تھے۔ جب شیبانی خاں کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ گھبرا کر سورج نکلنے تک ڈیڑھ سو آدمیوں کو ساتھ لے کر دروازۂ آہنی پر پہنچ گیا۔ اگرچہ وہ عجیب طرح قابو میں تو آ گیا تھا لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ میرے ساتھ اس وقت آدمی بہت کم تھے۔ اس لئے کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ بھی وہاں نہ رک سکا اور جلد ہی واپس چلا گیا۔ میں وہاں سے آ کر بستان سرائے میں اترا۔ اکابر و اشراف شہر اور سربر آوردہ لوگ مجھ سے ملاقات کرنے کے لئے آئے اور مبارک باد دینے لگے۔

تقریباً گزشتہ ایک سو چالیس سال سے سمرقند ہمارے خاندان کا پائے تخت چلا آ رہا تھا۔ نہ جانے کہاں سے آن کر ایک باغی سرکش اس پر قابض ہو گیا تھا۔ جو ملک میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا خدا تعالےٰ نے اسے مجھے واپس دلوا دیا اور وہ ولایت جسے تاخت و تاراج کیا جا چکا تھا ہمارے تحت تصرف آ گئی۔

سلطان حسین مرزا نے بھی ہرات پر اسی طرح قبضہ کیا تھا۔ لیکن اندازہ شناس اور اہل انصاف پر یہ بات واضح ہے کہ یہ کام اس کام سے مختلف تھا اور ان قبضوں میں نمایاں فرق تھا۔

پہلا فرق تو یہی تھا کہ سلطان حسین نہایت آزمودہ کار اور بہت سے تجربات سے گزرا ہوا عظیم فرماں روا تھا۔

دوسرا یہ کہ اس کا مدمقابل یادگار محمد مرزا سترہ اٹھارہ سالہ نا تجربہ کار خورد سال نوجوان تھا۔

تیسرے یہ کہ امیر علی میر آخور نے جو کہ دشمن کی تمام کیفیت سے واقف اور حالات سے باخبر تھا مرزا کی جانب آدمی روانہ کئے تھے۔

چوتھے یہ کہ اس کا دشمن قلعے میں نہیں بلکہ باغ زغان میں تھا اور جس وقت سلطان حسین مرزا نے مرزا یادگار محمد اور اس سے وابستہ لوگوں کو گرفتار کیا تو اس رات وہ مستی میں سرشار تھے اور انہوں نے صرف غین دربان دروازے پر لگائے تھے۔

پانچواں فرق یہ کہ اس نے ہرات پر قبضہ پہلی دفعہ ہی میں کر لیا تھا۔ سمرقند کی فتح کے لئے جس وقت میں نے جدّ وجہد کی تھی اس وقت میری عمر انیس سال تھی۔ قطعی ناواقف، سخت ناآزمودہ وناتجربہ کار۔

دوسرے یہ کہ میرا دشمن شیبانی خاں جیسا تجربہ کار اور جہاں دیدہ اور تجربے کار آدمی تھا۔

تیسرے یہ کہ سمرقند کے لوگوں میں سے کوئی بھی اطلاع کیلئے نہیں آیا جب کہ وہاں کے لوگ دل سے تو میرے ساتھ تھے لیکن شیبانی خاں کے خوف سے کوئی شخص اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔

چوتھے یہ کہ جس وقت میں نے حملہ کیا تو دشمن قلعے میں تھا

پانچویں یہ کہ پہلی مرتبہ جب میں نے سمرقند پر قبضہ کیا تو مجھے واپس جانا پڑا دوسری مرتبہ خداوند تعالیٰ نے میرے حالات سازگار کر دیئے

یہ سب بیان کرنے سے میرا مقصد کسی کا وزن کم کرنا نہیں بلکہ امر واقعی کا بیان ہے۔ اور یہ لکھ کر میرا مقصود ہرگز یہ نہیں کہ خود کو نمایاں کروں بلکہ حقیقت کو بیان کرنا ہے۔

اس فتح کی مناسبت سے شاعروں نے تاریخیں کہی تھیں۔ ان میں سے ایک (ورق ۷۲) جو میرے ذہن میں رہ گئی وہ یہ ہے

باز گفتہ خرد کہ تاریخش

فتح بابر بہادر[5] است بدان

(عقلمندوں نے کہا کہ اس کی تاریخ "فتح بابر بہادر" سے نکلتی ہے)

سمرقند کی فتح کے بعد شاودر، سغد اور ان قلعوں کے لوگ جو قرب وجوار میں واقع تھے ایک ایک کر کے میری طرف آنا شروع ہو گئے۔ بعض قلعوں میں جہاں ازبک سردار تھے میرے خوف سے فرار ہونے لگے۔ اور بعض میں سے اہلیان قلعہ نے ازبکوں کو مار مار کر باہر نکال دیا بعض نے اپنے سرداروں کو جو قلعوں میں داروغہ تھے پکڑ لیا اور قلعوں کو مضبوط کر لیا۔

اسی اثنا میں شیبانی خاں کے اہل وعیال نیز دیگر افراد خاندان ترکستان سے آ گئے تھے۔ شیبانی خاں ابھی خواجہ دیدار اور علی آباد کے نواح میں تھا جب اس نے اہلیان قلعہ اور دیگر لوگوں کو میرا طرف دار ہوتے دیکھا تو وہ بخارا کی جانب کوچ کر گیا۔ خداوند تعالیٰ کی عنایت سے سغد اور میاں کال کے قلعے تین چار ماہ کے عرصے میں میرے پاس واپس آ گئے۔ باقی ترخان نے موقع پا کر قلعہ قرشی پر قبضہ کر لیا۔ او راس طرح خراز اور قرشی بھی ازبکوں کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ ابوالحسن مرزا کے آدمیوں نے میرو سے آ کر قراکول پر قبضہ کر لیا۔ اور اب ہمیں اپنے کاموں میں ترقی نظر آنے لگی۔

میری مائیں، شریک حیات اور دیگر افراد خاندان اندجان سے سیکڑوں پریشانیوں اور دشواریوں کے بعد اوراتیپہ پہنچ گئے تھے۔ ایک شخص کو بھیج کر انہیں سمرقند بلایا گیا۔ چند ہی دنوں میں سلطان احمد مرزا کی دختر عائشہ سلطان بیگم کے بطن سے جو میری پہلی منکوحہ بیوی تھی ایک لڑکی کی ولادت ہوئی۔ جس کا نام فخر النسا رکھا گیا۔ وہ میری پہلی اولاد تھی۔ اس وقت میری عمر انیس سال تھی۔ وہ لڑکی ایک ماہ یا چالیس دن کے اندر ہی خدا کو پیاری ہو گئی۔

۵۔ فتح بابر بہادر کے مادے سے ۹۰۵ کی تاریخ نکلتی ہے۔ یہ نشان دہی سب سے پہلے ارسکن نے کی (ے موآرس ص ۸۹ نوٹ ۲) تھیکسٹن اور اینٹ بیورج اس سلسلہ میں خاموش ہیں۔ مرزا نصیر الدین حیدر نے کہا غالباً اوپر کسی مصرعہ میں تعمیہ ہوگا (ص ۸۵)، لیکن اس کی مثال نہیں دی۔ اگر کلام کے اعداد سے تاریخ نکالتے ہوئے عدد کم ہو جائیں تو اسی کلام میں سے کسی لفظ کے عدد جمع کرنے کو تعمیہ تدخلہ اور نکالنے کو تعمیہ تخرجہ کہتے ہیں۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں مومن خان مومن کے تذکرے میں اس کا ذکر کیا ہے (ص ۳۴۷، مومن خاں مومن ص ۸۸،۸۷) ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق اس کمی یا زیادتی کو برابر کرنے کے لئے کلام میں کوئی اشارہ ہونا چاہیے (فن تاریخ گوئی، ص ۲۲) دوسرا مصرعہ "فتح بابر بہادر است بدان" ہے۔ اگر فتح بابر بہادر کے ۹۰۵ میں "است" کے الف کا ایک عدد ڈال دیں تو تاریخ ۹۰۶ ہو جاتی ہے، یا تو بابر نے خود تعمیہ تدخلہ کی طرف اشارہ نہیں کیا یا بعد کے کاتبوں نے اس کو بھلا دیا۔

سمرقند کے بعد اطراف و جوانب کے خوانین سلاطین، امرا اور سرحد نشین سرداروں سے اعانت و امداد کے لئے ایلچی بھیجے گئے۔ بعض نے اپنے تجربات کے باوجود سہل انگاری سے کام لیا۔ بعض نے اس بنا پر کہ ان کے ہاں ہر طبقہ کے لوگوں کے ساتھ گستاخیاں کی گئی تھیں۔ آئندہ کے ناخوشگوار واقعات سوچتے ہوئے تغافل سے کام لیا۔ بعض نے مدد بھیجی بھی مگر وہ ناکافی تھی۔ چنانچہ ان سب کا ذکر اگلے صفحات پر مناسب جگہ پر کیا جائے گا۔

جس وقت سمرقند پر دوسری مرتبہ قبضہ ہوا، علی شیر بیگ زندہ تھا۔ ایک مرتبہ اس کا خط بھی آیا۔ اور میں نے اسے ایک خط کی پشت پر ایک شعر جو ترکی زبان میں کہا تھا، لکھ کر روانہ کیا۔ اس کا جواب آنے تک فتنہ و غوغا برپا ہو گیا۔ شیبانی خاں نے جب سمرقند پر قبضہ کیا تھا اس نے ملا بنائی کو ملازم رکھ لیا تھا۔ وہ کچھ عرصے اس کے ساتھ رہا تھا کہ اس شہر پر میرا قبضہ ہو گیا۔ شیخ (ملا بنائی) چند روز بعد آیا۔ لیکن قاسم بیگ اس سے بدگمان ہو چکا تھا۔ اس نے شہر کی جانب آنے کی اسے اجازت نہیں دی۔ لیکن چونکہ اہل فضل و دانش میں اس کا شمار ہوتا تھا اور اس سے کوئی قصور بھی سرزد نہیں ہوا تھا اس لئے اسے سمرقند بلایا گیا۔ ہمیشہ قصیدہ و غزل کہہ کر میری خدمت میں پیش کرتا تھا۔ اس نے نوا کی طرز پر ایک قطعہ مجھے پیش کیا۔ اسی عرصے میں اس نے ایک رباعی بھی پیش کی:

نی غلہ مراکز و توانم نوشید
نی مہمل غلہ تاتوانم پوشید
ان راکہ خوردنست ونی پوشیدن
درعلم و ہنر کجا تواند کوشید

(ورق ۷۳)

(نہ میرے پاس اتنا غلہ ہے (جسے فروخت کر کے) خورد ونوش کا سامان فراہم کروں۔ نہ اتنا (اضافی اناج جسے بیچ کر) پہننے کا سامان مہیا کروں۔ جس کے پاس نہ کھانے کو روٹی ہے اور نہ پہننے کو کپڑا، وہ علم و ہنر کے میدان میں کیا کوشش کر سکتا ہے)

میں اس زمانے میں ایک دو بیت کہہ لیا کرتا تھا۔ لیکن کبھی غزل مکمل نہیں کہی تھی۔ میں نے ترکی میں ایک رباعی کہی اور اس کے پاس بھیج دی۔

ایشلار باری کو نکلو نکداکی دیک بولغوسی دور
انعام و وظیفہ باری بویرو لغوسی دور
اول غلہ و مہمل کہ دیب ایر دینگ بیلدم
مہمل غہ بویی و غلہ دین اوی تولغو سی دور

(تیرے دل کی خواہش پوری ہوگی انعام و وظیفہ کا حکم صادر کیا جائے گا مجھے معلوم ہے کہ غلّے کی طرح پر ہی تو شعر کہے گا تجھے اور تیرے اہل خانہ کو غلہ ضرور ملے گا)

اس کے بعد ملا بنائی نے اس رباعی کے پہلے مصرع کے قافیہ کو ردیف بنا کر اس پر مزید قافیہ لگا کر ایک اور رباعی کہی اور میری خدمت میں پیش کی۔

میرزا کہ شاہ بحر و بر بولغوسی دور
عالم داہنر بیرلہ سمر بولغوسی دور
بیر مہمل اوجون مونچہ عنایت بولدی
معقول اگر دیسام لی لار بولغوسی دور

(بادشاہی مرزا کی بحر و بر میں ہوگی | اسکا ہنر و فن عالم کی داستاں ہوگی
اگر مہمل الفاظ پر ایسے انعام ملے | معقول اشعار پر کیا کیا نہ عنایت ہوگی؟)

ان ہی دنوں شہر سبز سے ابوالبرکہ فراقی سمرقند وارد ہوا۔ اس نے کہا کہ تم کو اسی قافیہ میں رباعی کہنا چاہیے تھی۔ چنانچہ خواجہ ابوالبرکہ نے یہ رباعی کہی:

بوجور کہ قیلیدی دور سورر لغوسی دور　　سلطان کرم بوعذرنی قولغوسی دور
تو کولکان اگرچہ تو لماسااِی ساقی　　تو کولکانیمز ہو دور دا تو لغوسی دور

(ہمارے ساتھ جو بھی ناانصافی ہوئی ہوگی، ان شکایات پر سلطان کا جود و کرم ہوگا، ساقی اگرچہ ہمارا پیالہ ابھی خالی ہے اس نئے دور میں یہ لبالب بھرا ہوگا)

اس موسم سرما میں ہمارے کام ترقی پذیر تھے اور شیبانی خاں کے کام زوال پذیر تھے۔ اس عرصے میں ایک دو کام خراب بھی ہوئے۔ جو لوگ مرو سے آئے تھے انہوں نے قراکول پر قبضہ کر لیا مگر وہ اسے اپنے تحت رکھ نہ سکے اور یہ دوبارہ ازبکوں کے پاس چلا گیا۔ احمد خاں ترخان نے قلعہ دبوسی اپنے برادر خورد ابراہیم ترخان کے سپرد کر دیا تھا۔ شیبانی خاں نے وہاں پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ جب تک ہم لشکر جمع کریں اور جنگ کرنے کے قابل ہوں وہ قلعے پر قابض ہو گیا اور لوگوں کا قتل عام کر ڈالا۔

جس وقت میں نے سمرقند پر قبضہ کیا اس وقت میرے ہمراہ کل دو سو چالیس آدمی تھے۔ لیکن خداوند تعالیٰ کی عنایت سے پانچ چھ ماہ کے عرصے میں سپاہ کی تعداد اتنی ہو گئی کہ شیبانی خاں جیسے دشمن سے میں نے صف بستہ ہو کر جنگ کی۔ اس کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔ اطراف و جوانب اور خاں کی طرف سے ایوب بیگ چک میرک قشقہ، محمود بیگ تقریباً چار پانچ سو آدمی لے کر آئے۔ جہانگیر مرزا کی طرف سے تنبل کا چھوٹا بھائی خلیل دو سو آدمیوں کے ساتھ آیا۔ لیکن سلطان حسین مرزا جیسے تجربہ کار بادشاہ، جو شیبانی خاں کے بارے میں جانتا تھا، کی طرف سے کوئی نہیں آیا۔ بدیع الزماں مرزا کی جانب سے بھی کوئی نہیں آیا۔ خسرو شاہ جس نے میرے خاندان کو چونکہ سخت اذیت پہنچائی تھی اس لئے اس نے خدشے کی بنا پر اپنے کسی آدمی کو نہیں بھیجا اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اس پر ہمارا خوف غالب تھا۔

جنگ سرپل

ماہ شوال میں شیبانی خاں کے ساتھ جنگ کے ارادے سے ہم نے سفر اختیار کیا۔ اور ہم باغ نو پہنچے۔ لشکر کے جمع ہونے کے پیش نظر اور جنگ کی تیاری کی خاطر ہم پانچ چھ روز تک باغ نو میں مقیم رہے۔ وہاں سے روانہ ہو کر کوچ در کوچ آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ سرپل پار کر کے قیام پذیر ہوئے۔ لشکر گاہ کے گرد خندق اور درختوں کے تنے لگا کر اس کو مضبوط کیا۔ اس طرف سے شیبانی خاں آگے بڑھا اور خواجہ کاروزن کے نواح میں اس نے قیام کیا۔ ہمارے اور اس کے درمیان تقریباً ایک فرسنگ کا فاصلہ ہوگا۔ چار پانچ روز تک اسی منزل پر قیام رہا۔ ہمارے آدمیوں اور اس (شیبانی) کے سپاہیوں کے درمیان ہر روز لڑائی ہوتی اور ایک دوسرے پر گھوڑے دوڑا کر وار بھی کرتے تھے۔ ایک روز غنیم کے سپاہی ذرا زیادہ آگے آ گئے۔ دونوں کے درمیان خوب لڑائی ہوئی مگر میدان کوئی بھی سر نہ کر سکا۔ ہم میں سے ایک علمدار نے ذرا سی لغزش کی اور بھاگ کر کر خندق میں پناہ لی۔ (ورق ۷۴ب)
بعض نے کہا کہ یہ علم سیّدی قرا بیگ کا ہے۔ سیّدی قرا اگرچہ اپنے قول کا پکا اور خوش بیان آدمی تھا مگر تلوار کا دھنی نہ تھا۔ اسی عرصے میں ایک مرتبہ شیبانی خاں نے شبخوں مارا مگر چونکہ لشکر گاہ کو درختوں کے تنوں اور خندق بنا کر محکم کر دیا گیا تھا اسی لئے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔ خندق پر آ کر چند نعرے لگا کر اور تیر برسا کر واپس چلا گیا۔

اب جنگی امور میں میں نے پوری توجہ دی اور اس کا مکمل اہتمام کیا۔ قنبر علی بھی اپنی جگہ کوشاں رہا۔ باقی ترخان اپنے ہزار دو ہزار آدمیوں کو لے کر کش میں قیام پذیر ہوا۔ اور دو روز بعد وہ ہمارے ہمراہ آ گیا۔ محمد دوغلت مرزا بھی میرے خاں دادا کے پاس سے میری مدد کے لئے اپنے ساتھ پندرہ سو آدمی لے کر پہنچ گیا اور

تقریباً چار فرسنگ دور دیول نامی مقام پر قیام کیا اور اگلے روز صبح ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ یہ سب موقع و محل دیکھ کر ہم نے جنگ کرنے میں عجلت کی۔

به تندی سبک دست بردن به تیغ
به دندان گزد پشت دست دریغ

(جلدی میں پھرتی سے تلوار کو ہاتھ لگانا (گویا) اپنے ہاتھ کی پشت کو افسوس کے ساتھ دانتوں سے کاٹنا ہے)

میں یہ اہتمام اس بنا پر کر رہا تھا کہ جنگ کے دن ہشت نجوم[۶] دونوں لشکروں کے بیچ میں تھا۔ اگر وہ دن بیت جاتا تو یہ ستارے تیرہ چودہ دن تک دشمن کی پیچھے رہتے اس طرح کی سوچ بالکل بے کار تھی اور ہم نے بلاوجہ جلدی کی۔ جنگی لباس اور گھوڑوں کو تیار کر کے ہم نے صبح جلدی ہی کوچ کیا۔ ہم نے برانغار، جوانغار، قول اور ہراول پروں کو مرتب کر کے رزم گاہ کی جانب رخ کیا۔ برانغار میں ابراہیم سارو، ابراہیم جانی، ابوالقاسم کوہ بر نیز دیگر امرا تھے۔ جوانغار میں محمد مزید ترخان، ابراہیم ترخان، سمرقند کے دیگر امرا نیز سلطان حسین ارغون، قرابرلاس، پیر احمد اور خواجہ حسین شامل تھے۔ قول میں قاسم بیگ اور بعض میرے نزدیکی قرابت دار تھے۔ ہراول میں جن لوگوں کے نام درج کئے گئے تھے ان میں قنبر علی سلاخ، بندہ علی، خواجہ علی، میرم شاہ قوچین، سید قاسم، ایشک آغا، بندہ علی کا برادر خورد خالدار، قوچ بیگ، قاسم بیگ کا لڑکا حیدر قاسم جیسے عمدہ جوان اور باقی میرے نزدیکی قربت دار شامل تھے۔

ہم خود کو مرتب کر کے آگے بڑھے۔ دشمن بھی خود کو آراستہ کر کے سامنے سے نمودار ہوا۔ اس کے برانغار میں محمود سلطان، جانی بیگ اور سلطان تیمور تھے۔ جوانغار میں حمزہ سلطان، مہدی سلطان اور بعض دیگر سلاطین موجود تھے۔ جیسے ہی دونوں فوجیں ایک دوسرے کے نزدیک ہوئیں تو غنیم کا برانغار ہماری فوج کے بالکل عقب میں چلا گیا۔ میں نے بھی اس کی جانب اپنا رخ کیا۔ تجربہ کار جنگ آزمودہ اور تلوار کے دھنی سپاہی اور عمدہ جوان جو ہم نے ہراول میں رکھے تھے وہ سب دائیں جانب رہ گئے۔ ہمارے سامنے کوئی بھی نہ تھا۔ اس کے باوجود جو سامنے سے حملہ آور ہوئے انہیں ہم نے اتنا مارا کہ انہیں قول میں ہی واپس جانا پڑا۔ چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ شیبانی خاں کے بعض عمر رسیدہ سردار پکار اٹھے کہ شیبانی خاں کو اب چل دینا چاہئے۔ مقابلہ کرنے کا وقت بیت گیا مگر وہ اپنی جگہ قائم رہا۔ غنیم کے برانغار نے ہمارے جوانغار کو زیر کر کے پیچھے سے ہم پر حملہ کیا۔ ہمارا ہراول دستہ دائیں رہ گیا۔ اب ہمارے سامنے کا میدان خالی تھا۔ چنانچہ دشمن کے آدمیوں نے آگے اور پیچھے سے شدت کے ساتھ تیروں کی بارش شروع کر دی۔ لشکر مغل جو مدد کے لئے آیا تھا اس کے سپاہیوں میں جنگ کرنے کی ہمت نہ تھی (ورق ۵ ۷) انہوں نے جنگ کا ارادہ تو ترک کر دیا البتہ لوگوں کو لوٹنے اور انہیں گھوڑوں سے اتارنے لگے۔ یہ پہلی مرتبہ نہ تھا ان بدبخت مغلوں کی ہمیشہ سے یہی عادت رہی ہے۔ اگر وہ دشمن کو زیر کر لیتے تو ان سے مال غنیمت چھین لیتے ہیں اور اگر اپنے سردار شکست کھائیں تو اپنے ہی لوگوں پر ہاتھ صاف کر دیتے ہیں۔

دشمن کے وہ سپاہی جو سامنے سے ہم پر حملہ آور ہوئے تھے ہم نے کئی مرتبہ انہیں پوری طاقت سے پسپا کیا مگر اس کے باوجود وہ سامنے کے رخ سے پوری قوت سے حملہ کرتے رہے۔ دشمن کے وہ سپاہی جو ہمارے لشکر کے عقب میں پہنچ گئے تھے آگے بڑھے اور انہوں نے ہمارے پرچم پر تیروں کی بارش شروع کر دی اور پورا زور لگا کر ہم پر آگے اور پیچھے سے حملہ کر دیا۔ جس کے باعث ہماری سپاہ کے پیر اکھڑ گئے۔

جنگ میں ازبکوں کا یہ ایک اچھا حربہ ہے کہ وہ ہمیشہ آگے اور پیچھے سے حملہ آور ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کی کوئی جنگ ایسی نہیں ہوتی جس میں وہ یہ حربہ استعمال نہ کرتے ہوں۔ ان کا دوسرا حربہ یہ ہے کہ نوکر و آقا جب آگے اور پیچھے سے بڑھتے ہیں تو تیر چلاتے ہوئے آتے ہیں اور اپنے گھوڑوں کی زین ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں اور جب واپس جاتے ہیں تو باقاعدہ ایک ساتھ واپس ہوتے ہیں۔

۶۔ ہشت نجوم۔ یہ آٹھ ستاروں کا سنگم اگر فوج کے پیچھے ہو تو جنگ میں فتح کے لئے مبارک سمجھا جاتا ہے۔
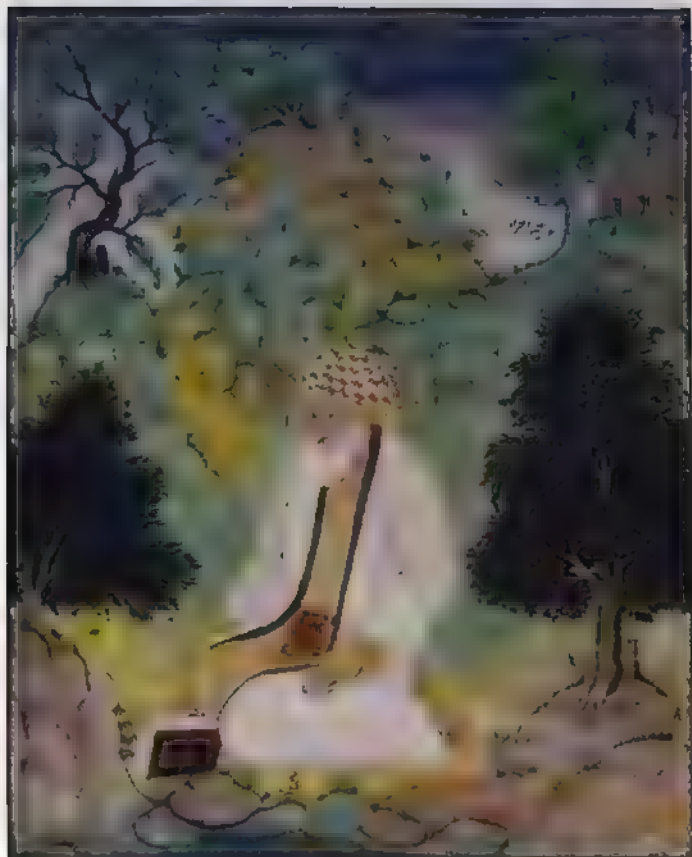
خواجہ عبیداللہ احرار۔ (برٹش لائبریری ۰۱۰-۶۱۷-۱۹۷۴)

بابر نے کئی جگہ تپچاق گھوڑے کا ذکر کیا ہے۔ یہ عمدہ نسل کا اور اعلیٰ تربیت یافتہ گھوڑا ہے

(وکٹوریہ البرٹ میوزیم ۲۶۹۴۳-۰-وی)

میرے ساتھ دس پندرہ آدمی رہ گئے تھے۔ دریائے کوہک قریب ہی تھا ہمارے برانغار کا آخری پرہ دریا تک پہنچ گیا تھا۔ ہم دریا کی جانب بڑھتے گئے اور دریا پر پہنچتے ہی ہم آستین زرہ پوش اپنے گھوڑوں پر سوار پانی میں اتر گئے۔ دریا آدھے سے زیادہ پایاب تھا۔ اس سے آگے اتنا پانی تھا کہ آدمی ڈوب جائے تقریباً ایک گز کی گہرائی ہوگی۔ چنانچہ ہم گھوڑوں کو تیراتے ہوئے پار اتر گئے۔ دریا سے باہر آکر ہم نے گھوڑوں پر سے زرہ اتار پھینکے اور انہیں زمین پر لوٹ لگانے کے لئے چھوڑ دیا۔ دریا پار کر کے ہم شمال کی جانب پہنچے دشمن سے تو ہمیں نجات مل گئی مگر اب بھی راستے میں یہ غارت گر اور کپڑے اتار لینے والے منحوس مغل ایک ایک دو دو کر کے مل جاتے۔ چنانچہ ابراہیم ترخان اور دیگر عمدہ جوانوں کو مغلوں نے لوٹ کر اور انہیں گھوڑوں سے اتار کر قتل کر دیا۔ دریائے کوہک کے شمال میں پہنچ کر قلبہ نامی جگہ کے نواح میں دریائے کوہک کو اپنے پیچھے چھوڑتے ہوئے دو غاروں کے درمیان دروازہ شیخ زادہ سے ہم قلعے میں داخل ہو گئے۔

اس جنگ میں بڑے بڑے امیر، عمدہ جوان اور کثیر تعداد میں لوگ مارے گئے۔ ابراہیم ترخان، ابراہیم سارو اور ابراہیم جانی اسی جنگ میں کام آئے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس جنگ میں تین ابراہیم نامی اپنی جان سے گئے۔ قاسم بیگ کا بڑا لڑکا حیدر ابوالقاسم کوہ بر، خدابردی طغاچی اور سلطان احمد تنبل کا بھائی خلیل جس کا ذکر اس سے پہلے کئی جگہ ہو چکا ہے اسی جنگ میں کھیت رہے۔ بعض امرا جدھر بھی منہ اٹھا نکل گئے۔ فرار ہونے والوں میں محمد مزید ترخان خسرو شاہ کی طرف حصار چلا گیا۔ قنبر علی سلاخ مغل جس نے مجھ سے بہت سے مراعات حاصل کی تھیں، نے اس قدر مراعات حاصل کرنے کے باوجود ایسے آڑے وقت میں ہمارا ساتھ نہ دیا۔ وہ ہمارے پاس سمرقند سے خسرو شاہ کے پاس چلا گیا۔ میرے دیگر قرابت داروں اور جوانوں میں کریم داد، خداداد ترکمان، جانکہ کوکلتاش اور ملا بابا پشاغری جیسے امیر اوراتیپہ کی طرف نکل گئے۔ اگرچہ اس وقت ملا بابا ہمارا ملازم نہ تھا بلکہ مہمانوں کی طرح تھا۔

امرا میں شریم طغائی اور اس کا دستہ میری والدہ کے ہمراہ سمرقند سے آیا، صلاح و مشورے میں میرا شریک رہا، اپنے مردہ و زندہ قرابت داروں کو قلعہ سمرقند میں دیکھا، قلعہ محکم کرنے میں اس نے میرا ساتھ دیا مگر اس کے باوجود میری ماں اور بہنیں تو قلعہ سمرقند میں ہی رہیں اور اس نے اپنے اہل و عیال اور دیگر لوگوں کو وہاں سے نکال کر اوراتیپہ پہنچا دیا اور صرف چند ساتھیوں کے ساتھ قلعے میں رہا۔ (ورق ۷۶) صرف یہی ایک واقعہ نہیں بلکہ وہ ہمیشہ جب بھی سخت وقت پڑا، اسی طرح کی خود غرضی، کم ہمتی اور نااتفاقی کی حرکات کرتا رہا ہے۔

سمرقند میں محصور

اگلے دن صبح میں نے خواجہ ابوالمکارم، قاسم بیگ، تمام امیروں، قرابت داروں اور ان جوانوں کو جن پر میری بات کا اثر ہوتا تھا طلب کیا۔ انہیں جمع کر کے مشورہ کیا گیا۔ قرار یہ پایا کہ قلعے کو محکم کیا جائے اور خواہ زندہ رہیں یا مر جائیں مگر قلعے میں ہی رہیں۔ اس مصلحت کے پیش نظر میں نے قاسم بیگ کے ساتھ مل کر دیگر قرابت داروں اور جوانوں کی مدد سے شہر کے درمیان مدرسہ الغ بیگ کی محراب پر سفید خیمہ نصب کروا دیا۔ اور ہم وہاں مقیم ہو گئے۔ دیگر امرا اور جوانوں کے درمیان دروازوں اور قلعے کے ارد گرد فصیل و مورچوں کو قائم کیا گیا۔ دو تین دن بعد شیبانی خاں وہاں پہنچ گیا اور قلعے سے ذرا دور مقیم ہوا۔ سمرقند کی گلی گلی اور کوچے کوچے سے چھیلے، بانکے اور اوباش پرے کے پرے بنا کر اور با آواز بلند صلواۃ پڑھتے ہوئے مدرسے کے دروازے پر جنگ و پیکار کی نیت سے جمع ہونے لگے۔ اگرچہ شیبانی خاں جنگ کے ارادے سے سوار تو ہوتا لیکن فصیل کے نزدیک آنے کی اس میں ہمت نہ ہوتی۔ چند دن اسی طور سے گزر گئے۔ ان چھیلوں، بانکوں اور اوباشوں نے چونکہ میدان کارزار نہیں دیکھا تھا اور تیر و شمشیر کے زخم نہیں کھائے تھے اُس کی اس حرکت سے دلیر ہو کر اپنے جتھے بنا کر جمع

ہونے لگے۔ تجربہ کار و جنگ آزمودہ جوان اس طرح انہیں آگے آنے سے روکتے، یہ ان پر طعن تشنیع کرتے ایک روز جب شیبانی خان نے دروازۂ آہنی پر جنگ کی تو یہ بانکے چونکہ نڈر ہو چکے تھے ہمیشہ کی طرح جیدار بن کر جتھوں میں جمع ہونے لگے چنانچہ ان کے پیچھے بعض گھڑ سوار جوانوں کو بھیجا گیا۔ ملازمین خاص، مقربین اور کچھ کوکو کلداش جیسے نویان کوکلداش، قل نظر، طغایی بیگ اور مزید جیسے قرابت دار اشتر گردن[7] پر پہنچ گئے اس طرف سے دو تین ازبک گھوڑے دوڑاتے ہوئے ان کے سر پر آن پہنچے۔ چنانچہ قل نظر کے ساتھ ان کی تلواریں بھی کھنچ گئیں جو ازبک وہاں تھے انہوں نے اپنے گھوڑوں سے اتر کر ان اوباشوں پر زور آزمائی شروع کر دی جس کے باعث شہر کے جتنے بھی اوباش تھے سب کو دھکیل کر انہوں نے آہنی دروازے کے اندر تک پہنچا دیا۔ قوچ بیگ اور میر شاہ قوچین خواجہ خضر مسجد[8] کے نزدیک اپنے گھوڑوں سے اتر کر وہیں اپنی جگہ قائم رہے۔ پیادوں کو اپنی راہ سے ہٹا کر چند گھڑ سوار ان کے سامنے مسجد خواجہ خضر پر پہنچ گئے۔ ان میں قوچ بیگ نے سب سے آگے بڑھ کر حملہ کیا اور نمایاں رہا جن لوگوں کو فرار ہونا تھا وہ بے تحاشا بھاگنے میں لگ گئے۔

اب کام تیر اندازی اور نبرد آزمائی سے گزر چکا تھا میں دروزے کے اوپر سے ناوک کمان[9] چلا رہا تھا اور میرے نزدیک جو تھے وہ بھی تیر اندازی کر رہے تھے۔ ہماری تیر اندازی کو دیکھ کر ان میں مسجد خواجہ خضر سے آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی چنانچہ وہ وہیں سے واپس چلے گئے۔

جن دنوں محاصرہ جاری تھا ہم ہر رات قلعے کی فصیل پر گشت لگاتے۔ اس گشت پر کبھی میں چلا جاتا کبھی قاسم بیگ، کبھی بعض امرا اور بعض مرتبہ میرے قرابت دار۔ فیروزہ دروازہ سے شیخ زادہ دروازہ تک فصیل پر ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر گشت لگا سکتے تھے۔ دوسری جگہوں پر پیدل گشت کرتے۔ ایک ہی گشت میں اول شب سے صبح نمودار ہو جاتی۔

ایک دن شیبانی خاں نے (ورق ۷۷) آہنی دروازہ اور دروازہ شیخ زادہ کے درمیان حملہ کیا۔ میں چونکہ محفوظ سپاہیوں میں تھا اسی لئے جیسے ہی جنگ شروع ہوئی میں دروازہ گازرستان اور دروازہ سوزن گران کی پروا کئے بغیر وہاں پہنچ گیا۔ اس روز دروازہ شیخ زادہ پر میں نے ناوک کمان چلا کر ایک سفید گھوڑے کو نشانہ بنایا جیسے ہی اس کے تیر لگا وہ وہیں ختم ہو گیا۔ اس روز دشمنوں نے اس قدر زور آزمائی کی کہ اشتر گردن کے نواح میں وہ فصیل کے نیچے تک پہنچ گئے۔ ہم اس طرف تو جنگ و جدال میں لگے رہے مگر دوسری طرف سے بالکل ہی غافل ہو گئے۔ انہوں نے پہلے سے ہی پچیس چھبیس سیڑھیاں تیار کر رکھی تھی اور سیڑھیاں بھی اتنی چوڑی کہ دو تین آدمی برابر ان پر ایک ساتھ چڑھ سکتے تھے۔ انہوں نے دروازہ گازارستان اور سوزن گران کے درمیان سامنے کی طرف ان سیڑھیوں کے ساتھ سات آٹھ سو جوان چھپا کر بٹھا رکھے تھے شیبانی خاں خود تو ادھر آ کر بر سر جنگ و پیکار تھا اور ہمارے تمام آدمی اسی طرف جنگ میں لگے ہوئے تھے۔ چنانچہ جن جگہوں پر ہمارے مورچے خالی تھے وہاں یہ جوان چھپے ہوئے تیزی کے ساتھ نکل کر باہر آئے اور انہوں نے مذکورہ بالا دروازوں کے درمیان محمد مزید ترخان کی حویلی کے سامنے سیڑھیاں لگا کر فصیل کے اندر داخل ہو گئے۔ یہاں قوچ بیگ اور محمد قلی قوچین کا مورچہ تھا جن کے ساتھ جوانوں کا دستہ بھی تھا۔ یہ جوان اس وقت محمد مزید ترخاں کی حویلی میں تھے۔ دروازہ سوزن گراں پر قرا برالاس کا مورچہ تھا دروازہ گازرستان شیرم طغایی اپنے بھائیوں اور کوکلداش قتلق خواجہ کے ساتھ مورچہ لگائے ہوئے تھا۔ جس وقت دوسری جانب سے حملہ ہوا اس وقت لوگ منتشر ہو کر اپنے کاموں اور دیگر امور کے لئے گھروں اور بازار کی جانب جا چکے تھے۔ مورچوں پر متعین امیر دو تین نوکروں اور غلاموں کے ساتھ رہ گئے تھے۔ قوچ بیگ، محمد قلی قوچین، شاہ صوفی اور ایک جوان نے خوب مردانگی کے جوہر دکھائے۔ دشمن کے بعض آدمی فصیل پر چڑھ آئے تھے اور باقی آیا ہی چاہتے تھے کہ ان چاروں افراد نے دوڑ کر ان کے ساتھ خوب جم کر لڑائی کی اور مار

۷۔ اشتر گردن (اونٹ کی گردن) اس مقام کو کہتے ہیں جہاں پانی نیچے سے اوپر چڑھے اور دوسری طرف رواں ہو جائے۔ یہ اب سمرقند میں موجود نہیں۔

اشتر گردن دلی کے قلعہ میں بھی تھی۔ وہاں اس کو شتر گلو کہتے تھے (نصیر الدین حیدر ص ۹۰) یہ ایک کاریز ہوتی ہے۔ کیونکہ پانی پہاڑوں کی اونچائی سے لایا جاتا ہے اس لئے اوپر چڑھ سکتا ہے۔ اب یہ دلی کے قلعہ میں بھی نہیں رہی۔

ارسکن (ص ۹۵)، اینٹ بیورج (ص ۱۳۲) اور نصیر الدین حیدر (ص ۹۰) کے برخلاف ٹھیکسٹن (ص ۱۲۷) نے اس کو شتر باغ بنا دیا ہے۔ لیکن اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی۔

۸۔ مسجد خواجہ خضر۔ یہ مسجد سمرقند میں اب بھی موجود ہے۔ حضرت قثم بن عباس کے مزار کے سامنے ہے۔ ان دونوں کے بیچ میں اب ایک سڑک گزرتی ہے۔ خضر سبز کو کہتے ہیں خواجہ خضر ایک روایتی بزرگ ہیں۔ قرآن میں بھی ان کا ذکر آیا ہے (الکھف ۱۸: ۶۰۔۸۲) اسلامی، تاریخی، شاعری اور مذہبی کتابوں میں جگہ جگہ ان کا تذکرہ ہے۔ ذوق کا ایک شعر ہے۔

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

(ذوق ایک مطالعہ ص ۸۷)

حضرت خضر کی عمر روایتوں میں بہت لمبی ہے۔ یہ لوگوں کو راستہ بتاتے ہیں۔ بھولوں بھٹکوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔

مسجد خضر سمرقند اپنے محل وقوع کی وجہ سے سمرقند آنے جانے والوں کے لئے راہ نما ہوا کرتی تھی۔ اس لئے ہی یہ اس نام سے مشہور ہو گئی۔ اس کی بنیاد میں چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) کی اینٹیں ملی ہیں۔ اب جو مسجد ہے اس کی عمارت ۱۸۲۳ء کی بنی ہوئی ہے۔

۹۔ ناوک کمان کی تفصیل کے لئے ۹۰۰ھ کے حالات میں نوٹ نمبر ۱۰ دیکھیں

مومن کا یہ شعر ناوک کے کاری ہونے کی دلالت کرتا ہے۔

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے، کئی بے جاں ہوں گے

(مومن خان مومن ص ۱۰۳)

مار کران کو ایسا سدھا کر دیا کہ انہیں قلعے سے اترتے اور بھاگتے ہی بن پڑی۔ ان میں قوچ بیگ نے سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اس کے نمایاں کاموں میں سے ایک پسندیدہ کام یہ تھا کہ اس محاصرے کے دوران وہ دو مرتبہ مشکل میں پڑا اور کامیابی سے نکل گیا۔ قرابرلاس بھی مورچہ سوزن گراں میں تنہا رہ گیا تھا۔ وہ بھی خوب اپنی جگہ قائم رہا۔ قتلق خواجہ کوکلداش اور قل نظر مرزا اپنے مورچہ پر دروازہ گازارستان میں تھے۔ انہوں نے بھی آدمیوں کی کمی کے باوجود خوب مقابلہ کیا اور دشمن کے ساتھ ان کی اچھی چھڑپ رہی۔ ایک مرتبہ تو قاسم بیگ جوانوں کو سر کرتا ہوا دروازہ سوزن گراں سے باہر نکل آیا اور خواجہ کفشیر[10] تک اس نے ازبکوں کا تعاقب کیا۔ چند ازبکوں کو تو اس نے گھوڑوں پر سے اتار دیا اور ان کے سر کاٹ کر اپنے ساتھ لایا۔

اب فصل کے پکنے کا وقت آ گیا تھا۔ اور ابھی تک کوئی بھی کسان نیا اناج شہر میں نہیں لایا تھا۔ محاصرے کا زمانہ طویل ہو چلا تھا۔ جس کے باعث لوگ سخت مشکلات سے دوچار تھے۔ نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ غریب آدمی کتے اور گدھے کی گوشت پر گزر بسر کرنے لگے۔ گھوڑوں کو بھی دانہ کم مل رہا تھا۔ انہیں درختوں کے پتے کھلائے جا رہے تھے۔ یہیں سے یہ تجربہ حاصل ہوا کہ شہتوت اور قرایغاچ[11] کے پتے گھوڑوں کے لئے زیادہ مفید و سازگار ہوتے ہیں۔ بعض لوگ سوکھی لکڑیوں کو گیلا کر کے اور اس کی چھلن کو پانی میں بھگو کر گھوڑوں کو دے رہے تھے۔ تین چار ماہ تک شیبانی خاں قلعے کے نزدیک نہ آیا۔ وہ بس دور ہی سے قلعے کے گرد چکر لگاتا اور ایک منزل سے دوسری منزل منتقل ہوتا رہا۔ ایک شب اس وقت جب کہ لوگ غافل تھے آدھی رات کے قریب وہ فیروزہ دروازے کی طرف سے نمودار ہوا اور نقارے بجا بجا کر حملہ کرنے کا اظہار کیا اس وقت میں مدرسہ میں تھا۔ عجیب تردّد خوف کی کیفیت تھی۔ اس کے بعد بھی ہر رات اس کے سپاہی آتے، نقارے بجاتے اور حملہ کا بہانہ بناتے۔ ہر چند اطراف و جوانب میں ایلچی اور آدمی بھیجے مگر کوئی شخص مدد کو نہ آیا۔ جس وقت میں طاقت ور تھا اور کسی قسم کی شکست و ریخت کی نوبت نہیں آئی تھی اس وقت کوئی میری مدد کو نہ آیا تو بھلا اس وقت کیا امید کی جا سکتی تھی۔ ان حالات کے تحت محاصرے کو جاری رکھنا بے موقع نظر آتا تھا۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ قلعہ داری کے لئے ایک سر دو ہاتھ اور دو ٹانگیں ضروری ہیں سر سردار ہے دونوں ہاتھ کمک جو دو طرف سے آتے ہیں اور دونوں ٹانگیں پانی اور خوراک کا وہ ذخیرہ ہیں جو شہر میں ہو۔ جو لوگ ہمارے اطراف و جوانب میں تھے اور ہم ان سے مدد کی آس لگائے ہوئے تھے وہ کسی اور ہی خیال میں مگن تھے۔ سلطان حسین مرزا جیسا جوانمرد اور تجربہ کار فرمانروا ہماری مدد کو نہ آیا اور ایلچی بھیج کر ہماری دلداری تک نہ کی بلکہ اس نے کمال الدین حسین گزرگاہی کو شیبانی خاں کے پاس محاصرے کے دوران ایلچی بنا کر بھیجا۔

تنبل فرغنہ میں

تنبل اندجان کے نواح سے بیش کنت کے نواح میں پہنچ چکا تھا۔ خاں کو احمد بیگ اور اس کے دستے کے لوگوں نے اس سے مقابلہ کے لئے بھیج دیا۔ لک لکان کے نواح میں توراک نامی چار باغ میں دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہوئے۔ اس سے قبل کہ ان کے درمیان جنگ کی نوبت آئے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ سلطان محمود خان مرد کارزار نہ تھا اور آداب سپاہ گری سے سخت بیگانہ۔ جس وقت وہ تنبل کے مقابلے پر آیا تو خاں کے قول و فعل سے بے دلی کے آثار نمایاں تھے۔ لیکن احمد بیگ واقعی ترک سپاہی تھا اگرچہ زبان سے نہایت ہی بدکلام تھا مگر دلیر اور حکومت کا خیر خواہ۔ وہ برملا کہتا تھا کہ آخر تنبل ہے کیا چیز جو تم لوگ اس سے اس قدر ڈرتے ہو۔ اگر تم اس کو دیکھ کر خوف کھاتے ہو تو آنکھوں پر پٹی باندھ لو پھر اس کے مقابلے میں ڈٹ جاؤں۔

۱۰۔ خواجہ کفشیر۔ اس محلّہ میں خواجہ عبیداللہ احرار کا مزار و مسجد ہے جو عثمان یوسوپو شاہراہ پر واقعہ ہے۔ یہ شہر سمرقند کا جنوبی علاقہ ہے۔

۱۱۔ قرایغاچ۔ اس درخت کو انگریزی میں ایلم اور سائنس کی زبان میں فریگزلینس کہتے ہیں۔ یہ سالہا سال چلتا ہے اس کا ایک بڑا درخت مسجد حضرت امام شہر سبز میں دیکھا۔ یہ مسجد و درخت عبداللہ خان دوم (۹۹۱۔۱۰۰۷/۱۵۸۳۔۱۵۹۸ء) کہ جس نے شہر سبز کو تباہ کر دیا تھا کے غضب سے اس وجہ سے بچ گئے کہ اسے یہ باور کرایا گیا کہ حضرت امام یہاں دفن ہیں۔ حضرت امام آٹھویں صدی عیسوی (دوسری صدی ہجری) عراق کے بزرگ ہیں۔

واقعات ۹۰۷ھ

(۱۷ جولائی ۱۵۰۱ء ۔ ۶ جولائی ۱۵۰۲ء)

ا۔خان زادہ بیگم۔ دیکھئے واقعات ۸۹۹ھ نوٹ ۳۸

محاصرہ بہت طویل ہوگیا۔ زادراہ اور سامان رسد کسی طرف سے نہ پہنچا اور مدد بھی کسی جگہ نہ مل سکی۔ سپاہ و رعیت مایوس ہو چکی تھی۔ چنانچہ ایک ایک دو دو اشخاص قلعے سے نکل کر فرار ہونے لگے۔ شیبانی خاں کو قلعے کے لوگوں کی بدحالی کا اندازہ ہوگیا۔ چنانچہ اس نے پیشقدمی کی اور غار عاشقان کے نواح میں قیام پذیر ہوا۔ میں بھی نیچے گلی میں واقع ملک محمد مرزا کے مکانات میں اس کے مقابل پہنچ گیا۔ اسی اثنا میں اوزون حسن اور خواجہ حسن اپنے دس پندرہ ملازمین کے ہمراہ وہاں پہنچ کر قلعے میں داخل ہو گئے۔ اوزون حسن وہ شخص تھا جس نے جہانگیر مرزا کو میرے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا تھا اور اسی کے باعث مجھے سمرقند کو خیرباد کہنا پڑا تھا۔ اس کے علاوہ بھی ایسا کون سا فتنہ وفساد تھا جو اس نے بپا نہ کیا۔ ان کے آنے سے سپاہ اور اہل شہر کی تنگ دستی اور پریشانی میں مزید اضافہ ہوگیا۔ میرے قرابت دار اور معتبر آدمی فصیل پر سے کود کر فرار ہونے لگے۔ امرا میں سے دلیس شیخ اور ویس بابری فرار ہو کر فصیل سے نیچے اتر آئے۔ (ورق ۷۹) اطراف وجوانب سے ہم قطعی مایوس ہو چکے تھے اور کسی طرف سے بھی امید کی رمق باقی نہیں رہ گئی تھی۔ زاد سفر اور سامان رسد پہلے ہی کم تھا اب بالکل ہی ختم ہوگیا۔ کسی طرف سے بھی زادراہ اور رسد کا سامان نہ پہنچا۔ اس اثنا میں شیبانی خاں نے صلح وآشتی کی بات شروع کی۔ اگر کسی طرف سے مدد کی امید ہوتی اور کہیں سے سامان رسد پہنچ گیا ہوتا تو صلح کی بات پر کون کان دھرتا۔ چنانچہ وقت کا تقاضا دیکھتے ہوئے صلح کر لی گئی۔ تقریباً دو پہر رات گزر چکی تھی کہ ہم دروازہ شیخ زادہ سے باہر آئے۔

دوشنبہ میوزیم میں ایک پتھر پر کندہ اشعار

میں اپنی والدہ خانم اور دو عورتوں کے ہمراہ باہر آیا۔ ان عورتوں میں ایک بیچکا خلیفہ تھی اور دوسری منگلیک کوکلداش۔ جس وقت میں باہر نکل رہا تھا میری بڑی بہن خانزادہ اس بھگدڑ میں رہ گئیں اور شیبانی خاں کے گرفت امیں آگئیں۔ ایسی سیاہ رات میں راستہ بھٹک کر ہم سغد کی شاہ نہر کے آس پاس سرگردان رہے۔ چنانچہ سیکڑوں مشکلات کے بعد صبح کے وقت خواجہ دیدار نامی جگہ کو پار کر کے وقت نماز چاشت قار بوغ کے پشتے پر پہنچے۔ قار بوغ پشتے کے شمال میں موضع جودک کے نیچے سے گزرتے ہوئے ہم ایلان اوتی پہنچنے کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ راستے میں قنبر علی اور قاسم بیگ کے ساتھ گھڑ دوڑ ہوگئی۔ میرا گھوڑا آگے نکل گیا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ ان کے گھوڑے کتنے پیچھے رہ گئے ہیں میں نے مڑ کر انہیں دیکھا۔ اس وقت گھوڑے کا زیر بند ٹوٹ گیا اور زین پلٹ گئی اور میں سر کے بل زمین پر گرا۔ اگرچہ میں اسی وقت اٹھ کر گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ لیکن رات تک میرے ہوش وحواس قابو میں نہ آئے۔ یہ کیفیت اور گزشتہ واقعات میرے دل ودماغ سے خواب وخیال کی طرح گزر رہے تھے۔ جس وقت ہم ایلان اوتی پہنچے تو نماز ظہر کا وقت گزر چکا تھا۔ یہاں ہم نے ایک گھوڑا ذبح کیا اور اس کے گوشت کی تکہ بوٹی کر کے کباب بنائے۔ کچھ دیر گھوڑوں کو ستا کر ہم سوار ہوئے۔ صبح سے پہلے ہم خلیلہ نامی گاؤں میں پہنچ کر دزک نامی مقام پر قیام پذیر ہوئے۔ اس وقت دزک حافظ محمد بیگ دولدائی کے بیٹے طاہر دولدائی کے تحت تھا۔ یہاں انواع واقسام کے فربہ گوشت، میدے کے ارزاں ناں، شیریں خربوزے اور عمدہ انگوروں کی کثرت تھی اور ہمیں یہ نعمتیں انتہائی عسرت، تنگ دستی، اس قدر آلام اور مصائب کے بعد نصیب ہوئیں۔

وهم وعسرت تین امانی تاپتوق   یانگی جان تازه جهانی تاپتوق

(فقر وفاقہ اور تنگ دستی پر ہم نے بالآخر قابو پا ہی لیا۔ اس جہان تازہ سے ہم نے نئی زندگی حاصل کی)

ہمارے دلوں میں جو خوف تھا وہ زائل ہو گیا اور جو بھوک ختم ہو گئی تھی لوٹ آئی۔ تمام عمر میں اس قدر فراغت کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اور ساری زندگی میں کبھی امن و عافیت اور فراوانی کی قدر نہیں جانی تھی۔ عسرت کے بعد عشرت اور مشقت کے بعد راحت، بہت اچھی لگتی ہے۔ چار پانچ مرتبہ ہم اسی طرح مشقت سے راحت کی جانب اور راحت سے مشقت کی طرف منتقل ہوتے رہے ہیں۔ پہلا اتفاق اس وقت ہوا جب کہ ہم نے دشمن کی آفت اور بھوک کی مصیبت سے نجات پا کر امن وامان کی راحت اور فراوان نعمت و فراغت حاصل کی۔ تین چار دن ہم نے دزک میں آرام کیا۔ اس کے بعد اوراتیپہ کی جانب جانے کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ پشاغر عام راستے سے ذرا ہٹ کر ہے۔ چونکہ ایک عرصے تک میں وہاں رہ چکا تھا اسی لئے وہاں سے گزرتے ہوئے سیر کرنے کے ارادے سے چلا گیا۔ قلعہ پشاغر میں آتون (معلمہ) موجود تھیں جو کافی عرصے قبل میری والدہ کے پاس رہ چکی تھیں، اس مرتبہ وہ سمرقند میں رہ گئی تھیں کہ ان کے لئے سواری کا انتظام نہ ہو سکا تھا (ورق ۸۰) ان سے یہاں اچانک ملاقات ہو گئی۔ میں نے ان کا حال پوچھا معلوم ہوا کہ وہ سمرقند سے یہاں پیدل چل کر آئی تھیں۔

میری خالہ خوب نگار خانم جو عمر میں میری والدہ سے چھوٹی تھیں اس عالم فانی سے رخصت ہو گئی تھیں۔ اوراتیپہ میں مجھے اور میری والدہ کو اس سانحہ کی خبر پہنچادی گئی تھی۔ میری دادی بھی اندجان میں رحلت کر گئی تھیں۔ یہ خبر بھی میرے گوش گزار کی گئی۔ میرے نانا کی وفات کے بعد خانم نے اپنی سوتیلی ماں (شاہ بیگم) چھوٹے بھائیوں، بہنوں، سلطان محمود خاں، سلطان نگار خانم، دولت سلطان خانم وغیرہ سے تیرہ چودہ سال سے ملاقات نہیں کی تھی اسی لئے اپنے عزیز و اقارب اور بچوں سے ملنے کے لئے تاشقند کی جانب روانہ ہوئیں۔

میں نے محمد حسین سے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ اوراتیپہ کے دیہات میں سے دخکت نامی گاؤں میں سردی کا زمانہ گزارا جائے۔ اپنے اہل و عیال کو دخکت میں چھوڑ کر چند دن بعد شاہ بیگم، خاں دادا[۲] اور دیگر عزیز و اقارب سے ملنے کے لئے میں بھی تاشقند کی جانب روانہ ہوا وہاں پہنچ کر میں نے شاہ بیگم اور اپنے خاں دادا سے ملاقات کی۔ میں چند روز وہاں مقیم رہا۔ میری ماں کی سگی بڑی بہن مہر نگار خانم بھی سمرقند سے وہاں پہنچ گئیں۔ میری والدہ خانم کی طبیعت ناساز ہو گئی جس نے شدت اختیار کر لی۔ اور وہ سخت تکلیف میں مبتلا رہیں۔

حضرت خواجکا خواجہ سمرقند سے آکر فرکت میں مقیم ہو گئے۔ ان سے ملاقات کرنے کے لئے میں فرکت پہنچا۔ مجھے یہ امید تھی کہ میرے خاں دادا میرے ساتھ عنایت و رعایت کرتے ہوئے مجھے کوئی پرگنہ عنایت کر دیں گے۔ اگرچہ انہوں نے اوراتیپہ دینے کا وعدہ بھی کیا مگر محمد حسین اس راہ میں مانع رہا۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس نے یہ اقدام خود کیا یا ان کی طرف سے اسے اشارہ تھا۔

دخکت

بہر حال میں چند روز بعد دخکت واپس پہنچ گیا۔ یہ گاؤں اوراتیپہ کے پہاڑی سلسلے کے دامن میں واقع ہے اور ایک اونچے پہاڑ کے دامن پر اس جگہ بنا ہوا ہے جہاں سے یہ شروع ہوتا ہے اسی پہاڑ سے گزرتے ہی ولایت مسیحا شروع ہو جاتی ہے۔ اگرچہ یہاں کے لوگ نسل کے اعتبار سے تاجیک ہیں لیکن ترکوں کی طرح مویشی پالتے ہیں۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ اس گاؤں میں چالیس ہزار بھیڑیں ہیں۔ ہم اس گاؤں میں رعیت کے گھروں پر رکے یہاں کے چودھری کے مکان میں میرا قیام رہا۔ وہ ایک ستر اسی سال کا بوڑھا تھا۔ اس کی ماں بھی زندہ تھی۔ اس عورت نے بڑی لمبی عمر پائی تھی۔ وہ ایک سو دس یا ایک سو گیارہ سال کی تھی۔ جس وقت تیمور بیگ نے ہندستان کی جانب رخ کیا تھا تو اس کے لشکر میں اس کا ایک رشتہ دار بھی شامل تھا۔ یہ بات اس کے ذہن میں رہ گئی تھی اور کبھی کبھی وہ اس واقعہ کا ذکر کرتی تھی۔ اسی دخکت گاؤں میں اس کے بچوں، پوتوں، پڑپوتوں، نواسوں

۲۔ خان دادا۔ یہاں اس سے مراد بڑی عمر کا رشتہ دار ہے۔ بابر نے یہ الفاظ یہاں سلطان محمود خاں، اپنے بڑے سوتیلے ماموں کے لئے استعمال کئے ہیں (نوٹ ۷، واقعات ۸۹۹ھ)

اور کنواسوں میں سے چھیانوے افراد اب بھی زندہ تھے۔ جو مر چکے تھے ان کی تعداد حساب کرنے پر دو سو بتائی گئی تھی۔ اس کے نواسے کا نواسا پچیس چھبیس سالہ نوجوان ہے جس کی ڈاڑھی سیاہ تھی۔ جس وقت میں دخکت میں تھا تو اس کے گرد و نواح کے پہاڑوں میں ہمیشہ پیدل سیر کے لئے جایا کرتا تھا۔ بیشتر اوقات ننگے پیر ہوتا بہت زیادہ ننگے پیر گھومنے پھرنے کی وجہ سے میرے پیر ایسے سخت ہو گئے تھے کہ میرے لئے پہاڑوں پتھروں میں کوئی فرق باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ایک روز اسی طرح گھومتے پھرتے ظہر و عصر کے درمیان ایک پگڈنڈی پر ایک شخص گائے لے کر جا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا نہ جانے اس راستہ پر جانے سے ہم کھو نہ جائیں اس نے کہا کہ اس گائے پر نظر رکھو اور اس کو آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دو، (ورق ۸۱) یہ تمہیں پہنچا دے گی۔ خواجہ اسد اللہ نے شوخی کرتے ہوئے کہا کہ اگر گائے خود راستہ بھول گئی تو ہم کیا کریں گے۔

اسی موسم سرما میں سپاہیوں میں سے بعض نے اندجاں جانے کے لئے رخصت چاہی کیونکہ وہ ہمارے ساتھ رہ کر حملوں میں نہیں جا سکتے تھے۔ قاسم بیگ نے اصرار کیا کہ چونکہ یہ لوگ جا ہی رہے ہیں اسی لئے ان کے ہاتھ جہانگیر مرزا کے لئے اپنی پہنی ہوئی کوئی چیز بھیج دیں۔ میں نے اسے بھیجنے کے لئے اپنی چوگوشہ ٹوپی دے دی۔ قاسم بیگ نے پھر اصرار کیا اور کہا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ تنبل کے لئے بھی کوئی چیز بھیج دی جائے۔ اگرچہ میں اس کے لئے راضی نہ تھا لیکن چونکہ قاسم بیگ کا اصرار تھا اسی لئے میں نے نویان کوکلداش سے تلوار لے کر جو اس نے سمرقند میں اپنے لئے بنوائی تھی تنبل کے لئے بھیج دی اور یہ وہی تلوار تھی جو بعد میں میرے سر پر پڑی چنانچہ اس کی کیفیت آئندہ سال کے واقعات میں بیان کی جائے گی۔

چند روز بعد میری نانی ایسن دولت بیگم جو سمرقند سے روانگی کے وقت وہیں رہ گئی تھیں۔ لاغر و نحیف اور بھوکے پیاسے افراد خاندان اور لشکر کے ساتھ میرے پاس پہنچ گئیں۔

اسی موسم میں شیبانی خاں نے منجمد دریائے خجند کو پار کر کے شاہرخیہ کے نواح اور بیشکینت پر حملہ کر دیا۔ جیسے ہی یہ خبر مجھے ملی میں نے اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ میرے آدمیوں کی تعداد کم ہے جلدی ہی گھوڑوں پر سوار اپنے ساتھیوں کے ساتھ حملہ کی غرض سے روانہ ہو گیا اور خجند کی جانب ہم نے رخ کیا۔ عجیب سخت سردی پڑ رہی تھی۔ اس جگہ کے گرد و نواح میں ہوا کی تندی ہادر ویش سے کم نہیں ہوتی بہت تیز ہوا چل رہی تھی اس مرتبہ سردی بھی خوب تھی۔ چنانچہ سردی کی شدت کی باعث دو تین دن کے اندر دو تین آدمی مر گئے۔ اس وقت مجھے غسل کی ضرورت پیش آ گئی۔ سامنے ایک ندی تھی جس کے کناروں پر سخت برف جمی ہوئی تھی لیکن بیچ میں پانی کی تیز روانی کے باعث برف منجمد نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اس پانی میں اتر کر غسل کیا، میں نے سولہ مرتبہ پانی میں غوطے لگائے۔ پانی کی سردی کا مجھ پر اچھا اثر ہوا۔ اگلے دن صبح خاص لار نامی مقام پر سے ہم نے دریائے خجند کو پار کیا۔ دو دن اور ایک رات کے بیچ ہم بیشکینت پہنچ گئے۔ شیبانی خاں اسی دوران شاہرخیہ کے گرد و نواح میں راہزنی کر کے واپس چلا گیا۔

اس وقت بیشکینت پر ملا حیدر کے لڑکے عبدالمنان کا قبضہ تھا۔ اس سے عمر میں چھوٹا مومن نامی اس کا بھائی بالکل ہی نکما اور حواس باختہ، جس وقت میں سمرقند میں مقیم تھا تو وہ میرے پاس آیا تھا۔ سرِدست فوری طور پر میں اس کے ساتھ بہت نرمی سے پیش آیا۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ نویان کوکلداش نے اس کے ساتھ بدفعلی کی تھی۔ اس فعل سے اس بے چارے کے دل میں سخت کینہ بیٹھا ہوا تھا۔ جب ہمارے پاس یہ خبر پہنچی کہ ازبک حملہ آور واپس چلے گئے ہیں ہم نے خاں کے پاس اپنا آدمی بھیجا اور بیشکینت سے کوچ کر کے آہنگران نامی دیہات میں تین چار دن قیام کیا۔

نویان کوکلداش کی موت

سمرقند میں چونکہ ان سے واقفیت ہو چکی تھی اسی لئے حیدر کے لڑکے مومن نے نویان کوکلداش، احمد

قاسم اور دیگر لوگوں کی کھانے کی دعوت کی تو میں پیشکینت سے روانہ ہوگیا لیکن یہ لوگ یہیں رک گئے۔ یہ دعوت پہاڑی کے قریب دی گئی۔ ہم شام سیرک نامی گاؤں میں قیام کرنے کے لئے واپس آگئے جو آہنگر ان کے تابع ہے۔ اگلے دن صبح یہ خبر ملی کہ نویان کوکلداش مستی کے عالم میں پہاڑی نالے میں گر کر مر گیا۔ نویان کوکلداش کے ماموں حق نظر (ورق ۸۲) کو ایک دوسری جماعت کے ساتھ اس جگہ بھیجا گیا جہاں وہ گرا تھا۔ انہوں نے احتیاط سے کام لیا اور نویان کو پیشکینت میں سپرد خاک کر کے واپس آئے۔ جس جگہ یہ محفل ترتیب دی گئی تھی اس سے ایک تیر کی جست کے فاصلے پر ایک اور اونچے پہاڑی نالے کے نیچے نویان کی لاش پائی گئی۔ لیکن بعض کا گمان یہ تھا کہ مومن کے دل میں چونکہ سمرقند کے واقعے کا کینہ تھا اسی لئے وہ اس اقدام کا مرتکب ہوا۔ تحقیق سے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی موت کا مجھ پر گہرا اثر ہوا اور ایسے کم ہی لوگ ہوں گے جن کی موت نے مجھے اتنا متاثر کیا ہو۔ میں ایک دو ہفتے تک مسلسل گریہ زاری کرتا رہا۔

اس کی تاریخ وفات ''فوت شد نویان'' (۹۰۷) سے نکالی گئی۔ چند روز بعد میں وہاں سے واپس دخکت آگیا۔ جب موسم بہار آگیا تو شیبانی خاں کے اوراتیپہ آنے کی افواہ لوگوں میں پھیل گئی۔ دخکت چونکہ ہموار زمین پر واقع ہے اسی لئے درہ آب بردن پار کر کے اور آبادی سے گزر کر ہم مسیحا کے کوہستانی سلسلے میں پہنچ گئے۔ اس کے آخری سرے پر درہ آب بردن ہے اور اس سے نیچے کی طرف پانی کا چشمہ ہے جہاں ایک مزار بھی ہے۔ اس چشمے سے اوپر کا جو علاقہ ہے وہ مسیحا میں شامل ہے اور نیچے کا حصہ پلغر سے متعلق ہے۔ ایک پتھر پر جو اس چشمے کے پہلو میں ہی ہے یہ بیت لکھ کر کندہ کر دی گئی۔

شنیدم کہ جمشید فرخ سرشت

بسر چشمہ برسنگی نوشت

(میں نے سنا ہے کہ مبارک سرشت جمشید نے کسی چشمے کے کنارے پتھر پر لکھوایا)۔

برین چشمہ چون ماہسی دم زدند

برفتند تا چشم برہم زدند

(اس چشمے پر ہم جیسے بہت سے لوگوں نے دم لیا۔ (اور) پلک جھپکتے ہی وہ یہاں سے کوچ کر گئے)۔

گرفتیم عالم بمردی وزور

ولیکن نبردیم خود بزور [3]

(ہم نے دنیا پر اپنی جوانمردی اور طاقت سے قبضہ کیا۔ لیکن اپنی طاقت کے بل پر اسے اپنے ساتھ نہ لے جا سکے)

اس کوہستانی علاقے میں یہ رسم ہے کہ لوگ پتھروں پر اشعار اور بعض دوسری عبارات لکھ دیتے ہیں۔

ان ہی دنوں جب کہ ہم وہاں مقیم تھے ملا ہجری شاعر حصار سے وہاں آن پہنچا۔ وہ میری خدمت میں حاضر ہوا میں نے یہ مطلع اس کے آنے پر ہی کہا تھا:

تکلف ہر نیچہ صورت بولسہ اند این ارتوق سین

سینی جان دیر لار اما بی تکلف جاندین ارتوق سین

(اپنی صورت سے تم دعوکہ نہ کھانا تم اس سے بھی بہتر ہو لوگ تمہیں جان جانتے ہیں تم اس سے زیادہ عزیز ہو)

شیبانی خاں اس وقت اوراتیپہ کے گرد نواح میں آیا۔ اپنے آدمیوں کی کمی اور ان کے مسلح نہ ہونے کے باوجود افراد خاندان کو مسیحا میں چھوڑ کر ہم نے درہ آب بردن اور اس کی آبادی کو پار کر کے پہاڑ سے گزرتے

۳۔ یہ اشعار شیخ سعدی کی بوستاں سے ہیں۔
حکایت کو پورا سمجھنے کے لئے اس کے آگے بھی دو شعر ہیں۔

چو بر دشمنے باشدت دسترس

مرنجانش کو راہمیں غصہ بس

(جس دشمن پر تجھے قابو حاصل ہو جائے اس کو نہ ستا، اس کے لئے یہ ذلت ہی کافی ہے)

عدو زندہ سرگزشتہ پیرامنت

بہ ازخوں اوکشتہ در گردنت

(زندہ و پریشاں دشمن سامنے کھڑے ہیں اس کا خون اپنی گردن پر نہ لے) (بوستاں سعدی ۵۲)

شیخ سعدی۔ نامح شاعر اور صاحب حکمت ہیں۔ ان کا لقب مصلح الدین اسی وجہ سے پڑا۔ ان کے والد فارس کے اتابک سعد بن زنگی کے ہاں ملازم تھے۔ (انکی تخت نشینی ۵۹۲/۱۱۹۵ میں ہوئی تھی) اس نسبت سے انہوں نے سعدی تخلص اختیار کیا۔ نصائح میں ان کی نظم و نثر کا جواب نہیں۔ گلستاں، بوستاں مشہور تصانیف ہیں۔ شیراز میں ۶۹۱/۱۲۹۱ میں انتقال کیا۔ وہیں مدفون ہیں۔ ان کا مقبرہ بہت خوبصورت ہے اور شہر کے جس علاقہ میں ہے وہ سعیدیہ کہلاتا ہے (شبلی نعمانی۔ شعر العجم ۲۶۰۲)

ہوئے دخلت کے نواح میں قیام کیا پہاڑ کے نشیب پر ہم صبح کے قریب یکجا ہوئے تا کہ اس وقت جو کچھ ہمارے ہاتھ لگے اس کے حاصل کرنے میں کوتاہی نہ ہو۔

شیبانی خاں بھی تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔ ہمیں بھی پہاڑوں سے گزر کر دوبارہ مسیحا آنا پڑا۔ اس وقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اس طرح ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ کو پار کرتے رہنے سے آخر کیا فائدہ۔ نہ گھر نہ در نہ ملک نہ ولایت نا ہی رہنے کا کوئی ٹھکانہ اس طرح مارے مارے پھرنے سے بہتر یہی ہے کہ خاں کے پاس چلا جانا چاہئے۔ قاسم بیگ وہاں جانے پر راضی نہ ہوا۔ قرابولاق نامی مقام کے نظم ونسق کے درست کرنے کے لئے وہ تین چار مغل افراد کو قتل کر چکا تھا۔ جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے شاید یہی وجہ تھی کہ وہاں جانے میں پس وپیش کر رہا تھا۔ اگر چہ ہم نے ہر چند اصرار کیا مگر وہ آمادہ نہ ہوا۔ وہ اپنے بھائی بندوں، خورد وکلاں متعلقین کو ساتھ لے کر حصار میں جا بیٹھا۔ ہم نے سواری کے گھوڑوں پر درہ آب بردن کو پار کیا اور خاں کے پاس پہنچنے کے لئے سمرقند کی جانب روانہ ہوئے۔

ان ہی دنوں تنبل نے بھی لشکر کشی کی اور آہنگر ان نامی مقام کی ہموار سر زمین پر آن پہنچا۔ اس کے لشکر کے سالاروں (ورق ۸۳) میں محمد دوغلت (جو محمد حصاری کے نام سے مشہور تھا) اس کے برادر خورد سلطان حسین دوغلت اور قنبر علی سلاخ نے باہمی سازش کر کے تنبل کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ تنبل کو جیسے ہی اس بات کا علم ہوا وہ اس مہم میں اس کے ساتھ نہ رہ سکے اور فرار ہو کر خاں کے پاس چلے گئے۔ ہم نے عید قربان شاہ رخیہ میں منائی۔ وہاں سے فوراً ہی کوچ کر کے میں تاشقند میں خاں کے پاس چلا گیا۔ میں نے یہ رباعی معمولی قافیہ میں کہی تھی۔ مجھے اس کے قافیہ کی صحت پر شک تھا کیونکہ اس زمانہ میں مصطلحات شعر سے میں اچھی طرح واقف نہ تھا۔ خاں خوش ذوق تھا شعر بھی کہتا تھا۔ اگر چہ اس کی غزل کمزور تھی۔ میں نے یہ رباعی خاں کی خدمت میں پیش کی۔ اس رباعی کے کہنے میں جو تردد در پیش تھا میں نے اس کے بارے میں بھی اسے بتا دیا لیکن اس نے ایسا کوئی جواب نہیں دیا۔ جس سے دل کو تسلی ہو۔ بظاہر خاں نے شاعرانہ اصطلاحات کا کم ہی تتبع کیا تھا۔ رباعی یہ ہے:

بادایتماش ایمش کشی نے محنت تہ کیشی
شادایتماش ایمش کونکول نی غربت تہ کیشی
کونکلوم بو غریب لنیق تو شاد اولمادی بم ہیچ
غربت تہ سیو نمایس امیرمش البتہ کیشی

(مصیبت میں کوئی کسی کی داد و فریاد نہیں سنتا۔ جب آدمی غریب الوطن ہو تو کوئی اس سے ہنس کر نہیں بولتا۔
اس غریب الوطنی میں میرا دل شاد و خرم نہیں۔ آدمی کوئی بھی ہو اسے غریب الوطنی میں مسرت نصیب نہیں ہوتی)

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ترکی میں شعری ضرورت کے تحت حرف ''تا'' اور ''دا'' نیز 'غا'، 'کا' 'قا' ایک دوسرے کے متبادل ہو سکتے ہیں۔

مغل جنگی پرچم کشائی

چند روز بعد تنبل نے اوراتیپہ پر لشکر کشی کر دی۔ اس خبر کے سنتے ہی خاں نے بھی تاشقند سے لشکر روانہ کیا۔ بیشکینت اور سام سیرک نامی مقامات کے درمیان اس نے لشکر کے جوانغار و برانغار دستوں کو مرتب کیا اور مغل دستور کے مطابق انہوں نے اپنے یاک کی دم والے پرچم نصب کئے۔ خاں گھوڑے پر سے اترا۔ نو پرچم خاں کے سامنے نصب کئے گئے۔ گائے کے دست کی ہڈی کو سفید دوسوتی کپڑے کے لمبے سے ٹکڑے میں باندھ کر اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ مزید تین سفید کپڑے کے ٹکڑے یاک کی دم سے ذرا نیچے باندھ کر انہیں پرچم کے

ڈنڈے سے لپیٹ دیا گیا۔ کپڑے کے ایک سرے کو خاں نے اپنے پیر کے نیچے رکھا اور خود اس پر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے کپڑے کے ٹکڑے کو اسی طرح دوسرے پرچم کے ساتھ باندھا گیا۔ جسے میں نے اپنے پیر کے نیچے رکھا اور میں اس پر کھڑا ہو گیا اور تیسرے کپڑے کے سرے پر سلطان محمود خانیکہ کھڑا ہو گیا۔ وہ مغل جس نے ان کپڑوں کے ٹکڑوں کو باندھا تھا اس نے گائے کی دست کی ہڈی کو ہاتھ میں لے کر مغلئی زبان میں کچھ منتر پڑھے۔ اس نے پرچم کی طرف دیکھ کر کچھ اشارہ کیا۔ خاں اور وہ تمام لوگ جو وہاں کھڑے تھے انہوں نے پرچم کی جانب قمیز [۴] کے چھینٹے دیئے۔ اس کے بعد ایک دم فضا نقاروں کی صدا سے گونجنے لگی۔ ان تمام لوگوں نے جو قطار باندھ کر کھڑے تھے تین مرتبہ نعرے بلند کئے اس کے بعد وہ گھوڑوں پر سوار ہوئے اور نعرے لگاتے ہوئے سرپٹ دوڑنے لگے۔

وہ قواعد جو چنگیز خاں نے مرتب کئے تھے ان کا آج بھی اسی طرح مغلوں کے درمیان رواج ہے۔ برانغار، جوانغار اور غول کے سپاہ کی جو جگہ مقرر ہے وہ موروثی طور پر آج بھی یکے بعد دیگرے چلی آ رہی ہے۔ چنانچہ لشکری اسی جگہ کھڑا ہوتا ہے جو اس کے لئے مقرر ہے۔ جو لشکری جوانغار برانغار میں جگہ پاتے ہیں وہ زیادہ قابل توقیر سمجھے جاتے ہیں اور وہ اوج یعنی لشکر کے سرے پر کھڑے ہوتے ہیں۔ چیراس اور بیگ چک قبائل کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ انہیں برانغار میں اوج پر جگہ دی جائے۔ اس وقت چیراس قبیلے کا سردار قشقہ محمود جری جوان تھا۔ اور بیگ چک کا سردار ایوب (ورق ۸۴) یعقوب تھا۔ اوج پر جگہ پانے کے لئے یہ قبیلے آپس میں جنگ تک پر اتر آئے اور ایک دوسرے پر تلواریں سونت لیں۔ بالآخر ظاہراً یہ قرار پایا کہ ان میں سے ایک حلقہ شکارگاہ [۵] میں بلند ترین مقام حاصل کرے اور دوسرا صف کارزار میں اوج پر متعین ہو۔

اگلے دن صبح سام سیرک کے نواح میں شکار کے لئے نرغہ ڈالا گیا۔ شکار کھیلنے کے بعد لوراک نامی چار باغ میں پہنچے، اس روز میں نے پہلی غزل اسی مقام پر مکمل کی جس کا مطلع ہے:

جانیم دین اوز کایار وفادار یماديم
کونکلوم دین اوز کا محرم اسرار تاپماديم

(اپنی جان کے علاوہ کوئی یار وفادار نہیں اپنے دل کے علاوہ کوئی محرم راز نہیں)

یہ غزل سات اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد جو غزلیں مکمل ہوئیں وہ اسی ترتیب سے قلمبند کی گئیں۔ یہاں سے ہم منزل بہ منزل کوچ کرتے ہوئے دریائے خجند پر پہنچے۔ ایک دن سیر کرنے کے غرض سے ہم نے دریا پار کیا۔ یہاں ہم نے کھانا پکایا۔ جوانوں اور سرداروں نے دل کھول کر تفریح کی۔ اسی روز کسی نے میرا سونے کا حلقہ چرا لیا جو کمر بند میں لگا ہوا تھا۔ اسی دن صبح خان کلی بیان کلی اور سلطان محمد ولیس فرار ہو کر تنبل سے جا ملے۔ اگرچہ یہ بات پایۂ ثبوت کو تو نہ پہنچ سکی مگر گمان یہ ہے کہ یہ حرکت ان ہی سے مرتکب ہوئی۔ احمد قاسم کوہ برنے بھی اجازت چاہی اور وہ بھی اورتیپہ کی جانب چلا گیا۔ اس کے بعد وہ واپس نہیں آیا کیونکہ وہ بھی تنبل کے پاس چلا گیا تھا۔

۴۔ قمیض۔ گھوڑی کے دودھ سے بنا مشروب

۵۔ شکار شان و شوکت سے کیا جاتا تھا۔ کئی میل کا گھیرا بنا کر حلقہ باندھا جاتا تھا۔ اس حلقے میں جتنے بھی جانور ہوتے تھے ان کو شور و غل کر کے ڈھول بجا کر ہانکتے اور ایک جگہ جمع کرتے تاکہ شکار ایک حلقے میں باآسانی کیا جا سکے۔

واقعات ۹۰۸ھ

(۷ جولائی ۱۵۰۲ء ۔ ۲۶ جون ۱۵۰۳ء)

خاں کا یہ حملہ کسی حد تک بے فائدہ ہی رہا۔ اس نے نہ تو قلعہ سر کیا اور نہ ہی دشمن کو زیر۔ بس وہ وہاں چلا گیا اور واپس آ گیا۔ اس عرصے میں تاشقند میں مقیم رہا بہت زیادہ تنگدستی ذلت و خواری برداشت کی۔ نہ میرے پاس کوئی ولایت تھی اور نہ ملنے کی امید۔ میں اکثر و بیشتر پریشان حال و سرگردان رہتا۔ بہت سے لوگ مجھ سے علیحدہ ہو گئے اور وہ چند جورہ گئے وہ بھی میری قلاّشی کے باعث ساتھ نہیں رہ سکتے تھے۔ میں جب کبھی اپنے خاں دادا کے پاس جاتا تو میرے ساتھ بس ایک یا دو ساتھی ہوتے۔ ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ میرے لئے بیگانہ نہ تھے بلکہ میرے اپنے ہی تھے۔ اپنے خاں دادا کو کورنش کر کے میں شاہ بیگم کے پاس چلا جاتا۔ میں ان کے سامنے ننگے سر اور ننگے پیر اس طرح چلا جاتا گویا یہ میرا اپنا ہی گھر ہو۔

میں اس طرح کی سرگردانی اور خانہ ویرانی سے تنگ آ چکا تھا۔ اب تو یہ جان بھی مجھے عذاب لگنے لگی تھی۔ میں خود سوچتا تھا کہ اس دشواری و پریشانی کے ساتھ زندہ رہنے سے بہتر ہے کہ جدھر بھی سر اٹھے اس طرف نکل جاؤں اور خود کو نیست و نابود کر دوں۔ جہاں تک میرے پاؤں ساتھ دیں میں چلتا جاؤں تا کہ لوگ میری یہ ذلت و خواری اور گریہ و زاری کے بارے میں تو نہ جان سکیں۔ یہ سوچ کر میں نے سفر پر ملک خطا کی جانب جانے کا ارادہ کیا۔

بچپن سے ہی میری یہ آرزو تھی کہ ملک خطا کی سیر کروں۔ لیکن سلطنت کے کاموں اور دوسری مصروفیتوں کے باعث یہ سفر میسر نہ آ سکا۔ اب سلطنت ہاتھ سے نکل چکی تھی میری والدہ اپنی سوتیلی ماں اور چھوٹے بھائیوں کے پاس چلی گئی تھیں، گویا سیر و سفر کے لئے جو رکاوٹیں تھیں وہ دور ہو گئیں۔

میں نے خواجہ ابوالمکارم کے ذریعے یہ بات خاں سے کہلوائی کہ شیبانی خاں جیسا موذی دشمن سر ابھار چکا ہے وہ ترکوں کے لئے بھی اتنا ہی مضر ہے جتنا مغلوں کے لئے ابھی اس نے قبائل کو پورے طور پر زیر نہیں کیا ہے اور اس کا اقتدار بہت زیادہ نہیں ہوا ہے اس لئے اس کا سدّباب ضروری ہے جیسا کہ کسی نے کہا ہے

امروز بکش جون می توان کشت

آتش چو بلند شد جهان سوخت

(آج جب کہ تو آگ کو بجھا سکتا ہے تو بجھا دے۔ (اگر) اس کے شعلے بلند ہو گئے تو یہ دنیا کو جلا ڈالیں)

مگذار که زه کمند کمان را

دشمن چو به تیر می توان دوخت [1] (ورق ۸۵)

(وہ دشمن جو تیرے (جسم میں) تیر پیوست کر سکتا ہے۔ اسے اتنا موقع مت دے کہ وہ کمان پر چلّہ چڑھائے)

تقریباً چوبیس پچیس سال کے عرصے سے ان (بڑے ماموں) کی ملاقات میرے چھوٹے خاں دادا سے نہیں ہوئی تھی اور میں نے تو انہیں دیکھا ہی نہیں تھا۔ اگر ایسا ہو جائے کہ میں وہاں چلا جاؤں تا کہ اپنے چھوٹے خاں دادا سے ملاقات کر لوں اور دوسروں سے ملاقات کا واسطہ و ذریعہ بن جاؤں۔ میرا اصلی مقصد یہ تھا کہ اس بہانے سے میں یہاں سے نکل جاؤں اور مغلستان اور طرفان کی جانب جانے میں کوئی رکاوٹ نہ رہے

۱۔ شیخ سعدی نے یہ قطعہ گلستان میں باب ہشتم در آداب صحبت کے تحت دیا ہے۔ دشمن کو حقیر سمجھنا کم عقلی ہے۔ (گلستان ص ۲۵۸) بابر نے کس عمدہ اور مناسب وقت پر یہ تنبیہ کی ہے، لیکن ہوا دہی دشمن نے سر اٹھا لیا اور پھر کوئی اس کو دبا نہ سکا۔

جبکہ میری باگیں میرے اپنے ہاتھ میں ہوں گی۔ میری اس سوچ سے کوئی بھی شخص باخبر نہ تھا اور کسی کو بھی ہم خیال وہم راز نہیں بنایا تھا۔ اسی بنا پر میرے لئے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ اپنی سگی ماں کو اس قسم کی بات بتاؤں۔ اور نہ ان لوگوں سے جو میرے گرد وپیش تھے اور مجھ سے امیدیں وابستہ رکھ کر پریشانی وسرگرانی برداشت کر رہے تھے خواجہ ابولمکارم نے جب میری بات شاہ بیگم اور میرے بڑے خاں دادا کو بتائی تو انہوں نے اس کا یہ مطلب نکالا کہ چونکہ ان کی طرف سے مجھے خاطر خواہ مراعات حاصل نہیں تھیں اسی لئے میں دوبارہ جانے کے لئے ان سے رخصت چاہ رہا ہوں۔ (اپنی عزت کا خیال کرتے ہوئے) انہوں نے مجھے رخصت کی اجازت دینے میں ذرا تامل سے کام لیا۔

کیچک خاں تاشقند میں

اس عرصے میں چھوٹے خاں دادا کی طرف سے ایک شخص آیا اور اس نے بتایا کہ چھوٹے خاں مجھ سے ملاقات کرنے کی غرض سے آرہے ہیں۔ میں نے اس کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اتنے میں دوسرا شخص آیا اور یہ خبر لایا کہ چھوٹے خاں نزدیک پہنچ چکے ہیں۔ یہ سن کر شاہ بیگم چھوٹے خاں دادا کی چھوٹی بہنیں سلطان نگار خانم، دولت سلطان خانم، سلطان محمد خانیکہ، مرزا خاں اور میں سب کے سب ان کا استقبال کرنے کے لئے روانہ ہوگئے۔

تاشقند اور سیرام کے درمیان کئی چھوٹے گاؤں کے علاوہ یغمہ نامی گاؤں میں جہاں ابراہیم اتا [2] اور اسحاق اتا کی قبریں ہیں میں پہنچا تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے چھوٹے خاں دادا بھی یہیں قرب وجوار میں ہیں۔ میں خالی الذہن گھوڑے پر سوار سیر کے لئے جا رہا تھا کہ وہ اچانک میرے بالکل مقابل آگئے۔ میں آگے بڑھا۔ وہاں پہنچتے ہی میرے چھوٹے خاں دادا نے صورت حال کا اندازہ لگایا۔ وہ بہت مضطرب نظر آرہے تھے ان کے دل میں غالباً یہ خیال گزر رہا تھا کہ جس جگہ ہم ملے ہیں وہ ملاقات کے لئے مناسب نہیں۔ میں تو گھوڑے سے اتر کر نیچے آگیا مگر انہیں اترنے کا موقع نہ مل سکا۔ میں ان کے سامنے دوزانو ہوگیا، میں سمجھ گیا کہ شرمندہ ہیں۔ انہوں نے اسی وقت سلطان سعید خاں اور بابا خاں سلطان سے کہا کہ وہ گھوڑے سے اتر کر اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر میرا استقبال کریں۔ خاں کے بیٹوں میں بس یہی دو آئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر تیرہ چودہ سال ہوگی۔ ان سلاطین سے ملاقات کرکے اور گھوڑوں پر سوار ہوکر ہم شاہ بیگم کے پاس پہنچے۔ میرے چھوٹے خاں دادا نے شاہ بیگم اور خاندان کے دیگر افراد سے ملاقات کی۔ ایک دوسرے کی احوال پرسی کی، بیٹھ کر بات چیت کی۔ بیتی بسری باتوں کو یاد کرکے آدھی رات تک ایک دوسرے سے گفتگو کرتے رہے۔ اگلے دن صبح میرے چھوٹے خاں دادا نے مغلوں کی رسم کے مطابق مجھے خلعت [3] سروپا ترکش [4] اور اپنے خاصے کا گھوڑا مع زین عنایت کیا خلعت میں کلابتو سلما ستارے کا کام تھا۔ گوشہ دار ٹوپی بیل بوٹوں سے لیس خطائی اطلس [5] (ورق ۸۶) کی عبا [6] اور خطائی ترکش وغیرہ شامل تھے۔ قدیم دستور کے مطابق بیش بہا سنگ کے ساتھ بنددار خورجین [7] بھی دی گئی جس میں دائیں جانب تین چار عبیردان [8] اور جزدان جیسی چھوٹی چھوٹی چیزیں لٹکی ہوئی تھیں جو عورتیں گریبان میں لٹکانے کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ بائیں جانب بھی اسی طرح تین چار چیزیں لٹکی ہوئی تھیں۔

آداب واستقبال

یہاں سے ہم تاشقند کی جانب روانہ ہوئے۔ میرے بڑے خاں دادا شہر سے تین چار فرسنگ باہر پیشوائی کے لئے آگئے تھے۔ ایک جگہ شامیانہ نصب کیا گیا۔ وہاں میرے بڑے خاں دادا بیٹھے چھوٹے خاں ان کے سامنے سے آئے۔ جب وہ نزدیک پہنچے تو بائیں ہاتھ کی جانب سے وہ بڑے خاں دادا کے گرد گھوم کر سامنے آکر گھوڑے سے اترے۔ کورنش گاہ پر پہنچ کر نو مرتبہ زانوں کے بل زمین پر بیٹھے۔ اس کے بعد وہ بڑے خاں دادا

۲۔ ابراہیم اتا، جن کا پورا نام ابواسحاق ابراہیم ہے (۱۱۳۲۔۱۲۲۶ء) شیخ عبدالقادر جیلانی کے فرزند ہیں (سفینۃ الاصفیہ، نول کشور ص ۱۱۱)

۳۔ خلعت۔ وہ لباس جو بادشاہ کی طرف سے انعام میں ملے۔

۴۔ ترکش۔ تیرکش کا مخفف۔ تیر رکھنے کا خانہ۔

۵۔ اطلس۔ ساٹن، نہایت عمدہ، دبیز، ریشمی کپڑا (جہاں آرا حبیب اللہ۔ زندگی کی یادیں ص ۱۱۵)

۶۔ عبا۔ موٹے کپڑے کا سامنے سے کھلا ہوا کوٹ۔ اس کے مقابلے میں قبا سامنے سے بند کوٹ کو کہتے ہیں، جس میں اوپر ایک دو بند ہوتے تھے۔ غالب ان بندوں کو بھی کھلا ہی چھوڑ دیتے تھے۔ کہتے ہیں

مست کب بند قبا باندھتے ہیں (دیوان ص ۱۰۱)

۷۔ خورجین۔ گھوڑے کی زین کے ساتھ لٹکانے والا تھیلا، جو دونوں طرف لٹکتا ہے

۸۔ عبیردان۔ عطردان

کے نزدیک آئے چھوٹے خاں جیسے ہی وہاں پہنچے تو بڑے خاں دادا بھی ان کی پزیرائی کے لئے اپنی جگہ سے اٹھے۔ پذیرائی کے وقت وہ ایک دوسرے سے کافی دیر تک بغل گیر رہے۔ جب علیحدہ ہوئے تو چھوٹے خاں پھر نومرتبہ زمین پر زانو رکھ کر آداب بجالائے۔ پیشکش اور نذر گزارنے کے وقت بھی وہ کئی مرتبہ زانو کے بل زمین پر بیٹھے۔ اس کے بعد وہ پاس آ کر ان کے نزدیک بیٹھ گئے چھوٹے خاں کے ساتھ جتنے بھی لوگ تھے وہ بھی خود کو مغل طرز پر آراستہ کئے ہوئے تھے۔ سروں پر وہی گوشہ دار ٹوپیاں وہی چکن کی خطائی اطلس کی عبائیں مغلوں کے دستور کے مطابق ترکش لگائے ہوئے چمڑے کی سبز زینیں اور مغلئی گھوڑے عجیب غیر معمولی سج دھج کے ساتھ وہ وہاں پہنچے تھے۔ وہ اپنے ساتھ زیادہ آدمی لے کر نہیں آئے تھے۔ بس یہی ہزار سے زیادہ اور دو ہزار سے کم ہوں گے۔ میرے چھوٹے خاں دادا کے رنگ ڈھنگ ہی نرالے تھے تلوار کے دھنی تھے۔ کہا کرتے تھے کہ ششپر[9] پیازی[10] کیستن[11] تبرزین[12] تبرتیشہ[13] وغیرہ میں سے جو بھی ہتھیار ہو اگر وار کر جائے تو بس ایک ہی جگہ کارگر ہوتا ہے۔ لیکن تلوار اگر وار کر جائے تو سر سے پیر تک کام کرتی چلی جاتی ہے۔ تیز دھار تلوار پر وہ تکیہ کرتے اسے خود سے ہرگز جدا نہ کرتے، وہ یا تو ان کی کمر سے بندھی رہتی یا اسے اپنے ہاتھ میں رکھتے۔[14] چونکہ ان کی پرورش ایک عظیم ولایت کی سرحد پر ایک گوشے میں ہوئی تھی اسی لئے ان کی بود و باش دیہاتیوں جیسی تھی اور بات کرنے میں لہجہ بھی درشت رہتا۔

میں اسی مغل لباس کو زیب تن کئے ہوئے اپنے چھوٹے خاں دادا کے ساتھ واپس آیا تو خواجہ ابوالمکارم جو بڑے خاں دادا کے ساتھ تھا مجھے نہیں پہچانا۔ چنانچہ اس نے سوال کیا کہ یہ کون سلطان ہیں۔ لیکن جب میں نے بات کی تو پہچان گیا۔

اندجان پر حملہ

تاشقند واپس آ کر انہوں نے کندرلیگ درے کے راستے سے سلطان احمد تنبل پر لشکر کشی شروع کر دی۔ چونکہ وہاں کے لوگ باخبر ہو گئے تھے اسی لئے وہ آہنگران کے میدانی علاقے کی جانب چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے چھوٹے خاں اور مجھے خود سے علیحدہ کر کے آگے کی طرف روانہ کر دیا۔ رایان نامی ٹیلے سے گزر کر زبرقان اور کرنان کے نواح میں دونوں خاں یکجا ہوئے۔

کرنان کے نواح میں انہوں نے لشکر کا جائزہ لیا اور تخمینہ لگایا کہ تیس ہزار سوار ہیں۔ یہ خبر پہلے سے ہی پہنچ گئی کہ تنبل اپنے لشکر کو جمع کر کے اخسی پہنچ گیا ہے۔ دونوں خاں مشورے کے لئے بیٹھے۔ اس رائے پر اتفاق ہوا کہ میرے ہمراہ لشکر کا ایک دستہ روانہ کریں اور میں دریائے خجند پار کر کے راہ اوش اور اوزکند سے گزر کر اس کے عقب میں پہنچ جاؤں۔ اس پر فیصلہ ہو گیا ایوب بیگ چک کو اس کی فوج کے ساتھ جان حسن نارین کو قبیلہ نارین کے ہمراہ محمد حصاری دوغلت، سلطان حسین مرزا دوغلت (ورق ۸۷) کو قبیلہ دوغلت کے افراد کے ساتھ اور قنبر علی اور ساریق باش مرزا یتار چی کو داروغہ لشکر مقرر کر کے میرے ہمراہ کر دیا گیا۔

ہم نے کرنان سے خاں سے علیحدگی اختیار کی گزشتہ سال کی طرح اس مرتبہ بھی سکان کے نواح سے ہم نے دریائے خجند تختے پر پار کیا۔ رباط خوقان سے گزرتے اور قبا کو زیر کرتے ہوئے ہم نے الایلوق کے راستے سے اوش پر یلغار کر دی۔ چنانچہ صبح صبح کے وقت جب کہ لوگ بالکل غافل و بے خبر تھے ہم قلعہ اوش پر پہنچ گئے۔ اس وقت لوگ کوئی سدباب نہ کر سکے۔ چنانچہ انہوں نے اوش ہمارے حوالے کر دیا ولایت اوش کے لوگ طبعاً ہماری آمد کے خواہاں تھے۔ تنبل کے خوف کے باعث اور ہم سے دور ہونے کی بنا پر انہیں کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا تھا۔ جیسے ہی ہم اوش میں داخل ہوئے تو اندجان کے مشرق اور جنوب کے کوہ و میدان میں آباد تمام چھوٹے اور بڑے قبائل ہمارے پاس آ کر جمع ہو گئے۔ اوزکند اب سے قبل فرغنہ کا پایۂ تخت رہ چکا تھا۔ اس کا قلعہ بہت عمدہ ہے اور وہ ولایت کی سرحد پر واقع ہے۔ یہاں کے لوگوں نے بھی ہماری بندگی اختیار کر لی اور اپنے آدمی بھیج کر وہ ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔

۹۔ ششپر۔ وہ عصا جس کے چھ پہلو ہوں

۱۰۔ پیازی۔ ایک سخت لکڑی کا بنا ہوا عصا جس کا ایک سرا گول یا بیضوی یا پیازی شکل کا ہوتا ہے اور حملے کے وقت اس گول حصے سے خود کو توڑنے یا کھولنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے (پنت ص ۸۳)

۱۱۔ کیستن۔ عصے کے ایک سرے پر زنجیر اور زنجیر کے ساتھ ایک گولا جڑا ہوا۔ عصے کو گھما کر گولے سے چوٹ ماری جاتی ہے (پنت ص ۸۳)

۱۲۔ تبرزین۔ بسونہ۔ ایک ہلکا اور چھوٹا لکڑی چھیلنے والا آلہ۔

۱۳۔ تبرتیشہ۔ ترکی میں بالتو۔ کلہاڑی کو کہتے ہیں۔

۱۴۔ تلوار۔ شریف محمد منصور سعید ابوالفرج جو مبارک شاہ کے نام سے زیادہ مشہور ہیں نے ایک کتاب "آداب الحرب والشجاع" تیرھویں صدی میں لکھی تھی۔ ان کا بھی کہنا ہے کہ "اگر ایک شخص کے پاس سب ہتھیار ہوں لیکن تلوار نہ ہو تو وہ ناکافی ہے۔ لیکن اگر آدمی کے پاس تلوار ہے تو اس کو کسی اور ہتھیار کی ضرورت نہیں۔ مبارک شاہ کے مطابق اس زمانے میں مندرجہ ذیل ہتھیار تلوار کے علاوہ ہوتے تھے۔

تیر، نیزہ، سپر (ڈھال)۔ کاروئی بزرگ (بڑا خنجر)، پیکان (برچھی) منجنیق، ارابہ (توپ ڈھونے والی گاڑی) حسک (کیلیں جو دشمن کے گھوڑوں کے نیچے پھینکی جاتی تھیں) اور گرز (نزیر جان۔ تیمور ملک ص ۳۲۹)

چند روز بعد مرغینان کے لوگوں نے اپنے داروغہ کو زدوکوب کر کے وہاں سے نکال دیا اور میرے پاس پہنچ گئے۔اس عرصے میں اس کے باوجود کہ ایسے قلعے ہمارے ہاتھ آ گئے تھے اور اس ولایت میں کیسا کیسا شور وفتنہ بپا نہ ہوا مگر تنبل کو اب بھی عقل نہیں آئی تھی وہ اخسی و کرنان کے درمیان اپنے سوار و پیادہ لشکر کے ہمراہ خانوں کے مقابلے میں آموجود ہوا درختوں کے تنوں کے باڑھ لگا کر اور خندق کو محکم کر کے وہ اس کے اندر بیٹھ رہا۔اگر چہ دونوں جانب سے جنگ میں پیشقدمی ہوئی لیکن کسی طرف سے بھی یہ معلوم نہیں ہوا کہ کون غالب رہا اور کون مغلوب۔

چونکہ اندجان کی طرف سے خورد وکلاں قبائل میرے ساتھ ہو گئے تھے اور اس کے اکثر قلعے نیز اس کا بیشتر حصہ میرے تحت تصرّف آ چکا تھا اور طبعاً لوگ میرے خواہاں بھی تھے مگر انہیں کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا تھا۔ چنانچہ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اندجان کے قریب پہنچا جائے۔کسی شخص کا انتخاب کر کے اس کے ذریعے وہاں کے خواجہ اور امرا سے گفتگو کی جائے تو اس امر کا احتمال ہے کہ وہ ہماری طرف ہو جائیں۔اس خیال کے پیش نظر ہم اوش سے سوار ہوئے آدھی رات کے وقت اندجان سے ایک کروہ کے فاصلے پر چہل دختران نامی مقام کے مقابل پہنچے۔قنبر علی بیگ اور دیگر بعض امرا کو آگے روانہ کیا تاکہ پوشیدہ طور پر کسی شخص کو قلعے کے اندر داخل کر کے وہاں کے مالکین اور ارباب حل وعقد سے گفتگو کر سکیں۔جو امرا آگے گئے تھے گھوڑوں پر سوار ہم ان کا انتظار کر رہے تھے بعض لوگ غنودگی میں تھے اور بعض نیند کی حالت میں۔شاید تین پہر رات گزری تھی کہ اچانک طبل بجنے لگے اور سواروں کی صدا بلند ہوئی۔سرکش لوگوں کی کمی وزیادتی کی بارے میں جانے بغیر اور خواب آلود غافل لوگ ایک دوسرے کی جانب متوجہ ہوئے بغیر ایک دم بھاگنے لگے۔مجھے اتنا موقع نہ مل سکا کہ اپنے لوگوں کو جمع کر سکوں۔میں آگے دشمن کی طرف بڑھا۔میر شاہ قوچین بابا شیر زاد اور دوست ناصر میرے ساتھ روانہ ہوئے ہم چاروں کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھاگ نکلنے کی کوشش کی۔میں ابھی تھوڑا ہی آگے بڑھا تھا کہ وہ دستہ جو وہاں متعین تھا اور جو سوار وہاں تھے گھوڑے دوڑا کر آن پہنچے۔ایک سوار جس کے گھوڑے کی پیشانی پر قشقہ لگا ہوا تھا میرے نزدیک (ورق ۸۸) پہنچا۔میں نے اس کے گھوڑے کو اپنے تیر کا نشانہ بنایا۔اس نے قلابازی کھائی اور وہیں ڈھیر ہو گیا وہ لوگ وہیں رک گئے یہ تینوں جو میرے ساتھ تھے کہنے لگے کہ رات کی تاریکی میں معلوم نہیں کہ دشمن کی تعداد کم ہے یا زیادہ۔لشکر جو ہمارے ساتھ تھا وہ سب بھاگ گیا ہے۔ہم چار آدمی دشمن کو کس قدر نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ہمیں جا کر ان لوگوں کو جو فرار ہو گئے ہیں جمع کر کے جنگ کرنی چاہئے۔میں ان کی تلاش میں نکلا اور ان تک پہنچا چابک تک مارے کہ انہیں واپس جمع کروں مگر کوئی نہیں ٹھہرا۔چنانچہ ہم واپس آئے دور دشمن پر تیراندازی شروع کر دی۔ تھوڑے دیر کے لئے وہ پسپا ہو گئے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ ہم تین چار آدمیوں سے زیادہ نہیں ہیں انہوں نے ہمارا تعاقب کر کے ہمیں گھوڑوں سے اتارنے کی کوشش کی۔تین چار مرتبہ میں نے چاہا کہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ حملہ کروں مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔چنانچہ ان ہی تین آدمیوں کے ساتھ واپس آیا اور تیروں کی بوچھاڑ سے دشمن کا منہ موڑ دیا انہوں نے میرے آدمیوں کا تین کروہ یعنی پشتہ خراموک و پشامون تک تعقب کیا۔جس وقت ہم پشتہ تک پہنچے تو ہمیں محمد علی مبشر نظر آیا۔میں نے اس سے کہا کہ وہ تھوڑے ہی آدمی ہیں ثابت قدم رہو تو ہم ان پر گھوڑے دوڑا دیں۔جب ہم وہاں پہنچے اور ان پر گھوڑوں سے وار کیا تو انہوں نے سینہ سپر ہو کر مقابلہ کیا۔

اس کے بعد میرے آدمی جو منتشر ہو گئے تھے اِدھر اُدھر سے جمع ہو کر میرے پاس پہنچ گئے۔ان میں بعض عمدہ و کارآمد نوجوان بھی تھے لیکن اس انتشار و پریشانی کے عالم میں ہم سیدھے اوش پہنچ گئے۔

ایوب بیگ چک کی فوج میں سے چند مغل علیحدہ ہو کر قتل وغارت گری کی غرض سے اندجان کے اطراف میں تھے۔لیکن جب انہوں نے ہمارے لشکر کا شور وغوغا سنا تو خاموشی سے وہ ہماری طرف بڑھے۔لیکن ہمارا ایمائی [15] لفظ سمجھنے میں انہوں نے غلطی کی۔(ایمائی لفظ دو نوع کے ہوتے ہیں۔ایک تو وہ جو کسی قبیلے میں استعمال کیا جاتا

ہے۔ چنانچہ بعض قبائل کا ایمائی لفظ "دردانہ" ہے بعض میں "توقبائی" مروج اور کچھ قبائل میں "لولو" استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسرا وہ ہوتا ہے جس میں دو لفظ لشکر میں کارزار کے وقت دہرائے جاتے ہیں۔ یعنی کارزار کے وقت جب کوئی ایک لفظ کہے تو دوسرا شخص وہ لفظ بولے جو پہلے سے متعین کر دیا گیا ہے۔ تاکہ اس طریقے سے کہنے والا شخص خود کو باغی وسرکش لوگوں سے الگ کر سکے اپنے اور غیر میں فرق کیا جا سکے۔)

اس یورش میں مقررہ ایمائی لفظ تاشقند اور سیرام تھے۔ یعنی اگر کوئی تاشقند کہے تو دوسرا سیرام جواب میں کہے۔ اگر ایک نے سیرام کہا ہو تو دوسرا تاشقند کہے۔ اس وقت خواجہ محمد علی دوسرے لوگوں سے ذرا آگے تھا۔ جب مغل تاشقند تاشقند کہتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے تو خواجہ محمد علی اپنے تاجیکی ہونے کے باعث مضطرب و پریشان ہو گیا۔ چنانچہ اس نے بھی "تاشقند تاشقند" کہا۔ مغلوں نے اسے باغی تصور کیا۔ اسی لئے اس پر گھوڑے دوڑا دیئے اور نقارے بجاتے ہوئے اس پر تیروں کی بارش کرنے لگے۔ محض اس ایک غلطی کے باعث ہم تتر بتر ہو گئے اور جس منصوبے کو لے کر چلے تھے وہ پورا نہ ہو سکا۔ اس بنا پر ہم وہاں سے واپس اوش آ گئے۔

اندجان پر پھر حملہ

پانچ چھ دن کے اندر جب کوہ و میدان اور قلعوں کے لوگ میری طرف رجوع کرنے لگے تو تنبل اور اس کے ساتھی بددل اور پست ہمت ہو گئے۔ چنانچہ عام لوگ اور لشکر کے سپاہی بھاگنے لگے۔ بعض لوگ جو ان کے قرابت داروں میں سے تھے میرے پاس آئے، کہتے تھے کہ تنبل اب تباہی و بربادی کے کنارے پہنچ چکا ہے اور تین چار دن میں ہی ختم ہو جائے گا یہ خبر سنتے ہی ہم اندجان کی جانب گھوڑوں پر روانہ ہوئے۔ قلعہ اندجان میں تنبل (ورق ۸۹) کا برادر خورد سلطان محمد کلپک تھا۔ توتلوق کے راستے سے ہم اندجان کے جنوب میں پہنچ گئے۔ ظہر کے وقت خاکان نہر کی جانب سے حملہ آور دستہ روانہ کیا۔ جس کے پیچھے میں بھی پشتہ عیش کے دامن تک پہنچ گیا جو خاقان نہر کی جانب ہے۔ اتنے میں قراول دستے نے یہ خبر بھیجی کہ سلطان محمد کلپک اپنے آدمیوں کے ساتھ محلات و باغات سے نکل کر پشتہ عیش کے دامن میں پہنچ گیا ہے۔ ہمارا حملہ آور دستہ ابھی جمع نہیں ہوا تھا۔ میں اس دستے کا انتظار کئے بغیر ہی بلا توقف فوراً ہی اس باغی کی طرف روانہ ہوا۔ کلپک کے آدمی پانچ سو سے زیادہ ہوں گے۔ اگرچہ ہمارے آدمیوں کی تعداد ان سے زیادہ ہی تھی مگر وہ چوں کہ حملہ آور دستے کے ساتھ جا کر منتشر ہو گئے تھے اسی لئے حملہ کرتے وقت اِن کی تعداد شاید اُن کے آدمیوں کے برابر ہی ہوگی۔ لشکر کی ترتیب وصف بندی کو ملحوظ کئے بغیر ہم نے تیز رفتاری سے دشمن کی جانب حملہ کیا۔ جیسے ہی ہم اس کے نزدیک پہنچے وہ ہمارا مقابلہ نہ کر سکے، یہ نوبت تک نہ آئی کہ تلوار کے ایک دو ہاتھ ہی ہو جاتے۔ میری سپاہ نے اس کے آدمیوں کا دروازہ خاکان تک تعاقب کیا اور ان سب کو گھوڑوں سے اتار لیا جن لوگوں کو گھوڑوں پر سے اتارا گیا تھا انہوں نے اپنی راہ لی اور اس طرح سرکش دشمن زیر ہو گیا۔

جس وقت ہم دشمن کو زیر کر کے محلہ خواجہ کت نامی پر پہنچے تو مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ تیزی سے دوڑ کر دروازے تک پہنچ جاؤں لیکن میرے عمر رسیدہ اور تجربہ کار امرا (دوست بیگ کے والد) ناصر بیگ اور قمبر علی بیگ نے عرض کیا کہ اس وقت کافی دیر ہو گئی ہے۔ رات کی تاریکی میں قلعے کے نزدیک جانا بے موقع ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ذرا پیچھے ہٹ کر پڑاؤ کریں۔ صبح ہونے تک ان کے پاس قلعہ ہمارے حوالے کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں چنانچہ ان تجربہ کار امرا کی بات پر عمل کرتے ہوئے قلعہ سے واپس آ گئے۔ اگر ہم قلعے کے دروازے تک پہنچ گئے ہوتے تو بلا شک وشبہ قلعہ ہمارے ہاتھ آ گیا ہوتا۔

تنبل سے دو دو ہاتھ

عشاء کا وقت تھا کہ ہم خاکان نہر سے گزر کر زورق سرائے کے نزدیک اترے۔ اگرچہ تباہ حال تنبل کے اندجان کی طرف آنے کی خبر مل گئی تھی مگر اس کے باوجود اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر ہم سے یہ غفلت ہوگئی کہ خاکان نہر جیسی مضبوط جگہ کو محکم کر کے وہاں قیام کرنے کی بجائے نہر کے پار پہنچ کر زورق سرائے کے نزدیک ایک گاؤں میں ہموار زمین پر آرام کیا ہمارے نہ آگے کوئی حفاظتی دستہ تھا اور نہ پیچھے۔ سب کے سب بے خبر سوئے ہوئے تھے۔ ابھی صبح نمودار ہی ہوئی تھی اور لوگ خواب شیریں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ قنبر علی دوڑا دوڑا آیا کہ اٹھو دشمن سر پر آن پہنچا ہے۔ اس نے بس اتنا ہی کہا اور دم بھر رکے بغیر واپس چلا گیا۔ میں ہمیشہ امن و عافیت کے دنوں میں بھی کبھی کپڑے اتار کر نہیں سوتا تھا بلکہ انہیں پہنے پہنے ہی ٹیک لگا کر سو جاتا تھا۔ بیدار ہوتے ہی شمشیر و ترکش باندھ کر فوراً سوار ہوا۔ نشان بردار کو اتنی فرصت نہ ملی کہ وہ پرچم باندھ سکے۔ چنانچہ وہ اسے ہاتھ میں لئے ہوئے ہی سوار ہوا۔ سامنے سے غنیم نظر آیا، ہم اس کی طرف بڑھے جس وقت ہم سوار ہوئے تھے اس وقت ہمارے ساتھ دس پندرہ آدمی تھے۔ اب ہم دشمن سے اتنے ہی فاصلے پر تھے جہاں تک تیر پہنچ سکتا ہے۔ جس وقت ہم دشمن کے حملہ آور دستے کے روبرو ہوئے تو اس وقت میرے ہمراہ دس ہی آدمی ہوں گے۔ اُدھر سے تیر آیا اِدھر سے بھی تیر چلایا گیا۔ دشمن کے جو سپاہی آگے بڑھ کر آئے تھے ہم ان تک پہنچ گئے اور انہیں پسپا کر دیا۔ میں نے اپنی سپاہ کو آگے بڑھایا اور ہم آگے کی جانب روانہ ہوئے۔ ہم نے تیر کی رسائی تک ان کا تعاقب کیا۔ یہاں تک کہ ہم دشمن کے غول تک پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر کیا دیکھتے ہیں کہ سلطان تنبل تقریباً سو آدمیوں کے ساتھ موجود ہے۔ ہماری طرح (ورق ۹۰) اس کی فوج کے دستے کا ایک آدمی اپنے دستے سے آگے کھڑا تھا۔ اگرچہ اسے یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنی جگہ قائم رہے مگر اس کے آدمی حملے سے پہلوتہی کر رہے تھے۔ سوچ رہے تھے کہ آیا فرار اختیار کریں یا نہ کریں۔ چنانچہ اسی کشمکش و پیچ میں وہ اسی طرح وہاں کھڑے رہے اس وقت میرے ساتھ بس تین آدمی رہ گئے تھے۔ ان میں سے ایک دوست ناصر تھا دوسرا مرزا قلی کوکلداش اور تیسرا (خدائے داد کا لڑکا) کریم داد ترکمان۔ ایک تیر جو میرے پاس تھا میں نے تنبل کے خود کو نشانہ بنا کر چلایا میں نے دوبارہ ترکش کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میرے خاں دادا نے مجھے ایک تاز گوشہ گیر[16] دیا تھا وہ ترکش میں سے نکل آیا۔ مجھے اسکو پھینکتے ہوئے دکھ ہوا لیکن جب تک میں اسے ترکش میں واپس رکھتا دو یا تین تیر چلانے کا وقت نکل جاتا۔ میرے چلّے میں ابھی ایک تیر باقی تھا۔ میں آگے بڑھا، میرے یہ تینوں ساتھی مجھ سے پیچھے رہ گئے تھے۔ اب میرے مقابل دو آدمی تھے۔ ان میں سے ایک تنبل تھا وہ آگے بڑھا ہمارے درمیان ایک شاہراہ تھی۔ اس کی ایک جانب میں تھا اور دوسری طرف وہ، ہم اس شاہراہ پر پہنچ گئے۔ اب ہم ایک دوسرے کے روبرو تھے۔ چنانچہ میرا دایاں ہاتھ دشمن کی طرف تھا اور تنبل کا دایاں میری جانب تھا۔ وہاں تنبل مکمل طور پر مسلح اور میرے پاس شمشیر و ترکش کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ وہ تیر جو میرے ہاتھ میں تھا میں نے اس سے ہی اس کے سر کو نشانہ بنایا اور اس پر چلا دیا۔ اسی کیفیت میں ایک تیر میری دائیں ران میں آ کر لگا اور پار نکل گیا۔ میرے سر پر خود کے نیچے دو پلی گوشے دار ٹوپی تھی۔ تنبل نے تلوار سے میرے سر پر وار کیا۔ جس کی ضرب سے میرا سر سن ہو گیا۔ اگرچہ میری ٹوپی کا ایک دھاگا بھی نہیں کٹا لیکن میرا سر بری طرح زخمی ہو چکا تھا[17]۔

میرے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ تلوار کو میان سے نکال سکوں۔ دشمنوں کے نرغے میں بس یکہ و تنہا تھا۔ اب وہاں کھڑے رہنے کا موقع نہ تھا۔ چنانچہ اس کے سامنے سے میں نے اپنی باگیں موڑ لیں۔ میرے تیروں پر بھی تلوار کا ایک اور وار ہوا۔ ابھی میں سات آٹھ قدم ہی مڑا تھا کہ میری پیادہ سپاہ کے دو تین آدمی وہاں پہنچ کر میرے ہمراہ ہو گئے۔ مجھ پر حملہ کرنے کے بعد تنبل نے دوست ناصر پر بھی تلوار کا وار کیا۔ اور اس کے آدمیوں نے ایک تیر کی رسائی تک ہمارا تعاقب کیا

[16] گوشہ گیر۔ تیر کو سیدھا کرنے والا آلہ۔

[17] سر کی چوٹ۔ خود پر ضرب لگنے سے دماغ کھوپڑی کے اندر مل جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے دماغ کو عارضی یا مستقل صدمہ پہنچ سکتا ہے۔

خاکان ایک بڑی نہر ہونے کے باعث بہت وسیع اور گہری ہے اسی لئے اسے ہر جگہ سے پار نہیں کیا جاسکتا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ہماری نظر سامنے کے ایک گھاٹ پر پڑ گئی۔ نہر کو پار کرتے ہی دوست ناصر کا گھوڑا چونکہ کمزور تھا اسی لئے وہاں گر گیا مجبوراً ہمیں وہاں رکنا پڑا۔ اسے سوار کرا کے ان پشتوں سے گزر کر جو خرابوک اور قرا اغینہ کے درمیان واقع ہیں اصل راستے سے ہٹ کر اوش کی جانب روانہ ہوئے۔ جس وقت ہم ان پشتوں کے اوپر سے گزر رہے تھے مزید طغائی پہنچ کر ہمارے ہمراہ ہو گیا۔ اس کی بھی دائیں ٹانگ میں ران سے ذرا نیچے تیر لگا تھا۔ اگرچہ ران کے پار نہیں ہوا تھا مگر اوش تک آتے آتے اس کی حالت تشویشناک ہو چکی تھی۔ دشمن نے چونکہ ہمارے عمدہ آدمیوں کو گھوڑوں سے گرا دیا تھا اسی لئے ناصر بیگ، محمد علی مبشر، خواجہ محمد علی، خسرو کوکلداش اور نعمان چہرہ یہاں کام آئے ان کے علاوہ دوسرے چھوٹے بڑے سپاہی بھی مارے گئے۔

ماموں سے ملاقات

خاں تنبل کے تعقب میں اندجان کے نواح میں اترے الغ خاں[18] شکارگاہ کے کنارے میری نانی ایسن دولت بیگم کے باغ میں جو قوش تیگرمان کے نام سے موسوم ہے پڑاؤ کیا۔ کچک خاں[19] لنگر بابا توکل کے نزدیک اترے۔ دو روز بعد میں اوش نکل کر باہر آیا۔ اور الغ خاں (ورق ۹۱) سے میں نے قوش مان میں ملاقات کی۔ جس وقت میں نے خاں سے ملاقات کی انہوں نے وہ علاقے جو میرے حصے میں آئے تھے خاں خورد کے حوالے کر دیئے۔ جس کا عذر انہوں نے یہ پیش کیا کہ شیبانی خاں جیسے قومی دشمن نے سمرقند جیسے شہر پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور اس کی طاقت روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اسی مصلحت کی بنا پر کہ ہم خاں خورد کو اتنی دور سے لے کر آئے ہیں یہاں اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ ولایات دریائے خجند کے جنوب میں اندجان تک کا علاقہ خان خورد کا ہے اور دریائے خجند کے شمال میں جو ولایات واقع ہیں وہ انہوں نے اخسی کے ساتھ مجھے دینے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا ہے کہ جب اس ملک پر ہمارا تسلط ہو جائے گا تو سمرقند پہنچ کر اور اس پر قبضہ کر کے میرے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد تمام فرغنہ خاں خورد کی ملکیت ہوگا۔ یہ باتیں غالباً محض مجھے دلاسا دینے کے لئے کہی جا رہی تھیں۔ کیونکہ معلوم نہ تھا کہ جب وہ اپنے اقدام میں کامیاب ہو جائیں گے تو کیا رخ اختیار کریں گے۔ میرے لئے کوئی چارہ نہ تھا اسی لئے میں نے اسی پر اکتفا کیا۔

الغ خاں سے رخصت ہو کر گھوڑے پر سوار میں کچک خاں سے ملنے کے لئے جا ہی رہا تھا کہ راستے میں قنبر علی بیگ سلاخ میرے بالکل نزدیک آ گیا اور کہنے لگا۔ آپ نے یہ تو دیکھ ہی لیا کہ ولایات انہوں نے لے لیں اب تمہیں فوراً ہی اوش کی جانب روانہ ہو جانا چاہئے۔ وہاں پہنچ کر اور وہاں کے تمام قلعوں کو محکم کر کے سلطان احمد تنبل کے پاس اپنا آدمی بھیجو۔ اس کے ساتھ صلح کر لو مغلوں پر حملہ کر کے انہیں یہاں سے نکال دو۔ اس کے بعد ان ولایات کو بھائیوں میں تقسیم کر دو۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ تو درست ہے مگر یہ خاں میرے اپنے قوم و قبیلے کے لوگ ہیں۔ ان کی نوکری بجا لانا تنبل پر حکمرانی کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔ اس نے دیکھا کہ اس کی بات کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ چنانچہ وہ اپنی اس بات سے پشیمان ہو کر واپس چلا گیا۔ یہاں سے چل کر میں کچک خاں سے ملاقات کرنے کے لئے پہنچا۔ پہلی مرتبہ ملاقات کے لئے میں چونکہ اچانک ہی اطلاع کئے بغیر پہنچا تھا اس لئے انہیں اتنا موقع نہ مل سکا کہ گھوڑے سے اتر کر میرا استقبال کریں۔ چنانچہ اس ملاقات میں آداب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اس مرتبہ میں ان کے اتنے قریب آ گیا کہ وہ دوڑ کر خیمے کی طناب تک پہنچ گئے۔ میری ٹانگ میں چونکہ تیر لگا ہوا تھا اس بنا پر لکڑی کے سہارے مشکل سے ہی چل سکتا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے میرا شایان شان استقبال کیا۔ اب تو تم بہت بہادر ہو گئے ہو کہتے ہوئے انہوں نے میرا بازو پکڑا اور خیمے میں لے آئے یہ خیمہ نسبتاً چھوٹا ہی تیار کیا

۱۸۔ الغ خاں۔ بابر کے بڑے سوتیلے ماموں سلطان محمود خاں۔

۱۹۔ کچک خاں۔ بابر کے چھوٹے سوتیلے ماموں سلطان احمد خاں عرف الاچہ خاں۔

گیا تھا۔ وہ چونکہ اپنی ولایت کے گوشہ و کنار میں رہ کر پروان چڑھے تھے اس لئے ان کے خیمے اور نشست گاہ بے تکلف اور سپاہیانہ تھی۔ خربوزے، انگور، اصطبل کا سامان اور برتن سب ایک ہی جگہ جمع تھے جہاں وہ خود تھے۔

جراح کا علاج

خان خورد کے پاس سے اٹھ کر میں واپس اپنی لشکر گاہ میں آیا۔ میرے زخم کا علاج کرانے کے لئے انہوں نے آتیکہ بخشی نام کے اپنے جراح کو میرے پاس بھیجا۔ مغل جراح کو بخشی کہتے ہیں۔ جراحی کے کام میں وہ بہت ہوشیار تھا۔ اگر کسی کا بھیجا باہر نکل آتا وہ اس کا بھی علاج کر دیتا تھا۔ اگر رگوں میں کسی قسم کا زخم ہو جاتا تو وہ اس کو بھی صحیح کر دیتا۔ بعض زخموں پر وہ مرہم لگاتا اور بعض زخموں کا علاج کرنے کے لئے دوا کھانے کو دیتا۔ میری ران کے زخم کا علاج اس نے یہ تجویز کیا کہ اس پر لومڑی کی ٹانگ کی کھال کس کر باندھ دی۔ لیکن اس نے اس میں فلیتہ داخل نہیں کیا۔ اس نے ایک مرتبہ دوا کھانے کے لئے بھی کہا۔ اس نے خود ہی بتایا کہ ایک مرتبہ ایک شخص کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی، اور مٹھی برابر ہڈی تو بالکل ہی ریزہ ریزہ ہو چکی تھی۔ اس نے پنڈلی کے گوشت (ورق ۹۲) کو چاک کر کے تمام ریزہ ریزہ ہڈیوں کو باہر نکالا اور دوا کو آٹے کی طرح گوندھ کر اس میں بھر دیا۔ یہ دوا ہڈی کی طرح ہو گئی اور اس کی ٹانگ ٹھیک ہو گئی۔ وہ اپنے بارے میں بڑی عجیب و غریب باتیں بتایا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ اس ولایت کے جراح اُس جیسا علاج نہیں کر سکتے۔

قنبر علی نے جو باتیں مجھ سے کہیں تھیں اس سے اس کے دل میں خوف پیدا ہوا۔ اسی لئے تین چار دن بعد فرار ہو کر اندجان پہنچ گیا۔ کچھ دن بعد خانوں نے فیصلہ کیا اور ساریغ باش کو سردار لشکر بنا کر ایوب بیگ چک کو اپنا ہزاری لشکر اور حسن بارین کو بارین قبیلے کے ہزار افراد کے ہمراہ میرے ساتھ کر دیا۔ اور اس طرح ہزار دو ہزار آدمی اخسی کی جانب روانہ ہوئے۔ یہاں تنبل کا چھوٹا بھائی شیخ بایزید مقیم تھا اور کاسان میں شہباز قارلوق تھا۔ انہی دنوں شہباز وہاں سے نکل کر قلعہ نوکند کے سامنے پڑاؤ کئے ہوئے تھا۔ بنجر اتا کے سامنے سے دریائے خجند کو پار کر کے ہم نوکند پہنچ گئے اور یہاں سے شہباز پر یلغار کرنے کا ارادہ کیا۔ صبح کے نمودار ہونے سے قبل جس وقت ہم نوکند پہنچے تو امرا نے عرض کیا کہ دشمن چونکہ ہمارے ارادے سے باخبر ہو گیا ہے اس لئے مناسب یہی ہے کہ لشکر کی صفوں کو مرتب کئے بغیر ہی ہم ایک دوسرے کے قریب چلتے رہیں۔ اسی بنا پر ہم ذرا آہستہ روانہ ہوئے۔ جس وقت ہم اس کے نزدیک پہنچے تو وہ باخبر ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ باہر سے کوچ کر کے قلعے میں پہنچ گیا۔ اس طرح کے اتفاقات اکثر ہوئے ہیں کہ یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ دشمن باخبر ہو گیا ہے اور اس افواہ کو سچ جان کر لشکریوں نے تساہل سے کام لیا اور موقعہ ہاتھ سے نکل گیا۔ چنانچہ میرا تجربہ یہی ہے کہ جس وقت موقعہ ہاتھ لگ جائے تو اس پر قابو پانے کے لئے جدوجہد و اہتمام میں ذرا بھی کوتاہی نہ کرنی چاہئے۔ کیونکہ جب یہ موقعہ ہاتھ سے نکل گیا تو پھر پچھتانے سے کیا فائدہ صبح کے وقت قلعے کے اطراف میں معمولی سی جنگ ہوئی مگر اس میں سنجیدگی سے حصہ نہیں لیا گیا۔ جانوروں کے لئے چارا مہیا کرنے کے خیال سے ہم نے نوکند سے کوہستانی سلسلے کی جانب بشاران کی طرف رخ کیا۔ شہباز قارلوق نے اس موقعے کو غنیمت جان کر نوکند پر یورش کر دی اور وہاں سے فرار ہو کر کاسان کی جانب چلا گیا۔ ہم واپس نوکند آ کر وہیں مقیم ہو گئے۔ اس عرصے میں ہمارے لشکر چند مرتبہ اطراف و جوانب میں گئے اور وہاں انہوں نے لشکر کشی بھی کی۔ ایک مرتبہ انہوں نے اخسی پہنچ کر اس پر حملہ بھی کیا۔ شہباز، اوزون حسن کے متبنی (جس کا نام میرم تھا) کے ساتھ جنگ کے ارادے سے آیا۔ انہوں نے جنگ تو کی مگر پسپا ہوئے اور میرم کی موت وہیں ہو گئی۔

اخسی کے محکم قلعوں میں ایک قلعہ پاپ ہے۔ قلعے کے لوگوں نے قلعہ پاپ کو مضبوط کر کے اپنا آدمی بھیجا۔ سید قاسم کے ہمراہ چند جوان روانہ کئے گئے۔ اخسی کے بالائی حصے میں جو گاؤں آباد ہیں وہاں سے ہم نے

دریا پار کیا اور اس جگہ پہنچ کر قلعے میں داخل ہوگئے۔ چند روز بعد عجیب واقعہ پیش آیا۔ اس وقت ابراہیم چاپق تغائی، احمد قاسم کہبر، قاسم ختیکہ ارغون اور شیخ بایزید اخسی میں موجود تھے۔ ان مزکورہ اشخاص کے ساتھ تنبل نے دوسو جوان ہمراہ کر دیئے۔ اور انہیں اچانک پاپ پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔ سیّد قاسم نے احتیاط سے کام نہ لیا۔ وہ گہری نیند سویا گیا تھا دشمن کے سپاہی قلعے تک پہنچ گئے اور سیڑھیاں لگا کر اوپر چڑھ آئے۔ انہوں نے دروازوں پر قبضہ کر کے پل رواں نصب کر دیا۔ (ورق ۹۳) اس وقت تقریباً اسّی جوان جو قلعے میں موجود تھے نکل کر آئے سیّد قاسم کو جب خبر ہوئی تو خواب آلودہ ایک کرتے میں وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پانچ چھ آدمیوں کو ساتھ لے کر تیر اندازی کر کے اور مارتے مارتے انہیں باہر نکال دیا اور چند آدمیوں کے سر کاٹ کر میرے پاس روانہ کر دیئے۔ اگرچہ اس طرح غفلت سے سوئے رہنا شان سرداری کے خلاف ہے مگر آدمیوں کی کمی کے باوجود مسلح جوانوں کو مار مار کر باہر نکال دینا بھی بڑی ہمت و جوانمردی کا کام تھا۔

اس دوران خاں سردار تو قلعہ اندجان کا محاصرہ کرنے میں مشغول تھے مگر اہل قلعہ انہیں پاس نہیں آنے دیتے تھے۔ جوان گھوڑوں پر سوار ہو کر باہر آتے اور دونوں کے درمیان خوب جنگ رہتی۔

شیخ بایزید نے میری حکومت سے خیر خواہی کا اظہار کرنے کی غرض سے آدمی بھیجنے شروع کئے اور تاکید سے ہمیں اخسی آنے کی دعوت دی۔ مجھے اس طرح تاکید کیساتھ بلانے میں یہ غرض پنہاں تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی بہانے مجھے خاں سرداروں سے علیحدہ کر دے۔ کیونکہ یہ خاں سردار مجھ سے علیحدہ ہونے کے بعد اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ مجھے اپنے پاس بلانے کی دعوت اس نے اپنے بڑے بھائی تنبل سے مشورہ کر کے ہی دی ہوگی۔ لیکن خاں سرداروں سے علیحدہ ہو کر اس کے ساتھ اتحاد کر لینا میرے لئے قطعی دشوار تھا۔ خاں سرداروں کو اشارہ کر دیا گیا کہ شیخ بایزید نے مجھے اپنے پاس بلانے کی دعوت دی ہے۔ انہوں نے مجھے یہ ہدایت کی کہ اس کے پاس جاؤں اور جس طرح بھی ہو سکے اسے گرفتار کر لوں۔ اس طرح کا مکر و فریب میرا شیوہ نہ تھا۔ بالخصوص اس صورت میں جب کہ ہمارے درمیان معاہدہ بھی ہو چکا ہو تو اس حالت میں کس طرح عہد شکنی کی جا سکتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے دل میں یہ خیال آیا کہ خواہ کچھ بھی ہو ہمیں اخسی تک پہنچ ہی جانا چاہئے۔ اس صورت میں یا تو شیخ بایزید تنبل سے قطع تعلق کر لے گا اور ہماری طرف ہو جائیگا یا کوئی ایسی صورت نکل آئے گی جو ہماری حکومت کے حق میں مفید ہو سکے۔ چنانچہ ہم نے بھی آدمی بھیجے اور چونکہ ہمیں اخسی آنے کی دعوت دی گئی تھی اسی لئے عہد و پیمان کر کے ہم اس طرف روانہ ہوگئے۔ وہ ہمارے استقبال کے لئے آیا اور اپنے ساتھ میرے بھائی ناصر مرزا کو بھی لایا۔ اب وہ ہمیں اپنے ساتھ لیکر قلعہ اخسی میں داخل ہوا۔ اس سنگین قلعے کی عمارات میں سے جو میرے والد کی تھیں اس نے میری رہائش کے لئے جگہ متعین کی۔ چنانچہ وہاں پہنچ کر میں قیام کرنے کی غرض سے اترا۔

تنبل نے شیبانی خاں کے پاس اپنے بڑے بھائی بیگ تلبہ کو بھیجا۔ اطاعت و فرمان برداری کا اظہار کرتے ہوئے اس نے اسے فرغنہ آنے کی دعوت دی۔ اسی دوران شیبانی خاں کے نشانات بھی آئے جن میں اس نے لکھ کر یہ بتایا تھا کہ میں آ رہا ہوں۔ یہ خبر ملتے ہی سب خاں سردار بے سر و پا ہوگئے۔ اب وہ یہاں نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ اسی لئے وہ اندجان کی جانب روانہ ہونے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

خاں خورد کے بارے میں اگرچہ یہ مشہور تھا کہ وہ عادل اور نیک دل مسلمان ہے۔ لیکن اوش، مرغینان اور دیگر مقامات جو میرے تحت تصرّف تھے وہاں جو مغل متعیّن کئے گئے تھے وہ خلاف توقع لوگوں کیساتھ جور و ستم اور بد معاشی کے سلوک پر اتر آئے تھے۔ خاں سرداروں نے جیسے ہی اندجان کا محاصرہ اٹھایا اوش اور مرغینان کے لوگوں نے یورش کر دی۔ چنانچہ جو مغل قلعے میں موجود تھے انہیں تاخت و تاراج و گرفتار اور زد و کوب کر کے قلعے سے باہر نکال دیا۔ ان خاں سرداون نے دریائے خجند پار نہیں کیا بلکہ مرغینان اور کند بادام کے راستے سے واپس

آ کر خجند سے دریا کو عبور کیا۔ تنبل ان خاں سرداروں کے عقب میں مرغینان پہنچا۔ ہم اس وقت عجب تردد کا شکار تھے۔ ہمیں مناسب نہ معلوم ہوا کہ بلاسبب وہاں جائیں اور پھر واپس آئیں۔ ایک روز صبح کے وقت تنبل سے علیحدہ ہو کر اور اس سے فرار ہو کر جہانگیر مرزا میرے پاس آیا۔ میں اس وقت حمام میں تھا کہ مرزا پہنچ گیا۔ میں نے اس سے ملاقات کی اس وقت شیخ بایزید بھی مضطرب و پریشان وہاں موجود تھا۔ (ورق ۹۴) وہ سراسیمہ و حواس باختہ تھا۔ مرزا اور ابراہیم بیگ نے مشورہ دیا کہ شیخ بایزید کو گرفتار کر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا جائے۔ فی الواقع ہونا بھی ایسا ہی چاہئے تھا۔ لیکن میں نے ان سے کہا کہ ہم جب اس سے عہد کر چکے ہیں تو عہد شکنی کس طرح کی جا سکتی ہے۔ شیخ بایزید قلعے میں چلا گیا سرپل کسی کو پہرے پر ہونا چاہئے تھا مگر وہاں بھی کس شخص کو ہم نے مقرر نہیں کیا اور یہ تمام مسائل محض ہماری ناتجربہ کاری کے باعث پیش آئے۔ ابھی صبح نمودار ہی ہوئی تھی کہ تنبل دو تین ہزار مسلح افراد کے ساتھ وہاں آن پہنچا اور پل پار کر کے قلعے میں داخل ہو گیا۔ امر واقعی یہ ہے کہ اس وقت میرے ساتھ سپاہ کی تعداد نسبتاً کم تھی۔ جب میں واپس اخسی آیا تھا تو بعض آدمیوں کو قلعوں پر کچھ کو اضلاع میں اور بعض کو رسد فراہم کرنے کی غرض سے مختلف اطرف میں روانہ کر دیا تھا۔ اس وقت اخسی میں میرے ساتھ سو سے زیادہ کچھ ہی لوگ ہوں انہیں ہی ساتھ لے کر میں سوار ہوا۔ ہر کوچے کے سرے پر جوانوں کو مقرر کرتا ہوا میں سامان جنگ جمع کر ہی رہا تھا کہ تنبل کی جانب سے شیخ بایزید، قنبر علی اور محمد دوست صلح کی بات کرنے کی غرض سے آئے۔ وہ لوگ جنہیں جنگ کیلئے مقرر کیا گیا تھا انہیں ان کی جگہ پہرے پر متعین کر کے میں اپنے والد کے مقبرے میں جا کر قیام پزیر ہوا۔ میں نے جہانگیر مرزا کو بلایا، محمد دوست خود ہی واپس چلا گیا۔ شیخ بایزید اور قنبر علی ایک ساتھ آئے۔ مقبرے کے جنوبی ایوان میں، ہم مشورہ کر ہی رہے تھے کہ جہانگر مرزا نے ابراہیم چاپوق کے ساتھ مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ان دونوں گرفتار کر لیا جائے۔ اس اثنا میں جہانگیر مرزا نے میرے کان میں یہ بات کہی کہ انہیں گرفتار کر لیا جائے لیکن میں نے کہا عجلت سے کام نہ لو۔ بات گرفتار کرنے سے آگے نکل چکی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شاید باہمی صلح و مشورے سے کوئی کام بن جائے کیونکہ وہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور ہم بہت کم۔ اس کے علاوہ وہ اپنی پوری قوت و توانائی کے ساتھ قلعے میں ہیں اور ہم اس ضعف و ناتوانی کی حالت میں قلعے سے باہر۔ شیخ بایزید اور قنبر علی موجود تھے کہ جہانگیر مرزا نے ابراہیم بیگ کی طرف دیکھا اور اسے اشارہ کیا مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ برعکس سمجھا یا اس نے چالاکی دکھائی بہر صورت اس نے اسی وقت بایزید کو پکڑ لیا۔ اور جو جوان وہاں متعین تھے وہ ان پر ہر طرف سے ٹوٹ پڑے۔ اب کام صلح و صلاح سے گزر چکا تھا۔ ان دونوں کو اپنے آدمیوں کے حوالے کر کے ہم جنگ کرنے کے لئے سوار ہوئے۔ شہر کی ایک جانب کا پورا علاقہ جہانگیر مرزا کی تحویل میں دے دیا گیا۔ مرزا کے ساتھ چونکہ آدمیوں کی تعداد کم تھی اسی لئے میں نے اپنے آدمیوں میں سے ایک دستہ مرزا کی مدد کے لئے متعین کیا۔ اول میں وہاں پہنچا اور ہر جگہ جنگ کے لئے آدمی مقرر کئے پھر دوسری طرف گیا۔ شہر میں ایک کشادہ وسیع میدان تھا۔ میں نے وہاں جوانوں کے ایک دستے کو متعین کیا اور پھر آگے نکل گیا۔ اس دستے پر بہت سے دشمن گھوڑے سوار اور پیادہ سپاہی ٹوٹ پڑے اور انہوں نے ہمارے لوگوں کو وہاں سے بھگا کر گلی کوچوں میں دھکیل دیا۔ اس وقت میں وہاں پہنچا اور پہنچتے ہی ان پر اپنا گھوڑا دوڑایا۔ جس کے باعث وہ وہاں ٹھہر نہ سکے بلکہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں اپنے جوانوں کو گلی کوچوں میں سے نکال کر پھر میدان میں لے آیا۔ جس وقت میں میان سے تلوار نکال ہی رہا تھا کہ میرے گھوڑے کی ٹانگ پر تیر آ کر لگا۔ جس کی وجہ سے میرا گھوڑا بھڑک اٹھا اور عین دشمن کے نرغے میں اس نے مجھے زمین پر گرا دیا۔ میں جست لگا کر اٹھا اور تیر سے وار کیا۔ (ورق ۹۵) اس وقت کاہل صاحب قدم وہاں میرے ساتھ موجود تھا، جس کے پاس ایک مریل سا گھوڑا تھا۔ اس پر سے اتر کر اس نے گھوڑا میری طرف بڑھا دیا۔ میں اس پر سوار ہوا اور ایک شخص کو یہاں متعین کر کے دوسرے

کوچے کی جانب متوجہ ہوا۔ سلطان محمود ولیس نے میرے گھوڑے کی لاغری کو دیکھا، اس نے اپنے گھوڑے سے اتر کر اسے مجھے پیش کیا اور میں اس پر سوار ہوا۔ اس وقت قاسم بیگ کالڑ کا قنبر علی بیگ زخمی حالت میں جہانگیر مرزا کے پاس سے آیا اور کہنے لگا کہ ابھی کچھ ہی عرصہ گزرا ہے کہ جہانگیر مرزا پر قوت آزمائی کر کے اسے اس کی جگہ پر سے ہٹا دیا گیا ہے اور وہ وہاں سے نکل کر کسی طرف چلا گیا ہے یہ سن کر ہم حیران رہ گئے اسی وقت سید قاسم بھی جو قلعہ میں تھا، پہنچ گیا، اس کا وہاں آنا قطعی بے موقع تھا۔ ان حالات میں اگر وہ مضبوط قلعہ ہمارے ہاتھوں میں رہتا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ میں نے ابراہیم بیگ سے کہا اب کیا کرنا چاہیے اس وقت وہ کچھ حد تک زخمی تھا، معلوم نہیں کہ اس زخم کے باعث یا آزردہ دلی کی وجہ سے وہ کوئی معقول جواب نہ دے سکا۔ اس وقت ہی میرے دل میں یہ خیال آیا کہ پل کو پار کر کے اسے تباہ کر دوں اور اند جان کی طرف چلا جاؤں۔ اس وقت بابا شیر زاد نے بہت اچھا کیا جو یہ بات کہی کہ اسی دروازے پر زور آزمائی کر کے ہمیں باہر آ جانا چاہئے۔ اس کی اس بات کو دھیان میں رکھ کر ہم نے دروازے کی جانب رخ کیا۔ اس وقت خواجہ میر میران نے بھی بڑی جوانمردی دکھائی۔ جس وقت ہم کوچے میں پہنچے تو دیکھا سیّد قاسم اور دوست ناصر باقی خیر (خواجہ سرا) سے چپقلش[۲۰] کر رہے ہیں۔ میں، ابراہیم بیگ اور مرزا قلی کوکلداش ذرا آگے تھے۔ جیسے ہی ہم دروازے کے سامنے پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ شیخ بایزید کرتے پر صرف فرجی[۲۱] پہنچے ہوئے تین چار سواروں کے ساتھ دروازے سے نکل کر آ رہا ہے۔ میرے انگوٹھے پر جو اس وقت تیر تھا اسے ہی میں نے چلا دیا۔ جو اس کی گردن کے پار نکل گیا۔ یہ تیر کارگر ثابت ہوا۔ دروازے سے نکل کر وہ اس کوچے کی طرف اضطراب و سراسیمگی کی حالت میں بھاگا جو دائیں جانب تھا۔ ہم نے بھی اس کا تعاقب کیا صبح جس وقت ہم نے شیخ بایزید اور اس کے ساتھیوں کو اپنی مرضی کے خلاف پکڑا تھا اور وہ جہانگیر مرزا کے آدمیوں کی تحویل میں تھے جب وہ نکلے تو اپنے ساتھ شیخ بایزید کو بھی لیتے آئے۔ ہمارا خیال تھا کہ اسے قتل کر دیا ہوگا لیکن یہ اچھا ہی ہوا کہ اسے انہوں نے قتل نہیں کیا زندہ رہنے دیا۔ ان سے چھٹکارا پا کر وہ باہر آیا جس وقت دروازے سے وہ باہر نکل رہا تھا تو اس کا اور میرا سامنا ہو گیا۔ مرزا قلی کوکلداش نے اس کے ایک پیادے پر تلوار کا وار کیا۔ مرزا قلی کے وہاں سے گزر جانے پر دوسرے نے ابراہیم بیگ کو اپنے تیر کا نشانہ بنایا۔ ابراہیم بیگ ہائیں ہائیں کہتا ہوا وہاں سے گزر رہی رہا تھا کہ اس نے مجھے اتنے فاصلے سے جو صحن و دالان کے درمیان ہو سکتا ہے۔ اپنے تیر کا نشانہ بنایا۔ وہ میری بغل میں آ کر لگا اور قلماقی[۲۲] زرہ بکتر کی دو تہوں چیرتا ہوا انہیں چاک چاک کر گیا۔ تیر کا وار کرنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے بھاگا اور میں نے اس کی پیٹھ کو اپنے تیر کا نشانہ بنایا۔ اسی وقت ایک پیادہ فصیل سے بھاگ کر چلا جا رہا تھا، میں نے اس کی جو گوشہ ٹوپی کو اس طرح تیر کا نشانہ بنایا کہ وہ فصیل کے کنگورے سے جا لگی۔ چنانچہ اس کی وہ چوگوشہ ٹوپی کنگورے سے جا کر ایسی ٹکرائی کہ وہیں لٹکی رہ گئی اور اس کی دستار اس کے ہاتھ میں الجھ گئی۔ جس کوچے میں شیخ بایزید فرار ہوا تھا اسی سے ایک اور سوار میرے قریب سے بھاگا۔ میں نے اپنی تلوار کی نوک سے اس کی کنپٹی پر وار کیا۔ وہ اپنے گھوڑے پر ایک طرف کو جھک گیا اور دیوار کا سہارا لیا، وہ گھوڑے پر سے گرا تو نہیں لیکن بمشکل تمام اس نے فرار ہو کر نجات حاصل کی۔ دروازے پر جو سوار اور پیادے تھے میں نے انہیں بھی بھگا دیا اور دروازے پر قبضہ کر لیا۔ اب کام ہر تدبیر سے گزر چکا تھا۔ چنانچہ دو تین ہزار (ورق ۹۶) مسلح آدمی قلعے میں تھے اور ہم سو یا زیادہ سے زیادہ دو سو آدمی اس تنگی قلعے کے باہر۔ اس پر مزید طرّہ یہ کہ جتنی دیر میں دودھ میں ابال آئے اُس سے پہلے ہی وہ جہانگیر مرزا پر حملہ کر کے اسے پکڑ لائے۔ ہماری آدھی جمعیت تو اس کے ساتھ چلی گئی۔ اس تمام کیفیت کی بنا پر اور اپنی ناتجربہ کاری کے باعث ہم دروازے پر جم کر کھڑے ہو گئے۔ جہانگیر مرزا کے پاس آدمی بھیجا گیا، اگر وہ کہیں قریب ہو تو آ جائے تاکہ ایک مرتبہ پھر زور آزمائی کر لیں۔ لیکن اب بات ہمارے قابو سے باہر تھی۔ ابراہیم بیگ کا گھوڑا چونکہ زخمی ہو چکا تھا اسی لئے وہ کمزور

۲۰۔ چپقلش۔ تلوار کی لڑائی

۲۱۔ فرجی۔ قبا، لمبی پوشاک

۲۲۔ قلماقی۔ قلماق کی صفت۔ قلماق ایک بدھ خانہ بدوش قبیلہ ہے جو کاشغر کے مشرق میں رہتا ہے۔ ترک عام طور پر یہ لفظ سب مغل خانہ بدوش قبائل کے واسطے استعمال کرتے تھے (ترکی زبان، شاہ) بابر کی یہ زرہ بکتر ان قبائل کے پاس سے آئی ہوگی۔

تھا۔اس نے کہا کہ میرا گھوڑا ناکارہ ہو گیا ہے۔محمد علی مبشر کے ساتھ سلیمان نامی نوکر تھا۔اس سے پہلے کہ کوئی اُس سے کچھ کہے وہ خود ہی گھوڑے پر سے اتر گیا اور اسے ابراہیم بیگ کے حوالے کر دیا یہ بڑی مردانگی تھی۔اُس وقت جب کہ ہم اُس دروازے پر کھڑے ہوئے تھے کچیک علی نے جو اس وقت ضلع کول کا شقدار ہے بڑی بہادری و مردانگی دکھائی۔اُس وقت وہ سلطان محمد ویس کا نوکر تھا اور اوش کے میدان کارزار میں دو مرتبہ اپنی مردانگی دکھا چکا تھا۔اس وقت تک جبکہ مرزا جہانگیر کے پاس جو قاصد گیا تھا واپس آئے وہ وہیں دروازے پر مستعدی سے کھڑا رہا۔جو شخص گیا تھا وہ واپس آ گیا اور اس نے بتایا کہ کافی عرصہ ہوا مرزا یہاں آیا تھا اور وہ آ کر چلا بھی گیا ہے۔اب یہاں کھڑے رہنے سے کوئی کام بننے والا نہ تھا۔چنانچہ ہم بھی روانہ ہوئے۔ہم جو یہاں اس قدر عرصے تک کھڑے رہے تھے وہ کسی حساب وشمار میں نہیں تھا۔اب ہمارے ساتھ بس بیس تیس ہی افراد رہ گئے تھے۔جیسے ہی ہم وہاں سے روانہ ہوئے بہت سے لوگ ہمارے اردگرد جمع ہونے لگے۔ہم جیسے ہی چلے شہر کی جانب سے دشمن کے آدمی آن پہنچے۔اس وقت قاسم بیگ کے لڑکے حمزہ کے نانا بندہ علی بیگ نے ابراہیم بیگ کو للکارا کہ تو اپنے جوش وولولے کی بڑی ڈینگیں مارا کرتا تھا۔اب سامنے آ تا کہ تلوار کے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔اس وقت ابراہیم بیگ میرے بالکل قریب ہی کھڑا تھا۔نادان لوگ ہی اس طرح شکست کھا کر ایسی ڈینگیں مارا کرتے ہیں۔یہاں اس کا کیا محل وموقع ہے اب ہمارے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ دیر کریں یا یہاں رکے رہیں۔چنانچہ تیزی سے روانہ ہو گئے۔دشمن ہمارے پیچھے سرپٹ دوڑا چلا آ رہا تھا اور ہمارے آدمیوں کو ان کے گھوڑوں پر سے اتار رہا تھا۔

اخسی سے فرار

اخسی سے ایک شرعی کے فاصلے پر گنبد چمن نامی مقام ہے۔ہم اس جگہ سے گزرے ہی تھے کہ ابراہیم بیگ نے آواز دے کر مجھے پکارا۔میں نے پلٹ کر دیکھا، کہ شیخ بایزید کا کم عمر نوکر ابراہیم بیگ کے پاس پہنچ گیا ہے۔میں نے اپنے گھوڑے کی باگیں موڑیں۔خان قلی بیان قلی میرے بالکل قریب تھا۔اس نے کہا کہ واپس جانا صحیح نہیں۔یہ کہہ کر اس نے میری لگامیں سنبھالیں اور ہم بھاگے جب تک ہم سنگ نامی مقام پر پہنچیں ہمارے بہت سے آدمیوں کو گھوڑوں سے اتارا جا چکا تھا۔اخسی سے سنگ نامی جگہ دو شرعی کے فاصلے پر واقع ہے۔ہم جب سنگ سے گزرے تو ہمیں پیچھے نہ ہی دشمن دکھائی دیا اور نا ہی اپنے آدمی نظر آئے۔دریائے سنگ کے بہاؤ کے خلاف ہم روانہ ہوئے۔اس وقت ہم بس آٹھ آدمی یعنی دوست ناصر، قاسم بیگ کا لڑکا قمبر علی، خان قلی بیان قلی، مرزا قلی کوکلداش، شاہم ناصر، عبدالقدوس سیدی قرا اور خواجہ حسینی رہ گئے تھے۔ان سب میں آٹھواں میں تھا۔اس وقت جبکہ ہم دریا کی بالائی جانب بڑھ رہے تھے تو ہمیں ایک پتلا سا راستہ دکھائی دیا۔چنانچہ درّوں میں سے عام راستے سے ہٹ کر سنسان جگہوں پر ہم اسی طرح بالائی جانب بڑھتے رہے۔دریا کو ہم نے دائیں جانب چھوڑ کر دوسرا خشکی کا راستہ اختیار کیا۔نماز ظہر کا وقت تھا جو ہم ان درّوں سے نکل کر میدان میں پہنچے۔جہاں ہمیں دور سے سیاہی نظر آئی (ورق ۹۷) میں نے اپنے آدمیوں کو محفوظ جگہ پر متعین کیا اور خود گھوڑے سے اتر کر پیادہ ایک ٹیلے پر چڑھ گیا تا کہ گردونواح کی خبر گیری کر سکوں۔ہمارے پیچھے کافی تعداد میں سوار اپنے گھوڑے دوڑائے ٹیلے کی طرف چلے آ رہے تھے۔وہ تعداد میں زیادہ تھے یا کم اس کے بارے میں اس وقت تجزیہ ممکن نہیں تھا۔چنانچہ سوار ہو کر ہم نے اپنی راہ لی۔یہ لوگ جو ہمارے پیچھے آ رہے تھے تعداد میں کل پچیس تھے اور ہم صرف آٹھ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔اگر پہلی ہی نظر میں ہمیں یہ معلوم ہو گیا ہوتا کہ یہ تعداد میں کتنے ہیں تو ہم ان کے ساتھ اچھی طرح نبرد آزمائی کرتے لیکن ہم نے یہ سوچ کر کہ انہیں پیچھے سے کمک پہنچ جائے گی ہم وہاں سے آگے روانہ

ہوگئے۔ فرار ہوتے ہوئے دشمن کی تعداد خواہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو وہ مقابلہ نہیں کرسکتا۔ چنانچہ بزرگوں کا قول ہے کہ شکست خوردہ فوج کے لئے ایک "ہو" ہی کافی ہے۔

خان قلی نے کہا کہ اس طرح کام نہیں چلے گا۔ وہ ہم سب کو پکڑ لیں گے۔ ان گھوڑوں میں سے تم دو عمدہ گھوڑے چن لو۔ تم اور مرزا قلی کوکلداش ایک دوسرے کے گھوڑوں کو ساتھ کا گھوڑا بنا کر تیزی دکھاؤ شاید بچ کر نکل سکو۔ اس کا یہ مشورہ برا نہ تھا۔ اگر میدان کارزار گرم نہ ہوتا تو یہی پیش آتا۔ اس اقدام میں رہائی کا امکان بھی تھا۔ مگر ایسی صورت میں ایک ساتھی کو اس کے گھوڑے سے محروم کر کے دشمن کے نرغے میں چھوڑ دینا ہمیں گوارا نہ ہوا۔ بالآخر وہ خود ہی ایک ایک کر کے اپنے گھوڑوں پر پیچھے رہتے گئے۔ میرا گھوڑا کچھ زیادہ ہی سست ہوگیا تھا۔ خان قلی اپنے گھوڑے سے اترا اور وہ اس نے مجھے پیش کر دیا۔ میں نے اپنے گھوڑے سے چھلانگ لگائی اور اس کے گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ خان قلی میرے گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ اسی کیفیت میں شاہم ناصر، عبدالقدوس سیدی قرا کو بھی جو ذرا زیادہ پیچھے رہ گئے تھے دشمن نے ان کے گھوڑوں پر سے اتارا اور ان کے گھوڑے چھین لئے۔ خان قلی بھی پیچھے رہ گیا تھا۔ اس وقت ایسا موقعہ نہ تھا کہ اس کی حمایت و مدد کی جائے۔ کہتے ہیں کہ اپنے گھوڑے کی توانائی دیکھ کر ہی اس پر سواری کی جاتی ہے۔ اور جس کا گھوڑا تھک گیا، وہ خود بھی ہار گیا۔ دوست بیگ کا گھوڑا بھی ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ وہ گھوڑا جس پر میں سوار تھا وہ بھی سست ہونے لگا تھا۔ قنبر علی اپنے گھوڑے سے اترا اور اسے میرے حوالے کر دیا۔ میں اس پر سوار ہوا۔ قنبر علی میرے گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ اور وہیں رہ گیا۔ خواجہ حسینی لنگڑا آدمی تھا۔ وہ لنگڑاتے ہوئے کسی نہ کسی طرح ٹیلے تک پہنچ گیا۔ میں اور مرزا قلی کوکلداش رہ گئے، گھوڑوں میں اتنی سکت نہ تھی کہ انہیں تیز دوڑایا جاسکے۔ انہیں بس دلکی چال پر ہی چلایا جاسکتا تھا۔ مرزا قلی کا گھوڑا بھی سستی دکھانے لگا۔ میں نے اس سے کہا کہ تجھے چھوڑ کر اب میں کہاں جاؤں۔ اب ہم مریں یا زندہ بچیں لیکن ایک ساتھ ہی رہیں گے۔ مرزا قلی کو پیچھے دیکھتا ہوا میں راستہ چل رہا تھا۔ آخر مرزا قلی نے کہہ ہی دیا کہ میرا گھوڑا بالکل تھک چکا ہے، اب تم میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اگر تم میرا خیال کرو گے تو خود کسی بلا میں پھنس جاؤ گے۔ اب تم اپنی راہ لو شاید بچ نکلو۔ اس وقت میری عجب کس مپرسی کی حالت تھی مرزا قلی بھی تھک رہا اور میں تنہا رہ گیا۔

دشمن کے دو آدمی نظر آئے۔ ان میں سے ایک کا نام بابا سرامی تھا اور دوسرے کا بندہ علی۔ وہ دونوں میرے قریب آئے۔ میرا گھوڑا بالکل تھک چکا تھا اور پہاڑ ابھی ایک کروہ فاصلے پر، ایک پتھریلی چٹان راستے میں تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ گھوڑا تھک چکا ہے اور پہاڑ بھی دور ہے۔ اب میں جاؤں تو کہاں جاؤں۔ اس وقت میرے ترکش میں بیس تیر تھے۔ کیا اس پتھریلی چٹان کے پاس اتر جاؤں اور جب تک میرے پاس تیر ہیں انہیں چلاتا رہوں۔ پھر میرے دل میں یہ خیال آیا کہ شاید پہاڑ تک پہنچ سکوں۔ پہاڑ پر پہنچنے کے بعد کچھ تیر کمر کی پٹی میں پھنسا کر پہاڑ پر رینگتا رینگتا اوپر چڑھ جاؤں۔ مجھے اپنی ٹانگوں پر بڑا بھروسہ تھا۔ چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر روانہ ہوگیا۔ میرے گھوڑے میں اب اتنی سکت بھی باقی نہیں تھی کہ وہ دلکی چال بھی چل سکے۔ (ورق ۹۸) دشمن کے جو دو آدمی نظر آئے تھے میرے تیر کی زد سے باہر تھے۔ میں نے اپنا تیر تلف نہ کیا۔ انہوں نے بھی احتیاط سے کام لیا دور ہی دور رہے اور زیادہ نزدیک نہ آئے۔ وہ اسی طرح میرے پیچھے پیچھے چلے آرہے تھے۔ جس وقت آفتاب غروب ہو رہا تھا تو ہم پہاڑی کے نزدیک پہنچے۔ انہوں نے اچانک پکار کر کہا کہ اسی طرح کہاں تک چلتے رہو گے۔ جہانگیر مرزا کو وہ پکڑ کر لے گئے ہیں۔ ناصر مرزا تو ان کے ہاتھوں ہی میں تھا۔ اُن کی ان باتوں سے میرے دل میں بڑا دغدغہ پیدا ہوا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ اگر ہم سب ان کے چنگل میں رہے تو خطرے کا احتمال بہت زیادہ تھا۔ میں نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا بلکہ پہاڑی کی طرف چلتا ہی رہا۔ ہم نے کافی راستہ طے کر لیا تھا کہ انہوں نے پھر پکارنا شروع کر دیا۔ اس مرتبہ پہلے کے مقابلے ان کے لہجے میں ذرا نرمی تھی۔ انہوں نے

گھوڑوں سے اتر کر باتیں کرنا شروع کر دیں۔ میں نے ان کی باتوں پر ذرا بھی کان نہ دھرا اور تھکے قدموں سے چلتا ہی رہا۔ میں درّے کی چڑھائی پر آگے کی طرف بڑھ رہا تھا بالآخر مجھے ایسا بڑا ٹیلہ نظر آیا جو کسی گھر سے کم نہ تھا۔ میں اُس ٹیلے کے پیچھے گیا بڑے بڑے پتھر تھے جن پر سے گھوڑا نہیں گزارا جا سکتا تھا۔ وہ بھی گھوڑوں سے اتر گئے۔ اب انہوں نے احترام تعظیم کے ساتھ ذرا زیادہ نرم لہجے میں گفتگو شروع کی۔ اس طرح اس اندھیری رات میں جہاں راستے تک دکھائی نہیں دیتے کہاں تک بھٹکتے پھرو گے۔ انہوں نے قسم کھا کر مجھے یقین دلایا کہ سلطان احمد (تنبل) تمہیں تخت شاہی پر متمکن کرنا چاہتا ہے میں نے کہا مگر یہ بات میرے دل کو نہیں لگتی اور وہاں پہنچنا بھی ممکن نہیں۔ اگر تمہیں میری خدمت کرنے کا ایسا ہی خیال ہے تو یہ موقعہ تمہیں سالہا سال تک نہ ملے گا، مجھے بس ایک راستے پر پہنچا دو تا کہ میں خاں سرداروں کے پاس پہنچ جاؤں۔ اگر تم مجھے راستہ دکھا دو گے تو زیادہ مراعات وشفقت کے ساتھ پیش آؤں گا جس کا خیال تمہارے دلوں میں ہے اور اگر تم یہ نہیں کر سکتے تو جس راہ سے آئے ہو اسی سے واپس چلے جاؤ۔ یہی میرے لئے تمہاری بہت عمدہ خدمت ہوگی۔ میری تقدیر میں جو ہے وہ میرے ساتھ ہو کر ہی رہے گا۔ انہوں نے کہا کہ اے کاش ہم نہ آئے ہوتے۔ آپ سے منہ موڑ کر اب ہم کیسے واپس جا سکتے ہیں۔ جب آپ وہاں جانا نہیں چاہتے تو آپ جہاں کہیں بھی جائیں گے ہم آپ کی خدمت میں حاضر رہیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ اپنے قول کی صداقت کا مجھ سے عہد کرو۔ انہوں نے قرآن مجید کی موٹی موٹی قسمیں کھا کر اپنے قول کی پاسداری کا مجھ سے عہد کیا ان کی اس بات سے مجھے فوری طور پر اطمینان ہو گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ اسی درّے میں مجھے ایک چوڑا راستہ دکھایا گیا تھا اب تم مجھے اُسی پر لے چلو۔ اگرچہ انہوں نے مجھ سے عہد تو کر لیا مگر مجھے مکمل اطمینان نہ ہوا۔ میں نے انہیں آگے آگے رکھا اور خود ان کے پیچھے روانہ ہوا۔ کوئی دو کروہ راہ چلے ہوں گے کہ ایک تیز رفتار ندی کے پاس پہنچے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کشادہ درّہ جس کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کیا وہ یہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ راستہ ذرا دور ہے اور ابھی بہت آگے ہے۔ اگرچہ اُس کشادہ درّے کا راستہ وہی تھا۔ درحقیقت وہ عہد شکنی پر اتر آئے تھے اور اصل بات مجھ سے چھپا رہے تھے۔ نصف شب تک ہم راستہ پر چلتے رہے اور ایک بار پھر ایک ندی کے پاس پہنچے۔ اس اثنا میں انہوں نے مجھے بتایا کہ ہم خود راستہ بھٹک گئے ہیں کشادہ درّے کا راستہ پیچھے رہ گیا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ غوا کی جانب جانے والی راہ قریب ہی ہے اور وہاں سے فرکت کی طرف راستہ جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے وہی راستہ اختیار کیا۔ تین پہر رات گزر چکی تھی۔ اُس وقت ہم کرنان کے نزدیک پہنچے۔ یہ تنگ گھاٹی غوا سے نکلنے کے بعد آتی ہے۔ یہاں بابا سیرامی نے کہا کہ تم یہاں رکو۔ میں غوا کا راستہ اچھی طرح معلوم کر کے آتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آ گیا اور کہنے لگا کہ کچھ لوگ اس راستے سے ہو کر میدان میں پہنچے ہیں۔ (ورق ۹۹) اسی لئے یہاں سے نہیں گزرا جا سکتا۔ میں اس کی یہ بات سن کر حیران رہ گیا۔ اس وقت ہم بالکل بیچ میدان میں تھے۔ صبح ہوا ہی چاہتی تھی اور منزل ابھی بہت دور تھی۔ میں نے کہا کہ کوئی جگہ تلاش کرو تا کہ دن کے وقت ہم وہاں چھپ رہیں جب رات ہو گی تو گھوڑوں پر سوار ہو کر دریائے خجند پار کر کے شہر خجند میں پہنچ جائیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ وہاں ایک پشتہ ہے جس میں پناہ لی جا سکتی ہے۔

بندہ علی کرنان کا داروغہ تھا۔ اس نے کہا کہ اب ہم کو کچھ کھانا چاہیے اور گھوڑوں کو بھی چارا دیں۔ میں کرنان کی طرف جاتا ہوں۔ وہاں سے جو بھی ہاتھ آئے گا لے کر آتا ہوں۔ وہاں سے واپس ہو کر ہم نے کرنان کی جانب رخ کیا۔ وہاں پہنچنے سے ایک کروہ پہلے ہی ہم رک گئے۔ بندہ علی چلا گیا اور کافی دیر تک واپس نہ آیا۔ صبح ہونے میں دیر نہ تھی اور اس مردود کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وقت شدید کرب واضطراب میں گزر رہا تھا۔ بالآخر وہ بھاگا بھاگا آیا، گھوڑوں کے لئے دانہ تو لے کر نہیں آیا البتہ تین نان لے آیا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک نے ایک نان اٹھایا اور

اسے بغل میں دبا کر نہایت اضطراب میں وہاں سے واپس آئے اور اس پشتے پر پہنچ گئے جہاں ہم پناہ لینی چاہتے تھے۔ گھوڑوں کو تالابوں کے پاس باندھ کر ہم میں سے ہر ایک کسی نہ کسی ایک بلند جگہ پر پہنچ گیا اور پہرہ دینے لگا۔

تقریباً آدھا دن گزر چکا تھا۔ اس وقت احمد قورچی چار گھوڑوں کے ساتھ غوا سے اخسی کی جانب جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسے بلاؤں وعدہ وعید اور منت سماجت کر کے کہوں کہ وہ اپنے گھوڑے ہمیں دیدے۔ کیونکہ ہمارے گھوڑے ایک دن اور ایک رات مسلسل چابک کی مار کھاتے رہے۔ انہیں کھانے کو دانہ تک نہیں ملا تھا اور تھک کر بالکل چور چور ہو چکے تھے۔ مگر دل کو یہ گوارا نہ ہوا کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔ چنانچہ جو لوگ ہمارے ساتھ تھے ان سے مشورہ کر کے ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ رات کے وقت بہر صورت ہمیں کرنان میں ہی رہنا چاہیے۔ رات کے وقت چھپتے چھپاتے باہر نکل کر ان گھوڑوں کو پکڑیں گے تا کہ خود کو کسی جگہ پہنچا سکیں۔

دوپہر کا وقت ہو گیا تھا۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی، گھوڑے پر کوئی چمکتی ہوئی چیز نظر آئی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کیا ہے۔ یہ محمد باقر بیگ تھا جو اخسی میں ہمارے ساتھ تھا۔ چنانچہ جس وقت ہم وہاں سے نکل کر باہر آئے تو جس شخص کا جدھر منہ اٹھا وہ ادھر نکل گیا۔ محمد باقر بیگ اس طرف نکل آیا تھا اور چھپا چھپا پھر رہا تھا۔ بندہ علی اور بابا سیرام نے کہا کہ گھوڑوں کو دو دن سے دانہ چارا نہیں ملا ہے، کسی وادی میں اتر کر گھوڑوں کو چرنے کے لئے چھوڑ دیں۔ چنانچہ ہم وہاں سے اتر کر نیچے وادی میں آئے اور گھوڑوں کو گھاس چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ عصر کا وقت تھا کہ اس پشتے پر جہاں ہم چھپے ہوئے تھے ایک سوار نمودار ہوا ہم نے اسے پہچان لیا۔ وہ غوا کا داروغہ قادر بردی تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ قادر بردی کو بلاؤ، چنانچہ اسے انہوں نے بلایا۔ ہم ملے احوال پرسی ہوئی۔ وہ بہت شفقت و عنایت سے پیش آیا۔ اس نے ہم سے مدد کا وعدہ کیا اور ہماری بڑی دل جوئی بھی کی۔ میں نے اس کے ساتھ اپنا آدمی روانہ کیا کہ رسی، گھاس کاٹنے کی کھرپی، کلہاڑی، دریا پار کرنے کے وسائل گھوڑوں کے لئے چارا، اور ہمارے لئے کھانے کا سامان مہیا کرے اور اگر ممکن ہو سکے تو گھوڑے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ جگہ مقرر کر دی گئی اور اسے یہ بتا دیا گیا کہ عشا کے وقت تک وہ وہاں پہنچ جائے۔

نماز عشا کا وقت گزر چکا تھا۔ ایک سوار کرنان سے غوا کی طرف جا رہا تھا۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ تو کون ہے (ورق ۱۰۰) اس نے کہا کہ میں محمد باقر بیگ ہوں۔ وہ جس جگہ پوشیدہ تھا وہاں سے دوسری جگہ روپوش ہونے کے لئے جا رہا تھا۔ اس نے اپنی آواز اس طرح بدل لی تھی کہ وہ اگرچہ سالہا سال تک ہمارے ساتھ رہا تھا مگر میں قطعی اسے نہ پہچان سکا۔ اگر میں اسے پہچان جاتا تو یقیناً اسے اپنے ساتھ کر لیتا اس کا وہاں سے گزر جانا اچھا ہی ہوا۔ کیونکہ گزرنے سے جو تشویش پیدا ہو گئی تھی اس کے باعث ہم اس جگہ نہیں رک سکتے تھے جو ہم نے قادر بردی سے ملنے کے لئے مقرر کی تھی۔

بندہ علی نے کہا کہ کرنان میں ایسے باغیچے موجود ہیں جو سنسان پڑے رہتے ہیں۔ وہاں ہمارے آنے کا کسی کو گمان تک نہ ہو گا وہاں پہنچ کر قادر بردی کے پاس آدمی بھیجا جائے گا تا کہ وہ وہاں پہنچ جائے۔ اس خیال کے پیش نظر ہم سوار ہوئے اور کرنان کے گرد و نواح میں پہنچ گئے۔ جاڑے کا زمانہ تھا انتہائی سرد۔ ایک پرانی کرخت پوستین[۲۳] لائی گئی جسے میں نے پہن لیا۔ ایک دلیے کا پیالہ جو گیہوں کو دل کر بنا کر گیا تھا میں نے پیا، جس سے ہاتھ پیروں میں عجب چستی آئی۔ میں نے بندہ علی سے پوچھا کہ قادر بردی کے پاس کسی کو بھیجا؟ اس نے کہا کہ ہاں! میں نے آدمی بھیج دیا ہے۔ ان مردود گنواروں نے قادر بردی کے ساتھ سازش کر کے تنبل کے پاس اخسی کی جانب قاصد روانہ کر دیا تھا۔ ہم ایک گھر کے احاطے میں داخل ہوئے۔ کہیں سے لا کر آگ روشن کی ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ ان لوگوں نے بڑی چالاکی دکھائی۔ مجھ سے بار بار کہا گیا کہ جب تک قادر بردی کے بارے میں کوئی اطلاع نہ ملے آپ یہاں سے ہرگز ہلیں بھی نہیں۔ یہ جگہ رہائشی محلوں کے درمیان واقع ہے۔ البتہ باغات

۲۳۔ پوستین۔ بالوں والا کھال کا کوٹ

کے اطراف میں ایسی جگہیں ہیں کہ اگر وہاں جایا جائے تو کسی کو گمان تک نہ ہوگا۔ چنانچہ آدھی رات کے وقت میں گھوڑے پر سوار ہو کر اس باغ میں پہنچا جو رہائشی محلّے کے اطراف میں واقع ہے۔ بابا سیرامی نے چھت پر چڑھ کر اُدھر اِدھر نظریں دوڑا کر پہرہ داری کی، وقت دو پہر گزر چکا تھا کہ وہ چھت پر سے نیچے اتر کر میرے پاس پہنچا اور کہنے لگا کہ یوسف داروغہ چلا آرہا ہے۔ میں عجیب دغدغے میں پھنس گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ پتہ لگانے کی کوشش کر کیا وہ یہ جان کر آرہا ہے کہ میں یہاں ہوں؟ چنانچہ وہ اس کے پاس پہنچا اور اس سے بات کر کے واپس آیا اور مجھے بتایا کہ یوسف داروغہ کہہ رہا ہے کہ اخسی میں اس کی ایک پیادہ سپاہی سے اتفاقیہ ملاقات ہوگئی اس نے بتایا کہ بادشاہ کرنان میں فلاں جگہ ہے۔ میں نے اس بات کی کسی کو خبر نہیں کی۔ البتہ اس پیادے کو ولی خزانچی کے ساتھ جو جنگ میں میرے ساتھ تھا ایک جگہ چھوڑ کر تمہارے پاس بھاگتا ہوا آیا ہوں۔ امرا کو اس بات کی ذرا بھی خبر نہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تیرے دل میں کیا بات آتی ہے۔ اس نے کہا وہ سب آپ کے خادم ہیں۔ اب ہمارے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ یہاں سے روانہ ہوں تا کہ وہ تمہیں تخت شاہی پر متمکن کر دیں۔ میں نے کہا کہ اس قدر جنگ و غوغا بپا ہونے کے بعد کس بھروسے پر میں وہاں جاؤں۔ ابھی ہم گفتگو کر ہی رہے تھے کہ یوسف میرے سامنے دوزانو ادب سے بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ اب آپ سے کیا چھپاؤں۔ سلطان احمد بیگ کو تو کچھ معلوم نہیں البتہ شیخ بایزید کو آپ کے بارے میں پتہ چل گیا ہے۔ اور اس نے ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ یہ سنتے ہی میری عجیب حالت ہوئی۔ دنیا میں جان کے خوف سے بدتر کوئی فکر نہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ سچ بتا کہ معاملہ کیا ہے۔ اگر حالات نے کوئی دوسری صورت اختیار کر لی ہے تو تو مجھے اتنی مہلت تو دیدے کہ میں وضو کر لوں۔ یوسف نے قسم کھائی (ورق ۱۰۱) لیکن اس کی قسم کا کون اعتبار کرے گا۔ مجھے اپنی بے بسی کا احساس ہونے لگا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور باغ کے ایک کونے میں چلا گیا اور پھر میں نے خود ہی غور کیا کہ اگر کسی انسان کو سو سال اور ہزار سال کی زندگی بھی مل جائے تو انجام اس کا فنا ہی ہے۔

(یہاں سے سلسلہء عبارت منقطع ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری جگہ بھی اسی طرح سلسلہ منقطع ہے۔ ترکی متن میں بھی اسی طرح ہے چنانچہ اس ضمن میں نواب مستطاب خاں، عظم معلی القاب مخدومی مدظلہ سے رجوع کیا گیا۔ اپنے دست مبارک سے موصوف نے اس اصل نسخے کو ملاحظہ کیا جو بندگان حضرت فردوس مکانی (بابر بادشاہ) نے اپنے دست مبارک سے ترکی زبان میں مرقوم فرمایا ہے۔ موصوف نے راقم سے فرمایا کہ چند سال کے واقعات کی تلاش و جستجو کی گئی مگر وہ دستیاب نہ ہو سکے۔ ترکی متن میں بھی وہ موجود نہیں)

کابل میں باغ بابر۔ جس کی تزئین و آرائش کی جا رہی ہے
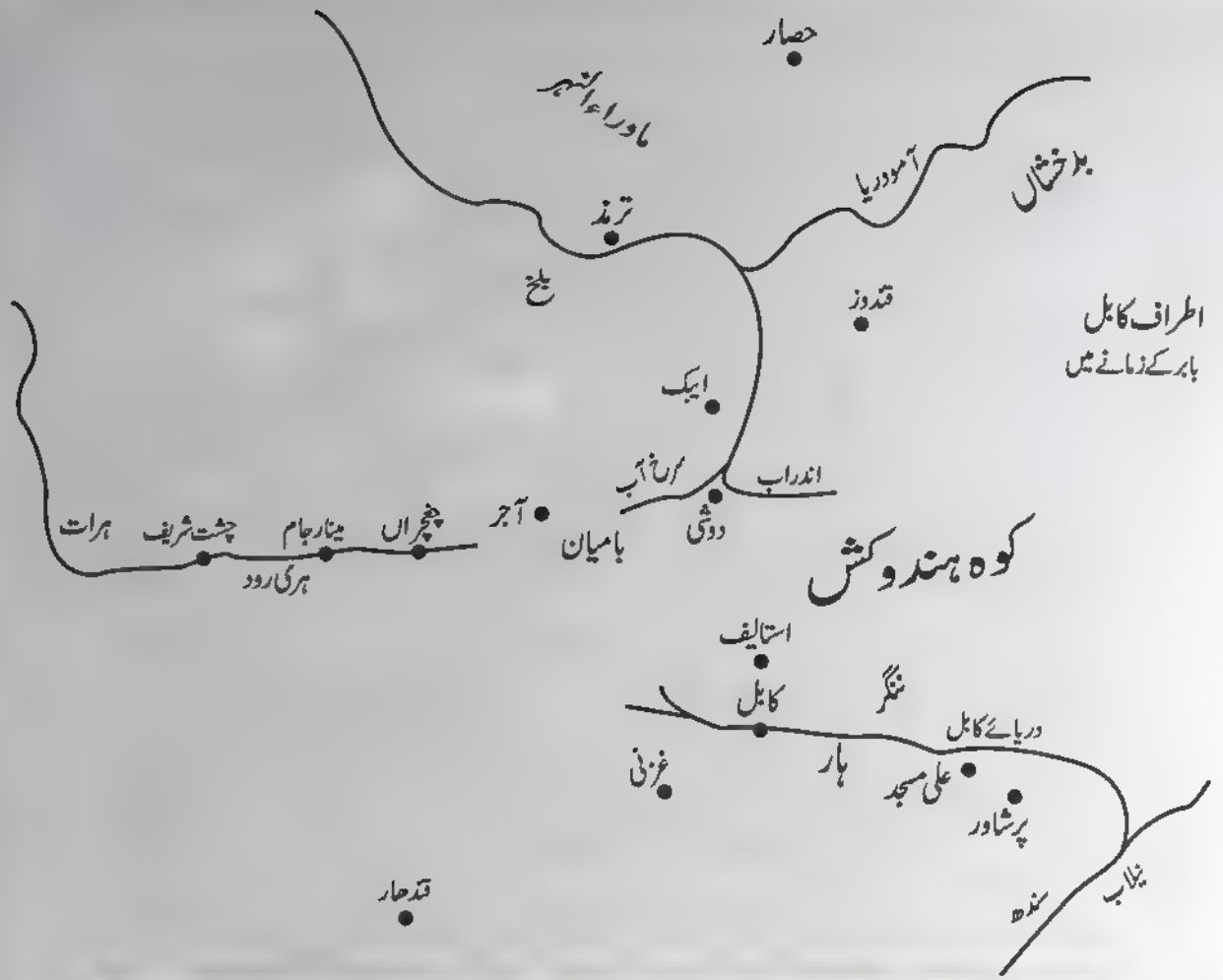
دریائے اندراب

واقعات ۹۱۰ھ

(۱۴ جون ۱۵۰۴ء - ۴ جون ۱۵۰۵ء)

پہلا خط بنانا

میں ماہ محرم میں ولایت فرغنہ سے خراسان کی جانب جانے کے ارادے سے روانہ ہوا ایلاک یا یلاغ نامی مقام پر جو ولایت حصار کی چراگاہوں میں سے ایک ہے میں نے قیام کیا۔ اسی خیمہ گاہ میں اس وقت جب کہ میری عمر کا ۲۳واں سال شروع ہی ہوا تھا میں نے استرے سے اپنے چہرے کی اصلاح کی[1] وہ خورد و کلاں لوگ جو کسی اُمید میں میرے ارد گرد چکر لگا رہے تھے دو سو سے زیادہ اور تین سو سے کم تھے۔ ان میں سے بیشتر پیادہ تھے، ہاتھوں میں ان کے لاٹھیاں تھیں، پیروں میں ادھوڑی اُستر کے جوتے اور کندھوں پر چرواہوں کی گدڑی، عسرت و تنگدستی کا یہ عالم تھا کہ ہمارے پاس دو خیمے تھے۔ میرا خیمہ بھی میری والدہ کے لئے لگا دیا جاتا اور ہر خیمہ گاہ پر میرے بیٹھنے کے لئے چھپّر لگا دیا جاتا میں وہیں بیٹھا کرتا تھا۔

[1] بابر کی جو قلمی تصاویر ملتی ہیں ان میں بابر کے چہرے پر بالوں کی کمی ظاہر ہے۔ ڈاڑھی چھدری ہے، ٹھوڑی اور خط پر بال ہیں بیچ میں کلوں پر نمایاں کمی ہے شاید اسی وجہ سے یہاں بائیس سال کی عمر میں پہلی دفعہ استرے کا استعمال ہو رہا ہے۔

حصار

ہم نے خراسان کی جانب جانے کا عزم کیا لیکن اِس ولایت سے اور خسرو شاہ کے ملازمین سے ہماری کچھ امیدیں وابستہ تھیں۔ چند روز بعد کوئی نہ کوئی ایسا آدمی آ جاتا جو اس ولایت اور وہاں کے قبائل کے بارے میں ہمیں ایسی باتیں بتاتا جس سے ہماری آس بندھ جاتی۔ ملا بابا پشاغری کو خسرو شاہ کے پاس ایلچی بنا کر بھیجا گیا تھا وہ ان ہی دونوں واپس آیا۔ اس نے خسرو شاہ کے بارے میں جو باتیں بتائیں ان سے دل کو تسلی و تشفی نہیں ہو سکتی تھی مگر قبائل اور جرگوں کی طرف سے وہ اچھی خبر لے کر آیا۔ ایلاک سے تین چار منزلیں نکلنے کے بعد حصار کے گرد و نواح میں خواجہ عماد نامی مقام پر پہنچے اور قیام کیا۔ اس منزل پر خسرو شاہ کی جانب سے محب علی قورچی اس کے ایلچی کی حیثیت سے پہنچا۔ اگر چہ خسرو شاہ اپنی جود و سخا کے باعث مشہور تھا، اس کی ولایت سے ہمارا دو مرتبہ گزر ہوا لیکن اس نے نا ہی میرے ساتھ اور نا ہی میرے لوگوں کے ساتھ بھلائی کا کوئی سلوک کیا۔ لیکن چوں کہ اس ولایت کے اہل قبائل اور جرگہ کے لوگوں سے امید وابستہ تھی اس لئے ہر منزل پر کچھ زیادہ عرصے قیام کیا۔

ان ایام میں شیرم طغائی سے بڑا کوئی آدمی ہمارے ساتھ نہ تھا۔ وہ خراسان کی جانب جانے کی تاب نہ لاسکا۔ اس کے سر میں ہم سے علیحدہ ہونے کا سودا سمایا ہوا تھا۔ جس طرح سر پل پر ہمارے شکست سے دو چار ہونے پر اس نے اپنے اہل خاندان کو قلعے میں سے بھیج دیا تھا اور وہاں اکیلا قلعہ داری کے فرائض انجام دیئے تھے اس میں جوان مردانہ شان نہ تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ ایسی حرکت کر چکا تھا۔

جس وقت ہم قبادیان پہنچے تو اس وقت خسرو شاہ کے چھوٹے بھائی باقی چغانیانی کا چغانیان، شہر صفا اور ترمذ پر قبضہ تھا۔ اس نے خطیب قرشی کو میرے پاس بھیجا اور میری خیر خواہی کے ساتھ اپنی ہمرائی کا اظہار کیا۔ جس وقت ہم نے آمو دریا پار کیا تو وہ اوباج نامی مقام پر مجھ سے ملاقات کرنے کے لئے آیا۔ باقی چغانیانی نے ترمذ کے مقابل پہنچ کر تمام افراد خاندان و متعلقین کو دریا پار بھیج دیا۔ ہم اسے اپنے ساتھ لے کر کہمرد اور بامیان کی جانب روانہ ہوئے۔ اس وقت یہ علاقے خسرو شاہ کے بھانجے احمد قاسم کے تحت تصرّف تھے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ اہل خانہ اور افراد خاندان کو آجر نامی قلعے میں جو کہمرد کے مضافات میں واقع ہے، حفاظت کے لئے چھوڑ دیں اور اس کے بعد (ورق ۱۰۲) جو بھی صورت حال رونما ہوا سے مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کے مطابق اقدام کیا جائے۔

یار علی بلال

جس وقت ہم ایک پہنچے تو راستے میں یار علی بلال نظر آیا۔ ابتدائی زمانے میں وہ میرے ساتھ تھا اور اس نے تلوار کے وار بھی خوب کئے تھے۔ میری دربدری کے دنوں میں مجھ سے علیحدہ ہو کر وہ خسرو شاہ کے ساتھ ہو گیا تھا۔ وہ چند جوانوں کے ساتھ فرار ہو کر میرے پاس آیا۔ اس نے ہی مجھے بتایا کہ وہ مغل سپاہی جو خسرو شاہ کے ساتھ ہیں انھوں نے میرے ساتھ وفاداری و دولت خواہی کا پیغام بھیجا ہے۔

قنبر علی سلاخ

جس وقت ہم درّہ زندان میں پہنچے تو قنبر علی بیگ جسے قنبر علی سلاخ بھی کہتے ہیں فرار ہو کر میرے پاس آیا۔ تین چار کوچ سر کر کے ہم کہمرد پہنچے۔ قلعہ آجر میں اہل خانہ و افراد خاندان کو بھیج دیا گیا۔

جہانگیر مرزا کا نکاح

ان چند دن کے دوران جس وقت ہم آجر میں مقیم تھے سلطان محمود مرزا اور خان زادہ بیگم کی بیٹی (جو اس سے قبل مرزا صاحبان کی حیات میں جہانگیر مرزا سے منسوب تھی) کا نکاح جہانگیر مرزا کے ساتھ کر دیا گیا۔

اس اثنا میں باقی بیگ نے مجھ سے کئی مرتبہ یہ کہلوایا کہ ایک مملکت میں دو بادشاہ اور ایک لشکر میں دو امیر موجب تفرقہ و ویرانی اور فتنہ و پریشانی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ کہا گیا ہے:

"دہ درویش در گلیمی بخسپند
و دو بادشاہ در اقلیمی نگنجند

(دس درویش ایک کمبل کے نیچے سو سکتے ہیں (لیکن) دو بادشاہ ایک اقلیم میں نہیں سما سکتے)

نیم نانی گر خورد مرد خدای　　بذل درویشان کند نیمی دگر
ملک اقلیمی بگیر د پادشاہ　　ہمچنان در بند اقلیمی دگر

(اگر خدا کا بندہ (درویش) آدھی روٹی کھاتا ہے تو اس میں سے بھی آدھی بچی ہوئی روٹی دوسرے درویشوں کو بانٹ دیتا ہے۔ اگر کوئی بادشاہ کسی اقلیم پر قبضہ کر لیتا ہے تو وہ کسی دوسرے اقلیم پر قبضہ کرنے کی دھن میں لگا رہتا ہے[۲])

کیونکہ امید نظر آتی ہے کہ آج کل میں خسرو شاہ کے عام نوکر اور اہل کار حاضر ہو کر آپ کی اطاعت و بندگی، بادشاہ کی حیثیت سے قبول کر لیں گے۔ کیوں کہ ایوب کے بیٹوں جیسے اور بھی بعض فتنہ انگیز لوگ موجود ہیں جو ہم مرزازادگان کے درمیان ہمیشہ فتنہ اور برائی کے محرک رہے ہیں۔ اب اسی وقت جہانگیر مرزا کو بخیر و خوبی خراسان کی جانب رخصت کر دیا جائے تو کل ندامت و پشیمانی کا سبب نہ ہو گا۔

میرے بھائیوں اور قرابت داروں نے خواہ کتنی ہی میرے ساتھ بے رخی برتی ہو مگر یہ میری شان کے خلاف تھا کہ انہیں میرے ہاتھوں کوئی ضرر پہنچے۔ اس میں شک نہیں کہ نوکر اور آقا کی حیثیت سے جہانگیر مرزا اور ہمارے درمیان بہت سے کینہ و عداوت کے آثار نمایاں ہو چکے تھے لیکن اس مرتبہ وہ اس ولایت (فرغنہ کو) ترک کر کے میرے ساتھ چل کر یہاں آیا تھا اور سگے بھائی، قریبی رشتہ دار نیز نوکر بن کر خدمت کا حق ادا کیا تھا۔ اس وقت تک ایسی کوئی چیز نمایاں نہیں ہوتی تھی جس سے کدورت کے آثار ظاہر ہوں۔ اگرچہ اس امر پر مجھ سے اصرار کیا گیا مگر میں نے اسے ہرگز قبول نہ کیا۔ آخر وہی ہوا جس کے بارے میں باقی بیگ پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ یہ فتنہ پرداز یوسف ایوب اور بہلول ایوب مجھ سے علیحدہ ہو کر جہانگیر مرزا سے جا ملے اور اس کے ساتھ ہو کر فتنہ و شر کے ایسے بیج بوئے کہ مجھے اس سے جدا کر دیا اور اسے اپنے ساتھ لے کر خراسان کی طرف روانہ ہو گئے۔

۲۔ شیخ سعدی کا یہ قول اور اشعار گلستان کے پہلے باب میں تیسری حکایت سے ماخوذ ہیں جہاں ایک بادشاہ چنگیز الو بیٹوں کو ادھر اُدھر جاگیر دے کر ایک کو ولی عہد مقرر کر کے اپنے پاس رکھتا ہے تا کہ وہ ہی بعد میں بادشاہ ہو (گلستان سعدی ص ۴۸)

سلطان حسین مرزا کے خطوط

ان ہی دنوں سلطان حسین مرزا اور بدیع الزماں مرزا کی جانب سے میرے خسرو شاہ اور ذوالنون بیگ کے پاس ایسے طویل رقعات آئے جو اس وقت بھی میرے پاس محفوظ ہیں اور جن کا مضمون یہ تھا کہ جب ''سلطان احمد مرزا، سلطان محمود مرزا، الغ بیگ مرزا اور ان کے بھائی جو ایکا کر کے مجھ پر حملہ آور ہوئے تھے تو میں مرغاب کے کنارے کو محکم کر چکا تھا۔ تمام مرزا قریب تو آ گئے مگر کچھ کر نہ سکے، اسی لئے وہ واپس چلے گئے اور اگر اب بھی (ورق ۱۰۳) ازبک اس طرف کا رُخ کریں تو میں پھر مرغاب کے کنارے کو مضبوط کرلوں گا۔ بدیع الزماں مرزا بلخ، شبرغان اور اندخوی کے قلعات میں قابل اعتماد لوگوں کو بٹھا دے اور گرزوان درۂ زنگ کے کوہستانی قلعوں کو محکم کرے۔''

میرے ان گردونواح میں پہنچنے کی اطلاع انھیں مل چکی تھی۔ انہوں نے مجھے لکھ کر بھیجا تھا کہ اگر تم کہمرد، اور آجر کے پہاڑی دامنوں کو مضبوط کرلو، خسرو شاہ حصار اور قندوز کے قلعوں میں اپنے قابل اعتماد آدمی متعین کر دے، اور اس کا چھوٹا بھائی بدخشاں وختلان کے کوہستان کو محکم کرے تو ازبک کچھ بھی نہ کر سکیں گے اور ناکام واپس چلے جائیں گے۔

سلطان حسین مرزا کے ان رقعوں نے ناامیدی کی کیفیت پیدا کر دی۔ کیوں کہ اس وقت تیمور بیگ کی مملکت میں سن و سال، ولایت اور لشکر کے اعتبار سے کوئی دوسرا شخص ان سے بڑا حکمران نہ تھا اور یہ توقع کی جا رہی تھی کہ ایلچی و نامہ بر تیزی کے ساتھ ممانعت کے لئے آتے ہوں گے، اور وہ یہ حکمنامہ لے کر پہنچیں گے کہ ترمذ، کلف اور کرکی کے گھاٹوں پر اتنی کشتیاں تیار ملیں۔ پل بنانے کا اس قدر ساز وسامان مہیا ہو۔ نیز توقوز اور اولوم کے گھاٹوں کی بلندی پر سے نگرانی کی جائے تاکہ وہ لوگ جو گزشتہ چند سال کے دوران ازبکوں کی تفرقہ اندازی کے باعث آزردہ خاطر ہو چکے تھے قوی دل ہو جائیں اور انھیں یہ امید ہو جائے کہ سلطان حسین مرزا جو تیمور بیگ کی جگہ تخت حکومت پر متمکن ہوا ہے ایک عظیم القدر بادشاہ ہے، لیکن دشمن پر حملہ کرنے کے بجائے وہ قلعوں کو مضبوط کرنے کا حکم جاری کرے، تو ملک و عوام اس سے کیا توقع کریں گے۔

گھوڑوں اور فاقہ زدہ زبون و ناتواں انسانوں، ان کے اہل و عیال و ساز و سامان، باقی چغانیاں کے واقف کاروں، اس کے لڑکے احمد قاسم اور ان سب سپاہیوں کو جو ہمارے ہمراہ تھے نیز ان کے ہم قوم و قبیلہ افراد کو آجر میں چھوڑ کر اور خود لشکر کے ساتھ ہم آگے روانہ ہوئے۔ خسرو شاہ کی مغل سپاہ میں سے لوگ متواتر طلے خان سے طایخاں تک آنا شروع ہوئے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم نے طلے خان سے طایخاں تک بادشاہ کی اطاعت وفرمانبرداری قبول کرلی ہے۔ چنانچہ تمام مغل قبائل کوچ کر کے اشکمش اور فلول پہنچ گئے ہیں۔ اب بادشاہ کو چاہئے وہ سعی وکوشش کر کے جلدی ہی یہاں پہنچ جائیں کیوں کہ خسرو شاہ کے اکثر و بیشتر لوگ تباہ و برباد ہو کر بادشاہ کی اطاعت و بندگی قبول کرنے کے لئے آ رہے ہیں۔ اسی اثنا میں یہ اطلاع ملی کہ شیبانی خاں نے اندجان پر قبضہ کر لیا ہے اور قندوز وحصار پر اس نے لشکر کشی کا ارادہ کیا ہے۔ اس خبر کے سنتے ہی خسرو شاہ قندوز میں نہ ٹھہر سکا۔ اس کے ساتھ جتنے بھی آدمی تھے انھیں اس نے کوچ کرنے کا حکم دیا اور کابل کی جانب روانہ ہو گیا۔ خسرو شاہ جیسے ہی قندوز سے روانہ ہوا تو اس کے قدیم قابل اعتماد نوکر ملا محمد ترکستانی نے شیبانی خاں کی خاطر قلعہ قندوز کو مستحکم کرلیا۔

جس وقت ہم نے سمبتو کی راہ سے سرخ آب نامی دریا کی طرف رخ کیا تو تین چار ہزار مغل خاندان جو خسرو شاہ سے متعلق تھے اور قندوز میں رہ گئے تھے اپنے کنبے کے لوگوں کے ساتھ ہمارے ہمراہ ہو گئے۔ قنبر علی مغل جس کا ذکر بار بار ہوا ہے ہذیان گو قسم کا آدمی تھا۔ اس کے اطوار باقی بیگ کو پسند نہ تھے۔ محض باقی بیگ کی خاطر اسے رخصت کیا گیا، اس کے بعد اس کا لڑکا عبدالشکور دوبارہ جہانگیر (ورق ۱۰۴) کا ملازم ہو گیا۔

خسرو شاہ کی اطاعت

جس وقت خسرو شاہ کو معلوم ہوا کہ مغل قبائل میرے ساتھ ہو گئے ہیں تو وہ چراغ پا ہو کر رہ گیا۔ جب اسے کوئی چارہ نظر نہ آیا تو اس نے اپنے داماد یعقوب ایوب کو ایلچی بنا کر بھیجا اور اپنی اطاعت وفرمانبرداری کا اظہار کیا، اس نے یہ التجا کی کہ اگر عہد و پیماں کر لیا جائے تو میں حاضر خدمت ہونے کے لئے تیار ہوں۔ باقی چغانیانی چونکہ صاحب اختیار اقتدار اور ہر چند خود کو میری حکومت کا خیر خواہ ظاہر کرنا چاہتا تھا لیکن یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اپنے بھائی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ چنانچہ قرار یہ پایا کہ معاہدہ اس طرح ہو کہ اس کی جان کو امان ملے اور جس قدر ساز وسامان وہ اپنے ساتھ لے جانا چاہے اس میں کوئی مضائقہ نہ ہو۔ چنانچہ اسی طریقے پر معاہدہ کیا گیا۔ جب یعقوب کو رخصت ہونے کی اجازت دے دی گئی تو ہم نے سرخ دریا کے بہاؤ کی طرف کوچ کیا اور سرخ آب واندراب کے سنگم پر قیام پذیر ہوئے۔

اگلے دن صبح ماہ ربیع الاول کے وسط میں نے اندراب کو تنہا پار کیا اور دوشی کے نواح میں ایک گھنے چنار کے زیر سایہ بیٹھ گیا۔ اس طرف سے خسرو شاہ پوری شان وشوکت اور جاہ کے ساتھ اپنے بہت سے حوالی موالی کے ہمراہ پہنچ گیا۔ اور قاعدہ ودستور کے مطابق اپنے گھوڑے سے اتر کر پیادہ ہو گیا۔ جب وہ نزدیک پہنچا تو تین مرتبہ اس نے اپنے زانو زمین بوس کئے اور واپس جاتے وقت بھی اس نے یہی اقدام کیا۔ احوال پرسی اور تحائف کی پیشکش کے وقت بھی اس نے ایک مرتبہ اپنے زانو زمین بوس کئے۔ اس طرح وہ جہانگیر مرزا اور مرزا خاں کے سامنے بھی دو زانو ہوا۔ کم بخت وہ ناکارہ سن رسیدہ آدمی جو سالہا سال تک من مانی کرتا رہا تھا اور اس کے سوا کہ اس کے نام کا خطبہ نہیں پڑھا گیا تھا باقی سلطنت کی ہر چیز اس کی دسترس میں تھی۔ اب وہی شخص متواتر پچیس چھبیس مرتبہ زانو کے بل بیٹھ چکا تھا۔ بار بار آمد و رفت کے باعث وہ اتنا تھک چکا تھا کہ اب اس کے زمین پر لیٹنے میں کوئی کسر نہ رہ گئی تھی۔ چند سالہ سلطنت اور امیرانہ شان وشوکت کے بعد اب اس کے سب کس بل نکل چکے تھے۔ اس کی پیشی اور تحائف کی پیشکش کے بعد میں نے اسے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ وہ ایک یا دو گھڑی بیٹھا۔ ادھر ادھر کی باتیں اور قصے کہانیاں ہوتی رہیں۔ بزدل اور نمک حرام تو تھا ہی مگر اس کی باتوں میں بھی کوئی مٹھاس نہ تھی اس کے قابل اعتماد ملازمین جوق در جوق اس کی آنکھوں کے سامنے میری نوکری اختیار کر رہے تھے اب وہ اس حال کو پہنچ چکا تھا۔ کبھی بادشاہی کے نشے میں اِترایا کرتا تھا، اب ذلیل وخوار پھر رہا تھا۔ دو عجیب باتیں اس کی زبان سے نکلیں، پہلی تو یہ کہ اس کے ملازمین کے اس سے جدا ہونے پر جب اس کی دلداری کی گئی تو اس کے جواب میں اس نے یہ کہا کہ یہ ملازمین پہلے بھی چار مرتبہ مجھ سے علیحدہ ہو چکے ہیں اور پھر واپس آ گئے ہیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ جب میں نے اس سے پوچھا کہ اس کا برادر خورد ولی کب واپس آئے گا اور آمو دریا کو وہ کس گھاٹ سے پار کرے گا تو اس نے جواب دیا کہ اگر اسے پار کرنے کا موقعہ ملا تو وہ جلد ہی آ جائے گا۔ لیکن جب دریا کا پاٹ بڑھتا ہے تو گھاٹ بھی بدلتے رہتے ہیں۔ کیوں کہ یہ کہاوت مشہور ہے کہ اس گھاٹ کو پانی نگل گیا۔ اس کے دولت واقبال اور نوکر چاکر کے ہاتھوں سے نکل جانے کے بعد خداوند تعالیٰ یہ الفاظ اس سے کہلوا رہا تھا۔ ایک دو گھڑی بعد میں سوار ہوا اور لشکر گاہ میں پہنچا۔ وہ بھی اپنی قیامگاہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ اسی دن سے ہی اس کے خورد و کلاں اور بھلے بُرے امیر جوق در جوق اپنے افرادِ خاندان نیز مال واسباب کے ساتھ اس سے جدا ہو کر ہماری طرف آنے لگے۔ اس روز صبح سے اگلے دن نماز ظہر تک کوئی بھی شخص اس کے ساتھ نہ تھا:

قل اللّٰھم مالک الملک تؤتی الملک من تشآء و تنزع الملک ممّن تشآء و تعز من تشآء و تذل من تشآء (ورق ۱۰۵) بیدک الخیرہ انّک علیٰ کلّ شیٍٔ قدیرہ[۳]

(کہو اے خدا (اے) بادشاہی کے مالک۔ تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے، اور جسے چاہے ذلیل کرے ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے اور بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے)

اس قادر مطلق کی بھی عجیب حکمت ہے کہ وہ شخص جس کے پاس کبھی بیس تیس ہزار نوکر تھے اور اس قلعے سے جسے در بند آہنین کہتے ہیں ہندوکش تک وہ تمام ولایات جو کبھی سلطان محمود مرزا کے زیر نگیں تھیں اب اس کے تحت آ چکی تھیں۔ اس کا وہ حسن برلاس نامی حقیر بوڑھا محصول گر جو ایلاک سے اوباج تک بڑی سختی سے لگان وصول کیا کرتا تھا اور جس کے اشارے پر ہم یا تو کوچ کر جاتے تھے یا قیام پذیر ہو جایا کرتے تھے۔ آدھے دن میں جنگ و جدال کئے بغیر ہمارے دو سو ڈھائی سو قلاش اور مفلوک الحال لوگوں کے سامنے اس طرح زبوں و خوار بے بس اور لاچار کھڑا تھا کہ نہ اسے کسی نوکر پر کوئی اختیار رہا تھا اور نا ہی اپنے جان و مال پر۔

اسی شام جب کہ ہم خسرو شاہ سے ملاقات کر کے واپس آ رہے تھے تو مرزا خاں میرے پاس آیا اور اپنے بھائیوں کے خون کا مدّعی ہوا[4] ہم میں سے کچھ اس بات پر مصر تھے کہ روایات اور شرع کی رو سے جو بھی مناسب ہو لوگوں کو سزا ملنی چاہئے۔ لیکن چوں کہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ خسرو شاہ کو آزاد کر دیا جائے گا، اسی لئے فرمان دیا گیا کہ جو کچھ مال و اسباب وہ لے جا سکتا ہے وہ اپنے ساتھ لے جائے۔ تین چار خچروں اور اونٹوں کی قطاروں پر جواہرات، سونے کے زیورات، چاندی کی ظروف اور دیگر نفیس و بیش قیمت اشیا جو بھی وہ لاد کے لے جا سکتا تھا اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے شیرم طغائی کو اس کے ہمراہ کیا اور کہا کہ غوری اور دہانہ کے راستے سے اس کو خراسان کی طرف روانہ کر دے۔ خود کہمرد پہنچ کر افراد خاندان کو ہمارے پیچھے کابل پہنچا دے۔ چنانچہ ہم خیمہ گاہ سے کابل کی جانب روانہ ہوئے اور راہ میں خواجہ زید نامی مقام پر قیام کیا۔ اسی دن ازبکوں کا سرغنہ حمزہ بے منگغیت منزلیں مارتا ہوا آن پہنچا اور دوشی کے نواح میں اس نے ہم پر حملہ کر دیا۔ سیّد قاسم ایشیک آقا و احمد قاسم کوہ بر اور دیگر جوانوں کو روانہ کیا گیا کہ جو حملہ آوروں کا اچھی طرح قلع قمع کر کے ان میں سے چند کے سر کاٹ کر لائے۔ اسی منزل گاہ پر خسرو کا اسلحہ خانہ تقسیم کیا گیا۔ اس کے سات سو آٹھ سو زرہ بکتروں و زین خود اور فوجی ساز و سامان کے علاوہ جو چیزیں باقی بچ رہی تھیں ان میں چند چینی کے ظروف تھے۔ اگرچہ چیزیں اور بھی تھیں مگر ایسی نہیں جو نظروں میں سما سکیں۔

خواجہ زید سے تین چار منزلیں گزر کر ہم غور بند پہنچے۔ جس وقت ہم کنار شہر قیام پذیر ہوئے تو ہمیں اطلاع ملی کہ مقیم[5] کے صاحب اختیار امرا میں سے شیر کہ ارغون نامی امیر ہم سے بجنر اپنے لشکر کے ہمراہ آن پہنچا ہے اور دریائے باران کے کنارے مقیم ہے، اور ان لوگوں کو دریا پار کرنے سے روک رہا ہے جو پنج شیر کے راستے سے عبدالرزاق مرزا کے پاس جانا چاہتے ہیں جو اس وقت کابل سے فرار ہو کر ان تارکلانی افغانوں[6] کے پاس پہنچ گیا ہے جو لمغان کے نواح میں آباد ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی ہم نے عصر و مغرب کے درمیان وہاں سے کوچ کیا اور تمام رات سفر کر کے ہم درۂ آہو بیان سے گزر گئے۔

سہیل ستارہ

میں نے سہیل ستارہ[7] پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ درّے سے باہر رات کی سیاہی میں جنوب کی جانب ایک روشن ستارہ نمودار ہوا۔ میں نے کہا کہ کہیں یہ سہیل نہ ہو۔ میرے ساتھیوں نے کہا، ہاں! یہ سہیل ہی ہے۔ اس پر باقی چغانیانی نے یہ شعر پڑھا:

تو سہیلی تا کجا تابی و کی طالع شوی
چشم تو بر ہر کہ می افتد نشان دولت است

۴۔ بابر پہلے ہی یہ ذکر کر چکا ہے کہ مرزا خان کے بڑے بھائی بایسنغر مرزا کو خسرو شاہ نے قتل کروا دیا تھا اور دوسرے بھائی سلطان مسعود مرزا کی آنکھوں میں سلائی پھروا کر اندھا کر دیا تھا۔ یہ تینوں بھائی بابر کے چچا سلطان محمود مرزا کے بیٹے تھے۔

۵۔ مقیم بن ذوالنون بیگ حاکم کابل جس نے عبدالرزاق مرزا بن الغ بیگ مرزا تیموری کو کابل سے ۹۰۹/۱۵۰۴ میں بے دخل کیا (ارسکن، تاریخ بابر ص ۲۷۴)

۶۔ افغان، ایران، توران اور ہندستان کے درمیان کے کوہستانی علاقوں کے ساکن قبائل۔ سب مسلمان ہیں اور ایک زبان بولتے ہیں۔ مہاجر کو پناہ دینا، میزبانی اور بدلہ ان میں قدر مشترک ہیں۔ خان قبیلے کا سردار ہوتا ہے۔ اس کی طاقت محدود ہوتی ہے۔ جرگہ میں فیصلے مشورے سے ہوتے ہیں۔ بابر یہاں افغان قبائل اور ان کے مساکن کا تذکرہ کر کے تاریخ میں پہلی بار تفصیل فراہم کرتا ہے اس سے پہلے تاریخ داں مشکل ہی سے یہ ذکر کرتے ہیں (کیرو ص ۱۵۱) سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں البیرونی نے کتاب الہند میں سرسری ذکر کیا ہے کہ ہندستان کے مغربی پہاڑی علاقوں میں افغان قبائل بستے ہیں جن کی آبادیاں سندھ تک ہیں (ص ۲۷۹) لیکن افغانوں کے متعلق تفصیلات درج نہیں کیں۔ تارکلانی یا ترک لانری کے معنی ترک برادری کے ہیں (ریسٹر، بیلو ص ۷۸) بنگش، محسود اور کئی دوسرے پٹھان قبائل ان ہی کی اولاد ہیں (کیرو ص ۲۱)

۷۔ سہیل۔ ایک ستارے کا نام جو آسمان میں شباہنگ ستارے کے بعد دوسرے نمبر کا چمکدار تارہ ہے۔ سہیل کی چمک صرف اس لئے کم ہے کہ یہ زیادہ دوری پر ہے۔ یہ سورج سے دو سو ہزار گناہ زیادہ چمکدار ہے۔ دنیا کے جنوبی علاقوں میں یہ نظر آتا ہے۔ (اٹلس اوف یونیورس ص ۲۱۴) اس بات پر تو یقین نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے اثر سے یمن میں چمڑے کے حشرات الارض مر جاتے ہیں (سید احمد دہلوی) یا چمڑے میں خوشبو پیدا ہو جاتی ہے (حسن اللغات) لیکن سید احمد دہلوی نے ذوق کا یہ شعر لکھا ہے۔

اللہ رے تاب حسن کہ اس کا ور بلاق
چشمک زنی کرے ہے سہیل یمن کے ساتھ۔

جنوبی علاقوں میں یہ زیادہ نظر آتا ہے۔ باقی چغانیانی کی بات پر یقین کرنا بھی اب مشکل ہے کہ بابر کی قسمت بھی اس کو دیکھنے سے پہلے ہی طلوع ہونا شروع ہو گئی تھی۔

سورج تقریباً ایک نیزہ اوپر آچکا تھا۔ اس وقت ہم درہ سنجد کے سرے پر اترے۔ ہم نے بعض جوانوں کو قراولی[۸] کے لئے آگے روانہ کیا۔ دوسرے کچھ جوان قراباغ کے آخری کنارے پر ایکری بار کے نواح میں پہنچ گئے اور وہاں پہنچتے ہی (ورق ۱۰۶) انھوں نے شیر کہ ارغوں پر حملہ کردیا۔ ایک ہلکی جھڑپ سے ان کا قلع قمع ہوگیا اور ہمارے آدمیوں نے انھیں وہاں سے مار بھگایا۔ شیر کہ کو اس کے ستر اسی عمدہ جوانوں کے ہمراہ ان کے گھوڑوں سے اتار کر میرے حضور پیش کیا گیا۔ میں نے اسے معاف کردیا۔ اس نے میری ملازمت اختیار کرلی۔

خسرو شاہ نے اپنے قوم و قبیلے کے افراد کی پروا کئے بغیر قندوز سے کابل کی جانب رُخ کیا تھا۔ وہ لوگ جو اس سے وابستہ اور ہم قوم وقبیلہ تھے پانچ چھ گروہ میں تقسیم تھے۔ سید یم علی دربان کا گروہ اہلیان بدخشاں پر مشتمل تھا وہ اس وقت ہزارہ دستا میں مقیم تھا۔ اس نے درّہ پنج شیر کو پار کیا اور میرے خیمہ گاہ میں پہنچ کر ملازمت اختیار کرلی۔ دوسر گروہ یوسف ایوب اور بہلول ایوب نے بھی اطاعت کی تیسرا گروہ خسرو کے چھوٹے بھائی ولی اور خنلان کا تھا دیگر گروہ ایپلانچق، تنگدری، قاقشال اوایماقی سے وابستہ تھے اور وہ قندوز میں ہی مقیم تھے۔ ان گروہوں میں سے دوگروہ ایسے تھے جواندراب اور سرخ آب کے راستے سے گزر کر چاہتے تھے کہ پنج شیر درّے کو پار کرلیں۔ ایماق گروہ کے لوگ کچھ پیچھے رہ گئے تھے۔ ابھی وہ سراب نامی مقام پر تھے کہ ولی عقب سے آن پہنچا۔ ایماق گروہ کے لوگوں نے اس کا راستہ روک لیا اور اس کے ساتھ جنگ کر کے اسے شکست دے دی۔ شکست کھا کر وہ ازبک قبائل کی طرف چلا گیا جہاں شیبانی خان نے حکم دیا کہ سمرقند کے چوراہے پر اس کی گردن ماردی جائے۔ باقی تمام لوگ جن میں نوکر اور اہل کار سب ہی شامل تھے گریہ وزاری اور آہ و نالہ کرتے ہوئے اپنے ہم قوم قبیلہ لوگوں کے ساتھ اسی منزل پر میرے پاس پہنچے اور اطاعت قبول کرلی۔ ان ہی لوگوں میں سید یوسف بیگ اغلاقچی بھی شامل تھا جو اپنے قوم و قبیلے کے لوگوں کے ساتھ اسی منزل پر میرے پاس پہنچا تھا۔

اس منزل سے کوچ کر کے ہم آقسرائے نامی سبزہ زار میں پہنچے اور قرہ باغ کے کنارے قیام پذیر ہوئے۔ خسرو شاہ کے لوگوں نے ظلم وتعدّی اور بے راہ روی کی تعلیم حاصل کی تھی اسی لئے انھوں نے بندگان خدا پر ظلم وستم کرنا روا رکھا۔ آخر ہم نے ایک روز سید یم علی دربان کے نوکر کو اس جرم میں پکڑ لیا کہ اس نے کسی شخص کے تیل کا مرتبان چرایا تھا۔ اسے پکڑ کر ہم گھر میں لائے۔ میں نے حکم دیا کہ لکڑی سے اچھی طرح اُس کی پٹائی کریں اس مار پیٹ میں اس کا دم نکل گیا۔ چنانچہ اس سزا کی بنا پر تمام لوگ راہ راست پر آگئے۔

اسی منزل پر اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے کہ آیا کابل کی جانب کوچ کیا جائے یا نہ کیا جائے مشورہ طلب کیا گیا۔ سید یوسف بیگ اور دیگر افراد کی رائے یہ تھی کہ چونکہ موسم سرما نزدیک ہے اسی لئے فی الوقت لمغان کی جانب کوچ کیا جائے۔ اور وہاں سے جو بھی موقعہ ومحل ہو اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ باقی چغانیانی اور دیگر افراد کو مصلحت اس میں نظر آتی تھی کہ کابل کی طرف رخ کیا جائے۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ کابل کی جانب رخ کیا جائے۔ وہاں سے کوچ کر کے ہم قوروق نامی مقام پر قیام پذیر ہوئے۔

میری والدہ مع دیگر افراد خاندان وساز وسامان کے کہمرد میں رہ گئی تھیں وہ اس اسی منزل پر مجھ سے آن ملیں۔ جن سخت خطرات سے گزر کر یہاں پہنچی تھیں ان کی تفصیل یہ ہے:

شیرم طغائی کو خسرو شاہ کے ہمراہ کر کے اس لئے بھیجا گیا تھا کہ وہ خسرو شاہ کو خراسان کی طرف روانہ کر کے خود کہمرد سے اپنے ہمراہ افراد خاندان کو لے آئے جس وقت وہ دہانہ نامی مقام پر پہنچا تو شیرم طغائی نے اپنے آپ کو بے بس پایا، کیونکہ خسرو شاہ اس کے ساتھ ہی کہمرد پہنچا خسرو شاہ کا بھانجا احمد قاسم پہلے سے ہی وہاں موجود

بابر نواح کابل میں ایک چشمے پر ہدایت دیتے ہوئے۔ (تصویر برٹش لائبریری ۳۷۱۴-او آر)
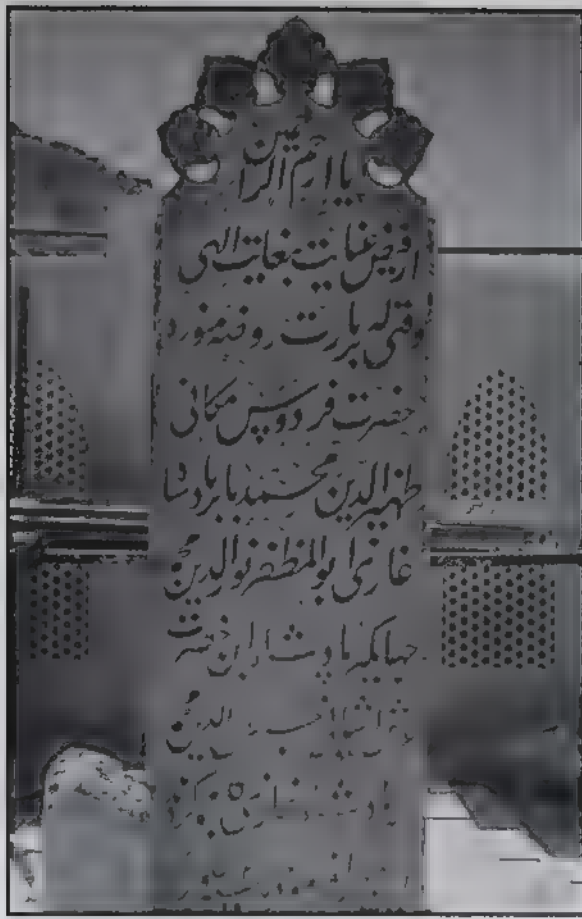
بابر کی لحد کا کتبہ پشت کا مضمون
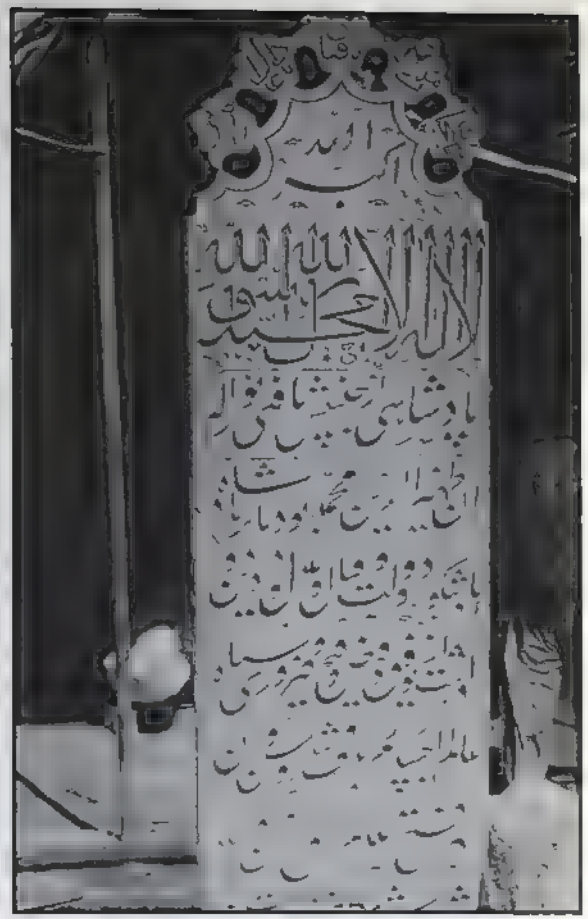
بابر کی لحد کا کتبہ۔ مضمون دونوں طرف ہے۔
یہ کتبہ جہانگیر نے ۱۶۰۷ء میں اپنے سفر کابل میں نصب کروایا تھا

بابر اور خاندان کے دوسرے لوگوں کی قبروں کے گرد چاردیواری بندی گئی ہے۔
اس کے سامنے سے شاہجہاں کی بنائی سنگِ مرمر کی مسجد ہے

تھا۔ خسرو شاہ نے احمد قاسم کو اس کے لئے آمادہ کر لیا کہ وہ تمام افراد خاندان کے ساتھ بد سلوکی سے پیش آئے۔ باقی چغانیانی کے بہت سے مغل ملازمین اپنے افراد خاندان کے ہمراہ کہمرد میں ہی مقیم تھے۔ (ورق ۱۰۷) انہوں نے خفیہ طور پر شیرم طغائی کے ساتھ یہ سازش کی کہ خسرو شاہ اور احمد قاسم کو گرفتار کر لیا جائے مگر انھیں اس سازش کا پتہ چل گیا۔

انھوں نے اس راستے سے جو درّہ آجر کے کنارے کنارے چلا جاتا ہے فرار ہو کر خراسان کا رخ کیا۔ اس باہمی اتفاق کے پس پردہ یہ غرض کار فرما تھی کہ مغل خود کو خسرو شاہ کے چنگل سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ افراد خاندان خسرو شاہ سے نجات پا کر درّہ آجر سے نکل کر جس وقت کہمرد پہنچے تو سغانچی قبیلے کے لوگوں نے ان کا راستہ روک لیا اور اکثر و بیشتر خاندان، باقی بیگ کے قوم و قبیلے والوں کو انہوں نے لوٹ لیا۔ قل بایزید کا لڑکا تیزک کم عمر بچہ ہی تھا مگر اسے انھوں نے قید کر لیا جو تین چار سال بعد کابل پہنچا۔ تباہ حال و برباد یہ خاندان درّہ قپچاق کے راستے سے جس پر سے ہم پہلے ہی گزر چکے تھے ہم سے قوروق نامی مقام پر ملے۔

کابل پر قبضہ

وہاں سے کوچ کرنے کے بعد ہم دو منزلوں کو ایک کرتے ہوئے چالاک نامی سبزہ زار میں پہنچے، جہاں اتر کر ہم نے قیام اور باہمی صلح و مشورہ کیا۔ متفقہ طور پر فیصلہ ہوا کہ کابل کا محاصرہ کیا جائے۔ میں نے قلب لشکر کے ساتھ کوچ کیا اور باغ حیدر تقی و مقبرہ قل بایزید بکاول کے درمیان قیام پذیر ہوا جہانگیر مرزا اپنی جوانغار فوج کے ساتھ چار باغ کلاں میں جا کر اترا۔ ناصر مرزا گورخانہ قتلق قدم کی پشت پر جو سبزہ زار ہے اس میں اپنے برانغار لشکر کے ہمراہ پہنچا۔ ہمارے آدمی مقیم کے پاس جا کر مسلسل اُس سے گفت و شنید کرتے رہے۔ وہ کبھی تو کوئی عذر پیش کر دیتا اور کبھی نرم لہجے میں بات کرتا۔ اس کے پاس اس حیلے بہانے کی اصل وجہ یہ تھی کہ جس وقت ہم نے شرکہ کو گرفتار کیا تھا مقیم نے اپنے باپ اور بڑے بھائی کے پاس آدمی روانہ کئے تھے اور چوں کہ اسے اپنے بڑے بھائی کی طرف سے کچھ توقع تھی اسی لئے وہ لیت و لعل کر رہا تھا۔[9]

ایک روز حکم دیا گیا کہ قلب اور دائیں بازو (برانغار) کے لشکر اس طرح مسلّح ہوں کہ اندرون قلعہ لوگ اس سے مرعوب ہو جائیں۔ جہانگیر مرزا اور دائیں بازو کے لشکریوں نے سامنے کے رخ سے کوچہ باغ کی جانب پیشقدمی کی لشکر قلب کے روبرو چونکہ کہ پانی تھا اس لئے میں قلب کی سپاہ کے ہمراہ گورخانہ قتلق قدم کی جانب سے اس ٹیلے پر پہنچ گیا جو پشتے سے ذرا آگے واقع ہے۔ ہراول دستے کے لوگوں نے قتلق پر قدم رکھا اور یہاں سے آگے روانہ ہو گئے۔ اس وقت وہاں پل نہ تھا۔ ہمارے جوان شوخی و شرارت کرتے ہوئے چرم گران دروازے تک گھوڑے دوڑاتے ہوئے پہنچ گئے۔ وہ لوگ جو باہر نکل آئے تھے وہ ان کی تاب نہ لا سکے، چنانچہ بھاگ کر واپس قلعے میں پہنچ گئے۔ کابل کے بہت سے لوگ جستجو میں اس بلندی تک پہنچ گئے تھے جو قلعہ کے پہلو میں واقع ہے۔ وہاں جیسے ہی افراتفری پھیلی تو بہت سے لوگ اس بلندی پر سے نیچے آرہے۔ دروازے اور پل کے درمیان ایک اونچا پشتہ ہے۔ دونوں کے درمیان راستے میں زمین کھود کر اس میں گڑھے بنا کر انھیں گھاس پھوس سے ڈھک دیا گیا تھا۔ چنانچہ جس وقت سلطان قلی چناق کے ساتھ کچھ جوان گھوڑوں پر سوار حملہ آور ہوئے تو وہ ان میں جا گرے۔ دائیں بازو کی جانب سے ان چند جوانوں میں سے جو کوچہ باغ میں تھے ایک دو تلواریں لہراتے ہوئے باہر نکل آئے۔ دشمن سے کچھ مجادلہ بھی ہوا لیکن چونکہ جنگ کا حکم نہیں تھا اسی لئے وہ اسی پر اکتفا کر کے واپس آگئے۔ قلعے میں جو لوگ تھے وہ خوف زدہ و پریشان تھے۔ مقیم نے اپنے امرا کو درمیان میں لا کر کابل ہمارے حوالے کر دیا اور خود بھی اطاعت قبول کر لی۔ چنانچہ وہ باقی بیگ (ورق ۱۰۸) چغانیانی کے ذریعے میری خدمت

۹۔ مقیم کا بڑا بھائی شاہ بیگ اور باپ ذوالنون بیگ ارغون خاں کی اولاد ہیں جس کا شجرہ چنگیز خاں سے ملتا ہے ذوالنون سلطان حسین مرزا کی طرف سے حاکم قندھار تھا اور کابل اس کے چھوٹے بیٹے مقیم کے پاس (ارسکن بابر ص ۲۶۲)

میں حاضر ہوا۔ ہم بھی اس کے ساتھ شفقت و عنایت سے پیش آئے۔ اور اس کے دل میں جو وسوسہ و دغدغہ تھا اسے رفع کر دیا۔ طے یہ ہوا کہ وہ اگلے دن اپنے تمام نوکر و چاکر اور مال و متاع کے ساتھ باہر آ جائے اور قلعہ ہمارے حوالے کر دے گا۔ خسرو شاہ سے وابستہ آدمیوں نے خودسری اور دست اندازی کا شیوہ اختیار کر رکھا تھا مقیم کے افراد خاندان کو نکالنے کے لئے جہانگیر مرزا اور ناصر مرزا کو بڑے امرا اور رشتہ داروں کے ساتھ متعین کر دیا گیا تھا کہ وہ مقیم اور اس کے متعلقین کو ان کے مال و اسباب کے ہمراہ کابل سے نکال دیں۔ مقیم کے لئے تیپا میدان میں خیمہ گاہ کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ اگلے دن صبح کے وقت جب مرزا اور امرا دروازے پر پہنچے تو وہاں ایک ہجوم اور لوگوں کا شور و غوغا پایا۔ انھوں نے میرے پاس آدمی بھیجا کہ جب تک آپ تشریف نہیں لائیں گے ان لوگوں کو کوئی نہیں روک سکتا۔ آخر میں خود ہی گھوڑے پر سوار ہوا۔ چار پانچ کو تیروں کا نشانہ بنایا اور ایک دو کے لئے حکم دیا کہ ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ جس کے باعث شور و غوغا ختم ہوا۔ مقیم اور اس کے متعلقین صحیح و سلامت وہاں سے نکل کر تیپا میں قیام پذیر ہوئے۔

کابل

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ماہ ربیع الاول کے آخری دنوں میں کابل، غزنی اور اس کے اضلاع بغیر جنگ و جدل کے میرے ماتحت آ گئے۔

کابل اقلیم چہارم میں خرم و آباد جگہ پر واقع ہے۔ اس کے مشرق میں لمغان کے اضلاع، پشاور، ھشنگر اور ہندوستان کے بعض اضلاع ہیں۔ اس کے مغرب میں کوہستانی سلسلہ ہے، جس میں کرنو اور غور واقع ہیں، اس وقت تک نکدری اور ہزارہ[10] اقوام کے افراد اس کوہستان میں آباد ہیں۔ اس کے شمال میں قندوز اور اندراب کی ولایات ہیں۔ کوہ ہندوکش ان کے درمیان ہے۔ اور جنوب میں برمل، نغر بنوں، اور افغانستان[11] ہیں۔

یہ ایک مختصر ولایت ہے۔ جو حدود اربعہ کے اعتبار سے شکل میں طولانی ہے۔ اور اس کا یہ طول مشرق سے مغرب کی جانب چلا گیا ہے۔ اس کے تمام اطراف و جوانب میں پہاڑ ہی پہاڑ ہیں۔ اس کا قلعہ یہاں کے پہاڑ سے متصل ہے۔ قلعے کے مغرب اور جنوب میں پہاڑی ہے، جس کی چوٹی پر کبھی کسی شاہ کابل نے کوئی عمارت بنوائی تھی اسی لئے اس پہاڑی کا نام شاہ کابل[12] پڑ گیا۔ اس پہاڑی کے شروع میں دیورین نامی تنگ گھاٹی ہے جو دہ یعقوب نامی گھاٹی تک چلی گئی ہے۔ اس کا محیط تقریباً ایک شرعی ہوگا۔ اس پہاڑ کے دامن پر باغات ہی باغات ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ میرے چچا الغ بیگ کے زمانے میں ان کے اتالیق ویس آتکہ نے پہاڑ کے دامن پر ایک نہر نکالی تھی، چنانچہ جو باغات اس پہاڑ کے دامن میں واقع ہیں وہ اسی کے پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ جس جگہ پر یہ نہر ختم ہوتی ہے۔ وہاں گلکنہ نامی علاقہ ہے، بہت سنسان جگہ ہے۔ جہاں بہت سے بدکاری کے عمل ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ شوخی و مزاح کے طور پر حافظ شیرازی[13] کا یہ شعر ذرا سی تبدیلی کے ساتھ اس طرح پڑھا جاتا ہے:

ای خوش آن وقت کہ بی پا و سر ایّا می چند
ساکن گلکنہ بودیم بہ بدنامی چند

(ہائے افسوس! وہ کیا ہی اچھا وقت تھا جب کہ ہم نے آزادی سے چند دن گلکنہ میں بدنامی کے ساتھ گزارے۔)

قلعے کی جنوبی جانب اور شاہ کابل کے مشرق میں ایک وسیع جھیل ہے۔ جس کا محیط تقریباً ایک شرعی ہوگا شاہ کابل سے تین چھوٹے چھوٹے چشمے نکلتے ہیں جن میں سے دو گلکنہ کے گرد و نواح میں ہیں۔ ایک چشمے پر خواجہ شمو نامی[14] بزرگ کا مزار ہے۔ دوسرے چشمے پر حضرت خواجہ خضر[15] کی قدمگاہ ہے۔ یہ دو مقام اہلیان کابل کے

۱۰۔ ہزارہ اور نکدری۔ یہ مغل قبائل ہیں (جمکسن ۱۶۹ نوٹ ۵ ماخذ از حبیب السیر ۳: ۱۵۰، ۲۷۶، ۴: ۱۷۰، ۲۹۳) جو چنگیز خاں کی باقیات ہیں۔ بابر کے مطابق ان میں سے کچھ مغلی زبان بولتے ہیں (ورق ۱۱۱) ان کی شکل و صورت سے آج بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان کا تعلق منگولوں سے ہے۔ ان کی نسلیں کوہستانوں میں پلی بڑھی ہیں اور بیرونی رابطہ کم رہا ہے۔ اب یہ سب فارسی بولتے ہیں (کیرو ص ۱۳۶)۔ ہزارہ لفظ ہزار سے نکلا ہے۔ چنگیز خان یہاں دس ہزار فوج چھوڑ گیا تھا (ریسیز، بیلو ص ۱۱۴) بابر کے نکدری آجکل کے تکدری ہیں جو اس وقت قندھار اور ہرات کے بیچ میں آباد تھے۔ یہ افغان نہیں ہیں (کیرو ۱۵۵)

۱۱۔ بابر کا افغانستان آجکل کے افغانستان سے حدود اربعہ میں مختصر ہے۔ اس میں وہ علاقہ شامل نہیں ہیں جو کابل کے جنوب میں ہیں ہندوکش کا شمالی علاقہ شامل نہیں لیکن اس کی جنوبی سرحد دریائے سندھ ہے۔

۱۲۔ کابل کے جنوب مغرب میں جو پہاڑی ہے اس پر اب بابر کے مزار و باغات ہیں اور وہ ہی بابر سے منسوب ہے۔

۱۳۔ حافظ شیرازی۔ فارسی کے مشہور غزل گو شاعر۔ نام شمس الدین محمد، حافظ قرآن تھے اسی مناسبت سے تخلص رکھا۔ ان کے والد اصفہان سے شیراز آ کر بس گئے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد کمایا بھی اور دل لگا کر پڑھا بھی۔ کلام پہلے زیادہ مقبول نہ تھا۔ ایک دفعہ بابا کوہی کے مزار پر حضرت علی کی زیارت ہوئی جنھوں نے حافظ کو کچھ کھانے کو دیا جس سے آپ کے کلام میں تازگی آ گئی۔ کلام میں مستی اور رندی کا زور ہے۔ کلام چار دانگ عالم میں مقبول ہے اور ان کے اپنے زمانے میں ہی شہرت بلندیوں کو چھو رہی تھی۔

بہ شعر حافظ شیرازی می گویند وی رقصند
سید چشمانِ کشمیری و ترکان سمرقندی

دیوان کے علاوہ لسان الغیب و ترجمان الاسرار مشہور تصانیف ہیں۔ امیر تیمور نے شیراز فتح کرنے کے بعد ان سے ملاقات کی تو کہا کہ میں نے اتنے ملک فتح کئے تا کہ سمرقند و بخارا کو رونق و آباد کروں لیکن آپ نے ان کا یہ حشر کیا کہ انہیں محبوب کے ایک تل پر نچھاور کر دیا:

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوش سمرقند و بخارا

حافظ نے جواب دیا کہ یہ اسی فضول خرچی کا نتیجہ ہے کہ میں آج اس حال میں ہوں۔ تیمور نے جواب سے خوش ہو کر خلعت

تفریحی مقامات ہیں۔ ایک اور چشمہ (ورق ۱۰۹) خواجہ عبدالصمد کے مقابل واقع ہے جو خواجہ روشنائی کے نام سے مشہور ہے۔ شاہ کابل بلندی پر جا کر دوسرے پہاڑوں سے الگ ہو گیا ہے۔ جس کی چوٹی عقابین کہلاتی ہے۔ اس سے الگ ایک چھوٹا پہاڑ ہے، جس پر کابل کی شہر پناہ تعمیر ہے۔ قلعہ اسی فصیل شہر پناہ کے شمال میں واقع ہے۔ فصیل غیر معمولی طور پر بلند ہے اور یہاں کا ماحول نہایت ہی پر فضا۔ اس جگہ بلندی پر ایک بہت بڑی جھیل اور نیچے کی جانب میں سیہ سنگ، سونگ قرغان اور چالاک نامی سبزہ زار ہیں۔ جس وقت یہ میدان سرسبز و شاداب ہوتے ہیں تو بہت ہی حسین و دل کش نظر آتے ہیں۔ بہار کے موسم میں بادشمالی، ہر وقت چلتی رہتی ہے جسے یہاں بادوزان کہتے ہیں۔ فصیل شہر پناہ میں شمال کے رخ دریچہ دار مکانات بنائے جاتے ہیں۔ جس کے باعث فضا بہت خوشگوار رہتی ہے۔ چنانچہ ملا محمد طالب تخلص معمائی [16] نے کابل کی تعریف میں جو شعر کہا تھا اسے اس نے بدیع الزماں سے ممنون کیا تھا، شعر ملاحظہ ہو:

بخور درارک کابل می، بگردان کاسه پی در پی
که هم کوهست وهم دریا و هم شهراست وهم صحرا

(کابل کی فصیل شہر پناہ میں شراب پی، اور پیالے کو متواتر گردش میں لا کیوں کہ یہاں پہاڑ ہے، دریا بھی ہے، شہر بھی ہے اور صحرا بھی۔)

جس طرح عرب کے لوگ غیر عرب کو عجم کہتے ہیں اسی طرح اہل ہند، ہر اس جگہ کو جو ہندستان کے باہر ہے خراسان کے عنوان سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہندستان اور خراسان کے درمیان خشکی کے راستے دو تجارتی مرکز ہیں۔ ان میں سے ایک کابل ہے اور دوسرا قندھار۔ فرغنہ، ترکستان، سمرقند، بخارا، بلخ، حصار اور بدخشان سے کاروان کابل آتے ہیں اور خراسان سے قندھار کی جانب کوچ کرتے ہیں۔ خراسان اور ہندستان کے درمیان یہی ولایت جائے اتصال ہے اور تجارت کا بہت عمدہ مرکز۔ جو تاجر روم اور خطا جاتے ہیں وہ اس جگہ عمدہ کاروبار کر سکتے ہیں۔ یہاں ہر سال تقریباً سات آٹھ سو گھوڑے لائے جاتے ہیں۔ ہندستان سے بھی پندرہ بیس ہزار کاروان اپنے خاندان کے ساتھ کابل آتے ہیں اور اپنے ساتھ ہندستان کا مال لاتے ہیں، جو غلاموں، سفید کپڑے کے تھانوں، قند، نبات، شکر اور دواؤں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بہت سے سوداگر تو ایسے ہیں جو تین اور چار گنا نفع سے کم تو بات ہی نہیں کرتے۔ خراسان، عراق، روم اور چین کا مال کابل میں اکثر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ہندستان کی تو یہاں اپنی خاص منڈی ہے۔

یہاں گرم اور سرد مناطق ایک دوسرے کے نزدیک ہی ہیں۔ کابل سے ایک دن کا سفر طے کر کے ایسی جگہ پہنچا جا سکتا ہے جہاں برف کبھی نہیں پگھلتی۔ کبھی اتفاق سے گرمی پڑ جائے تو بالکل ہی پگھل جائے۔ کابل کے گرد و نواح میں موسم گرما و سرما کے میوے بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ یہاں کہ فضا بھی بڑی خوشگوار ہے۔ معلوم نہیں کہ یہاں کے علاوہ دنیا میں کسی اور جگہ کی فضا اتنی پُر لطف ہو۔ گرمی کے زمانے میں رات کو چادر اوڑھے بغیر نہیں سویا جا سکتا۔ جاڑے میں اگرچہ برف بہت زیادہ پڑتی ہے مگر بلا کی سردی نہیں ہوتی۔ سمرقند اور تبریز اپنے خوشگوار موسم کے لئے مشہور ہوں مگر وہاں سردی بھی غضب کی ہوتی ہے۔ کابل اور اس کے دیہات میں سردی کے میوہ جات جیسے انگور، انار، خوبانی، سیب، بہی، ناشپاتی، شفتالو، آلوچہ، عناب، بادام اور چار مغز بکثرت ہوتے ہیں۔ میں نے شاہ دانہ [17] کا پودا منگا کر وہاں لگوایا تھا، جس کا پھل بہت عمدہ ہوتا ہے اور اب بھی دن بدن پروان ہی چڑھ رہا ہے۔ گرمی کے پھل جیسے نارنج، ترنج، املوک [18] اور گنا وغیرہ لمغان کے اضلاع سے آتے ہیں۔ گنے کی جڑ تو میں لے کر آیا تھا اور اس کی بوائی کرائی تھی۔ یہاں چلغوزے نجراو سے کثیر تعداد میں لائے جاتے ہیں۔ (ورق ۱۱۰) یہاں شہد چاروں طرف سے آتا ہے صرف مغربی کوہستان سے نہیں آتا کابل میں ریوند چینی [19] کی

وانعام عطا کیا۔ ان کے دیوان سے لوگ اب بھی فال نکالتے ہیں۔ ان کا انتقال ۷۹۱/۱۳۸۹ میں ہوا۔ حافظ کا مزار شیراز میں جس علاقے میں ہے وہ حافظیہ کہلاتا ہے۔ لوگ گھومنے پھرنے اور کسی زمانے میں پینے پلانے بھی آتے تھے اور کچھ حافظ کے لئے خاک میں بھی ڈال دیتے تھے۔ فرما گئے ہیں

بر سر تربت ما چون گذری همت خواه
که زیارت گه رندان جهان خواهد شد

(شبلی نعمانی شعر العجم ۲: ۱۹۰) حافظ شیرازی کی ردیف چند کے ساتھ ایک ہی غزل ہے اور اصل شعر یہ ہے۔

زاهد اکوچه رندان بسلامت بگذر
تا خرابت نکند صحبت بد نامی چند
(دیوان حافظ ص ۷۶)

۱۴۔ خواجہ شمو۔ یہ عوام کی زبان میں خواجہ احمد شمس الدین جانباز کا نام ہے۔ آپ کے مزار کا ذکر میسن نے کابل کی زیارتوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کو ایک اہم زیارت بتایا ہے (میسن۔ بلوچستان، افغانستان، پنجاب ج ۲ ص ۲۷۹)

۱۵۔ خواجہ خضر ایک روایتی بزرگ ہیں۔ جو بھولوں بھٹکوں کو راستہ دکھاتے ہیں۔ آب حیات پینے کی وجہ سے عمر جاوداں ان کو نصیب ہے۔

عمر خضر سے زیادہ ہو اس کی زندگی
دھووں بیٹے جو یار کی زلف دراز کا (آتش)

(سید احمد دہلوی ۲: ۱۹۸) قدم گاہیں مسلم ممالک میں عام طور پر ملتی ہیں اور مشہور زیارت گاہیں ہیں۔

۱۶۔ ملا محمد طالب معمائی۔ یہ بدیع الزمان مرزا کے صدر تھے۔ پھر بابر کے پاس آ گئے تھے۔ کول ملک کی جنگ میں کام آئے یہ جنگ ۹۱۸/۱۵۱۲ میں بابر اور عبیداللہ ازبک کے درمیان ہوئی تھی۔ بابر کے واقعات میں اس کا ذکر نہیں۔ وہ صفحات غائب ہیں (اینٹ بیورج ص ۲۰۱ نوٹ ۷)

۱۷۔ شاہ دانہ۔ اسکو آلو بالو، چیری اور ولایتی مکو بھی کہتے ہیں ایک چھوٹا گول پھل جس کے بیچ میں دانہ ہوتا ہے۔ اس کا رنگ گہرا چمک دار سرخ ہوتا ہے۔ اس کا سائنسی نام پرونس ہے۔

۱۸۔ املوک۔ پہاڑیوں میں خودرو جنگلی جھاڑیوں میں یہ گوندنی پیدا ہوتی ہے۔ (الفنسٹن، کابل ص ۱۹۴)

۱۹۔ ریوند چینی۔ یہ نباتات چین اور تبت سے آئی ہے۔ اس کی جڑ یونانی دواؤں میں بطور ملین دوا کے کام آتی ہے۔ اس کا سائنسی نام ریوم ہے۔ یورپی ممالک میں جہاں قبض کی عام شکایت ہے

اس کے پتے بطور غذا استعمال کیے جاتے ہیں۔

فصل بہت عمدہ ہوتی ہے۔ یہاں کہ بہی اور آلو چے بھی اچھے ہوتے ہیں۔ یہاں ایک قسم کا انگور ہوتا ہے جسے آب انگور کہتے ہیں، یہ انگور بہت ہی عمدہ ہوتا ہے۔ یہاں کی شرابیں بہت زیادہ مستی آور ہوتی ہیں چنانچہ خواجہ خوانہ سعید نامی پہاڑ کے دامن کی شراب تو اپنی تیزی کے باعث مشہور ہے۔ یہاں میں دوسرے شعرا کی تقلید میں اس کی تعریف اس طرح کر سکتا ہوں:

لذّت می مست داند، هوشیاران راچه حظ

(شراب کی لذّت تو بس مست ہی جانتا ہے۔ ہوشیار لوگوں کو اس کی مزے کا کیا علم۔)

یہاں زراعت اچھی نہیں ہوتی۔ اگر چار یا پانچ گنا ہو جائے تو بس یہی غنیمت ہے۔ یہاں کے خربوزے بھی اچھے نہیں ہوتے لیکن خراسان سے لاکر اس کے تخم کی کاشت کی جائے تو پھل بُرا نہیں ہوتا۔

چراگاہیں

اس کے اطراف میں چاروں طرف بہت عمدہ چراگاہیں ہیں مشرق وشمال کی درمیانی جانب سونک قورغان ہے جو کابل سے تقریباً دو کروہ کے فاصلے پر ہے۔ یہ بہت ہی اچھی چراگاہ ہے اور اس کی گھاس گھوڑوں کو موافق آتی ہے۔ مکھیاں یہاں کم ہوتی ہیں۔ مغرب وشمال کے درمیان چالاک نامی چراگاہ ہے' جو کابل سے تقریباً ایک کروہ دور ہے۔ یہ بڑی وسیع چراگاہ ہے۔ فصل بہار میں یہاں مکھیاں گھوڑوں کو بہت تنگ کرتی ہیں۔ مغرب میں دیورین چراگاہ ہے۔ اصل میں یہ دو چراگاہیں ہیں جن میں سے ایک تیپا ہے اور دوسری قوش نادر، اس حساب سے یہاں پانچ چراگاہیں ہو جاتی ہیں۔ یہ دونوں چراگاہیں کابل سے ایک شرعی کے فاصلے پر ہیں اگرچہ چھوٹی ہیں مگر یہاں کی گھاس گھوڑوں کو خوب راس آتی ہے۔ یہاں مکھی بھی نہیں ہوتی۔ کابل کی تمام چراگاہوں سے ان دو کا کوئی مقابلہ نہیں مشرق میں سیاہ سنگ چراگاہ ہے، یہ دروازہ چرم گران کو گورخانہ قتلق قدم سے متصل کرتی ہے۔ چوں کہ موسم بہار میں یہاں مکھیاں کثرت سے ہوتی ہیں اسی لئے اس کی جانب کم ہی توجہ دی جاتی ہے۔ اسی سے متصل کمری نامی چراگاہ بھی ہے۔ اس اعتبار سے کابل کے نواح میں چھ چراگاہیں ہیں، لیکن ان میں سے مشہور چار ہی ہیں۔

ولایت کابل نہایت محکم ولایت ہے۔ اسی لئے دشمن کا یہاں حملہ کرنا سخت دشوار ہے۔ کوہ ہندوکش، کابل، کو بدخشاں، بلخ اور قندوز سے علیحدہ کرتا ہے۔ اس پہاڑ میں سات راستے ہیں، ان میں سے تین درہ پنج شیر میں ہیں یہاں بلندترین درہ خواک ہے۔ اس سے نیچے درّہ طول اور اس سے نیچے بازارک ہے۔ ان تینوں درّوں میں سے طول سب سے اچھا ہے۔ لیکن اس میں سے جو راستہ گزرتا ہے وہ قدرے طولانی ہے، اسی بنا پر اسے طول کہا جاتا ہے۔ بازارک درّے کا راستہ سب سے زیادہ سیدھا ہے۔ طول اور بازارک درّوں سے نیچے اتر کر سراب نامی مقام پر پہنچتے ہیں۔ چوں کہ یہ درّہ پارندی نامی گاؤں پر آکر ختم ہو جاتا ہے اسی لئے یہاں کے لوگ اسے کوتل پارندی (درّہ پارندی) کہتے ہیں۔ دوسرے راستے کا نام پروان ہے۔ اس کے علاوہ کوہ کلان اور پروان کے درمیان سات دیگر درّے ہیں جو ہفت بچہ کہلاتے ہیں۔ اندراب نامی مقام سے بھی دو راستے نکلتے ہیں جو کوتل کلان کے اختتام پر ایک راستے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ جو راستہ ہفت بچہؔ سے پروان کی طرف جاتا ہے نہایت ہی دشوار گزار ا ہے۔ غور بند میں سے بھی تین راستے نکلتے ہیں۔ پروان کی راہ سے نزدیک ترین راستہ درہ مایکی تول ہے۔ جو ولیان اور ضخان نامی مقامات پر آکر اترتا ہے۔ (ورق ۱۱۱) تیسرا درّہ قپچاق ہے جو دریائے اندراب اور سرخ آب کے سنگم پر اتر کر ختم ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک اچھا راستہ ہے۔ چوتھا راستہ شبرتو ہے۔ گرمی کے زمانے میں جب پانی کی افراط ہوتی ہے تو اس وقت ان درّوں سے اتر کر بامیان اور سایقان کی جانب رُخ کیا

جاتا ہے۔موسم سرما میں جب کہ تمام راستے تقریباً چار یا پانچ ماہ تک بند رہتے ہیں تو لوگ شبرتو کے راستے سے اس درّے کو پار کرتے ہیں اور آب درّہ نامی راہ پر سفر کرتے ہیں۔جو راستہ خراسان سے آتا ہے۔قندھار سے گزرتا ہے اور وہ ہموار ہے اس میں کوئی درّہ نہیں۔

ہندستان کے راستے

ہندستان سے آنے کے چار راستے ہیں۔ان میں سے ایک راستہ لمغانات سے گزرتا ہے۔اس راستے میں خیبر کے پہاڑ ہیں جن میں ایک مختصر درّہ بھی آتا ہے۔[20] دوسرا راستہ بنگش کا ہے۔تیسرا راستہ نغر سے اور چوتھا راستہ فرمول سے ہے۔اس راستے میں بھی کم وبیش درّے ہیں۔دریائے سندھ کو اس کے تین گھاٹوں کے ذریعے پار کر کے ان راہوں پر سفر کیا جاسکتا ہے۔جو لوگ نیلاب گھاٹ سے گزرتے ہیں وہ لمغانات کے راستے سے یہاں پہنچتے ہیں۔موسم سرما میں ذرا بلندی پر جہاں دریائے سندھ اور دریائے کابل کا سنگم ہوتا ہے، وہاں سے لوگ ان دریاؤں کو پار کرتے ہیں۔اس زمانے میں لوگ دریائے سوات اور دریائے کابل سے نہیں گزرتے میں نے جب بھی ہندستان پر لشکرکشی کی ہے میں نے اکثر ان ہی گھاٹوں سے گزر کر یہ دریا پار کئے ہیں۔اس مرتبہ جب میں وہاں پہنچا اور سلطان ابراہیم کو شکست دی اور ہندستان کو فتح کیا تو میں نے کشتی کے ذریعے ہی نیلاب کے گھاٹ سے دریا پار کیا تھا اس گھاٹ کے علاوہ کسی دوسری جگہ سے دریائے سندھ بغیر کشتی عبور نہیں کیا جاتا جو لوگ دینکوٹ گھاٹ سے دریا پار کرتے ہیں وہ بنگش پہنچتے ہیں۔اور جو لوگ جو بارہ گھاٹ سے دریا پار کرتے ہیں وہ برل کے راستے سے غزنی آتے ہیں۔اگر دشت کے راستے سے سفر کیا جائے تو قندھار پہنچا جاتا ہے۔

اقوام کابل

ولایت کابل میں مختلف اقوام کے لوگ آباد ہیں۔ان میں ترک، ایماق[21] اور عرب بستے ہیں۔شہر اور دیہات میں تاجیک نسل کے لوگ رہتے ہیں۔بعض دیہات اور ولایات میں پشائی[22]، پراچی[23]، تاجیک، ترکی اور افغان قبائل رہتے ہیں۔غزنی کے کوہستان میں ہزارہ اور نگدری قبائل کا مسکن ہے۔ہزارہ قبیلے کے لوگوں میں بعض لوگ مغلی زبان بولتے ہیں۔مشرق وشمال کے مابین کوہستانی سلسلے میں کافرستان[24] ہے جہاں کتور اور گبریک قبائل کے لوگ آباد ہیں۔اس کے جنوب میں افغانستان ہے۔

کابل میں تقریباً گیارہ یا بارہ بولیاں بولی جاتی ہیں۔عربی، فارسی، ترکی، ہندی، افغانی، پشائی، پراچی، گبری اور برکی ولمغانی۔معلوم نہیں کہ یہاں کے علاوہ کسی اور جگہ اتنی مختلف اقوام کے لوگ آباد ہوں اور اس قدر انواع واقسام کی زبانوں میں گفتگو کرتے ہوں۔یہ ولایت چودہ اضلاع پر منقسم ہے۔سمرقند وبخارا اور اس کے نواح میں ان اضلاع کو جو ایک ولایت کے تابع ہوں تومان کہتے ہیں۔اندجان اور کاشغر کے نواح میں انھیں درچن اور ہندستان میں پرگنہ کہتے ہیں۔ابتدائی زمانے میں باجوڑ، سوات، پشاور اور ہشنگر کابل کے ہی تابع تھے۔مگر فی زمانہ ان میں سے بعض تو افغان قوم کے ہاتھوں تباہ وویران ہوچکے ہیں اور بعض اس کے تحت تصرّف آگئے ہیں۔چنانچہ اب ان پر ولایت کی اصطلاح کا اطلاق نہیں ہوتا۔اس کے مشرق میں لمغانات ہیں، یہ ولایت پانچ تومان (اضلاع کلاں) اور دو بولوک (اضلاع خورد) پر مشتمل ہے۔

ننگرہار

ننگرہار ان تومانات میں سے سب سے بڑا تومان ہے۔بعض کتب تواریخ میں اسے نگرہار بھی بیان کیا گیا ہے۔ادینہ پور یہاں کی حکومت کا مرکز ہے (ورق ۱۱۲) جو کابل سے تیرہ فرسنگ کے فاصلے پر ہے۔کابل اور ننگرہار کے درمیان راستہ سخت دشوار ہے۔تین چار جگہ چھوٹے چھوٹے درّے ہیں، دو تین جگہ تنگ گھاٹیاں ہیں۔

۲۰۔ یہ درہ خیبر ہے جو چار دانگ عالم میں مشہور ہے۔لیکن بابر اس کا افغانستان کے اور دروں سے موازنہ کرتے ہوئے اس کو ایک چھوٹا درہ بیان کرتا ہے۔

۲۱۔ ایماق۔ یہ ترکی منگول قبیلے پہلے زیادہ تر ہرات کے آس پاس تھے۔اور کچھ قندھار میں۔اس میں جمشیدی، فیروزکوہی، تیموری اور چغتائی شامل ہیں اور نیم خانہ بدوش زندگی گزارتے ہیں فارسی بولتے ہیں۔اس میں سے تیموری زیادہ تر خراسان چلے گئے ہیں (گزٹ ص ۲۵)

۲۲۔ پشائی۔ یہ ایک چھوٹا قبیلہ ہے جو تقریباً ناپید ہوتا جارہا ہے (ممکسٹن ص ۷۳، نوٹ ۳۳۔ ماخوذ از گزیٹیر آدمیک ج ۶ ص ۶۴۷)

۲۳۔ پراچی۔ یہ قبیلہ پنجاب میں زیادہ ہے اور کچھ لوگ افغانستان ہجرت کرکے آباد ہیں۔لفظ پراچہ (کپڑے) سے مشتق ہے (ذاتوں کا انسائیکلوپیڈیا ص ۱۱۱)

۲۴۔ کافرستان۔ افغانستان کے شمال مشرق میں پہاڑی علاقہ جو جلال آباد کے قریب ہے۔اس کا حدود اربعہ پانچ ہزار میل ہے یہاں کی آبادی زیادہ تر غیر مسلم ہے۔یہاں کی وادیاں گہری اور تنگ ہیں۔ ذرائع آمد ورفت مشکل ہیں۔ سردیوں میں آبادیاں بند ہوجاتی ہیں اور ذرائع آمد ورفت ناممکن۔ یہاں کئی قبیلے آباد ہیں۔ان میں آپس میں بھی بہت فرق ہے۔ قبیلے کا سردار جست کہلاتا ہے اور بزرگوں پر مشتمل جرگہ فیصلہ کرتا ہے، عورتوں کی حیثیت کافی دگرگوں ہے۔کئی شادیوں کا عام رواج ہے۔وادی میں سبزہ تیرہ ہزار فٹ تک ہے۔اس سے اوپر سبزہ نہیں۔ پانی کی فراوانی ہے جس میں مچھلیاں کافی ہوتی ہیں لیکن کافر مچھلی نہیں کھاتے۔

امیر عبدالرحمٰن نے ۶ - ۱۸۹۵ء میں اس کو افغانستان میں شامل کرلیا تھا اور اس کا نام نورستان رکھ دیا (امپیریل گزیٹیر ص ۶۸)

امیر عبدالرحمٰن نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ کافر انتہائی جنگلی قوم تھے۔ اپنی بیویوں کو دے کر گائیں لے لیتے تھے (دی لائف اوف عبدالرحمٰن ج ۱ ص ۲۸۸)

باغ وفا۔ ننگر ہار صوبے جلال آباد سے جنوب مغربی علاقہ جہاں آج بھی پھلوں کے باغات ہیں

چشمہ خواجہ خضر کابل کی ایک مشہور زیارت گاہ۔ بابر کے زمانے میں یہاں ایک قدم شریف تھا
جس کا اب نام ونشان نہیں
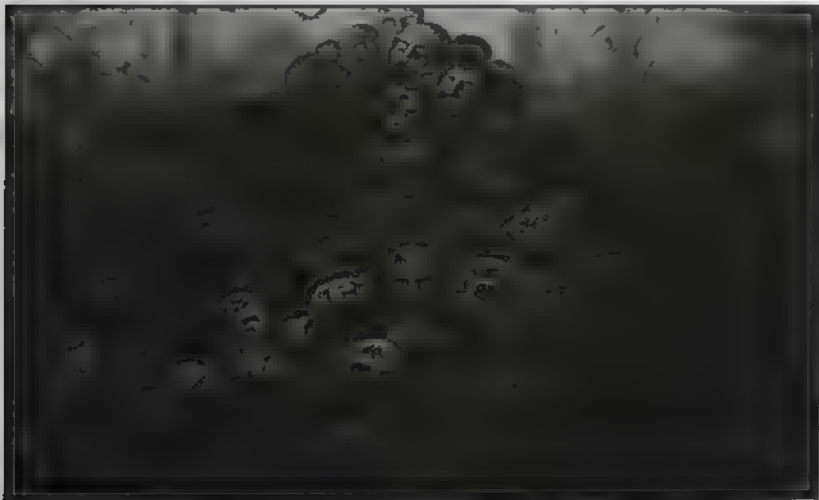
کلہ مینار۔ یہ نقاشی کند بادام کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ شاید ۱۹۳۰ء میں کسی روسی نقاش نے بنائی تھی۔

خرلچی اور تمام راہزن افغان قبائل ان راہوں پر لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ چونکہ یہاں آبادیاں نہ تھیں اسی لئے میں نے قراتو نامی جگہ کو قوروق سائے کی انتہا تک آباد کرادیا اور اسی وجہ سے یہ راستہ پرامن ہوگیا۔

گرم و سرد علاقوں کو بادام چشمہ نامی درّہ ایک دوسرے سے علیحدہ کرتا ہے۔ درّے کے اس جانب برف باری ہوتی ہے مگر قوروق سائے اور لمغانات کی طرف برف نہیں پڑتی۔ اس درّے کے گزرتے ہی دوسرا عالم ہوتا ہے۔ درختوں کی قسم علیحدہ، گھاس کی قسم الگ، جانور کی نوعیت دیگر اور آداب و رسوم قطعی مختلف ننگر ہار میں تو دریا ہیں، یہاں چاول اور گیہوں کی فصل عمدہ ہوتی ہے۔ نارنج، اور ترنج اور انار بھی کثرت سے ہوتے ہیں۔ اور بہت عمدہ ہوتے ہیں۔

باغِ وفا

قلعہ آدینہ پور کے مقابل جنوبی سمت میں ایک بلند جگہ پر میں ۹۱۴/۹۔۱۵۰۸ میں ایک چار باغ بنوایا جس کا نام باغ وفا ہے یہ دریا سے متصل ہے جو قلعے اور باغ کے درمیان سے گزرتا ہے۔ جس سال میں نے پہاڑ خان کو زیر کر کے لاہور اور دیپال پور فتح کیا تھا، اسی سال میں نے یہاں کیلے کے درخت لگوائے تھے جو خوب پھلے اور پھولے اس سے ایک سال پہلے گنّے کی فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔ یہی گنّے کی پود بدخشاں اور بخارا بھیجی گئی تھی۔ یہاں کی سطح زمین مرتفع ہے اور پانی ہر وقت رواں رہتا ہے۔ سردی کے زمانے میں موسم معتدل رہتا ہے۔ باغ کے درمیان میں ایک چھوٹا پشتہ ہے اسی پشتے سے جو باغ کے درمیان واقع ہے اتنا پانی گرتا ہے جس سے چکی چل سکے۔ باغ میں جو چار چمن ترتیب دیا گیا ہے وہ اسی پشتے پر ہے۔ باغ کے مغرب اور جنوب کے درمیان ایک حوض ہے، جس کا طول و عرض دس گز ہے۔ اس کے اطراف میں تمام نارنج کے درخت ہیں۔ یہاں انار کے درخت بھی ہیں۔ حوض کے اردگرد سہ برگہ (گھاس) کا سبزہ زار ہے۔ باغ کی پر رونق جگہ یہی ہے۔ جس وقت نارنج زرد ہو جاتے ہیں تو بہت دلکش نظر آتے ہیں۔ باغ کی طرح اندازی بھی بہت عمدہ طور پر کی گئی ہے۔

کوہِ سفید

ننگر ہار کے جنوب میں کوہ سفید[۲۵] واقع ہے جو ننگر ہار اور بنگش کے درمیان حائل ہے۔ اس پہاڑ سے سوار ہو کر نہیں گزرا جا سکتا۔ س پہاڑ سے کوئی دریا بھی نہیں نکلتا اس پر برف کبھی نہیں پگھلتی۔ اسی وجہ سے اسے کوہ سفید کہتے ہیں لیکن وہ تنگ گھاٹی جو پہاڑ کے سرے پر ہے وہاں کبھی برف نہیں پڑتی۔ باغ اور پہاڑ کے درمیان اتنی جگہ ہے کہ جہاں اچھی خاصی جماعت اتر سکتی ہے۔ اس پہاڑ کے دامن پر کئی پرفضا مقام ہیں۔ پانی ایسا سرد کے برف کی ضرورت ہی نہیں۔ قلعہ آدینہ پور کے جنوب میں سرخ رود (سرخ دریا) ہے۔ قلعہ بلند جگہ پر واقع ہے۔ دریا کی جانب چالیس پچاس گز تک پہاڑ ایک ہی انداز میں چلا گیا ہے۔ اس کے شمال میں ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے جس پر مضبوط قلعہ بنا ہوا ہے۔ یہ پہاڑ ننگر ہار اور لمغانات کو ایک دوسرے سے متصل کرتا ہے۔ جس وقت کابل میں برف گرتی ہے تو اس قلعے پر بھی برف باری ہوتی ہے یہاں کی برف باری سے لمغان کے لوگ اس بات کا اندازہ لگا لیتے ہیں کہ کابل میں بھی برف گر رہی ہے۔ وہ راستہ جو کابل سے ان لمغانات کی جانب آتا ہے اس پر اگر قوروق سائے کی جانب سے آئیں تو دیری درّہ راہ میں آتا ہے (ورق ۱۱۳) اور اگر بولان سے لمغانات کی طرف چلیں تو ایک راستہ اور بھی ہے جو قوروق سائے سے ذرا نیچے واقع ہے۔ چنانچہ قوراتو سے گزرے، اور اولوق کو آب باران پر پار کرتے اور بادیچ درّے سے ہوتے ہوئے لمغان پہنچتے ہیں۔ اگر نجراو کی راہ سے آئیں تو بدراوٗ گزار کر اور قرا انکریق کو پار کر کے درّہ بادیچ پہنچتے ہیں۔ لمغانات میں جو اضلاع (تومان) شامل ہیں ان میں سے ایک ننگر ہار ہے۔ لیکن لمغانات کو جن تین اضلاع پر مشتمل سمجھا جاتا ہے ان میں سے ایک علیشنگ ہے۔

۲۵۔ کوہ سفید۔ یہ مشرقی افغانستان کا مشہور پہاڑ ہے جو افغانستان اور پاکستان کو جدا کرتا ہے۔ درہ خیبر اور جلال آباد اس کے شمال میں ہیں (امپیریل گزیٹیر ص ۶۸)۔

جن کا شمالی حصّہ ہندوکش سے جاملتا ہے۔ یہاں بہت بڑے بڑے پہاڑ ہیں جن پر برف خوب گرتی ہے۔ یہ تمام کوہستانی علاقہ کافرستان کہلاتا ہے۔ کافرستان میں علیشنگ میل سب سے نزدیک جگہ ہے علیشنگ دریا اسی میں سے نکلتا ہے۔ حضرت نوحؑ کے باپ حضرت مہترلام [۲۶] کی درگاہ اسی ضلع میں واقع ہے۔ جو لمک اور لمکان مشہور ہے۔ بہت غور و فکر کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ اس علاقے کے لوگ حرف ''کاف'' کو غین کی صورت میں ادا کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے غالبًا اس ولایت کو لمغان کہا جاتا ہے۔

النگار

دوسرا ضلع (تومان) النگار ہے۔ کافرستان میں النگار کے نزدیک ترین جگہ گور ہے۔ النگار دریا گور ہی سے نکلتا ہے۔ یہ دونوں دریا علیشنگ اور النگار کو پار کر کے ایک دوسرے سے جاملتے ہیں۔

منداور

تیسرا ضلع مندرجہ بالا ضلع سے ذرا نیچے واقع ہے۔ جس کا نام منداور ہے جو آب باران تک چلا گیا ہے۔

درہ نور

جن دو بلوک کا ذکر اوپر آچکا ہے ان میں سے ایک درّہ نور ہے اور یہ ایسی جگہ واقع ہے کہ جس کی نظیر نہیں اس کا قلعہ پہاڑ کی نوک پر وادی کے دہانے پر واقع ہے۔ جس کے دونوں طرف دریا بہتا ہے، جہاں دھان کے کھیت دور تک چلے گئے ہیں۔ اس پہاڑ پر راستے کے علاوہ سفر نہیں کیا جاسکتا۔ نارنج، ترنج کے علاوہ موسم سرما کے پھل بھی یہاں ہوتے ہیں۔ یہاں چند کھجور کے درخت بھی ہیں۔ اس دریا کے کنارے کنارے جو قلعے کے دونوں طرف ہے ہر جگہ درخت ہی درخت ہیں۔ جن میں املوک سب سے زیادہ پایا جاتا ہے بعض ترک اسے قرایمش بھی کہتے ہیں۔ یہ درخت اس درّے میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ اس جگہ کے علاوہ کسی دوسری جگہ یہ درخت نہیں دیکھا گیا۔ یہاں انگور بھی ہوتے ہیں جن کی بیلیں درختوں پر پروان چڑھتی ہیں۔ لمغانات میں درّہ نور کی شراب مشہور ہے۔ جو دو قسم کی ہوتی ہیں جسے ارّہ تاشی اور سوہن تاشی کہتے ہیں۔ ارّہ تاشی زردی مائل ہوتی ہے اور سوہن تاشی کا رنگ شوخ سرخ۔ ارّہ تاشی سے سرور زیادہ ہوتا ہے۔ اگرچہ دونوں میں نشے کے اعتبار سے سرور کی وہ کیفیت نہیں جتنی بیان کی جاتی ہے۔ یہاں سے ذرا بلندی پر اس وادی کے دہانوں پر بندر بھی پائے جاتے ہیں اور اس سے نیچے ہندستان کی طرف بھی یہ جانور ملتا ہے۔ اب سے قبل اس جگہ سے ذرا بلند مقام پر لوگ سور بھی پالتے تھے۔ مگر اب ہمارے زمانے میں یہ رواج ختم ہوگیا ہے۔

کنر و نورگل

تیسرا ضلع کنر و نورگل ہے۔ یہ ضلع لمغانات سے ذرا دور واقع ہے۔ یہ کافرستان میں شامل ہے اور اسی ولایت کی سرحد بھی ہے۔ اگرچہ رقبے میں یہ دیگر اضلاع کے برابر ہی ہے مگر یہاں کا محصول کم ہے کیونکہ جگہ دور افتاد ہے اور چغان سرائے دریا مشرق و شمال کے درمیان سے نکل کر کافرستان میں سے گزرتا ہے اور اس ولایت سے گزرنے کے بعد کامہ بلوک میں آب باران نامی دریا سے متصل ہوکر (ورق ۱۱۴) مشرق کی جانب چلا جاتا ہے۔

میر سید علی ہمدانی رحمتہ اللہ علیہ [۲۷] سیاحت کرتے ہوئے یہاں تشریف لائے اور کنار نامی مقام سے ایک شرعی دو اس بلند مقام پر رحلت کی۔ ان کے مریدان کے جسد کو یہاں سے ختلان [۲۸] لے گئے۔ جس جگہ موصوف نے رحلت فرمائی تھی اب وہ جگہ زیارت گاہ بن گئی ہے۔ ۹۲۵ھ میں چغان سرائے پر قبضہ کر کے اس زیارت گاہ کا میں نے طواف کیا تھا۔

۲۶۔ مہترلام۔ انہوں نے لمبی عمر پائی۔ ایک سو پچاسی برس کی عمر میں حضرت نوح پیدا ہوئے اس کے بعد بھی پانچ سو پچانوے سال اور زندہ رہے۔ اس طرح ان کی کل عمر سات سو ستتر سال ہوتی ہے (توریت تخلیق ۵:۲۸) مہتر کے معنی بڑے اور بزرگ کے ہیں۔

۲۷۔ میر سید علی ہمدانی کا پورا نام علی ابن شہاب الدین ابن محمد ہے۔ یہ ۱۲/۷/۱۳۱۴ کو ہمدان میں پیدا ہوئے۔ صوفی منش تھے۔ ایران سے کشمیر گئے اور کبراویہ سلسلہ صوفیہ کو کشمیر میں پھیلایا۔ ان کی مشہور کتاب ذخیرہ الملوک ہے۔ ان کا انتقال کنار میں ۸۶/۷/۱۳۸۵ میں ہوا۔ ان کے جسد خاکی کو کلاب تاجکستان لیجایا گیا۔ ان کا مزار اب بھی زائرین کے لئے کشش کا باعث ہے (برٹینیکا)

۲۸۔ ختلان وہ علاقہ جو بدخشان کے شمال مغرب میں ہے۔ اس کی مغربی حد دریائے سرخاب (وخش) ہے۔ یہ تنگ وادی ہے لیکن زرخیز علاقہ کلاب اور اس کے اطراف ہے جہاں میر سید علی ہمدانی کا مزار ہے۔ یہ آجکل تاجکستان میں ہے۔ یہاں کے گھوڑے مشہور ہیں (انسائیکلوپیڈیا اسلامیکا)

نارنج، لیموں اور چاول یہاں بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ کافرستان سے تیز قسم کی شرابیں بھی لائی جاتی ہیں۔ یہاں کے لوگ عجیب باتیں بیان کرتے ہیں جو قابل قبول تو نہیں لیکن مسلسل و متواتر سنی گئی ہیں۔ اس ضلع سے نیچے کی جانب ایک جگہ ہے جسے ملتہ کندی کہتے ہیں۔ اس سے نیچے درّہ نور ہے جو اتر ار سے متعلق ہے۔ ملتہ کندی سے بلند تر ان مقامات پر جو اس کوہستانی سلسلے میں واقع ہیں جیسے نور گل، باجوڑ اور سوات وغیرہ میں یہ بات مشہور ہے کہ جس وقت یہاں کوئی عورت مرجاتی ہے تو اسے چار پائی پر لٹا دیتے ہیں اور اس کے چاروں کونے اٹھاتے ہیں۔ اگر اس عورت سے گناہ صادر نہ ہوئے ہوں تو یہ چار پائی اٹھانے والوں پر اچانک لرزہ طاری کردیتی ہے۔ اگر یہ لاش برادر اس پر قابو پالیں تو لاش خود ہی چار پائی سے نیچے گر جاتی ہے۔ اگر یہ عورت اعمال بد کی مرتکب ہوئی ہو تو اس میں جنبش پیدا نہیں ہوتی۔ یہ بات میں نے صرف یہیں کے لوگوں سے نہیں سنی بلکہ باجوڑ، سوات اور اس کے کوہستانی سلسلے کے تمام لوگوں نے یہی بات بتائی۔ حیدر علی باجوڑی ولایت باجوڑ کا سلطان تھا اس نے اس ولایت کا نظم و نسق بہت عمدہ کر رکھا تھا۔ اس نے اپنی ماں کے مرنے پر آہ و زاری نہیں کی اور اس کا ماتم نہیں کیا، سیاہ لباس نہیں پہنا۔ اس نے بھی بس اتنا ہی کہا کہ جاؤ میری ماں کو چار پائی پر لٹا دو۔ اگر لاش میں جنبش نہیں ہوئی تو میں اسے جلا دوں گا۔ چنانچہ اس کی ماں کی لاش کو چار پائی پر لٹا دیا گیا۔ حسب معمول اس میں جنبش پیدا ہوئی۔ جب اس نے یہ سنا تب اس نے سیاہ لباس پہنا اور اس کا ماتم کیا۔

چغان سرائے

چوتھا بلوک چغان سرائے ہے۔ جو رقبے میں کسی گاؤں سے زیادہ نہیں۔ ویران جگہ ہے اور کافرستان کے دامن پر واقع ہے یہاں کے لوگ کافرستان کے لوگوں سے بود و باش میں اس قدر متاثر ہیں کہ اگرچہ مسلمان ہیں مگر کافروں کی بہت سی رسومات ادا کرتے ہیں۔ ایک بڑا دریا دریائے چغان سرائے کے نام سے مشہور ہے۔ چغان سرائے کی شمالی مشرقی جانب سے نکلتا ہے جو باجوڑ کے عقب سے گزرتا ہوا اور مغربی جانب سے کافرستان میں داخل ہو کر پیچ نامی مقام پر ایک چھوٹے دریا سے جا ملتا ہے۔ چغان سرائے کی مشروبات نشے میں تیز اور رنگ میں ہلکی زرد ہوتی ہیں جن کا درّہ نور کی مشروبات سے کوئی مقابلہ نہیں۔ چغان سرائے میں انگور اور باغات نہیں ہیں۔ پانی بھی اوپر کافرستان اور دریائے پیچ سے لایا جاتا ہے۔ جس وقت میں نے چغان سرائے پر قبضہ کیا تو پیچ کے کافر ان لوگوں کی مدد کے لئے آئے تھے۔ ان لوگوں میں شراب کا ایسا عام رواج ہے کہ ہر کافر کی گردن میں شراب کی کُپی لٹکی رہتی ہے۔ پانی کی جگہ شراب ہی پیتے ہیں۔

کامہ

کامہ اگرچہ کوئی مستقل مقام نہیں بلکہ ننگر ہار کے تابع ہے اسے بھی تحصیل ہی کہا جاتا ہے۔

نجراو

نجراو ایک اور تومان ہے یہ کابل کے مشرق و شمال میں واقع ہے۔ اس کی پشت پر کوہستانی علاقے میں کافر آباد ہیں اور پورا علاقہ کافرستان کہلاتا ہے۔ یہ بہت ہی دور افتادہ مقام ہے۔ انگور اور دوسرے میوے فراواں ہوتے ہیں۔ یہاں کی شراب عمدہ ہوتی ہے۔ لیکن وہ اسے جوش دیتے ہیں۔ موسم سرما میں مرغوں کو پال کر خوب فربہ کرتے ہیں۔ یہاں کے اکثر لوگ شراب خور ہیں۔ نماز سے بیگانہ آدمیت سے دور بالکل کافروں کے انداز میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہاں کے (ورق ۱۱۵) کوہستانی سلسلے میں چنار و چلغوزہ و بلوط اور خنجک [۲۹] کے درخت کثرت سے ہوتے ہیں۔ چنار، بلوط اور چلغوزے کے درخت نیچے کے علاقے میں ملتے ہیں اور نجراو سے اوپر تو

۲۹۔ خنجک۔ وہ درخت جس سے رال (گوند کی قسم) نکالی جاتی ہے۔ اس کا سائنسی نام پسٹا سیا لینٹی کس ہے۔

قطعی نہیں ہوتے۔ ان کا شمار ہندستان کے درختوں میں ہوتا ہے۔ اس کوہستانی سلسلے کے لوگ روشنی کے لئے چلغوزے کی لکڑی کا استعمال کرتے ہیں جو شمع کی طرح روشن رہتی ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ جلتی نہیں۔ نجراو کے کوہستان میں اڑنے والی گلہری [۳۰] پائی جاتی ہے جو درحقیقت ایک جانور ہے جو گلہری سے ذرا بڑا ہوتا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھوں اور رانوں کے درمیان ایسے پردے ہوتے ہیں جیسے چمگاڈر کے پروں میں۔ اس جانور کو دکھانے کے لئے لوگ میرے پاس مسلسل آتے رہتے۔ کہتے ہیں کہ ایک درخت سے دوسرے درخت تک نشیب کی طرف یہ تقریباً ایک گز کے فاصلے تک چھلانگ لگا لیتی ہے لیکن میں نے اسے چھلانگ لگاتے نہیں دیکھا۔ لیکن جب اسے درخت پر چھوڑ آ گیا تو یہ اس پر چپک گئی اور وہاں سے اس نے جست بھری۔ وہاں سے جب اسے اڑایا گیا تو اس نے پرندوں کی طرح اپنے بازو کھولے اور اڑتی ہوئی نیچے آ گئی۔

اس کوہستان میں لوچہ [۳۱] نامی پرندہ ہوتا ہے جسے بوقلمون (چتی دار) کہتے ہیں۔ اس کے سر سے دم تک پانچ چھ مختلف رنگ ہوتے ہیں جو کبوتر کی گردن کی طرح چمکدار ہوتے ہیں قد و قامت میں یہ چکور کے برابر ہوتا ہے، غالباً ہندستان کا چکور یہی ہے۔ لوگوں نے اس کے بارے میں عجیب باتیں بتائی ہیں۔ جب موسم سرما آتا ہے تو یہ اتر کر پہاڑ کے دامن میں پہنچ جاتا ہے اگر اسے اڑایا جائے تو بس انگور کے پانچ باغوں تک ہی اڑ سکتا ہے۔ اس کے بعد بالکل نہیں اڑ سکتا۔ لوگ اسے پکڑ لیتے ہیں۔

نجرو میں چوہے کی ایک قسم ہوتی ہے جسے موش مشکین [۳۲] کہتے ہیں کیونکہ اس کے جسم سے مشک کی خوشبو نکلتی ہے۔ میں نے یہ جانور نہیں دیکھا۔

پنج شیر: پنج شیر پانچواں تومان ہے جو کافرستان کے راستے پر واقع ہے۔ اس سے بہت زیادہ نزدیک ہے۔ کفار راہزنوں کی آمد و رفت پنج شیر سے ہی رہتی ہے۔ یہاں کے لوگ چوں کہ کفار کے نزدیک ہیں اسی لئے ان سے محصول وصول کرتے ہیں۔ اس مرتبہ آکر جب میں نے ہندستان کو فتح کیا تو کفار نے وہاں پہنچ کر بہت سے آدمیوں کو قتل کر دیا اور بہت زیادہ تباہی مچائی۔

غور بند: چھٹا ضلع غور بند ہے۔ اس ولایت میں درّے کو بند کہتے ہیں۔ غور کی جانب اسی درّے سے گزر کر جاتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے اسے غور بند کہا جاتا ہے۔ درّوں کے دہانوں پر ہزارہ قبائل کا قبضہ ہے۔ یہ چند دیہات پر مشتمل ہے۔ جن کی آمدنی بہت قلیل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ غور بند میں چاندی اور لاجورد [۳۳] کی کانیں ہیں۔ اس پہاڑ کے دامن میں کچھ گاؤں بھی ہیں، جن میں سے چند کے نام یہ ہیں: رویہ، متہ، کچہ اور پروان۔ رویہ گاؤں سے نیچے بارہ تیرہ گاؤں ہوں گے۔ یہاں کے دیہات میں بھی پھل پائے جاتے ہیں۔ یہاں کی شراب ان ہی دیہات میں کشید کی جاتی ہیں۔ ان تمام شرابوں میں خواجہ خاں سعید سب سے زیادہ تند ہوتی ہے۔ چونکہ یہاں کے تمام دیہات دامن کوہ اور بلندیوں پر واقع ہیں اسی لئے یہ لوگ خراج ادا نہیں کرتے اور اس قابل بھی نہیں کہ ان سے خراج وصول کیا جائے۔

ان دیہات سے ذرا نیچے دامن کوہ پر پہاڑ اور دریائے باران کے درمیان دو ہموار میدانی علاقے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام کرّہ تازیان ہے اور دوسرے کا دشت شیخ۔ موسم گرما میں چیکن تالہ نامی گھاس کثرت سے ہوتی ہے۔ جس کے لئے ایماق ترک قبائل یہاں آتے ہیں۔

دامن کوہ پر مختلف رنگوں کے پھول بکثرت ہوتے ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ حکم دیا کہ ان کا شمار کیا جائے بتیس تینتیس قسم کے پھول شمار کئے گئے (ورق ۱۱۶) یہاں پھولوں کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے جس میں سے بھینی بھینی گلاب کی خوشبو نکلتی ہے۔ اسی لئے میں نے اس کا نام لالہ گل بوئے رکھ دیا ہے۔ لالہ کی یہ قسم دشت شیخ میں بس ایک ہی جگہ پائی جاتی ہے۔ دوسری کسی جگہ نہیں ملتی۔ اسی دامن کوہ پر پروان سے ذرا نیچے لالہ صد برگ پایا جاتا ہے۔

۳۰۔ اڑنے والی گلہری۔ ایک گلہری کی قسم جو ایک درخت سے دوسرے درخت تک چھلانگ لگا سکتی ہے۔ اس کے اگلے پاؤں سے پچھلے پاؤں تک ایک جھلی ہوتی ہے۔ جو اڑتے وقت گرنے سے روکتی ہے۔ اسی کا سائنسی نام ٹروپس ہے۔ اس کی عام خوراک درختوں کے پھل ہوتے ہیں۔

۳۱۔ لوچہ۔ اس کو فارسی میں کبک اور اردو میں چکور یا پہاڑی تیتر کہہ سکتے ہیں۔ سائنسی نام پرڈکس ہے۔ سکندر برنس نے بھی اس کو کوہستان میں دیکھا اور نعمت غیر مترقبہ کہا۔ اس کے گوشت کی تعریف ہے۔ (کابل ص ۱۶۳)

۳۲۔ موش مشکین۔ موش فارسی میں چوہے کو کہتے ہیں یہ چوہے سے تھوڑا بڑا ہوتا ہے۔ اس کا رنگ گہرا کالا پیٹھ پر اور ہلکا خاکی پیٹ پر، دریاؤں اور تالابوں کے کنارے پر زمین میں بل بنا کر رہتا ہے اور راتوں میں باہر نکلتا ہے۔ اس کے چڈوں میں سے رطوبت نکلتی ہے جس میں مشک کی سی خوشبو ہوتی ہے۔ اس کا سائنسی نام فائبر ہے۔

۳۳۔ لاجورد۔ ایک شوخ نیلے رنگ کی معدنیات۔ اس پتھر کی یہ کان ماقبل از تاریخ سے کام کر رہی ہے۔ اس پتھر کو دریائے سندھ اور بابل کی تہذیبوں میں پایا گیا ہے۔ اسے برطانوی عجائب گھر کے ارکے مجموعہ نوادرات اور توتن خامون کی نقاب کی آنکھوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ دنیا کی ایک ہی کان ہے، جس میں اسقدر بہترین پتھر پیدا ہوتا ہے۔ کان کنی کے طریقے ہزاروں سال سے بدلے نہیں ہیں۔ یہاں چار کانیں ہیں، جس میں سے دو کانوں کا پتھر بہترین ہے۔ یہ کانیں چترال سے ۲۵ میل دور ہیں۔ لیکن راستہ انتہائی دشوار گزار ہے۔ ایک انتہائی نایاب ذریعہ آمدنی بے وقوفی سے سستے داموں فروخت ہو رہا ہے (جون سمپسن۔ سٹرینج پلیسیس کویسچن ایبل پیوپل، ص ۵۰۶۔ بارتھولڈ، ترکستان ص ۲۶)

یہ غور بند کے تنگ درّے کے باہر بس ایک جگہ ہی پیدا ہوتا ہے۔ ان دو دشت کے درمیان ایک پہاڑی ہے۔ ایک طرف یہ پہاڑی ہے تو دوسری طرف ہموار میدان۔ اس پہاڑ کی چوٹی سے اس کے دامن تک کے علاقے کو خواجہ ریگ روان کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ گرمی کے موسم میں یہاں سے نقارے بجنے کی آوازیں آتی ہیں۔[۳۴]

کابل کے دیہات: کابل کے تابع چند دیہات ہیں۔ جنوب مغرب میں ایک بڑا پہاڑ[۳۵] ہے جہاں اتنی برف گرتی ہے کہ سال ہا سال تک ختم نہیں ہوتی اگر کسی سال برف کم پڑے کہ پورے سال تک کے لئے کافی نہ ہو اور کابل کے سردخانوں کی برف ختم ہو جائے تو اس پہاڑ سے برف لائی جاتی ہے اور اسے پگھلا کر پانی پیتے ہیں۔ یہ پہاڑ کابل سے تقریباً تین شرعی دور ہوگا۔ کوہ بامیان[۳۶] اور یہ پہاڑ دونوں ہی عظیم شمار کئے جاتے ہیں۔ ہلمند، سندھ، (کابل) دوغابہ قندوز اور بلخاب جیسے دریا ان ہی پہاڑوں سے نکلتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص چاہے تو چاروں دریاؤں کا پانی ایک دن میں پی سکتا ہے۔ ان دیہات میں سے بیشتر اسی دریا کے دامن پر بسے ہوئے ہیں۔ باغات اور انگور یہاں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ہر قسم کا میوہ پایا جاتا ہے اور بہت عمدہ ہوتا ہے۔ دیہات میں استالف[۳۷] اور استرغچ[۳۸] کا ثانی نہیں۔ الغ بیگ مرزا ان دیہات کو اپنا خراسان اور سمرقند کہا کرتے تھے۔

پغمان ان دیہات میں سے ایک ہے۔ جو ان دیہات سے تیر کی رسائی کی حد میں واقع ہے۔ اگرچہ انگور اور دوسرے پھل تو اتنے اچھے نہیں ہوتے جیسے دیگر دیہات میں مگر یہاں کی آب و ہوا کا ان مقامات سے کوئی مقابلہ نہیں۔ یہاں کے پہاڑ برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ دیگر مقامات شاید ہی ایسے دل کش ہوں جن کا استالف سے مقابلہ کیا جا سکے۔ اس کے درمیان سے ایک وسیع دریا گزرتا ہے۔ جس کے دونوں طرف باغات اور سرسبز وشاداب باغیچے ہیں۔ اس کا پانی اتنا سرد ہے کہ برف کی ضرورت نہیں۔ اکثر جگہوں پر پانی صاف رہتا ہے۔ یہاں باغ کلاں نامی باغ ہے جسے الغ بیگ نے غصب کر لیا تھا مگر میں نے اس کے مالکوں کو اس کی قیمت ادا کر کے حاصل کیا۔ باغ کے باہر سبز گھنے سایہ دار چنار کے درخت ہیں، مکانات صاف اور ستھرے ہیں۔ باغ کے درمیان سے ایسی نہر گزرتی ہے جس میں ہمیشہ اتنا پانی رہتا ہے کہ چکی چل سکے۔ اس نہر کے کنارے چنار کے علاوہ بھی انواع واقسام کے درخت بکثرت ہیں۔ اب سے قبل یہ نہر کسی طور وطریقے کے تحت نہیں بنائی گئی تھی البتہ میں نے حکم دیا کہ اسے سیدھا کر کے درست کریں۔ اب بہت حسین و دل کش جگہ بن گئی ہے۔ ان دیہات سے ذرا نیچے، دشت سے ایک یا ڈیڑھ کروہ کے فاصلے پر بلند پہاڑ کے دامن میں نیچے کی جانب ایک چشمہ ہے جسے خواجہ سہ یاراں[۳۹] کہتے ہیں۔ اس چشمے پر کئی قسم کے درخت لگے ہیں سامنے چنار نیز اس کے اطراف میں پشتوں پر جو پہاڑوں کے سروں پر ہیں بلوط کے درخت کثرت سے ہیں۔ ان کے علاوہ کابل کی مغربی پہاڑوں میں قطعی ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں بلوط کے درخت پائے جاتے ہوں۔ اس چشمے کے سامنے جو دشت کی جانب واقع ہے ایک وسیع ارغوان کا جھنڈ ہے۔ اس ولایت میں اس کے علاوہ کوئی دوسرا ایسا جھنڈ نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تین قسم کے درخت ان تین بزرگوں کی کرامت سے پیدا ہوئے۔ (ورق ۱۱۷) جن کے نام پر چشمہ ہے۔ اس چشمے کے گرد میں نے سنگ کاری کرائی اور حکم دیا کہ اس کے گرد چونے کی استرکاری کر کے ۱۰×۱۰ ہاتھ کا حوض تیار کریں۔ چنانچہ اس چشمے کے چاروں حدوں کو سیدھا کیا گیا ہے اور اس کے مقابل چوکیاں بنوائی گئیں۔ جس وقت یہاں ارغوانی پھول کھلتے ہیں۔ خوب بہار دکھاتے ہیں۔ اس پہاڑ کے دامن میں دراصل ارغوانی سرخ اور ارغوانی زرد ایک ساتھ ہی کھلتے ہیں۔

اس کے چشمے کے مغرب وجنوب کے درمیان واقع ایک درّے سے ہمیشہ آدھی چکی کے برابر پانی جاری رہتا ہے۔ میں نے حکم دیا کہ اس پانی کے لئے نہر تیار کریں۔ چنانچہ نہر کھود دی گئی اور اسے اس چشمے کے اوپر تک لے کر آئے جو سہ یاراں کے مغرب وجنوب میں واقع ہے، اس پشتے پر میں نے دائرہ نما چبوترہ تیار کرایا۔ جس کی تاریخ ''جوی خوش''[۴۰] نکالی گئی۔

۳۴۔ ریگ رواں۔ یہ کابل سے چالیس میل شمال میں ہندوکش کے دامن میں ہے۔ ریت ایسی ہے جیسے کہ ابھی سمندر کے کنارے سے لائی گئی ہے۔ یہاں ہوا بہت زوردار ہوتی ہے اور سکندر برنس نے بھی یہ آواز سنی تھی۔ ہوا کے زور اور پہاڑ کی گونج سے یہ آواز پیدا ہوتی ہے۔ دنیا میں اور جگہ بھی ایسا ہے جیسے کہ بحیرہ احمر کے پہاڑوں میں بھی ایسی آواز سننے میں آتی ہے۔ (سکندر برنس، کابل، ص ۱۵۷)

۳۵۔ اس پہاڑ کا نام کوہ بابا ہے۔ یہ ہندوکش کا مغرب کی طرف تسلسل ہے اور افغانستان کی ریڑھ کی ہڈی۔ یہ افغانستان کو شمالی اور جنوبی علاقوں میں تقسیم کرتا ہے۔

۳۶۔ کوہ بامیان۔ کوہ بامیان مغرب کی طرف جا کر چار پہاڑوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ ایک شاخ ہری رود وادی کے جنوب میں ہرات تک چلی گئی ہے۔ اس کو اب کوہ بامیان کہتے ہیں (امپیریل گزیٹیر ص ۳۹)

۳۷۔ استالیف۔ یہ قصبہ کابل سے ۲۰ میل شمال مغرب کی طرف ہے۔ بے پناہ خوبصورتی کی وجہ سے مشہور ہے۔ سکندر برنس نے اس کی بہت تعریف کی ہے (ص ۱۴۷) وہاں کے رہنے والے کہتے ہیں کہ جس نے استالیف نہیں دیکھا اس نے دنیا میں کچھ نہیں دیکھا۔ ستمبر ۱۸۴۲ء میں جنرل میکاسکل کی انگریز فوج نے اس کو سکندر برنس اور چاریکر میں قتل عام کے بدلے میں تباہ کر دیا تھا (امپیریل گزیٹیر ص ۶۶) ہری رام گپتا اپنی کتاب موہن لال میں فریزر کے حوالے سے لکھتا ہے کہ استالیف کے خلاف کاروائی کا ہمارے پاس کوئی جواز نہ تھا۔ انھوں نے استالیف کو اس وجہ سے سزا دی کہ چاریکر میں ایک سال پہلے انگریزی فوج برباد ہوگئی تھی۔ استالیف چاریکر کے راستے میں ہے اور وقت کی کمی کی وجہ سے انگریزی فوج چاریکر جا نہیں سکتی تھی اس لئے استالیف کو نشانہ بنایا (ص ۳۵۵ نوٹ ۲۹)

۳۸۔ استرغچ۔ یہ گاؤں استالیف سے چھ میل شمال میں ہے۔ سکندر برنس یہاں بھی گیا تھا (کابل ص ۱۵۱)

۳۹۔ ہمایوں کے ترکی مخطوطے میں یہ نوٹ دیا گیا ہے کہ یہ تین یار خواجہ محمود چشتی، خواجہ خواند سعید اور خواجہ ریگ رواں ہیں۔ ظاہر ہے یہ آخری نام نہیں بلکہ ان خواجہ کے مسکن کے تعلق سے ہے۔ اس مخطوطے میں یہ عبارت ''درخت لا ارو رو'' کے بعد اضافہ کی گئی ہے ''حضرت خواجہ مودود چشتی وخاوند سعید وخواجہ ریگ رواں بودہ ان سہ یاراں عبارت از یں سہ عزیز است واللہ

لہوگر: لہوگر ایک اور ضلع ہے جس میں سب سے بڑا گاؤں چرخ ہے۔ حضرت مولانا یعقوب قدس سرہ اسی چرخ کے باشندے تھے۔ ملازادہ عثمان [41] بھی چرخ کے ہی رہنے والے تھے۔ سجاوند بھی لہوگر کے دیہات میں سے ایک ہے۔ خواجہ احمد اور خواجہ یونس بھی سجاوند کے باسی تھے۔ چرخ میں باغات بہت زیادہ ہیں۔ لہوگو کے دیگر دیہات میں باغات نہیں۔ یہاں کے لوگ اوغان شالی کہلاتے ہیں۔ یہ لفظ کابل میں عام ہے۔ غالباً یہ لفظ افغان شعار ہوگا جو بدل کر اوغان شالی ہوگیا ہے۔ [42]

غزنی

غزنی ایک اور ولایت ہے۔ بعض لوگ اسے ضلع کہتے ہیں۔ سبکتگین [43]، سلطان محمود [44] اور ان کے جانشینوں کا پایۂ تخت غزنی ہی تھا۔ جسے بعض لوگ غزنین بھی کہتے ہیں۔ سلطان شہاب الدین غوری [45] کا دارالسلطنت بھی غزنی ہی تھا۔ سلطان شہاب الدین کو طبقات ناصری [46] اور ہندستان کی بعض تاریخ کی کتابوں میں معزالدین لکھا ہے۔ غزنی کا شمار اقلیم سوئم میں ہوتا ہے اسے زابل بھی کہتے ہیں۔ زابلستان سے مراد بھی ولایت لی جاتی ہے۔ بعض لوگوں نے قندھار کو بھی زابلستان کی حدود میں شمار کیا ہے۔ یہ کابل سے مغرب رویہ چودہ فرسنگ کے فاصلے پر واقع ہے۔ جو لوگ علی الصبح یہاں سے روانہ ہوتے ہیں وہ ظہر و عصر کے درمیان کابل پہنچ جاتے ہیں۔ اگرچہ آدینہ پور یہاں سے تیرہ فرسنگ دور ہے لیکن اس کا راستہ اتنا خراب ہے کہ ایک دن میں یہاں نہیں پہنچا جا سکتا۔ یہ مختصری ولایت ہے جس کے دریا میں چار یا پانچ چکی برابر پانی ہوگا۔ شہر غزنی اور چار پانچ دیگر دیہات اسی سے سیراب ہوتے ہیں۔ دوسرے تین چار گاؤں کی آبیاری کاریز سے ہوتی ہے۔ کابل کے مقابلے میں غزنی کے انگور بہتر ہوتے ہیں۔ یہاں سردے کابل کے مقابل زیادہ ہوتے ہیں۔ سیب کی فصل بھی عمدہ ہوتی ہے جسے ہندستان لے جاتے ہیں۔ کاشت کاری سخت دشوار ہے۔ جتنی زمین پر زراعت کی جاتی ہے اس کے لئے ہر سال نئی مٹی لانی پڑتی ہے۔ لیکن کابل کے مقابل یہاں زراعت زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں مجیٹھ [47] کی کاشت کی جاتی ہے جو تمام ہندستان میں پہنچتی ہے اور اس سے ہی لوگوں کی آمدنی خوب ہوتی ہے۔ یہاں کے صحرانشین ہزارہ اور افغان ہیں۔ کابل کے مقابل غزنی میں اشیا ارزاں ملتی ہیں۔ لوگ حنفی مسلک کے پیروکار اور پاکیزہ عقیدے کے مسلمان ہیں۔ ایسے لوگ بہت ہیں جو تین ماہ تک روزہ رکھتے ہیں، ان کے بچے اور خواتین جدا رہتے ہیں۔ ملا عبدالرحمن کا شمار غزنی کے معزز لوگوں میں ہوتا ہے، یہ دانشمند آدمی تھے اور درس و تدریس میں مشغول رہتے (ورق ۱۱۸) بہت زیادہ متقی، دین دار اور پرہیزگار آدمی تھے۔ جس سال ناصر مرزا کی وفات ہوئی اسی سال ان کا بھی انتقال ہوا۔ سلطان محمود کی قبر اسی شہر کے اطراف میں ہے۔ جسے روضہ کہتے ہیں۔ غزنی کے انگوروں میں روضہ کے انگور سب سے زیادہ عمدہ ہوتے ہیں۔ سلطان محمود کے جانشینوں میں سے سلطان مسعود اور سلطان ابراہیم کی قبور بھی غزنی میں ہی ہیں۔ غزنی میں مزارات مقدس بہت زیادہ ہیں۔ جس سال میں نے کابل حاصل کیا اسی سال میں نے کوہاٹ بنوں، اور دشت افغانستان پر حملے کئے۔ دکی کو پار کر کے آب ایستادہ [48] کے کنارے کنارے غزنی پہنچا۔

کہا جاتا ہے کہ غزنی کے دیہات میں ایک مزار ہے جب اس پر لوگ صلوٰۃ پڑھتے ہیں تو قبر حرکت کرنے لگتی ہے۔ اس کا ملاحظہ کیا گیا۔ قبر کی حرکت محسوس کی گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ مجاوروں کی کارستانی تھی۔ قبر کو انھوں نے ڈھک رکھا تھا۔ جب اسے ہلایا جاتا تھا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا قبر میں جنبش ہو رہی ہے۔ بالکل اسی طرح جب لوگ جہاز میں بیٹھتے ہیں تو انھیں ساحل چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے حکم دیا کہ مجاورین اس سے دور ہو جائیں۔ اس کے بعد کئی مرتبہ صلوات پڑھی گئی مگر قبر میں جنبش پیدا نہیں ہوئی۔ چنانچہ میں نے حکم

اعلم بالصواب" اس عبارت کو مٹانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن پھر بھی پڑھی جاتی ہے۔ حاشیہ پر نوٹ دوسرے قلم سے صاف ہے۔

۴۰۔ جوی خوش کے ۹۲۵ عدد بنتے ہیں۔

۴۱۔ ملازادہ عثمان کے لئے دیکھئے ورق ۱۵۴ ب

۴۲۔ کثرت استعمال سے یہ عین ممکن ہے۔

۴۳۔ سبکتگین۔ ترک قبیلوں میں جو ترکستان کے صحراؤں میں خانہ بدوش تھے جب جنگی قیدی پکڑے جاتے تو ان کو غلام بنا لیا جاتا تھا۔ سبکتگین بھی ایک غلام تھا۔ اس کا آقا الپتگین تھا۔ الپتگین سپہ سالار تھا جو سامانی حکمرانوں کے لئے کام کرتا تھا۔ کیونکہ غزنی دور دراز علاقہ تھا اس لئے سبکتگین کی حکومت یہاں قائم کر دی گئی۔ سبکتگین کا انتقال ۳۸۷/۹۹۷ میں ہوا۔

۴۴۔ سلطان محمود غزنوی، سبکتگین کا بیٹا تھا۔ اس نے ۳۲ سال یہاں حکومت کی۔ اسکی پیدائش ۳۶۱/۹۷۱ میں ہوئی۔ یہ سبکتگین کا بڑا بیٹا تھا۔ ان ۳۲ سالوں میں یہ مسلسل جنگ، جدل میں مصروف رہا اور ہندوستان پر ۱۷ حملے کئے۔ ۴۱۶/۱۰۲۶ میں تھر کا ریگستان پار کر کے سومناتھ پر مشہور حملہ کیا۔ محمود کے دربار میں عالموں اور شاعروں کی سرپرستی کی جاتی تھی صرف فردوسی ایسا تھا جو کہ ناخوش رہا۔

۴۵۔ شہاب الدین غوری نے ۵۶۹/۱۱۷۳ سے ۶۰۲/۱۲۰۳ تک غزنی پر حکومت کی۔

۴۶۔ طبقات ناصری۔ قاضی منہاج سراج کی تصنیف جو انہوں نے دلی میں ۶۵۸/۱۲۶۰ میں رقم کی۔ (طبقات ج اص ۱۹) بہ حیثیت مجموعی طبقات کی تاریخی اہمیت نہیں لیکن خراساں، غور اور ہندستان کے متعلق کچھ حصے اہمیت رکھتے ہیں۔

۴۷۔ مجیٹھ۔ ایک پودہ جس کا سائنسی نام روبیا ٹنک ٹورم ہے۔ اس کے پھول زرد رنگ کے ہوتے ہیں۔ اس کی جڑوں سے سرخ رنگ حاصل کیا جاتا ہے۔

۴۸۔ آب ایستادہ۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ جھیل پانی کے جمع ہونے سے وجود میں آجاتی ہے۔ علاقہ کافی نیچا ہے۔ یہ جھیل غزنی سے ۶۵ میل جنوب مغرب میں ہے۔ پانی نمکین ہے اور مچھلیاں زندہ نہیں رہتیں۔ دریائے غزنی اسی جھیل میں آکر گرتا ہے۔ (امپیریل گزیٹیر ص ۵۵)

دیا کہ چبوترے کو قبر سے ہٹا کر توڑ دیں اور اس پر گنبد تعمیر کریں۔ اور مجاوروں کو تنبیہ کے ساتھ منع کیا گیا کہ وہ اس حرکت سے باز رہیں۔[۴۹]

غزنی ویران سی جگہ ہے۔ مجھے ہمیشہ اس بات پر تعجب رہا کہ وہ حکمران جن کے تحت ہندستان اور خراسان جیسے ممالک رہے انھوں نے ایسی چھوٹی جگہ کو کیوں اپنا پائے تخت قرار دیا سلطان محمود کے زمانے میں یہاں تین چار بند تھے۔ غزنی کے شمال میں اس دریا پر جو مغرب کی جانب سے آتا ہے اس شہر سے تین فرسنگ کی بلندی پر خود سلطان (محمود) نے بند بنوایا تھا جو چالیس پچاس گز اونچا اور تقریباً تین سو گز لمبا تھا۔ یہاں پانی ذخیرہ کیا جاتا تھا اور ضرورت کے مطابق کاشت کاری کے لئے مہیا کر دیا جاتا تھا۔ علاؤالدین غوری[۵۰] (جس کا خطاب جہاں سوز تھا) نے جب اس ولایت پر قبضہ کیا تو اس بند کو تباہ کر دیا۔ سلطان کے جانشینوں کی قبروں میں آگ لگوادی شہر کو ویران کر کے اور جلا کر خاک کر دیا اور وہاں کے لوگوں کو تاراج کر کے ان کا قتل عام کرایا اور اس شہر کی تباہی و بربادی میں اس نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ اس کے بعد سے یہ بند ویران ہی رہا۔ لیکن جس سال میں نے ہندستان فتح کیا تو اسی سال خواجہ کلاں کے ہاتھ وافر مقدار میں روپیہ بھیجا گیا اور خداوند تعالیٰ کی عنایت سے یہ امید ہے کہ یہ بند پھر آباد و معمور ہو جائے گا۔

سخن نامی دوسرا بند ہے جو غزنی کے مشرق میں واقع ہے۔ اور یہاں سے تقریباً دو تین فرسنگ دور یہ بھی ویران ہے اور اس قابل نہیں کہ دوبارہ استعمال میں لایا جاسکے۔ تیسرا بند سردا ہے جو معمور و آباد ہے۔

کتب تاریخ میں آیا ہے کہ غزنی میں ایسا چشمہ موجود ہے کہ اگر اس میں نجاست و کثافت ڈالی جائے تو اس میں طوفان بپا ہو جاتا ہے اور بارش و برف باری شروع ہو جاتی ہے۔ تاریخ کی دوسری کتب میں لکھا گیا ہے کہ جس وقت ہندستان کے فرمانروا رائے (جے پال)[۵۱] نے سبکتگین کا غزنی میں محاصرہ کیا تو سبکتگین نے حکم دیا کہ اس چشمے کو نجاست و کثافت سے پر کر دیں۔ چنانچہ اسی وقت وہاں طغیانی آگئی (ورق ۱۱۹) اور بارش و برف باری ہونے لگی۔ چنانچہ اس جنگی چال سے اس نے دشمن کے حملے کی مدافعت کی۔ میں نے اس چشمے کو بہت تلاش کیا مگر کسی نے اس کی نشاندہی نہیں کی۔

اس ولایت میں غزنی اور خوارزم سردی کے اعتبار سے ایسے ہی مشہور ہیں جیسے عراق (عجم)[۵۲] میں آذربائیجان، سلطانیہ اور تبریز۔

زرمت: ان اضلاع میں ایک تومان زرمت ہے۔ یہ کابل کے جنوب اور غزنی کے مشرق و جنوب کے درمیان واقع ہے۔ کابل سے بارہ تیرہ فرسنگ، غزنی سے سات آٹھ فرسنگ کے فاصلے پر ہے۔ یہ آٹھ دیہات پر مشتمل ہے ان میں سے گردیز مقامی حکومت کا مرکز ہے۔ اندرون شہر میں اکثر مکانات تین چار منزلہ ہیں۔ یہ محکم جگہ ہے۔ یہاں کے لوگوں نے ناصر مرزا کو سخت پریشان کیا تھا۔ اس تومان کے جنوب میں پہاڑ ہے جسے برکستان کہتے ہیں۔ اس پہاڑ کے دامن میں بلندی پر چشمہ ہے۔ شیخ محمد مسلمان کی قبر یہیں واقع ہے۔ ضلع زرمت میں افغان شال[۵۳] کی نسل کے لوگ آباد ہیں جو کاشت کاری کرتے ہیں۔ یہاں نہ درخت ہیں اور نہ باغات۔

قرمل: اس سے اگلا تومان قرمل ہے۔ معمولی سی جگہ ہے۔ یہاں کے سیب برے نہیں ہوتے انہیں ہندستان اور ملتان لے جایا جاتا ہے۔ جس وقت ہندستان میں افغانوں کی حکومت تھی تو شیخ زادگان کو بہت سی مراعات حاصل تھیں۔ یہ شیخ زادگان محمد مسلمان کی اولاد ہیں جو قرمل کے ہی باشندے تھے۔

بنگش: اس سے اگلا تومان بنگش ہے۔ جس کے گردونواح میں خوگیانی، خرلچی، توری اور لندر[۵۴] وغیرہ جیسے راہزن قبائل بسے ہوئے ہیں۔ چوں کہ یہ لوگ ضلع کی سرحد پر آباد ہیں اس لئے خاطر خواہ خراج ادا نہیں کرتے۔ چونکہ میرے سامنے فتح قندھار، بلخ، بدخشان اور ہندستان جیسی عظیم مہمات تھیں اسی لئے مجھے یہ موقع نہ مل سکا کہ بنگش کو

۴۹۔ اسی قسم کی اصلاح کی آج بھی جگہ جگہ ضرورت ہے۔ مجاورین جس طرح زائرین کو بہلا پھسلا کر پریشان کرتے ہیں اس کا خاتمہ ضروری ہے۔

۵۰۔ علاؤالدین غوری جہاں سوز نے اپنے دو بھائیوں کی موت کا بدلہ لینے کے لئے ۵۴۵/۱۵۰-۱۱۵۰ میں غزنی پر چڑھائی کی اور اس کو تباہ کیا۔ اسکا لقب جہاں سوز غزنی کو جلانے کی وجہ سے ہی ہے۔ (طبقات ناصری ج۱ ص ۶۱۴)

۵۱۔ راجہ جے پال۔ ہندوشاہی طاقتور حکمرانوں میں یہ لاہور کا راجہ تھا جس کی حکومت لمغان سے ملتان تک تھی۔ جب سبکتگین نے غزنی پر قبضہ کیا تو لاہور میں راجہ جے پال نے اسکو آگے آنے سے روکنے کے لئے غزنی پر بڑی فوج کے ساتھ حملہ کیا۔ لیکن طوفان اور برف باری سے گھبرا کر فوج واپس لے گیا۔ اس کے بعد پھر سبکتگین نے واپس حملہ کر کے کابل کی وادی پشاور تک فتح کر لی۔ راجہ جے پال کا حملہ ۳۷۸/۹۸۸ میں ہوا (مآثر رحیمی ص ۱۷)

۵۲۔ عراق (عجمی) سے مراد آجکل کا مغربی ایران ہے۔ عراق عربی دجلہ اور فرات کی سرزمین۔ ایران کے مغربی حصہ میں جو زگراس کا پہاڑی سلسلہ ہے عجمی عراق اس کے شمال مشرق میں اور عربی عراق جنوب مغرب میں ہے (ھیکسٹن ص ۹)

۵۳۔ دیکھیں ورق ۱۱۷

۵۴۔ خوگیانی اور توری دونوں کرلانزی پٹھان ہیں۔ یہ مسئلہ ابھی حل طلب ہے کہ آیا ان کے اجداد ترک تھے۔ کرلانزی لفظ کڑھائی سے اخذ کیا گیا ہے اس کی کہانی یہ بتائی جاتی ہے کہ دو بھائی ایک میدان جنگ میں گئے ایک کو وہاں ایک کڑھائی ملی اور دوسرے کو ایک بچہ پڑا ہوا ملا۔ جس بھائی کو کڑھائی ملی اس کے بچے نہ تھا۔ اس لئے اس نے مال غنیمت بدل لیا۔ بچہ کا نام کرلانزی رکھا اس کو پال پوس کر بڑا کیا اور اپنی بیٹی سے اسکی شادی کی اور ان کی اولاد کرلانزی پٹھان ہوئے۔ خوگیانی پٹھان کا ذکر امان اللہ خان کے دور حکومت میں بھی ملتا ہے (۱۹۲۹) توری پٹھان شیعہ ہیں اور روشنیہ فرقہ بھی ان میں کافی ہے۔ یہ کرم ایجنسی میں ہیں (کیرو ص ۲۱، ۱۲۴، بیلو ص ۸۰، ہارون رشید ص ۳۱۳، ۳۴۱) خرلچیوں کا ذکر بابر نے پہلے بھی کیا ہے (ورق ۱۱۲) خرلچیوں اور لندر کے متعلق کچھ معلومات نہیں۔

زیر کر سکوں۔ اگر خداوند تعالیٰ نے حالات سازگار کئے تو مجھے یقین ہے کہ موقع ملتے ہی بنگش پر قبضہ کرنے کے لئے یہاں کے راہزنوں کا قلع قمع کر دوں گا۔

الاسائی: کابل کے نواح میں سے ایک الاسائی ہے۔ یہ نجرو اسے تقریباً دو تین شرعی دور ہوگا۔ نجرو اکی جانب سے مشرق کی طرف سیدھا راستہ ہے۔ جب کورہ نامی جگہ پر پہنچتے ہیں تو راستے میں الاسائی کی جانب ایک چھوٹا سا درّہ آتا ہے جو گرم و سرد مناطق کے درمیان حد فاصل کا کام کرتا ہے۔

پرندوں کا شکار: فصل بہار کے اوائل میں نقل مکانی کرنے والے پرندے اسی درّہ کورہ سے گزرتے ہیں۔ پیچغان نامی جگہ نجرو اکے تابع ہے۔ یہاں کے لوگ ان پرندوں کو بے تحاشہ پکڑتے ہیں۔ درّے کے دہانے میں جگہ جگہ پتھروں سے پناہ گاہیں بنا رکھی ہیں جو لوگ پرندے پکڑتے ہیں ان پناہ گاہوں میں بیٹھ کر گھات لگاتے ہیں۔ ایک طرف سے وہ جال کو پانچ چھ گز کی دوری تک مضبوط باندھ دیتے ہیں اور اس کی دوسری طرف اس کے اوپر پتھر رکھ دیتے ہیں۔ اس جال کے ایک طرف بیچ میں تین چار گز لمبی لکڑی باندھ دیتے ہیں۔ لکڑی کا ایک سرا اس شخص کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو پتھروں کی اوٹ میں گھات لگائے بیٹھا رہتا ہے اور ان پتھروں کے شگافوں میں سے جنہیں وہ پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرتا ہے دیکھتا رہتا ہے کہ جیسے ہی پرندے جال کے قریب آتے ہیں وہ جال کو کھینچ لیتا ہے۔ جس کے باعث پرندے خود ہی آ کر جال میں پھنس جاتے ہیں۔ چنانچہ اس حربے سے کثیر تعداد میں پرندے پکڑ لئے جاتے ہیں اور کبھی کبھی تو اتنے زیادہ پھنس جاتے ہیں کہ اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ سب کو ذبح کیا جا سکے۔

الاسائی کا انار (ورق ۱۴۰) مشہور ہے۔ اگرچہ یہ بہت عمدہ قسم کا تو نہیں ہوتا مگر اس ولایت میں الاسائی کے علاوہ کسی دوسری جگہ ایسا انار نہیں ہوتا۔ یہاں کے انار کے پودے ہندستان لے جائے جاتے ہیں۔ یہاں کے انگور بھی برے نہیں ہوتے۔ نجرو امیں جو شرابیں تیار کی جاتی ہیں ان میں الاسائی کی شراب نشے میں زیادہ تیز اور خوش رنگ ہوتی ہے۔

بدراو: اس کا اگلا نواح بدراو ہے۔ جو الاسائی سے متصل ہے۔ یہاں پھل نہیں ہوتے۔ پورے کوہستانی منطقے میں کافر آباد ہیں جو اناج اگاتے ہیں۔

جس طرح خراسان اور سمرقند میں ترک ایماق قبائل کے لوگ صحرا نشین ہیں اسی طرح سے یہاں ہزارہ وافغان صحرا نشینی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان تمام ہزارہ قبائل میں سب ہی سلطان مسعودی برادری[55] کے ہیں اور جتنے افغان ہیں وہ سب مہمندی۔[56]

کابل کا محصول: ولایت کابل کے کل محصول کا تخمینہ وہ خواہ کاشت کاری کی زمین سے حاصل ہو اور خواہ چنگی کے ذریعے آٹھ لاکھ شاہرخی[57] لگایا گیا ہے۔

کوہستانی سلسلے: ولایت کابل کے مشرق میں جو کوہستانی سلسلہ چلا گیا ہے وہ دو نوعیت کا ہے۔ اور وہ کوہستانی سلسلہ جو مغرب کی جانب واقع ہے وہ بھی دو نوعیت کا ہے۔ وہ کوہستان جو اندراب، خوست اور بدخشانات پر مشتمل ہے۔ اس میں صنوبر کے درخت بہت زیادہ ہیں۔ یہاں چشموں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے اور پشتوں کا نشیب بہت کم۔ پہاڑوں پشتوں اور گھاٹیوں میں جو گھاس رہتی ہے ایک ہی طرح کی ہوتی ہے۔ بہت زیادہ اور اکثر جگہ گھنے گٹھوں کی شکل میں اُگتی ہے۔ یہ گھاس گھوڑوں کو بہت موافق آتی ہے۔ ولایت اندجان میں اس گھاس کو بوتکہ اوتی کہتے ہیں۔ جس کی وجہ تسمیہ معلوم نہ تھی لیکن اس ولایت میں آ کر معلوم ہوئی۔ چونکہ اس گھاس میں جگہ جگہ جھنڈ پائے جاتے ہیں اس لئے اسے بوتہ کہتے ہیں۔ یہاں کی موسم گرما کی چراگاہیں حصار، ختلان، سمرقند، فرغنہ، نیز مغلستان جیسی ہی ہیں۔ لیکن پھر بھی فرغنہ اور مغلستان کی چراگاہوں کا ان سے کوئی مقابلہ نہیں۔ یہی کیفیت پہاڑوں اور اس کی چراگاہوں کی ہے۔

۵۵۔ سلطان مسعودی ہزارہ قوم کا اس وقت سردار تھا۔ دیکھیں آگے ورق ۱۴۳

۵۶۔ مہمندی۔ مشرقی پٹھان قبیلہ جن کے اجداد سربرانی ہیں۔ یہ گندھاریوں کی نسل سے ہیں (کیرو ص ۱۲، ہارون رشید ص ۳۳) یہ زیادہ تر پشاور اور آس پاس آباد ہیں۔

۵۷۔ شاہ رخی۔ یہ سکہ امیر تیمور کے پوتے شاہ رخ کے نام پر ہے۔ اس کا پایہ تخت ہرات تھا۔ اس سکہ پر "السلطان الاعظم شاہ رخ بہادر خلد اللہ ملکہ وسلطنۃ" لکھا ہوتا تھا۔ ایک روپے کے ڈھائی شاہ رخی ہوتے تھے (انسائیکلوپیڈیا اسلام، آئین اکبری ۲: ۱۶۹)

نجرو ا کی دوسری جانب لمغانات کے پہاڑ ہیں یہاں سوات اور باجوڑ نامی مقامات پر چلغوزے، زیتون، بلوط اور خنجک کے درخت کثرت سے ہوتے ہیں۔ یہاں کی گھاس کوہستان کی گھاس کے برابر نہیں اگر چہ بہت زیادہ اور بہت اونچی ہوتی ہے مگر بے فائدہ کیوں کہ گھوڑوں اور بھیڑوں کو موافق نہیں۔ اگر چہ وہاں کے کوہستانی سلسلے کے برابر یہاں پہاڑ بلند نہیں بلکہ ان کے مقابل کم ہی ہیں مگر نہایت ہی مضبوط، ہموار پشتوں کی طرح نظر آتے ہیں، ان پر ہر جگہ گھوڑے پر سوار ہو کر سفر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کوہستانی سلسلہ میں ہندستان کے پرندے اور دیگر جانور بہت زیادہ پائے جاتے ہیں جن میں طوطا، مینا، مور، پہاڑی کوا، بندر، نیل گائے اور کوتہ پا[۵۸] قابل ذکر ہیں۔ جن جانوروں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ بھی دوسری قسم کے پرندے اور چوپائے بھی یہاں پائے جاتے ہیں جن کا نام ہندستان میں نہیں سنا گیا۔

مغربی جانب جو کوہستانی سلسلہ چلا گیا ہے۔ اس میں درہ زندان صوف، درہ گندروان اور غرجستان نامی ہیں۔ یہ سب ایک جیسے ہیں۔ مگر دیگر کوہستانی سلسلوں کے برعکس یہاں پشتوں اور پہاڑیوں میں جو گھاس پائی جاتی ہے وہ ایک ہی قسم کی نہیں ہوتی۔ مقدار میں فراواں اور جنس کے اعتبار سے بہت زیادہ اچھی تو نہیں ہوتی مگر گھوڑوں اور بھیڑوں کو موافق آتی ہے۔ ان پہاڑوں کا بالائی حصہ کافی ہموار ہے اور فضا شاداب۔ یہاں کاشت کاری خوب ہو سکتی ہے۔ یہاں ہرن بھی بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ پہاڑوں کی تہ میں گھاٹیاں اور درّے بہت زیادہ مضبوط ہیں۔ اور بیشتر جگہوں پر یہ یکساں ہیں لیکن ان میں ہر جگہ اوپر سے اتر کر نیچے نہیں جایا سکتا۔ عام طور پر پہاڑوں میں جہاں مضبوط جگہیں ہوتی ہیں وہ سب بلندیوں پر پائی جاتی ہیں۔ مگر (ورق ۱۲۱) یہاں کے متعلق عجیب بات یہ ہے کہ کوہستانی سلسلے کی مضبوط جگہیں پشتوں پر واقع ہیں۔

غور کرنو اور ہزارہ کا بھی کوہستانی سلسلہ اسی طرح کا ہے۔ یہاں گھاس کے قطعات تنگ درّوں اور میدانوں میں پائے جاتے ہیں۔ درخت کم ہوتے ہیں۔ صنوبر کی لکڑی اچھی نہیں ہوتی۔ گھاس گھوڑوں اور بھیڑوں کو موافق آتی ہے۔ ہرن بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ جن کوہستانی سلسلوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں محکم جگہیں ان کے پشتے ہیں مگر یہاں ایسا نہیں۔

خواجہ اسمٰعیل، دشت، دکی اور افغانستان کے کوہستانی سلسلے بھی ایک ہی طرح کے ہیں۔ سب کے سب پست، گھاس کم، پانی ناکافی، درخت دور دور تک نہیں اور دیکھنے میں بھی بدنما پورے اس کوہستانی سلسلے میں گھاس نام تک کو نہیں لیکن یہ جگہ یہاں اسی طرح ہے جیسے یہاں کے رہنے والے لوگ[۵۹] مثل مشہور ہے کہ وہ دوپہر نہیں جس کی صبح نہ ہوتی ہو، دنیا میں ایسے بدزیب پہاڑ کم ہی ہوں گے۔

اگر چہ کابل میں برف باری بہت زیادہ ہوتی اور سردی بھی خوب پڑتی ہے مگر یہاں ایندھن ملتا ہے اور وہ بھی نزدیک ہی بس اتنے فاصلے پر کہ ایک دن میں جا کر لایا جا سکتا ہے۔ خنجک، بلوط، بادامچہ اور قرقند کے درختوں کی لکڑی جلانے کے کام آتی ہے۔ جلتی ہے تو روشنی دیتی ہے۔ دھوئیں سے خوشبو نکلتی ہے اور اس سے چنگاریاں بھی دیر تک نکلتی رہتی ہیں۔ بلوط کی لکڑی کا بھی ایندھن اچھا ہوتا ہے مگر اس کے شعلے میں روشنی زیادہ نہیں ہوتی، چنگاریاں دیر تک جلتی رہتی ہیں۔ اس کی بو بھی بھینی بھینی ہوتی ہے۔ بلوط کے درخت کی ایک عجیب خاصیت یہ ہے کہ اگر اس کی ہری شاخوں کو پتوں کے ساتھ جلایا جائے تو ان میں سے چٹخنے کی آواز نکلتی ہے اور چیخ چیخ کر ایک سرے سے دوسرے سرے تک آن کی آن میں بھڑک کر جلتی چلی جاتی ہے۔ اس درخت کو جلتے ہوئے دیکھنے میں بہت لطف آتا ہے۔ بادامچہ کی لکڑی سب سے زیادہ ہوتی ہے اور اس کا استعمال بھی عام ہے مگر اس کی چنگاریاں دیر تک نہیں رہتیں۔ قرقند کا درخت خاردار ہوتا ہے اور زیادہ اونچا نہیں جاتا۔ اس کی لکڑی خشک و تر یکساں جلتی ہے۔ غزنی کے تمام لوگ یہی لکڑی بطور ایندھن استعمال کرتے ہیں۔

۵۸۔ کوتہ پا۔ ہرن کی ایک قسم جس کا جسم و قد سفید ہرن کے برابر لیکن ٹانگیں چھوٹی ہوتی ہیں۔

۵۹۔ ماحول وموسم دونوں کا اثر رہن سہن اور عادات پر پڑتا ہے۔

ولایت کابل کوہستانی سلسلے کے درمیان میں واقع ہے جو دیکھنے میں بند کی طرح نظر آتے ہیں۔ پہاڑوں کے درمیان میں درّے ہیں اور وہ ہموار ہیں۔ بیشتر دیہات اور آباد علاقے ان ہی میں ہیں۔ یہاں ہرن اور اور دوسرے شکاری جانور کم پائے جاتے ہیں۔ فصل بہار اور خزاں میں ایک قسم کی جنگلی پہاڑی بھیڑ گرم و سرد مناطق میں منتقل ہوتی ہیں تو شکار کے شوقین جوان شکارگاہوں میں جہاں یہ پائی جاتی ہیں اپنے شکاری کتے لے کر پہنچ جاتے ہیں اور ان کا شکار کرتے ہیں۔ سرخاب اور خورد کابل کی طرف جنگلی گدھے بھی پائے جاتے ہیں مگر سفید ہرن قطعی نہیں ملتے۔ غزنی میں جنگلی گدھے اور سفید ہرن دونوں ہی پائے جاتے ہیں۔ غزنی میں سفید ہرن فربہ ہوتے ہیں شاید دوسری جگہ ایسے کم ہی ہوں۔

پرندوں کا شکار

بہار کے موسم میں بہت سی جگہیں شکارگاہ بن جاتی ہیں۔ اکثر نقل مکانی کرنے والے پرندے اور دوسرے جانور آب باران کے کنارے سے گزرتے ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ مشرق کی طرف بھی کوہستانی سلسلہ ہے اور مغرب میں بھی جہاں باران گزرتا ہے۔ اس کے سامنے ایک بہت بڑا درّہ ہے جو ہندوکش سے متعلق ہے اس کے علاوہ اور کوئی درّہ نہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ تمام پرندے اسی درّے سے گزرتے ہیں۔ اگر ہوا چل رہی ہو ہندوکش کے اوپر ذرا بھی بادل چھائے ہوئے ہوں تو یہ جانور یہاں سے نہیں گزر سکتے۔ سب کے سب آب باران کے کنارے میدان میں اُترتے ہیں (ورق ۱۲۲) اس جگہ گردونواح کے لوگ بہت سے جانوروں کا شکار کرتے ہیں۔ آب باران کے کنارے موسم سرما کے آخری دنوں میں مرغابیاں بہت آتی ہیں اور بہت زیادہ فربہ ہوتی ہیں۔ ان کے بعد کلنگ اور بگلے آتے ہیں۔ جو جھتے میں بہت بڑے اور تعداد میں بے شمار ہوتے ہیں۔ آب باران کے کنارے طناب کے ذریعے کلنگ کثیر تعداد میں پکڑے جاتے ہیں۔ بگلے اور قرقرہ اور حواصل نامی پرندے بھی بہت زیادہ تعداد میں ڈوریوں سے ہی صید کئے جاتے ہیں۔ اسی طریقے سے جانور ایک ہی مرتبہ گرفت میں آجاتے ہیں۔ صید کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ صیاد تقریباً ایک گز لمبی ڈوری بٹ لیتے ہیں۔ ڈوری کے ایک سرے پر ایک گز لمبی چھڑ جکڑ کر باندھ دی جاتی ہے اور دوسرے سرے پر پھنّی کس دی جاتی ہے۔ جو موٹائی میں کلائی جتنی اور لمبائی میں بالشت بھر ہوتی ہے۔ ڈوری کے ایک سرے کو چھڑی سے لپیٹ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد چھڑی کو ڈھیلا چھوڑ کر بٹی ہوئی ڈوری کے بیچ میں سے اس پھنّی کو گز ارا جاتا ہے۔ چھڑی پر ڈوری لپٹی رہتی ہے، جو جگہ اس میں خالی رہ جاتی ہے اس سے پھندا بن جاتا ہے۔ اب پھنّی کو اس طرف جدھر سے پرندے آتے ہیں ہاتھ بڑھا کر پھینک دیا جاتا ہے، جس کے پھندے میں پرندے کی گردن یا اس کا بازو پھنس جاتا ہے۔ آب باران کے نواح میں آباد لوگ اسی طریقے سے کثیر تعداد میں پرندوں کا شکار کرتے ہیں۔ لیکن اس طرح ان پرندوں کو پکڑنا سخت دشوار کام ہے۔ ان سیاہ راتوں میں جس وقت بارش ہوتی رہتی ہے ان پرندوں کو جو اس راہ سے گزرتے ہیں اسی طریقے سے پکڑا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ درندوں کے خوف سے یہ پرندے کہیں بسیرا نہیں کرتے بلکہ صبح کے نمودار ہونے تک پرواز کرتے رہتے ہیں اور نیچے نیچے ہی اڑتے ہیں۔ سیاہ راتوں میں ان پرندوں کا گزر اسی آب باراں کے اوپر سے ہوتا ہے۔ اندھیری راتوں میں چونکہ پانی سفید اور روشن نظر آتا ہے اسی خوف کے باعث سطح آب سے اوپر اوپر صبح کے نمودار ہونے تک گزرتے رہتے ہیں اور شکاری ان کی اس گزرگاہ پر ڈوری کے ذریعے ان کا شکار کر لیتے ہیں۔ ایک مرتبہ رات کے وقت میں نے بھی ڈوری پھینکی تھی، ڈوری ٹوٹ گئی اور پرندہ بھی اس میں نہ پھنسا۔ صبح جب لوگ ان پرندوں کو پکڑنے کے لئے گئے تو وہ میری ٹوٹی ہوئی ڈوری بھی لے آئے۔ اس طریقے سے آب باران کے قریب آباد لوگ بگلے بھی کثیر تعداد میں

پکڑتے ہیں۔ جس کے پروں سے دستار کی کلغی بنائی جاتی ہے۔ چنانچہ کابل سے جو مال عراق اور خراسان کی جانب بھیجا جاتا ہے ان میں سے یہ کلغی بھی شامل ہے۔

یہاں کچھ غلام خاندان آباد ہیں جو پرندوں کا شکار کرتے ہیں۔ ان کا یہی مشغلہ و پیشہ ہے۔ یہاں تقریباً دو سو تین سو خاندان آباد ہوں گے۔ آل تیمور میں سے کوئی انھیں ملتان کے نواح سے کوچ کرا کر یہاں لایا تھا۔ انھوں نے تلاب اپنار کھے ہیں جن پر وہ درجنوں درختوں کی شاخوں کو پانی میں ڈال کر ان پر جال تان دیتے ہیں۔ چنانچہ اس طریقے سے وہ ہر طرح کے پرندے پکڑتے ہیں۔ صرف یہ پیشہ ور شکاری ہی نہیں بلکہ وہ تمام لوگ جو آب باران کے نواح میں آباد ہیں۔ اسی طرح ڈوریاں لگا کر ان پر جال باندھتے ہیں اور اسی طریقے سے ہر قسم کے پرندوں کا شکار کرتے ہیں۔ اور وہ بھی کثیر تعداد میں۔

مچھلیوں کا شکار

اسی موسم میں آب باران میں سفر کرتی ہوئی مچھلیاں یہاں پہنچتی ہیں۔ پہلے انھیں جال سے اور بعد میں باڑھ لگا کر کثیر تعداد میں پکڑا جاتا ہے۔ فصل خزاں میں جب دم گور خر نامی پودا اپنی پوری بہار پر ہوتا ہے اس کے پھول پوری طرح کھل اٹھتے ہیں اور ان میں بیج پڑ جاتا ہے تو اس کے ساتھ کوک شیاق نامی پودے کے ہرے پتوں کے بیس تیس گانٹھوں کی کٹی بنائی جاتی ہے اور اسے پانی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جیسے ہی اس چارے کو پانی میں ڈالا جاتا ہے مچھلیاں اس پر لپکتی ہیں اور ادھر ماہی گیر انھیں پکڑنا شروع کر دیتے ہیں (ورق ۱۲۳)۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ قریب ہی نشیب میں کسی مناسب جگہ پر باڑھ لگا دی جاتی ہے۔ جس کے لگانے کا طریقہ یہ ہے کہ بید کی شاخوں کو انگل انگل بھر کے فاصلے پر چق کی طرح باندھ لیا جاتا ہے اور اس چق کو اس جگہ جہاں پانی اوپر سے گرتا ہے اور وہاں گڑھا بن جاتا ہے لگا دیتے ہیں۔ اور اس کے آس پاس پتھر چن دیتے ہیں۔ چنانچہ پانی اس چق پر گرتا ہے اور شور مچاتا ہوا نیچے پہنچتا ہے جیسے ہی یہ نیچے آتا ہے تو بہتا ہوا آگے چلا جاتا ہے اور مچھلیاں جو گڑھے کی تہ میں پہنچ جاتی ہیں۔ وہ اس چق کے ساتھ رہ جاتی ہیں۔ یہ مچھلیاں اوپر سے نیچے کی طرف اچھلتی کودتی اور کھیلتی ہوئی آتی ہیں اور اس طرح باڑھ کے نزدیک کثیر مقدار میں جمع ہو جاتی ہیں۔ گل بہار، پروان اور استالف جیسے علاقوں میں یہ مچھلیاں اسی طرح شکار کی جاتی ہیں۔

موسم سرما کے دوران لمغانات میں مچھلیوں کا شکار عجیب طریقے سے کیا جاتا ہے۔ جس جگہ پانی گرتا ہے وہاں لوگ ایسے گہرے گڑھے بنا لیتے ہیں جس میں پورا خیمہ تک سما جائے۔ ان میں دیگ کے چولہوں کی طرح ہر طرف پتھر چن دیئے جاتے ہیں البتہ سطح آب کے نیچے ایک جگہ سوراخ کھلا رہنے دیتے ہیں۔ یہ پتھر اس طرح چنے جاتے ہیں کہ مچھلی صرف ایک سوراخ کے علاوہ کسی اور جگہ سے نہ اندر آسکتی اور نہ ہی باہر نکل کر جا سکتی ہے۔ جن پتھروں کو چن دیا جاتا ہے۔ پانی ان کے اوپر سے گزر جاتا ہے۔ اس عمل سے یہ گڑھا گویا ماہی خانہ بن جاتا ہے۔ سردی کے موسم میں جب مچھلی کی ضرورت ہوتی ہے تو ان گڑھوں میں سے کسی ایک کا دہانہ کھول لیا جاتا ہے اور بیک وقت چالیس پچاس مچھلیاں پکڑلی جاتی ہیں۔ جس جگہ یہ دہانہ بنایا جاتا ہے وہ جگہ معین ہوتی ہے۔ اس کے بعد گڑھے کا منھ مضبوطی کے ساتھ بند کر دیا جاتا ہے اور اوپر پتھر رکھ دیتے ہیں۔ اس ماہی خانے کے دروازے پر چق جیسی چیز تان دی جاتی ہے۔ جس کے دونوں سروں کو یکجا کر کے باندھ دیا جاتا ہے۔ اس کے درمیان ایک اور چیز چق جیسی ہی مضبوطی سے لگا دیتے ہیں۔ چنانچہ ماہی خانے کا دہانہ چق کے برابر رکھا جاتا ہے اور لمبائی اس چق سے آدھی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس کے اندرونی منھ کو تنگ رکھا جاتا ہے، جب یہ اندرونی چق دہانے کے اندر داخل ہو جاتی ہے تو اسے بڑی چق کے درمیان سے گزارا جاتا ہے۔ بڑی چق کے نچلے

دہانے کو اس طرح بنا دیا جاتا ہے کہ مچھلی اس میں سے نکل کر باہر نہیں آسکتی۔ اندرونی چق کے نچلے اندرونی دہانے کو اس طرح بنا دیا جاتا ہے کہ جس وقت بالائی دہانے سے مچھلیاں نکل کر آتی ہیں تو اندرونی دہانے سے ایک ایک کر کے ہی نکل سکتی ہیں۔ اندرونی دہانے پر لکڑی لگا دی جاتی ہے، اس دہانے سے نکل کر مچھلی جب اُس دہانے پر پہنچتی ہے جو بڑی چق میں بنایا جاتا ہے تو اسے مضبوط کر کے اس طرح باندھ دیا جاتا ہے کہ مچھلی اس میں سے باہر نہیں نکل سکتی اور اگر نکلنا بھی چاہے تو نکل نہیں سکتی کیونکہ اندرونی چق کے اندر اتنے کانٹے ہوتے ہیں کہ وہ ان سے گزر نہیں سکتی۔ جس چق کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ ماہی خانے کے دہانے پر مضبوطی سے باندھ دی جاتی ہے۔ چنانچہ جس وقت ماہی خانے کے اس دہانے کو کھولا جاتا ہے جس کے گرداگرد دھان کے پتوں سے بندش کر دی جاتی ہے تو ہر مچھلی اس گڑھے میں گر جاتی ہے اور اگر نکل کر بھاگ بھی جائے تو بہر صورت اس چق کی طرف آتی ہے۔ چنانچہ اسی جگہ یہیں سے اِسے پکڑ لیا جاتا ہے۔ یہاں جس طرح ماہی گیری کی جاتی ہے وہ طریقہ کسی اور جگہ بروئے کار نہیں لایا جاتا۔

مقیم کی روانگی

فتح کابل کے چند روز بعد مقیم نے قندھار جانے کے لئے اجازت چاہی۔ چونکہ اس کا ہمارے ساتھ عہد و پیمان تھا اسی لئے اس کے تمام افراد کو اس کے ساز و سامان کے ساتھ صحیح و سلامت اس کے والد اور بڑے بھائی کے پاس جانے کی (ورق ۱۲۴) رخصت دے دی گئی۔ مقیم کے رخصت ہو جانے کے بعد ملک کو امرا میں تقسیم کر دیا گیا۔ جہانگیر مرزا کو غزنی اور اس کے اطراف، ناصر مرزا کو ننگر ہار، منداور، نور وادی، کنار، نور گل اور چغان سرائے۔ وہ امرا جو مشکل وقت میں میرے ساتھ تھے اور کابل آئے تھے ان کو گاؤں اور قطعات دیئے گئے۔ ولایت کابل کسی کو نہ دی گئی۔ اس دفعہ ہی نہیں بلکہ ہر موقعہ پر جب خدا تعالیٰ نے اپنا کرم کیا میں نے امرا اور حمایتوں کے ساتھ بہتر سلوک کیا اندجانیوں اور اپنے رشتہ داروں کے مقابلے میں۔ اس کے باوجود لوگ الزام لگاتے ہیں کہ نوکروں اور اندجانیوں کے ساتھ رعایت کی گئی۔ یہ تو وہی مثل ہے کہ کون سی بات ہے جو دشمن نہیں کہتا اور کون سی چیز ہے جو خواب میں نہیں آتی۔

دروازہ شہر را تواں بست
نتواں دہن دہن مخالفان بست

(شہر کا دروازہ بند کیا جاسکتا ہے۔ مگر دشمن کا منہ بند نہیں کیا جاسکتا۔)[۶۰]

چونکہ حصار، سمرقند اور قندوز سے بہت سے خاندان وقبائل کے لوگ کثیر تعداد میں میرے ہمراہ آئے تھے، کابل ایک معمولی جگہ ہے اور اہل سیف وقلم کے لئے قطعی ناکافی ہے۔ اسی لئے یہاں سے اتنی رقم فراہم نہیں کی جاسکتی جو تمام لوگوں کی کفالت کر سکے۔ ان وجوہات کے مدنظر مصلحت اس امر میں سمجھی گئی کہ ان قبائل و خاندان کے افراد میں سے ہر ایک کو جو جو میرے ہمراہ آئے تھے غلہ فراہم کر کے لشکر کشی کی جائے۔ اتفاق رائے اس بنا پر ہوا کہ مجموعی طور پر کابل وغزنی کی ولایات تیس ہزار خاندانوں پر مشتمل ہیں۔ چونکہ کابل کی آمدنی اور اس کے محصول کا اندازہ نہیں تھا اسی لئے تخمینہ لگایا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس ولایت کی حالت بہت زبون ہو گئی۔

خط بابری: کابل وہ جگہ ہے جہاں میں نے خط بابری[۶۱] کا اختراع کیا۔

ہزارہ پر یورش: ہزارہ قبیلے کے سردار سلطان مسعودی پر خراج کثیر تعداد میں بھیڑیں فراہم کر کے ادا کرنے کو کہا گیا وصولیابی کے لئے کارندے روانہ کئے گئے۔ چند روز بعد اطلاع ملی کہ ہزارہ قبائل کے لوگوں نے خراج سے انکار کر دیا ہے اور سرکشی پر اتر آئے ہیں۔ اس سے پہلے بھی وہ غزنی اور گردیز کے راستوں پر غارت گری کر چکے تھے۔ چنانچہ ہم ہزارہ قبیلے کے سردار سلطان مسعودی پر حملہ کرنے کے لئے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے، میدان

۶۰۔ مارنے والے کا ہاتھ پکڑا جاسکتا ہے۔ کہنے والے کی زبان نہیں پکڑی جاسکتی (یونس جعفری)

۶۱۔ خط بابری۔ اس خط کے دو نسخے معلوم ہیں۔ ایک نسخہ قرآن مجید جو آستان قدس رضوی مشہد (نمبر ۵۰) میں ہے۔ نسخہ پر کاتب کا نام نہیں۔ اس پر کشمیری تہذیب ہے اور اس کو شاہ حسین رضوی نے ۱۱۱۹/ ۱۷۰۷ میں آستان قدس کے لئے وقف کیا تھا۔ احمد گلچین معانی نے گنجینہ قرآن کیٹلاگ مطبوعہ مشہد ص ۷۸، میں اس کا ذکر کیا ہے۔ خط بابری کا دوسرا نسخہ تاشقند اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں کتاب عجائب الطبقات مولفہ محمد طاہر بن قاسم میں موجود ہے (سنٹرل ایشین ریویو ج ۷ ص ۷) دونوں خط جدا ہیں۔ ایک دوسرے سے بالکل نہیں ملتے۔

کے راستے نکل کر ہم نے راتوں رات زرخ درّے کو پار کیا اور نماز فجر کے وقت جیلتو نامی مقام پر ہزارہ کے لوگوں پر یورش شروع کر دی۔ خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا وہاں سے ہم سنگ سوراخ نامی جگہ سے واپس ہوئے اور جہانگیر مرزا کو غزنی جانے کی اجازت دے دی گئی۔

جس وقت ہم کابل میں فروکش ہوئے تو دریا خان کا لڑکا یار حسین بھیرہ کی جانب سے میری اطاعت و بندگی قبول کرنے کے لئے آیا۔

چند روز بعد لشکر کی از سر نو تنظیم کی گئی، اور ایسے لوگوں کو جو وہاں کے چپے چپے سے واقف تھے طلب کیا گیا۔ اطراف و جوانب کے بارے میں واقفیت بہم پہنچائی گئی۔ بعض نے دشت کا مشورہ دیا اور بعض نے کہا کہ بنگش مناسب جگہ ہے اور بعض نے ہندستان کی طرف جانے میں مصلحت سمجھی۔ اتفاق رائے اس امر پر ہوا کہ ہندستان پر حملہ کیا جائے۔

ہندستان کی طرف پہلا قدم

ماہ شعبان میں اس وقت جب کہ آفتاب برج دلو میں تھا ہم نے کابل سے ہندستان کی جانب رخ کرنے کا عزم کیا اور اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ بادام چشمے کے راستے سے جگدالیک تک ہم نے چھ منزلوں پر پڑاؤ کیا اور آدینہ پور پہنچ گئے۔ گرم مناطق اور ہندستان کے گردونواح اور اس کے بارے میں میرا یہ پہلا تجربہ تھا۔ ہم جیسے ہی ننگر ہار پہنچے تو ہمیں وہاں دوسرا ہی عالم نظر آیا۔ سبزا دوسری طرح کا، درختوں کی وضع و کیفیت جدا، راہ وروش دیگر، رنگ و روپ الگ، پرندوں کی نوع و قسم جدا، اقوام و قبائل کی بود و باش اور طرز زندگی مختلف۔ واقعی حیرانی در حیرانی تھی۔ (ورق ۱۲۵)

ناصر مرزا اس سے قبل اپنی ولایت میں پہنچ چکا تھا۔ وہ مجھ سے آدینہ پور میں آکر ملا اور یہاں اس نے میری ملازمت اختیار کر لی وہ قبائل و خاندان جو اس طرف سے موسم سرما گزارنے کے لئے کوچ کر کے لمغانات کی طرف آچکے تھے ان کے لشکروں کے وہاں پہنچے اور ان لشکروں کے لئے جو پیچھے رہ گئے تھے ہم نے ایک دو روز توقف کیا، انھیں اپنے ساتھ لے کر جوئے شاہی سے ذرا نیچے قوش گنبد نامی مقام پر ہم نے قیام کیا۔ ناصر مرزا نے اپنے ملازمین کے ہمراہ اپنی ولایت سے کچھ سامان ہمراہ کیا اور کہا کہ میں ایک دو دن بعد آؤں گا۔ یہ کہہ کر اس نے رخصت چاہی۔ ہم نے قوش گنبد سے کوچ کیا گرم چشمہ نامی مقام پر قیام پذیر ہوئے۔ پَچی نامی شخص کا کیانی [۶۲] قبیلے کا سردار تھا وہ اپنے قافلے کے ساتھ آرہا تھا، اسے ہمارے پاس لایا گیا، اس مصلحت کے پیش نظر کہ وہ ہماری راہنمائی کرے گا اسے ساتھ لے لیا گیا۔ ایک دو کوچ بعد ہم نے خیبر پار کر لیا اور جام [۶۳] میں قیام پذیر ہوئے۔ ہم نے گورک چھتری [۶۴] کی تعریف سن رکھی تھی، یہ جوگیوں اور ہندوؤں کا مقدس مقام ہے۔ یہاں لوگ دور دراز مقامات سے آتے ہیں اور اپنی ڈاڑھی مونچھ منڈواتے ہیں۔ جب ہم نے جام پر قیام کیا اس وقت میں بگرام کا معائنہ کرنے کے لئے گھوڑوں پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ یہاں مجھے ایک بہت بڑا برگد کا پیڑ دکھائی دیا۔ میں نے بگرام کا جائزہ لیا۔ میں نے اپنے راہنما ملک بوسعید کمری سے گورک چھتری کے بارے میں ہر چند معلوم کرنا چاہا مگر اس نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ جس وقت ہم وہاں سے واپس آرہے تھے تو خواجہ محمد امین کو اُس نے بتایا کہ گورک چھتری بگرام کے نزدیک واقع ہے۔ چونکہ وہاں غار اور خطرناک جگہیں ہیں اس لئے میں نے ان کے بارے میں اس وقت کچھ نہیں بتایا۔ دن ڈھل چکا تھا۔ راستہ بھی دور تھا اسی لئے ہم وہاں نہ جاسکے۔

کوہاٹ پر حملہ: دریائے سندھ پار کرنے کے بارے میں مشورہ کیا گیا اور اس امر پر غور کیا گیا کہ اس کے بعد کس

۶۲۔ اس قبیلے کو اب گگیانی کہا جاتا ہے۔ یہ آج کل دوآبہ میں ہیں اور مشرقی سرحدی افغان ہیں۔

۶۳۔ جام۔ آج کل کا جمرود ہے۔

۶۴۔ گورک چھتری۔ پشاور کے پرانے شہر میں آج بھی موجود ہے۔ بدھ اور ہندو دور کے اثرات باقی نہیں۔ مغلیہ دور کی محرابیں اور سکھ دور کا گردوارہ باقی ہے۔ لیکن سب کی حالت بری ہے۔

جانب رخ کیا جائے۔ باقی چغانیانی نے عرض کیا کہ دریائے سندھ عبور کرنے سے پہلے یہاں سے ایک پڑاؤ بعد کوہاٹ نامی جگہ آتی ہے۔ ہمیں وہاں چلنا چاہئے، کیوں کہ وہ ایک آباد جگہ ہے اور لوگ دولتمند ہیں۔ اس نے کابل کے چند لوگوں کو بھی پیش کیا جنہوں نے اس کے قول کی تصدیق کی۔ میرے ہمراہ لوگوں نے عرض کیا کہ ہم نے یہ نام تو کبھی نہیں سنا۔ لیکن جب میرے ایک صاحب اختیار امیر نے یہ بات کہی اور کوہاٹ کی طرف جانے میں وہ مصلحت سمجھتا تھا اور اپنے دعوے کو صحیح ثابت کرنے کے لئے اس نے چند گواہ بھی پیش کئے تھے۔ اس لئے ہم نے دریائے سندھ عبور کر کے ہندوستان کی جانب رُخ کرنے کے ارادے کو ترک کر دیا۔ جام سے کوچ کر کے دریائے بارہ کو عبور کیا اور محمد بخ نامی درّے کے قریب قیام پذیر ہوئے۔ اس وقت کا کیانی قبیلے کے افغان پشاور میں تھے لیکن ہمارے لشکر کے خوف سے اور اس پہاڑ کے دامن میں پناہ لئے ہوئے تھے۔ کا کیانی قبیلے کا سردار خسرو کا کیانی اس منزل پر حاضر خدمت ہوا۔ اس کو اور بخی کو ہمراہ لیا گیا کہ وہ جگہوں اور راستوں کے بارے میں ہماری راہنمائی کر سکیں۔ اس منزل سے ہم نے آدھی رات کو کوچ کیا، آفتاب طلوع ہونے کے بعد ہم نے محمد بخ درے کو پار کیا اور دوپہر کے وقت کوہاٹ پر لشکر کشی کر دی۔ اس حملے میں بہت سی گائیں اور بھینس ہمارے ہاتھ لگیں۔ اور بہت سے افغان بھی قید ہوئے۔ چنانچہ انھیں علیحدہ کر کے سب کو آزاد کر دیا گیا۔ یہاں لوگوں کے گھروں میں غلے کی بے اندازہ فراوانی تھی۔ ہمارے حملہ آوروں نے دریائے سندھ کے کنارے تک لشکر کشی کی اور ایک رات وہاں بسر کرنے کے بعد اگلے دن واپس آئے اور ہمارے ہمراہ ہو گئے۔ (ورق ۱۲۶) جیسا کہ باقی چغانیانی نے کہا تھا اس کے مطابق اہل لشکر کر کے ہاتھ کوئی چیز نہ لگی۔ اور اپنے اس اقدام کے باعث اسے بہت خفت ہوئی۔ کوہاٹ میں دو راتیں اور ایک دن گزارنے کے بعد ہم نے اپنے حملہ آور لشکر کو جمع کیا۔ اب کس طرف چلنا مناسب ہوگا اس کے بارے میں مشورہ کیا گیا۔ اس بات پر اتفاق رائے ہوا کہ بنو اور بنگش کے نواح میں آباد افغان قبائل پر لشکر کشی کر کے نغر اور برل کے راستے سے واپس جایا جائے۔ دریا خاں کے لڑکے یار حسین نے جو کابل میں حاضر خدمت ہوا تھا عرض کی کہ "دلہ زاک [۶۵]، یوسف زئی [۶۶] اور کا کیانی قبائل کو فرامین صادر کئے جائیں کہ اگر وہ میری اطاعت سے روگردانی نہ کریں تو میں دریائے سندھ کے پار بادشاہ کے لئے شمشیر کے جوہر دکھاؤں"۔ چنانچہ اس کی خواہش کے مطابق فرامین جاری کئے گئے اور اسے کوہاٹ سے روانہ کر دیا گیا۔

بنگش: کوہاٹ سے کوچ کر کے ہم ہنگو کے راستے سے اوپر کی جانب بنگش کی طرف روانہ ہو گئے۔ کوہاٹ اور ہنگو کے درمیان ایک درہ پڑتا ہے [۶۷] جس کے دونوں طرف پہاڑ ہیں اور راستہ اسی دّرے میں سے نکلتا ہے۔ کوچ کرنے کے بعد جب ہم اس درّے میں داخل ہوئے تو کوہاٹ اور اس کے اطراف کے تمام افغان جمع ہو گئے۔ اور ان پہاڑوں پر چڑھ کر جو اس درّے کے دونوں طرف ہیں شور و غوغا کرنا شروع کر دیا۔ ملک بوسعید کمری جو کہ تمام افغانوں کو بخوبی جانتا تھا اور اس لشکر کشی میں ہمارا رہبر تھا، نے عرض کیا کہ ذرا آگے دائیں جانب علیحدہ ایک پہاڑی ہے۔ چونکہ بالکل الگ ہے اسی لئے اگر افغان اِس پہاڑ سے اُس پہاڑ کی طرف چلے جائیں تو ہم انھیں چاروں طرف سے گھیر کر پکڑ سکتے ہیں۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ یہ افغان ہم پر ٹوٹ پڑے اور اسی پہاڑی پر پہنچ گئے۔ لشکر کے ایک دستے کو حکم دیا گیا کہ اس تنگ درّے پر جو دو پہاڑوں کے درمیان واقع ہے فوراً قبضہ کر لیں۔ لشکر کے دیگر افراد کو حکم ہوا کہ خواہ اِس طرف سے ہو اور خواہ اُس طرف سے جو شخص بھی وہاں ہو وہ افغانوں پر حملہ کر دے تا کہ انھیں اپنے کئے کی سزا مل سکے جیسے ہی ان پر حملہ ہوا وہ اس کی تاب نہ لا سکے اور نبرد آزمائی کئے بغیر ہی سو اور ڈیڑھ سو کی تعداد میں فرار ہونے لگے۔ بعض کو زندہ لایا گیا اور بعض کے سر لا کر پیش کئے گئے۔ یہ رسم یہیں دیکھی کہ جس وقت افغان جنگ میں خود کو تباہ حال پاتے ہیں تو گھاس کا تنکا اپنے دانتوں میں دبا لیتے ہیں۔ گویا ہم آپ کے آگے خس و خاشاک کے برابر ہیں۔ جو لوگ زندہ لائے گئے ان سب کے دانتوں کے درمیان میں

۶۵۔ دلہ ذاک۔ یہ کرلانی پٹھان قبیلہ اب موجود نہیں ہے۔ دادوزئی کے علاقے میں جو پشاور کے شمال میں ہے ایک گاؤں ہے جس کا نام دلہ ذاک ہے۔ محمود غزنوی کے زمانے میں انہوں نے اسلام قبول کیا اور اپنی قوم کے لوگ محمود غزنوی کے ساتھ سومناتھ کی فتح کے لئے بھیجے (کیرو ص ۱۷۵؛)

۶۶۔ یوسف زئی۔ مشرقی سڑابنی افغان جو پٹھانوں میں مشہور قبیلہ ہے۔ یہ دیر سوات اور بنیر میں مقیم ہیں۔ یوسف زئی اور دلہ ذاک قبیلوں کے درمیان ایک قصہ بھی کافی مشہور ہے کہ یوسف زئی کا سردار خان کجو دلہ ذاک سردار کی بیٹی پر عاشق ہو گیا۔ دونوں قبیلوں کی جنگ میں دلہ ذاک کو شکست ہوئی۔ دلہ ذاک کا سردار گھرانہ جب دریا سندھ کو پار کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو خان کجو نے ان کی مدد کی اور اس طرح سردار کی بیٹی کو پایا (کیرو ص ۱۷۶)

۶۷۔ کیرو کے مطابق یہ خوبصورت وادی ہنگو سے آگے استر زئی اور رئیسن گاؤں کے درمیان ہے (ص ۱۵۶)

گھانس کی پتی تھی۔ میں نے حکم دیا کہ ان سب کی گردن ماردیں اور جس جگہ ہم قیام پذیر تھے اسی جگہ ان کی کھوپڑیوں کا مینار چن [٦٨] دیا گیا۔

اگلے دن صبح ہم وہاں سے روانہ ہو کر ہنگو کے نواح میں قیام پذیر ہوئے۔ اس کے گردونواح میں جو افغان آباد تھے انہوں نے اس پہاڑی کو جو وہاں سب سے الگ تھی اپنی سنگر (پناہ گاہ) بنالیا۔ یہ لفظ کابل میں سنا تھا۔ یہاں کے لوگ پہاڑوں میں جس جگہ کو محکم کرلیتے ہیں اسے سنگر کہتے ہیں۔ ہمارے لشکر کے لوگ وہاں پہنچے اور اس سنگر کو توڑ دیا اور سو دو سو سرکش افغانوں کے سرکاٹ لائے۔ یہاں بھی ان کے سروں کا مینار بنادیا گیا۔

ہنگو سے کوچ کیا گیا۔ دریائے بنگش [٦٩] سے دو کروہ دور تھل نامی پڑاؤ پڑتا ہے۔ رات بسر کرنے کے لئے ہم یہاں قیام پذیر ہوئے۔ یہاں بھی ہمارے لشکر کے افراد ان افغانوں پر حملہ آور ہوئے (ورق ١٢٧) جو اس جگہ کے گردونواح میں آباد ہیں۔ ایک سنگر سے ہمارا حملہ آور دستہ کچھ حد تک خالی ہاتھ ہی واپس آیا۔

یہاں سے روانہ ہونے کے بعد ہمارے سامنے کوئی متعین طریق وراستہ نہ تھا۔ چلتے چلتے رات کے وقت ایک جگہ پڑاؤ کیا اگلے دن صبح ہمارے سامنے ایک ڈھلان تھی چنانچہ نہایت ہی دور دراز تنگ گھاٹی سے گزر کر ہم بنو پہنچے اور وہاں اتر کر پڑاؤ کیا۔ ہمارے لشکریوں، اونٹوں اور گھوڑوں نے پہاڑ کی بلندی اور راستے کی تنگی کے باعث سخت صعوبت برداشت کی۔ وہ مویشی جو بطور مال غنیمت ہمارے ہاتھ آئے تھے۔ چھوڑ دیئے گئے

راستہ ہماری دائیں جانب ایک یا دو کروہ دور تھا۔ جس راستہ پر ہم تھے سواری کے قابل نہ تھا۔ چونکہ چوپان اور غلّہ بان کبھی کبھی اپنے غلّوں کو چَرانے کے لئے اس تنگ گھاٹی کی طرف سے آتے ہیں اسی لئے یہ جگہ گوسفند لیار (بھیڑوں کی راہ) کے نام سے مشہور ہے۔ کیوں کہ افغانوں کی زبان میں راستے کو لیار کہتے ہیں۔ ملک بوسعید کمری ہمارا میر کارواں تھا۔ ہمارے اکثر اہل لشکر راستہ بھٹک جانے کا ذمہ دار اسی کو ٹھہراتے تھے۔

بنگش اور نغر کے پہاڑوں سے نکلتے ہی ہمیں بنو نظر آیا، یہ ہموار جگہ واقع ہے۔ اس کے شمال میں بنگش اور نغر کا کوہستانی سلسلہ ہے۔ یہاں کی سرزمین دریائے بنگش کے پانی سے سیراب ہوتی ہے۔ اس کے جنوب میں جو پاڑہ اور دریائے سندھ ہے اور مشرق میں دینکوٹ۔ اس کے مغرب میں دشت ہے جسے بازار اور تاک بھی کہتے ہیں۔ افغان قبائل میں کرزّانی [٧٠]، کیوی، سور، عیسیٰ خیل اور نیازی [٧١] اس ولایت میں زراعت کرتے ہیں۔

بنوں: جیسے ہی ہم نے بنو میں پڑاؤ کیا۔ یہ خبر ملی کہ وہ قبائل جو اس میدان میں رہتے ہیں انھوں نے شمالی کوہستان میں سنگر قائم کرلی ہے چنانچہ جہانگیر مرزا کے ہمراہ ان کی سرکوبی کیلئے لشکر روانہ کیا گیا، غالباً یہ کیوی قبیلے کی سنگر تھی اُس نے وہاں پہنچتے ہی آن کی آن میں قتل عام شروع کردیا۔ بہت سے دشمنوں کے سرکاٹ کر اپنے ساتھ لائے اور ہمارے لشکر کے آدمیوں کے ہاتھ بہت سا ساز وسامان آیا۔ بنوں میں بھی دشمنوں کے سروں سے مینار بنایا گیا۔ جس وقت اس سنگر پر ہمارا قبضہ ہوگیا۔ کیوی قبیلے کا سردار شادی خاں نامی شخص دانتوں کے بیچ تنکا دبائے حاضر خدمت ہوا۔ اس کے قیدیوں کو معاف کردیا گیا۔

دشت پر حملہ: کوہاٹ پر حملہ کرتے وقت راستہ اس طرح مقرر کیا گیا تھا کہ بنگش اور بنوں کے افغانوں کی تاخت وتاراج کرکے نغر اور برل کی راہ سے واپس جایا جائے۔ بنوں پر حملہ کرنے کے بعد ان لوگوں نے جو جگہ سے واقف تھے عرض کیا کہ دشت یہاں سے نزدیک ہے اور وہاں ایسے صاحب حیثیت افراد ہیں جن کے پاس کافی لوگ ہیں۔ راستہ بھی اچھا ہے۔ چنانچہ قرار پایا کہ برل کی راہ سے گزر کر دشت پر حملہ کیا جائے اور اسی راہ سے برل واپس جایا جائے۔

اگلے دن صبح وہاں سے کوچ کرکے دریا کے کنارے کنارے ہم عیسیٰ خیل گاؤں میں پہنچے اور وہیں قیام پذیر ہوئے جب عیسیٰ خیل کو معلوم ہوا تو انہوں نے خود کو چوپاڑہ کے کوہستان میں جمع کرلیا۔ عیسیٰ خیل کے گاؤں

٦٨۔ کھوپڑیوں کا مینار (کلہ مینار) جنگ میں فتح کے بعد کی یہ قبیح رسم منگولوں نے شروع کی تھی۔ یوروپی مصنفین اس کو امیر تیمور کی نشانی بتاتے ہیں (جسٹمین مروزی، تمرلین ص ٢٥٢) جو غلط ہے۔ علاء الدین عطا ملک جیوانی نے جو چنگیز خان اور ان کی اولاد کی تاریخ بعنوان تاریخ جہاں گشا لکھی ہے اس میں درج ہے کہ یہ رسم اس وقت موجود تھی (ص ١٧٨) اسپین کے سفیر کلاجیوو (ایمبسی ٹو تمرلین ص ١٧٤) نے اسی کو دمغان میں دیکھا تھا ایک برہ کھوپڑیوں کا اور دوسرا مٹی اور اینٹوں کا اوپر قندیلیں روشن ہوتی تھیں۔ اس کے مقابلے میں مولف نے کندبادام کے عجائب گھر میں روسی دور کا ایک مصوری کا نمونہ دیکھا جس میں یہ صرف ایک کھوپڑیوں کا ڈھیر ہے۔

٦٩۔ دریائے بنگش۔ دریائے کرم۔ اسی نام کا قبیلہ بھی ہے جو کرلانی افغان ہیں اور یہ کوہاٹ اور کرم کے نواح میں ہیں۔

٧٠۔ کرزّانی۔ ان سے مراد افغانوں کا تیسرا مشہور قبیلہ کرلانی ہے۔ اس کے لئے دیکھئے نوٹ ٥٤

٧١۔ سور قبیلہ شیر شاہ سوری کا قبیلہ ہے۔ نیازی اور عیسیٰ خیل دونوں لودھی خاندان سے ہیں۔ لودی مغلوں سے پہلے دلی پر حکمراں تھے۔ کیوی قبیلے کے متعلق زیادہ معلومات نہیں۔

سے کوچ کر کے کوہستان چوپارہ کے دامن میں قیام پذیر ہوئے۔ حملہ آور جماعت کوہستان کی جانب روانہ ہوئی جس نے عیسی خیل کی ایک سنگر کو توڑ ڈالا اور اپنے ساتھ بھڑیں دیگر مویشی اور ساز وسامان لے کر واپس آئی۔

اسی رات عیسی خیل نے شبخون مارا۔ اگر چہ اس یورش میں انہوں نے بہت زیادہ احتیاط سے کام لیا تھا تاہم اس کے باوجود ان کی پیش نہ گئی۔ ہماری طرف سے بھی بطور احتیاط اقدام کیا گیا تھا کو جو بھی سپاہی برانغار، جوانغار، غول اور ہراول میں جس جگہ بھی تھا اس نے اپنے مقام پر خود کو مسلح کیا اور اپنے پیادہ دستوں کو جمع کر کے مستعد جنگ ہوگیا۔ (ورق ۱۲۸) سپاہی اپنی خیمہ گاہوں کے گرد تیر کی رسائی کے فاصلے پر پہرے پر مقرر کیے گئے تھے۔ ہر رات لشکر کے تمام آدمی اسی قاعدے کے مطابق متعین کیے جاتے۔ تین چار گشتی پہرہ دار مشعلین ہاتھوں میں لئے باری باری جمع ہوتے اور انھیں گشت پر بھیجا جاتا۔ ایک مرتبہ گشت کے لئے میری باری بھی آئی۔ جو شخص بھی گشت پر نہ جاتا اس کی ناک میں شگاف لگایا جاتا اور اسے لشکر کے گرد گھمایا جاتا[۷۲]۔ برانغار میں جہانگیر مرزا، باقی چغانیانی، شیرم طغائی۔ سید حسین اکبر اور بعض دیگر امرا تھے۔ جوانغار میں مرزا خاں، عبدالرزاق، مرزا قاسم بیگ اور دیگر امیر تھے۔ قلب میں کوئی بڑا امیر نہ تھا۔ یہ تمام امرا میرے قرابت دار تھے۔ ہراول میں سید قاسم ایشک آغا، بابا اوغلی، اللہ بیردی اور دیگر بعض امیر تھے۔ پورے لشکر کو چھ گروہوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ جس میں سے ہر ایک دن رات باری باری پہرہ داری کرتا۔

اس پہاڑ کے دامن سے کوچ کر کے مغرب کی جانب روانہ ہوئے اور دشت بنو کے درمیان ایک خشک دریا میں اترے لشکر کے لوگوں نے اس دریا کی تہ کو کھودا۔ تقریباً ایک گز یا ڈیڑھ گز کھودنے کے بعد اپنے لئے، اپنے گلے اور دیگر مویشیوں کے لئے پانی نکالا۔ صرف یہی دریا ایسا نہ تھا بلکہ ہندستان کے تمام دریاؤں کی یہی خاصیت ہے کہ جب ایک یا ڈیڑھ گز تہ کو کھودا جاتا ہے تو اس میں سے پانی برآمد ہوتا ہے۔ یہ بھی خدا کی عجیب قدرت ہے کہ ہندستان میں دریاؤں کے علاوہ کسی دوسری جگہ پانی بہتا ہوا نہیں ملتا' اور دریاؤں کو کھودنے پر اس قدر نزدیک پانی مل جاتا ہے۔

اس خشک دریا سے ہم نے صبح کے وقت کوچ کیا۔ نماز ظہر کے وقت ہمارے اسپ سوار آدمی دشت کے دیہات میں پہنچ گئے۔ ہمارے حملہ آور گروہ نے چند دیہات پر حملہ کیا وہ اپنے ساتھ ساز وسامان کے علاوہ، مویشیوں کے گلے اور سوداگروں کے گھوڑے لے کر آئے۔ اس رات سے صبح تک اور صبح سے رات تک ساز وسامان سے لدے ہوئے گھوڑے اور خچر، مویشیوں کے گلے، اونٹ نیز لشکر کے پیادہ سپاہی مسلسل آتے رہے۔ حملہ آور دستے نے دشت کے دیہات میں مسلسل حملے کر کے بہت سی بھیڑیں اور گائیں جمع کیں اور اپنے ساتھ لے آئے۔ وہاں ان کا ٹکراؤ افغان تاجروں سے ہوگیا۔ وہ ان سے کثیر تعداد میں سفید کپڑے، عقاقیر،[۷۳] قند مصری، تپچاق گھوڑے[۷۴] اور سوداگروں کے گھوڑے اپنے ساتھ لے کر آئے۔

افغانوں میں خواجہ خضر نوحانی[۷۵] کا شمار مشہور و معتبر سوداگروں میں ہوتا تھا۔ ہندی مغل نے اس کو گھوڑے پر سے اتارا اور اس کا سر کاٹ کر میرے پاس لایا۔ شیرم طغائی حملہ آور دستے کے عقب میں گیا تھا۔ ایک پیادہ افغان سے اس کا مقابلہ ہوگیا۔ اس نے شمشیر کی ایسی کاری ضرب لگائی کہ اس کی انگشت شہادت کٹ کر گر گئی۔

واپسی کا راستہ: کابل واپسی کے لئے اگلے دن صبح کے وقت کوچ کیا گیا۔ دشت میں واقع دیہات کے ذرا نزدیک ہم نے قیام کیا اور وہاں سے کوچ کر کے ہم دریائے گومل کے کنارے اترے۔ دشت سے غزنی کی جانب دو راستے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک سنگ سوراخ ہے جو برک سے گزر کر برمل تک آتی ہے۔ دوسری دریائے گومل کے کنارے کنارے چلی گئی ہے۔ اور برک تک پہنچے بغیر یہ بھی برمل سے جا ملتی ہے۔ کچھ لوگوں نے

۷۲۔ یہ ایک طرح ذلیل کرنے والا قدم تھا۔ جس طرح گنجا کر کے گدھے پر الٹا بٹھا کر گھمانا۔ ناک میں شگاف لگانے کا مقصد اس میں چیرا لگا دینا کہ خون نکلے، نشان قائم ہو جائے اور جرم عیاں ہو۔ منگولوں میں یہ رواج تھا کہ جو خطرناک قیدی سزا کے بعد معاف کیے جاتے یا چھوڑے جاتے ان کے گلوں پر نشان لگا دیا جاتا تھا کہ پہچانے جا سکیں (مارکو پولو ص ۲۲۰)

۷۳۔ عقاقیر۔ نباتاتی جڑیں۔ یہ ہندستان سے برامد کی جاتی تھیں۔

۷۴۔ تپچاق۔ دیکھیں نوٹ ۵۱ حالات ۸۹۹ ہجری

۷۵۔ نوحانی۔ یہ نوحانی بنوں اور ٹانک کے علاقے کے بٹانی پٹھان ہیں۔

گومل کے راستے کو پسند کیا۔ ان چند روز کے درمیان جب کہ ہم دشت میں تھے مسلسل کئی روز تک بارش ہوتی رہی۔ (ورق ۱۲۹) جس کے باعث دریائے گومل کا پانی اتنا چڑھ چکا تھا کہ اسے پار کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ لیکن ہم نے اسے پار کیا۔ جو لوگ اس جگہ کے بارے میں جانتے تھے انہوں نے عرض کیا کہ گومل کے راستے میں یہ دریا کتنی ہی مرتبہ ہماری راہ میں آئے گا جس سے ہمیں گزرنا ہوگا۔ اگر پانی کی یہی فراوانی رہی تو اس کا عبور کرنا مشکل ہے۔ چنانچہ اس راستے کے بارے میں رد و کد پیدا ہو گئی۔

ابھی ہم کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہیں پہنچے تھے کہ اگلے روز صبح کے وقت کوچ کا نقارہ بجا دیا گیا۔ میں گھوڑوں پر سوار ہونے کے بعد فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ عید کا دن تھا اور میں نماز عید کے لئے غسل کر رہا تھا کہ میں نے سنا کہ جہانگیر مرزا اور دیگر امرا آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ دشت کے مغرب میں جو پہاڑ ہے اسے کوہ مہتر سلیمان کہتے ہیں۔ یہ پہاڑ دشت اور دکی کے درمیان واقع ہے۔ اس کی نوک پر سے گزر جانے کے بعد راستہ ہموار ہے اگر چہ اس میں ایک دو کوچ کا فرق ہے۔ ان کا اس رائے پر اتفاق ہوا کہ پہاڑ کی چوٹی کو پار کیا جائے اور وہ اس طرف روانہ بھی ہو گئے۔ جس وقت میں غسل سے فارغ ہوا تو لشکر کے لوگ اس طرف روانہ ہو چکے تھے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر نے دریائے گومل کو پار بھی کر لیا تھا۔ چوں کہ راستوں کے نشیب و فراز سے واقف نہ تھے اسی لئے انہیں دوری و نزدیکی کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ محض افواہوں پر یقین کر کے اس طرف روانہ ہو گئے تھے۔

عید: نماز عید دریائے گومل کے کنارے ادا کی گئی۔ اس سال عید فطر اور عید نوروز [۷۶] بہت ہی نزدیک واقع ہوئیں، بس ایک دو دن کا ہی فرق ہوگا۔ چنانچہ اسی مناسبت سے میں نے یہ غزل کہی۔

یانکی ای یار یوزی بیرلہ کورروب ایل شاد بیرم لار
منگا یوز وقا شینکدین ایرو بیرم آییدا غم لار
ماہ نور امردی یار مردم شایدوعید ہاست
مرا ازرو داہروی آورد ماہ عید غمہاست
یوزی نورروزی وصلی عید ینی بابر غنیمت توت
کہ موندین یخشی بولماس بولسہ یور نورو زو بیرم لا
مرارز دوی او وعید اصل اور ابا غنیمت بدان
کہ ازین بہتر نمی شود اگر شود صد نوروز وعیدھا

(ہلال و یار ہوں ساتھ اس سے بہتر عید نہیں
میں غم زدہ ہوں کہ ماہ رخ کی شنید نہیں
خوش قسمتی پہ ناز کر جب وہ مکھڑا سامنے ہو
سیکڑوں ہوں پر اس سے بہتر دید نہیں)

ہم دریائے گومل پار کر کے دامن کوہ کے کنارے کنارے جنوب رویہ روانہ ہوئے۔ ایک یا دو کروہ ہی راستہ طے کیا ہوگا کہ اپنے خون کے پیاسے کچھ افغان دامن کوہ اور پشتے پر نمودار ہوئے۔ سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہم ان کی طرف بڑھے۔ اگر چہ ان میں سے بہت سے بھاگ گئے مگر بعض نے حماقت کی اور خود کو دامن و پشت کوہ کی پہاڑیوں پر مضبوط کر لیا۔ ایک افغان سب سے الگ ایک ننگی چٹان پر کھڑا تھا۔ بظاہر اس چٹان کی دوسری طرف تیز ڈھلان ہوگی۔ جہاں سے گزرنے کے لئے راستہ تک نہ ہوگا۔ سلطان قلی چناق چوں کہ مسلح تھا اس لئے اس کی طرف بڑھا۔ کچھ نبرد آزمائی ہوئی اور اسے پکڑ لیا۔ دوسری چٹان پر قتلق قدم اور ایک افغان کے درمیان

۷۶۔ نوروز۔ پارسی سال کا پہلا دن۔ جو ایرانی اب بھی بہت جوش خروش سے مناتے ہیں۔

مقابلہ ہوا دونوں ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ دس بارہ گز کی بلندی سے انہوں نے ایک ساتھ چھلانگ لگائی بالآخر وہ اس افغان کا سر کاٹ کر میرے پاس لے آیا تیسری چٹان پر کتہ بیگ اور ایک افغان دست و گریبان تھے۔ پہاڑ کی بلندی سے اس کی آدھی اونچائی تک لڑھکتے اور قلابازیاں کھاتے نیچے آ رہے اس نے بھی سر کاٹ لیا اور میرے سامنے پیش کر دیا۔ اس محاربے میں بہت سے افغان قیدی ہاتھ لگے جنہیں آزاد کر دیا گیا۔

دشت سے کوچ کر کے کوہ مہتر سلیمان کے دامن پر اس کے کنارے کنارے جنوب رویہ ہم روانہ ہوئے۔ تین منزلوں کو ایک ساتھ سر کرتے ہوئے ہم بیلہ نامی چھوٹے سے قصبے میں پہنچے جو دریائے سندھ کے کنارے (ورق ۱۳۰) ملتان کے تابع ہے۔ وہاں کے لوگ کشتیوں میں سوار ہو کر دریا پار کر گئے۔ بعض نے پانی میں چھلانگ لگا دی اور تیر کر نکل گئے۔ اس گاؤں کے سامنے ایک ٹاپو تھا۔ جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے وہ اس ٹاپو پر نظر آئے۔ ہمارے لشکر کے اکثر لوگ اپنے گھوڑوں اور ان کے ساز و سامان کے ساتھ پانی میں کود گئے اور پار جا لگے۔ کچھ لوگ پانی کی رو میں بہہ گئے جنہیں پانی بہا کر لے گیا۔ ان میں ایک ملازم قل احمد اور وق بھی شامل تھا۔ دوسرا شخص مرزا جہانگیر کا نوکر میر فراش تھا اور تیسرا شخص قیتماس ترکمان تھا۔ ہمارے بعض اہالی لشکر کے ہاتھ پارچہ اور دیگر بار برادری کا سامان لگا اس جگہ کے گرد و نواح میں جو لوگ آباد تھے وہ سب کشتیوں کے ذریعے دریائے سندھ کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ اس ایک دستے نے جو اسی ٹاپو کے سامنے سے گزر رہا تھا پانی کے پاٹ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی تلواریں سونت لیں اور شمشیر بازی کے کرتب دکھانے لگے۔ ایک شخص کی تو انہوں نے گردن ہی مار دی۔

بایزید بکاول کی بہادری

وہ دستہ جو اس ٹاپو پر پہنچ چکا تھا اس میں قل بایزید بکاول [۷۷] بھی شامل تھا۔ وہ اپنے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر پانی میں کود گیا اور ان کے مقابلے پر اتر آیا۔ ٹاپو کے اس پار دریا کا پاٹ اس طرف کے پاٹ سے دو تین گنا زیادہ ہوگا، وہ گھوڑے کو تیراتے ہوئے ان لوگوں کے مقابلے پر پہنچا جو ٹاپو کے اس طرف تھے چنانچہ ایک تیر کی جست کے فاصلے پر وہ پایاب جگہ پر پہنچ گیا۔ پانی رکاب کے تسمے تک ہوگا۔ وہ وہاں بس اتنی ہی دیر رکا جتنی دیر میں دودھ ابلتا ہے۔ شاید اس وقت اس نے خود کو مرتب کیا ہوگا۔ عقب سے اسے کوئی مدد نہ ملی اور اس کے آنے کا کوئی احتمال بھی نہ تھا چنانچہ اسی جگہ سے اس نے لوگوں پر وار کیا ادھر سے بھی ایک دو تیر چلائے گئے۔ مگر ان کے قدم وہاں جم نہ سکے، ہار کر فرار ہو گئے۔ اپنے اس گھوڑے پر سوار جس کے اوپر نہ کوئی ساز تھا اور نا کوئی سامان اور نا ہی عقب سے کسی مدد کی امید وہ اسے تیراتا ہوا سندھ جیسے دریا کو پار کیا گیا اور دشمن کو وہاں سے بھگا دیا۔ ان کی جگہ پر قبضہ کر لیا۔ یہ تھا اس کا جاندارانہ کارنامہ۔ دشمن کو وہاں سے بھگا دینے کے بعد لشکر کے لوگ وہاں پہنچے اور اپنے ساتھ پارچہ جات اور مویشیوں کے گلے بطور مال غنیمت لے کر آئے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی چند مرتبہ اس کی خدمات اور مردانگی کے کارنامے مجھ پر عیاں ہو چکے تھے اور اس نے مقام حاصل کر لیا تھا کہ وہ قابل رعایت، شفقت سمجھا جائے۔ اس بار میں نے اس کا مرتبہ باورچی سے بلند کر کے شاہی دسترخوان کے نمک چش [۷۸] پر پہنچا دیا۔ اس کے ان اقدام سے اس کے بارے میں میری پوری توجہ و عنایت اس کی تربیت دینے کی جانب رہنے لگی اور وہ اس لائق بھی تھا کہ اس پر مکمل عنایت کی جائے اور پوری طرح اس کی تربیت ہوں۔

ہم نے وہاں سے کوچ کر کے دریائے سندھ کے کنارے دو منزلیں اور سر کریں۔ اور پانی کے بہاؤ کی طرف روانہ ہوئے۔ لشکر کے لوگوں نے اس کثرت سے حملہ کیے کہ گھوڑوں کی حالت زبوں ہو کر رہ گئی۔ اس لشکر کشی کے بعد جو مال غنیمت وہ لے کر آئے اس میں کوئی بیش قیمت چیز ان کے ہاتھ نہ لگی بس مویشیوں کا غلہ تھا جسے

۷۷۔ بکاول۔ باورچیوں کا داروغہ

۷۸۔ نمک چش۔ نمک چکھنے والا۔

وہ اپنے ساتھ لے کر آئے۔ دشت میں بھیڑیں اور دوسری جگہوں پر پارچہ جات اہل لشکر کو ملے تھے لیکن دشت سے گزرنے کے بعد مویشیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جس وقت ہم دریائے سندھ کے کنارے کنارے سفر کر رہے تھے اس وقت گھر کا ایک خدمت گار آسانی سے تین سو چار سو مویشیوں کا غلّہ اپنے ساتھ ہانک لایا۔ ان میں سے بہت سے جانوروں کو ہم نے یونہی پیچھے چھوڑ دیا۔

سخی سرور: تین منزلیں سر کرنے کے بعد ہم دریائے سندھ کے کنارے قیام پذیر ہوئے۔ اس کے بعد ہم نے دیگر تین منزلیں طے کی اور پیر کانو[79] کے مزار تک پہنچ کر دریائے سندھ سے الگ ہو گئے یہاں ہم نے پڑاؤ کیا چونکہ لشکر کے بعض لوگوں نے مجاوروں کو پریشان کیا تھا اس لئے میں نے حکم دیا کہ بطور تنبیہ ایک کی تکّہ بوٹی کر دی جائے۔ یہ مزار ہندستان میں بہت متبرک سمجھا جاتا ہے۔ اور وہ پہاڑ جن کا سلسلہ کوہ سلیمان سے جاملتا ہے ان کے دامن میں واقع ہے (ورق ۱۳۱) اس مزار سے کوچ کر کے ہم نے ایک درّے کے اوپر پڑاؤ کیا۔ اور وہاں سے روانہ ہونے کے بعد ہم اس دریا میں اترے جو ولایت دکی[80] سے متعلق ہے۔ جس وقت ہم اس منزل سے کوچ کر رہے تھے تو شاہ بیگ[81] کا ملازم سیوی کے داروغہ فاضل کوکلداش کے بیس نوکروں کو پکڑ لیا گیا جو قراول دستے پر مشتمل تھے۔ اس وقت چونکہ اس کے ساتھ کوئی کدورت نہ تھی اسی لئے ہم نے ان کے گھوڑوں نیز ساز و سامان کے ساتھ انھیں جانے دیا۔ رات ایک منزل پر بسر کرنے کے بعد ہم نے اگلے دن چوٹالی گاؤں کے نزدیک، جس کا شمار دکی کے دیہات میں ہوتا ہے پڑاؤ کیا۔

دریائے سندھ سے دور اور اس کے کنارے ہمارے حملہ آور دستے اپنا کام کرتے رہے یہاں گھوڑوں کے لئے گھاس اور دانہ فراوان تھا اسی لئے انہوں نے اپنے گھوڑوں کو پیچھے نہیں چھوڑا۔ لیکن جب ہم پیر کانو سے روانہ ہوئے تو سبز دانے کا دور دور تک کہیں نشان نہ تھا۔ اگرچہ دو تین منزل بعد کہیں کوئی سبزہ زار نظر آ جاتا تھا مگر گھوڑوں کے لئے چارہ قطعی ناپید تھا چنانچہ تین منزلوں کے بعد گھوڑوں کو پیچھے چھوڑ دینا پڑا۔ چوٹالی سے چونکہ بار برداری کے جانور کم تھے اسی لئے میرا خیمہ بھی یہیں رہ گیا۔ اسی منزل پر اس رات ایسی شدید بارش ہوئی کہ پانی خیموں میں پنڈلیوں سے اوپر تک آ گیا۔ ہم رات بھر دریوں پر بیٹھے رہے اور پوری رات صبح تک جاگ کر اسی پریشانی کے عالم میں گزری۔

باقی کی سازش

ایک دو کوچ بعد جہانگیر مرزا نے میرے کان میں کہا کہ تنہائی میں کچھ کہنا ہے۔ چنانچہ تخلیہ کیا گیا۔ اس نے عرض کیا کہ باقی چغانیانی میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ بادشاہ کو سات آٹھ لوگوں کے ہمراہ رخصت کر دیا جائے اور جب وہ دریائے سندھ عبور کر لیں تو تمہیں تخت شاہی پر بٹھا دیں۔ میں نے پوچھا اس میں اور کون کون ہے اس نے کہا کہ فی الحال باقی بیگ ہی ہے، دوسروں کے بارے میں نہیں جانتا۔ میں نے اس سے کہا کہ دوسروں کے بارے میں بھی معلوم کرو غالباً سید حسین اکبر، سلطان علی چہرہ، خسرو شاہ کے بعض امرا کچھ اور جوان بھی ہوں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ جہانگیر مرزا نے بڑا بھلائی کا کام کیا اور بھائی ہونے کا حق ادا کر دیا۔ اس قدم سے اس نے اس سلوک کو نبھایا تھا جو میں نے اس کے ساتھ کہمرد میں کیا تھا۔ وہاں بھی فتنہ و فساد اسی مردود کا بپا کیا ہوا تھا۔

جس وقت ہم اس منزل سے کوچ کر کے اگلی منزل پر قیام پذیر ہوئے میں نے لشکر کے لوگوں میں سے اس دستے کو جن کے گھوڑے کارآمد تھے جہانگیر مرزا کی سربراہی میں افغانوں پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا جو گرد و نواح میں آباد تھے۔ اس منزل پر اہل لشکر کے گھوڑوں نے تھک کر گردنیں ڈالنا شروع کر دیں۔ کسی کسی دن تو دو سو تین سو گھوڑے تھک ہار کر کام سے رہ جاتے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ عمدہ عمدہ جانباز سپاہی اور اہل لشکر

۷۹۔ پیر کانو۔ پنجاب کے دوسرے بڑے صوفی بزرگ۔ آپ کا نام سید احمد سلطان تھا۔ آپکے والد ماجد زین العابدین ہجرت کر کے ۵۲۰/۱۱۲۶ میں شاہ کوٹ نزد ملتان قیام پذیر ہوئے۔ وہیں آپ پیدا ہوئے۔ آپ نے زراعت اور بھیڑ بکریاں پالنے کا پیشہ اختیار کیا۔ روحانی فیض کے لئے آپ بغداد شیخ عبدالقادر جیلانی کے دردولت پر حاضر ہوئے۔ آپ چشتیہ، سہروردیہ، اور قادریہ تینوں سلسلوں سے وابستہ تھے۔ ۵۷۷/۱۱۸۱ میں خالہ زاد بھائیوں نے دشمنی میں آپ کو شہید کر دیا۔ آپ کی خانقاہ اورنگزیب عالمگیر نے تعمیر کروائی تھی۔ آپ کے القاب سخی سرور اور لکھ داتا آپ کی دریا دلی کی وجہ سے ہیں۔ آپ کی یاد میں کئی میلے لگتے ہیں، جس میں مشہور پشاور کا جھنڈا میلہ ہے جو ہر سال منعقد ہوتا ہے۔ پیر کانو بھی آپ کا لقب ہے جو شاید پیر خانو کی بگڑی ہوئی شکل ہے (حضرت سخی سرور۔ حامد خاں حامد ص ۷۹) ڈیرہ غازی خاں کے پاس سخی سرور کے مقام پر آپ کا مزار آج بھی زیارت خاص و عام ہے۔

۸۰۔ ولایت دکی۔ یہ لورالائی کے علاقہ میں صوبہ بلوچستان میں ہے۔

۸۱۔ شاہ بیگ ارغوں بن ذوالنون بیگ جو اس وقت حاکم قندھار تھا۔ اس نے بعد میں سندھ میں اپنی حکومت قائم کی۔

پیادہ ہوگئے۔ شاہ محمد اوغلاچی کا شمار میرے خانہ زاد بہادروں میں ہوتا ہے اس کے تمام گھوڑے تھک رہے۔ وہ پیدل چلا آرہا تھا۔ غزنی پہنچنے تک گھوڑوں کی یہی حالت تھی۔

تین منزلیں سر کر لینے کے بعد جہانگیر مرزا نے افغانوں کے ایک دستے پر حملہ کر دیا۔ اور کچھ بھیڑیں اپنے ساتھ لے کر آیا۔

آب ایستادہ: ایک دو کوچ بعد ہم آب استادہ نامی جگہ پر پہنچے۔ جہاں ہمیں بہت ہی عجیب وغریب وسیع خطہ آب نظر آیا کہ اس کی دوسری طرف جو دشت تھا وہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لگتا تھا کہ پانی آسمان کو چھو رہا ہے۔ اُس طرف جو پہاڑ اور پشتے تھے وہ فضائیں تیرتے ہوئے نظر آرہے تھے لگتا تھا کہ فضا میں معلق ہیں۔ وہ پانی جو یہاں ذخیرہ ہوگیا تھا (ورق ۱۳۲) وہ وادی کتہ داد، وادی زرمت، دریائے غزنی اور قرہ باغ کی چراگاہوں اور موسم بہار کی بارش کا نتیجہ تھا۔ بہار کے موسم میں یہاں پانی کی وہ فراوانی ہوتی ہے کہ زراعت کے استعمال کے بعد بھی بچ رہتا ہے۔ جس وقت ہم آب ایستادہ سے ایک کروہ کے فاصلے پر تھے تو ہمیں عجیب چیز نظر آئی، پانی کے درمیان اور آسمان کے بیچ میں ہر وقت شفق جیسی کوئی سرخ چیز چمکتی تھی اور اس کے بعد وہ غائب ہو جاتی تھی۔ چنانچہ جب تک ہم اس کے نزدیک نہیں پہنچ گئے یہی کیفیت رہی۔ اور جیسے ہی نزدیک پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ کیفیت قاز کے ان جھنڈوں کی وجہ سے تھی جو دس بیس ہزار نہیں بلکہ لاتعداد تھیں۔ جس وقت وہ اڑتیں اور اپنے سرخ پر پھڑ پھڑاتیں تو کبھی روشنی ہوتی اور کبھی بجھ جاتی۔ صرف قازیں ہی تعداد میں بے انتہا نہیں تھیں بلکہ دوسری اقسام کے تمام پرندے بھی بے حد واندازہ تھے [۸۲] پانی کے کنارے پر ہمیں جگہ جگہ پرندوں کے انڈے نظر آئے۔ کچھ افغان جو یہاں ان کے انڈے جمع کرنے کے لئے آئے تھے ہمیں دیکھ کر بھاگے اور پانی میں کود گئے۔ ہمارے کچھ آدمی ایک یا نصف کروہ ان کے تعاقب میں گئے اور پکڑ کر لے آئے۔ جہاں تک وہ گئے تھے وہاں تک تہ آب ایک ہی طرح ہموار تھی۔ ہم اس دریا کے بہاؤ کے کنارے پر جسے آب ایستادہ سیراب کرتا ہے قیام پذیر ہوئے۔ یہ خشک دریا ہے جہاں پانی ہمیشہ جاری نہیں رہتا۔ ہم کئی مرتبہ اس پر سے گزرے مگر اس میں کبھی بہتا ہوا پانی نہیں پایا۔ مگر اس مرتبہ فصل بہار کی بارش کے باعث اس میں اس کثرت سے پانی تھا کہ اسے قطعاً عبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر چہ دریا کا پاٹ بہت چوڑا نہیں لیکن گہرا بہت ہے۔ چنانچہ تمام گھوڑوں اور اونٹوں کو تیرا کر پار پہنچایا گیا۔ کچھ بار برداری کے قابل سامان کو رسیوں سے باندھ کر اس پار کھینچ کر لے جایا گیا۔ کہنہ نانی اور سردہ کے بند سے گزر کر ہم غزنی پہنچے جہاں ہم دو روز جہانگیر مرزا کے مہمان رہے اس نے دعوتیں کیں اور پیشکش ہماری نذر کی۔

کابل واپسی: اس سال اکثر جگہوں پر طغیانی آئی تھی جس کے باعث دریائے دہ یعقوب کو تو عبور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے ایک ناؤ جہیل کے لئے بنوائی تھی، اسے لایا گیا اور کمری کے سامنے اسے دریا میں ڈال دیا گیا، جس کے ذریعے میرے لوگوں نے دریا کو عبور کیا۔ ایک اعتبار سے ہم درہ سجاوند سے سیدھے کمری پہنچے اور اس جگہ سے دریا کو پار کر کے ماہ ذی الحجہ میں کابل پہنچ گئے۔ [۸۳]

سید یوسف بیگ چند روز قبل مرض قولنج [۸۴] میں بتلا رہ کر واصل بحق ہو چکا تھا۔

ناصر مرزا کی غلطی: ناصر مرزا نے اپنے نوکر چاکر اور اپنی ولایات سے کچھ سامان لینے کا ارادہ کیا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ میں دو تین دن بعد پہنچوں گا۔ قوش گنبد سے وہ رخصت ہوا ہمارے پاس سے چلے جانے کے بعد اس نے درۂ نور میں اپنا لشکر بھیجا تا کہ ان لوگوں کی سرکوبی کر سکے جنھوں نے سرکشی کی تھی۔

قلعہ درۂ نور نہایت ہی محکم جگہ پر واقع ہے۔ جس کے چاروں طرف دھان کے کھیت ہیں اور یہ پہاڑ کی بالکل نوک پر بنا ہوا ہے۔ فضلی سالار لشکر تھا۔ اس نے اس وقت احتیاط سے کام نہ لیا۔ اس دشوار گزار تنگ راستے پر جو یکطرفہ تھا اور جس کے سامنے پہاڑ ہی پہاڑ تھے اس نے لشکر کے آدمیوں کو بھیج دیا۔ درہ نور کے لوگ ان کے

۸۲۔ آب ایستادہ۔ یہ بڑی جھیل ہے ۱۵x۱۷ میل اس کی پیمائش ہے۔ بابر کے اس بیان کو اگر ساڑھے تین سو سال بعد والے بیان سے موازنہ کریں (دیکھیں نوٹ ۴۸) تو اندازہ ہوگا کہ کس طرح میٹھے پانی کی جھیل نمک اور شورے سے برباد ہو چکی ہے۔

۸۳۔ یہ چار مہینے کی مہم تقریباً بیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ بابر نے سر کی۔ اس میں بیشتر خسرو شاہ کے سپاہی تھے۔ راستوں کی ناواقفیت اور ملک میں سامان کی قلت کی وجہ سے کافی تباہی ہوئی اور کچھ زیادہ ہاتھ بھی نہیں آیا۔ کوئی خاص بڑی لڑائی بھی نہیں ہوئی (مرزا حیدر ص ۲۰۱) اسی وجہ سے کابل لوٹنے کے بعد بہت سے خسرو شاہ کے ساتھی بابر کو چھوڑ گئے جیسا کہ آگے ذکر آئے گا۔

۸۴۔ قولنج۔ وہ درد جو مروڑ کے ساتھ ہو۔ یہ پتہ، گردے کی نالی یا انتڑیوں میں ہوسکتا ہے۔ قولون سے کولون بنا جو انگریزی میں بڑی آنت کو کہتے ہیں۔

سردوں پر آن پہنچے اور حملہ آوروں کو منتشر کر کے چلے گئے جس کی تاب لشکر کے دیگر سپاہی نہ لا سکے اور فرار ہو گئے۔ پورے ایک دستے کو قتل کر دیا اور بہت سا ساز و سامان ان کے ہاتھ لگا۔ جس لشکر کا سالار فضلی جیسا شخص ہو لا محالہ اس کا انجام یہی ہونا ہے، (ورق ۱۳۴) یا تو یہ وجہ تھی یا ناصر مرزا کے دل میں کدورت اس نے ہمارے ساتھ نہ آنے کا فیصلہ کیا اور پیچھے رہ گیا۔

ایوب کے لڑکے یوسف اور بہلول بھی اپنی شر پسندی، فتنہ پردازی، خودسری اور حماقت میں کسی سے کم نہ تھے۔ میں نے النگار کا علاقہ یوسف کو اور بہلول کو علی شنگ کا علاقہ عطا کیا تھا۔ ان سے توقع تھی کہ وہ اپنی ولایات سے کچھ ساز و سامان لے کر ناصر مرزا کے ساتھ آئیں گے۔ چوں کہ ناصر مرزا نہیں آیا اسی لئے یہ بھی نہیں آئے۔ اس سال موسم سرما میں یہ ناصر مرزا کے ہم نوالہ، ہم پیالہ اور ہمنشین رہے اسی موسم سرما میں انہوں نے ایک مرتبہ ترکلانی[85] افغانوں پر یلغار کی تھی لیکن جیسے ہی بہار آئی اس نے ان تمام قبائل اور ان کے جانوروں کو در بدر کر دیا جو ننگرہار اور لمغانات میں آ کر بس گئے تھے۔ اور انھیں ہانکتے ہانکتے دریائے باران کے کنارے تک پہنچا دیا۔

جن دنوں ناصر مرزا دریائے باران اور اس کے نواح میں تھا اس کو یہ خبر ملی کہ بدخشان کے لوگوں نے ازبکوں کو قتل کر دیا ہے اور مل کر ایک ہو گئے ہیں جس کی تفصیل یہ ہے

شیبانی خاں نے قنبر بے کو قندور کا علاقہ عطا کیا تھا اور خود خوارزم کی جانب چلا گیا تھا۔ قنبر بے نے اہالی بدخشاں کی دل جوئی کی غرض سے محمد مخدومی کے لڑکے مسمّی محمود کو بدخشان کی جانب روانہ کیا۔ مبارک شاہ جس کے آباواجداد شاہان بدخشان کے دربار میں درجہ امارت پر فائز رہ چکے تھے سرکشی پر اتر آیا۔ اس نے مخدومی کے لڑکے اور چند دوسرے سرداروں کو قتل کر دیا اور ان کے سر تن سے جدا کر دیئے۔ اس جگہ جو ابتدا میں شاف تنور کے نام سے مشہور تھی ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا اور اس کا نام قلعہ ظفر رکھا۔ خسرو شاہ کے ترکش برداروں میں سے ایک محمد قورچی تھا۔ اس وقت خملنگان پر اس کا قبضہ تھا۔ اس نے شیبانی خاں کے صدر اعظم کو دیگر چند ازبک کے ساتھ روستاق میں قتل کر دیا اور خملنگان کو مستحکم کر لیا۔ زبیر راغی کے آباواجداد کا شمار شاہان بدخشان کے امرا میں ہوتا تھا اس نے راغ نامی مقام پر اعلان جنگ کر دیا۔ جہانگیر ترکمان نے بھی جو خسرو شاہ کے بھائی ولی کا ملازم تھا تباہی میں اپنے امیر کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس نے مغرور سپاہیوں اور ولی کے افراد قبیلہ کو جمع کر کے ایک گوشے میں پناہ گزینی اختیار کر لی تھی۔ جب ناصر مرزا نے اس قسم کی خبریں سنیں تو بدخشان کے لالچ میں اس نے چند بے عقل و کوتہ اندیش لوگوں کے ورغلانے پر ان تمام قوم و قبیلے کے افراد کو جو آمو دریا پار کر کے اس طرف آئے تھے کوچ کرنے پر مجبور کر دیا اور اور خود شبرتو دآب درہ کو عبور کر کے اس پار پہنچ گیا۔

خسرو شاہ جس وقت احمد قاسم کے ساتھ اجر نامی مقام سے فرار ہو کر خراسان کی جانب جا رہا تھا تو راستے میں اس کی بدیع الزماں مرزا اور ذوالنوں بیگ سے ملاقات ہوئی۔ چنانچہ وہ ایک ساتھ مل کر ہرات پہنچے اور سلطان حسین مرزا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ وہی شر پسند لوگ تھے جو کئی سال سے مرزا کے خلاف سرکشی کرتے چلے آ رہے تھے اور اس کی شان میں کتنی ہی مرتبہ گستاخی کے مرتکب ہو چکے تھے۔ ان کے باعث کون سا ایسا داغ تھا جس کا چرکہ مرزا کے دل پر نہ لگا ہو۔ وہ ذلت و خواری کی حالت میں مرزا کے روبرو پیش ہوئے اس کا سبب میں تھا۔ اگر میں خسرو شاہ کو اس کے نوکروں سے الگ نہ کرتا تو انکو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اور ذوالنون کے لڑکے (ورق ۱۳۴) مقیم کو میں نے کابل کی حکومت سے تاراج نہ کیا ہوتا، ان کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ایک نہ ایک دن وہ مرزا کی خدمت میں اس کے روبرو ہوں گے۔ بدیع الزماں ان کے ہاتھ میں مٹی کے مادھو کی طرح تھا۔ ان کے آگے اس کی ذرا بھی پیش نہیں جاتی تھی لیکن اس کے باوجود سلطان حسین مرزا نے ان کے ساتھ احسان کا سلوک کیا۔ جو بُرا برتاؤ وہ اس کے ساتھ کر چکے تھے وہ اسے بھی زبان پر نہ لایا بلکہ انھیں انعام و اکرام سے نوازا۔

۸۵۔ ترکلانی افغان۔ مشرقی سرائی افغان جن کی رہائش باجوڑ میں ہے۔

کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد خسرو شاہ نے اپنی ولایت کی جانب جانے کے لئے رخصت چاہی تاکہ وہاں پہنچ کر ولایت پر اپنا قبضہ کر سکے۔ جس وقت وہ آیا تھا تو اس وقت اس کے پاس نہ ساز وسامان تھا اور نا ہی لشکر، اس لئے اس کی روانگی میں لیت ولعل سے کام لیا جارہا تھا۔ وہ جیسے جیسے تساہل سے کام لیتے یہ رخصت ہونے کے لئے اصرار کرتا۔ جب اس کا اصرار حد سے تجاوز کر گیا تو محمد برندوق نے اسے منہ توڑ جواب دیا کہ اس وقت جب کہ تیرے پاس تیس ہزار نوکر تھے اور تمام ولایت تیرے تحت تصرف تھی اس وقت جب تو کچھ نہ کرسکا تو بھلا اب ان پانچ سو آدمیوں کے ساتھ جب کہ تیری ولایت ازبکوں کے قبضے میں ہے تو کیا کرے گا۔ اگرچہ اسے بہت نصیحت کی گئی اور بہت سی معقول باتیں بتائی گئیں مگر چونکہ موت اس کے سر پر منڈلا رہی تھی اس لئے اس پر کسی کے کہنے کا ذرا بھی اثر نہ ہوا اور اصرار بڑھتا ہی گیا۔ بالآخر اسے اجازت دے دی گئی۔ تین چار سو کی جمعیت کے ہمراہ وہ سیدھا داہانہ کی سرحد تک پہنچ گیا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس وقت ناصر مرزا بھی وہاں سے گزر رہا تھا۔

اس نے ناصر مرزا کو داہانہ کے گردونواح میں دیکھا۔ بدخشان کے سرداروں نے ناصر مرزا کو تخلیہ میں بلایا کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ خسرو شاہ وہاں موجود رہے۔ ناصر مرزا نے ہر چند خسرو شاہ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ کوہستان کی جانب چلا جائے مگر وہ اس پر قطعی راضی نہ ہوا۔ خسرو شاہ کا یہ ارادہ تھا کہ وہ ناصر مرزا کو سبز باغ دکھا کر قید کر لے اور قتل کر کے ولایت پر قابض ہو جائے۔ بالآخر جنگ کی نوبت آہی گئی اور اشکمش کے نواح میں دونوں صف آرا ہو گئے۔ مسلح ہو کر میدان جنگ میں اتر آئے۔ ناصر مرزا پسپا ہو کر بدخشان میں آرہا۔ خسرو شاہ نے تقریباً ایک ہزار کے قریب اوباش قسم کے لوگ اپنے گرد جمع کر لئے اور ان کا جتھا بنا کر قندوز کا محاصرہ کرنے کے ارادے سے وہاں پہنچا اور اس جگہ سے ایک دو فرسنگ دور خواجہ چار طاقی نامی مقام پر اس نے پڑاؤ کیا۔

خسرہ شاہ کا خاتمہ: محمد شیبانی خاں نے اندجان میں سلطان احمد تنبل کو قید کرنے کے بعد حصار کی جانب رخ کیا جہاں شیرم چہرہ جوانوں کے عمدہ دستے کے ساتھ پہلے ہی موجود تھا۔ اگرچہ ان کے سردار ولایات کو چھوڑ کر وہاں سے چلے گئے تھے مگر حصار کے قلعوں پر ان کا قبضہ باقی تھا جسے انھوں نے مزید مضبوط کر لیا۔ شیبانی خاں نے حصار کا محاصرہ حمزہ سلطان اور مہدی سلطان کے حوالے کر دیا اور خود قندوز کی جانب چلا گیا۔ اس ولایت کو اس نے برادر خورد محمود سلطان کے حوالے کر دیا اور خود بلا توقف حسین صوفی سے نبرد آزما ہونے کے لئے خوارزم کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابھی وہ سمرقند پہنچا بھی نہیں تھا کہ اس کے بھائی کا قندوز میں انتقال ہو گیا۔ یہاں کے لوگوں نے اس کی جگہ قنبر بے مروی کو حاکم بنا دیا۔

جس وقت خسرو شاہ اس جگہ پہنچا قنبر بے قندوز میں موجود تھا۔ قنبر بے نے حمزہ سلطان اور دیگر سلاطین کے پاس جو وہاں رہ گئے تھے، قاصد دوڑائے اور انھیں اپنے پاس آنے کی دعوت دی۔ حمزہ سلطان دریائے آمو کے کنارے واقع سرائے نامی مقام تک پہنچا۔ اس نے لشکر کو اپنے لڑکوں اور سرداروں کے ہمراہ قندوز کی جانب روانہ کر دیا۔ وہ وہاں پہنچے مگر جنگ نہ ہوئی اور وہ بزدل (ورق ۱۳۵) کاہل الوجود انسان فرار بھی نہ ہو سکا۔ حمزہ سلطان کے آدمی اس کے سر پر پہنچ گئے۔ اس کے بھانجے احمد قاسم، شیرم اور اس کے بعض عمدہ جوانوں کو قندوز لے جا کر وہاں قتل کر دیا۔ خسرو شاہ کی بھی گردن ماردی گئی اور اس کے سر کو شیبانی خان کے پاس خوارزم بھیج دیا گیا۔

خسرو شاہ نے جو کہا تھا وہی وقوع پذیر ہوا۔ جیسے ہی وہ قندوز کے گردونواح میں پہنچا اس کے نوکر چاکر جو میرے ہمراہ تھے اپنے رویئے میں یکسر بدل گئے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر کوچ کر کے خواجہ رواج نامی مقام اور اس کے مضافات میں چلے گئے۔ میرے ساتھ بیشتر وہی لوگ تھے جو کبھی اس کے نوکر چاکر رہ چکے تھے۔ مغل ہی اچھے تھے کہ میرے ہمدم رہے۔ جیسے ہی خسرو شاہ کے قتل کی اطلاع انھیں ملی ان کا جوش اس طرح سرد پڑ گیا گویا کسی نے آگ پر پانی چھڑک دیا ہو۔

واقعات ۹۱۱ھ

(۴ جون ۱۵۰۵ء - ۲۴ مئی ۱۵۰۶ء)

والدہ کی رحلت:۔ اس سال میری والدہ قتلق نگار خانم کو خسرہ[1] کا عارضہ ہوا۔ فصد کھولی گئی جو ناقص ثابت ہوئی۔ خراسان کا ایک طبیب وہاں موجود تھا جسے سیّد طبیب کہتے تھے اس کی تجویز پر تربوز دیا گیا۔ چونکہ موت کا وقت آن پہنچا تھا اس لئے چھ روز بعد ہفتے کے دن غریق رحمت ایزدی ہوئیں۔ مرزا الغ بیگ نے پہاڑ کے دامن پر ایک باغ کی تعمیر کرائی تھی، اس کا نام باغ نوروز تھا۔ اس باغ کے وارثوں کی اجازت سے اتوار کے دن ان کے جسد کو یہاں لایا گیا اور قاسم جان کی مدد سے میں نے انھیں یہاں سپرد خاک کیا۔ میں اپنی والدہ کے غم میں سوگوار ہی تھا کہ اپنے چھوٹے خاں دادا الچہ خاں اور نانی ایس دولت بیگم کے مرنے کی خبر مجھے سنائی گئی۔ میری والدہ کے چہلم کی تاریخ نزدیک آ چکی تھی، اسی اثنا میں خاں سرداروں کی والدہ شاہ بیگم، میری خالہ، سلطان احمد مرزا کی حرم مہر نگار خانم اور محمد حسین دوغلت خراسان سے آن پہنچے سوگواری کا زخم ایک بار پھر ہرا ہو گیا۔ آتش فراق کے شعلوں کی حد نہ رہی سوگواری کی رسومات ادا کرنے کے لئے فقرا و مساکین کو کھانا کھلایا گیا۔ قرآن مجید کے ختم کئے گئے۔ متوفی کی روح کو ثواب پہنچایا گیا۔ ان رسومات سے فارغ ہوئے اور سیاہ ماتمی لباس اتار دینے کے بعد باقی چغانیان کے سخت اصرار پر ہم اپنے لشکر کے ہمراہ قندھار کی جانب روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر قوش نادر نامی سبزہ زار میں قیام پذیر ہوئے۔ یہاں میں بخار میں مبتلا ہو گیا، عجیب طرح کی غفلت مجھ پر طاری تھی۔ ہر چند مجھے بیدار کرنے کی کوشش کی گئی لیکن جیسے ہی آنکھ کھلتی فوراً ہی نیند آ جاتی۔ پانچ، چھ دن بعد مجموعی طور پر ذرا طبیعت بہتر ہوئی۔[2]

اس اثنا میں ایسا شدید زلزلہ آیا کہ پہاڑ کی بلندیوں پر بنے قلعوں کی فصیلیں اور شہر و دیہات میں سے اکثر مکانات زمین بوس ہو گئے۔ ان کے مکین بام و در کے نیچے دب کر مر گئے۔ پغمان گاؤں میں تو ایک بھی گھر سالم نہ بچا۔ اس گاؤں کے ستر اسی آدمی اپنے گھر کے ساز و سامان کے ساتھ گھروں کے نیچے دب کر مر گئے۔ پمغان اور بیگ توت کے درمیان اتنا وسیع قطعۂ ارض کے جہاں تک پتھر پھینکا جا سکتا ہو زمین کے اندر ایک تیر کی پہنچ کے برابر دھنس گیا۔

جس جگہ قطعۂ زمین پھٹا تھا وہاں سے کئی چشمے ابلنے لگے۔ استرغچ سے میدان تک تقریباً چھ سات فرسنگ کا فاصلہ ہوگا، اس رقبے کی زمین ایسی زیر و زبر ہو گئی اور اس میں ایسے شگاف پیدا ہو گئے کہ کہیں ہاتھی برابر ٹیلے بن گئے اور کہیں ایسے گڑھے پڑ گئے کہ ہاتھی اس میں سما جائے۔ کچھ جگہوں پر تو شگاف ایسے بڑے بڑے تھے جن سے آدمی گھس کر نکل آئے۔ جس وقت زلزلہ آیا تھا تو تمام پہاڑوں کی چوٹیوں پر گرد و خاک اڑنے لگی تھی۔ اس وقت نور اللہ طبلہ نواز میرے سامنے طبلہ بجا رہا تھا اس کے ساتھ دوسرا ساز ندہ بھی تھا وہ اس وقت دونوں ساز اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے تھا (ورق ۱۳۶) اس وقت وہ ایسا بے قابو ہوا کہ دونوں ساز ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ الغ بیگ مرزا نے تیپہ نامی مقام پر کچھ محلات تعمیر کرائے تھے۔ جہانگیر مرزا اس کی بالائی منزل کے ایک ایوان میں تھا۔ جیسے ہی زلزلہ آیا وہ نیچے کود گیا خدا نے خیر کی اور وہ ہر گزند سے محفوظ رہا۔ اس کے مقربین میں سے ایک شخص اسی بالائی منزل پر تھا، چھت گری اور وہ نیچے دب گیا۔ تیپہ کے اکثر مکانات زمین بوس ہو گئے۔ اس دن تینتیس ۳۳ مرتبہ زمین کو جھٹکے لگے۔[3] ایک ماہ تک ہر دن اور رات کے دوران ایک دو مرتبہ جھٹکے لگتے رہے۔ قلعے کی دیوار اور اس کے برج میں جو شکست و ریخت پیدا ہو گئی تھی اس کی مرمت کے لئے امرا اور سپاہ کو حکم دے دیا

۱۔ بابر نے لفظ خصبہ استعمال کیا ہے جو عام طور پر خسرہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسرے مختلف امراض میں بھی بخار کے ساتھ دانے نکل آتے ہیں لیکن عام خسرہ ہی ہے۔ پرانے زمانے کے حکما کا خیال تھا کہ یہ بدن کی حدت کی نشانی ہے اس لئے فصد کھول کر حدت کو کم کیا جاتا تھا اور تربوز بھی ان کے خیال میں اسی گرمی کو کم کرنے اور ٹھنڈک پہنچانے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔

۲۔ یہ بخار کی شدت کا نتیجہ ہوگا کہ نیند کا غلبہ تھا۔ پانچ چھ دن میں صحت یاب ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ وائرس کی وجہ سے تھا۔

۳۔ برصغیر ہند و پاکستان ارضیاتی تاریخ کے لحاظ سے براعظم ایشیا کے اندر دھنس رہا ہے۔ ان دو ٹکڑوں کے تصادم ہی کی وجہ سے یہاں زمین کا سب سے اونچا ابھار کوہ ہمالیہ ہے۔ پورا افغانستان پاکستان اور وسط ایشیا اسی طبقات الارض کے تقص کی وجہ سے زلزلہ سے عام طور پر متاثر ہیں نومبر ۱۹۷۵ء میں راقم کوئٹہ میں تھا۔ ایک رات میں ۱۸ زلزلے کے جھٹکے آئے اور پھر کئی دن تک آتے رہے۔

۴۔ تیر و ترکش گلے میں لٹکا کر آنا ترکوں میں شکست تسلیم کرنے کی نشانی اور اطاعت کا اظہار ہے۔

گیا کہ ان کی درستی کریں۔ بیس دن یا ایک ماہ کی مسلسل کوشش کے بعد قلعے کی شکست و ریخت کو مکمل کیا گیا اور اس کی دیواریں مرمت کر دی گئیں۔

کلات (غلزئی) کی فتح

بیماری، غنودگی اور لرزش زمین کی وجہ سے قندہار کی طرف جانے کا ارادہ کچھ عرصے کے لئے ملتوی ہو گیا۔ غنودگی سے نجات پا کر اور قلعے کو درست کرنے کے بعد قندہار کی طرف جانے کا عزم از سر نو مصمم ہو گیا لیکن یہ فیصلہ کرنا باقی تھا کہ قندھار کی جانب رخ کیا جائے یا ابھی کوہ پیمائی اور صحرا نوردی کی جائے۔ جس وقت ہم شنیز نامی جگہ پر قیام پذیر ہوئے تو جہانگیر مرزا اور دیگر امرا کو جمع کر کے ان سے مشورہ طلب کیا گیا متفقہ فیصلہ کلات پر ہوا۔ جہانگیر مرزا اور باقی چغانیان اس مہم کے لئے کوشاں تھے۔ جس وقت ہم پاری نامی مقام پر پہنچے تو ہمیں اطلاع ملی کہ علی شیر چہرہ، کچیک باقی اور چند اور لوگ فرار ہونے کی فکر میں ہیں، انھیں گرفتار کیا گیا۔ شیر علی چہرہ نے میری ہدایت میں رہتے ہوئے، اس کے باہر (کابل میں اور ماوراءالنہر میں ایسا کون سا فتنہ و فساد نہ تھا جو برپا نہ کیا ہو۔) چنانچہ وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔ دیگر لوگوں کو ان کے گھوڑوں اور ہتھیاروں سے محروم کر کے چھوڑ دیا گیا۔

جس وقت ہم کلات پہنچے میں تو ہمارے پاس جنگ کا ساز و سامان نہ تھا مگر اس کے باوجود ہم نے وہاں پہنچتے ہی یورش شروع کر دی۔ بڑا زبردست معرکہ ہوا۔ خواجہ کلاں کا بڑا بھائی کچیک بیگ بڑا دلیر جوان مرد تھا۔ وہ کئی مرتبہ میرے سامنے اپنی شمشیر کے جوہر دکھا چکا تھا چنانچہ، اس کا ذکر ان تاریخی واقعات میں گزر چکا ہے۔ قلات کی جنوبی جانب جو برج تھا اس پر اس نے اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ قریب تھا کہ وہ اس کے اوپر پہنچ جائے کہ کسی نے اس کی آنکھ کو تیر کا نشانہ بنایا۔ جب کلات کا قلعہ فتح ہو گیا تو ایک دو دن بعد وہ اسی زخم کی شدت کے باعث اس دنیا سے رخصت ہوا۔ کچیک باقی دیوانہ جو شیر علی کے ساتھ سازش میں شریک تھا، نے اپنے کئے کی سزا یہاں پائی۔ جس وقت وہ دروازے سے نکل کر باہر آیا اور فصیل کے نیچے پہنچا تو اس کے اوپر پتھر گرا اور وہ وہیں ختم ہو گیا۔ اس کے ساتھ ایک دو لوگ اور بھی مرے۔ ظہر کی نماز کے وقت تک جنگ بدستور ہوتی رہی، جوان زور آزمائی کرتے رہے۔ اس وقت تک ان کے ہاتھ پیر شل ہو چکے تھے، اسی اثنا میں قلعے میں محصور لوگوں نے پناہ مانگی اور قلعہ ہمارے حوالے کر دیا۔ ذوالنون ارغون نے کلات کو مقیم کے سپرد کر دیا تھا۔ اس کے نوکروں میں سے فرخ ارغون اور قرا بلوت کلات میں ہی تھے۔ وہ ترکش اور تلواریں اپنی گردنوں میں لٹکا کر قلعے سے نکل آئے۔[۴] ان کے قصور معاف کر دیئے گئے۔ کیوں کہ میرا ہرگز یہ ارادہ نہ تھا کہ اس سطح کے لوگوں کو پریشان کیا جائے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ازبک جیسا قوی دشمن ہمارے پہلو میں گھات لگائے کھڑا تھا۔ اگر ہم ان کے ساتھ بدسلوکی کرتے تو دور و نزدیک کے دیکھنے اور سننے والے ہمارے بارے میں کیا کیا باتیں نہ بناتے۔ (ورق ۱۴۷) یہ مہم چونکہ جہانگیر مرزا اور باقی بیگ کی سعی و کوشش سے سر ہوئی تھی اسی لئے کلات کی نگہداری جہانگیر مرزا کے سپرد کی گئی۔ مگر اس نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ باقی بیگ نے بھی اس ضمن میں کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ چنانچہ ہماری اس قدر زور آزمائی اور جنگ گیری بے فائدہ ثابت ہوئی۔

ہم کلات سے جنوب کی جانب روانہ ہوئے سوار سنگ اور الاتاغ کے گرد و نواح میں مقیم افغانوں کو تاخت و تاراج کرتے ہوئے ہم کابل پہنچ گئے۔

جس رات ہم کابل میں قیام پذیر ہوئے اسی رات میں قلعے میں گیا۔ میرا خیمہ اور طویلہ چار باغ میں تھا۔ ایک خرلجی چور وہاں داخل ہوا اور میرا سرخ گھوڑا اور خنجر خاص چرا کر لے گیا۔

باقی چغانیانی کا حشر

آمو دریا کے کنارے جب سے میرا اور باقی چغانیان کا ساتھ ہوا اس وقت سے کسی کو بھی میں نے اس سے زیادہ بااعتبار اور صاحب اختیار نہ پایا۔ جو بات وہ کہتا اور جو کام بھی وہ انجام دیتا اس میں اسی کی بات چلتی اور وہ اسی کا کارنامہ ہوتا۔ اگر چہ اس نے کوئی شائستہ خدمت انجام نہیں دی اور کوئی ایسا کام نہیں کیا جو انسانیت وشرافت پر مبنی ہو بلکہ اس سے انواع واقسام کی گستاخیاں اور بدکرداری کے افعال سرزد ہوتے رہے۔ وہ نہایت خسیس، ورزبان، حاسد، کینہ پرور، دوسروں کا بدخواہ اور کج خلق انسان تھا۔ کنجوس تو وہ ایسا تھا کہ جب اس نے ترمذ کو خیر باد کہا اور اپنے اہل وعیال اور مال ودولت کے ساتھ میرے ہمراہ ہوا تو اس وقت اس کے پاس اپنی تیس چالیس ہزار بھیڑیں تھیں جو ہر منزل پر میرے سامنے سے گزرتی تھیں لیکن اس کے باوجود کہ ہمارے جوان اور ملازمین بھوک سے نڈھال ہوتے اور وہ انھیں ایک بھیڑ تک دینے کو تیار نہ ہوتا۔ آخر میں اس وقت جب کہ ہم کہمرد کی طرف روانہ ہوئے تو اس نے پچاس بھیڑیں دی تھیں۔ اگر چہ اس نے مجھے بادشاہ تسلیم کر لیا تھا مگر اس کے باوجود (ورق ۱۳۷) اس کے دروازے پر نوبت بجتی۔ اس کا دل کسی سے بھی صاف نہ تھا۔ اور کسی کو اپنا ہم پلہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ کابل میں جو محصول اسے ملتا حاصل وہ چنگی کی بدولت تھا، یہ اس کی آمدنی کی ایک مد تھی کابل، پنجشیر، ہزارہ کوشلک کی داروغگی اس سے علیحدہ تھی۔ اندرون خانہ تمام اختیارات اس کے ہاتھ میں تھے۔ اس قدر انعام واکرام اور عنایات کے باوجود وہ مطمئن نہ تھا اور نا ہی شکر گزار۔ اس نے میری تباہی وبربادی کے لئے جو بھی منصوبے تیار کئے اس کا ذکر اوپر آچکا ہے مگر میں کبھی انہیں اپنے دل میں نہ لایا اور انھیں کبھی اس کے منہ پر نہ جتایا وہ ہمیشہ فخر وناز کرتا رہتا اور چھٹی کا طالب رہتا۔ اس کے ناز اٹھائے جاتے اور معذرت کے ساتھ اسے چھٹی پر جانے سے منع کر دیا جاتا ایک دو روز تک وہ کہتا سنتا رہتا۔ پھر ایک دو روز بعد آجاتا اور چھٹی مانگنے لگتا۔ چھٹی مانگتے مانگتے اس کا اصرار جب حد سے گزر گیا۔ تو ہم بھی اس کے رویئے اور کردار سے تنگ آگئے۔ چنانچہ اس کو چھٹی دے دی گئی۔ اب چھٹی مانگنے پر وہ خود شرمندہ وپشیمان ہوا۔ وہ گریہ وزاری پر اتر آیا۔ جس کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے یہ زبانی پیغام بھجوایا کہ آپ نے یہ شرط رکھی تھی کہ جب تک مجھ سے قصور سرزد نہ ہوں گے مجھ سے باز پرس نہ کی جائے گی۔ میں نے ملا بابا کو اس کے ایک ایک کر کے گیارہ قصور گنوائے اور جب وہ ملا کے ذہن نشین ہو گئے تو میں نے ملا کو اس کے پاس قصور شماری کے لئے بھیجا جن کا اس نے اقرار کیا۔ اسے اس کے اہل وعیال کے ساتھ ہندستان جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کے چند نوکر اس کے ساتھ خیبر تک گئے اور اس وہاں چھوڑ کر خود واپس آگئے۔ باقی کا کیانی [5] کے کاروان کے ساتھ اس نے دریائے سندھ پار کیا۔

اس وقت دریا خاں کا لڑ کا یار حسین کچکوٹ [6] کا فرمانروا تھا۔ وہ فرمان جو اس نے مجھ سے کوہاٹ میں لیا تھا اسے وہ بطور سند استعمال کرتا تھا۔ اس نے ایک طرف دلہ ذاک اور یوسف زئی افغانوں کے دستے کو اپنا ہموا کیا (ورق ۱۳۸) تو دوسری طرف جاٹوں اور گوجروں سے ساز و باز کر کے کسی کو دوست بنایا اور کسی کو ملازم رکھ لیا۔ اس کا کام ہی تاخت وتاراج اور راہزنی تھا۔ اسے جب باقی کے بارے میں خبر ملی تو اس نے باقی کی ناکہ بندی کر دی۔ نیز اس کے تمام ساتھیوں کو چن چن کر قتل کروا دیا اور اس کی زوجہ کو اپنے تحت تصرف لے آیا۔ اگر چہ ہم نے باقی کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا تھا مگر اس کا کیا خود اس کے آگے آیا اور اس نے اپنے کئے کی سزا پائی۔

تو بد کننده خودرا به روزگار سپار
که روزگار ترا چاکر هست کینه گذار

(جو شخص تیرے ساتھ برائی کرے، تو اسے وقت کے حوالے کر دے۔ کیوں کہ وقت تیرا وہ نوکر ہے جو خود ہی اس کا بدلہ لے گا۔)

۵۔ باقی کا کیانی۔ باقی گلیا کے لئے دیکھیں ۹۱۰ کے حالات میں نوٹ ۶۲۔

۶۔ کچکوٹ۔ حسن ابدال کے پاس ہے

ہزارہ کی سرزنش

اس مرتبہ موسم سرما میں ایک دو بار برف گرنے تک ہم چہار باغ ہی میں مقیم رہے۔ہم جب سے کابل میں قیام پذیر ہوئے تھے اس وقت تک ہزارہ وترکمان مختلف قسم کی گستاخیوں اور واقعات راہزنی کے مرتکب ہو چکے تھے ہم نے ان کی سرکوبی کا ارادہ کیا۔الغ بیگ مرزا نے شہر میں بستان سرائے نامی عمارت بنوائی تھی، ہم اس میں داخل ہوئے۔اور وہاں سے ماہ شعبان میں ہزارہ ترکمانوں کی سرکوبی کے لئے سوار ہوئے۔درّہ خویش کے دہانے پر واقع جنگلک نامی مقام پر ہم نے یورش کی۔درّہ خویش کے نزدیک ایک غار میں کچھ ہزارہ چھپے ہوئے تھے۔شیخ درویش کوکلتاش اکثر و بیشتر قتل وغارت گری کے معرکوں میں میرے ساتھ رہ چکا تھا، وہ قوربیگی کے منصب پر فائز تھا۔کمان کو پوری طاقت سے کھینچتا اور بہت عمدہ تیراندازی کرتا تھا۔وہ اس غار کے دہانے پر انجانے میں اندر تک پہنچ گیا۔وہاں سے ایک ہزارہ نے اس کے سینے کو تیر کا نشانہ بنایا۔تیر نوک پستان پر لگا جس کے باعث اسی دن اس کا انتقال ہو گیا۔بیشتر ہزارہ موسم سرما درّہ خویش میں گزار رہے تھے۔چنانچہ ہم نے ان کی جانب رخ کیا۔درّہ خویش کچھ عجب طرح کا درہ ہے، اس کے دہانے سے تقریباً نیم کروہ تک اندر کی طرف تنگ راستہ چلا گیا ہے جس کا راستہ کمر کوہ پر واقع ہے۔راستے سے ذرا نیچے پچاس ساٹھ گز کی سیدھی ڈھلان ہے، اوپر بھی ذرا بلندی پر اس میں داخل ہونے کے لئے راہ موجود ہے۔ایک گھڑسوار بیک وقت اس میں سے گزر سکتا ہے ہم اس تنگ راستے سے گزرتے رہے۔ظہر وعصر کی نماز کے درمیانی وقت تک ہمیں کوئی انسان یہاں نظر نہ آیا۔ ایک جگہ ہم نے قیام کیا۔ہزارہ کا ایک فربہ اونٹ نظر آیا جسے ہمارے آدمی پکڑ لائے اسے ذبح کیا اس کے گوشت کو بھون کر کباب بنائے اور کچھ گوشت کو تنگ منہ کی دیگچی میں پکایا۔اس قدر خوش ذائقہ گوشت میں نے کبھی نہیں کھایا تھا۔کچھ لوگ تو اس کے گوشت میں اور بھیڑ کے گوشت میں تمیز نہیں کر سکے۔

اگلے دن صبح ہم وہاں سے روانہ ہوئے اور اس جانب رخ کیا جہاں ہزارہ قبیلے کے لوگ موسم سرما گزار رہے تھے۔ایک پہر وقت گزرا تھا کہ سامنے سے ایک شخص آتا ہوا نظر آیا اور اس نے بتایا کہ ہزارہ نے ایک تنگ درّے میں درختوں کے تنوں سے ناکہ بندی کر دی ہے۔ہمارے آدمیوں کو انہوں نے پکڑ لیا ہے اور ان کے ساتھ وہ نبرد آزما ہیں یہ خبر پاتے ہی ہم نے اپنی رفتار تیز کر دی اور وہاں پہنچ گئے جہاں ہزارہ اپنے گھوڑوں سے اتر کر جنگ کر رہے تھے۔اس سال موسم سرما میں برف باری بہت زیادہ ہوئی تھی۔اصل راستے سے ہٹ کر چلنا قطعی دشوار تھا۔کھڑے پانی کے جتنے بھی تالاب تھے ان کے کناروں پر برف جم کر یخ ہوگئی تھی۔اس یخ اور برف کے باعث پانی کو گھاٹوں کے علاوہ کسی اور جگہ سے عبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔پانی کی گزرگاہ کو ہزارہ نے درخت کاٹ کر ان کے تنوں سے مسدود کر دیا تھا اور خود ان تالابوں کے کنارے پیادہ وسوار تیروں سے ہم پر یورش کر رہے تھے۔

محمد علی مبشر بیگ کے ساتھ میں نے حال ہی میں مراعات کی تھیں، وہ واقعی بڑا ہی دلیر جوان تھا اور اس قابل تھا کہ اس کے ساتھ رعایت کا سلوک کیا جائے (ورق ۱۳۹) اگرچہ اس کے پاس زرہ بکتر نہ تھا مگر اس کے باوجود وہ اس جگہ سے آگے پہنچ گیا جہاں درختوں کے تنوں سے بندش کر دی گئی تھی۔تیر اس کی گردن پر آ کر لگا جس کے باعث اس نے وہیں جان دے دی۔چونکہ ہم بہت جلدی میں آئے تھے اسی لئے اکثر کے پاس زرہ بکتر نہ تھا۔ایک دو تیر آتے اور ہمارے پاس سے گزر کر زمین میں گر جاتے۔احمد یوسف بیگ اس وقت بہت مضطرب و پریشان تھا وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ تم غیر مسلح چلے جا رہے ہو میں نے دو تین تیر تمہارے سروں پر سے گزرتے ہوئے دیکھے ہیں۔میں نے اس سے کہا کہ "ہمت سے کام لو" ایسے تیر تو میرے سر پر سے بہت گزر چکے ہیں۔اتنے میں میری دائیں جانب سے قاسم بیگ اپنے پورے ساز و اسلحہ کے ساتھ دریا پار کر کے اس طرف پہنچ گیا۔اس نے

جیسے ہی اپنا گھوڑا دوڑایا ہزارہ اس کی تاب نہ لا سکے اور فرار ہو گئے۔ وہ دستہ جوان کے ساتھ آیا مگر ان کے فرار کے وقت پیچھے رہ گیا اس کو گھوڑوں پر سے اتار لیا گیا۔ اس کے بعد وہ پیدل ان کے پیچھے روانہ ہو گئے۔

قاسم بیگ کو اس کے اس کام کے باعث بنگش کا علاقہ دے دیا گیا۔ اس یورش میں حاتم بیگ کا اقدام بھی برا نہ تھا۔ شیخ درویش کو کلد اش کا منصب قوربیگی اسے عطا کر دیا گیا۔ کیپک قلی بابا نے بھی اپنی جگہ خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اسی لئے محمد علی مبشر کا عہدہ اسے تفویض کر دیا گیا۔

سلطان علی چناق ہزارہ کا تعاقب کر رہا تھا لیکن برف باری کے باعث اسے راستہ نہیں مل رہا تھا۔ میں بھی ان جوانوں کے ہمراہ روانہ ہوا۔ ہزارہ کے موسم سرما کی قیام گاہوں کے نزدیک ہمیں بھیڑوں کے ریوڑ اور گھوڑوں کے گلّے نظر آئے چنانچہ چار سو پانچ سو بھیڑیں اور بیس پچیس گھوڑے تو خود میں نے ہی گھیرے اس وقت سلطان علی اور دیگر دو تین آدمی قریب ہی تھے۔ اس طرح کی یورش میں پہلے بھی دو مرتبہ کر چکا ہوں۔ ان میں سے ایک تو یہی تھی۔ اس سے قبل یورش میں نے اس وقت کی تھی جب ہم خراسان سے واپس آ رہے تھے اور ان ہی ترکمان ہزارہ پر حملہ آور ہوئے تھے اور بہت سے گھوڑے نیز بھیڑیں اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ ہزارہ خاندانوں کے اہل و عیال خورد و کلاں پا پیادہ برف کی پشتوں پر چڑھ گئے اور وہاں جا کر انہوں نے پناہ لی۔ ہم نے کچھ تو تساہل سے کام لیا اور کچھ دن بھی ڈھلتا جا رہا تھا ہم واپس آئے اور ہزارہ کی پناہ گاہوں میں قیام پذیر ہوئے۔ اس سال برف باری کثرت سے ہوئی۔ اس جگہ عام راستے سے ہٹ کر برف اتنی زیادہ تھی کہ گھوڑوں کی رکاب تک پہنچی تھی۔ رات کے وقت جو دستہ گشت پر گیا تھا وہ صبح تک گھوڑوں پر ہی سوار رہا۔

اگلے دن صبح ہم واپس آئے۔ رات کے وقت ہم درۂ خویش میں ہزارہ کے موسم سرما کی قیام گاہوں میں مقیم رہے تھے۔ وہاں سے کوچ کر کے ہم جنگلک میں قیام پذیر ہوئے۔ یارک طغائی اور بعض دوسرے لوگ جو ذرا پیچھے رہ گئے تھے انھیں حکم دیا گیا کہ وہ ان ہزارہ قبیلے کے افراد کو گرفتار کر کے لائیں جنھوں نے شیخ درویش کو قتل کیا تھا۔ وہ بد بخت جن کے سروں پر موت کھیل رہی تھی ابھی غاروں میں ہی تھے کہ انھیں نرغے میں لے لیا اور ستر اسی افراد کو پکڑ لائے۔ ان میں بیشتر لوگوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

ہزارہ کی یورش سے فارغ ہونے کے بعد ہم ای تو غدی نامی مقام کے نواح میں آب باران کے انتہائی کنارے پر نجراو سے محصول لینے کے لئے پہنچے۔ جس وقت ہم آی تو غدی کے نواح میں تھے تو غزنی سے آ کر جہانگیر مرزا میری خدمت میں حاضر ہوا۔ اسی اثنا میں ماہ رمضان کی تیرہ تاریخ کو میں عرق النسا[8] کی شدید تکلیف میں مبتلا ہو گیا۔ (ورق ۱۴۰) چالیس دن تک میری یہ حالت رہی کہ مجھے ایک پہلو سے دوسرے پہلو پر لٹا جاتا رہا۔

نجراو سے خراج

نجراو کے درّوں میں درہ پیچخان رقبے کے اعتبار سے دیگر تمام درّوں کے مقابل زیادہ بڑا ہے۔ حسین غنی آغا اور اس کے برادر خورد کا سرکشی و ناادائیگی وخست کے بارے میں شہرہ تھا۔ جہانگیر مرزا کو سردار لشکر مقرر کر کے اس طرف روانہ کیا گیا۔ قاسم بیگ بھی گیا۔ لشکر وہاں تک پہنچ گیا جہاں انہوں نے مورچہ بندی کر رکھی تھی جسے پوری قوت کے ساتھ توڑ دیا گیا۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو ان کے کیئے کی سزا دی گئی۔

میں چوں کہ عرق النسا میں مبتلا تھا اس لئے ڈولے جیسی ایک چیز بنائی گئی تھی۔ جس میں مجھے آب باران کے کنارے سے شہر تک لا کر بستان سرائے میں پہنچا دیا گیا۔ چنانچہ اس موسم سرما کے چند روز میں نے اسی بستان سرائے میں گزارے۔ اس بیماری سے میں نے ابھی پوری طرح نجات نہیں پائی تھی کہ دائیں گال پر پھوڑا[9] نکل آیا۔ جس پر نشتر کا عمل کیا گیا۔ اس بیماری کی وجہ سے مجھے مسہل[10] بھی لینا پڑا اور جب صحت یاب ہو گیا تو چار باغ آیا۔

۸۔ عرق النسا۔ انتہائی شدید اور تڑپا دینے والا درد۔ کمر سے اٹھ کر کولہے اور ٹانگ سے ہوتا ہوا پاؤں تک جاتا ہے۔ اس کی وجہ اعصاب کا کمر میں دب جانا ہے۔

۹۔ پھوڑے میں شگاف لگا کر پیپ کو نکالا گیا۔

۱۰۔ مسہل۔ پرانی طبی سوچ کے مطابق پھوڑے جسم کی گرمی سے ہوتے ہیں۔ اس کو کم کرنے کے لئے جلاب لیا جاتا تھا۔

جہانگیر مرزا کی بے راہ روی

جہانگیر مرزا میری خدمت میں حاضر ہوا۔ ایوّب مرزا کے لڑکے یوسف اور بہلول کی فتنہ وشرانگیزی کی وجہ سے اس مرتبہ جہانگیر مرزا پہلے جیسا نہ تھا۔ چند روز بعد اس نے ان پشتوں سے کوچ کیا اور مسلح ہو کر تیز رفتاری سے غزنی پہنچ گیا۔ قلعۂ نانی پر قبضہ کر کے اس نے چند آدمیوں کو قتل کیا قلعے کو تاخت وتاراج کر ڈالا۔ خورد وکلاں جو بھی وہاں موجود تھے انہیں اس نے کوچ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور ہزارہ قبیلے کے درمیان سے گزر کر اس نے بامیان کی جانب رخ کیا۔

خداوند تعالیٰ پر یہ روشن وعیاں ہے کہ میں نے اور ان لوگوں نے جو مجھ سے وابستہ ہیں، کبھی کوئی ایسا اقدام نہ کیا اور کبھی ایسی بات نہیں کہی جس کے باعث اس قدر کدورت اور رنجش پیدا ہوئی۔ یہ سننے میں آیا کہ چند باتیں ایسی پیش آئیں جن کے باعث اس نے یہ روّیہ اختیار کیا۔ وہ باتیں یہ ہیں جس وقت وہ غزنی سے روانہ ہوا تو قاسم بیگ اور اقربا اس کی پیشوائی کے لئے آئے۔ اس وقت مرزا نے اپنے باز کو پودنے پر لپکایا جس وقت باز اپنے چنگل پودنے پر گاڑنا ہی چاہتا تھا کہ پودنہ زمین پر آگرا۔ اس پر اس نے باآواز بلند پوچھا "شکار پکڑا گیا یا نہیں؟ اس پر قاسم بیگ نے کہا کہ جس وقت دشمن کمزور ہو تو وہ کیوں گرفت میں نہیں آئے گا۔ اسے تو پکڑا ہی جانا چاہیے"۔ یہی وہ باتیں تھیں جنھوں نے عداوت کا بیج بویا۔ اور یہی اس کی کنارکشی کا سبب ہوا۔ اس کے علاوہ اور بھی ایک دو اس سے بھی زیادہ ناپسندیدہ سخت سست باتیں سنی گئیں۔ غزنی کو تباہی وبربادی کے حال پر پہنچانے کے بعد وہ ہزارہ کے درمیان سے گزر کر ایماق قبیلے میں چلے گئے۔ اس وقت تک یہ قبائل اگرچہ ناصر مرزا سے علیحدہ ہو چکے تھے مگر ابھی ازبکوں کے ساتھ ان کا میل نہیں ہوا تھا۔ وہ ابھی یائی، اشتراب اور ان کے گرد وانواح میں واقع سبزہ زاروں میں مقیم تھے۔

سلطان حسین مرزا کی دعوت

اسی عرصے میں سلطان حسین مرزا نے محمد شیبانی خاں کو پسپا کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ اس نے اپنے تمام لڑکوں کو بلایا اور مجھے بھی دعوت سیّد علی خواب بین کے لڑکے سیّد افضل کو بھیج کر دی۔ خراسان کی جانب رخ کرنا چند وجوہ کی بنا پر ضروری تھا۔ ان میں سے ایک وجہ یہ تھی کہ سلطان حسین مرزا جیسا عظیم الشان بادشاہ جو تیمور بیگ کے تخت سلطنت پر متمکن تھا اور اطراف وجوانب سے اس نے اپنے لڑکوں اور امرا کو اپنے پاس آنے کی دعوت دی۔ جب شیبانی خاں دشمن (ورق ۱۴۱) پر یورش کرنا مقصود ہو تو اس وقت دوسرے لوگ اگر پیروں سے چل کر جاتے تو ہمیں تو سر کے بل جانا ہی تھا۔ اگر لوگ اپنے ساتھ لاٹھیاں لے کر چلتے تو ہم پتھر اپنے ساتھ لے کر جاتے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ چونکہ جہانگیر مرزا کے دل میں کدورت پیدا ہو گئی تھی اور وہ بدی پر اتر آیا تھا اس لئے یا تو اس کی کدورت کو دور کرنا یا اس کے مضر اثرات کا سدِّ باب کرنا ضروری تھا۔

اسی سال شیبانی خاں نے حسین صوفی کا خوارزم میں گزشتہ دس ماہ سے محاصرہ کر رکھا تھا۔ اس محاصرے کے دوران بہت سی جنگیں وقوع پذیر ہوئیں۔ خوارزم کے جوانوں نے بڑی دلیری وجوانمردی دکھائی، وہ کچھ اس طرح تیر اندازی کرتے تھے کہ بارہا تیر سروں پر سے گزر گئے۔ زرہ بکتر میں پیوست ہو گئے تو اسے پارہ پارہ کر دیا۔ اور کبھی کبھی تو دوہری تہ کے زرہ بکتروں کے انہوں نے پرخچے اڑا دیئے۔ اس حالت میں جب کہ انہیں کہیں سے کسی مدد کی توقع تک نہ تھی دس ماہ تک پامردی سے ناکہ بندی کا مقابلہ کیا۔ اس کے بعد زبوں وناتواں لوگوں نے بددل ہو کر ازبکوں کے ساتھ گفتگو شروع کی اور انہیں قلعہ پر چڑھا لیا۔ جب حسین صوفی کو اس امر کی اطلاع ملی تو وہ خود ہی قلعے کے اوپر پہنچ گیا۔ جو قلعے پر چڑھ آئے تھے جس وقت انہیں مار مار کر نیچے اتار رہا تھا کے اس

۱۱۔ یوسف اور بہلول جو جہانگیر مرزا کے قریب تھے، کے طرزِ عمل کے پیش نظر اس جملے کو غلط معنوں میں لیا گیا کہ ان کے دن قریب ہیں۔

سلطان حسین مرزا بادشاہ ہرات اور امیر شیر علی نوائی دو دوست وفادار

کے ہی کسی آدمی نے اس کی پیٹھ پر تیر کا وار کیا، جس کے باعث وہ وہیں مر گیا اب جب کہ کوئی نبرد آزما مرد ہی باقی نہیں رہ گیا تھا تو ازبکوں نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ خدا حسین صوفی پر اپنی رحمت نازل کرے مردانگی سے جان دینے میں اس نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔

شیبانی خاں نے خوارزم کو کوپک بہ کے حوالے کر دیا۔ اور خود سمرقند کی طرف چلا گیا۔ اسی سال ماہ ذی الحجہ میں سلطان حسین مرزا شیبانی خاں پر لشکر کشی کرتے ہوئے بابا الہٰی نامی مقام پر رحمت ایزدی سے جاملا۔

سلطان حسین مرزا

ان کی ولادت ۸۴۲ھ کے دوران شاہرخ کے عہد حکومت میں ہرات میں ہوئی تھی۔ ان کا سلسلہ یہ ہے: سلطان حسین مرزا ابن منصور ابن بیقرا ابن عمر شیخ بن امیر تیمور۔ منصور مرزا اور بیقرار مرزا کو کبھی نعمت سلطنت نصیب نہ ہوئی۔ ان کی والدہ فیروزہ بیگم تیمور بیگ کی پوتی تھیں۔ سلطان حسین مرزا رشتے میں میران شاہ کے نواسے بھی تھے اور اس اعتبار سے وہ نجیب الطرفین تھے۔ فیروزہ کے بطن سے دولڑکوں بیقرا مرزا اور سلطان حسین مرزا اور دولڑکیوں کی ولادت ہوئی جن میں بڑی لڑکی کا نام آکا بیگم تھا۔ دوسری لڑکی بدیع الجمال (بدکہ بیگم) کی شادی احمد خاں سے ہوئی تھی۔ سلطان حسین سے بیقرا مرزا عمر میں بڑا تھا، لیکن اس کی خدمت گزاری کیا کرتا تھا مگر دربار میں کبھی حاضر نہیں ہوتا تھا۔ البتہ دربار کے علاوہ ہر جگہ وہ دونوں ایک ہی گدے پر بیٹھا کرتے تھے۔ چھوٹے بھائی نے ولایت بلخ اسے عطا کر دی تھی۔ جہاں وہ کئی سال تک حکمران رہا۔ سلطان محمد مرزا، سلطان ویس مرزا اور سلطان سکندر مرزا اس کے تین لڑکے تھے۔ آکا بیگم مرزا کی بڑی بہن تھیں۔ ان کی شادی میراں شاہ کے پوتے سلطان احمد مرزا سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے ایک لڑکے کی ولادت ہوئی جس کا نام کچیک مرزا تھا۔ ابتدا میں وہ اپنے ماموں کی خدمت گزاری کیا کرتا تھا لیکن آخری عمر میں اس نے سپاہ گری کو ترک کر کے اپنے آپ کو مطالعات میں مشغول کر لیا۔ کہتے ہیں کہ اہل علم و دانش تھا۔ طبیعت موزوں پائی تھی اور یہ رباعی اسی کی ہے:

> عمری بصلاح می ستودم خودرا
> در شیوہ زھد می نمودم خودرا
> چون عشق آمد کدام زھد وچہ صلاح
> المنّة للہ آزمودم خودراد

(ایک عمر تک میں اپنے صلاح و تقوے پر ناز کرتا رہا میں خود کو زاہدوں کے زمرے میں شمار کرتا تھا۔ جب عشق نے آلیا تو کیا زہد اور کہاں کی صلاح خدا کا شکر ہے کہ میں نے خود کو آزمالیا)

اس رباعی میں اور ملّا جامی [۱۲] کی رباعی میں توارد واقع ہوا ہے۔ [۱۳]

آخری عمر میں طواف بیت اللہ سے بھی مشرّف ہوا تھا۔

بدکہ بیگم مرزا کی چھوٹی بہن تھیں۔ انہیں اس نے حاجی ترخاں (موجود استرخاں) کے حکمران (خاں) احمد خاں کی زوجیت میں دے دیا تھا۔ (ورق ۱۴۲) ان کے بطن سے دولڑکوں کی ولادت ہوئی، جو ہرات آگئے تھے اور کافی عرصے تک مرزا کی خدمت میں ملازم رہے۔

اس کی شکل وصورت

تیکھی آنکھیں، شیر کا سا بدن، کمر سے نیچے کا حصہ پتلا ہوتا چلا گیا تھا۔ اگر چہ عمر کافی ہو چکی تھی اور داڑھی سفید ہوگئی تھی مگر اس کے باوجود شوخ رنگ کے سرخ و سبز ریشمی لباس پسند کرتا تھا۔ بزک [۱۴] کے کھال کی چہار گوشہ

۱۲۔ ملا جامی۔ دیوان کامل جامی۔ ص ۸۰۹ رباعی ۴ (تھیکسٹن ۲۰۶ نوٹ ۱۰۲)

۱۳۔ بابر کا یہ کہنا کہ کچیک مرزا اور ملا جامی کی رباعی ایک جیسی ہیں سے تھیکسٹن نے یہ غلط فہمی پیدا کی ہے کہ اس میں سرقہ ہے۔ حالانکہ توارد تو شاعری میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔

۱۴۔ برک۔ وہ اونی کپڑا جو اونٹ کے بالوں سے بنا جاتا ہے اور سرمائی لباس مثلاً قبا وکلاہ بنانے کے کام آتا ہے (سید احمد دہلوی ص ۳۸۶)

ٹوپی یا قلپاق[15] پہنتا تھا۔ کبھی کبھی اور خاص طور پر عید کے دن چوڑی باڑھ کی تین بل دار دیدہ زیب دستار بھی سر پر لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ہما کے پر کی کلغی اس میں لگا کر نماز کو جایا کرتا تھا۔

اخلاق و اطوار

تخت نشین ہونے کے بعد پہلی مرتبہ اس کے دل میں یہ خیال گزرا کہ خطبے میں بارہ اماموں کا ذکر کیا جائے۔ بعض لوگوں نے اسے باز رکھنا چاہا۔ آخر میں اس کے تمام آداب و اطوار مذہب اہل سنت والجماعت کے مطابق ہو گئے تھے۔ چوں کہ اس کے جوڑوں میں درد رہتا تھا[16] اس لئے نماز ادا کرنے سے قاصر تھا۔ روزہ بھی نہیں رکھتا تھا۔ بولتا بہت تھا اور خوش خلق انسان تھا۔ مزاج میں ذرا تندی تھی۔ اس کی باتوں سے اس کے اخلاق کی چاشنی چھلکتی تھی۔ بعض امور میں شرعی احکامات کی سخت پابندی کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے ایک لڑکے کو اس جرم میں کہ اس نے کسی کو قتل کیا تھا وارثین مقتول کے حوالے کر دیا اور اسے دار القضا میں بھیج دیا۔

تخت سلطنت پر متمکن ہونے کے چھ سات سال تک وہ تایب رہا۔ مگر اس کے بعد شراب پینے لگا تھا۔ اس نے چالیس سال تک خراسان میں حکومت کی۔ اس عرصے میں کوئی دن ایسا نہیں گزرا جو اس نے نماز ظہر کے بعد میخواری نہ کی ہو۔ مگر اس نے صبوحی[17] کبھی نہیں پی۔ اس کے تمام لڑکے سپاہی، شہری اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ افراط سے داد عیش دیتے اور فسق و فجور میں مبتلا رہتے۔

آدمی بہادر و جری اور تلوار کا دھنی تھا۔ یہی نہیں بلکہ ایک معرکے میں تو اس نے کئی مرتبہ بڑھ کر تلوار کے وار کیے تھے۔ معلوم نہیں کہ آل تیمور میں کسی شخص نے سلطان حسین مرزا کے برابر شمشیر زنی کے جوہر دکھائے ہوں طبع موزوں پائی تھی۔ دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ ترکی زبان میں شعر کہتا اور حسینی تخلص تھا۔ اس کے اشعار برے نہیں۔ لیکن پورا دیوان ایک ہی بحر میں ہے۔ بہرصورت سن و سال اور فرمانروا ہونے کے اعتبار سے ایک عظیم حکمران تھا۔ مینڈھوں کو بچوں کی طرح پالتا تھا۔ کبوتر بازی کا بھی شوق تھا۔ مرغوں کو بھی لڑواتا تھا۔

سلطان حسین مرزا کی جنگیں

اس نے کئی مرتبہ جنگیں کیں۔ ایک مرتبہ جنگ کرتے ہوئے خود دریائے گرگان کے کنارے پانی میں کود گیا۔ پار جا کر وہاں اس نے ازبکوں کے ایک دستے کو پوری طرح زیر کر لیا۔

سلطان ابوسعید مرزا نے محمد علی بخشی کو سردار بنا کر تین ہزار فوج اس پر یلغار کرنے کے لئے روانہ کی۔ سلطان حسین مرزا کے ساتھ بس ساٹھ جوان تھے جنہوں نے بخشی پر اچانک حملہ کر دیا اور ایسی کاری ضرب لگائی کہ سب مطیع ہو گئے۔

سلطان حسین مرزا کا ایک نمایاں کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے ایک مرتبہ استر آباد میں سلطان محمود مرزا سے جنگ کی اور اس کو زیر کر لیا۔

استر آباد میں ہی حسین ترکمان کے لڑکے سعد لیق سے اس نے جنگ کی اور اسے بھی زیر کر لیا۔ تخت سلطنت پر متمکن ہونے کے بعد چناران میں اس نے یادگار محمد مرزا سے جنگ کر کے اسے بھی شکست دی۔

مرغاب کے سرپلی سے وہ یلغار کرتا ہوا آیا۔ باغ زاغان میں یادگار محمد شراب کے نشے میں مست پڑا ہوا تھا۔ اس کو اس نے وہیں زیر کر لیا۔ (ورق ۱۴۳) اس طرح اسے گرفتار کر کے اس نے خراسان کو خطرات سے بچا لیا۔

اندخود اور شبرغان کے نواح میں حکیمان نامی مقام پر اس نے سلطان محمود سے جنگ کی اس میں بھی وہ غالب رہا۔

ابا بکر مرزا نے عراق سے آق قوینلوق کے ترکمانوں کو اپنے ساتھ لیا اور النغ بیگ مرزا کو تکانہ دخمار کے

[15] ۱۵۔ قلپاق۔ ترکمان ٹوپی جو بھیڑ کی کھال سے بنتی ہے اور قراقلی ٹوپی سے میں زیادہ اونچی ہوتی ہے۔

[16] ۱۶۔ سلطان حسین مرزا کے دربار میں کئی حکیم بھی تھے۔ ہمیں جن کے متعلق معلومات ہے وہ ایک درباری طبیب بہاالدولہ ہے۔ اسکا اصلی نام محمد حسینی نور بخش تھا۔ وہ رے میں پیدا ہوا۔ اسکی ایک تصنیف خلاصۃ التجارب ہے (بہاالدولہ۔ پاکستان جرنل اوف اڈولیرنگاوجی ۱۹۸۷ء ص ۳۸)

اس نے خلاصۃ التجارب میں ذکر کیا ہے کہ ہرات میں ایک موقعہ پر سلطان حسین مرزا کو جوڑوں کا سخت درد ہوا۔ سلطان کو ضروری سفر درپیش تھا۔ اسکو ملین دوا دی گئی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ایک منزل بعد سلطان حسین مرزا نے بہاالدولہ کے استاد کو بلایا اور زیادہ زود اثر دوا کی فرمائش کی۔ اس دوا سے اسکو دست آنے شروع ہو گئے یہاں تک کہ دس پندرہ دفعہ اجابت ہوئی۔ ساتویں دفعہ کے بعد خون بھی آنے لگا۔ اس سبب طبیب پریشان ہو گئے۔ سلطان حسین کے فوجی قافلے میں ایک ہندوستانی وید بھی تھا۔ سب نے مل کر مشورہ کیا اور سلطان کو جدوار۔ ٹھنڈا قہوا، چھاج اور گھی میں پکے ہوئے نرم چاول کھلائے گئے۔ اسکے ہاتھوں اور پاؤں کی مالش کی گئی اور اس کے پیٹ پر چربی کی مالش کی گئی۔ اس طرح اسکے دست بند ہوئے اور جوڑوں کے درد سے نجات ملی (بہاالدولہ ص ۱۳۲ حواشی سی رل ایلگوڈ ص ۱۷)

[17] ۱۷۔ صبوحی۔ وہ ہے جو صبح نوش جان کی جائے۔

ساقی اٹھ لے جام صبوحی سعو کی خیر
مشتاق کب سے ہیں لب شب آفتاب کے
(نسیم دہلوی) سید احمد دہلوی۔ فرہنگ آصفیہ ۳، ۲۱۳

درمیان شکست دے کر کابل پر قبضہ کرلیا۔لیکن عراق میں شورش کے باعث وہ وہاں سے واپس چلا گیا۔خیبر سے گزر کر خوشاب وملتان کے نواح میں آیا اور وہاں سے سیوی پہنچ گیا۔اس جگہ سے اس نے کرمان کی جانب رخ کیا اور اس پر قبضہ کرلیا۔لیکن اسے اپنے تحت تصرف نہ رکھ سکا۔چنانچہ جب وہ کرمان سے ولایت خراسان کی جانب جارہا تھا تو سلطان حسین مرزا نے اچانک حملہ کیا اور اسے شکست دی۔[۱۸]

پل چراغ نامی مقام پر اس نے اپنے لڑکے بدیع الزماں مرزا کو شکست دی۔

قندز پر لشکر کشی کر کے اس پر قبضہ کرلیا لیکن اسے اپنے قبضے میں نہ رکھ سکا اور وہاں سے واپس چلا آیا۔

اس نے حصار پر بھی حملہ کیا لیکن اسے وہاں فتح نصیب نہ ہوئی چنانچہ وہاں سے بھی واپس آ گیا۔

ایک مرتبہ وہ ذوالنون بیگ کی ولایت پر حملہ آور ہوا۔بُست کے داروغہ نے بست اس کے حوالے کردیا مگر وہاں بھی اس کی پیش نہ گئی۔وہاں سے بھی واپس آ گیا۔سلطان حسین مرزا جیسے عظیم فرمانروا نے شاہانہ عزم کے ساتھ تینوں جگہ جنگ کا ارادہ کیا مگر وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا چنانچہ اس کا کوئی بھی اقدام مکمل نہ ہوا!

نشین نامی سبزہ زار میں اس نے اپنے لڑکے بدیع الزماں کو شکست دی۔وہ ذوالنون بیگ کے لڑکے شاہ شجاع بیگ کی مدد سے اس کے مقابلے پر آیا تھا مگر شکست سے دوچار ہوا۔یہاں کچھ عجیب اتفاقات رونما ہوئے: سلطان حسین مرزا نے اپنے لشکر کو استرآباد کے نواح میں بھیج دیا تھا۔لیکن جس روز اس نے اہل لشکر کو استرآباد کی طرف جانے کا حکم دیا اسی دن جنگ ہوگئی جس کے باعث اسی روز اس کا لشکر استرآباد سے واپس آیا اور اس کے ساتھ جنگ میں شریک ہوا اس طرف سے سلطان مسعود مرزا جس نے بایسنغر مرزا کی حصار کا علاقہ دلوانے میں مدد کی تھی سلطان حسین مرزا کے پاس آرہا تھا، وہ بھی اسی دن وہاں پہنچا۔

تمام ولایت میں اس کی ولایت خراسان تھی جس کی حدود مشرق میں بلخ سے، مغرب میں بسطام ودامغان سے، شمال میں خوارزم سے اور جنوب میں قندھار وسیستان سے متصل تھیں۔جب ہرات جیسا شہر اس کے ہاتھ آ گیا تو اس کے بعد اس کے علاوہ کوئی کام نہ کرسکا۔شب وروز داد عیش عشرت دیتا۔چونکہ اس نے جہانداری ولشکر کشی کی زحمت وتکلیف برداشت نہیں کی اس لئے اس کے جاہ وحشم اور ولایت میں اضافہ ہونے کی بجائے روز بروز کمی واقع ہونے لگی۔

اولاد: اس کے بچوں میں چودہ لڑکے اور گیارہ لڑکیاں زندہ بچے تھے۔لڑکوں میں سب سے بڑا بدیع الزماں مرزا تھا۔اس کی والدہ سنجر مرزا مروی کی دختر تھیں (بیگہ سلطان)۔دوسرا لڑکا شاہ غریب مرزا تھا۔اگرچہ اس کی شکل وہیئت تو اچھی نہ تھی لیکن مزاج عمدہ پایا تھا جسمانی طور پر وہ زبون وناتوان تھا لیکن اس کا کلام مرغوب وپسندیدہ تھا غریبی تخلص کرتا تھا۔اس نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا۔شعر ترکی اور فارسی میں کہتا تھا۔یہ شعر اسی کا ہے:

درگلر دیدم پری رویی شدم دیوانہ اش

چیست نام او کجا باشد ندانم خانہ اش

(راستے میں میں نے ایک پری چہرہ کو دیکھا اور اس کا دیوانہ ہوگیا۔مجھے نہیں معلوم کہ اس کا نام کیا ہے اور اس کا گھر کہاں ہے)

کچھ عرصے کے لئے ہرات کی حکومت سلطان حسین مرزا نے شاہ غریب مرزا کو سونپ دی تھی۔باپ کے زمانۂ حیات میں ہی اس کا انتقال ہوگیا۔اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔

تیرا لڑکا مظفر حسین مرزا تھا۔جو سلطان حسین مرزا کو بہت عزیز تھا۔اگرچہ اپنے اخلاق وافعال کے اعتبار سے وہ لائق توجہ نہ تھا کہ اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے مگر چونکہ وہ باپ کے زیادہ نزدیک تھا اس لئے دوسرے لڑکے بغاوت پر اتر آئے۔ان دونوں کی ماں کا نام خدیجہ بیگم تھا جو کبھی ابوسعید مرزا کی حرم تھیں۔(ورق ۱۶۴) جن سے اس کی ایک بیٹی آق بیگم تھی۔

۱۸۔ یہ جنگ استرآباد کے قریب ہوئی تھی۔اس جنگ میں قراقویونلو کا سردار پیر علی بیگ تھے جو بیرم خاں کے پردادا ہوتے ہیں۔یہ جنگ ۸۸۵/۱۴۸۰ میں ہوئی تھی اور پیر علی بیگ اس میں کام آئے۔(سوکار رے ص ۲)

چوتھا لڑکا ابوالحسن مرزا تھا اور پانچواں کیپک مرزا جس کا اصلی نام محمد حسن مرزا تھا۔ ان دونوں کی ماں لطیف سلطان آغچہ تھی۔

چھٹا لڑکا ابوتراب مرزا تھا۔ اوائل میں اس کے بڑے چرچے تھے لیکن جیسے ہی اس کے باپ کے مرض نے شدت اختیار کی اور اس سلسلے میں اس نے کچھ ناگوار خبریں سنیں تو اپنے برادر خورد محمد حسین مرزا کے ہمراہ عراق کی جانب چلا گیا جہاں اس نے سپاہ گری ترک کر کے درویشی اختیار کر لی۔ اس کے بعد اس کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکا۔ اس کا ایک لڑکا تھا جس کا نام سہراب تھا۔ جس وقت میں نے حمزہ سلطان، مہدی سلطان اور دیگر سلاطین کو زیر کیا اور حصار پر قابض ہو گیا تو وہ میرے ساتھ تھا۔ وہ ایک آنکھ سے نابینا اور شکل و صورت کے اعتبار سے نہایت بدصورت، جیسی اس کی صورت تھی ویسی ہی سیرت۔ اس کا رویہ چونکہ اعتدال کی حد سے گزر چکا تھا اسی لئے وہ میرے ساتھ نہ رہ سکا اور چلا گیا۔ اس کی اسی بے اعتدالی کے باعث استرآباد کے نواح میں نجم ثانی نے اسے ایذا پہنچا کر قتل کر دیا۔

ساتواں لڑکا محمد حسین مرزا تھا۔ عراق میں اسے اور شاہ اسمٰعیل کو ایک جگہ قید کیا گیا تھا۔ اس نے وہیں ان کی مریدی اختیار کی تھی، جس کے بعد وہ بڑا ہی متعصب رافضی ہو گیا۔ اگرچہ اس کے والد اور برادران خورد وکلاں سب ہی سنی مسلک کے پیروکار تھے۔ لیکن وہ اپنے رفض پر قائم رہا۔ چنانچہ بمقام استرآباد اس کی اسی گمراہی وبطالت کے عالم میں موت واقع ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بڑا ہی دلیر اور قوی دل انسان تھا لیکن اس نے کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دیا جو یہاں لکھنے کے قابل ہو۔ طبع موزوں پائی تھی اور یہ شعر اسی کا ہے:

آلوده کردی زہی صید که کشتی
غرق عرقی در دل گرم که گذشتی

(خاک سے اٹے ہوئے کس کا شکار کر رہے ہو اور پسینے میں نہائے ہوئے کس گرم دل میں داخل ہو گئے ہو)

آٹھواں لڑکا فریدون مرزا تھا۔ کمان کو پوری طاقت سے کھینچتا اور تیراندازی بھی بہت عمدہ کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی کمان گروھہ [19] چالیس من کی تھی، خوش طبع، دلیر انسان تھا مگر جنگ میں کبھی فتح نصیب نہ ہوئی۔ جہاں کہیں نبرد آزمائی کی پسپا ہی ہوا۔ رباط دودر پر فریدون حسین مرزا اور اس کے حقیقی بھائی ابن حسین مرزا نے تیمور سلطان کا سخت مقابلہ کیا فریدون حسین مرزا اور محمد زمان مرزا کو شیبانی خان نے دامغان میں گرفتار کر لیا جنہیں اس نے قتل نہیں کیا بلکہ آزاد کر دیا۔ اس کے بعد اس وقت جب کہ شاہ محمد دیوانہ کلات کو مضبوط کر رہا تھا وہ اس کے پاس چلا گیا۔ لیکن جب ازبکوں کا کلات پر قبضہ ہو گیا تو وہ ان کے نرغے میں پھنس گیا۔ جسے انہوں نے قتل کر دیا۔ یہ تینوں منگلی بی آغچہ نامی داشتہ کے بطن سے تھے۔

نواں لڑکا حیدر مرزا تھا۔ اس کی والدہ کا نام پایندہ سلطان بیگم تھا جو سلطان ابوسعید کی بیٹی تھیں۔ اپنے والد کے زمان حیات میں وہ کچھ عرصے تک مشہد اور بلخ کا حکمران رہا۔ جس وقت اس نے حصار کا محاصرہ کیا تو سلطان محمود مرزا نے اپنی اس لڑکی کو جو خانزادہ کے بطن سے تھی اس کے ساتھ بیاہ دیا چنانچہ اس کے بعد اس نے صلح کر لی اور حصار پر سے محاصرہ اٹھا لیا۔ اس کی نشانی ایک معصوم سی لڑکی رہ گئی تھی، جس کا نام شاد بیگم تھا۔ آخری دنوں میں وہ کابل آ گئی تھی۔ جس کی شادی عادل سلطان سے کر دی گئی۔ حیدر مرزا اپنے والد کے زمانہ حیات میں ہی عالم بقا کی جانب راہی ہوا۔

دسواں لڑکا محمد معصوم مرزا تھا۔ قندھار کی حکومت اس کے سپرد کر دی گئی تھی۔ وہاں پہنچ کر اس نے الغ بیگ مرزا کی ایک لڑکی کے ساتھ اپنی مرضی سے نسبت کی۔ جب وہ اس لڑکی کو ہرات لے کر آیا تو (ورق ۱۴۵) وہاں اس نے مفصل ضیافت کا اہتمام کیا۔ جہاں اس نے شاندار چار دری شامیانہ نصب کیا۔ اگرچہ قندھار محمد

۱۹۔ کمان گروھہ۔ کمانوں کی تفصیل کے لئے دیکھیں ۹۰۹ھ کے حالات میں نوٹ ۹۔ اینٹ بیورج اور تھیکسٹن دونوں کا خیال ہے کہ چالیس من اس کمان کا وزن نہیں بلکہ اسکے زور کا پیمانہ ہے۔ چین گالوے کے مطابق کمان کی طاقت کی پیمائش اس وزن سے ہوتی ہے جو کمان کی ڈوری کو تیر کی لمبائی تک کھینچ لے (دی کراس بو، رالف پین گالوے۔ ترکی اور مشرقی کمانیں ص ۳)

معصوم مرزا کو دے دیا گیا تھا مگر وہاں کے سیاہ و سفید کا مالک شاہ بیگ ارغون تھا۔ جس میں مرزا کا کوئی عمل و دخل نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ قندھار کو ترک کر کے خراسان چلا گیا۔ وہ بھی اپنے والد کے زمانہ حیات ہی میں اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

گیارھواں لڑکا ابراہیم حسین مرزا تھا۔ جو طبیعت کے اعتبار سے برا نہ تھا۔ ہرات کی شراب کا کثرت سے استعمال کرتا تھا، جسے پی پی کر وہ بھی اپنے والد کے زمانہ حیات ہی میں مر گیا۔

بارھواں بیٹا فرخ حسین مرزا اور تیرھواں محمد قاسم مرزا تھا۔ ان دونوں کا ذکر آگے آئے گا۔ ان پانچ مؤخر الذکر مرزازادوں کی ماں پاپا آغاچہ بھی داشتہ تھی۔

لڑکیوں میں سب سے بڑی سلطانیم بیگم تھی۔ جو اپنی ماں کی اکلوتی بیٹی تھی جس کا نام چولی بیگم تھا، اور وہ امرائے ازاق کے ایک امیر کی بیٹی تھی۔ سلطانیم بیگم اگرچہ بڑی ہی باتونی عورت تھی مگر اس کی باتوں میں مزہ نہ تھا اس کے بڑے بھائی نے اس کی شادی بیقرا مرزا کے منجھلے لڑکے سلطان ویس مرزا سے کر دی تھی۔ اس کے بطن سے ایک لڑکے اور ایک لڑکی کی ولادت ہوئی۔ لڑکی کی شادی بارس سلطان کے برادر خورد ایسن قلی سلطان سے کر دی گئی تھی، جس کا شمار شیبانی خاں کے سلاطین میں ہوتا تھا۔ اس کا لڑکا محمد سلطان مرزا ہے جسے میں نے قنوج کی ولایت دے رکھی ہے۔ سلطانیم بیگم اپنے پوتے کے ساتھ ہندستان کی جانب آ رہی تھی، دریائے نیلاب [20] کے قریب خدا کو پیاری ہو گئی۔ اور اس کی لاش کو تو اس کے رشتہ دار واپس لے گئے مگر اس کا پوتا ہندستان کی جانب چلا آیا۔

پایندہ بیگم کے بطن سے چار لڑکیوں کی ولادت ہوئی۔ جن میں سب سے بڑی آق بیگم تھی۔ اس کی شادی (ابوالقاسم) بابر مرزا کی سب سے چھوٹی بہن بیگہ بیگم کے نواسے محمد قاسم ارلات سے ہوئی تھی۔ اس کے بطن سے ایک ننھی سی بچی قراکوز بیگم پیدا ہوئی تھی جس سے ناصر مرزا نے شادی کی۔ منجھلی لڑکی کا نام کچک بیگم تھا۔ سلطان مسعود مرزا کا اس کی جانب بہت میلان تھا۔ اس نے ہر چند سعی و کوشش کی مگر پایندہ بیگم کو اس میں کوئی ایسی خوبی نظر نہ آئی اور وہ اس رشتۂ ازدواج کے لئے راضی نہ ہوئی۔ البتہ اس نے ملا خواجہ سے جو سیّد اتا کی نسل سے تھا اسے بیاہ دیا۔ تیسری لڑکی بیگہ بیگم اور چوتھی لڑکی آغا بیگم کی شادی اس نے اپنی چھوٹی بہن رابعہ سلطان بیگم کے لڑکوں بابر مرزا اور سلطان مراد مرزا سے کر دی۔

منگلی بے آغاچہ کے بطن سے دو لڑکیوں کی ولادت ہوئی۔ اس نے بڑی لڑکی کی شادی سید عبداللہ سے کر دی۔ جس کا شمار اندخود کے سادات میں ہوتا تھا اور رشتے میں بیقرا مرزا کا نواسا تھا۔ اس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام سید برکہ تھا جس وقت میں نے سمرقند پر قبضہ کیا تو اس نے میری ملازمت اختیار کر لی۔ آخر میں وہ ارگنج کی طرف چلا گیا جہاں اس نے حکومت کی دعویداری کا اعلان کر دیا۔ اسے استرآباد میں قزلباشوں نے قتل کر دیا۔ اس کی ایک لڑکی اور بھی تھی جس کا نام فاطمہ سلطان تھا۔ اس کی شادی یادگار محمد مرزا سے کر دی گئی تھی، جو تیمور بیگ کی نسل سے تھا۔

پاپا آغاچہ کے بطن سے تین لڑکیاں پیدا ہوئیں جن میں سب سے بڑی سلطان نژاد بیگم تھی، سلطان حسین مرزا نے اس کی شادی اپنے بڑے بھائی کے چھوٹے لڑکے سکندر مرزا [21] سے کر دی تھی۔

مندرجہ ذیل عبارت پشت ورق ۱۴۵ کے حاشیے پر درج ہے:

سلطان نژاد بیگم کی سکندر مرزا سے شادی کے بعد آکہ بیگم نامی لڑکی کی ولادت ہوئی، جس کی شادی میر برکہ کے خاندان میں کر دی گئی تھی۔ اس کے بطن سے عبداللہ مرزا اور خانم سلطان بیگم کی ولادت ہوئی۔ عبداللہ کی زوجہ کے بطن سے اس کے لڑکے سیّد قلی مرزا کی ولادت ہوئی۔ سید قلی مرزا کے فرزند کا نام مہدی محمد مرزا تھا جس کی کوئی اولاد زندہ نہ رہی۔ حضرت جنت آشیانی محمد ہمایوں بادشاہ نے خانم سلطان بیگم کی شادی میر علاء الملک سے کر دی تھی جن کا شمار سادات نقبای موسویہ مشہد اقدس رضوی علیہ تحیات و اثنا میں ہوتا ہے۔ موصوف اس راقم الحروف کے دادا تھے۔ سلطان

۲۰۔ نیلاب۔ نیل اور آب سے۔ دریائے سندھ کا گھاٹ

۲۱۔ کاتب بابرنامہ موسوی خان علی اکبر کا شجرہ

سلطان حسین مرزا بیقرا = پاپا آغاچہ
|
سلطان نژاد بیگم = سکندر مرزا
|
آکہ بیگم = دولہا میر برکہ کے خاندان میں سے

عبداللہ مرزا | خانم سلطان بیگم = میر علاء الملک = ----
سید قلی مرزا | نژاد بیگم | ----
مہدی مرزا | | موسوی خاں علی اکبر

بیگم کے بطن سے ایک لڑکی کی ولادت ہوئی اس کا نام بھی شہزادہ بیگم ہی رکھا گیا۔ موصوفہ اس خادم الفقرا کی رشتے میں پھوپھی ہوتی ہیں۔ میری پرورش ان ہی کی نگرانی میں ہوئی انہوں نے کسی سے نکاح نہیں کیا اس لئے کوئی اولاد نہ ہوئی۔

خادم الفقرا الاحقر

موسوی خان علی اکبر

عفی عنہ الحق محمد والہ واصحابہ

ان کی دوسری لڑکی کا نام بیگم سلطان تھا۔ اس کی شادی سلطان مسعود مرزا سے اس وقت کی گئی جب اس کی بینائی ضائع ہو چکی تھی۔ (ورق ۱۴۶) اس کے بطن سے ایک لڑکے اور ایک لڑکی کی ولادت ہوئی۔ اس کی سرپرستی سلطان حسین کی شریک حیات اپاق بیگم نے کی۔ وہ ہرات سے کابل چلی گئیں، جہاں انہوں نے سید مرزا اپاق سے اس کی شادی کر دی۔ جب سلطان مسعود مرزا کو ازبکوں نے قتل کر دیا تو بیگم سلطان مکہ کی طرف روانہ ہو گئیں۔ حال ہی میں یہ خبر پہنچی ہے کہ وہ اور ان کا لڑکا مکہ میں ہیں۔

تیسری لڑکی کی شادی سیّد مرزا نامی شخص سے کر دی گئی۔ ان کا شمار سادات اندخود میں ہوتا تھا اور وہ زیادہ سیّد مرزا کے لقب سے جانے جاتے تھے۔

زبیدہ آغاچہ نامی اس کی ایک اور داشتہ کے بطن سے اس کی لڑکی عائشہ سلطان کی ولادت ہوئی تھی۔ یہ داشتہ حسن شیخ تیمور کی پوتی تھی۔ جس کی شادی سلاطین شیبانی خاں میں سے قاسم سلطان سے کر دی گئی تھی۔ اس کے بطن سے ایک لڑکے کی ولادت ہوئی جس کا نام قاسم حسین تھا۔ ہندستان میں اس نے میری ملازمت اختیار کی اور رانا سانگاہ کے خلاف جنگ میں بھی شریک تھا۔ بداؤن (بدایون) کا علاقہ اسے دے دیا گیا تھا۔ قاسم سلطان کے بعد اس نے پوران نامی شخص سے جو قاسم سلطان کا رشتہ دار تھا شادی کی، شادی کے بعد عبداللہ سلطان نامی لڑکے کی ولادت ہوئی۔ اب وقت وہ میرے ملازمین میں شامل ہے۔ اگر چہ اس وقت اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں لیکن اس کے آداب خدمت برے نہیں۔

اس کی بیگمات اور داشتہ عورتیں: اس کی پہلی شریک حیات سنجر مرزا مروی کی لڑکی بیگہ سلطان بیگم تھی۔ اس کے بطن سے بدیع الزمان مرزا کی ولادت ہوئی۔ وہ بہت ہی بدمزاج عورت تھی اور اس بدمزاجی کے باعث اس نے سلطان حسین مرزا کو بہت ایذا پہنچائی، چنانچہ تنگ آ کر مرزا نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی اور نجات پائی۔ آخر کرتا بھی کیا، مرزا ہی حق پر تھا۔

زنِ بد سرای مردِ نکو همدرین عالم است دوزخ او [22]

(نیک آدمی کے گھر میں اگر بدخصلت عورت ہو تو اس مرد کے لئے دنیا ہی جہنم ہے)

خداوند تعالٰی کسی بھی مسلمان کو اس بلا میں گرفتار نہ کرے۔ الٰہی کوئی بدمزاج عورت اس دنیا میں نہ رہے۔

اس کی دوسری زوجہ چولی بیگم تھی، جس کے والد کا شمار اذاق قبیلے کے امرا میں ہوتا تھا۔ سلطانیم بیگم اس سے پیدا ہوئی۔

اس کی تیسری زوجہ سلطان ابوسعید مرزا کی لڑکی شہر بانو بیگم تھی۔ اس نے اس کے ساتھ شادی تخت سلطنت پر متمکن ہونے کے بعد کی تھی۔ جنگ چکمان میں جس وقت کہ مرزا کی تمام زوجات ڈولوں میں سے اتر کر گھوڑوں پر سوار ہوئیں تھیں تو وہ اس وقت اپنے ڈولے سے اتر کر گھوڑے پر سوار نہیں ہوئی کیوں کہ اسے اپنے برادر خورد (سلطان محمود مرزا) پر اعتماد تھا۔ جب اس بات کی اطلاع مرزا کو ہوئی تو اس نے اس سے قطع تعلق کر کے اس کی چھوٹی بہن پایندہ سلطان بیگم سے شادی کر لی۔ جس وقت ازبکوں نے خراسان پر قبضہ کر لیا تو پائندہ سلطان بیگم عراق چلی گئی جہاں دیار غیر میں اس کا انتقال ہوا۔

۲۲۔ شیخ سعدی کو بیت المقدس میں فرنگیوں نے قید کر لیا تھا۔ حلب کے ایک رئیس نے معاوضہ دے کر جان بچائی اور اپنی بیٹی سے حق مہر کے عیوض شادی کر دی۔ یہ لڑکی بدخو، جھگڑالو اور نافرمان تھی۔ شیخ کو طعنے دیتی تھی۔ شیخ نے طعنہ زنی کے جواب میں کہا کہ میں وہی ہوں جس کو دس دینار دے کر تیرے باپ نے چھڑوایا اور سو دینار کے عوض تیرے ہاتھوں مجھے گرفتار کروا دیا۔ (حالی۔ حیات سعدی ص ۳۲)

خدیجہ بیگم جو کبھی سلطان ابو سعید مرزا کی داشتہ رہ چکی تھی۔ اس کے بطن سے سلطان ابو سعید مرزا کی بیٹی آق بیگم کی ولادت ہوئی۔ سلطان ابو سعید مرزا کو جب عراق میں شکست ہوئی تو وہ ہرات پہنچ گئی۔ ہرات میں وہ سلطان حسین مرزا کی منظورِ نظر ہوگئی۔ چوں کہ وہ سلطان کو بہت عزیز تھی اسی لئے اس نے اس کو داشتہ گیری سے ترقی دے کر بیگم کے مرتبے پر پہنچا دیا۔ آخری دنوں میں تو وہ بہت با اختیار ہوگئی تھی۔ محمد مومن مرزا کے قتل میں اس کی سعی و کوشش کار فرما تھی۔ سلطان حسین مرزا کے لڑکوں نے اسی لئے بغاوت و سرکشی کی راہ اختیار کی تھی کہ وہ خود کو بہت چالاک سمجھتی تھی لیکن در حقیقت بے وقوف عورت تھی جس کی زبان بہت چلتی تھی۔ مسلک کے اعتبار سے رافضی تھی۔ شاہ غریب مرزا اور مظفر حسین مرزا کی ولادت اسی کے بطن سے ہوئی تھی۔

(ورق ۱۴۷) آپاق بیگم کے بطن سے کسی لڑکے یا لڑکی کی ولادت نہیں ہوئی۔ پاپا آغاچہ کو مرزا بہت زیادہ چاہتا تھا جو آپاق بیگم کی رضائی بہن تھی۔ چنانچہ اس کے بطن سے جتنے بھی لڑکوں اور لڑکیوں کی ولادت ہوئی آپاق بیگم نے ان کی پرورش اپنے بچوں کی طرح کی، اور جب بھی مرزا کی طبیعت ناساز ہوتی تو اس کی ایسی خدمت کرتی کہ اس کے حرم کی دیگر خواتین اس قدر خدمت انجام نہیں دے سکتی تھیں۔ جس سال میں ہندستان پہنچا وہ ہرات سے میرے پاس آئیں۔ چنانچہ جس حد تک ممکن تھا میں نے ان کی تعظیم و تکریم میں کوتاہی نہیں کی۔ جس وقت میں چندیری کا محاصرہ کئے ہوئے تھا مجھے اطلاع دی گئی کہ وہ کابل میں خدا کو پیاری ہوگئیں۔

اس کی داشتہ عورتوں میں سے ایک لطیف سلطان تھی۔ ابوالحسن مرزا اور کپک مرزا نے اس کی کوک سے جنم لیا تھا۔

دوسری داشتہ مینگل بی آغاچہ تھی۔ نسل کے اعتبار سے وہ ازبک تھی۔ جس کا شمار شہر بانو بیگم کے ملازمین میں ہوتا تھا۔ ابوتراب مرزا، محمد حسن مرزا اور فریدوں حسین مرزا کی ولادت اسی کے بطن سے ہوئی تھی۔ ان کے علاوہ اس کی دو لڑکیاں اور بھی تھیں۔

تیسری داشتہ پاپا آغاچہ تھی۔ جو رشتے میں آپاق بیگم کی رضاعی بہن تھی۔ جب مرزا نے اسے دیکھا تو اس پر اس کا دل آ گیا چنانچہ اسی لئے اس نے اس کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اس کے بطن سے پانچ لڑکوں اور چار لڑکیوں کی ولادت ہوئی۔ ان سب کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

چوتھی داشتہ بیگی سلطان آغاچہ تھی۔ اس کے بطن سے کسی لڑکے یا لڑکی نے جنم نہیں لیا۔ ان کے علاوہ بھی مرزا کی بہت سی داشتہ اور من چاہی عورتیں تھیں لیکن ان میں جو زیادہ معروف تھیں ان کا ذکر یہاں کر دیا گیا ہے۔

یہ بات کس قدر تعجب خیز ہے کہ شہر اسلام ہرات کے سلطان حسین مرزا جیسے عظیم فرمانروا کے چودہ لڑکوں میں سے صرف تین ہی ایسے تھے جو جائز تھے۔ اس کی اپنی ذات میں اس کے لڑکوں میں اور قوم و قبیلے کے لوگوں میں فسق و فجور (ورق ۱۴۷) کی عادت عام تھی۔ یہ ان کے شامت اعمال کا ہی نتیجہ ہے کہ سات، آٹھ سال کے عرصے میں ایسے عظیم خاندان میں سے محمد زمان مرزا کے علاوہ کسی کا بھی نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

امرا

محمد برندوق بن علی برندوق:۔ اس کے امرا میں ایک محمد برندوق بن علی برندوق بن جہان شاہ بن چاکوی برلاس تھا۔ وہ (ابوالقاسم) بابر مرزا کے امرا میں شامل تھا۔ اس کے بعد سلطان ابو سعید مرزا نے اس کے ساتھ بہت زیادہ مراعات کیں۔ اس نے خطۂ کابل اسے عنایت کر کے اسے الغ بیگ مرزا کا سرپرست مقرر کر دیا۔ سلطان ابو سعید مرزا کی وفات کے بعد الغ بیگ مرزا نے برلاس قبیلے کے لوگوں کا قلع قمع کرنے کا ارادہ کیا۔ جس کا اندازہ انہیں ہوگیا چنانچہ انہوں نے مرزا کو اغوا کر کے اپنے ساتھ لیا اور پورے قوم و قبیلے کے ہمراہ وہ وہاں سے کوچ کر

۲۳۔ میر علی شیر نوائی رمضان ۸۴۴/۱۴۴۱۔۱۴۴۰ میں ہرات میں پیدا ہوئے۔ مولانا جامی کے زیر اثر وہ نقشبندیوں کے حلقہ ارادت میں شامل ہوگئے۔ وہ کثیر القلم ہیں۔ اب تک ان کی ۲۹ تصانیف کی نشاندہی ہو چکی ہے۔ سب سے آخری محاکمۃ اللغتین ہے جو انہوں نے انتقال سے ایک سال پہلے لکھی۔ سوانح میں انکی عمدہ کتاب مجالس النفائس ہے۔ جس میں انہوں نے شعرا۔ ادب بزرگان کے حالات کے علاوہ اپنے وقت کے شہزادگان اور بادشاہ سلطان حسین مرزا کے حالات درج کئے ہیں۔ ان کا انتقال ۱۲ جمادی الثانی ۹۰۶ھ (۳ جنوری ۱۵۰۱ء) کو ہوا۔ (براؤن، اے لٹریری ہسٹری اوف پرشیا، ج ۳ ص ۵۰۶،۴۴۷)

کے قندز کی طرف چلے گئے۔ کوہ ہندوکش کی بلندی پر پہنچنے کے بعد انہوں نے مرزا کو تو نہایت شرافت سے کابل کی جانب بھیج دیا اور خود سلطان حسین مرزا کے پاس خراسان آگئے۔ مرزا (سلطان حسین) نے بھی انہیں بہت سی مراعات دیں۔ محمد برندق بہت ہی ذہین آدمی تھا اور بے انتہا بہادر سردار، اسے شکاری پرندے پالنے کا بہت شوق تھا۔ اگر اس کا کوئی شکاری پرندہ مر جاتا یا کم ہو جاتا تو وہ اپنے کسی بیٹے کا نام لے کر کہتا کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس پرندے کی بجائے یہ لڑکا مر گیا ہوتا یا فلاں لڑکے کی گردن ٹوٹ گئی ہوتی تو بہتر ہوتا۔

مظفر مرزا برلاس:۔ ایک اور امیر مظفر مرزا برلاس تھا، جنگ و جدال میں وہ ہمیشہ مرزا کے ساتھ رہا۔ یہ معلوم نہیں کہ مرزا کو اس کی کون سی ایسی ادا بھا گئی جس کے باعث اس نے بہت سی گرانمایہ مراعات سے اسے نوازا۔ مرزا کے نزدیک اسے یہ قدر و منزلت حاصل تھی کہ کارزار کے موقعے پر مرزا نے اس کے ساتھ یہ شرط رکھی تھی کہ جس ولایت کی بھی تسخیر ہوگی اس کے چھ حصّوں میں سے چار حصے (ورق ۱۴۸) میرے اور دو حصے تیرے ہوں گے عجیب شرط تھی۔ امور شاہی میں بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک بادشاہ اپنے کسی وفادار کو اس طرح اپنا شریک بنائے۔ جب بھائی یا بیٹے کے ساتھ اس طرح کی شرط نہیں رکھی جا سکتی تو بھلا کسی امیر یا سردار کے ساتھ کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن تخت حاصل کرنے کے بعد وہ اپنی شرط پر پشیمان ہوا جس کا اب کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس کند فہم گاودی نے بھی اس قدر مراعات حاصل کی رکھی تھیں کہ وہ مرزا پر فوقیت و برتری حاصل کرنا چاہتا مگر مرزا اس کی بات پر دھیان نہ دیتا۔ کہا جاتا ہے کہ آخر میں اسے زہر دے دیا گیا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

شیر علی بیگ نوائی:۔ ایک امیر شیر علی بیگ نوائی تھا[۲۳]۔ وہ امیر نہیں بلکہ مصاحب تھا اور بچپن میں اس کا ہم مکتب رہا تھا۔ بڑی خوبیوں کا مالک تھا معلوم نہیں کہ کس جرم کی پاداش میں سلطان ابو سعید مرزا نے اسے ہرات سے باہر نکلوا دیا، یہاں سے وہ سمرقند چلا گیا جہاں وہ کئی سال تک احمد حاجی بیگ کی تحت تربیت و حمایت مقیم رہا۔ علی شیر اپنی نازک مزاجی کے لیے مشہور ہے، جس کی وجہ نوکر یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی دولت ہے لیکن حقیقت یہ نہیں بلکہ جبلی طور پر اس میں یہ صفت موجود تھی جس وقت وہ سمرقند میں مقیم تھا وہاں بھی اس کی نازک مزاجی کی یہی کیفیت تھی۔ وہ ایک بے نظیر آدمی تھا، ترکی زبان میں اب تک جتنے شاعروں نے اشعار کہے ہیں ان سے کسی کا کلام علی شیر نوائی سے بہتر نہیں۔ اس نے چھ مثنویاں نظم کی ہیں جس میں پانچ خمسہ (نظامی گنجوی)[۲۴] کے جواب میں ہیں۔ اور ایک مثنوی منطق الطیر کے وزن پر لسان الطیر ہے۔ اس نے اپنی غزلیات کے چار دیوان مرتب کئے تھے۔ جن کے عنوانات ہیں: غریب الصغر، نوادر الشباب، بدایع اوسط اور فواید الکبر۔ ان کے علاوہ بھی اس کی دیگر تصانیف ہیں جو ان کے مقابل ست وادنیٰ ہیں۔ ان ہی میں سے ایک میں اس نے مولانا عبدالرحمٰن جامی[۲۵] کی تقلید کی ہے چنانچہ اس نے جس شخص کو بھی خط لکھا ہے اس کو ایک مجموعے میں شامل کر لیا۔[۲۶] اس کا ایک رسالہ فن عروض پر ہے[۲۷] جس کا عنوان میزان الاوزان ہے۔ مطالب کے اعتبار سے یہ کمزور ہے۔ رباعی کے چوبیس اوزاں میں سے چار اوزان میں اس سے سہو ہوا ہے۔ دیگر بعض بحروں میں بھی اسی سے لغزش ہوئی ہے۔ چنانچہ جو شخص بھی عروض سے واقف ہوگا اس پر یہ نقص عیاں ہو جائے گا۔ اس نے اپنے فارسی کلام کا دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ فارسی میں وہ فانی تخلص کرتا تھا۔ بعض اشعار برے نہیں لیکن بیشتر ست اور ادنیٰ درجے کے ہیں[۲۸] فن موسیقی میں بھی اس کی تخلیقات بہت عمدہ ہیں۔ نغمات نقش اور پیشرو میں اس کے جوہر نمایاں ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اہل فضل و ہنر کا ایسا مربی و سرپرست کبھی پیدا ہوا ہو؟ استاد قل محمد شیخی نے نواز[۲۹] اور حسین عود نواز[۳۰] جو اپنے زمانے کے سربرآوردہ فنکار شمار کیے جاتے ہیں وہ اسی امیر کے تربیت و تقویت یافتہ استادان فن ہیں اور اسی کی زیر پرستی انہوں نے یہ شہرت و ترقی حاصل کی۔ فن نقاشی استاد بہزاد[۳۱] اور استاد مظفر[۳۲] نے اسی امیر کے زیر اہتمام وسعی شہرت و نام آوری حاصل کی۔ فلاح و بہبود کے جس قدر کام اس نے انجام دیئے شاید ہی کسی دوسرے شخص نے

۲۴۔ نظامی گنجوی۔ قم میں ۵۳۳/۱۱۳۸ میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش تصدیق شدہ نہیں۔ درویشانہ طبیعت تھی لیکن شاعری بھی ازل سے ساتھ لائے تھے۔ اپنی خمسہ کی وجہ سے مشہور ہیں یہ پانچ مثنویاں مخزن الاسرار، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنون، سکندر نامہ اور ہفت پیکر طویل نظمیں ہیں جن میں فلسفیانہ اور رومانوی کلام ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے ہی پانچ مختلف بحروں میں مثنویاں لکھیں۔ سکندر نامہ میں ہیرو کا انتخاب غلط ہوا ہے اور مذاہب کو ملانا یعنی ذوالقرنین کو سکندر بنانا سہو ہے کیونکہ یہ قران شریف کے خلاف ہے۔ ان کی تقلید میں اور کئی شاعروں نے بھی مثنویاں تحریر کیں۔ نظامی کا مثنویوں کے علاوہ بھی کافی کام تھا جواب مفقود ہے۔ انہوں نے ۹۳ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ (شبلی نعمانی۔ شعرالعجم ص ۲۵۶)

۲۵۔ بابر مولانا کا ذکر آگے کرے گا۔ ان کا مجموعہ نامہ ہائے دست نویس جامی ہے۔

۲۶۔ مجموعہ مکتوبات ۸۹۸/۱۳۹۲۔۹۰۰/۱۳۹۴۔

۲۷۔ عروض کے لغوی معنی خیمے کی چوب کے ہیں جس طرح چوب خیمے کو قائم رکھتی ہے اسی طرح (اشعار کے وزن کے قواعد اور اصول علم عروض کہلاتے ہیں۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۲۷۸)

۲۸۔ فارسی دیوان کا نام دیوان فانی ہے۔

۲۹۔ نے۔ بانسری

شعلہ آواز سے جھڑکتی جو ہیں چنگاریاں۔

نے بنائی تو نے کیا منقار موسیقار کی (وزیر)

فرہنگ آصفیہ۔ سید احمد دہلوی ج ۴: ص ۲۲)

۳۰۔ عود۔ بربط، ایک موسیقی کا آلہ جس کا مرکزی حصہ ڈبہ نما ہوتا ہے جو آگے جا کر پتلا اور گردن نما ہو جاتا ہے۔ اس کے اوپر تار کھینچے ہوتے ہیں جن سے دھن پیدا ہوتی ہے۔

۳۱۔ استاد بہزاد ہرات میں پیدا ہوئے۔ مولانا میرک شاہی کتب خانہ کے مہتم کی شاگردی کی۔ حبیب السیر کے مطابق (ج ۳ ورق ۳۶۲) میر علی شیر نوائی اور سلطان حسین بیقرا کی سرپرستی میں ترقی کی۔ ہرات میں ایک مصوری کا مکتب ان کے سایہ میں پل رہا تھا۔ ان کے مصوری کے نمونے دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں شائل سعدی کی بوستاں کا ایک نسخہ قاہرہ میں ہے۔ ظفرنامہ جواب پیرس میں ہے دہلی کی شاہی کتب خانے میں اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے زیر مطالعہ رہا ہے۔ خمسہ نظامی لندن میں ہے۔ لندن میں ایک نمائش ۱۹۳۱ میں ایرانی مصوری کی ہوئی تھی جس میں بہزاد کے شہ پارے

انجام دیئے ہوں۔ وہ اہل وعیال سے محروم تھا اور مجردانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ابتدا میں وہ مہردار تھا اسی اثنا میں اسے درجۂ امارت عطا کیا گیا۔ کچھ عرصے تک استرآباد میں حکومت بھی کی۔ اس کے بعد اس نے پیشۂ سپہ گری کو ترک کر دیا۔ اس نے مرزا سے کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا بلکہ ہر سال مرزا کی خدمت میں معقول رقم بطور پیشکش روانہ کرتا جس وقت سلطان حسین مرزا استرآباد سے واپس آ رہا تھا تو وہ اس کی پیشوائی کے لئے حاضر ہوا اور گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا۔ لیکن ایک مرتبہ جب کہ اس کو کھڑا ہو جانا چاہیئے تھا اس پر کچھ ایسی حالت طاری ہوئی کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ نہ سکا۔ چنانچہ اس کو وہاں سے اٹھا کر لے جایا گیا (ورق ۱۴۹) اطبا اس کے مرض کی قطعی تشخیص نہ کر سکے۔ اگلے دن صبح واصل بحق ہوا۔ اس کا یہ شعر اسی کے حسب حال ہے۔

بوددر دایلسہ کہ اولاد مین مرض جو ظاہر ایماس

طبیب لاربو بلاغہ نی چارہ قیلفانی لار

(جس درد سے میں مرا جا رہا ہوں جب اس کی تشخیص ہی نہیں تو طبیب اس کا علاج کیا کریں گے)

ولی بیگ :۔ ایک امیر ولی بیگ تھا۔ نسل کے اعتبار سے اس کا تعلق حاجی سیف الدین بیگ سے تھا۔ اس کا شمار مرزا کے بڑے امرا میں ہوتا تھا۔ سلطان حسین مرزا کی تخت نشینی کے بعد اس کی عمر نے زیادہ وفا نہ کی اور چند روز بعد ہی اس دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔

شیخ تیمور :۔ پانچواں امیر شیخ حسن تیمور تھا۔ اس کے ساتھ بابر مرزا نے بہت سی مراعات کی تھیں اور اسے مرتبہ امارت تک پہنچا دیا تھا۔

نویان بیگ :۔ ایک امیر نویان بیگ تھا۔ اس کے والد کا شمار سادات ترمذ میں ہوتا تھا اسکی ماں بھی اسی نسل ومقام سے تھی۔ سلطان ابوسعید مرزا نے اس کے ساتھ بہت سی مراعات کی تھیں۔ وہ احمد مرزا کی نظروں میں بھی معتبر تھا۔ جب وہ سلطان حسین مرزا کے پاس گیا تو اس نے بھی اس کے ساتھ بہت مراعات کا سلوک کیا۔ وہ آوارہ، خوش گزران، شراب خور اور عیاش قسم کا آدمی تھا۔ حسن یعقوب چونکہ اس کی خدمت میں رہ چکا تھا اسی لئے وہ نویان کا حسن مشہور تھا۔

جہانگیر برلاس :۔ ایک اور امیر جہانگیر برلاس تھا۔ کچھ عرصے تک وہ اور محمد برندوق کابل کی حکمرانی میں شریک رہے۔ آخری دنوں میں وہ سلطان حسین مرزا کے پاس چلا گیا جہاں اسے بہت سی مراعات حاصل ہوئیں اس کی حرکات وسکنات سے ظرافت ولطافت عیاں تھی۔ خوش باش قسم کا انسان تھا۔ چونکہ بدیع الزماں مرزا کا مصاحب رہ چکا تھا اسی لئے وہ اسے اکثر یاد کیا کرتا تھا۔

احمد علی :۔ ایک امیر احمد علی فارسی تھا

عبدالخالق :۔ ایک امیر عبدالخالق، فیروز شاہ کا پوتا تھا۔ چونکہ فیروز شاہ کے ساتھ مرزا شاہ رُخ نے بہت زیادہ مراعات کا سلوک کیا تھا اسی لئے وہ عبدالخالق فیروز شاہ کے نام سے مشہور تھا۔ کچھ عرصے تک وہ خوارزم کا حکمران بھی رہا۔

ابراہیم دولدلی :۔ ایک امیر ابراہیم دولدلی تھا۔ حساب داری اور امور ملک داری سے خوب واقف تھا۔ اسے محمد برندوق کا نقل مطابق اصل کہتے تھے۔

ذوالنون ارغون :۔ ایک امیر ذوالنون ارغون تھا۔ اپنی ہمت ودلیری کے لئے مشہور تھا۔ سلطان ابوسعید مرزا کی ملازمت میں دوبدو جنگوں میں تلوار کے خوب جوہر دکھائے، اس کے بعد بھی جہاں کہیں میدان کارزار گرم ہوتا فتح ونصرت اس کے ہاتھ سے ہی نقیب ہوتی۔ اس کی مردانگی میں کلام نہیں لیکن عقل میں ذرا کوتاہ تھا، امیران شاہی کے پاس سے وہ سلطان حسین مرزا کے پاس چلا گیا۔ غور اور تکدرہ کے علاقے اسے عطا کئے گئے۔ اس نے اپنے ستر اتنی

پہلی اور آخری دفعہ جمع کئے گئے تھے جو تعداد میں تین تھے۔ بہزاد کی مصوری کے اثرات ایران۔ بخارا اور ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے لمبی عمر پائی اور ایران کے شاہ طہماسپ کے دور میں انتقال کیا۔

۳۲۔ شاہ مظفر بھی بہزاد اسکول کے ہی مصور تھے دونوں ہرات میں یا تو ساتھ ہی کام کرتے تھے یا شاید شاہ مظفر بہزاد کے شاگرد تھے۔

عبداللہ چغتائی۔ مسلم سلیم بیٹنز پشاور (ص۳۷۹) مرزا حیدر دوغلت کے مطابق شاہ مظفر کے والد شاہ منصور بھی مصور تھے۔ لیکن بیٹا باپ سے آگے نکل گیا تھا۔ شاہ مظفر کا برش نازک اور تصاویر میں پختگی تھی۔ ان کا ۲۴ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ (ورق ۱۹۷)

آدمیوں کے ساتھ اس کے گردونواح میں خوب شمشیر زنی کی۔ اس نے اپنے مٹھی بھر آدمیوں کی مدد سے ہزارہ اور نکدری کے لوگوں کو زیر کرلیا۔ ہزارہ اور نکدری لوگوں پر اس کی طرح کسی نے قابو نہیں پایا تھا۔ کچھ عرصے بعد زمین داور کا علاقہ بھی اسے دے دیا گیا۔ اس کا لڑکا شاہ شجاع ارغون بچپن سے اس کے ساتھ رہا تھا اس نے بھی تلوار کے خوب جوہر دکھائے۔ سلطان حسین مرزا نے باپ سے زیادہ بیٹے کو مراعات سے نوازا۔ باپ کی شرکت میں قندھار کا علاقہ اسے حکمرانی کے لئے دیا گیا۔ بعد میں باپ اور بیٹے کے درمیان ناچاقی ہوگئی۔ چنانچہ دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف بغاوت پر ابھارا گیا اور خوب فتنہ بپا ہوا۔ بالآخر جس سال میں نے خسرو شاہ کو نوکروں سے علیحدہ کردیا اسی سال میں نے ذوالنون کے کم عمر لڑکے مقیم کو کابل کی حکومت سے تاراج کر کے اس پر قبضہ کرلیا۔ ذوالنون اور خسرو شاہ نے جب خود کو میرے مقابل زبوں پایا تو وہ سلطان حسن مرزا کے پاس چلے گئے اور اس سے ملاقات کی۔ سلطان حسین مرزا کی وفات کے بعد ذوالنون ارغون نے زیادہ وسعت پیدا کی۔ چنانچہ کوہ ہرات کے دامن پر واقع اوبہ اور چچ چراں کی ولایات اسے دے دی گئیں۔ بدیع الزمان مرزا اور مظفر مرزا جب مشترک طور پر فرمارواں ہوئے تو بدیع الزمان (ورق ۱۵۰) کے امور اندرون خانہ میں ذوالنون ارغوں کو اور مظفر مرزا کے امور خانہ میں محمد برندوق برلاس کو صاحب اختیار مقرر کیا گیا اگرچہ آدمی جری تھا لیکن کچھ حد تک دیوانگی کے اطوار اور کم فہمی کے آثار بھی اس میں پائے جاتے تھے۔ اگر دیوانہ کم عقل نہ ہوتا تو کیا وہ اس طرح کی خوشامدانہ باتیں پسند کرتا اور رسوا و خوار ہوتا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب ہرات میں وہ صاحب اختیار و اعتبار ہوگیا تو کچھ شیخ اور ملا اس کے گرد جمع ہوگئے اور کہنے لگے کہ ان کا قطبوں سے ربط و تعلق ہے اور انہوں نے تجھے اسداللہ کے لقب سے نوازا ہے تو ازبکوں کو شکست دے کر انہیں قید کرے گا۔ وہ ان خوشامدانہ باتوں میں آگیا اور گلے میں جھولی ڈال کر شکر خداوندی بجالایا۔ بادغیس کے نواح میں جب شیبانی خاں پہنچا تو اسے شیوخ اور ملاؤں کی باتوں پر پورا یقین تھا اسی لئے وہ ان کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ وہ جیسے ہی میدان کارزار میں پہنچا ایک جم غفیر نے آگے بڑھ کر اسے گھیر لیا اور اپنے ساتھ لے جا کر قتل کردیا۔

راسخ العقیدہ انسان تھا، نماز کبھی ترک نہیں کرتا تھا۔ نوافل بھی کثرت سے پڑھا کرتا تھا۔ شطرنج کا بہت شوقین تھا۔ لوگ تو دل لگا کر کھیلتے لیکن وہ اس پر جان و دل دونوں ہی کی بازی لگا دیتا۔ جس طرح بھی اس کا دل چاہتا وہ اس شوق کو پورا کرتا۔ طبیعت پر خست کا غلبہ تھا۔

درویش علی بیگ:۔ ایک امیر علی شیر بیگ کا حقیقی برادر خورد درویش علی بیگ تھا۔ کچھ عرصے تک وہ بلخ کا حکمران رہا۔ جہان امور حکمرانی اس نے بخوبی انجام دیئے۔ کند ذہن، غبی اور بے ہنر قسم کا آدمی تھا۔ سلطان حسین مرزا نے جب پہلی مرتبہ قندز اور حصار پر حملہ کیا تو اپنی حماقتوں کے باعث گرفتار اور بلخ کی حکومت سے معزول ہوا۔ ۹۱۶ھ میں جب میں قندز پہنچا تو وہ میرے پاس آیا تھا میں نے اسے بالکل مات و مبہوت پایا۔ اس میں نہ تو قابلیت تھی کہ اسے درجہ امارت عطا کیا جائے اور نا ہی یہ صلاحیت کہ مقرب مقرر کیا جائے۔ بظاہر علی شیر بیگ کے توسط سے اسے یہ مراعات حاصل ہوئی تھیں۔

مغول بیگ:۔ ایک امیر مغول بیگ تھا۔ کچھ عرصے کے لئے ہرات کی حکومت اسے تفویض کردی گئی تھی۔ اس کے بعد وہ استرآباد سے فرار ہوکر یعقوب بیگ کے پاس پہنچ گیا۔ عیار قسم کا آدمی تھا اور ہمیشہ جوا کھیلتا رہتا۔

سید بدر:۔ ایک امیر سیّد بدر تھا۔ جسمانی اعتبار سے تومند اور حرکات بہت دل کش و شیرین عجب بااصول انسان تھا۔ رقص بھی عجیب انداز سے کرتا تھا جو بالکل ہی انوکھا ہوتا۔ غالباً یہ اس کا اپنا ایجاد کردہ تھا۔ مرزا کی خدمت میں ہمیشہ حاضر رہتا۔ بزم مے نوشی میں ہر وقت شریک اور مرزا کا مصاحب تھا۔

سلطان جنید برلاس:۔ ایک امیر سلطان جنید برلاس تھا۔ آخر میں سلطان احمد مرزا کے پاس سے چلا آیا تھا۔ موجودہ سلطان حسین برلاس اسی شخص کا فرزند ہے جو اس وقت مشترکہ طور پر حکومت جونپور کا فرمانروا ہے۔

ابوسعید خاں درمیان :۔ ایک اور امیر شیخ ابوسعید خان درمیاں تھا۔ معلوم نہیں کہ کس جنگ کے درمیان اس نے مرزا کو گھوڑا اپیش کیا تھا یا جس وقت دشمن نے مرزا پر وار کرنا چاہا تھا تو اس نے درمیان آ کر مرزا کا تحفظ کیا تھا۔ چنانچہ اسی بنا پر وہ درمیان کے لقب سے مشہور تھا۔

بہبود بیگ :۔ ایک امیر بہبود بیگ تھا۔ اوائل میں وہ نوعمر پیادہ خدمت گاروں کے زمرے میں شامل رہا تھا۔ لیکن چونکہ مرزا کے ساتھ اس کے معرکوں میں اس نے نمایاں خدمات انجام دی تھیں اس لئے مرزا نے ان خدمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس پر یہ عنایت کی کہ اس کے نام کا تمغہ اور سکّہ جاری کر دیا۔

مرشخیم :۔ ایک امیر مرشخیم تھا۔ چونکہ اپنے کلام میں وہ سہیلی تخلص کرتا تھا اسی لئے وہ شخیم سہیلی کے نام سے مشہور تھا۔ شعر کچھ اس انداز میں کہتا کہ سامع پر ہیبت طاری ہو جاتی تھی (ورق ۱۵۱) اس کے جملہ اشعار میں سے ایک یہ ہے:

شب غم گرد باد آهم ازجا برد گردون را

فرو برد اژدهای سیل اشکم ربع مسکون را

(غم کی رات میری آہ کے بگولے نے آسمان کو اس کی جگہ سے ہلا دیا۔ میرے اشکوں کی طغیانی کے اژدھے نے اس ایک چوتھائی آباد دنیا کو نگل لیا)

مشہور ہے کہ ایک مرتبہ اس نے یہ شعر حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی کی خدمت میں پڑھا تھا۔ شعر سن کر مولانا جامی نے فرمایا کہ شعر کہتے ہو یا سامع کو خوف دلاتے ہو۔ اس نے اپنا دیوان بھی مرتبہ کیا تھا۔ جس میں مثنویاں بھی شامل ہیں۔

محمد ولی بیگ :۔ ایک امیر محمد ولی بیگ تھا۔ یہ ولی بیگ اس ولی بیگ کا فرزند تھا جس کا ذکر گزر چکا ہے۔ آواخر میں اس کا شمار مرزا کے بڑے امرا میں ہونے لگا تھا مگر جس خدمت پر وہ مامور تھا اسے اس نے کبھی ترک نہ کیا۔ دن رات دربانی کی خدمت انجام دیتا۔ یہاں تک کہ اس کا دسترخوان بھی در دولت پر لگایا جاتا۔ یہ کلیہ امر ہے کہ جو شخص اس مستعدی سے خدمت انجام دے گا وہ ان مراعات کا مستحق ہوگا۔ اس زمانے میں امیری و سرداری بھی عجیب مصیبت بن گئی ہے کہ جس کسی نے مرتبہ امارت حاصل کیا اس کے آگے پیچھے پانچ چھ نکمے اور ناکارہ لوگ لگ گئے۔ کیا انہیں بھی ان ہی تکلفات کے ساتھ کسی محل کے دروازے پر متعین کیا جا سکتا ہے۔ اب ایسے وفادار ملازم کہاں ہیں۔ اگر وہ اس کے اہل نہیں ہیں تو یہ ان ہی کی بدبختی ہے۔

محمد ولی بیگ کا دسترخوان بہت وسیع و رنگین تھا۔ اپنے نوکروں کی صفائی کا خاص خیال رکھتا تھا۔ فقیروں اور مسکینوں کو اپنے ہاتھ سے خیرات دیتا، فحش گو اور بدزبان آدمی تھا۔ ۹۱۷ھ میں جس وقت میں نے سمرقند پر قبضہ کیا تو محمد ولی بیگ اور درویش علی کتابدار میرے ہمراہ تھے۔ اس وقت اس پر فالج کا اثر ہو چکا تھا۔ اب اس کی زبان میں وہ حلاوت نہ تھی اور اس قابل نہیں تھا کہ اس کے ساتھ مزید مراعات روا رکھی جائیں۔ یہ اس کی خدمات کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ اس مرتبے تک پہنچ گیا تھا۔

بابا علی ایشیک آغا :۔ ایک امیر بابا علی ایشیک آغا تھا۔ ابتدا میں اسے علی شیر بیگ کی سرپرستی حاصل تھی۔ بعد میں مرزا نے اس کے جوہر مردانگی کو دیکھ کر اپنے ملازمین میں شامل کر لیا اور ایشیک آغا (میر دربان شاہی) مقرر کر کے اسے مرتبہ امارت پر پہنچا دیا۔ یونس علی حسن کا ذکر اس کتاب میں بار بار آئے گا وہ اسی کا لڑکا ہے۔ اس وقت وہ میرا امیر مقرب ہے اور میرے بہت ہی نزدیک۔

بدرالدین :۔ ایک امیر بدرالدین تھا۔ ابتدا میں وہ سلطان ابوسعید مرزا کے میر عدل، مرک عبدالرحیم کی خدمت میں تھا۔ آدمی بڑا ہی چست اور پھرتیلا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک ہی جست میں سات گھوڑوں پر سے پھلانگ جاتا تھا۔ اس میں اور علی بابا میں گہری دوستی تھی۔

علی حسن جلایر :۔ ایک اور امیر علی حسن جلایر تھا۔ اس کا اصل نام تو حسین علی جلایر تھا لیکن حسن علی کے نام سے

مشہور۔ اس کے والد علی جلایر کو مرزا نے بہت مراعات دی تھیں اور اس نے ہی اسے مرتبہ امارت تک پہنچایا تھا۔ اس کے بعد جب یادگار محمد مرزا نے ہرات پر قبضہ کیا تو اس وقت اس کے ساتھ علی جلایر سے بڑا کوئی امیر نہ تھا۔ سلطان حسین نے حسن علی جلایر کو اپنا قوش بیگی (پرندوں کا میر شکار) مقرر کیا تھا۔ وہ طبعاً شاعر تھا اور طفلی تخلص کرتا تھا۔ قصیدہ بہت عمدہ کہتا تھا۔ اپنے زمانے میں وہ فن قصیدہ گوئی میں ممتاز تھا۔ ۹۱۷ھ میں اس وقت جب میں نے سمرقند پر قبضہ کیا تو وہ میرے پاس آگیا تھا۔ پانچ چھ سال تک میرے ساتھ رہا اور میری تعریف میں بھی عمدہ قصیدے کہے۔ بے باک اور عیاش طبع آدمی تھا۔ لڑکے پال رکھے تھے۔ ہمیشہ چوسر کھیلتا رہتا، جوئے کا بھی شوقین تھا

خواجہ عبداللہ مروارید:۔ ایک امیر خواجہ عبداللہ مروارید تھا۔ ابتدا میں وہ میر عدل کے عہدے پر فائز تھا۔ بعد میں اس نے مرزا کا مقرب، ندیم خاص اور امیر ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ صاحب علم دانش تھا۔ ساز قانون [۳۳] میں گرفت نامی دھن کی اختراع اسی نے کی تھی۔ فن تحریر کے بہت سے خطوط پر اسے مہارت حاصل تھی۔ تعلیق [۳۴] دوسرے خطوط کے مقابل بہتر اور بہت عمدہ لکھتا تھا۔ انشا نگاری میں بھی اسے دسترس حاصل تھی۔ شعر گوئی میں (ورق ۱۵۲) دوسروں کے مقابل اس کا درجہ کمتر تھا اس کا تخلص بیانی تھا۔ لیکن شعر فہمی کا ملکہ خوب حاصل تھا۔ فاسق اور بے باک آدمی تھا۔ اپنے فسق و فجور کے باعث ہی چیچک جیسے مرض میں گرفتا، اور ہاتھ پیروں سے معذور، کئی سال تک اس نے کئی قسم کی مشکلات اور دشواریاں برداشت کیں۔ اور آخر ان ہی مصائب میں گرفتار ہو کر ملک عدم کی راہ لی۔

سید اوروس:۔ ایک امیر محمد سیّد اوروس تھا۔ جس وقت سلطان ابوسعید مرزا نے تخت سلطنت پر قبضہ کیا تو اس وقت اوروس ارغون اس کا بڑا صاحب اختیار بڑا امیر تھا۔ وہ اسی محمد سیّد اوروس کا باپ تھا۔ اسی زمانے میں جو عمدہ دکار آمد جوان تھے۔ ان ہی سر برآوردہ جوانوں میں وہ بھی شامل تھا۔ اس کی کمان میں زور تھا اور نشانہ خوب لگاتا تھا۔ وہ عمدہ تیرانداز تھا کچھ عرصہ تک اس نے اندخود پر حکمرانی بھی کی تھی۔

امیر علی:۔ ایک امیر، امیر علی تھا۔ جو میر اصطبل کے عہدے پر فائز تھا۔ یہ وہی امیر علی ہے، جس نے سلطان حسین مرزا کے پاس قاصد بھیج کر یادگار مرزا پر اچانک حملہ کروایا تھا۔

سید حسین اوغلاقچی:۔ ایک امیر، سعید اوغلاقچی کا فرزند اور سید یوسف بیگ کا برادر کلاں سید حسین اوغلاقچی تھا۔ مرزا فرخ نامی اس کا لڑکا صاحب حیثیت و قابلیت انسان تھا۔ ۹۱۷ھ میں جس وقت میں نے سمرقند پر قبضہ کیا تو وہ میرے پاس آگیا تھا۔ اگرچہ شعر کم کہتا تھا مگر صاحب طرز شاعر تھا۔ اسطرلاب [۳۵] اور فن نجوم سے بخوبی واقف تھا۔ اس کی صحبت و ہم نشینی بھی عمدہ تھی۔ شراب پی کر ذرا بدمست ہو جاتا تھا۔ غجدوان کی جنگ [۳۶] میں کام آیا۔

تنگری بردی سانچی:۔ ایک امیر، تنگری بردی سانچی (میر سامان) تھا۔ بانکا ترک، جی دار جوان اور تلوار کا دھنی تھا۔ بلخ کے دروازے پر اس نے نظر بہادر، خسرو شاہ کے نامور سے خوب نبرد آزمائی کی تھی، اس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔[۳۷]

ان کے علاوہ بھی چند ترکمان امیر تھے جنہوں نے مرزا کی خدمت میں حاضر رہ کر مراعات حاصل کیں۔ سب سے پہلے جو امیر اس کے پاس پہنچے وہ علی خاں بایندر، اسد بیگ اور تہمش بیگ تھے۔ آخری دونوں آپس میں بھائی تھے۔ تہمش بیگ کی لڑکی سے بدیع الزماں مرزا نے شادی کی تھی۔ محمد زمان کی ولادت اسی کے بطن سے ہوئی تھی۔

ابراہیم چغتائی:۔ ایک اور امیر ابراہیم چغتائی تھا۔

عمر بیگ:۔ ایک امیر عمر بیگ تھا آخری دنوں میں وہ بدیع الزماں کی خدمت کرتا تھا۔ دلیر، بانکا ترک اور اچھا

۳۳۔ قانون۔ ایک ترکی ساز جو دسویں صدی ہجری سے مستعمل ہے۔ اس کا مرکزی تختہ مربع شکل کا لیکن غیر متوازی ہوتا ہے جس کے اوپر برابر برابر تار کھنچے ہوتے ہیں۔ ان تاروں کو چھیڑ کر بجایا جاتا ہے (میوزیکل انسٹرومنٹس ص ۸۰)

۳۴۔ نستعلیق۔ مشرقی زبانوں میں عام مروج خط نسخ ہے۔ جب کتابت خطاطی کی حدود سے نکل کر نقاشی کی قلمرو میں داخل ہوئی تو اس میں مصورانہ نزاکتیں پیدا ہونے لگیں۔ تحریر میں نوک پلک پیدا ہوئی۔ حرفوں کی نوکیں، گردنیں اور دو میں باریک بے لگیں۔ دائرے خوبصورت اور گول لکھے جانے لگے۔ اس مذاق کو پیش نظر رکھ کر سب سے پہلے میر علی تبریزی نے اس کو با اصول و با قاعدہ بنایا۔ اس کا نام نستعلیق ہوا جو دراصل نسخ تعلیق یعنی ضمیمہ نسخ ہے۔ (عبدالحلیم شرر، لکھنؤ ص ۱۶۰) -
محمد حسین دوغلت کے مطابق میر علی تبریزی امیر تیمور کے دور میں زندہ تھے (ورق ۱۶۳)

۳۵۔ اسطرلاب۔ وہ آلہ جس سے اجرام فلکی کے متعلق معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔

۳۶۔ جنگ غجدوان کا ذکر بابر نے ۹۱۸ھ کے واقعات میں کیا ہوگا۔ یہ حصہ گمشدہ ہے۔ اس جنگ میں ازبکوں کی لڑائی بابر اور شاہ اسماعیل صفوی کے سپہ سالار نجم ثانی سے ہوئی تھی، جسکو بابر کے خواہش پر شاہ صفوی نے بھیجا تھا۔ اس ہار کے بعد ہی بابر نے ماوراءالنہر کا خیال چھوڑ دیا تھا۔ (مرزا حیدر دوغلت ص ۲۶۱)

۳۷۔ یہ ذکر ۹۰۳ھ کے بیان میں ورق دیکھیں ۴۹ الف۔

آدمی تھا۔ ابوالفتح نامی اس کا لڑکا عراق سے میرے پاس آیا اس وقت بھی وہ میری خدمت میں ہے۔ بہت ہی سست، نکما اور ناپید ہونے کے قابل ہے۔ ویسے باپ کا ایسا بیٹا۔

شاہ اسمٰعیل کے عراق اور آذربائیجان پر قبضہ کرنے کے بعد جو امرا آئے ان میں ایک عبدالباقی مرزا تھا۔ وہ تیمور بیگ کی نسل اور میران شاہ کے اخلاف میں سے تھا۔ آل تیمور میں سے ابتدائی دنوں میں جو لوگ اس ولایت میں داخل ہوئے اور سلطنت کی دعوے داری کے خیال سے دست بردار ہو کر وہاں کے حکمرانوں کی ملازمت اختیار کی اور مراعات حاصل کیں وہ اسی عبدالباقی مرزا کا چچا تیمور عثمان تھا۔ جس کا شمار یعقوب بیگ کے عظیم و معتبر امرا میں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے چاہا تھا کہ اس گران لشکر کے ساتھ جو اس نے فراہم کر لیا تھا اسے خراسان کی جانب روانہ کرے لیکن جیسے ہی عبدالباقی مرزا وہاں پہنچا اس کے ساتھ سلطان حسین مرزا نے بہت زیادہ مراعات کیں اور محمد سلطان مرزا کی والدہ اور اپنی بیٹی سلطانیم بیگم کی شادی اس سے کر دی۔

وہ امرا جو اواخر میں وہاں پہنچے ان میں مراد بیگ بایندر بھی شامل تھا۔

صدور

سر برہنہ:۔ اس کے صدور [38] میں ایک امیر سر برہنہ [39] تھا، وہ اندجان کے کسی گاؤں کا باشندہ تھا۔ خود کو سید بتاتا تھا۔ بہت عمدہ ہم نشیں، خوش طبع و شیریں کلام انسان تھا۔ خراسان کے شعرا اور اہلِ فضل و دانش میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ چنانچہ اس کا کہا ان کے لئے سند کی حیثیت رکھتا تھا۔ (ورق ۱۵۳) قصہ امیر حمزہ کے ہم پلہ داستان کہنے میں اس نے اپنی عمر تلف کی۔ البتہ ایک ایسی دور و دراز بے اصل و بنیاد کہانی کا تانا بانا اس نے بن لیا جو عقل و طبع انسانی کے لئے قطعی ناقابلِ قبول ہے۔

کمال الدین حسین گازر گہی:۔ ایک امیر، کمال الدین حسین گازر گہی تھا۔ اگرچہ صوفی نہیں تھا لیکن متصوفہ میں سے تھا۔ علی شیر بیگ کے گرد کچھ اہل تصوف جمع ہو گئے تھے جو وجد و سماع کیا کرتے تھے۔ لیکن اُس کی کیفیت ان صوفیوں سے بہتر تھی جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وجد و حال کی کیفیت میں وہ کچھ آداب ملحوظ رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں ایسا کوئی وصف نہ تھا جسے بیان کیا جا سکے۔ مجلس العشاق نامی اس کی ایک تصنیف ہے جسے اس نے سلطان حسین مرزا کے نام سے لکھا ہے۔ کتاب بڑی ہی بے مزہ، بیشتر مطالب دروغگوئی پر مبنی اور افترا پردازی میں تو وہ ادب کی حدود سے بھی تجاوز کر گیا ہے۔ ان میں بعض مطالب تو ایسے ہیں کہ اس پر کفر کا شائبہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے بہت سے اولیا اور انبیا کو عشق مجازی سے منسوب کیا ہے۔ ہر ایک ولی و نبی کا اس نے کوئی نہ کوئی محبوب معشوق تخلیق کیا ہے۔ ایک اور عجیب حماقت جو اس کتاب میں کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ دیباچۂ کتاب میں سلطان حسین مرزا نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ یہ میری تصنیف و تالیف ہے لیکن ہر نظم جو کمال الدین کا معروف کلام بھی ہے لکھا ہے کہ یہ مصنف کی لکھی ہوئی ہے۔ اس طرح کی خوش آمد کی وجہ سے ہی اس نے ذوالنون ارغون کو شیر خدا کا لقب دیا تھا۔

وزیر

اس کے وزرا میں ایک وزیر خواجہ شبیر احمد خوانی کا فرزند مجدالدین تھا۔ خواجہ شیر احمد خوانی مرزا شاہ رخ کے قلعوں میں سے ایک قلعہ میں عہدہ دیوانی [40] پر مقرر تھا۔ ابتدائی دنوں میں سلطان حسین کے امور دیوانی میں خاطر خواہ نظم و نسق موجود نہ تھا۔ جہاں بے جا خرچ اور ضیاع بکثرت تھا۔ نہ رعیت آباد تھی اور نہ ہی سپاہی شکر گزار۔ اس وقت مجدالدین وہاں ایک پروانچی ر (منشی) تھا جسے لوگ برک کہتے تھے۔ مرزا کو ایک مرتبہ کچھ رقم کی ضرورت پیش آئی اور اس کا اس نے مطالبہ کیا تو کار پردازان امور دیوانی نے کہا کہ خزانہ خالی ہے اور محصول وصول نہیں ہو رہا ہے۔ اس وقت مجدالدین وہاں موجود تھا اور مسکرا رہا تھا۔ جب مرزا نے اس کی وجہ پوچھی تو اس

۳۸۔ صدر کا عہدہ جج کا ہوتا ہے۔ لیکن یہ لفظ کسی بھی عہدے کے ساتھ ملایا جا سکتا ہے جیسے صدر اعلیٰ، صدر اعظم وغیرہ

۳۹۔ عشق میں یہ ننگے سر پھرا کرتے تھے (خواند امیر ۴:۳۲۲، تھیکسٹن ۲۲۰)

نے تنہائی میں وہ سب کہہ دیا جو وہ کہنا چاہتا تھا۔اس نے مزید کہا کہ اگر مرزا خود سے یہ عہد کریں کہ وہ میرے ہاتھ مضبوط کریں گے اور میری بات سے تجاوز نہیں فرمائیں گے تو میں کچھ ہی دنوں میں وہ کر دکھاؤں گا کہ رعیت آباد ہو جائے گی، سپاہ شکر گزار اور خزانہ معمور۔ چنانچہ مرزا نے اس کی مرضی کے موافق عہد و پیمان کر کے اسے خراسان کا مختارِ کل مقرر کر دیا۔ تمام مہمات اس کے سپرد کر دی گئیں۔ چنانچہ جس حد تک اس کے امکان میں تھا اس نے سعی و کوشش کی، تھوڑے ہی عرصے میں سپاہ و رعیت دونوں ہی اس سے راضی و مطمئن ہو گئے۔ خزانہ بھی مالا مال ہو گیا۔ ولایت معمور و آباد ہو گئیں۔ لیکن شیر علی بیگ اور ان تمام امرا کے ساتھ جو اس سے وابستہ تھے نیز تمام اہلِ منصب کے ساتھ اس کا رویہ مخالفانہ رہا۔ جس کے باعث وہ اس کے دشمن ہو گئے۔ چنانچہ ان سب نے اس کے خلاف سازش کر کے اسے گرفتار اور معزول کروا دیا اور اس کی جگہ انہوں نے نظام الملک کو مقرر کیا۔ کچھ عرصے بعد علی شیر بیگ نے اسے بھی گرفتار کروا کے قتل کروا دیا۔ اس کے بعد خواجہ ابوالفضل کو عراق سے لایا گیا اور عہدہ دیوانی پر مقرر کیا گیا۔ جس وقت میں کابل پہنچا تو اسے درجۂ امارت پر پہنچا دیا گیا تھا۔ دیوانی امور میں اس کی مہر ثبت کی جاتی تھی۔

خواجہ عطا:۔ خواجہ عطا اگرچہ وہ مذکورہ بالا صاحبانِ دیوان کی طرح صاحبِ منصب و دیوان نہ تھا۔ لیکن خراسان کے تمام علاقوں میں اس سے مشورہ کئے بغیر اہم معاملات میں کوئی فیصلہ کن اقدام نہیں کیا جاتا تھا۔ متقی، نماز کا پابند اور دین دار آدمی تھا اس کے بعض اور مشاغل بھی تھے۔

جن لوگوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ سب سلطان حسین کے مرزا کے توابع و لواحقین تھے۔ اس کا زمانہ بھی کیا عجیب زمانہ تھا (ورق ۱۵۴) خراسان اور بالخصوص شہر ہرات اہلِ فضل و کمال اور لاثانی لوگوں سے آباد تھا۔ جو شخص بھی جس کام میں بھی مشغول تھا اس کے پیشِ نظر بس وہی مقصد تھا کہ اس کام کو اس کی انتہا تک پہنچا دے۔

علما

مولانا عبدالرحمٰن جامی:۔ ان ہی میں سے ایک مولانا عبدالرحمٰن جامی تھے۔ علوم ظاہر و باطن کے اعتبار سے ان کے عہد میں کوئی بھی شخص ان کے ہم پلّہ نہ تھا۔ اور یہ بات ان کے کلام سے بھی عیاں ہے۔ حضرت مولانا کی ذات اس امر سے بالاتر ہے کہ اسے کسی تعریف کی احتیاج و ضرورت ہو۔ بہر جہت چوں کہ بات ذہن میں آ گئی اسی لئے ان فرسودہ اوراق میں ان موصوف کا ذکرِ خیر بطور تبرک و تیمّن کر دیا گیا ہے۔ اور مختصر طور پر ان کے اوصاف یہاں بیان کر دیئے گئے ہیں۔[۴۱]

سیف الدین احمد:۔ جناب شیخ الاسلام سیف الدین احمد ملاّ سعد الدین تفتازانی[۴۲] کی نسل سے ہیں۔ ملک خراسان میں ان کی اولاد میں سے بہت سے لوگ مرتبۂ شیخ الاسلام پر فائز ہوئے ہیں۔ بہت ہی دانشمند انسان تھے۔ علوم عربیہ اور علوم نقلیہ پر عبور حاصل تھا۔ بہت ہی متقی اور دین دار انسان تھے۔ اگرچہ شافعی مسلک تھے مگر دیگر مسالک کا بھی احترام کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ تقریباً ستر سال کی عمر تک کبھی نماز با جماعت ترک نہیں کی۔ جب شاہ اسمٰعیل (صفوی) کا ہرات پر قبضہ ہو گیا تو اس نے انہیں قتل کرا دیا۔ اب ان کی نسل سے کوئی شخص زندہ نہیں۔

ملا شیخ حسین:۔ ملا شیخ حسین نے سلطان ابوسعید سے سلطان حسین مرزا کا زمانہ دیکھا تھا اسی لئے ان کا ذکر یہاں کیا گیا ہے علوم حکمیات اور علم کلام پر عبور حاصل تھا۔ مختصر الفاظ میں وسیع معانی پیدا کرنا ان ہی کا وصف تھا۔ مناسب وقت پر کلام کرنا ان ہی کی اختراع ہے سلطان ابوسعید مرزا کی عہد میں ان کے بہت ہی نزدیکی مقرب اور صاحبِ اختیار شخص تھے۔ مرزا کے تحت تصرف ممالک میں جتنے بھی اہم امور تھے ان سب میں ان کا عمل دخل

۴۱۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی۔ جام (خراسان) میں ۲۳ شعبان ۸۱۷ (۷ نومبر ۱۴۱۴ء) کو پیدا ہوئے۔ بہت ہوشیار اور عقلمند تھے۔ بچپن میں ہی عقلی بحثیں کیا کرتے تھے۔ مفکر، عالم، شاعر اور صوفی تھے۔ نقشبندی سلسلہ صوفیہ سے وابستہ تھے۔ خواجہ عبید اللہ احرار کو جب معلوم ہوا کہ رشحات کا مصنف ان سے ملنے کے لئے سمرقند آنا چاہتا ہے تو انہوں نے کہا کہ جب سورج ہرات میں چمک رہا ہو (جامی) تو سمرقند میں چراغ کے پاس روشنی کے لئے آنا کیا معنی۔ تین دیوان۔ سات مثنویاں (ہفت اورنگ)، صوفیوں کے حالات (نفحات الانس) اور بہارستان آپ کی تخلیقات ہیں۔ شاعری کی وجہ سے شہرت زیادہ ہے۔ انتقال ہرات میں ۸ محرم ۸۹۸ھ (۹ نومبر ۱۴۹۲ء) کو ہوا۔ تاریخ پیدائش "ومن دخلہ کان آمنا" (۸۹۸) سے نکلتی ہے

مولانا حاضر جواب تھے۔ یہ شعر انہوں نے پڑھا

سبکہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی

ہر کہ پیدا میشود از دور پندارم توئی

اس پر ایک بذلہ سنج نے کہا کہ اگر وہ گدھا ہو! مولانا نے فوراً عرض کیا کہ میں پھر یہ سوچ لوں گا کہ وہ آپ ہیں (براؤن ج ۳ ص ۵۰۷، ۵۱۱)

۴۲۔ ملا سعد الدین تفتازانی بن عمر تفتازانی۔ ایک عالم جو اپنے ہم عصر علما میں بہت عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ تفتازان نسا کے قریب ہے جو خراسان میں ہے۔ ۲۲/۱۳۲۲ میں پیدا ہوئے۔ اپنی پہلی کتاب سولہ سال کی عمر میں عربی گرامر پر لکھی، تیمور نے ان کے علم کی تعریف سن کر ان کو اپنے پاس بلا کر بطور امام رکھا۔ ان کا انتقال ۹۱/۱۳۸۹ میں ہوا۔ (تیمور۔ ابن عرب شاہ ص ۳۱۴) ان کی سولہ کتابیں فقہ، فلسفہ اور دینیات پر عربی میں ہیں۔

تھا۔ بحیثیت محتسب اس نے بہتر کوئی شخص نہ تھا۔ سلطان ابوسعید مرزا کے عہد میں جس شخص کو سلطان کا قرب حاصل تھا، اسی بے نظیر انسان کی سلطان حسین مرزا کے دور حکومت میں کیا ذلت وخواری نہ ہوئی۔

ملا زادہ ملا عثمان:۔ ملا زادہ ملا عثمان چرخ نامی گاؤں کے باشندے تھے جو تومان لہوگر میں واقع ہے اور اس ضلع کا شمار کابل کے تومانات میں ہوتا ہے۔ الغ بیگ مرزا کے عہد میں اس وقت جب کہ ان کی عمر چودہ سال تھی درس دیا کرتے تھے، اسی بنا پر لوگ انہیں مادر زاد ملا کہا کرتے تھے۔ فریضۂ حج بیت اللہ ادا کرنے کے بعد واپس وطن کی طرف آتے ہوئے جب ہرات پہنچے تو سلطان حسین مرزا نے انہیں وہاں سے جانے نہیں دیا، بلکہ انہیں وہیں روک لیا۔ بہت ہی دانشمند انسان تھے۔ ان کے عہد میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اگرچہ وہ مرتبہ اجتہاد تک پہنچ چکے تھے تاہم کبھی اس کا اقدام نہیں کیا۔ موصوف کا حافظہ بہت قوی تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر کسی شخص نے کبھی کوئی بات سن رکھی ہو تو وہ اسے کیسے بھول سکتا ہے۔

میر مرتاض:۔ میر مرتاض کو حکمیات اور معقولات پر عبور حاصل تھا۔ چوں کہ روزے بہت زیادہ رکھتے تھے اسی لئے انہیں مرتاض [۴۳] کا لقب دیا گیا تھا۔ شطرنج کا شوق اس حد تک تھا کہ اگر انہیں کہیں دو حریف مل جاتے وہ ان سے ایک کے ساتھ تو شطرنج کھیلتے اور دوسرے کا دامن پکڑ کر بیٹھ جاتے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں سے اٹھ کر کہیں چلا جائے۔

مسعود شیروانی:۔ ایک ملا مسعود شیروانی تھے۔

ملا عبدالغفور لاری:۔ ملا عبدالغفور لاری مولانا عبدالرحمٰن جامی کے شاگرد و مرید تھے۔ ملا جامی کی اکثر تصانیف کا مطالعہ آپ ہی کہ خدمت میں حاضر رہ کر کیا تھا۔ نفحات الانس [۴۴] پر شرح جیسی کوئی چیز بھی لکھی علوم ظاہری پر بہت زیادہ دسترس تھی لیکن اس کے باوجود علوم باطنی (ورق ۱۵۵) سے بھی بہرہ مند تھے۔ عجب سادہ لوح اور بے تکلف آدمی تھے۔ جس کسی نے انہیں ملا کہہ دیا بس اس کے سامنے اپنے دفتر کھولنے میں انہیں کوئی عار نہ تھا۔ اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ ہرات میں کوئی درویش موجود ہے تو جب تک اس کی خدمت میں حاضر نہ ہو جاتے چین نہ آتا۔ جس وقت میں خراسان پہنچا تو ملا عبدالغفور صاحب فراش تھے۔ چنانچہ جب میں حضرت مولانا جامی کے روضے کی زیارت کے لئے گیا تو ملا کی عبادت کے لئے بھی پہنچا، اس وقت موصوف مدرسہ میں تشریف فرما تھے۔ اس کے چند روز بعد اسی مرض میں مبتلا رہ کر عالم بقا کی جانب کوچ کیا۔

میر جمال الدین محدث:۔ ملک خراسان میں ایسا کوئی شخص نہ تھا جس کو علم حدیث میں ان کا ثانی کہا جا سکے۔ بہت زیادہ عمر رسیدہ آدمی ہیں۔ ابھی تک بقید حیات ہیں۔

میر عطاء اللہ مشہدی:۔ میر عطاء اللہ مشہدی علوم عربیہ سے بخوبی واقف تھے۔ فن قافیہ [۴۵] پر فارسی زبان میں ایک رسالہ تالیف کیا ہے، جس میں اس کے علاوہ کوئی عیب نہیں کہ تمام مثالیں اپنے اشعار سے لی ہیں۔ اس کے علاوہ ہر شعر درج کرنے سے قبل انہوں نے یہ جملہ حتمی طور پر لکھا ہے "اس حقیر نے عرض کیا ہے" فن شاعری میں "بدایع الصنایع" [۴۶] نامی رسالہ بھی موصوف کی ہی تالیف ہے۔ یہ رسالہ فن کے اعتبار سے بہت عمدہ ہے۔ ممکن ہے اپنے مسلک میں وہ راستی سے منحرف ہوں۔

قاضی اختیار:۔ ایک اور دانشور قاضی اختیار تھے۔ بحیثیت قاضی عمدہ خدمات انجام دیتے۔ علم فقہ سے متعلق فارسی زبان میں ایک رسالہ تالیف کیا ہے۔ مذکورہ رسالے میں اس امر کا احترام کیا ہے کہ ہر عنوان کے تحت آیات کلامی کے اقتباسات جمع کر دیئے گئے ہیں۔ جس وقت سلاطین زادگان نے مجھ سے مرغاب پر ملاقات کی تو قاضی اختیار اور محمد میر یوسف ہی ان کے ہمراہ آئے۔ ملاقات کے دوران خط بابری کا ذکر آ گیا۔ انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ حروف کو مقرر طور پر ان کے لئے لکھ دوں۔ جو میں نے انہیں اسی وقت لکھ دیئے۔ چنانچہ اسی مجلس میں انہوں نے ان کے اصول وقواعد مجھ سے دریافت کئے اور ان کے بارے میں خود کوئی عبارت بھی تحریر کی۔

۴۳۔ مرتاض۔ ریاضت کرنے والا

۴۴۔ نفحات الانس۔ یہ تذکرہ ۶۱۱ صوفیوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ جس میں مرد و نساء دونوں شامل ہیں۔ یہ ۸۸۱/۱۴۷۶ میں لکھا گیا۔ سوانح ابجد کے حساب سے رقم کیے گئے ہیں جو شاہ رخ کے دور تک کے صوفیوں پر محیط ہیں۔ اس کے علاوہ ۳۴ صفحات میں صوفی اصول، تاریخ اور عادات واطوار کا بھی ذکر ہے۔ یہ بہت آسان اور سادہ زبان میں ہے جو ۴۰۷ صفحات پر مذکور ہے اور کلکتہ سے ۱۸۵۹ میں چھپا تھا (براؤن ج ۲: ص ۴۳۵) اس کا اردو ترجمہ لاہور سے شائع ہو گیا ہے۔

۴۵۔ فن شاعری میں قافیہ بندی کے اصولوں پر بحث۔

۴۶۔ بدائع الصنائع۔ وہ عجیب وغریب نکات اور باریکیاں جو نظم یا کلام میں اس کی خوبی اور اپنی طبیعت کی رسائی ظاہر کرنے کے واسطے عمداً لائی جائیں یا از خود صادر ہوں (سید احمد دہلوی ج ۳۔ ص ۲۲۶)

محمد یوسف:۔ ایک اور دانشور شیخ الاسلام [47] کا شاگرد محمد یوسف تھا۔ لیکن اواخر میں وہ خود ہی اپنے نام کے ساتھ شیخ الاسلام لکھنے لگا تھا۔ بعض مجالس میں وہ قاضی اختیار کی نشست گاہ سے بلند تر جگہ پر بیٹھتا تھا۔ حال ہی میں سپاہ گری اور سپاہ سالاری کا شوق ایسا چرایا کہ وہ ان دو کے علاوہ کسی اور موضوع پر گفتگو ہی نہیں کرتا تھا۔ اگر چہ وہ ان دونوں ہی فنون سے بے بہرہ تھا۔ اس کے اطوار و کردار سے اس کا قطعی علم نہیں ہوتا تھا۔ بالآخر اسی خام خیال میں جان و مال سب ہی تباہ و برباد کر بیٹھا۔ وہ شاید شیعہ تھا۔

شعرا

فن سخن وری و سخن سرائی میں ملا عبدالرحمٰن جامی کا نام ہی سرفہرست تھا۔ موصوف کے علاوہ شیخم سہیلی اور حسن علی طفیلی جلایر بھی شاعر تھے۔ جس کا ذکر سلطان حسین مرزا کے امرا و اقربا کے زمرے میں آچکا ہے۔

آصفی:۔ ان ہی شعرا میں ایک شاعر آصفی تھے چوں کہ وزیر زادہ تھے اسی لئے آصفی تخلص اختیار کیا تھا۔ اشعار سے مضامین کی رنگینی اور معانی کی چاشنی ہویدا ہے۔ اگر چہ شاعری عشق اور وجد و حال کی کیفیت سے بے بہرہ ہے' لیکن' خود اس کا دعوہ یہ تھا کہ اس نے کبھی اس امر کا اقدام نہیں کیا کہ اپنی غزلیات کو جمع کروں بظاہر اس نے یہ بات محض تکلفاً کہی ہوگی۔ اس کی غزلیات اس کے کسی دوست یا قریبی رشتہ دار نے جمع کی تھیں۔ غزل کے علاوہ دیگر اصناف شعر میں کم ہی طبع آزمائی کی ہے۔ جس وقت میں خراسان پہنچا میری خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

بنائی:۔ ایک اور شاعر بنائی ہرات کا رہنے والا ہے۔ ان کے والد کا نام محمد سربنا [48] تھا۔ اسی مناسبت سے موصوف نے یہ تخلص اختیار کیا تھا۔ اس کی غزلیات میں مضامین کی رنگینی بھی ہے اور وجد و حال کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ موصوف نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا ہے جس میں مثنویات بھی شامل ہیں۔ بحر متقارب [49] میں ایک مثنوی کہی ہے جس میں میوہ جات کا ذکر ہے۔ یہ محض اس کی لاحاصل کوشش تھی۔ (ورق ۱۵۶)۔ دوسری مثنوی بحر خفیف [50] میں ہے جو ذرا مختصر ہے تیسری مثنوی دوسری کے مقابل طویل ہے وہ بھی بحر خفیف میں کہی گئی ہے اور حال میں اس نے تکمیل کی ہے۔ ابتدائی دور میں فن موسیقی کی خاطر ریاض بھی کیا کرتا تھا۔ وہ اس فن سے نابلد تھا جس کا علی شیر بیگ طعنہ دیا کرتا تھا۔ ایک سال مرزا موسم سرما بسر کرنے کی خاطر مرو کی جانب روانہ ہوا۔ اس سال علی شیر بیگ اور بنائی ہرات ہی میں رہے۔ اس گرمی کے زمانے میں اس نے فن موسیقی کا ریاض شروع کیا اور پورے موسم وہ یہی عمل کرتا رہا۔ چنانچہ اس فن میں اس نے یہاں تک مشق بہم پہنچائی گویا کارنامہ سر کرلیا۔ اور جس وقت مرزا واپس ہرات آیا تو بنائی نے صوت و ساز کے ذریعے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ علی شیر بیگ کو تعجب تو ہوا مگر اس نے داد دی۔ فن موسیقی کے اس میدان میں اس نے واقعی معرکہ سر کیا اور راست [51] کے سروں میں سے کئی راگ ایجاد کئے۔ جن میں سے ایک نقش [52] میں اس نے نو دھنیں یکجا جمع کی تھیں۔ اور اس کا نام نورنگ رکھا۔ ان اختراعات کے باوجود علی شیر اور اس کے درمیان چشمک باقی رہی۔ اگر چہ اس نے انتہائی صبر آزمائی سے اس کی مخالفت کا مقابلہ کیا بالآخر اس کی تاب نہ لاسکا اور عراق و آذربائیجان کی جانب رخ کیا اور یعقوب بیگ کے پاس چلا گیا۔ وہ برا آدمی نہ تھا چنانچہ اس نے بنائی کو اپنی مجلس میں شریک کرلیا۔ اس کی وفات کے بعد وہ ان ولایات میں نہ رہ سکا اور ہرات کی جانب چلا آیا وہاں اب بھی وہی مسخر اور چشمک کی فضا برقرار تھی۔

ایک روز شطرنج کی محفل برپا تھی علی شیر بیگ نے ٹانگ پھیلائی تو وہ بنائی کی کمر تک پہنچی، جس پر اس نے دل لگی کے طور پر کہا کہ شہر ہرات میں یہ عجیب مصیبت ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی ٹانگ پھیلائے تو وہ شاعر کی مقعد تک پہنچتی ہے۔ اس پر بنائی نے کہا کہ اگر سکیڑے بھی تو شاعر کی مقعد جا کر چھوتی ہے۔ بالآخر اسی ٹھول سے تنگ آکر اس نے ہرات سے سمرقند کی جانب رخ کیا۔

۴۷۔ شیخ الاسلام سیف الدین احمد تفتازانی۔ دیکھیں ورق ۱۵۴۔

۴۸۔ بنا۔ بنانے والا

۴۹۔ بحر متقارب۔ علم عروض میں ایک بحر کا نام جس کا وزن سالم آٹھ بار فعولن ہے۔

۵۰۔ بحر خفیف۔ ایک بحر کا نام جو عربی اشعار کی سولہ میں سے ایک۔ بحر کا نام جس کے اجزا دو بار فاعلاتن۔ مستفعلن۔ فاعلاتن ہیں۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۲۷۸۔۳۰۷)

۵۱۔ راست۔ موسیقی کے بارہ مقاموں میں سے ایک مقام۔

۵۲۔ نقش۔ ایک راگ خراسانیوں کا ایجاد کردہ

علی شیر بیگ نے بہت سی چیزوں کی اختراع کی تھی اس کے علاوہ بھی اگر کوئی شخص کسی نئی چیز کی اختراع کرتا تو اسے رواج و رونق دینے کے لئے علی شیر سے منسوب کر دیتا اور وہ چیز علی شیر کے نام سے مشہور ہو جاتی۔ بعض لوگ تو ہر نئی ایجاد کو بطور ظرافت علی شیری ہی کہنے لگے تھے۔ ایک مرتبہ علی شیر کے کان میں درد ہوا، اس نے رومال کو تکونہ بنا کر سر پر باندھ لیا چنانچہ اس کے بعد اس طرح سر پر رومال باندھنے کو علی شیری کہا جانے لگا۔ جب بنائی نے ہرات سے سمرقند جانے کا ارادہ کیا تو اس وقت اس نے پالان دوز سے اکہرا پالان [53] سلوایا اور اس کا نام علی شیری رکھا چنانچہ اس وقت سے وہ پالان علی شیری کے نام سے ہی مشہور ہو گیا۔[54]

سیفی بخاری:۔ ایک اور شاعر سیفی بخاری تھا علم کے اعتبار سے وہ واقعی ملا کہلانے کا مستحق تھا۔ چونکہ اس نے علم دین کے بارے میں مفصل کتابیں پڑھی تھیں اسی لئے اپنی ملایت ثابت کرنے کے لئے لوگوں کو اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کی فہرست دکھایا کرتا تھا۔ ایک دیوان بھی اس نے جمع کیا ایک دوسرا دیوان اس نے اہل حرفت کے واسطے لکھا جس میں اس نے ضرب الامثال کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ اس نے کوئی مثنوی نہیں کہی جس کی دلیل اس کا یہ قطعہ ہے:

مثنوی گرچہ سنّت شعراست

مَن غزل فرض عین می دانم

(شعر گوئی میں اگر چہ مثنوی روایت کی حیثیت رکھتی ہے لیکن میں غزل کو فرض عین سمجھتا ہوں)

پنج بیتی کہ دل پذیر بود

بہتر از خمسین می دانم

(اگر پانچ اشعار دل پذیر ہوں تو میں انہیں دو خمس سے بہتر سمجھتا ہوں)

فارسی زبان میں علم عروض [55] پر اس نے ایک سالہ بھی تالیف کیا ہے اگر چہ بہت مختصر ہے مگر ایک اعتبار سے مفصل ہے۔ مختصر اس اعتبار سے ہے کہ بہت سی ایسی باتیں جو مفید ہو سکتی تھیں وہ اس نے حذف کر دی ہیں۔ اور مفصل اسی لحاظ سے کہ وہ الفاظ جو واضح و روشن ہیں انہیں پورے نقاط اور اعراب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ شراب اس کثرت سے پیتا تھا کہ بدمست رہتا۔ اس کے گھونسے کی مار بہت سخت تھی۔

عبداللہ:۔ ایک اور شاعر عبداللہ تھا۔ جو مثنوی گوئی کے لئے بہت مشہور ہے (ورق ۱۵۷) جام کا رہنے والا تھا۔ اور ملاّ جامی کا بھانجا۔ ہاتفی تخلص کیا کرتا تھا۔ خمسہ (نظامی) کے جواب میں اس نے مثنویاں کہی ہیں ہفت پیکر کے جواب میں ہفت منظر لکھی اور سکندر نامہ کا جواب اس کی مثنوی تیمور نامہ ہے۔ تمام مثنویات میں سے اس کی لیلیٰ مجنوں زیادہ مشہور ہے لیکن لطافت کے اعتبار سے جو شہرت حاصل ہوئی وہ کیفیت اس مثنوی میں موجود نہیں۔

میر حسین معمائی:۔ پانچواں شاعر میر حسین معمائی تھا۔ فن معما گوئی میں اس نے جس قدر طبع آزمائی کی ہے شاید ہی کسی اور شاعر نے کی ہو۔ اس کا تمام وقت فکر معما گوئی میں ہی صرف ہوتا۔ عجب درویش منش، قانع اور بے آزار شخص تھا۔

محمد بدخشی:۔ ایک شاعر ملاّ محمد بدخشی تھا۔ اشکمش کا رہنے والا تھا۔ اگر چہ اشکمس کا شمار بدخشان میں نہیں ہوتا۔ لیکن حیرت ہے کہ وہ کیوں بدخشی تخلص لکھتا تھا۔ اس کا کلام ان شعراء کے کلام کے ہم پلّہ نہ تھا جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ فن معما میں اس نے ایک رسالہ لکھا ہے لیکن اس فن میں بھی وہ بہت اچھا شاعر نہ تھا۔ خوش گفتار ہمنشین تھا۔ بمقام سمرقند وہ میری خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

یوسف بدیعی:۔ ایک یوسف بدیعی تھا۔ ولایت فرغنہ کا رہنے والا، قصیدہ گوئی میں برا نہ تھا۔

آہی:۔ ایک اور شاعر آہی تھا۔ غزل خاص طرز میں کہتا۔ اواخر میں اس نے ابن حسین مرزا کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ اس کا دیوان بھی موجود ہے۔

۵۳۔ پالان۔ گھوڑے کی زین کے نیچے بچھانے کا کپڑا۔

۵۴۔ علی شیری۔ چنانچہ فیشن کوئی آج کا ہی رواج نہیں ازل سے چلا آ رہا ہے۔

۵۵۔ عروض۔ دیکھیں نوٹ ۲۷

محمد صالح:۔ ایک اور شاعر محمد صالح تھا[56]۔ اس کی غزلیات میں خاص چاشنی وحلاوت ہے مگر جس قدر حلاوت وچاشنی ہے اتنی ہمواری نہیں۔ ترکی میں بھی اشعار کہے ہیں جو بُرے نہیں۔ آخری دنوں میں شیبانی خاں کے پاس چلا گیا تھا۔ جس نے اس کو بہت سی مراعات عطا کیں۔ ترکی زبان میں اس نے ایک مثنوی کہی تھی جو اس نے شیبانی خاں سے ممنون کی تھی۔ یہ مثنوی بحر مدس مجنون [57] میں ہے۔ اسی بحر میں ملاّ جامی نے مثنوی سبحۃ الابرار کہی ہے۔ صالح کی مثنوی کے اشعار ست اور مضامین فرسودہ ہیں۔ جنہیں پڑھنے سے قاری کے دل میں اس شاعر کے لئے اعتماد باقی نہیں رہتا۔[58] اس کا ایک عمدہ شعر یہ ہے:

بولدی تنبل غہ وطن فرغانہ
قیلدی فرغانہ تنبل خانہ

(ایک فربہ تنبل (کاہل) آدمی نے فرغنہ کو اپنا وطن بنایا۔ گویا فرغنہ تنبل خانہ (کاہل خانہ) بن گیا)

ولایت فرغنہ کو تنبل خانہ بھی کہتے ہیں۔ اب مجھے یہ علم نہیں کہ اس کا یہ شعر اس کی مثنوی میں بھی ہے یا نہیں۔ وہ شر پسند، طبعاً ظالم اور بے رحم آدمی تھا۔

حسین کامی:۔ ایک اور شاعر شاہ حسین کامی تھا۔ غزل گو شاعر تھا۔ اس کے اشعار برے نہ تھے۔ غالباً ایک دیوان بھی اس نے مرتب کیا تھا۔

ہلالی:۔ ایک اور شاعر ہلالی ہے، جو اس وقت بقید حیات ہے۔ اس کی غزلیات ہموار و رنگین ہیں مگر مطالب سطحی۔ اس کا دیوان بھی ہے شاہ و درویش کے عنوان کے تحت، بحر خفیف میں اس نے ایک مثنوی بھی کہی ہے۔ اگرچہ بعض اشعار اچھے ہیں مگر مجموعی پوری مثنوی کا مضمون ست اور بندش خراب ہے۔ شعرائے متقدین نے عشق دعاشقی کے میدان میں جو مثنویاں کہی ہیں ان میں اس امر کا التزام کیا ہے کہ عاشق مرد ہوتا ہے اور معشوق کوئی عورت۔ ہلالی نے درویش کو عاشق بنا کر پیش کیا ہے اور شاہ کو معشوق۔ شاہ کے انداز اور اس کی گفتار کو جس پیرائے میں بیان کیا گیا ہے وہ اشعار رکیک وعامیانہ ہیں۔ کسی مثنوی کی طرح ریزی میں کسی نوجوان کو معشوق بنا کر پیش کرنا اور وہ بھی کسی بادشاہ کو نہایت ہی بے ہودہ قدم ہے کسی شاعر کے لئے یہ زیبا نہیں کہ وہ اپنے معشوق کو کسی فاحشہ کے کردار میں پیش کرے۔ اس کا حافظہ بہت قوی تھا۔ چالیس ہزار اشعار اسے یاد تھے۔ کہا جاتا ہے کہ خمسہ شاعری میں اسے بیشتر خمیس از بر تھیں۔ علم عروض وقافیہ میں اس کا ذہن بہت رسا تھا۔

اہلی:۔ ایک اور شاعر اہلی ہے۔ عامیانہ قسم کا آدمی ہے مگر اشعار برے نہیں۔ صاحب دیوان شاعر ہے۔

خطاط

اگرچہ اس فن کے ماہر بہت سے خوش نویس ہیں لیکن نسخ تعلیق نویسی میں سلطان علی مشہدی [59] کا نام پیش پیش ہے۔ (ورق ۱۵۸) اس نے مرزا اور علی بیگ کے لئے بہت سے نسخوں کی کتابت کی ہے۔ وہ ہر روز مرزا کے لئے تیس بیت اور علی شیر بیگ کے لئے بیس شعر لکھا کرتا تھا۔

مصوّر

مصوّروں میں نامور مصوّر بہزاد تھا[60]۔ اس کی تصاویر میں عجیب نزاکت پائی جاتی ہے۔ لیکن بے ریش آدمی کے چہرے کی تصویر کشی عمدہ نہیں کرتا تھا۔ تھوڑی کو بہت کشادہ بنا کر پیش کرتا تھا۔ لیکن باریش آدمی کے چہرے کی خوب تصویر کشی کرتا تھا۔

۵۶۔ محمد صالح۔ شاعر، جس نے محمد شیبانی خاں کے لئے تاریخ شیبانی نامہ نظم کی۔ خان زادہ بیگم جو بابر کی بہن تھیں اور شیبانی خاں کے تعلقات سے متعلق دیکھیں نوٹ ۳۴ سن ۸۹۹ کے حالات میں۔

۵۷۔ بحر مسدس مجنوں (رمل) مسدس میں چھ اشعار اور بحر رمل میں دوبار فاعلاتن۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن ہیں۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ ۲۷۸۔ ۳۰۷)

۵۸۔ بابر کیونکہ ان حالات کا خود چشم دید گواہ اور حصہ دار ہے اس لئے اس کو ان واقعات کی غلط بیانی کا علم ہے۔

۵۹۔ سلطان علی مشہدی خطاط۔ مرزا حیدر دوغلت کے مطابق انہوں نے آداب خطاطی پر کتاب بھی لکھی تھی اور ان کی لکھی ہوئی کتب شاہی کتب خانوں کی زینت تھیں۔ (تاریخ رشیدی ورق ۱۶۳)

۶۰۔ بہزاد۔ دیکھیں نوٹ ۳۱

دوسرا مصور شاہ مظفر[61] تھا۔ اس کی تصویر کشی میں بھی بہت زیادہ نزاکت پائی جاتی تھی۔ اس کی عمر نے زیادہ وفا نہ کی، ابھی وہ ترقی کی منازل طے کر رہی تھا کہ راہی عالم بقا ہوا۔

موسیقار

قانون نوازی میں جو ملکہ خواجہ عبداللہ مروارید کو حاصل تھا وہ کسی دوسرے کے نصیب میں نہیں آیا تھا۔ اس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔[62]

قل محمد عودی غیچک[63] نوازی میں اسے مہارت حاصل تھی۔ اس ساز پر اس نے تین مزید تاروں کا اضافہ کیا تھا۔ اہل نغمہ اور اہل ساز میں شاید کسی شخص نے اس قدر عمدہ دھنیں ایجاد کی ہونگی۔

ایک اور موسیقار شیخی نے[64] نواز تھا۔ عود[65] اور غیچک نوازی میں بھی اسے ملکہ حاصل تھا۔ بارہ تیرہ سال کی عمر سے ہی اس نے اس فن میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ ایک مرتبہ بدیع الزماں کی محفل میں اس نے ایسی نے نوازی کی کہ سماں بندھ گیا۔ قل محمد اپنے غیچک سے عمدہ و پاکیزہ سر نکالتا تھا۔ شیخی کے بارے میں ایک بات کہی جاتی ہے۔ نغمات کی شناخت میں اسے وہ مہارت حاصل تھی کہ وہ جو بھی نغمہ سنتا فوراً بتا دیتا کہ فلاں شخص نے فلاں دھن پر یہ سر نکالے ہیں لیکن اس نے کوئی بہت زیادہ دھنیں تیار نہیں کیں۔ بس ایک دو ہی اس کی یادگار باقی رہ گئی ہیں۔

ایک اور موسیقار شاہ قلی غیچک نواز تھا۔ عراق کا رہنے والا تھا۔ خراسان میں آ کر بس گیا تھا۔ اس نے اس ساز پر خوب ریاض کیا اور اس فن میں ترقی کی۔ نقش اور پیشرو نامی دھنوں میں نام کمایا۔

ایک اور موسیقار حسین عود نواز تھا۔ اس ساز پر وہ بہت عمدہ سر نکالتا تھا۔ اور جو نغمہ بھی پیش کرتا اس میں ایک کیفیت ہوتی۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ عود کے سب تاروں کو ایک دُھن پر لے آتا اور سب کو ملا کر ان سے ایک نئی سُر نکال سکتا تھا۔ لیکن اس میں اگر کوئی عیب تھا تو بس یہ تھا کہ اپنے فن کے مظاہرے میں ناز اور نخرے بہت دکھاتا تھا۔ ایک مرتبہ شیبانی خاں نے اس سے عود نوازی کی فرمائش کی۔ اس نے بہت ہی ناز دکھائے اور وہ سماں بھی نہ باندھ سکا۔ جو اس کے فن کا خاصہ تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنا ساز تک لے کر نہیں آیا بلکہ کہیں سے کوئی بے کار چیز اٹھا لایا تھا۔ شیبانی خاں سمجھ گیا چنانچہ اس نے حکم دیا کہ اسی محفل میں اس کی اچھی طرح گدی پر ماریں شیبانی خاں نے اگر دنیا میں کوئی بھلا کام کیا تو بس یہی ایک تھا۔ اس مزاج کے لوگوں کو اس سے زیادہ ہی سزا ملنی چاہئے۔

ایک موسیقار غلام شادی تھا۔ وہ شادی قوال کا بیٹا تھا۔ اگر چہ ساز خوب بجاتا تھا لیکن جن موسیقاروں کا ذکر گزر چکا ہے وہ ان کے زمرے میں نہیں آتا تھا۔ آواز سریلی پائی تھی اور نقش نامی دھن پر خوب سر نکالتا تھا۔ اس کے زمانۂ حیات میں نہ کسی نے ایسی سریلی آواز پائی تھی اور نا ہی نقش دھن میں سے ایسے سُر نکالے تھے۔ آخری دنوں میں شیبانی نے اسے محمد امین جان قراخانی کے پاس بھیج دیا تھا۔ اس کے بعد اس کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکا۔

ایک اور موسیقار میر عزّ تھا۔ وہ ساز نوازی نہیں کرتا تھا بلکہ دھنیں تیار کرتا تھا۔ اگر چہ اس کی اس فن میں تصنیفات بہت کم ہیں مگر جو بھی ہیں بہت عمدہ ہیں۔

بنائی شاعر ہی نہیں بلکہ نغمات کا مصنف بھی تھا۔ فن ساز وصدا میں اس کی کئی تصانیف ہیں۔

بے مثال لوگوں میں ایک پہلوان محمد بوسعید[66] تھا۔ فن کشتی گیری میں سربرآوردہ شخص تھا۔ وہ شعر بھی کہتا تھا، اس نے ساز وصدا دونوں ہی فنون میں نغمات ایجاد کیے۔ چنانچہ نقش میں اس نے چارگاہ نامی بہت عمدہ دھن تیار کی (ورق ۱۵۹) خوش گفتار آدمی تھا۔ ایک پہلوان میں ایسے اوصاف کا جمع ہو جانا واقعی عجیب بات تھی۔

جس وقت سلطان حسین مرزا نے اس عالم فانی سے کوچ کیا تو اس وقت شاہزادگان میں بدیع الزماں

۶۱۔ شاہ مظفر دیکھیں نوٹ ۳۲

۶۲۔ قانون۔ دیکھیں نوٹ ۳۳

۶۳۔ غیچک۔ سارنگی کو کہتے ہیں (شاہ ۱۳۸) جس پر قل محمد نے تین تاروں کا اضافہ کیا تھا۔

۶۴۔ نے۔ دیکھیں نوٹ ۲۹

۶۵۔ عود۔ دیکھیں نوٹ ۳۰

۶۶۔ ان پہلوان کے حالات میر علی شیر نوائی نے ایک کتاب کی صورت میں تحریر کیے ہیں۔

وسط ایشیا کے ساز۔ قانون سیدھے ہاتھ پر سب سے اوپر ہے۔

اور مظفر حسین مرزا وہاں موجود تھے۔ مظفر حسین مرزا باپ کو بہت پیارا تھا۔ اس کا آتکہ (دایہ کا شوہر) محمد برندوق برلاس اس کا صاحب اختیار امیر تھا۔ اس کی والدہ خدیجہ بیگم تھیں جو مرزا کی باوقار زوجہ تھیں۔ ان وجوہ کی بنا پر لوگوں کا بیشتر رجحان مظفر حسین مرزا کی جانب ہی تھا۔ اسی بنا پر بدیع الزماں مرزا عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ اور اس کا ارادہ آنے کا نہیں تھا۔ مظفر حسین مرزا اور محمد بیگ مرزا خود گھوڑوں پر سوار ہو کر اس کے پاس پہنچے اور اس کے دل میں جو خدشات تھے وہ دور کیے۔ مرزا سلطان حسین کا جنازہ ہرات لایا گیا اور شاہانہ آئین و مراسم کے مطابق اس کی تدفین اس کے ہی تعمیر کردہ مدرسے میں کی گئی۔ ان ہی دنوں میں ذوالنون بیگ مرزا بھی وہیں موجود تھا۔ محمد برندوق کے علاوہ سلطان حسین مرزا کے دیگر اقربا بھی وہیں قیام پذیر تھے۔ چنانچہ دونوں سلاطین اور تمام امرا یک جا جمع ہوئے اور اس امر پر ان کا اتفاق ہوا کہ بدیع الزماں مرزا کا صاحب اختیار امیر ذوالنون بیگ اور مظفر حسین کا محمد برندوق۔ بدیع الزماں مرزا کی جانب سے داروغہ شہر شیخ علی طغائی کو مقرر کیا گیا اور مظفر حسین مرزا کی طرف سے مرزا یوسف علی کوکلتاش کو، یہ بھی عجیب اتفاق تھا کیوں کہ اس سے پہلے یہ کبھی نہیں سنا گیا تھا کہ بادشاہی میں بھی شرکت کار فرما ہوتی ہے۔ اور یہ بات (ورق ۱۵۹ ب) حضرت شیخ سعدی کے قول کے بالکل برعکس واقع ہو رہی تھی۔ چنانچہ گلستان میں فرماتے ہیں:۔

دہ درویش یک گلیم بخسپند   ودو بادشاہ دراقلیمی نگنجند[۶۷]

(دس درویش ایک کمبل کے نیچے سو سکتے ہیں۔ لیکن دو بادشاہ ایک اقلیم میں نہیں سما سکتے)

۶۷۔ دہ درویش۔ دیکھیں نوٹ ۲ حالات ۹۱۰ھ

واقعات ۹۱۲ھ

(۱۴ مئی ۱۵۰۶ء - ۱۲ مئی ۱۵۰۷ء)

ماہ محرم میں ازبکوں کے حملے کو پسپا کرنے کے لئے ہم نے خراسان کی جانب کوچ کرنے کا عزم کیا چنانچہ غور بند اور شبرتو کے راستے سے اس طرف روانہ ہوئے۔

جہانگیر مرزا چونکہ ان ولایات سے ناراض ہو کر آیا تھا اس لئے اس امر کا احتمال تھا کہ اس کے قبائل میں کچھ لوگ وہاں فتنہ بپا کر سکتے ہیں۔ اس خدشے کا سدِ باب کرنے کے لئے ہم نے اشتر شہر میں اپنے خاندان کو خیر باد کہا اور انہیں ولی خازن اور دولت قدم قراول کے افراد کی تحویل میں دے کر اپنے سوار دستے کے ہمراہ تیزی سے روانہ ہوئے۔ اس روز ہم قلعہ ضحاک میں قیام پذیر ہوئے۔ وہاں سے کوتل گنبذک کی راہ روانہ ہوئے۔ سایقان کو زیر کر کے اور درہ دندان شکن سے گزر کر درۂ کہمرد کے سبزہ زار میں فروکش ہوئے۔ سیّد افضل خوابین کو سلطان محمد دولدی کے ہمراہ سلطان حسین مرزا کے پاس روانہ کیا تا کہ وہ کابل سے روانہ ہونے کی خبر پہنچائے۔

جہانگیر مرزا ہم سے ذرا پیچھے رہ گیا تھا۔ جس وقت وہ بامیاں پہنچا تو بیس تیس آدمی اس کے ہمراہ تھے وہ ان کے ہمراہ آگے بڑھا جس وقت وہ وہاں آیا تو اسے ہمارے ان افراد خاندان کے خیمے نظر آئے جو سامان کے ساتھ ہم سے پیچھے رہ گئے تھے۔ اس خیال کے تحت کہ ہم وہاں موجود ہیں وہ فوراً ہی وہاں سے واپس ہوئے اور ہر چیز سے بیزر و بے نیاز ایسے سر پر پیر رکھ کر بھاگے کہ پیچھے تک مڑ کر نہ دیکھا اور یکہ اولنگ نامی مقام جا کر ہی انہوں نے دم لیا۔

ناصر مرزا کی ازبکوں پر فتح

اس زمانے میں شیبانی خاں نے بلخ کا محاصرہ کر رکھا تھا اور سلطان قلنچاق وہاں موجود تھا۔ شیبانی خاں نے (ورق ۱۶۰) دو تین شاہزادوں کو تین چار ہزار افراد کے ساتھ بدخشان پر حملہ کرنے کے لئے بھیج رکھا تھا۔ ان ہی دنوں میں ناصر مرزا کے پاس مبارک شاہ اور زبیر پہنچے اور اس کے ہمراہ ہو گئے۔ اگر چہ اس سے قبل ان میں باہمی عداوت وکدورت تھی لیکن اب دریائے کشم کی جانب شاخدان میں خیمے نصب کر کے وہاں مقیم تھے۔ ازبکوں نے علی الصباح وہاں پہنچ کر ناصر مرزا پر شبخون مارا۔ وہ فوراً ہی وہاں سے پسپا ہو کر پشتے کے نزدیک پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اپنے آدمیوں کو جمع کیا اور شادیانہ بجاتا ہوا روانہ ہوا۔ اس نے روانگی کے فوراً بعد ہی ازبکوں پر حملہ کیا اور ان پر غالب آیا۔ اس کے بعد اس نے آگے کوچ کیا۔ اس وقت دریائے کشم چڑھاؤ پر تھا۔ اس حملے میں بہت سے لوگ تو تیر و شمشیر کے شکار ہوئے، کثیر تعداد میں گرفتار ہو کر آئے اور کافی وافر مقدار میں غرق دریا ہوئے۔ مبارک شاہ اور زبیر دریائے کشم کی جانب مرزا سے بلند تر مقام پر تھے۔ ازبکوں کا وہ دستہ جوان پر حملہ کرنے کی غرض سے اپنے لشکر سے علیحدہ ہو گیا تھا اس نے انہیں ایسا پسپا کیا کہ انہوں نے فرار ہو کر پشتے پر پناہ لی۔ جس وقت ناصر مرزا نے اپنے دشمن کو زیر کر کے اسے فرار ہونے پر مجبور کر دیا تو اسے یہ اطلاع ملی کہ دشمن نے مبارک شاہ اور زبیر کو بھگا دیا ہے۔ انہیں زیر کرنے کے لئے اس نے ایک دستہ روانہ کیا۔ ادھر اوپر سے کوہستانی امرا اپنی سوار اور پیادہ فوج کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اس کیفیت میں ازبک وہاں ٹھہرنے کی تاب نہ لا سکے اور وہاں سے فرار ہو گئے۔ ادھر سے بہت سے لوگ جنگ میں کام آئے، بہت سے تیر و شمشیر کا نشانہ بنے اور کچھ غرق دریا ہوئے۔ شاید اس جنگ میں تقریباً ہزار یا ڈیڑھ ہزار ازبک سپاہی قتل ہوئے ہوں گے۔ یہ مرزا

ناصر کی واقعاً ایک کامیاب فتح تھی۔ اس کی اطلاع ہمیں اس وقت ملی جب کہ ہم کہمرد میدان میں خیمہ زن تھے۔ اور اسے ناصر مرزا کے ایک آدمی نے ہم تک پہنچایا۔

خراسان روانگی

جس وقت ہم کہمرد کے نواح میں مقیم تھے اور ہمارے لشکر کے سپاہی غوری اور دہنہ سے غلّہ لے کر آرہے تھے تو اسی کے نواح میں سیّد افضل اور سلطان محمد دولدائی کے خطوط خراسان سے ملے کیوں کہ ان دونوں کو ہماری طرف سے خراسان بھیجا گیا تھا۔ ان خطوط میں سلطان حسین مرزا کے فوت ہونے کی خبر تھی۔

اس خاندان کے نام و ناموس کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہم نے خراسان کی جانب جانے کا عزم کیا اگر چہ اس عزم و ارادے میں دیگر اغراض بھی پنہاں تھیں[1]۔ ذرّہ آجر سے گزرتے ہوئے توپ اور مندا غان کے راستے سے ہم نے بلخاب کے درّون کو پار کیا اور وہاں سے صاف نامی پہاڑوں پر نکل آئے۔ سان اور چار یک نامی جگہوں پر ہمیں ازبکوں کے حملہ آور ہونے کی اطلاع ملی۔ قاسم بیگ کی سرکردگی میں ہم نے اپنا لشکر ان سرکشوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ لشکر روانہ ہوا، دونوں ایک دوسرے کے مقابل آئے انہیں اچھی طرح زیر کر لیا گیا۔ ہمارے سپاہی دشمن کی سپاہ کے بہت سے سر کاٹ کر اپنے ساتھ لائے۔

جہانگیر مرزا اور ایماق قبائل کے پاس آدمی روانہ کئے گئے۔ ان کی طرف سے خبر آنے کے انتظار میں ہم چند روز بیلاغ کوہ اور صاف کوہ نامی مقامات پر مقیم رہے۔ یہاں کے گرد و نواح میں ہرن بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ ان کا شکار بھی کیا گیا۔ ایک دو دن بعد تمام ایماق قبائل پہنچ گئے اور میری ملازمت اختیار کر لی اگر چہ ایماق قبائل کے پاس جہانگیر مرزا نے ہر چند آدمی بھیجے۔ ایک مرتبہ تو اس نے عمادالدین مسعود کو بھی ان کے پاس بھیجا، وہ اس کے پاس تو نہیں گئے البتہ میرے پاس آگئے۔ بالآخر مرزا کو ہی ہماری ضرورت پیش آئی۔ کوہ صاف سے گزر کر وہ درّہ بامی میں پہنچا اور وہاں وہ میری خدمت میں حاضر ہوا ہمیں خراسان کے بارے میں تشویش تھی۔ ہم مرزا اور ایماق قبائل کی پرواہ کئے بغیر روانہ ہوئے۔ گرزوان، المار، قیصار، چیچکتو سے گزر کر ہم نے فخر الدین الوم نامی جگہ کو پار کیا اور بادغیس کے تابع بام نامی درّے میں پہنچ گئے۔

چوں کہ افراتفری کا عالم تھا۔ اسی لئے جس کا بھی بس چلتا دست اندازی کرتا اور ولایت نیز قوم و قبائل کے افراد سے کوئی نہ کوئی چیز زبردستی حاصل کر لیتا۔ ہم نے بھی وہاں کے گرد و نواح میں آباد ترک اور دیگر قبائل پر محصول لگا دیا اور (ورق ۱۶۱) وصول کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح ایک دو ماہ کے عرصے میں شاید تین سو کبک خاں[2] کے عہد کے تومان[3] جمع کر لئے۔

ہماری آمد سے چند روز قبل ازبک حملہ آوروں کو جنہیں خراسان کی جانب بھیجا گیا تھا۔ ذوالنون کی سپاہ نے پندرہ اور مرچاق نامی جگہوں پر اچھی طرح زیر کر لیا۔ اس حملے میں بہت سے ازبک مارے گئے۔

بدیع الزماں مرزا، مظفر حسین مرزا، محمد برندوق برلاس، ذوالنون ارغون کے فرزند شاہ بیگ نے یہ عزم کیا کہ شیبانی خاں کی طرف رُخ کیا جائے کیوں کہ اس وقت اس نے بلخ میں سلطان قلیچاق کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اس مقصد کے تحت سلطان حسین مرزا کے تمام فرزندگان کو طلب کرنے کی خاطر آدمی روانہ کئے گئے۔ اس عزم کے مدّ نظر وہ ہرات سے باہر آئے۔ جس وقت وہ بادغیس پہنچے تو مرو سے روانہ ہو کر ابوالحسن مرزا چہل دختراں نامی مقام پر پہنچ گیا۔ کپک مرزا اس وقت مشہد میں تھا۔ اس کے پاس ہر چند آدمی روانہ کئے گئے مگر نہیں آیا بلکہ وہاں بیٹھا نامعقول اور بزدلی کی باتیں کرتا رہا۔ جس کے باعث اس کے اور مظفر حسین مرزا کے درمیان باہمی چشمک و عصبیت تھی۔ اس کا یہ دعویٰ تھا کہ اب وہ بادشاہ ہے اور میں اس کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے کیسے جا سکتا

۱۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ تو ازبک تھے۔

۲۔ کبک خاں۔ چنگیز خاں کے دوسرے بیٹے چغتائی خاں کی حکومت مرکزی ترکستان پر تھی۔ اس کا انتقال ۶۳۹/۱۲۴۱ میں ہوا۔ اس کی اولاد میں جتنے بھی خاں ہوئے وہ غیر معروف ہیں۔ کبک خاں ۷۰۹/۱۳۰۹ میں تخت پر بیٹھے اور ۷۲۷/۱۳۲۶ تک حکمراں رہے حالانکہ اس دوران میں انہوں نے اپنے بڑے بھائی کے لئے کچھ عرصے کے لئے تخت چھوڑ دیا تھا۔ یہ مسلمان نہیں تھے اور ان کو منگولوں کی خانہ بدوش زندگی بھی پسند نہیں تھی۔ اسی لئے انہوں نے قرشی میں ایک محل اپنے لئے تعمیر کیا اور ان کے آخری زمانے میں ہی مرکزی ترکستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ مغلستان جس کی تاریخ و تعلق مرزا حیدر دوغلت سے ہے اور ماوراء النہر جس کا تعلق امیر تیمور اور ان کی اولاد سے ہے۔ (تاریخ رشیدی ص ۳۶، ترکستان ص ۱۳۶، منگول ایمپائر ص ۲۱۴)

۳۔ تومان۔ ایک تومان دس ہزار سکہ رائج الوقت۔

ہوں۔ اس نے یہ بات اپنے دل میں گرہ کی طرح باندھ لی۔ اور اس کی اسی بات نے اس وقت جب کہ سب بھائی او خورد وکلاں یکجا جمع ہو گئے تھے اور شیبانی خان جیسے دشمن کی سرکوبی کے لئے مصمّم ارادہ کئے ہوئے تھے سارے ارادوں پر پانی پھیر دیا۔ وہ ہرگز نہ آیا۔ اگر چہ وہ اپنے اس اقدام کو ذاتی عصبیت پر محمول سمجھتا ہے مگر لوگ اس کو بزدلی و نامردی پر ہی محمول کریں گے۔ اس دنیا میں مرنے کے بعد انسانوں کے اعمال ہی باقی رہ جائیں گے۔ جو بھی شخص عقل و دانش سے بہرہ ور ہوگا وہ بھلا کب ایسی حرکت کا مرتکب ہوگا کہ مرنے کے بعد اسے بُرا کہا جائے۔ اور جس کسی میں ذرا بھی عقل و شعور ہے وہ کب ایسا اقدام کرے گا کہ مرنے کے بعد اسے خوبیوں سے یاد نہ کیا جائے۔ دانشمندوں کا قول ہے کہ ذکرِ خیر حیات ثانی ہے۔[۴]

میرے پاس بھی ایلچی آئے۔ ان کے بعد محمد برندوق برلاس بھی میرے پاس آیا، میں نے سوچا کہ اب جب کہ میں دو سو فرسنگ راہ چل کر اس مقصد کے پیش نظر آیا ہوں تو کیوں نا جاؤں۔ محمد برندوق بیگ کو ساتھ لے کر میں نے فوراً اس طرف کا رُخ کیا۔ اس وقت مرزا اور تیموری شاہزادگان دریائے مرغاب تک پہنچ چکے تھے۔

مرزاؤں سے ملاقات

بروز پیر آٹھ جمادی الآخر تیموری شہزادگان سے میری ملاقات ہوئی۔ ابوالحسن مرزا پیشوائی کے لئے آدھا کردہ چل کر آیا۔ جیسے ہی ہم دونوں ایک دوسرے کے نزدیک پہنچے تو اِس طرف تو میں اور اُس طرف ابوالحسن مرزا اپنے اپنے گھوڑے سے نیچے اترے۔ ہم آگے بڑھے، ایک دوسرے سے ملاقات کی اور اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ تھوڑی ہی دور آگے چل کر ہم لشکرگاہ کے نزدیک پہنچ گئے۔ یہاں مظفر حسین مرزا اور ابن حسین مرزا ہمارے استقبال کے لئے آگے آئے۔ یہ دونوں چوں کہ ابوالحسن مرزا سے عمر میں کم تھے اسی لئے مناسب تو یہی تھا کہ پیشوائی کے لئے وہ پہلے آئیں غالباً اس تاخیر کی وجہ غرور تکبر نہیں بلکہ شراب کا خمار ہوگا اور یہ کوتاہی عیش و عشرت کے باعث ہوئی ہوگی۔ اس کدورت کو دور کرنے کے لئے مظفر حسین مرزا نے بہت زیادہ عذر خواہی کی۔ گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے ہماری ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی۔ ابن حسین مرزا نے بھی ملاقات اسی طریقے سے کی، ہم آگے کی طرف بڑھے اور بدیع الزماں مرزا کے (ورق ۱۶۲) دولت کدے پر پہنچ کر اس کے دروازے پر اُترے۔ یہاں عجیب جم غفیر اور اژدھام تھا۔ لوگوں کے ہجوم کا یہ عالم تھا کہ بعض لوگوں کے پیر تو تین تین چار چار قدم تک زمین پر پڑتے ہی نہیں تھے (بلکہ دوسروں کے پاؤں ان کے پیروں تلے آرہے تھے) جو لوگ کسی بنا پر اور ضروری کام کے لئے واپس جانا چاہتے تھے (راستہ بنانے کے لئے) چار پانچ قدم پیچھے ہٹنا پڑتا تھا۔

ہم چلتے چلتے بدیع الزماں مرزا کے شامیانہ دیوان خانے میں داخل ہوئے۔ یہ بات طے پائی تھی کہ میں جیسے ہی بدیع الزماں مرزا کے دولت کدے میں داخل ہوں وہاں دوزانوں چوکی پر بیٹھ جاؤں۔ بدیع الزماں اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس چوکی تک آئے گا اس کے بعد ہماری ایک دوسرے سے ملاقات ہوگی۔ میں جیسے ہی اس کے شامیانے میں داخل ہو کر جھکا۔ میں نے فوراً ہی یہ محسوس کر لیا کہ بدیع الزّماں کچھ زیادہ ہی آہستگی سے اپنی جگہ سے اُٹھ رہا ہے اور سست قدموں سے چل کر آرہا ہے۔ قاسم بیگ چونکہ میرا خیر خواہ تھا اور اس کی عزت و ناموس میری عزت و آبرو سے وابستہ تھی اسی لئے اس نے میری کمر کی پیٹی پکڑ کر کھینچی اب میں پوری کیفیت سے باخبر تھا چنانچہ میں بھی بہت آہستہ آہستہ چل کر آگے بڑھا اور ملاقات کی جو جگہ متعیّن تھی وہاں پہنچ گیا۔

اس شامیانے میں چار جگہ بڑے بڑے سفید گدّے لگا دیۓ جاتے تھے۔ آج بھی شامیانے میں گدّے اسی طرح لگائے گئے تھے کہ ان میں سے ایک دروزے کے پاس بچھا رہتا تھا اور یہیں بدیع الزماں مرزا اور مظفر حسین مرزا بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک اور گدّا دائیں جانب صدر نشینی کی جگہ بچھا دیا گیا تھا، ابوالحسن مرزا اور

۴۔ یہاں بابر کس قدر حقیقت پسندانہ اور تاریخی بات کہہ گیا ہے۔ ان ہی ناچاقیوں اور آپس کی نااتفاقیوں کی وجہ سے تیموریوں پر ماوراء النہر میں زوال آیا۔

میں اس گدے پر بیٹھے۔ بدیع الزماں کے گدے سے ذرا نیچے بائیں جانب ایک اور گدا لگایا گیا تھا جس پر قاسم سلطان ازبک اور ابن حسین مرزا بیٹھے۔ دراصل قاسم سلطان ازبک کا شمار شیبان سلاطین میں ہوتا تھا۔ میری دائیں جانب اس گدے سے ذرا نیچے جس پر میری نشست تھی ایک اور گدا بچھایا گیا تھا۔ جہانگیر مرزا اور عبداللہ مرزا اس گدے پر بیٹھے تھے۔ دائیں جانب قاسم سلطان اور ابن حسین مرزا کی نشست گاہ سے بہت نیچے محمد برندوق بیگ، ذوالنون بیگ اور قاسم بیگ بٹھائے گئے تھے۔

کھانے کے پیالے دسترخوان پر چنے گئے اگرچہ یہ کوئی ایسا موقع ومحل نہ تھا کہ جہاں کھانے پینے کا اہتمام کیا جائے۔ پینے کے لئے شربت رکھا گیا تھا جس کے ساتھ سونے اور چاندی کی صراحیاں رکھی گئی تھیں۔ ہمارے آباواجداد چنگیزی آداب ورسوم[5] کا بڑا پاس کیا کرتے تھے۔ خواہ مجلس ہو یا دیوان خانہ یا تقریب ضیافت وہ نشست و برخواست میں آداب چنگیزی کی کبھی خلاف ورزی نہیں کرتے تھے اگرچہ چنگیزی اصول و قواعد کی کوئی بندش و پابندی نہیں لیکن بہتر یہی ہے کہ آدمی ان ہی آداب معاشرت کی پیروی کرے جو اُسے ترکے میں ملے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی اگر کسی کے باپ نے کوئی بُری رسم جاری کی ہو تو اس کے فرزند کو چاہئے کہ وہ اسے اچھائی میں تبدیل کردے۔

اس کے بعد ہم اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور جس جگہ قیام پذیر ہوئے وہاں ہمارے اور ان کے خیموں کے درمیان ایک شرعی کروہ کا فاصلہ تھا۔

بدیع الزماں مرزا جب دوسری مرتبہ ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو اس کی تعظیم و تکریم میں پہلی سی گرم جوشی نہ تھی۔ میں نے محمد برندوق بیگ اور ذوالنون مرزا کے ذریعے اسے یہ پیغام بھجوایا کہ اگرچہ میں سن وسال کے اعتبار سے کم عمر[6] ہی سہی لیکن مرتبے میں ان سے بلند تر ہوں۔ میرے آباواجداد کا پایا تخت شہر سمرقند رہا ہے۔ میں نے دو مرتبہ اسے تلوار کے بل پر حاصل کیا، اور اس پر متمکن ہوا ہوں۔ (ورق ۱۶۳) اس خاندان کی عزت و ناموس کی خاطر ایسا کون شخص ہے جس نے اغیار سے اتنی جنگ وجدال کی ہیں جتنی میں کرچکا ہوں۔ اس کے باوجود تعظیم میں تاخیر بے وجہ ہے۔ چوں کہ میری بات معقول تھی اسی لئے وہ یہ بات سن کر قائل ہوگئے اور میری خاطر خواہ عزت و تعظیم کی۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب میں بدیع الزماں مرزا سے ملاقات کرنے کے لئے گیا تو اس نے نماز ظہر کے بعد محفل بادہ نوشی کا اہتمام کیا۔ اگرچہ میں اس زمانے میں مے نوشی نہیں کرتا تھا مگر اس نے یہ عجیب وغریب محفل آراستہ کی تھی۔ طباقوں میں ہر قسم کی خوراک کو سجایا گیا تھا۔ کباب مرغ و کباب قاز کے ساتھ ہر قسم کا کھانا موجود تھا۔ میں نے بدیع الزمان مرزا کی محفل آرائی کی بہت تعریف سنی تھی اور بلا مبالغہ وہ شایان شان آراستہ محفل تھی۔ دریائے مرغاب کے کنارے اس نے دو تین مرتبہ مے نوشی کی محفل آراستہ کی جس میں میں بھی موجود تھا۔ چونکہ وہ اس امر سے واقف تھے کہ میں میخواری نہیں کرتا اسی لئے وہ مجھے پیش نہیں کی گئی۔

میں نے ایک مرتبہ مظفر حسین مرزا کی بھی مجلس میں شرکت کی۔ حسن علی جالایر اور میر بدر کا شمار اس کے ملازمین میں ہوتا تھا۔ وہ بھی اس وقت وہاں موجود تھے۔ جس وقت محفل کیف و سرور کے عالم میں اپنے شباب پر تھی تو میر بدر اس حالت میں ناچنے لگا اور بہت اچھا ناچا اور جس ترنگ میں وہ ناچ رہا تھا وہ شاید اسی کی اپنی اختراع کردہ تھی۔

یہ سلاطین شہر ہرات کے باہر جمع ہوئے اور اس میں انہیں تین چار ماہ کا عرصہ لگا۔ سلطان قلنچاق نے تنگ آکر قلعہ بلخ کو ازبکوں کے حوالے کردیا۔ بلخ پر قبضہ کرلینے کے بعد جب انہیں یہ اطلاع ملی کہ مرزا کی افواج وہاں جمع ہورہی ہیں تو وہ سمرقند کی جانب واپس چلے گئے۔ اگرچہ سلاطین لفاظی حاشیہ آرائی اور آداب معاشرت میں اچھے تھے مگر فن سپہ گری، آداب جنگ وجدال اور مردانگی اور دلیری کے طور وطریق سے قطعی بے بہرہ۔

۵۔ یاسا اور تورہ چنگیزی۔ یاسا ان قوانین کا مجموعہ جو چنگیز خاں نے وضع کئے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو حکومت کو زوال نہیں آسکتا۔ چنگیز خاں سے پہلے منگولوں میں رسم الخط رائج نہیں تھا۔ جب انہوں نے اوغوز رسم الخط اپنایا تو اصول حکومت تحریر میں آنے لگے۔ چنگیز خاں نے قوریلتائی ۶۰۳/۱۲۰۶ کی مجلس میں ان کو نافذ کیا تھا۔ اس کا سب سے پہلے ذکر الجوائی نے کیا جس نے تیرہویں صدی کی چھٹی دھائی میں لکھا "یہ کاغذ کے پلندے یاسا کی کتاب کہلاتے تھے اور شہزادوں کے خزانے میں رکھے رہتے تھے۔ جب بھی کوئی خاں تخت پر بیٹھتا تو ان کو نکالا جاتا تھا اور اُن پر عمل کرنے کے طریقے اپنائے جاتے تھے" (ڈیوڈ ایالون ۱۴اے۔ ۱۱۹) اس کے بعد یاسا کے متعلق دوسرا بڑا ثبوت ابن بطوطہ کا بیان ہے جو اس نے اپنے سفر ۷۲۶/۱۳۲۵ سے ۷۵۵/۱۳۵۴ کے بعد اپنی کتاب کی صورت میں دیا۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ "چنگیز خاں نے اپنے قوانین کتاب کی صورت میں وضع کئے تھے اور ان کو یاسق کہا جاتا تھا۔ اگر سلطان ان میں سے کسی قانون کو بدلنے کی کوشش کرتا تو اس کو ہٹانا ضروری ہو جاتا تھا۔ (مورگن ڈی او۔ ابن بطوطہ اور منگول، جے آر اے ایس ۲۰۰۱: ا۔ ۱۱) چنگیزی مفکرین اس بات پر متفق نہیں کہ یاسا کا احاطہ کیا تھا۔ آیا یہ جنگی قوانین تھے یا دستور یا شریعت اور اس میں سے کتنے لکھے ہوئے تھے۔ (مورگن ڈی او، بی ایس۔ او اے ایس ۴۹: ۱) لیکن اس میں شک نہیں کہ مستشرق یہ مانتے ہیں کہ چنگیزی قانون تھے اور کچھ لکھے ہوئے بھی تھے، لیکن ان پر عملدرآمد اسلام آنے کے بعد تبدیل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس کا ثبوت مرزا حیدر دوغلت کے بیانات میں ملتا ہے۔ مرزا حیدر دوغلت نے تغلق تیمور خاں کے ذکر میں لکھا ہے کہ اس نے امیر بیان سالدوز کو قتل کرنے کا حکم دیا کیونکہ یہ تورہ کے مطابق تھا (۷۶۲/۱۳۶۱) (تاریخ رشیدی ۲۳) جب الغ بیگ اور امیر خداداد خاں سمرقند پہنچے تو الغ بیگ نے فرمائش کی کہ امیر خداداد خاں کو جس قدر معلومات تورہ چنگیزی کے متعلق ہے کسی اور کو نہیں۔ میری خواہش ہے کہ وہ مجھے اس کے متعلق بتائیں۔ اس پر امیر خداداد خان نے کہا کہ ہم بدنام تورہ چنگیزی کو بھلا چکے ہیں جب سے ہم نے شریعت اپنالی ہے۔ اگر الغ بیگ چاہتا ہے تو میں اس کو ضرور بتاؤں گا لیکن اس کو عقل فہم اور انصاف کو اپنانا چاہئے۔ یہ سن کر الغ بیگ نے پھر تورہ کے متعلق معلوم کرنے پر زور نہیں دیا (تاریخ رشیدی ۷۰) بابر جب تورہ کا ذکر کرتا ہے تو وہ رسوم و رواج مراد لیتا ہے۔ جو دربار

جن دنوں ہم مرغاب میں مقیم تھے تو یہ خبر آئی کہ حق نظر چیابان نے چار سو پانچ سو آدمیوں کو ساتھ لے کر چچکتو کے نواح میں حملہ کر دیا ہے۔ اگرچہ تمام سلاطین جمع تو ہو گئے اور انہوں نے ہر چند سعی و کوشش بھی کی مگر اس باغی کی سرکوبی کے لئے جداگانہ طور پر وہ کچھ نہ کر سکے۔ مرغاب اور چچکتو کے درمیان دس فرسنگ کا فاصلہ ہے، اس مہم کو سر کرنے کا میں نے بیڑا اٹھانا چاہا لیکن انہوں نے اپنی عزت و ناموس کا پاس کرتے ہوئے مجھے بھی اس کی اجازت نہیں دی۔

جس وقت شیبانی خاں واپس گیا تو سال بھی ختم ہونے کے قریب تھا۔ چنانچہ یہ قرار پایا کہ یہ موسم سرما سلاطین جہاں بھی مناسب سمجھیں بسر کریں لیکن اس سے قبل کہ موسم گرما شروع ہو یکجا جمع ہو کر دشمن کی مدافعت کی جانب متوجہ ہوں۔

مجھے یہ حکم دیا گیا کہ موسم سرما خراسان کے گرد و نواح میں بسر کروں۔ کابل اور غزنی پُرشور و شر مقامات تھے کیوں کہ ترک، مغل، ان کے طائفے، قبیلے، افغان، ہزارہ اور دیگر طوائف موجود تھے۔ اس کے علاوہ خراساں و کابل کے درمیان جو نزدیک تر راستہ ہے وہ تمام پہاڑی ہے۔ اگر برف باری اور اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز مانع نہ ہو تو وہاں تک پہنچنے کے لئے ایک ماہ درکار ہے۔ اور اگر میدانی ہموار راہ اختیار کی جائے تو وہاں تک پہنچنے کے لئے پینتالیس دن لگتے ہیں، اور ملک بھی پورا قابو میں نہ تھا۔

میرے جتنے بھی خیر خواہ تھے ان میں سے کوئی بھی اس پر راضی نہ تھا کہ اس جگہ موسم سرما بسر کیا جائے۔ میں نے سلاطین سے وہاں جانے کے لئے عذر خواہی کی لیکن انہوں نے میرے وہاں رُکنے پر زور دیا۔ آخر کار بدیع الزماں مرزا، ابوالحسن مرزا اور مظفر حسین مرزا اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر (ورق ۱۶۴) میری خیمہ گاہ پر آئے اور اس بات پر زور دیا کہ موسم سرما اسی جگہ بسر کروں۔ میں سلاطین کے منہ پر منع نہ کر سکا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ایسے جلیل القدر بادشاہوں نے میری قیام گاہ پر آ کر مجھے یہ حکم دیا تھا۔ اس کے علاوہ میں ہرات دیکھنا چاہتا تھا۔ کہ اس جیسا کوئی دوسرا شہر نہیں ہے۔ سلطان حسین مرزا کے زمانے میں اس تصرّفات و تکلفات کے باعث اس شہر کی رونق و ترقی دس گنا نہیں بلکہ بیس گنا ہو گئی تھی اور واقعی یہ قابلِ دید جگہ تھی۔ چنانچہ اس بنا پر ہم نے یہاں قیام کرنا قبول کر لیا۔

ابوالحسن مرزا اپنی ولایت مرو کی جانب چلا گیا تھا۔ ابن حسین مرزا نے تون اور قاین کی راہ لی بدیع الزماں مرزا اور مظفر حسین مرزا نے ہرات جانے کا عزم کیا۔ ان کی روانگی کے دو تین دن بعد میں نے بھی براہ چہل دختران اور تاش رباط ہرات کی جانب رُخ کیا۔

تمام خواتین جن میں میری پھوپھی پاینده سلطان، خدیجہ بیگم، آفاق بیگم، سلطان ابوسعید مرزا کی دوسری بیٹیاں میری دوسری پھوپھیاں اور دیگر بیگمات شامل تھیں سب مدرسۂ سلطان حسین مرزا میں جمع ہو گئیں۔ جس وقت یہ تمام بیگمات مرزا کے مقبرے میں تھیں تو میں ان سے ملاقات کرنے کے لئے پہنچا سب سے پہلے میں پاینده سلطان بیگم کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے سامنے دو زانو بیٹھا۔ اس کے بعد خدیجہ بیگم کی جانب متوجہ ہوا اور ان کو بھی اسی طرح آداب بجا لایا۔ میں تھوڑی دیر تک وہاں رہا۔ جب حافظوں نے قرآن خوانی ختم کر لی تو میں مدرسے کے جنوبی حصے میں گیا۔ جہاں خدیجہ بیگم مقیم تھیں، انہوں نے میرے لئے دسترخوان لگایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے پاینده سلطان کی قیام گاہ کی جانب رُخ کیا اور رات وہیں مقیم رہا۔

ابتدا میں میری قیام گاہ کے لئے باغ نو کو منتخب کیا گیا تھا۔ جہاں میں صبح کے وقت پہنچا۔ اس باغ میں میں نے بس ایک ہی رات بسر کی۔ جب یہ دیکھا کہ یہ جگہ میرے لئے مناسب نہیں تو علی شیر بیگ کے محلات میں سے ایک محل میرے لئے متعین کیا گیا۔ ہرات سے روانہ ہونے تک میں علی شیر بیگ کے ان ہی محلات میں مقیم

میں اٹھنے بیٹھنے ملنے جلنے کے وقت استعمال کیے جاتے تھے۔ تورہ کے اصول تیموریوں نے بھی اپنا لئے تھے۔ اسلام میں شہنشاہیت نہیں تھی اس لئے ان اصولوں کو اپنانے کی گنجائش تھی۔ اس لئے آداب رسوم اور اصول دربار اور محفل کے طور طریقے مل جل کر تورہ چنگیزی ہو گئے۔ مغربی مفکرین ان اصولوں پر بے انتہا زور دیتے ہیں لیکن یہاں بابر نے صاف کہہ دیا ہے کہ باپ دادا کے اصول اپنانا اچھا ہے لیکن ان اصولوں اور قواعد کی پابندی نہیں ہے اور اگر کوئی بری رسم ہے تو اس کو اچھائی سے تبدیل کر دینا چاہئے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ بابر کے گھر کا ماحول مغلئی تھا۔ بابر کے باپ عمر شیخ مرزا کی رحلت پر بابر کی عمر گیارہ سال تھی اس کے بڑوں میں ماں قتلق نگار خانم، نانی ایسن دولت بیگم اور نانا یونس خاں کی وجہ سے ماحول اور خاندانی اطوار میں مغلئی عادتیں اپنائی گئی تھیں اسی وجہ سے ہی خاندان مغلیہ میں مغل رسومات پر چنگیزی کا اثر تھا۔

۶۔ بابر کی عمر اس وقت قمری حساب سے ۲۵ سال تھی۔

۹۱۲ھ (۱۵۰۶ء) میں بابر ۲۴ سال کی عمر میں سلطان حسین مرزا کی دعوت پر ان کی مدد کے لیے ہرات گیا۔
سے ملاقات رہی۔ بدیع الزماں مرزا اور مظفر حسین مرزا دونوں نے ہی دعوتیں کیں۔
انواع واقسام کے کھانوں اور گفت وشنید سے محظوظ ہوا جا رہا ہے

سفر کے دوران سلطان حسین مرزا کے انتقال کی خبر ملی۔ بابر نے سفر جاری رکھا، ہرات کی سیر اور چچا زادوں
یہ تصویر ان میں سے ایک دعوت کی ہے بابر قالین پر نشین الٹے ہاتھ سے چوتھا ہے۔
(تصویر وکٹوریہ والبرٹ میوزیم ۰۲۲۹۴۳-ڈی)

رہا۔ ہر ایک دو دن بعد میں باغ جہاں آرا کی طرف بھی چلا جاتا جہاں بدیع الزّماں مرزا کی خدمت میں حاضر ہو کر کورنش بجالاتا۔

مظفر حسین مرزا کی دعوت

چند روز بعد مظفر حسین مرزا نے مجھے اپنے محل میں آنے کی دعوت دی اس کی نشست باغ سفید میں تھی۔ خدیجہ بیگم بھی وہاں موجود تھیں۔ جب میں اس طرف جانے لگا تو جہانگیر مرزا میرے ساتھ تھا، ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد مظفر حسین مرزا ہمیں اس عمارت میں لے گیا جس کی تعمیر بابر مرزا نے کرائی تھی اور اس کا نام طرب خانہ رکھا تھا، یہاں محفل مے نوشی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ طرب خانہ ایک باغیچے کے درمیان واقع ہے اور یہ ایک مختصر عمارت ہے مگر دل کش ہے۔ بلائی منزل کی آرائش میں تکلف سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے چاروں کونوں میں حجرے بنے ہوئے ہیں، ان چاروں حجروں کے درمیان جو جگہ ہے وہ کشادہ کمرہ ہے۔ ان حجروں میں ہر ایک کے بیچ میں شہ نشین بنائی گئی ہے۔ اس محل کے ہر حصّے میں نقاشی و مصوری کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ عمارت بابر مرزا نے تیار کرائی تھی مگر تصویر کشی کے لئے حکم ابو سعید مرزا نے دیا تھا۔ جس میں اس کی جنگوں کے مناظر پیش کئے گئے ہیں۔

شمالی شہ نشین میں دو گدّے ایک دوسرے کے سامنے لگا دیئے گئے تھے، ان گدّوں کے پہلو شمالی جانب تھے۔ ایک گدّے پر میں اور مظفر حسین مرزا بیٹھے اور دوسرے پر سلطان مسعود مرزا۔ چونکہ ہم مظفر مرزا کے مہمان تھے اسی لئے اس نے مجھے یہ نشست پیش کی جو اس کی نشست گاہ سے قدرے بلند تر تھی۔ عیش و نشاط کے پیانے پُر کئے گئے (ورق ۱۶۵) ساقیوں نے کھڑے ہو کر اہل مجلس کو پیالے پیش کرنے شروع کئے۔ صاف و شفاف شراب کے جام اہل مجلس اس طرح پی رہے تھے گویا یہی آب حیات ہے۔ محفل عیش و نشاط گرم تھی اور کیف و سرور کا عالم عروج پر۔

ان کی خواہش تھی کہ مجھے بھی اس میں شریک کریں اور بادہ خواروں کے حلقے میں شامل کرلیں۔ اگرچہ میں اس وقت تک بادہ گساری کا مرتکب نہیں ہوا تھا اور نشے کی کیفیت و حالت سے ناواقف تھا لیکن شراب نوشی کی جانب طبیعت مائل تھی اور دل چاہتا تھا کہ اس وادی کی منزلیں طے کروں۔ عہد کم سنی میں اس جانب میری رغبت نہ تھی اور بادہ نوشی سے جو سرور کیف کا عالم ہوتا ہے اس سے نابلد تھا۔ کبھی کبھی میرے والد مجھے بادہ خوری کی طرف رغبت دیتے تھے لیکن میں ان سے معذرت کر لیتا اور بادہ گساری کا مرتکب نہ ہوتا لیکن ان کی رحلت کے بعد حضرت خواجہ قاضی کے قدم کی برکت سے میں زاہد و متقی ہو گیا۔ اب جب کہ میں ہر اس چیز کے کھانے سے گریز کرتا ہوں جس میں نشہ آوری کا شائبہ ہو تو بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ شراب نوشی جیسے گناہ کا مرتکب ہوتا۔ لیکن اس کے بعد جب کہ غرور جوانی اور خواہش نفسانی کے تحتِ شراب نوشی کی جانب طبیعت راغب ہوئی تو اب کوئی ایسا شخص نہ تھا جو اس کی پیشکش کرے، یہی نہیں بلکہ اب تو کوئی ایسا بھی نہیں جس کو یہ معلوم ہو کہ مجھے شراب سے رغبت ہے۔ اگرچہ شراب نوشی کی جانب طبیعت کا میلان تھا لیکن اس ممنوعہ فعل کو خود انجام دینا میرے لئے مشکل تھا۔ اس وقت یہ خیال دل میں گزرا کہ اب جب کہ یہ لوگ شراب پیش کر رہے ہیں اور اس وقت جب ہم ہرات جیسے حسین و دل کش شہر میں ہیں جہاں عیش و عشرت کے تمام وسائل و اسباب موجود اور ناز و نعمت کی ہر شئے و نعمت مہیا ہے تو اگر اس وقت مے نوشی نہیں کروں گا تو پھر کب بادہ پیمائی کی جائے گی۔ میں نے بادہ خواری کا ارادہ کیا ہی تھا کہ دل میں یہ خیال گزرا کہ بدیع الزماں مرزا میرا بڑا بھائی ہے۔ میں نے اس کے دولت کدے پر اس کے ہاتھ سے جام لے کر میکشی نہ کی تو چھوٹے بھائی کے دولت کدے پر کس طرح شراب نوشی کی جائے۔ [۷] اُس کے دل میں جو

وقائع ۹۱۲ھ

۷۔ آداب محفل کے انداز ملاحظہ ہوں۔

بات آئی تھی وہ اس نے کہہ دی۔ میں جس تردد میں مبتلا تھا وہ میں نے اسے بتا دیا۔ چوں کہ میرا عذر معقول تھا اسی لئے اس مجلس میں مجھے شراب پیش نہیں کی گئی۔ اس وقت قرار پایا کہ کسی وقت بدیع الزماں مرزا اور مظفر حسین مرزا یکجا جمع ہوں اور ان دونوں کی فرمائش پر میں مے نوشی کروں۔

اس محفل میں اہل نغمہ و موسیقی حافظ حاجی جلال الدین نے نواز اور غلام شادی کا برادر خورد غلام شادی بچہ موجود تھے۔ غلام شادی بچہ چنگ [8] نوازی کرتا تھا۔ حافظ حاجی اہل ہرات کی لے میں بہت اچھا گاتا تھا۔ یہاں کے لوگوں کا یہ خاصہ ہے کہ وہ دھیمے سروں میں بڑی نزاکت سے یکساں ترنم میں گاتے ہیں۔ جہانگیر مرزا کے ایک قوال نے چاہا کہ وہ بھی اس محفل میں اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ عجیب پاٹ دار آواز پائی تھی۔ اونچی تان میں ایسا گایا کہ کانوں کو ناگوار گزرا۔ خراسان کے لوگ لطافت و ظرافت کے ماحول میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اُس کے اس طرح گانے سے بعض نے تو اپنے کان بند کر لئے اور بعض کی تیوری پر بل پڑ گئے مگر وہ مرزا کا پاس کرتے ہوئے اسے گلہ پھاڑنے سے روک نہ سکے۔

مغرب کی نماز کے بعد ہم طرب خانے سے نکل کر مظفر حسین مرزا کے اس نو ساختہ محل میں پہنچے جو اس نے موسم سرما بسر کرنے کے لئے وہاں تعمیر کرایا۔ جس وقت ہم اس محل میں پہنچے تو یوسف کوکلداش عین عالم مستی میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور ترنگ میں ناچنے لگا۔ چونکہ سُر تال سے واقف تھا اس لئے عمدہ رقص کیا۔ اس کے بعد اس محل میں بہت دیر تک گرم جوشی کے ساتھ گفتگو ہوتی رہی۔ مظفر مرزا نے تلوار باندھنے کا پٹکا، بڑے کی کھال کا جبہ اور ایک خاکستری تپچاق کا گھوڑا مجھے عطا کیا۔ جانک قوال نے ترکی کلام گایا۔ مظفر حسین مرزا کے پاس کتہ ماہ اور کچیک ماہ نامی دو غلام تھے انہوں نے نشے میں چور عالم بدمستی میں محفل عیش و سرور کو بدمزہ کر دیا (ورق ۱۶۶) رات دیر تک صحبت گرم رہی۔ اس کے بعد اہل مجلس وہاں سے اپنی اپنی قیام گاہوں کی جانب روانہ ہوئے۔ میں اس رات اسی محل میں مقیم رہا۔ جب قاسم بیگ کو یہ اطلاع ہوئی کہ مجھے شراب نوشی کی دعوت دی جائے گی تو اس نے ذوالنون بیگ کے پاس آدمی بھیجا۔ اس نے نصیحت کے طور پر دونوں سلاطین کو سخت سست کہا۔ چنانچہ میری خاطر محفل مے نوشی کا ارادہ ترک کر دیا گیا۔

بدیع الزماں مرزا کی دعوت

جب بدیع الزماں مرزا کو یہ معلوم ہوا کہ مظفر حسین مرزا نے میری پذیرائی کا اہتمام کیا ہے تو اس نے بھی باغ جہاں آرا کے مقوی خانہ میں محفل مہمان نوازی آراستہ کر کے مجھے وہاں آنے کی دعوت دی۔ اس نے میرے بعض عزیز و اقارب اور جوانوں کو بھی مدعو کیا یہ وہ لوگ تھے جو میری موجودگی میں شراب نوشی کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ اور اگر کبھی پیتے بھی تھے تو مہینے سوا مہینے میں، وہ بھی چھپ کر، اچھی طرح دروازے بند کر کے ہزاروں خوف و دغدغے کے ساتھ اس محفل میں ایسے ہی لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ وہ یہاں آ کر جمع ہوئے، کبھی تو وہ مجھے اپنی طرف سے غافل پا کر اور کبھی اپنے ہاتھوں کے درمیان سے چھپا کر با خوف و خطر چسکی لگا لیتے تھے۔ اگر چہ اس محفل میں میری طرف سے انہیں اجازت تھی کہ وہ جس طرح چاہیں داد عیش دیں۔ کیوں کہ جن لوگوں نے اس دعوت کا اہتمام کیا تھا اس کی حیثیت میری نظر میں بمنزلہ والد یا بڑے بھائی کے تھی۔ بید مجنوں [9] کے چند درخت زیب و زینت کے لئے وہاں لائے گئے تھے۔ معلوم نہیں کہ یہ درخت اصلی تھے یا مصنوعی اس سے نکلی ہوئی شاخوں کو تیلی کی طرح باریک باریک تراشا گیا تھا۔ بہر حال یہ درخت دیکھنے میں دل کش لگتے تھے۔ [10]

جب محفل خوب گرم ہوگئی تو آخر میں قاز کے کباب میرے سامنے لائے گئے۔ چوں کہ اس سے پہلے میں نے کبھی گوشت کے تکے نہیں کئے تھے اور یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے کس طرح پارچے کروں اسی لئے میں

۸۔ چنگ۔ یہ آلہ لمبا اور پتلا، آگے سے نوکدار ہوتا ہے۔ اس کے اوپر لمبائی میں سلک کے تار کھینچے ہوتے ہیں جن کی تعداد ۱۴ ہوتی ہے۔ یہ آلہ چین سے آیا۔

۹۔ بید مجنوں۔ ایک درخت جس کی شاخیں پتلی اور جھکی ہوئی ہوتی ہیں۔ اسی خمیدگی کی وجہ سے اس کو مجنوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ حضرت ذوق فرماگئے ہیں۔

خوب روئے آج سنسان ہاموں دیکھ کر
یاد آیا ہم کو مجنوں بید مجنوں دیکھ کر
(سید احمد دہلوی)

۱۰۔ ترکوں اور ایرانیوں کا یہ دستور ہے کہ وہ خوشی کی مجالس میں کبھی خالی ہاتھ نہیں جاتے۔ اگر پھول اور پھل میسر نہ ہوں تو درخت کی ہری ٹہنی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ سبزہ کو شادی و خرمی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ محض شاخ درخت کے جانے کا مقصد ہوتا ہے کہ ہمیں اس تحفے کے عوض کچھ لینا مقصود نہیں بلکہ ہمارے باغیچے میں یہ چیز موجود تھی جسے کاٹ کر ہم لے آئے ہیں
(یونس جعفری)

افغانستان میں اب بھی اصلی و مصنوعی پھولوں کا ذوق ہے۔

نے اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ اس پر بدیع الزماں مرزا نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کباب کیوں تناول نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ اس کے پارچے کر کے مجھے عنایت کیجئے۔ اس قسم کے کاموں میں بدیع الزماں مرزا کا جواب نہ تھا۔ جب مجلس تمام ہوئی تو ایک مرقع خنجر چارقبا اور تپچاق گھوڑا مجھے بطور تحفہ دیا گیا۔

ہرات کی سیر

میں ہرات میں بیس دن تک مقیم رہا۔ اس عرصے میں میں نے جن جگہوں کو نہیں دیکھا تھا ان کی سیر کرنے کے لئے ہر روز گھوڑے پر سوار ہو کر نکل جاتا۔ اس سیر وتفریح کے مقامات میں میرا ہادی وراہنما یوسف علی کوکلداش ہوتا۔ جس تفریحی مقام پر ہم جا کر اترتے وہاں یوسف علی کوکلداش خورد ونوش کا اہتمام کرتا۔ اس بیس روز کے عرصے میں خانقاہ سلطان حسین مرزا کے علاوہ شاید ہی کوئی ایسی جگہ بچی ہو جس کی میں نے سیر نہ کی ہو۔ جن مقامات کی میں نے اس مختصر مدت میں سیر کی ان کے نام ہیں:

گازرگاہ	باغچہ علی شیر بیگ	جواز کاغذ	تخت آستانہ
پل گازرگاہ	دل	کہدستان	باغ نظرگاہ
نعمت آباد	خیابان	گازرگاہ	خطیرۂ سلطان احمد مرزا
تخت سفر	تخت نوائی	تخت پرگیر	تخت حاجی بیگ
شیخ بہاء الدین عمر	شیخ زین الدین	مزارات مولانا عبدالرحمٰن جامی اوران کے مقابر	
نمازگاہ مختار	حوض ماہیان	ساق سلمان	بلوری (دراصل
یہ لفظ ابوالولید تھا)	امام فخر	باغ خیابان	مدارس ومقابر مرزا
مدرسہ ومقبرہ گوہرشاد بیگم	مسجد جامع	باغ زاغان	باغ نو
باغ زبیدہ	آق سرائے، (اس کی تعمیر سلطان ابوسعید مرزا نے عراق سرائے کے دروازے پر کرائی تھی)		
پوران	صفۂ تیراندازان	چرغالانک	(ورق ۱۶۷) میر واحد
پل مالان	خواجہ طاق	باغ سفید	طرب خانہ
باغ جہاں آرا	کوشک	مقوی خانہ	سوسنی خانہ
دروازۂ برج	حوض کلاں (یہ باغ جہاں آرا کے شمال میں واقع ہے)		چہار عمارت
اور اس کی چہار اطراف	پنج دروازۂ قلعہ	دروازۂ ملک	دروازۂ عراق
دروازۂ پیروز آباد	دروازۂ خوش	دروازۂ قبچاق	بازار ملک
چارسو (چوراہہ)	مدرسۂ شیخ الاسلام	مسجد جامع ملکان	باغ شہر

مدرسۂ بدیع الزماں جو جوئے انجیل کے کنارے تعمیر کیا گیا ہے۔ مکانات علی شیر بیگ جو عرف عام میں ''انسیہ'' کہلاتے ہیں۔ علی شیر بیگ کا مقبرہ، مدرسہ اور اس کی خانقاہ (اس خانقاہ کو خلاصیہ اور اخلاصیہ بھی کہتے ہیں) علی شیر بیگ کا حمام اور اس کا دارالشفا (جو صفائیہ اور شفائیہ بھی کہلاتا ہے)

نسبت

میری معطلی وبیکاری کے زمانے سے قبل سلطان احمد مرزا کی چھوٹی بیٹی معصومہ سلطانہ بیگم کو اس کی والدہ حبیبہ سلطان بیگم خراسان لے آئی تھیں۔ جس روز میں اپنی پھپھی سے ملنے کے لئے گیا وہ بھی اپنی والدہ کے ساتھ

وہاں آئی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی میری نظر ان پر پڑی میرا دل ان کی جانب مائل ہونے لگا میں نے پوشیدہ طور پر اپنے آدمی کے ذریعے پھپھی حبیبہ سلطان بیگم اور چچی پائندہ سلطان بیگم پر اپنا عندیہ ظاہر کیا۔ اس بارے میں پھپھی نے چچی سے بات کی چنانچہ طے ہوا کہ میرے روانہ ہونے کے بعد میری چچی اپنی لڑکی کو لے کر کابل آجائیں گی۔

ہرات سے روانگی

محمد برندوق اور ذوالنون بیگ کا اگرچہ سخت اصرار تھا کہ موسم سرما اسی جگہ بسر کیا جائے مگر اس کو گزارنے کے لئے نہ تو انہوں نے کوئی خاص انتظام کیا تھا اور نا ہی کوئی مناسب جگہ تلاش کی تھی۔ موسم سرما شروع ہو گیا۔ ہرات اور کابل کے درمیان جو کوہستانی سلسلہ ہے اس پر برف باری ہونے لگی۔[11] کابل کی طرف سے میرا تردد و دغدغہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا۔ ان لوگوں نے نہ تو موسم سرما بسر کرنے کے لئے معقول سامان مہیا کیا تھا اور نا ہی کسی ایسی جگہ بتانے کے لئے تیار تھے جہاں موسم سرما گزارنے کے لئے سہولتیں میسر ہوں۔ میں صاف لفظوں میں ان سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

یہ بہانہ بنا کر کہ میں موسم سرما گزارنے کے لئے کسی گرم مقام کی طرف کوچ کر رہا ہوں بتاریخ ۷ شعبان میں ہرات سے روانہ ہوا۔ بادغیس کے گردونواح میں ہر منزل پر ایک دو روز قیام کرتے ہوئے ہم چل رہے تھے تاکہ وہ لوگ جو محصول وصول کرنے اور دیگر اہم کام انجام دینے کے لئے اپنی اپنی ولایات کی طرف چلے گئے تھے واپس آکر ہمارے ہمراہ ہو سکیں ہم آہستہ آہستہ کوچ کر رہے تھے، جس وقت لنگر میر غیاث سے دو تین منزل آگے نکل آئے تو ماہ رمضان کی آمد ہو گئی۔ وہ لوگ جو اپنی ضروریات پوری کرنے اور اہم کام انجام دینے کے لئے چلے گئے تھے اُن میں سے بعض واپس آکر ہمارے ہمراہ ہو گئے اور بعض بیس دن یا ایک ماہ بعد کابل پہنچ گئے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو ہرات میں رہ گئے اور انہوں نے سلاطین کی ملازمت اختیار کر لی۔ ان میں سے ایک شخص سیدیم علی دربان تھا وہ وہیں رُک گیا اور بدیع الزمان کی ملازمت اختیار کر لی۔ خسرو شاہ کے جتنے بھی ملازمین تھے ان میں سے میں نے کسی کو بھی اتنی مراعات نہیں دیں جس قدر اُس کو عطا کی تھیں۔ جس وقت جہانگیر مرزا نے غزنی کو خیر آباد کہا تو یہ علاقہ اسے دے دیا گیا۔ اس نے وہاں تو اپنے سالے اور دوست انگو شیخ کو مقرر کیا اور خود اپنے لشکر کے ساتھ میرے ہمراہ ہو گیا۔ امر واقعی یہ ہے کہ خسرو شاہ کے ملازمین میں سیدیم علی دربان اور محب علی قورچی سے بہتر کوئی شخص نہیں تھا۔ سیدیم اپنے اخلاق و اطوار کے اعتبار سے عمدہ آدمی تھا۔ شمشیر زنی میں اس کی مردانگی قابل تعریف تھی۔ (ورق ۱۶۸) اس کے گھر پر ہمیشہ دوستوں کی صحبت و مجلس گرم رہتی، سخی و دریا دل آدمی تھا۔ عجب بااستعداد، خود کفیل اور مرتب و منظم انسان تھا۔ اس کی ظرافت و لطافت میں شوخی و رنگینی اور باہمی محبت و اختلاط اور حکایت میں شیرینی پائی جاتی تھی۔ خوش خلق، ظریف اور ہزل گو شخص تھا۔ اس کی ذات میں عیب تھا تو بس یہی کہ طبیعت فسق و فجور اور امرد پرستی کی جانب مائل تھا۔ اپنے دین و مسلک میں وہ منحرف تھا بلکہ ایک حد تک منافق قسم کا آدمی تھا۔ بعض لوگ اس کے نفاق کو اس کی ہزل گوئی پر محمول کرتے ہیں مگر اس میں کچھ حقیقت ضرور تھی۔ جس وقت بدیع الزماں مرزا ہرات کو دشمن کے حوالے کر کے شاہ بیگ کے پاس جا رہا تھا تو اس نے شاہ بیگ اور مرزا کے درمیان منافقانہ باتیں کہیں۔ ان کے باعث مرزا نے اسے قتل کرا دیا اور لاش دریائے ہرمند میں پھینک دی گئی۔ محب علی کی کیفیت اس کے واقعات کے ذیل میں بیان کی جائے گی۔

لنگر میر غیاث سے نکل کر ہم بہت سے دیہات کے قریب سے گزرتے ہوئے چنچران پہنچ گئے۔ جس وقت ہم لنگر میر غیاث سے چنچران پہنچے تو مسلسل برف باری ہو رہی تھی، ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے برف باری کی مقدار میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ چنچران کے نواح میں تو برف گھوڑوں کی ران سے اوپر تک تھی۔ یہ جگہ

11۔ بابر کا کوہستانی راستہ۔ ہرات اور کابل کے درمیان جو کوہستانی راستہ ہے وہ سردیوں میں دشوار اور بہت تکلیف دہ ہے۔ بابر نے یہ راستہ کابل جلدی پہنچنے کے لئے چنا اور بے تحاشا تکالیف اٹھائی۔ حال ہی میں روری سٹوارٹ نے بھی بابر کے راستہ پر سفر کیا اور اپنی تکالیف کا ذکر ایک کتاب میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بابر اپنی کہانی بہت منکسر المزاجی سے سناتا ہے۔ وہ محتاط مشاہدہ کرنے والا ہے اور زیادہ تر سیاحوں کے برخلاف وہ دیانت دار مصنف ہے (دی پلیسس ان بٹوین، ص ۱۴۳)

ذوالنون بیگ سے متعلق تھی۔ میرگ جان نامی اس کا یزدی ملازم اس وقت وہاں موجود تھا۔ ذوالنون کا جتنا بھی غلّہ جمع تھا وہ قیمت ادا کر کے خرید لیا گیا۔ جب ہم پنجران سے آگے نکل آئے تو دو تین دن بعد برف اتنی زیادہ ہو گئی کہ گھوڑے کی رکاب سے اوپر نکل گئی۔ اکثر جگہیں تو ایسی تھیں جہاں گھوڑے کا سُم زمین تک ہی نہیں پہنچتا تھا۔ اس کے بعد بھی مسلسل برف باری ہوتی رہی۔

جس وقت ہم لنگر میر غیاث کے نواح میں تھے تو ہم نے یہ مشورہ کیا تھا کہ کابل پہنچنے کے لئے کون سا راستہ اختیار کیا جائے۔ میں اور اکثر و بیشتر لوگ اس امر پر متفق تھے کہ سردی کا موسم ہے اس وقت اگر چہ قندھار کی جانب سے راستہ قدرے دور ہے تاہم اس پر بلا خوف و خطر سفر کیا جا سکتا ہے۔ کوہستانی راستے سے سفر کرنے میں خطرہ و دغدغہ ہے۔ قاسم بیگ کی رائے یہ تھی کہ وہ راستہ دور دراز ہے اور یہ قریب و نزدیک۔ یہ مشورہ اس کی نادانی تھی پر ہم نے یہی کوہستانی راستہ اختیار کیا۔[۱۲]

ہمارا رہبر سلطان نامی پشائی تھا۔ معلوم نہیں کہ خوف کی وجہ سے یا ہمت ہار جانے کی باعث یا کثیر برف باری کی بنا پر وہ راستہ بھول گیا اور منزل کا راستہ نہ بتا سکا۔ چونکہ ہم نے قاسم بیگ کے اصرار پر یہ راستہ اختیار کیا تھا اسی لئے یہ موضوع اس کے وقار کا مسئلہ بن گیا۔ وہ خود اور اس کے لڑکے گھوڑوں سے اتر کر اور برف پیروں سے دبا دبا کر راستہ بنانے لگے اور اس طرح وہ آگے بڑھتے رہے۔ ایک دن برف بہت زیادہ تھی اور راستہ بھی معلوم نہ تھا اگر چہ بہت کوشش کی مگر اس کے باوجود ہم اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ جب کوئی چارہ نظر نہ آیا تو وہاں سے واپس ہوئے اور ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ایندھن کثرت سے موجود تھا۔ میں نے ساٹھ ستر جوانوں کو اس کام پر مقرر کیا کہ جو راستہ طے کر کے ہم آئے ہیں اسی کو وہ برف دبا کر ہموار کریں اور واپس جائیں اس کے بعد وہی کسی ایسے رہبر شخص کو تلاش کر کے لائیں جو اس وادی میں موسم سرما گزار چکا ہو تا کہ وہ ہماری رہبری کر سکے، ہمیں راستہ دکھا سکے اور ہم اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔ ہم نے تین چار دن تک اس منزل سے کوچ نہ کیا اور ان لوگوں کا انتظار کرتے رہے جو رہبر کی تلاش میں ہمارے خیمہ گاہ سے روانہ ہوئے تھے۔ جو لوگ اس مقصد کے لئے روانہ کئے گئے تھے وہ واپس آ گئے اور اپنے ساتھ کسی راہنما کو نہ لا سکے۔ چنانچہ توکل بخدا سلطان پشائی کو آگے کیا اور اسی راستے پر روانہ ہو گئے جس پر سے ہم واپس ہو گئے تھے۔ ان چند دنوں کے دوران ہم نے جو سخت مشکل و صعوبت برداشت کی اس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ تمام زندگی (ورق ۱۶۹) ایسی سخت اذیت کم ہی برداشت کی ہوگی۔ یہ مطلع میں نے اسی زمانے میں کہا تھا۔

چرخ نینک مین کو رما کان جورو جفا سی قالوی مو
خستہ کو نکلوم چیکما کان درد و بالسی قالای مو

(آسمان کی ایسی کون سی گردش ہے جس نے مجھ پر جور و جفا نہ کی ہو۔ ایسا کون سا درد و الم ہے
جو میرے دل ناتوان پر نہ گزرا ہو۔)

تقریباً ایک ہفتے تک برف کو اسی طرح دباتے ہوئے ہم ایک دن میں ایک یا ڈیڑھ کروہ سے زیادہ آگے نہیں بڑھ سکے۔ میں اپنے دس پندرہ قرابت داروں کے ساتھ اس کام پر لگا ہوا تھا۔ میرے ساتھ قاسم بیگ اس کے دو لڑکے تنگر بردی و قنبر علی اور اس کے دو تین نوکر بھی اس کام میں شریک تھے۔ وہ سب لوگ جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اپنے گھوڑوں سے اُتر کر برف کو دبانے کے کام پر لگے ہوئے تھے۔ وہ شخص جو سب سے آگے ہوتا چند قدم چلنے کے بعد برف کی سوزش کے باعث اپنی جگہ پر شل ہو کر رہ جاتا۔ اس کے بعد دوسرا شخص آگے آ جاتا۔ یہ دس پندرہ یا بیس آدمی جو برف کو دباتے جاتے تھے ان کی اس کوشش سے بس اتنا ہو سکا کہ ہم ساز و سامان کے بغیر گھوڑوں کو کھینچ سکیں۔ جن گھوڑوں کو ہم کھینچ رہے تھے ان کے اردگرد برف اتنی زیادہ تھی کہ ان کی رکابوں اور زیر

۱۲۔ پچھلے پانچ سو سالوں میں یہاں کچھ زیادہ تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ بالکل الگ تھلگ علاقہ ہے اوبے سے پنجران تک بہت کم آبادی ہے جہاں ایمق لوگ رہتے ہیں اور پنجران سے بامیاں تک ہزارہ بستے ہیں (دی پلیسیس ان ہوئین ص ۵۴)

بندوں تک پہنچتی تھی۔ یہ گھوڑے دس پندرہ قدم چل کر تھک جاتے ایسے تھکے ہوئے گھوڑوں کو تو ایک طرف کر دیا جاتا اور اس کی جگہ دوسرا گھوڑا لایا جاتا۔ ہم برف کو دباتے ہوئے اسی طرح دس پندرہ آدمی آگے بڑھتے اور یہی دس پندرہ یا بیس آدمی گھوڑوں کو کھینچتے دیگر وہ تمام عمدہ جوان اور اس کے دستے کے افراد جو امیری کے لقب سے سرفراز تھے اپنے گھوڑوں پر سوار اس راستے پر جو برف دبا کر تیار کیا جاتا تھا اپنے سر کو جھکائے چل رہے تھے۔ یہ ایسا موقع نہ تھا کہ کسی کو کسی کام کا حکم دیا جائے یا اس سے بزور وزبردستی کام لیا جائے یہ تو بس ہر شخص کے حوصلے اور اس کی ہمت پر منحصر تھا کہ وہ خود ہی کہے بغیر اس کام کو انجام دے برف کو اسی طرح دباتے اور راستہ بناتے اس منحوس مقام سے تین چار دن میں درۂ زرین کے نیچے خوال قوتی نامی غار پر پہنچے۔

اس روز عجب بلا خیز برف کا طوفان تھا۔ برف اس کثرت سے پڑ رہی تھی کہ سب کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ اب موت سر پر ہے۔[13] اس کوہستانی سلسلے کے لوگ غاروں اور گپھاؤں کو خوال کہتے ہیں۔ جس وقت ہم اس خوال پر پہنچے برف کا طوفان بہت شدید تھا چنانچہ ہم اسی خوال کے نزدیک اتر پڑے۔ برف اتنی زیادہ تھی کہ اس راستے پر برف کو دبا دبا کر بس اتنا چوڑا راستہ بنایا گیا تھا کہ وہاں سے ایک ہی آدمی گزر سکے۔ گھوڑوں کا چلنا سخت دشوار تھا چونکہ جاڑے کا موسم تھا اس لئے دن انتہائی چھوٹے تھے۔ جو لوگ سب سے آگے تھے وہ دن کی روشنی میں ہی اس خوال پر پہنچ گئے۔ اس کے بعد نماز مغرب اور عشا تک لوگ آتے رہے۔ اس کے بعد جو شخص بھی جہاں کھڑا تھا وہ وہیں اپنے گھوڑے سے اترا اور بہت سے لوگوں نے تو گھوڑے کی کمر پر رات بسر کی۔

یہ خوال تنگ معلوم ہوتا تھا اس لئے میں نے خوال کے دہانے پر برف صاف کرنے کا بیڑا لیا اور اس سے برف کو ہٹا کر اتنی جگہ خالی کی کہ جس پر نمدے کا تکیہ رکھا جا سکے۔ میں نے اپنے سینے تک برف کو کھود کر صاف کیا مگر اس کے باوجود زمین تک نہ پہنچ سکا مگر اتنی پناہ گاہ ہو گئی کہ برفانی ہوا کے تند تھپیڑوں سے محفوظ رہ سکوں اور اس جگہ بیٹھ گیا اگرچہ کچھ لوگوں نے کہا بھی کہ میں خوال کے اندر آ جاؤں مگر دل نہ مانا کیوں کہ میرے دل میں یہ بات تھی کہ سب لوگ تو برف اور توفانی ہواؤں کا مقابلہ کریں اور میں اندر جا کر گرم جگہ میں آرام سے بیٹھوں۔ میری قوم و قبیلے کے لوگ باہر مشکل و پریشانی کا مقابلہ کریں اور میں اندر جا کر اطمینان کا سانس لوں۔ یہ بات مجھے مروّت سے بعید نظر آئی۔ میں اس امر پر کاربند رہا کہ جو بھی صعوبت و پریشانی ہوگی میں خود بھی برداشت کروں گا کیوں کہ جو مشکل و دشواری دوسرے لوگ اٹھا سکتے ہیں اسے مجھے بھی برداشت کرنا چاہئے۔

فارسی زبان میں یہ ضرب المثل ہے: مرگ بیاران، عیداست، (دوستوں کی صحبت نصیب ہو تو موت میں بھی مزا ہے) (ورق ۱۷۰)

اسی طرح کے بلا انگیز طوفان میں وہ جگہ جو میں نے برف کو کھود کر اپنے لئے تیار کی تھی اس میں بیٹھ گیا۔ عشا کا وقت تھا اور میں اپنے دونوں پیروں پر بیٹھا تھا۔ برف کا جھونکا تیزی سے آیا میری کمر، میرے سر اور کانوں پر چار انگل برف بیٹھ گئی۔ اس رات میرے کان پر سردی کا اثر ظاہر ہونے لگا۔ عشا کی نماز کے وقت ان لوگوں نے جنہوں نے غار کو اندر سے اچھی طرح دیکھ لیا تھا با آواز بلند کہا کہ یہ خوال بہت زیادہ فراخ و کشادہ ہے۔ اس میں تو سب لوگوں کے اندر آنے کی گنجائش ہے۔ یہ بات سنتے ہی میں نے اس برف کو جو میرے سر پر پڑی ہوئی تھی جھٹکا اور خوال میں داخل ہوا۔ وہ نوجوان جو اس خوال کے گرد و نواح میں تھے میں نے ان سب کو بلایا۔ چالیس پچاس آدمیوں کے لئے اتنی جگہ نکل آئی کہ وہ آرام سے بیٹھ سکیں۔ توشہ، یخنی، خشک نان و گوشت وغیرہ غرض جس کے پاس جو دال دلیہ تھا وہ اس نے پیش کر دیا۔ اس سخت سردی، برف اور طوفان سے گزر کر عجب گرم، پر امن اور فراغت کی جگہ پر ہم پہنچ گئے تھے۔

علی الصبح برف باری اور طوفان خیزی بند ہو گئی۔ ہم سویرے ہی اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ گزشتہ طریقے

۱۳۔ یہاں برف کی وجہ سے آج بھی وہی مشکلات ہیں جو بابر کو ملی تھیں۔ یہاں راستہ ڈھونڈنا تقریباً ناممکن ہے۔ برف باری کی وجہ سے کبھی برفانی راہیں برف کے سلوف سے ڈھک جاتی ہیں (روری سٹوارٹ ص ۲۳۵)

کے مطابق برف کو دباتے اور راستہ بناتے ہوئے ہم درّے کے اس طرف ایک اونچی جگہ پر پہنچ گئے۔ راستہ نہایت تیز ڈھلان پر تھا جس سے گزر کر ہمیں اوپر کی جانب جانا تھا، بتایا گیا کہ درّۂ زرین اس سے بھی زیادہ بلندی پر ہے۔[14] ہم نے بالائی راستہ اختیار نہیں کیا بلکہ درّے کے نیچے نیچے ہی روانہ ہوئے۔ اس سے پہلے کہ ہم درّے کے اس پار پہنچیں شام ہو چکی تھی۔ ہم نے اس درّے کے دہانے پر ہی پڑاؤ کیا، وہ رات انتہائی سرد تھی جو ہم نے انتہائی سخت مشکل و دشواری میں بسر کی۔ بہت سے لوگوں کے تو ہاتھ پیر ہی سردی لگ جانے کے باعث شل ہو گئے۔ کپیر کے پیر سیوندوک ترکمان کے ہاتھ اور اخی کے پاؤں اسی رات سردی لگ جانے کے باعث شل ہوئے۔ اگلے دن صبح سویرے ہی ہم سیدھے وادی کی نیچائی طرف روانہ ہوئے۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ وہ درّے کی طرف جانے کا راستہ نہیں لیکن دیدہ و دانستہ خدا پر بھروسہ کر کے درّے کے اس جانب روانہ ہوئے وہاں تیز خطرناک ڈھلانیں تھیں وہاں ہمیں گھوڑوں پر سے بھی اترنا پڑا۔ بالآخر نماز مغرب کے وقت ہم درّے کے دہانے سے باہر نکل آئے شاید کسی بھی معمر آدمی کو یہ یاد نہ ہوگا کہ ایسے سخت موسم میں جب کہ کثرت سے برف باری ہو رہی ہو اس درّے سے کوئی شخص گزرا ہو، یہی نہیں بلکہ کسی کے دل میں یہ خیال تک نہ گزرا ہوگا کہ وہ ایسے سخت موسم میں اس درّے کو پار کرے۔ اگرچہ اس برف باری کے باعث ہم نے سخت مشکلات برداشت کیں لیکن اس کثیر برف باری کی وجہ سے ہی ہم اپنی منزل پر پہنچے۔ کیوں کہ اگر اس قدر کثیر مقدار میں اتنی اونچی برف نہ ہوتی تو ہم کیسے ان انجانی جگہوں سے گزرتے، اگر ایسی گہری کھائیاں نہ ہوتیں تو پہلی ہی کھائی پر لوگوں کے گھوڑے اور دو گوہانی اونٹ ناکارہ ہو جاتے۔

ہر نیک و بدی کہ در شمار است
تا در نگری صلاح کار است

(ہر وہ چیز جو اچھی اور بُری سمجھی جاتی ہے جب تو اس پر غور کرے گا تو اس میں بہتری ہی نظر آئے گی۔)

عصر کے وقت ہم یکہ اولنگ نامی سبزہ زار میں اترے جب یہاں کے لوگوں کو ہمارے آنے کی خبر ملی تو انہوں نے ہمارے لئے گرم مکانات فربہ بھیڑوں، گھوڑوں کے لئے گھاس دانہ اور چارے کا انتظام کیا اور آگ روشن کرنے کے لئے انہوں نے خس و خاشاک اور جانوروں کی مینگنیاں وغیرہ وافر مقدار میں مہیا کیں۔ ایسی سخت سردی اور شدید برف باری سے نجات پا کر ایسے گاؤں، ایسے گرم مکانات میں آنا، ایسی سخت مشکلات سے رہائی پا کر ایسے عمدہ نان اور فربہ بھیڑوں کا ملنا وہ نعمتیں ہیں کہ جن کی قدر وہی لوگ جان سکتے ہیں جو ایسی سخت و دشوار صعوبتوں سے دوچار ہوئے ہوں اور اس فارغ البالی سے وہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں (ورق ۱۷۱) جنہوں نے سخت بلاؤں کا مقابلہ کیا ہو۔ ہم نے خاطر جمعی اور دل آسودگی سے یکہ اولانگ میں ایک روز توقف کیا۔ یہاں سے کوچ کرنے کے بعد دو فرسنگ کا راستہ طے کر کے ہم نے پڑاؤ کیا۔ اگلے روز صبح عید الفطر تھی۔ بامیان سے گزر کر درّہ شبرتو پار کر کے ہم وہاں قیام پذیر ہوئے اور وہاں سے کوچ کر کے جنگلک کے آنے سے پہل ہی پڑاؤ کے لئے اُتر گئے۔

جن راستوں سے ہم گزر رہے تھے وہاں ترکمان، ہزارہ اپنے افراد خاندان اور حیوانات کے ساتھ موسم سرما کا زمانہ بسر کر رہے تھے۔ انہیں ہمارے بارے میں قطعاً کوئی خبر نہ تھی۔ صبح کے وقت جب کہ ہم کوچ کر کے اپنے سفر پر روانہ ہوئے تو راستے میں ان کے جانوروں کے باڑے اور جھونپڑے نظر آئے۔ چنانچہ دو تین کو دست برد کیا گیا۔ باقی لوگوں نے گھروں اور گھر کے سامان کو تو وہیں چھوڑا اور خود اپنے بال بچوں کے ساتھ پہاڑوں میں جا کر پناہ لی۔ قراول دستے کی طرف سے یہ خبر آئی کہ چند ہزارہ لوگوں نے ہمارے لشکر کے آدمیوں کا ایک تنگ درّے میں راستہ بند کر دیا ہے

۱۴۔ روری سٹوراٹ کا کہنا ہے کہ درہ زرین کے پاس سے بغیر رہبر کے گزرنا ناممکن ہے ان کی مدد سے ہی برف باری کے دوران راستہ تلاش کیا جاسکتا ہے (ص ۲۴۴)

اور ایسی تیراندازی کر رہے ہیں کہ کسی کو بھی وہاں سے گزرنے نہیں دیتے۔ جیسے ہی یہ اطلاع ملی میں تیزی کے ساتھ ان کی طرف روانہ ہوا۔ جب نزدیک پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہاں کوئی تنگ درّہ نہ تھا بلکہ چند ہزارہ لوگ پہاڑ کی نوک پر جتھا بنا کر جمع ہو گئے ہیں اور وہاں سے تیر برسا رہے ہیں۔

۱. قراسین باغی نینک کورو بتور لار — دنگ و حیران بولوب توررو بتور لار

۲. مین ییتیب تیز اول ساری یوررو دوم — یوررو یوررو دیب ایلکاری یوررو دوم

۳. غرضنیم ایلنی تیر قیلماق ایدی — باغی بیرله ستیز قیلماق ایدی

۴. تیزایتیب ایلنی تارتیم اوزنی — هیچیکم هم ایشتیمادی سوزنی

۵. یوق ایدی جیبه و کیجیم و یراق — میندا بار ایردی نیک اوق دسا داق

۶. یورد دوم ایرسه تمام ال توردی — یاغی گویا بولارنی اولتوردی

۷. میں نوکر کرکیم قیلور سین آنینک اوچون — یاراغی بیر محلدا جانینک اوچون

۸. یوق که نوکر توروب بیکی یوروکای — نوکر اسوده و بیگی چورو کای

۹. نوکری کیم بوطور دورنی اسیق — نی ایشنیککا یارارنی اشقه ماتیق

۱۰. آخرات سالدیم ایلکاری یوررو دوم — سو روبان تاققه یوتقاری یوررو دوم

۱۱. مینی کوروب بوررو دی ایل داغی — قالدی ایلدین کیین کا قور قاغی

۱۲. یتیبان تیر تاقفه یار ما شتوک — اوقیقه باقما یین یورروب اشتوک

۱۳. کاهی آب تین توشوب گهی ایلیق — یوررو بان ایلکا ربکا جرأت لیق

۱۴. یاغی هم تاغدین اوق قویار ایردی — زور کور کاج سالیب یوردی بیردی

۱۵. تاققه چیقتوک هزاره نی قولاب — قیرور قولده کییک کیبی اولاب

۱۶. داریغان نی کییک ایک اتقولا دوک — تالابان مال و قوییتی بولادوک

۱۷. قریبان ترکمان هزاره سینی — ایلد دوک بند کیستی قاره سینی

۱۸. ایراتا غیلقنی دستگیر اتیتوک — اهل وا ولدینی اسیر اتیتوک

۱۔ جب ہراول دستے کا راستہ ہزارہ لوگوں نے مسدود کر دیا تو سب لوگ حیران و مبہوت ہو کر اپنی جگہ رُک گئے۔

۲۔ اس وقت میں ہی تن تنہا آگے بڑھا اور جو لوگ فرار ہونا چاہتے تھے انہیں للکارا اور آگے بڑھو آگے بڑھو کہہ کر انکا حوصلہ بڑھایا۔

۳۔ اس وقت میں اپنے آدمیوں کو تیار کر کے ان کو دشمن سے لڑنے پر آمادہ کرنا چاہتا تھا۔

۴۔ ان لوگوں نے میری بات نہ مانی اور دشمن کی جانب رُخ نہیں کیا بلکہ اِدھر اُدھر ہو گئے۔

۵۔ اس وقت نہ تو میرے پاس زرہ بکتر تھا نہ سینہ بند اور نہ ہی گھوڑے کا ساز۔ بس ترکش کمان کے علاوہ میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔

۶۔ اگر میں رُک جاتا تو وہ بھی آگے نہ بڑھتے جیسے کہ وہ قتل ہونے کو تیار ہیں۔

۷۔ نوکر اس لئے رکھا جاتا ہے وہ وقت پر کام آئے اور اپنے آقا پر جان نثار کرے۔

۸۔ نا کہ اس لئے کہ وہ کھڑا رہے اور اس کا آقا بے بس ہو جائے۔

۹۔ ایسا نوکر کس کام کا؟ وہ نوکری کے قابل نہیں اور نہ اس کے اخراجات اٹھانا چاہئے۔

۱۰۔ اس کے بعد میں خود ہی تنہا دشمن کی جانب بڑھا اور ان پر اپنا گھوڑا دوڑایا۔

۱۱۔ جب لوگوں نے یہ دیکھا کہ میں آگے بڑھ رہا ہوں تو انہوں نے بھی میری پیروی کی۔

۱۲۔ جیسے ہی ہم پہاڑ پر چڑھے، وہاں ڈٹ گئے اور ان کے تیروں کی پرواہ نہ کی۔

۱۳۔ ہمارے ساتھی کبھی پیادہ اور کبھی سوار آگے کی جانب بڑھتے ہی رہے۔

۱۴۔ جب دشمن نے ہمارے لشکر کی زور آوری دیکھی تو وہ اس کی تاب نہ لا سکا اور فرار ہونے لگا۔

۱۵۔ پہاڑ پر چڑھ کر ہم نے ہزارہ کا اس طرح پیچھا کیا جیسے شکاری پہاڑوں اور وادیوں میں ہرن کا پیچھا کرتے ہیں۔

۱۶۔ ہم نے ان ہزارہ کا شکار کیا اور ان کے گلے اور ریوڑ کو لوٹ لیا۔

۱۷۔ ہم نے شکست خوردہ ترکمان ہزارہ کو قید کر لیا۔

۱۸۔ ان کے آدمیوں کو ہم نے پکڑ لیا اور عورتوں اور بچوں کو قید کر دیا۔

ہزارہ لوگوں کا جو مال غنیمت ہمارے ہاتھ لگا اس میں سے کچھ بھیڑیں تو میں نے خود ہی جمع کیں اور (ورق ۱۷۲ا) انہیں یارک طغائی کے حوالے کر دیا اور خود آگے کی جانب روانہ ہوا۔ کوہستانی سلسلے کی بلندیوں اور پشتوں پر پہنچ کر ہم نے ہزارہ لوگوں کے گھوڑوں اور ان کی بھیڑوں کو اپنے آگے ہانکا اور انہیں لنگر تیمور بیگ نامی مقام پر لا کر ہم قیام پذیر ہوئے۔ ہزارہ قوم کے سر برآوردہ لوگوں میں سے چودہ پندرہ سرکش اور راہزن لوگ ہمارے ہاتھ لگے۔ میرا ارادہ تھا کہ منزل پر پہنچ کر ہم انہیں مختلف طریقوں سے ایذا پہنچا کر قتل کر دیں تا کہ تمام راہزنوں اور سرکشوں کو ہمارے اس اقدام سے عبرت ہو لیکن اس اثنا میں قاسم بیگ ان کے پاس پہنچ گیا۔ اور بے موقع و محل ان پر رحم کھا کر انہیں آزاد کر دیا۔

نیکولی بابدان کردن چنان است

کہ بد کردن بجائے نیک مردان

(بُرے لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنا ایسا ہی ہے جیسے اچھے لوگوں کے ساتھ بدسلوکی کرنا۔)

زمین شور سنبل بر نیارد

درو تخم عمل ضایع مگردان

(شورزدہ زمین میں سنبل پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس زمین پر تو اپنی محنت برباد مت کر۔)

کابل میں بغاوت

جس وقت ہم ان ہزارہ ترکمانوں پر یورش کرنے میں لگے ہوئے تھے تو یہ سنا کہ محمد حسین مرزا دوغلت اور سلطان سنجر برلاس نے مغلوں کے اس دستے کو جو کابل میں رہ گیا تھا اپنا ہمنوا کر کے خاں مرزا کو تخت نشین کرنے کے بعد کابل کا محاصرہ کر لیا ہے اور لوگوں کے درمیان یہ مشہور کر دیا کہ بدیع الزماں مرزا اور مظفر مرزا نے بادشاہ کو گرفتار کر کے اسے ہرات کے قلعہ اختیار الدین میں بھیج دیا ہے۔ یہ قلعہ اب الہ قورغان کے نام سے مشہور ہے۔

قلعہ کابل میں ملا بابا پشاغری، خلیفہ محب علی قورچی، احمد یوسف اور احمد قاسم موجود تھے۔ انہوں نے اپنے فرائض بخوبی انجام دیئے اور قلعے کو مستحکم کر کے اس کی حفاظت کی۔

لنگر تیمور بیگ نامی مقام سے قاسم بیگ کے ملازم محمد اندجان کے ہمراہ ہم نے کابل میں موجود امرا کے پاس اپنا تحریری پیغام بھیجا۔ جس میں ہم نے یہاں پہنچنے کی پوری کیفیت بیان کی۔ یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ غور بند گھاٹی سے نکل کر ہم ان پر حملہ آور ہوں گے۔ جس کی علامت یہ رکھی گئی تھی کہ کوہ مینار سے گزر جانے کے بعد بہت اونچی آگ روشن کی جائے گی اور وہ بھی گڑھی میں اس قدیم محل کی چھت پر جہاں اب خزانہ رکھا جاتا ہے بہت اونچی آگ روشن کریں۔ تا کہ ہم یہ جان لیں کہ انہیں ہماری آمد کی اطلاع ہو گئی ہے۔ ہم اس طرف سے وہاں پہنچیں

گے اور وہ گڑھی کے اندر سے نکل کر باہر آئیں اور جو کچھ ان کے ہاتھ لگے اس کو حاصل کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔ ان باتوں کا فیصلہ کرنے کے بعد محمد اندجانی کو روانہ کر دیا گیا۔

اگلے دن علی الصبح ہم لنگر تیمور بیگ سے گھوڑوں پر سوار روانہ ہوئے اور اشتر شہر کے سامنے قیام کیا۔ وہاں سے صبح کے وقت سوار ہونے کے بعد رات سے پہلے پہلے (ورق ۱۷۳) غور بند گھاٹی سے ہم نکل آئے۔ سرپل اتر کر ہم نے گھوڑوں کو پانی پلایا اور انہیں آرام کرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ ظہر کے وقت ہم سرپل سے روانہ ہوئے، جب ہم تو تقاول پہنچے تو وہاں برف نہ تھی۔ لیکن اس جگہ سے گزرنے کے بعد ہم جتنا بھی آگے بڑھے برف زیادہ سے زیادہ ہوتی چلی گئی۔ دریہ بخشی اور منا کے درمیان اتنی شدید سردی تھی کہ اپنی زندگی ہم نے کم ہی دیکھی ہوگی۔

ہم نے احمد قاصد کو قراحمد یورتچی کے ہمراہ امرائے کابل کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ ہم مقررہ جگہ پر پہنچ گئے ہیں، ہوشیار رہو اور ہمت سے کام لو۔ کوہ سار سے گزر کر اس کے دامن میں پہنچے تو سردی برداشت سے باہر تھی۔ چنانچہ آگ روشن کی اور خود کو گرمی پہنچائی اگر یہ ایسا موقع نہ تھا کہ آگ روشن کی جائے لیکن سردی کی مار ایسی زبردست تھی کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ صبح نمودار ہونے کے قریب ہی تھی کہ ہم دامن کوہ منار سے گھوڑوں پر سوار روانہ ہوئے۔ کابل اور منار کے درمیان برف باری ہو رہی تھی اور ہر طرف برف ہی برف پڑی ہوئی تھی۔ اگر کوئی شخص راستہ بھٹک جاتا تو مشکل میں پڑ جاتا۔ یہ تمام فاصلہ ہم نے برف کے اندر اندر چل کر ہی طے کیا۔ مقررہ وقت پر جب ہم کابل پہنچے تو مطلع ابر آلود تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم بی بی ماہ روی نامی مقام پر پہنچیں گڑھی کی طرف آگ کی اونچی لپٹیں دکھائی دیں۔ جن سے یہ ظاہر ہوا کہ انہیں ہمارے آنے کی خبر مل گئی ہے۔

جس وقت ہم پل سید قاسم پر پہنچے تو ہم نے شیریم طغائی کو برانغار دستے کے ہمراہ پل ملا بابا کی طرف روانہ کیا۔ غول اور جوانغار کے ہمراہ ہم بابا بولی کی جانب روانہ ہوئے۔ اب جس جگہ باغ خلیفہ واقع ہے وہاں کبھی ایک مختصر سا باغیچہ تھا جسے الغ بیگ مرزا نے حویلی کی طرز پر بنوایا تھا۔ اب وہاں درخت اور پودے تو نہیں ہیں البتہ اس کا احاطہ محفوظ ہے۔ خاں مرزا اسی جگہ مقیم تھا۔ محمد حسین مرزا باغ بہشت میں مقیم تھا، یہ باغ بھی الغ بیگ مرزا نے ہی لگوایا تھا۔ باغ ملا کی جانب جو قبرستان ہے وہاں ہم پہنچے ہی تھے کہ وہ دستہ جسے تیزی سے آگے جانے کے لئے روانہ کیا گیا تھا اور جسے پسپا کر کے بھگا دیا گیا تھا ہم سے آن ملا۔ جب وہ لوگ مزید آگے گئے تو ان میں سے چار شخص خاں مرزا کی حویلی میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک سید قاسم میر دربان، دوسرا قاسم بیگ کا بیٹا قنبر علی، تیسرا مغل شیر قلی قراول اور چوتھا شیر علی مغل دستے کا رکن سلطان احمد مغل تھا۔ اس وقت خاں مرزا وہاں موجود تھا۔ یہ چاروں شخص وہاں پہنچتے ہی سیدھے حویلی کے اندر داخل ہو گئے جس کے باعث وہاں بڑا ہنگامہ بپا ہوا۔ شور سن کر خاں مرزا گھوڑے پر سوار ہوا اور وہاں سے فرار ہو گیا۔ محمد حسین قوربیگی کے بھائی نے خاں مرزا کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ان چار افراد میں سے شیر قلی پر اس نے تلوار کا وار کیا، وہ اس کا سر کاٹنا چاہتا ہی تھا کہ شیر قلی اس کے چنگل سے بچ نکلا۔ یہ چاروں گھائل اور زخم خوردہ ہم سے یہیں آن ملے۔

ایک تنگ کوچے میں سوار جمع تھے مزید کچھ اور لوگ بھی وہاں پہنچ گئے جس کے باعث وہاں جم غفیر جمع ہوا کہ نہ تو کوئی آگے بڑھ سکتا تھا اور نہ ہی واپس جا سکتا تھا۔ وہ جوان جو میرے نزدیک تھے میں نے ان سے کہا کہ نیچے اتر آؤ اور زور آزمائی کرو، دوست ناصر، خواجہ محمد کتابدار، بابا شیرزاد، شاہ محمود اور چند دیگر جوان گھوڑوں سے اتر گئے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ایسے تیر برسائے کہ دشمن کو فرار ہوتے ہی بنی۔

قلعے سے اپنے آدمیوں کے پہنچنے (ورق ۱۷۴) کا ہم نے بہت انتظار کیا مگر وہ وقت کارزار نہ پہنچ سکے

لیکن جب ہم نے دشمن کو پسپا کر دیا تو ان میں سے ایک ایک اور دو دو دوڑ کر آنے شروع ہوئے۔ ہم ابھی اسی چار باغ میں جہاں خاں مرزا مقیم تھا پہنچے بھی نہ تھے کہ اہل قلعہ میں سے احمد یوسف اور سیّد یوسف میرے پاس پہنچے اور اس باغ میں جہاں خاں مرزا مقیم تھا۔ میرے ساتھ داخل ہو گئے، جہاں پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ خاں مرزا موجود نہیں۔ میں انتہائی تیزی سے دوڑا، احمد یوسف میرے پیچھے آ رہا تھا۔ چار باغ کے دروازے پر دوست سر پلی پیادہ سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کو کابل میں میں نے اس کی مردانگی کے باعث بہت سی مراعات دی تھیں اور اس کو شہر کا کوتوال بنا دیا تھا وہ ہاتھ میں تلوار سونتے میری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا اگر چہ اس وقت زرہ بکتر میرے تن پر تھا مگر میں نے اس کے غر یچے باندھے نہیں تھے اور خود بھی سر پر نہ تھی۔ اگر چہ میں نے دوست دوست کہہ کر اسے کئی مرتبہ پکارا اور احمد یوسف نے بھی اسے آواز دی مگر وہ ہمیں نہ پہنچایا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ برف اور سردی کے باعث ہمارے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا تھا یا جنگ کی وجہ سے مضطرب و پریشان، بہر جہت وہ مجھے نہ پہچانا اور بے تحاشا اپنی تلوار میرے برہنہ بازو پر چلانی شروع کر دی۔ خداوند تعالیٰ کا فضل شامل حال تھا میرا بال بھی بیکا نہ ہوا۔

اگــر تیـغ عــالـم بـجنبـد زجـای
نبـردرگــی تــانـخـواهـدخـدای

(اگر ساری دنیا کی تلواریں حرکت کریں۔ خدا نہ چاہے تو وہ رگ تک نہیں کاٹ سکتیں۔)

اس وقت میں نے یہ دعا پڑھی تھی اور یہ اس دعا کا ہی اثر تھا کہ خداوند تعالیٰ نے مجھے محفوظ رکھا اور بلا میرے سر سے ٹل گئی:

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

اللّٰهم انت ربی لا الٰه الاّ انت علیک توکّلت و انت ربّ العرش العظیم. ماشآء اللّٰه کان وما لم یشآلم یکن ولا حول ولاقوّة الاّ باللّٰه العظیم ٥ واعلم ان اللّٰه علی کلّ شیٔ قدیر ٥ وان اللّٰه قد احاط بکلّ شیٔ علما واحصی کل شیٔ عددا ٥ اللّٰهم انّی اعوذبک من شر نفسی و من شر غیری و من شرذی شرو من شر کل دابّة اخذبنا صیتها انک ربّ العرش العظیم

"اے اللہ! تو ہی میرا رب ہے، تیرے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ میں تجھ پر ہی بھروسہ کرتا ہوں اور تو ہی عرش عظیم کا مالک ہے۔ جو تو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔ نہیں ہے کوئی طاقت وقوّت اللہ برتر کے سوا۔ یقیناً اللہ رب العزت کی ذات ہر چیز پر قادر ہے اور بیشک اللہ تعالیٰ کے علم نے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے اور گنتی وتعداد کے اعتبار سے ہر چیز پر اس کی ذات حاوی ہے۔ اے اللہ! میں تجھ سے ہی پناہ چاہتا ہوں اپنے نفس کے شر سے اور ہر رینگنے والے جانور کے شر سے۔ بیشک تو ہی عرش عظیم کا مالک ہے۔

میں وہاں سے نکل کر باغ بہشت کی جانب روانہ ہوا۔ یہاں محمد حسین مقیم تھا، فرار ہونے کے بعد وہ یہاں روپوش ہو گیا تھا۔ باغیچہ کی دیوار میں جس جگہ سے رخنہ ڈال کر کے محمد حسین مرزا اندر داخل ہوا تھا وہاں سات آٹھ آدمی تیر و کمان لئے ایستادہ تھے۔ میں اپنے گھوڑے کو ایڑھ لگا کر ان کی طرف لپکا۔ وہ میرے اس حملے کی تاب نہ لا سکے اور فرار ہونے لگے۔ میں نے ان تک پہنچ کر ایک پر تلوار کا وار کیا وہ اس طرح قلابازیاں کھاتا ہوا

بھا گا کہ اس کا سر پھٹ گیا ہے کیونکہ وہ بھاگا چلا جا رہا تھا میں نے اسے جانے دیا۔ جس شخص پر میں نے تلوار چلائی تھی وہ خان مرزا کا رضاعی بھائی تو لک کوکلداش تھا تلوار کا وار اس کی کمر پر ہوا تھا۔

جس عمارت میں محمد حسین مرزا پوشیدہ تھا جب میں اس کے دروازے پر پہنچا تو اس کی چھت پر ایک مغل نے جو کبھی میرا نوکر تھا اور میں نے اسے پہچان لیا تھا چلہ چڑھا کر اپنے تیر کا مجھے نشانہ بنانا چاہا لیکن اس اثنا میں چاروں طرف سے شور وغوغا برپا ہوا۔ ارے کیا کرتا ہے، دیکھتا نہیں کہ یہ حضرت بادشاہ سلامت ہیں۔ یہ سُن کر اس نے تیر کا رُخ پھیر دیا اور وہاں سے فرار ہو گیا۔ لیکن اب بات تیر اندازی سے آگے نکل چکی تھی کیوں کہ جس امیر کے ایماں پر وہ تیر چلانا چاہتا تھا وہ اور اس کے سردار فرار ہو گئے مگر گرفتار ہو کر آئے۔ اس فتنہ پردازی میں سلطان سنجر برلاس بھی شریک تھا (یہ وہی شخص تھا جسے میں نے بہت سی مراعات دی تھیں اور دس ہزار کی آبادی پر مشتمل) ضلع ننگر ہار اسے عطا کیا تھا (ورق ۱۷۵) اسی کا طوق اس کی گردن میں ڈال کر میرے سامنے لایا گیا۔ آتے ہی مضطرب و پریشان اس نے چیخنا اور چلانا شروع کر دیا کہ بتاؤ میرا قصور کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس سے بڑھ کر تیرا قصور کیا ہوگا کہ ان ٹولیوں اور منڈلیوں کا سرغنہ تو ہی ہے چونکہ میرے خان دادا کی والدہ شاہ بیگم کا یہ رشتہ میں بھانجا تھا اس لئے میں نے حکم دیا کہ اس کو حقارت کے ساتھ زمین پر نہ کھینچیں، یہ سزائے موت سے مبرّا ہے۔

یہاں سے باہر آ کر میں احمد قاسم کہبر کو، جو امرائے اندرون قلعہ میں سے ایک تھا، جوانوں کے ایک دستے کے ہمراہ خاں مرزا کے تعاقب میں روانہ کیا۔

باغ بہشت کے نزدیک ہی شاہ بیگم اور (مہر نگار) خانم کے خیمے نصب تھے اس باغ سے نکل کر میں شاہ بیگم اور خانم سے ملنے گیا۔ یہاں کیا دیکھتا ہوں کہ شہر کے لوگ اور کچھ اوباش ہاتھوں میں لاٹھیاں لئے جمع ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ اس جگہ کے کونوں کھدروں سے لوگوں کو پکڑیں اور ان کے مال واسباب لوٹ لیں۔ اس بنا پر میں نے یہاں اپنے کچھ آدمی متعیّن کئے کہ وہ ان بدمعاشوں کو مار کر بھگا دیں۔

شاہ بیگم اور خانم ایک خیمے میں تشریف فرما تھیں، جس جگہ میں ہمیشہ اپنے گھوڑے سے اترتا تھا، اس مقررہ جگہ پر اب بھی، پورے ادب واحترام کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور گذشتہ کی طرح آداب بجا لایا۔ شاہ بیگم اور خانم مضطرب، پریشان اور شرمندہ نظر آ رہی تھیں، اپنی پریشانی کا وہ کوئی معقول عذر بیان نہ کر سکیں اور نہ ہی اپنی محبت اور شفقت کا اظہار کیا۔ مجھے ان سے ایسی توقع ہرگز نہ تھی۔ ان کا مقام ایسا نہ تھا وہ خواہ کتنی ہی مشکل و پریشانی میں مبتلا کیوں نہ ہوں کوئی ان کی بات نہ سنے آخر مرزا خاں تو شاہ بیگم کا نواسہ تھا اور دن رات ان ہی کی آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔ یہ خواتین ان لوگوں کی باتوں میں نہ آ گئی ہوتیں تو مرزا خاں کو اپنے ساتھ رکھ سکتی تھیں۔ زمانے کی ناہمواری اور وقت کی ناسازگاری کے باعث کئی مرتبہ یہ اتفاق پیش آ چکا ہے کہ میں تخت ملک اور ملازمین سے دست برداری کے بعد ان کی خدمت میں اپنی والدہ کے ساتھ عرض داشت لے کر حاضر ہوا۔ لیکن ان کی طرف سے ذرا بھی کسی قسم کی رعایت، شفقت ومحبت کا اظہار نہ ہوا۔ میرا برادر خورد مرزا خاں اور اس کی والدہ سلطان نگار خانم کے پاس دوسروں کی ولایات کے علاوہ ان کی اپنی زرخیز وآباد زمینیں تھیں اس کے برعکس میرے اور میری والدہ کے پاس ولایت کا تو کیا ذکر ایک گاؤں اور چند مویشی تک نہ تھے گویا کہ میری والدہ یونس خاں کی بیٹی اور میں ان کا نواسہ نہ تھا۔

جب میرا بھلا وقت تھا اور اس قوم و برادری کا کوئی بھی شخص آیا، میں نے جہاں تک ممکن ہو سکا خون اور رشتہ کا حق ادا کیا۔ جس وقت شاہ بیگم تشریف لائیں تو میں نے انہیں پغمان کا علاقہ (جس کا شمار کابل کے بہترین علاقوں میں ہوتا ہے) عطا کر دیا۔ اس کے علاوہ بھی میں نے حق فرزندی اور خدمت گزاری میں کوئی کوتاہی نہ کی۔

فرمانروائے کاشغر، سلطان سعید خاں ننگے پیر پیدل چل کر میرے پاس آیا تھا میں نے اس کے ساتھ بھائی کا سا سلوک کیا اور (دس ہزار کی آبادی پر مشتمل) ضلع مند اور اسے عطا کیا۔ جس وقت شاہ اسمٰعیل نے شیبانی خاں کو مرو میں قتل کیا اور میرا گزر قندز سے ہوا تو ولایت اندجان کے لوگوں نے مجھے مدنظر رکھتے ہوئے اپنے بعض داروغہ لوگوں کو ولایت سے نکال کر میرے پاس آدمی بھیجا۔ میں نے اپنے ملازمین کو سلطان سعید خاں کے حوالے کر دیا اور اسے ولایت اندجان (ورق ۱۷۶) عطا کر دی اور اسے وہاں کا فرمانروا اور خان بنا کر روانہ کیا۔ اس وقت تک اس قوم و برادری کا جو شخص بھی میرے پاس آیا میں نے اس کے ساتھ اپنے سگے سے کمتر سلوک نہ کیا۔ چین تیمور سلطان، ایسن تیمور سلطان، توختہ بوغہ سلطان، اور بابا سلطان آج بھی میرے ہی پاس ہیں۔ میں نے ان سب کے ساتھ سگے رشتہ داروں سے کہیں زیادہ اچھا برتاؤ کیا ان کے ساتھ مراعات کیں شفقت کے ساتھ پیش آیا ہوں۔

یہاں میری غرض ہرگز یہ نہیں کہ شکایت کروں بلکہ حقیقت پر مبنی داستان ہے اسی لئے میں نے یہاں لکھ دیا اور میرا مقصد خودستائی نہیں بلکہ بیان ہے جو تحریری شکل میں پیش ہے۔ اس تاریخ کی کتاب میں اس امر کا التزام کیا گیا ہے کہ ہر بات کی حقیقت کو بیان کیا جائے اور ہر کام کو تحریر کی شکل دی جائے۔ اس لئے میں نے والد ہو یا بھائی جس نے میرے ساتھ اچھا یا بُرا جیسا بھی سلوک کیا اسے میں نے یہاں بیان کر دیا ہے۔ اسی طرح اپنے رشتہ داروں اور غیروں کا جو بھی عیب و ہنر تھا اس حقیقت کو یہاں تحریری شکل دے دی۔ اس لئے جو شخص بھی اسے پڑھے وہ مجھے معاف رکھے اور جو بھی سنے وہ اسے اعتراض کی نظر سے نہ دیکھے۔

اس جگہ سے روانہ ہو کر میں اس چار باغ میں قیام پذیر ہوا جہاں مرزا خاں کا قیام تھا۔ یہاں سے تمام ولایت، قبائل، قوم اور برادری کے لوگوں کو فتحنامے روانہ کیئے گئے۔ یہاں سے سوار ہو کر میں قلعے میں پہنچا۔

محمد حسین مرزا جان کے خوف سے بھاگ کر خانم کے توشک خانے میں جا چھپا اور وہاں جو لحاف و توشک وغیرہ رکھے تھے اس کے لچھے میں اس نے خود کو باندھ لیا۔[15] جو لوگ قلعے میں تھے ان میں سے میرے دیوان اور بعض دیگر لوگوں کو اس کام پر متعیّن کیا گیا کہ وہ گھر گھر کی تلاشی لیں اور محمد حسین مرزا کو باہر نکال کر لائیں۔ اسے تلاش کرتے ہوئے وہ خانم کے دردولت پہنچے۔ یہاں لوگ ان کے ساتھ نہایت بدکلامی اور بدتمیزی سے پیش آئے۔ بالآخر انہوں نے مرزا کو خانم کے توشک خانے میں جا لیا اور قلعے کے اندر لے کر آئے۔[16] میں حسب سابق اس کے ساتھ ادب واحترام سے پیش آیا، اور اس کی خاطر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت کوئی تلخ بات تک زبان پر نہیں لایا۔ محمد حسین مرزا نے میرے ساتھ جو سلوک کیا تھا اور جن حرکات کا وہ مرتکب ہوا تھا اور جس قسم کا فتنہ وفساد کو برپا کرنے کا اس نے اہتمام کیا تھا اس کے پیشِ نظر اگر میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا تو مناسب ہوتا۔ وہ ہر قسم کی ایذا وتکلیف کا سزاوار تھا لیکن چونکہ میرے اور اس کے درمیان قرابت داری تھی یعنی اس کی آل واولاد میری خالہ خوب نگار خانم کے ہی بچے تھے، اسی لئے میں نے ان حقوق کا پاس کرتے ہوئے اسے آزاد کر دیا اور خراسان کی جانب جانے کی اجازت دے دی۔ مگر اس بے مروت اور نمک حرام شخص نے میری اس نیکی کو بھی قطعی فراموش کر دیا کہ میں نے اس کی جان بخشی کی تھی شیبانی خان کے پاس پہنچ کر اس نے میری شکایت کی اور غیبت کے پل باندھ دیئے لیکن ابھی تھوڑا عرصہ بھی نہیں گزرا تھا کہ شیبانی خان نے اسے قتل کر دیا اور اس طرح اس نے اپنے کیئے کی سزا پائی۔[17]

تو بد کنندہ خود را بروزگار سپار
کہ روزگار ترا چاکر ست کینہ گذار

(تیرے ساتھ جو بُرا سلوک کرے اسے زمانے کے سپرد کر دے کیوں کہ زمانہ تیرا نوکر ہے جس کے دل میں یہ کینہ رہتا ہے۔)

۱۵۔ گلبدن بیگم نے بھی تحریر کیا ہے کہ محمد حسین مرزا نے اپنے آپ کو "سفرش" میں لپیٹ کر بندھوا لیا تھا۔ مفرش کا ترجمہ اینٹ بیورج نے قالین کیا ہے لیکن بابر کی اصطلاح توشک زیادہ درست ہے (ہمایوں نامہ ص ۸۹-۹۰)

۱۶۔ مرزا حیدر دوغلت نے تاریخ رشیدی میں سارا الزام شاہ بیگم پر ڈال کر اپنے باپ مرزا محمد حسین کو الزام سے بچانے کی پوری کوشش کی ہے۔ لیکن وقت نے حقیقت ظاہر کر دی (تاریخ رشیدی ص ۱۹۸)

احمد قاسم کہبر ا اور چند دیگر جوان جنہیں مرزا خاں کے تعاقب میں بھیجا گیا تھا انہوں نے اسے قرغہ یلاق کی پہاڑیوں میں جا لیا۔ وہ بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ بھاگنا تو دور کی بات ہے اس میں تو اتنی بھی سکت نہ تھی کہ ہاتھ تک ہلا سکے۔ بہر صورت اسے گرفتار کر کے میرے سامنے پیش کیا۔ جب اسے میرے سامنے لایا گیا تو اس وقت میں دیوانہ خانہ قدیم کے اس ایوان میں بیٹھا تھا جو اس دیوان خانے کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ میں نے اس سے کہا "آؤ ہم ایک دوسرے کو دیکھیں" خوف و ہراس کے باعث اس سے قبل کہ وہ زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھے وہ دو مرتبہ گر پڑا مگر (ورق ۱۷۷) جب وہ سامنے آیا تو اسے میں نے اپنے پہلو میں جگہ دی اور اس کی دل داری کی۔ شربت لایا گیا اس کا شک دور کرنے کیلئے میں نے خود پہلے شربت پیا اور اس کے بعد اس کی طرف بڑھایا۔

سپاہ و رعیت، مغل اور چغتائی قبائل کے وہ دستے جو مرزا خاں کے ساتھ تھے خوف زدہ تھے۔ میں نے احتیاط کے مدِّ نظر حکم دیا کہ وہ (خاں مرزا) چند روز اپنی بہنوں کے گھر میں جا کر رہے۔ میں نے صلاح اس امر میں دیکھی کہ خاں مرزا کابل میں مقیم نہ رہے اس لئے چند روز بعد اسے خراسان کی طرف جانے کی اجازت دے دی۔

۱۷۔ محمد حسین مرزا کا قتل۔ شیبانی خاں نے اپنا وہی پرانا حربہ جو خواجہ یحیٰی پر استعمال کیا تھا یہاں بھی دوہرایا۔ مرزا کو ہرات روانہ کیا اور پیچھے سے قاتل بھیج دیئے۔

کوہِ داماں کا سفر

انہیں رخصت کرنے کے بعد ہم باران، چاش توپہ اور گلبہار کی پہاڑیوں کی طرف سیر کرنے کی خاطر روانہ ہوئے۔ موسم بہار میں باران، رشت، چاش توپہ اور گلبہار کے دامن نہایت ہی حسین و دل کش نظر آتے ہیں۔ ولایت کابل میں جتنی بھی جگہیں ہیں ان کے مقابل یہاں سبزہ بکثرت ہوتا ہے اس جگہ انواع واقسام کے پھول کھلتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے حکم دیا کہ گن کر بتائیں یہاں کتنے قسم کے پھول پائے جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ تیس چالیس قسم کے پھول یہاں ہوتے ہیں۔ ان مقامات کی تعریف میں میں نے یہ شعر کہا تھا۔

سبزہ و گل لا ربیلہ جنت بولور کابل بہار
خاصہ بو موسمدا باران یاریسی و گلبہار

(اپنے سبزہ و گل کے باعث بہار کے موسم میں کابل بہشت کہلاتا ہے۔ خاص طور پر دشت باران اور گلبہار جیسے مقامات)

اس جگہ سیر کرتے ہوئے میں نے ایک غزل مکمل کر لی۔

مینیک کونکلوم کہ گل نینک غنچہ سی دیگ توبتہ قاندور
اگر یوز مینگ بہار اولسہ اچیلماتمی نوا مکاندور

(میرا دل غنچہ و گل میں ڈوبا ہوا ہے۔ اگر ہزاروں بہاریں بھی آئیں تو کیا اس دل کی کلی کھل سکتی ہے۔)

بہار کے موسم میں سیر و تفریح، شاہین پروازی اور تیر اندازی کے لئے کم جگہیں ہی ایسی حسین و دلکش ہوں گی۔ اس لئے مختصر طور پر کابل و غزنی کی تعریف یہاں کر دی گئی ہے۔

ناصر مرزا کا بدخشاں سے اخراج

اسی سال ناصر مرزا کے طور و طریقے اور اس کے پروردہ نوکروں کے رویّے سے تنگ آ کر محمد قورچی، مبارک شاہ، زبیر اور جہانگیر جیسے امرائے بدخشاں نے اس کے خلاف غم و غصے کا اظہار کیا بلکہ سب متفق ہو کر

لشکر کشی پر آمادہ ہو گئے۔ دریائے کوکچہ کے دشت کی طرف سے انہوں نے یفتل اور راغ نامی مقامات سے اپنے پیادہ وسوار لشکر جمع کرنے شروع کر دیئے، اور پہاڑی راستوں سے گزر کر وہ خمچال کے نزدیک جمع ہو گئے۔ ناصر مرزا اور اس کے اردگرد جو ناتجربہ کار جوان تھے وہ غور وفکر اور حالات کا جائزہ لئے بغیر ہی جنگ کرنے کی غرض سے پہاڑیوں پر پہنچ گئے۔ ٹیلوں اور پشتوں کی وجہ سے میدان جنگ ناہموار تھا اور بدخشاں کی پیادہ فوج بکثرت۔ ایک دو مرتبہ گھوڑے دوڑا کر انہوں نے حملے تو کیے اور دشمن کو بھگایا بھی مگر جب اس طرف سے حملہ ہوا تو وہ اس کی تاب نہ لا سکے اور فرار ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اہل بدخشاں نے ناصر مرزا کو شکست دے کر اس کے ہواخواہوں کو بھی زیر کر لیا۔

یہ شکست خوردہ اور تخت وتاراج زدہ لشکر اسکمش اور نارین کے راستے سے کلاگے نامی مقام پر پہنچا۔ یہاں سے دریائے سرخ (سرخ آب) کے بالائی طرف روانہ ہو کر اور بدرہ کے راستے سے گزرنے کے بعد انہوں نے درۂ شبرتو کو عبور کیا۔ بالآخر ستراستی خستہ، تباہ حال فاقہ زدہ اور برہنہ تن کابل پہنچے۔

قادر مطلق کی یہ عجیب قدرت ہے کہ دو تین سال قبل اسی ناصر مرزا نے تمام قوم وقبائل کے لوگوں کو کوچ کرنے پر مجبور کیا اور انہیں گھروں سے بے گھر کیا اور بغاوت کر کے کابل سے چلا گیا۔ وہاں سے نکل وہ بدخشاں پہنچا۔ وہاں کے درّوں اور قلعوں کو مضبوط کیا اور نہ جانے کس خیال میں وہ سرگرداں تھا (ورق ۱۷۸) لیکن وہ اپنے کئے پر شرمندہ وپشیمان تھا۔ اس کے ساتھی بھی میرا ساتھ چھوڑنے پر شرمندہ وپشیمان تھے۔ لیکن میں ان سب باتوں کو منہ پر نہیں لایا۔ میں نے اچھی طرح اس کا حال دریافت کیا اور مہربانی سے پیش آ کر اس کی شرمندگی کو ختم کیا۔

واقعات ۹۱۳ھ

(۱۳ مئی ۱۵۰۷ء ـ ۲ مئی ۱۵۰۸ء)

ہم کابل سے غلجی [۱] (غلزئی) پر حملہ کرنے کی غرض سے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ جس وقت ہم سردہ پہنچ کر وہاں قیام پذیر ہوئے تو مست اور سرگانہ نامی جگہوں پر جو سردہ سے ایک فرسنگ کے فاصلے پر واقع ہیں، بہت سے مہمند قبیلے کے لوگ خود سے بے خبر و بے نیاز قیام کئے ہوئے تھے۔ امرا اور جوانوں کا اس بات پر اتفاق ہوا کے مہمند [۲] قبیلے کے لوگوں پر حملہ کیا جائے۔ اس پر میں نے کہا کہ کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہم جس ارادے سے سوار ہوئے اس منزل مقصود پر پہنچے بغیر ہی اپنی رعیت کو تاخت و تاراج کریں اور واپس چلے جائیں۔ یہ ممکن نہیں۔

سردہ سے گھوڑوں پر سوار ہو کر ہم نے رات کی تاریکی میں صحرائے کتواز کو عبور کیا۔ اس سیاہ رات میں ناہموار زمین پر نہ تو کوئی پہاڑ نظر آتا تھا اور نا ہی کسی راستے کا نام و نشان ملتا تھا۔ کوئی شخص ایسا بھی نہ تھا کہ وہ اس راہ کو سر کرا سکے۔ بالآخر اسے سر کرنے کا میں نے ہی بیڑا اٹھایا کیوں کہ اس سے پہلے میں ایک دو مرتبہ اس جگہ کے گردونواح سے گزر چکا تھا۔ اسی قیاس کی بنا پر میں روانہ ہوا کہ قطب میرے دائیں جانب رہا۔ خدوندتعالیٰ نے ٹھیک ہی کیا، ہم سیدھے اسی سمت میں دائیں جانب چلتے چلتے قیا قتو اور اولابہ تو نامی دریاؤں پر پہنچ گئے۔ یہی وہ جگہ ہے جو غلزئی قبائل کی آماجگاہ ہے کیوں کہ یہیں خواجہ اسمٰعیل سریتی کا آستانہ ہے۔ گھوڑوں نے ذرا دم لیا۔ یہاں دریا پر راستہ آکر ملتا ہے۔ چنانچہ ہم دریا پار ہوگئے۔ تھوڑی دیر سو کر آرام کیا اور گھوڑوں نے بھی دم لیا۔ صبح کے وقت ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ جس وقت ہم پشتوں اور وادیوں سے گزر کر میدانی علاقے میں پہنچے تو سورج نکل چکا تھا۔ جس جگہ غلزئی آباد ہیں وہاں سے یہاں تک اچھا خاصا ایک فرسنگ کا فاصلہ ہوگا۔ وہاں یا تو غلزئی تھے یا دھواں۔ ہمارے کچھ بے سرے لوگوں نے ان کے لشکر پر یورش کردی۔ ہم نے ان کو روکنے کے لئے ان کا تعاقب کیا۔ آدمیوں اور گھوڑوں کو تیروں کا نشانہ بنایا پانچ چھ ہزار آدمیوں کے لشکر کو قابو میں رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ خدا کی کارسازی ہی تھی کہ وہ لوگ اپنی جگہ رک گئے تقریباً ایک کروہ شرعی چلے ہوں گے کہ ہمیں افغان نظر آئے۔ ہم نے ان پر اچانک حملہ کردیا۔ اس یورش میں بکثرت بھیڑیں ہمارے ہاتھ لگیں اس سے پہلے کسی بھی حملے میں اتنی تعداد میں بھیڑیں ہاتھ نہیں آئی تھیں۔

مال حاصل کرنے کے بعد جب ہم قیام پذیر ہوئے تو چاروں طرف سے افغانوں کے دستے آنے شروع ہوگئے اور جنگ کے لئے مشتعل کرنے لگے امرا اور عزیزوں نے وہاں پہنچ کر انکا صفایا کردیا اور سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا، ناصر مرزا ایک دوسری جماعت پر گھوڑوں سے حملہ آور ہوا اور اس کے تمام افراد کو قتل کردیا۔ جن افغانوں کو قتل کیا گیا تھا ان کے سروں سے مینار تیا کیا گیا۔ پیادہ سپاہی دوست کوتوالی کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ [۳] اس یورش میں اس کے پاؤں پر تیر آکر لگا جب وہ کابل پہنچا تو اس نے دم توڑ دیا۔

خواجہ اسمٰعیل نامی مقام سے کوچ کر کے ہم نے اولابہ تو پہنچ کر قیام کیا۔ یہاں یہ فرمان دیا گیا کہ بعض امرا اور قرابت داروں نے جو مال غنیمت جمع کیا ہے اس کا خمس [۴] ان سے وصول کیا جائے۔ قاسم بیگ اور دیگر بعض لوگوں کے ساتھ رعایت کا سلوک کیا گیا اور ان سے خمس کی وصولی نہیں کی گئی۔ جس وقت مال خمس کو تحریر میں لایا گیا تو معلوم ہوا کہ سولہ ہزار بھیڑیں مال خمس میں جمع ہوئی ہیں (ورق ۱۷۹) یعنی اسی ہزار بھیڑوں کا پانچواں

۱۔ غلجی۔(غلزئی) ایک خانہ بدوش پٹھان قبیلہ جو اپنی نسل بٹان قیس عبدالرشید کے دوسرے بیٹے سے ملاتے ہیں۔ قیس عبدالرشید پر سب پٹھان قبیلے جد اعلیٰ ہونے پر متفق ہیں۔ یہ قبیلہ بٹان کی بیٹی بی بی ماتو کی اولاد ہیں۔ یہ قبیلہ پشتو بولنے والوں میں سب سے بڑا قبیلہ ہے۔ یہ ماتو بی بی کے بڑے بیٹے کی اولاد ہیں اور چھوٹے بیٹے کی اولاد میں لودی اور سوری آتے ہیں جنہوں نے دہلی پر حکومت کی۔ (اولو کیرص ۱۵)

۲۔ مہمند۔ قیس عبدالرشید کے بڑے بیٹے سربنٹری کی اولاد۔ سربنی کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کی اولاد زیادہ تر مغربی افغانستان میں ہے اور چھوٹے بیٹے خرشبن کی اولاد مشرقی افغانستان میں ہیں۔ مہمند اس چھوٹے بیٹے کی اولاد ہیں اور زیادہ تر پشاور اور اس کے نواحی علاقاجات میں آباد ہیں۔ (اولو کیرص ۱۲)

۳۔ دوست کوتوالی۔ جس نے کابل کی بغاوت فرو کرتے ہوئے غلطی سے بابر پر حملہ کردیا تھا۔ اس کا ذکر ۹۱۲ھ کے واقعات میں ہے۔

۴۔ خمس۔ "اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔ اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو فیصلے کے روز یعنی دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ کے دن ہم نے اپنے بندے پر نازل کی تھی (تو یہ حصہ بخوشی ادا کرو) اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔" (۴۱:۸ قرآن)

حصہ۔ اگر ان بھیڑوں کو بھی شمار میں لایا جائے جو ضائع ہو گئیں اور رعایت کر کے دے دی گئیں تو ان کے ایک لاکھ ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

شکار۔ اس منزل سے ہم نے صبح کے وقت کوچ کیا اور دشت کتواز میں پہنچ کر وہاں شکار کے لئے نرغہ ڈالا۔ یہاں ہرن اور جنگلی گدھے بہت فربہ اور کثرت سے ہوتے ہیں۔ چناں چہ یہی وجہ تھی کہ ان کی کثیر تعداد نرغے میں آ گئی اور ان کا شکار کیا گیا میں نے ایک جنگلی گدھے کے پیچھے گھوڑا دوڑایا، اس کے نزدیک پہنچ کر اس پر تیر چلایا۔ اس کے بعد ایک اور تیر چلایا لیکن تیر کاری نہ لگے کہ وہ گر پڑے البتہ ان تیروں کی ضرب سے اس کے جو زخم تھے ان کے باعث اس کی رفتار پہلے کے مقابلے کم ہو گئی۔ میں نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس کے قریب پہنچ کر اس کے کانوں کے ذرا نیچے تلوار کی ایسی کاری ضرب لگائی کہ اس کے حلق سے نیچے تک اترتی چلی گئی۔ اس کے بعد اس نے ایسی قلابازی کھائی کہ اس کی پچھلی ٹانگیں میری رکاب پر آ کر لگیں۔ میری تلوار کا وار واقعی کار گر رہا۔ عجب فربہ گدھا تھا۔ اس کی پسلیاں گز بھر سے کچھ ہی کم ہوں گی۔ شیرم طغائی اور بعض لوگوں نے جو مغلستان میں جانوروں کو دیکھے ہوئے تھے۔ حیرت سے کہنے لگے کہ مغلستان میں تو ایسے فربہ جانور کم ہی نظر آتے ہیں۔ اس روز میں نے مزید ایک جنگلی گدھے کا شکار کیا۔ اس مرتبہ شکار میں جس قدر ہرن اور جنگلی گدھے گرائے گئے۔ اگر چہ ان میں بیشتر فربہ ہی تھے مگر جس جنگلی گدھے۔ کا میں نے شکار کیا تھا اس کے برابر کوئی بھی نہ تھا۔ اس شکار کے بعد ہم کابل آ گئے

ہرات کی تباہی

گزشتہ سال کے اواخر میں شیبانی خاں خراسان کی دعوے داری میں اپنے لشکر کے ہمراہ سمرقند سے روانہ ہوا۔ اس وقت اندخود کا علاقہ شاہ منصور بخشی نمکحرام سے متعلق تھا۔ اس نے شیبانی خاں کے پاس اپنے آدمی روانہ کئے۔ جس کے باعث اس کے سواروں کی رفتار میں سرعت آ گئی۔ جس وقت وہ اندخود کے نواح میں پہنچا تو اس بد بخت نے اس بات پر تکیہ کرتے ہوئے کہ اس نے ازبکوں کو قاصد بھیج کر یہاں آنے کی دعوت دی ہے خود کو آراستہ و پیراستہ کر کے اور سر پر کلغی لگا کر پیشکش اور تحائف کے ساتھ ان کا استقبال کرنے کے لئے آیا۔ جس وقت ازبک وہاں پہنچے تو وہ ہر طرف سے اس پر ٹوٹ پڑے۔ انھوں نے اس فجر کی پیشکش اس کے تحائف اور آدمیوں کو ان کی آن میں تتر بتر کر دیا۔

اس وقت بدیع الزماں مرزا، مظفر مرزا، محمد برندوق برلاس اور ذوالنون ارغون سب کے سب باباخاکی کے نواح میں اپنے لشکروں کے ساتھ تھے۔ ان کا ارادہ نہ تو جنگ کا تھا اور نا ہی اپنے قلعوں کو مستحکم کرنے کا ان کے سامنے کوئی بات واضح و روشن نہ تھی اور یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ وہ کیا اقدام کریں۔ بس سراسیمگی کی حالت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ محمد برندوق برلاس معقول آدمی تھا، اس کا اس امر پر اصرار تھا کہ مظفر مرزا اور میں قلعہ ہرات کو مستحکم کریں۔ بدیع الزماں مرزا اور ذوالنون بیگ ہرات کے گرد و نواح میں واقع کوہستان میں پہنچ جائیں، سیستان سے سلطان علی ارغون کو اور قندھار و زمیں داور سے شاہ بیگ و مقیم کو ان کے لشکروں کے ہمراہ یہاں آنے کی دعوت دی جائے۔ ان سب کو ساتھ لے کر اور ہزارہ و نکدری سے جو بھی لشکر فراہم ہو سکیں ان سب کو متحد کر کے جنگ کے لئے مکمل طور پر مستعد ہو جائیں۔ کیوں کہ اس صورت میں دشمن کو کوہستان کی جانب جانا مشکل ہو گا۔ جب وہ باہر لشکر کو دیکھے گا۔ (واق ۱۸۰) تو وہ قلعے کی طرف بھی رخ نہ کر سکے گا۔ اس نے جو بات کہی تھی عمدہ تھی اور جو خیال اس کے ذہن میں تھا معقول تھا۔

ذوالنون ارغون میں اگر چہ مردانہ آن بان تھی مگر بخیل و دولت پرست آدمی تھا۔ کسی معقول مشورے سے

بھی بے گانہ تھا، احمق و دیوانہ قسم کا انسان تھا۔ جس زمانے میں دو بھائی مشترکہ طور پر ہرات میں فرمانروائی کر رہے تھے، اس وقت وہ بدیع الزماں مرزا کے محل کا مختار کل تھا اس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اس کی مالی دوستی و خود پرستی کا یہ حال تھا کہ خود ہی کوئی کارنامہ سر کرے، جسے وہ نہ کر سکا۔ اس حماقت و دیوانگی کی اس سے بہتر کیا مثال ہوگی کہ فریب، لالچی، دروغگو اور خوشامدی لوگوں کی باتوں میں آ کر اس نے اپنے لئے فضیحت و رسوائی مول لے لی۔ جس کی تفصیل یہ ہے۔ جس وقت ہرات میں وہ صاحب اختیار شمار کیا جانے لگا تو کچھ ملاّ و مشائخ قسم کے لوگوں نے اسے گھیر لیا اور کہا کہ اقطاب سے ہمارا ربط و تعلق ہے انھوں نے تجھے ہزبر اللہ (شیر خدا) کا لقب دیا ہے۔ تو ازبکوں پر غلبہ حاصل کرے گا۔ وہ ان ملاّ و مشائخ کی باتوں میں آ گیا اور اپنی گردن کے گرد انگو چھا لپیٹ کر لشکر بجالایا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے محمد برندوق کے معقول مشورے پر عمل نہ کیا۔ اس نے نہ تو قلعے کو مستحکم کیا اور نا ہی اسلحہ کی تیاری کی۔ اس نے ہراول و جاسوس تک مقرر نہ کئے تا کہ اسے دشمن کی آمد سے آگاہ کر سکیں۔ لشکر کے لوگوں میں بھی کوئی ترتیب اور نظم و نسق نہ تھا کہ اگر دشمن سامنے آ جائے تو خاطر خواہ جنگ کی جا سکے۔

شیبانی خاں نے ماہ محرم میں دریائے مرغاب عبور کیا۔ جس وقت وہ سرکائی کے نواح میں پہنچا تو اس کے ہرات آنے کی انھیں خبر ملی۔ وہ ایسے سراسیمہ ہو گئے کہ کچھ نہ کر سکے، نہ تو آدمیوں کو جمع کیا جا سکا اور نا ہی لشکر کی ترتیب ہو سکی۔ جو شخص جہاں تھا وہ وہاں سے لڑنے کے لئے چل پڑا۔ ذوالنون لوگوں کی باتوں پر ایسا غرّایا ہوا تھا کہ اپنے سوڈیڑھ سو آدمیوں کے ساتھ چالیس پچاس ہزار ازبک فوج کے مقابلے کے لئے قرار باط پر آن پہنچا۔ فوج کے کثیر آدمیوں نے وہاں پہنچتے ہی اس کے آدمیوں کو گرفتار کر لیا اور اپنے ساتھ لے کر روانہ ہو گئے، انھوں نے ذوالنون کو بھی قید کر لیا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

ذوالنون کی ماں، بہن، حرم کی عورتیں اور خزانے کی تجوریاں قلعہ اختیار الدین میں تھیں جو آلہ قورغان کے نام سے مشہور ہے۔ مرزا لوگ رات کو شہر میں داخل ہوئے انھوں نے آدھی رات کے وقت گھوڑوں کو دم لینے کے لئے چھوڑ دیا اور خود بھی آرام کرنے کے لئے سو گئے۔ وقت سحر وہ وہاں سے بھاگ نکلے۔ قلعے کو مستحکم کرنے کا خیال بھی ان کے ذہن میں نہیں آیا۔

اس مدّت کے دوران وہ والدہ، بہن اور اہل و عیال کو بھی باہر نہ لے جا سکے اور انھیں ازبکوں کی قید میں چھوڑ کر خود فرار ہو گئے۔

پایندہ سلطان بیگم و خدیجہ بیگم، سلطان حسین مرزا و مظفر مرزا کی محرمات ان کے خورد سال بچوں کے ہمراہ آلہ قورغان میں مقیم تھیں۔ ان کے علاوہ سلاطین کے خزانے نیز کارخانے بھی اسی قلعے میں تھے۔ اس قلعے کو خاطر خواہ طور پر مستحکم نہیں کیا گیا تھا اور جو جوان اس قلعے کی حفاظت کے لئے متعیّن کئے گئے تھے وہ بھی وہاں نہیں پہنچے تھے۔ مزید بیگ کا چھوٹا بھائی عاشق محمد ارغون (ورق ۱۸۱) پیدل ہی لشکر سے فرار ہو کر وہاں پہنچ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی وہ قلعے میں داخل ہو گیا۔ مزید برآں، میر عمر بیگ کا لڑکا علی خان، شیخ عبداللہ بکاول، مرزا بیگ کیخسروی اور میرک گور دیوان بھی قلعے میں ہی تھے۔

شیبانی خاں کی آمد کے دو تین بعد شیخ الاسلام اور اکابر شہر عہد و پیمان کر کے فصیل و قلعے کی کنجیاں لے کر باہر چلے گئے، قلعے پر عاشق محمد کا سولہ سترہ دن تک قبضہ رہا۔ باہر سے بازار اسپ کی جانب قلعے میں نقب لگائی گئی اور آگ لگا کر ایک برج کو اڑا دیا گیا۔ اس اقدام سے اہل قلعہ حواس باختہ ہو گئے اور قلعے کو اپنے قبضے میں نہ رکھ سکے۔ اسی لئے انھوں نے اسے دشمن کے حوالے کر دیا۔

ہرات پر قبضہ کرنے کے بعد شیبانی خاں نے یہاں کے حکمرانوں کے اہل و عیال کے ساتھ بہت برا سلوک کیا، نہ صرف ان کے ساتھ بلکہ تمام شہری و دیہاتی لوگوں کے ساتھ بھی اس کا رویہ بہت برا رہا۔ اس

ناعاقبت اندیش شخص نے اس پنج روزہ فانی دنیا کی خاطر تمام بدنامی اپنے سر مول لی۔ ہرات میں شیبانی خاں سے جو حرکات سرزد ہوئیں اور جن افعال کا وہ مرتکب ہوا ان میں سے ایک یہ تھا کہ اس ناپائدار دنیا کی کثافت و آلائش جمع کرنے کے لئے اس نے خدیجہ بیگم کو بد دیانت شاہ منصور بخشی کے حوالے کیا جس نے مختلف طریقوں سے اس کو اذیت پہنچائی اس کے ساتھ ہی اس نے شیخ پوران جیسے ولی صفت انسان کو مغل عبدالوہاب کے ذریعے گرفتار کرایا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے ان کے ہر فرزند کو جداگانہ طور پر قید و بند کی مصیبت سے دوچار کیا۔ شعرا، فن کاروں اور اہل طبع لوگوں کو ملا بنائی کی تحویل میں دے دیا۔ خراسان کے ظریف شعرا میں سے ایک شاعر کا یہ قطعہ مشہور ہے۔

بجز عبداللہ گیر خر امروز — ندیدہ هیچ شاعر روی زررا
بنائی زر طمع دارد ز شاعر — مگر خواهد گرفتن گیر خررا

(آج عبداللہ گدھے کے علاوہ کسی شاعر نے زر کی شکل نہیں دیکھی۔ بنائی کی یہ تمنا ہے کہ اس کے ہاتھ زر لگے مگر اسے گدھے کے علاوہ کچھ بھی نہ ملے گا)

اس کے علاوہ خانزاد خانم مظفر مرزا کی حرم تھی، ابھی اس کی عدت بھی پوری نہ ہوئی تھی کہ اس پر (شیبانی) نے پر قبضہ کرنے کے فوراً بعد ہی اس سے نکاح کر لیا۔ قاضی اختیار و میر یوسف [5] کا شمار خراسان و ہرات کے مشہور علمائے دین میں ہوتا تھا وہ انھیں درس تفسیر دیا کرتا۔ ملا سلطان علی (مشہدی) [6] جیسے خوش نویس کے خط اور بہزاد [7] جیسے فنکار مصوّر کے نقش و نگار میں وہ اصلاح کیا کرتا تھا۔ ہر چند روز بعد وہ تک بندی بھی کر لیا کرتا تھا اور اپنے ان بے مزہ اشعار کو منبر پر پڑھواتا اور شہر کے چار راہوں پر آویزاں کراتا اور لوگوں سے اس کی داد چاہتا۔ (ملا بنائی نے یہ واقعہ بیان کیا [8] ہے کہ شیبانی خاں کی طبعیت نے جولانی دکھائی۔ اس نے ترکی زبان میں ایک شعر کہا اور اپنے ہاتھ سے اسے خط ثلث [9] میں لکھا۔ اس کے حاشیے و جدول پر گلکاری کی اور حکم دیا کہ اسے دروازہ ملک پر آویزاں کریں۔ اس نے ملا بنائی سے کہا کہ خاں کیا تو نے میرے شعر اور تحریر کو دیکھا۔ اس نے جواب دیا۔ جی ہاں میں نے دیکھا۔ اس نے اس پر پوچھا کہ اس کے علاوہ اس پر اور کیا ہونا چاہیئے۔ ملا نے جواب دیا کہ یہ تین شاعر جو پہلو میں بیٹھے ہیں ان کے لئے یہ نمونہ ہوں گے۔ اس پر خاں ہنس دیا)

قرات سے بھی کچھ حد تک واقف تھا لیکن بہت سے احمقانہ، گستاخانہ اور کافرانہ اقوال و افعال اس سے صادر ہوتے رہے۔

ہرات پر قبضہ کرنے کے دس پندرہ دن کے بعد شیبانی خاں کہدستان سے پل سالار کی جانب روانہ ہوا۔ اس کے پاس جتنے بھی لشکر تھے انھیں اس نے تیمور سلطان اور عبید سلطان کے ہمراہ کر کے انھیں ابوالحسن مرزا اور کپک مرزا پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا جو مشہد میں غافل بے خبر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے چاہا کلات [10] کو مستحکم کیا جائے۔ دوسری مرتبہ سنا گیا کہ وہ کسی دوسرے راستے سے شیبانی خاں پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں۔ اگر چہ ان کے یہ عجیب و غریب خیالات عمدہ تھے مگر کسی بھی کام کو انجام دینے کے لئے وہ کوئی متفقہ فیصلہ نہیں سکے۔ وہ اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھے رہے کہ تیمور سلطان اور عبید سلطان نے ان پر یلغار کر دی اور ان کے سر پر آن پہنچے۔ ابوالحسن مرزا جلد ہی مغلوب ہو گیا (ورق ۱۸۲) کپک مرزا نے اپنے چند آدمیوں کے ساتھ اپنے بھائی کے دشمن پر حملہ کیا لیکن وہ بھی مغلوب و پسپا ہوا۔ جب ان دونوں بھائیوں کو ان کے گھوڑوں سے اتار کر انھیں ایک ساتھ بٹھایا گیا تو وہ باہم بغل گیر ہوئے اور ایک دوسرے کے چہرے کو بوسہ دے کر وداع کیا۔ ابوالحسن مرزا کے رویّے سے بزدلی ظاہر ہوتی تھی مگر کپک مرزا پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔

جس وقت ان دونوں کے سر پل سالار پر بھیجے گئے تو ان ہی دنوں شاہ بیگ اور اس کے برادر خورد مقیم

۵۔ قاضی اختیار و میر یوسف۔ ان دونوں علماء کا ذکر سلطان حسین مرزا کے حالات میں ۹۱۱ھ میں گزر چکا ہے۔

۶۔ سلطان علی مشہدی، خطاط: نوٹ ۵۹ دیکھیں حالات ۹۱۱ھ

۷۔ استاد بہزاد، مصور: نوٹ ۳۱ دیکھیں حالات ۹۱۱ھ میں

۸۔ یہاں ترکی اور فارسی نسخوں میں اختلاف ہے۔ ترکی نسخے (حیدرآباد) میں ہے کہ وہ صبح اٹھا کرتا اور پانچ وقت کی نماز کبھی قضا نہ کرتا۔ فارسی نسخوں میں یہ جملہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ وہ فارسی نسخہ (برٹش لائبریری ۲۴۴۲۶) جس سے یہ ترجمہ کیا گیا ہے اس کے حاشیہ اضافہ بھی ہے جو قوسین کے درمیان درج ہے۔ یہ اضافہ موسوی علی خاں کاتب کی طرف سے معلوم ہوتا ہے

۹۔ خط ثلث۔ اس کی مثال مندرجہ ذیل ہے۔

بسم اللہ تیمناً بذکرہ القدیم

۱۰۔ کلات۔ مشہد کے شمال میں، نادر شاہ یہاں پیدا ہوا تھا۔

نے شیبانی خاں کے خوف سے کئی مرتبہ مجھے اپنے ایلچی اور عرض داشتیں بھیج کر یکجہتی اور خیر خواہی کا اظہار کیا۔ مقیم نے اپنی ایک عرض داشت میں صریح طور پر مجھے آنے کی دعوت دی۔ اس وقت جب کہ ازبکوں کا پوری ولایت پر مکمل قبضہ ہوگیا ہو تو کھڑے ہوکر تماشا دیکھتے رہنا ہمارے لئے مناسب نہ تھا۔ جب اتنی مرتبہ ایلچی اور عرض داشتیں بھیج کر ہمیں آنے کی دعوت دی گئی ہو تو میرا یہ شک و تردد بہت حد تک کم ہوگیا کہ وہ دونوں میری خدمت میں حاضر ہوں گے۔ چنانچہ تمام امرا اور اہل الرائے سے مشورہ کیا گیا تو اس بات پر فیصلہ ہوا کہ لشکر کو روانہ کیا جائے اور ارغون امرا کو ساتھ لے کر خراسان کی جانب روانہ ہوں۔ اور وہاں پہنچ کر جو بھی مصلحت ہو اسے مدنظر رکھتے ہوئے ان کی صوابدید کے مطابق کوئی فیصلہ کیا جائے۔

چنانچہ اس عزم وارادے کے ساتھ ہم نے قندہار کی جانب رخ کیا۔

حبیبہ سلطان بیگم کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ انھیں میں بھابھی کہا کرتا تھا۔ وہ اپنی لڑکی معصوم سلطان بیگم کو اس قول وقرار کے مطابق جو ہرات میں کیا گیا تھا اپنے ساتھ لے کر آئیں غزنی میں ہماری ان سے ملاقات ہوئی۔ خسرو کوکلداش، سلطان قلی چناق اور گدائی بلال ہرات سے فرار ہوکر ابن حسین مرزا کے پاس چلے گئے تھے۔ وہاں سے وہ ابوالمحسن کے پاس پہنچ گئے۔ وہ وہاں بھی نہ رہ سکے۔ اس لئے انھوں نے اب ہماری طرف رُخ کیا اور ان کے ساتھ وہ بھی آگئے۔

جس وقت ہم کلات [11] پہنچے ہیں تو کچھ ہندستانی تاجر جو تجارت کرنے کے لئے وہاں آئے ہوئے تھے وہاں سے فرار نہ ہوسکے۔ لشکر کے لوگ اچانک ان کے سر پر پہنچے۔ ان میں سے اکثر کا اس امر پر اتفاق تھا کہ جن علاقوں میں شورش وبغاوت بپا ہو اس وقت کوئی گروہ ہو اس کو تاخت وتاراج کر دینا چاہئے۔ میں ان کی اس رائے سے متفق نہ تھا میں نے کہا کہ اس میں تاجروں کا کیا قصور ہے۔ خداوند تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے ہمیں اس جزوی فائدے سے گریز کرنا چاہئے۔ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ ہمیں کسی دن کلی منفعت سے بہرہ مند کرے گا۔ چند روز پہلے ہی کی تو بات ہے کہ جس وقت ہم غلجی قبیلے کے لوگوں پر زور آزمائی کرنے کے لئے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوکر جا رہے تھے تو ان وقت مہمند قبیلے کا لشکر اپنی بھیڑوں، ساز وسامان اور اہل وعیال سے ایک فرسنگ دور تھا۔ تم میں سے اکثر لوگ ان پر حملہ کرنے کے لئے سنجیدہ تھے مگر میں تم لوگوں سے اس معاملے میں متفق نہ تھا، لیکن اس کے اگلے ہی دن صبح کے وقت غلزئی کی باغیانہ حرکات کے باعث اللہ تعالیٰ نے ہمارے لشکر کے لوگوں کو اس قدر مال عطا کیا کہ اس سے قبل کسی بھی یلغار میں اس قدر مال ہاتھ نہیں لگا۔ کلات آرام کرنے کے لئے قیام پذیر ہوئے۔ ان تاجروں سے ہم نے پیشکش کے طور پر کوئی تحفے لئے۔

کابل پر قبضہ کے بعد خاں مرزا کو خراسان کی جانب جانے کی اجازت دے دی تھی۔ (ورق ۱۸۳)

جس وقت میں خراسان سے واپس آ رہا تھا تو اس وقت عبدالرزاق مرزا وہیں رہ گیا تھا۔ جب میں نے کلات کو عبور کرلیا تو یہ دونوں مرزا قندہار سے فرار ہوکر میرے پاس آئے۔ بہار مرزا کا پوتا، جہانگیر مرزا کا بیٹا پیر محمد مرزا بھی اپنی والدہ کے ہمراہ میری خدمت میں حاضر ہوا۔

شاہ بیگ اور مقیم کو اس مضمون کے خط بھیجے گئے کہ آپ لوگوں کے کہنے پر ہم یہاں آگئے ہیں۔ ازبک جیسے بے گانہ باغیوں نے خراسان پر قبضہ کرلیا ہے، آپ بھی یہاں آئیں تا کہ اس امر پر غور کیا جائے کہ صلاح دوست کس امر میں ہے اور یہ اقدام آپ کی متفقہ رائے اور صواب دید کے مطابق انجام دیا جائے۔ انھوں نے ہماری تحریر اور دعوت کو قبول نہ کیا بلکہ ہمارے خطوط کا جواب گنواروں کی طرح تلخ لہجے میں دیا۔ شاہ بیگ کے گنوار پن کی ایک دلیل تو یہی ہے کہ وہ خط جو اس نے مجھے لکھ کر بھیجا تھا اس کی پشت پر اس نے جو اپنی مہر ثبت کی تھی وہ اس جگہ تھی جہاں کوئی امیر کسی دوسرے امیر کو خط لکھتے وقت بلکہ ایک اعلیٰ مرتبے کا امیر خود سے ادنیٰ مرتبہ

۱۱۔ کلات۔ کلات غلزئی۔ یہ قندہار کے شمال میں ہے۔

کے امیر کو خط لکھتے وقت ثبت کرتا ہے۔ اگر اس قسم کا گنوار پن نہ کرتے اور اس قسم کا تلخ جواب نہ دیتے تو نوبت یہاں تک نہ پہنچی۔

ستیزه بجایے رساند سخن که ویران کند خان و مان کهن

(جھگڑا بات کو یہاں تک پہنچا دیتا ہے کہ قدیم خاندان تک اس سے ویران ہو جاتے ہیں۔)

یہ ان کے جھگڑے اور گنوار پن کا ہی نتیجہ تھا کہ انھوں نے تیس چالیس سال سے بسے گھر اور قوم و قبیلے کے لوگوں کو تباہ و برباد کر دیا۔

شہر صفا کے نواح میں ایک روز لشکر گاہ کے درمیان ایک افواہ گشت کر گئی، جس کے باعث تمام سپاہ مسلح ہو کر گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ میں اس وقت غسل و طہارت میں مشغول تھا۔ امرا مضطرب و پریشان تھے۔ غسل سے فارغ ہو کر میں گھوڑے پر سوار ہوا چونکہ یہ شور و غوغا بے بنیاد تھا اسی لئے یہ فتنہ چند لمحہ بعد ہی خاموش ہو گیا۔

یہاں سے کوچ پر کوچ کر کے ہم گذر نامی مقام پر پہنچ گئے اور قیام پذیر ہوئے۔ یہاں بھی ہم نے ہر چند چاہا کہ ارغون قبیلے کے لوگوں سے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا جائے لیکن انھوں نے ہماری پیشکش کی جانب کوئی توجہ نہ دی بلکہ وہ اسی طرح سرکشی و نافرمانی پر قائم رہے۔ میرے خیر خواہ جو اس اطراف و جوانب سے واقف تھے انھوں نے عرض کی کہ کوہستانی دریاؤں کے ان سرچشموں کی جن کا رخ قندھار کی جانب ہے ناکہ بندی کر دی جائے۔ چنانچہ جب اس بات پر متفقہ فیصلہ ہو گیا تو اگلے دن صبح اسلحہ پوش ہوئے اور برانغار و جوانغار دستوں کو ترتیب دے کر خلیشک کی جانب کوچ کیا۔

جنگ قندھار

شاہ بیگ اور مقیم کوہ قندھار کی نوک پر جہاں بعد میں میں نے عمارت تعمیر کرائی ہے شامیانہ لگائے بیٹھے تھے۔ مقیم کے لوگوں نے عجلت کی اور زیادہ قریب آ گئے۔ طوفان ارغون جو شہر صفا کے نواح سے فرار ہو کر ہمارے پاس آ گیا تھا تن تنہا ارغون قبیلے کی صف بندی تک پہنچ گیا۔ عشق اللہ نامی شخص اپنے سات آٹھ آدمیوں کی جمعیت کے ساتھ ارغون قبیلے سے علیحدہ ہو کر تیزی کے ساتھ آگے بڑھا۔ اُدھر طوفان بالکل اکیلا تھا، دونوں کا مقابلہ ہوا، اور دونوں نے ایک دوسرے پر تلوار کے وار کئے۔ اس نے عشق اللہ کو گھوڑے سے گرا لیا اور سر کاٹ لیا۔ جس وقت ہم سنگ لخشک نامی مقام سے گزر رہے تھے، وہ اسے وہاں لے کر پہنچا جسے ہم نے نیک فال سمجھا۔ کیوں کہ یہ جگہ بیرون شہر، جنگل میں واقع تھی اسی لئے اس جگہ جنگ کرنے میں مصلحت نظر نہ آئی۔ دامن کوہ کے نیچے سے گزر کر سبزہ زار میں اس دریا کے کنارے جس کا رخ قندھار کی جانب ہے، ہم نے منزل گاہ متعین کی اور وہاں (ورق ۱۸۴) قیام پذیر ہوئے۔ اثنا میں شیر قلی قراول بھی پہنچ گیا اور اس نے یہ اطلاع دی کہ دشمن مکمل طور پر مسلّح ہو کر سر پر آن پہنچا ہے۔

کلات سے گزر جانے کے بعد لشکر کے لوگ بھوک اور تھکان سے نڈھال تھے۔ اسی لئے جب ہم خلیشک نامی مقام پر پہنچ گئے تو لوگ اس جگہ کے اوپر اور نیچے اپنی گائیں، بھیڑیں اور ساز و سامان جمع کرنے کے لئے منتشر ہو گئے۔ ہم لشکر کے لوگوں کے یکجا ہونے کا انتظار کئے بغیر ہی اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر حملہ آور ہوئے۔ اگرچہ ہمارے لشکر میں کم و بیش دو ہزار سپاہی شامل تھے لیکن جیسا کہ اوپر بیان چکا ہے، جس وقت ہم یہاں قیام پذیر ہوئے تو لوگ یہاں کے پست و بلند مقامات کی جانب جا چکے تھے اور وقت جنگ وہ ہمارے ہمراہ نہیں ہو سکتے تھے۔ جب جنگ کی نوبت آئی تو اس وقت کم و بیش ہزار آدمی وہاں حاضر ہوں گے۔

لشکر کی نئی صف بندی:۔ اگرچہ ہمارے آدمیوں کی تعداد کم تھی لیکن بہت ہی چاق و چوبند منظم و مستحکم، جن کی میں نے بہت عمدہ طور پر تربیت کی تھی۔ اس سے قبل میں نے کبھی اپنے لشکر کو اس طرح مرتب و منظم نہیں کیا تھا۔ جو

خاص میری نگرانی میں تھا اس میں سے میں نے ان جوانوں کو علیحدہ کیا جن پر وقت جنگ اعتماد کیا جاسکتا تھا۔ میں نے دس دس اور پچاس پچاس کے دستوں کا سردار مقرر کیا۔ ان میں سے یہی دس اور پچاس صف جنگ کے دائیں جانب تھے اور اتنے ہی بائیں جانب انھیں یہ بھی بتادیا گیا کہ میدان کارزار میں وہ کس جگہ متعین رہیں تاکہ پورے میدان کارزار کا نقشہ ان کی نظر میں رہے۔ برانغار و جوانغار، دائیں اور بائیں جانب کے دستے۔ دائیں اور بائیں جانب کے پرے ترتیب دینے کے بعد انھیں گھوڑوں پر سوار ہونے کا حکم دیا گیا اس وقت لشکر کے سپاہیوں نے فرماندار کے[12] حکم کے بغیر خود ہی اپنی جگہ سے سامنے کی طرف پیشقدمی کی۔

اگرچہ برانغار (دائیں صف)، اونگ قول (دست راست)، اونگ یان (دائیں جانب) اور اونگ (دایاں) ہم معنی لفظ ہیں۔ لیکن مختلف معنی دینے کے لئے میں نے ان کے مفہوم میں تبدیلی کی یہ معلوم ہی ہے کہ میمنہ (دائیں بازو کا لشکر) میسرہ (بائیں بازو کا لشکر) کو برانغار (دائیں جانب کی فوج) و جوانغار (بائیں جانب کی فوج) کہتے ہیں، یسال قلب (درمیانی فوج کا پرہ) کو غول (فوج کا درمیانی حصہ) کہتے ہیں۔ اور اس کا اطلاق میمنہ میسرہ پر نہیں ہوتا۔ اس بنا پر یہاں لشکر کے دائیں اور بائیں پروں کو برانغار و جوانغار کہا گیا ہے۔ غول (قلب، فوج کا درمیانی پرہ) تو ایک جداگانہ لشکر ہوتا ہے۔ یمین و یسار کو جداگانہ حیثیت دینے کی خاطر یہاں اونگ قول (دایاں ہاتھ) اور سول (بایاں ہاتھ) لکھا گیا ہے۔ غول (قلب) مخصوص و منفرد جانباز جوانوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان کے دائیں اور بائیں پروں کے نام میں نے اونگ (دایاں پرہ) اور سول (بایاں پرہ) رکھے۔

برانغار میں مرزا خاں شیرم طغائی، یارک طغائی نیز اس کے بھائی، چکمہ مغول و ایوب بیگ، محمد بیگ، ابراہیم بیگ، علی سیّد مغل اور اس کے مغل ساتھی، علی چہرہ اور خدابخش نیز اس کے بھائی شامل تھے۔

جوانغار، عبدالرزاق مرزا، قاسم بیگ، تنگری بردی، قنبر علی، احمد ایلچی بوغہ، غوری برلاس، سیّد حسین اکبر اور میر شاہ قوچین پر مشتمل تھا۔

ایراول (پیشرو دستہ) میں ناصر مرزا، سیّد قاسم، ایشیک آقا، محب علی قورچی، پاپا اوغلی، اللہ ویرن ترکمان، شیر قلی قراول، مغل نیز اس کے بھائی، محمد علی شامل تھے۔

قلب میں میری دائیں جانب قاسم کوکلداش، خسرو کوکلداش، سلطان محمد دولدائی، شاہ محمود پرادنچی، قل بایزید اور کمال پردانچی۔ میری بائیں جانب خواجہ محمد علی، دوست ناصر، میرم ناصر، بابا شیرزاد (ورق ۱۸۵) جان علی، ولی خرانچی، قتلق قدم قراول، مقصود سوچی اور بابا شیخ۔

غول میں میرے تمام قرابت دار و رشتہ دار تھے۔ بڑے امرا میں سے اس وقت وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ مذکورہ بالا لوگوں میں سے کوئی بھی مرتبہ امارت تک نہیں پہنچا تھا۔

وہ گروہ جس کے افراد کا نام منفرد جوانوں سے پیشتر درج کیا گیا تھا اس میں شیر بیگ، جانم قوربیگی، کپک قلی بابا، ابوالحسن قورچی نیز اس کے مغل ہمراہی روشن علی، سیّد درویش، علی سیّد، خوش کیلدی، چلمہ دوست کیلدی، چلمہ باغی داماچی مندی اور ترکمان ساتھیوں میں منصور، رستم علی، نیز اس کے بھائی شاہ نظر و سیوندوک شامل تھے۔

دشمن کے لوگ دو ٹکڑوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک ٹکڑی کا فرماندار شاہ شجاع ارغون عرف شاہ بیگ تھا، جس کا ذکر یہاں شاہ بیگ کے نام سے کیا جائے گا۔ دوسری ٹکڑی اس کے برادر خورد مقیم کے زیر فرمان تھی۔ اندازہ لگایا گیا تھا کہ مقیم کا لشکر چھ سات ہزار سپاہیوں پر مشتمل ہے اور اس میں کوئی کلام نہ تھا اس میں سے چار پانچ ہزار سپاہی یقیناً مسلح ہیں۔

۱۲۔ فرماندار۔ یہ ایک فوجی عہدہ ہے۔ جو شخص سالار اعلیٰ کا حکم دستوں کے سردار تک لے جائے۔

غول اور برانغار پروں کا مقابلہ ہوا۔ مقیم جوانغار کے روبرو ہوا۔ مقیم کا لشکر اس کے بڑے بھائی کے لشکر سے قدرے کم تھا۔ ہمارا جوانغار دستہ قاسم بیگ اور اس کے ساتھیوں کے زیر فرمان تھا۔ اس پر بہت زور کا حملہ ہوا جنگ کے وقت قاسم بیگ کے دو تین آدمی آئے جنہوں نے مدد کا مطالبہ کیا۔ چوں کہ ہمارے سامنے ہمارا دشمن بھی بہت طاقتور تھا اسی لئے ہم اپنے آدمیوں کو خود سے علیحدہ نہیں کر سکتے تھے۔ بلا تامل ہم نے دشمن کی جانب اپنا رخ کیا۔ دشمن کی جانب سے جیسے ہی تیر آنے شروع ہوئے اس نے ہمارے پیش قراول دستے کو پسپا کر کے غول تک پہنچا دیا۔ جس وقت ہم تیروں کو بوچھاڑ کرتے ہوئے آگے بڑھے تو دشمن نے بھی وار خالی نہ جانے دیا۔ اس نے بھی تیر کا جواب تیر سے ہی دیا اور مقابلہ کے لئے سینہ سپر ہو گیا۔ میرے سامنے کی طرف ایک شخص نے اپنے لوگوں کو بلانے کے لئے پکارا۔ اس نے گھوڑے سے اتر کر چاہا کہ تیر کو چلّہ پر چڑھائے کہ ہم بلا توقف آگے بڑھے۔ جیسے ہی ہم اس کے سر پر پہنچے تو وہ ہماری تاب نہ لا سکا اور فوراً ہی وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ وہ شخص جو گھوڑے سے اترا وہ خود شاہ بیگ تھا۔ جنگ کے دوران پیری بیگ نے اپنے چار پانچ بھائیوں کے ساتھ اپنی اپنی دستار کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور سرکشی سے روگرداں ہو کر وہ ہماری سپاہ میں شامل ہو گیا۔ (اس پیری بیگ کا شمار ان ترکمانوں میں ہوتا تھا جو اس وقت جب کہ شاہ اسمٰعیل نے بایندر کے سلاطین کو زیر کر لیا اور عراق پر قبضہ ہونے کے بعد عبدالباقی[13] و مراد بیگ بایندر و امرا کے ساتھ وہاں سے چلا آیا تھا)۔

ہمارا برانغار دستہ پہلے ہی دشمن پر غالب آچکا تھا۔ اب اس نے مزید پیشرفت کی۔ اس پرے نے جو پیش پیش تھا دشمن کو ایسا غوطہ دیا کہ پسپا کرتے کرتے اس جگہ تک پہنچا دیا جہاں میں نے اب باغ تعمیر کرایا ہے اور جوانغار دستہ بابا حسن ابدال سے بہت آگے اترتا چلا گیا یہاں تک کہ وہ بڑی ندی تک پہنچ گیا۔ یہی نہیں بلکہ وہاں جتنے بھی نالے تھے وہ ان سب کو عبور کر گیا۔ ہمارے جوانغار دستے کے روبرو مقیم اپنے وابستگان ولواحقین کے ساتھ موجود تھا۔ غنیم کے سپاہ کی تعداد کو مدّنظر رکھتے ہوئے جس کا سرغنہ مقیم خود تھا ہمارے جوانغار میں آدمی بہت کم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری سازگاری کی۔ وہ بڑی ندی جو قندھار کی طرف بہتی ہے اور اس کے دیہات کو سیراب کرتی ہے اور تین چار دیگر بڑی ندیاں ہمارے جوانغر دستے اور دشمن کے درمیان تھیں۔ اس نے گھاٹ پر قبضہ کر لیا اور اس کی ایسی ناکہ بندی کی کہ دشمن وہاں سے گزر نہیں سکتا تھا۔ اگرچہ ہمارے جوانغار دستے میں جو لوگ شامل تھے ان کی تعداد کم ہی تھی مگر اس کے باوجود انھوں نے بڑی ہی استقامت دپامردی دکھائی۔ (ورق ۱۸۶) ارغون قبیلے کی طرف سے حلواچی ترخان نے قنبر علی اور تینگری بردی کے ساتھ پانی میں خوب نبرد آزمائی کی۔ اتنے میں وہاں غوری برلاس بھی پہنچ گیا۔ بہرحال قنبر علی زخمی ہوا۔ قاسم نے پیشانی پر تیر کھایا اور غوری برلاس کی ابرو پر تیر اس طرح آکر لگا کہ اس کے گال سے نکل آیا۔

اس اثنا میں دشمن ہماری تاب نہ لا سکا اور فرار ہو گیا۔ ان پہاڑی ندیوں سے گزر کر ہم کوہ مرغان کی نوک کو بھی پار کر گئے۔ جس وقت تیجاق کی ندیوں سے گزر رہے تھے ہمیں خاکستری رنگ کے گھوڑے پر ایک سوار پہاڑ کے دامن پر نظر آیا وہ ادھر اُدھر اپنا گھوڑا دوڑا رہا تھا اور حیران و پریشان تھا کہ کدھر جائے بالآخر وہ ایک طرف روانہ ہو گیا۔ اپنے حلیے سے شاہ بیگ جیسا آدمی نظر آتا تھا۔ وہ غالباً شاہ بیگ ہی تھا۔

دشمن کو زیر کرنے کے فوراً بعد ہمارے لشکر کے تمام آدمی اس کا تعاقب کرنے اور اس کے سپاہیوں کو گھوڑوں سے اتارنے کے لئے چلے گئے تھے۔ اس وقت میرے ساتھ بس گنتی کے گیارہ آدمی ہی رہ گئے تھے۔ جن میں سے ایک عبداللہ کتابدار تھا۔ مقیم اب بھی ڈٹا ہوا تھا اور نبرد آزمائی کر رہا تھا۔ میں نے اس امر کی جانب توجہ دی ہی نہیں کہ میرے آدمیوں کی تعداد کم ہے۔ بس خدائے تعالیٰ پر توکل کر کے نقارہ بجاتے ہوئے ہم غنیم کی طرف روانہ ہوئے۔

۱۳۔ عبدالباقی مرزا۔ دیکھیں امرا سلطان حسین مرزا (ورق ۱۳۵ حالات ۹۱۱ھ)

کوپ وآزغہ تینکری دور بیر کوچی   بودر کھدایو قتور کیشی نینک کوچی
بہ کمّ وبیش دمندہ خدای است   دریں درگاہ کسی رازوری نیست [14]

(کم وزیادہ عطا کرنا خدا کے اختیار میں ہے۔اس بارگاہ پر کسی کا زور نہیں)

کم من فیئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللّٰہ ہ

(ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے) (البقرہ آیہ۲۴۹)

نقارے کی آواز سن کر اور ہمیں اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر وہ ایسے حواس باختہ ہوئے کہ قرار وپامردی کے طور وطریق بھول کر راہ فرار اختیار کی۔خداوند تعالیٰ نے سازگاری کی۔دشمن کو بھگا دینے کے بعد ہم قندھار کی جانب روانہ ہوئے۔اور یہاں باغ فرخ زاد میں قیام پذیر ہوئے۔جس کا اب کوئی نام ونشان باقی نہیں۔

شاہ بیگ اور مقیم فرار ہوگئے وہ قلعہ قندہار میں داخل نہیں ہوسکتے تھے۔شاہ بیگ شال اور مستونگ کی طرف نکل گیا اور مقیم نے رمینداور کی راہ اختیار کی۔انھوں نے کوئی ایسا آدمی نہیں چھوڑا تھا جو قلعے کو مستحکم کرسکے۔قلی بیگ ارغون کے بھائیوں میں سے احمد علی ترخان اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ جن کے خلوص مجھ پر آشکارا ہو چکے تھے قلعے میں موجود تھا۔قلعے کو میرے حوالے کردینے کی بات درمیان میں آئی تو اس نے اپنے بھائیوں کی جان کی امان چاہتی اور مجھ سے درخواست کی کہ انھیں لطف وعنایت میں شامل رکھا جائے پھر انھوں نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔یہ دیکھتے ہوئے کہ وہاں لوگوں میں فسادی موجود ہیں انھوں نے دوسرے دروازے نہیں کھولے ہم اسی دروازے سے قلعے میں داخل ہوئے۔شیرم بیگ اور یارک بیگ کو دروازے پر مقرر کیا گیا میں اپنے چند قرابت داروں کے ساتھ قلعے میں داخل ہوا اور فسادیوں میں سے ایک دو کو قتل کرنے کا حکم دیا۔

سب سے پہلے ہم مقیم کے خزانے پر پہنچے، جو قلعہ سنگین میں تھا۔عبدالرزاق مرزا مجھ سے پہلے ہی اس جگہ پہنچ چکا تھا۔اس خزانے میں سے عبدالرزاق مرزا کو تحفے دیئے گئے اس کے بعد دوست ناصر بیگ، قل بایزید بکاول اور بخشیوں میں سے محمد بخشی کو میں نے وہاں متعین کیا۔یہاں سے گزر کر ہم حصار قلعہ (گڑھی)، میں داخل ہوئے۔یہاں شاہ بیگ کے خزانے پر خواجہ محمد علی، شاہ محمود اور تغائی شاہ بخشی (جو کہ بخشیوں میں سے تھا) کو مقرر کیا۔میریم ناصر اور مقصود سوچی کو ذوالنون کے دیوان کے گھر بھیجا اور اسکو ناصر مرزا کی تحویل میں دیا۔شیخ ابوسعید ترخاں کو مرزا خاں کے حوالے کیا۔۔۔۔۔[15] کو عبدالرزاق کے سپرد کیا۔

ان ولایات میں چاندی کے سکّے اس قدر مقدار میں کبھی دیکھے نہیں گئے تھے بلکہ میں نے تو یہ سنا کہ کسی نے اس قدر دیکھے ہی نہیں۔اس رات ہم حصار (گڑھی) میں مقیم رہے۔شاہ بیگ کے غلام سنبل کو گرفتار کر کے میرے سامنے پیش کیا گیا۔اگرچہ وہ شاہ بیگ کا ندیم تھا مگر اس کی نظر میں اس کی زیادہ وقت نہیں تھی اور اسے بہت زیادہ مراعات بھی حاصل نہ تھیں۔میں نے اسے اپنے ایک آدمی کی نگرانی میں دے دیا مگر چوں کہ اس کی نگرانی سختی کے ساتھ نہیں کی گئی اسی لئے اسے فرار ہونے کا موقعہ مل گیا۔اگلے روز صبح ہم باغ فرخ زاد میں فروکش ہوئے کیوں کہ وہیں ہمارے خیمے نصب تھے۔

ولایت قندھار ناصر مرزا کی تحویل میں دے دی گئی۔خزانوں کا اندراج کیا گیا۔جس وقت اسے حصار (گڑھی) سے باہر لایا گیا تو اونٹوں کی قطار جس پر چاندی کے سکّے لدے ہوئے تھے اسے ناصر مرزا نے روک لیا۔اگرچہ اس کا میں نے اس سے مطالبہ نہیں کیا میں نے وہ پور قطار اسے ہی عطا کردی۔

اس جگہ سے کوچ کر کے ہم نے اپنے خیمے قوش خانہ نامی سبزہ زار میں نصب کئے۔لشکر کو کوچ کرنے کا حکم دے کر میں وہاں سیر وتفریح کرتا رہا اور دیر میں لشکر گاہ پہنچا۔اب یہ پہلی سی لشکر گاہ نہیں تھی اسی لئے میں اسے

۱۴۔دونوں فارسی نسخوں میں یہ اضافی شعر بھی رقم ہے۔

۱۵۔یہ ایک نام کسی نسخے میں نہیں ہے۔

پہچان نہ سکا۔ تپچاق گھوڑے نر و مادہ، قطار در قطار اونٹ، ریشمین زین پوش خچر، خرجین سے لدی ہوئی گاڑیاں، مخمل کمخواب/زربفت کے بیش قیمت کپڑوں کے شامیانے اور خیمے اور ہر کارگاہ میں مال سے پر صندوقوں کے انبار دراصل ان دونوں بھائیوں کے مال کو علیحدہ علیحدہ خزانوں میں محفوظ کیا گیا تھا۔ ہر خزانے میں صندوق کے صندوق اور بستے ہی بستے، بورے ہی بورے اور تھال ہی تھال چاندی کے ٹنکوں [۱۶] کے غرض ہر شخص کے خیمے میں ہر قسم و جنس کا مال غنیمت کثیر تعداد میں موجود تھا۔ اگر چہ اس مال میں بھیڑیں بھی وافر تعداد میں موجود تھیں مگر کسی نے ان کی جانب توجہ نہ کی۔

کلات میں متعین دستہ جس کے افراد مقیم کے ملازم تھے اور ان پر قوچ ارغون اور تاج الدین محمود کو سردار مقرر کیا گیا تھا ان سب کو مقیم کے مال و متاع کے ساتھ میں نے قاسم بیگ کو عطا کر دیا۔ وہ (قاسم بیگ) چوں کہ صاحب فہم و فراست شخص تھا اسی لئے اس نے اس امر میں صلاح نہ دیکھی کہ ہم زیادہ عرصہ قندہار کے نواح میں قیام پذیر رہیں۔ اس نے بار بار کہہ کر اور انجام بد سے باخبر کرتے ہوئے بالآخر ہمیں کوچ کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہ بات پہلے ہی بیان کی جا چکی ہے کہ قندہار ناصر مرزا کو عطا کر دیا گیا تھا۔ اسے روانگی کی اجازت دے کر ہم نے بھی کابل کا رُخ کیا۔

کابل روانگی

قندہار کے نواح میں ہمیں موقع نہ مل سکا کہ خزانے کو آپس میں تقسیم کر لیں۔ قراباغ نامی مقام پر قیام پذیر ہو کر ہم نے خزانے کو تقسیم کیا۔ سکّے چوں کہ اتنے زیادہ تھے کہ ان کا شمار کرنا دشوار تھا اس لئے انھیں ترازو سے تولا گیا۔ امرا، سردار، ملازمین اور سپاہی بورے کے بورے اور تھال کے تھال چاندی کے سکّے اپنی تنخواہ کے عوض نیز اپنے زیر دست لوگوں کے اخراجات کے لئے لے گئے۔ کثیر مال غنیمت کے ساتھ ہم باعزت و صد احترام کابل میں داخل ہوئے۔

معصومہ سلطان سے نکاح

سلطان احمد مرزا کی بیٹی معصومہ سلطان کو کابل آنے کی دعوت دی گئی۔ اور جب وہ وہاں آ گئیں تو میں نے ان کے ساتھ عقد کر لیا۔

اس واقعے کے چھ سات روز بعد ناصر مرزا کے ملازمین نے شیبانی خاں کی آمد اور قلعہ قندھار کا محاصرہ کرنے کی اطلاع دی۔ اس سے قبل یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ مقیم فرار ہو کر زمینداور کی طرف چلا گیا تھا۔ جہاں اس نے شیبانی خاں سے ملاقات کی۔ (ورق ۱۸۸) دوسری طرف شاہ بیگ نے بھی متواتر اپنے قاصد اس کے پاس روانہ کئے۔ ان دونوں کے ورغلانے پر اس نے ہرات سے کوہستانی راہ کے ذریعے قندھار پر یورش کر دی۔ کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ میں وہاں مقیم ہوں، ان ہی امور کو مدنظر رکھتے ہوئے قاسم بیگ نے اپنی فہم و فراست کے باعث عاقبت اندیشی کو بروئے کار لاتے ہوئے ہمیں کوچ کرنے پر مجبور کیا تھا۔

هر چه در آئینه جوان بیند   پیر در خشت پخته آن بیند

(جس چیز کو جوان آئینے میں دیکھتا ہے وہی چیز عمر رسیدہ آدمی کو پختہ اینٹ میں نظر آ جاتی ہے)

شیبانی خاں نے قندھار پہنچ کر ناصر مرزا کا محاصرہ کر لیا۔

اس کی آمد کی خبر ملتے ہی امرا کو طلب کر کے ان سے مشورہ کیا گیا اور ان کے سامنے یہ باتیں رکھی گئیں کہ ازبک اور شیبانی خاں جیسے بے گانے اور پرانے دشمنوں نے ان ولایات پر جو آل تیمور بیگ کے دست اختیار میں تھیں قبضہ کر لیا ہے۔ وہ ترک اور چغتائی قبائل کے لوگ جو کسی گوشہ و کنار میں رہ گئے تھے ان میں سے بعض برضا و رغبت کچھ بادل نخواستہ ازبکوں کے ساتھ ہو گئے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک میں ہی تھا جو کابل میں

۱۶۔ ٹنکہ یا تنگہ ترکی لفظ ہے۔ یہ تنگ سے نکلا ہے جس کے معنی سفید کے ہیں۔ سلطان علاؤالدین خلجی کے زمانے میں ایک تنکہ ایک تولہ چاندی کا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ تانبے کے سکّے بھی ہوتے تھے۔ شیر شاہ سوری نے تنکہ کا نام بدل کر روپیہ رکھا۔ (ارسکن تاریخ بابر ص ۵۴۳)

بچارہا۔ دشمن بہت طاقت ور ہے اور ہم بہت کمزور وزبوں۔ نا تو مصلحت ہے اور نا ہی عقلمندی کہ اس قدر عظیم طاقت وقوت کے روبرو رہیں۔ ہمیں سر چھپانے کے لئے غور فکر کرنا ہی ہے۔ اس وقت ہمیں جس قدر فرصت ومہلت ہے اس کے پیش نظر مصلحت یہی ہے کہ اپنے قوی دشمن سے دور دور رہتے ہوئے جدائی اختیار کر لینے میں عافیت ہے۔ اس مقصد کی برآری کے لئے ہمیں یا تو بدخشاں کی جانب یا ہندستان کی طرف رخ کر لینا چاہئے۔ اوران دو جگہوں میں سے کسی ایک طرف جانے کے لئے پختہ ارادہ کر لینا چاہئے۔

قاسم بیگ وشیرم بیگ اوران کے پیروکاروں کی صلاح یہ تھی کہ بدخشاں کی جانب رخ کیا جائے۔ ان دنوں اہالی بدخشاں کے ایک گروہ میں مبارک شاہ اور زبیر کا شمار سر برآوردہ اشخاص میں ہوتا تھا۔ انھوں نے بھی ازبکوں کے ساتھ ساز باز نہ کی تھی۔ میں نے، میرے بعض قربت داروں اور امرائے خاندان نے اس بات کو ترجیح دی کہ ہندستان کی جانب رخ کیا جائے۔ اسی لئے ہم لمغان کی جانب روانہ ہوئے۔

ہندستان کا عزم

فتح قندھار کے بغیر سرزمین کلات اور ولایت ترنوک عبدالرزاق مرزا کو عطا کر دی گئی تھیں اور اسے کلات میں متعین کر دیا گیا تھا۔ لیکن جب ازبکوں نے قندھار کا محاصرہ کر لیا تو وہ وہاں نہ رہ سکا۔ اس جگہ کو ترک کر کے وہ کابل پہنچا جب کہ ہم خود ہی اس شہر سے کوچ کر رہے تھے۔ اسے کابل میں متعین کر دیا گیا۔

بدخشاں میں چوں کہ کسی شاہ یا شہزادے کا تسلط وغلبہ برقرار نہیں تھا اسی لئے خاں مرزا نے اس مناسبت سے کہ وہ شاہ بیگم کا وطن ہے اپنی صوابدید پر بدخشاں جانا پسند کیا۔ خاں مرز کو اس طرف جانے کی اجازت دے دی گئی۔ شاہ بیگم بھی اسی کے ہمراہ روانہ ہو گئیں[17] میری خالہ مہر نگار خانم نے بھی بدخشاں جانے کا خیال ظاہر کیا اگر چہ ان کے لئے مناسب تو یہی تھا کہ وہ میرے ساتھ رہتیں کیوں کہ بالآخر میں اُن ہی کا بھانجہ تھا۔ انھیں ہر چند باز رکھنے کی کوشش کی گئی مگر وہ نہ مانیں اور وہ بھی بدخشاں کی طرف رخصت ہوئیں۔

ماہ جمادی الاوّل میں کابل سے ہندستان کی جانب رُخ کرنے کا عزم کیا گیا خورد کابل سے روانہ ہو کر براہ سرخ رباط ہم قوروق سای نامی مقام پر قیام پذیر ہوئے اور وہاں ہم نے دامن کوہ کو عبور کر لیا۔

افغان جو کابل اور لمغان کے درمیان آباد ہیں (ورق ۱۹۸) زمانۂ امن میں بھی راہزن وایذا رسانی سے باز نہیں آتے اور خدا سے چاہتے ہیں کہ انھیں اس قسم کے مواقع ملیں مگر یہ مواقع ان کے ہاتھ نہیں آتے۔ انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ میں کابل کو ترک کر کے ہندستان جا رہا ہوں تو ان کی یہ شر پسندی دس گناہ ہو گئی یہی نہیں بلکہ ان کے نیک خصلت لوگ بھی آزار پہنچانے پر اتر آئے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ جس دن صبح کے وقت ہم نے جگد الیک سے کوچ کیا تو افغان قبائل جو لمغان اور اس کے درمیان آباد تھے جیسے خضر خیل، شموخیل، خرلچی، خوگیانی[18] وغیرہ نے درہ جگد الیک کی ناکہ بندی کے ارادے سے اس پہاڑ پر جو شمال میں واقع ہے۔ آمادۂ جنگ ہو کر نقارے بجاتے اور اپنی تلواریں لہراتے قتل وغارت گری پر اتر آئے۔ میں نے گھوڑے پر سوار ہوتے ہی یہ حکم دیا کہ اہل لشکر کے لوگ ہر درّے اور ہر طرف سے پہاڑ کی جانب یلغار کرتے ہوئے پہنچیں۔ افغان وہاں ایک لمحہ بھی ٹھہرے کی تاب نہ لا سکے اور بلا تیر چلائے وہاں سے فرار ہو گئے۔ ان کا تعاقب کرتے ہوئے میں پہاڑ پر پہنچ گیا۔ ایک افغان میرے قریب سے نیچے کی طرف بھاگا۔ میں نے اس کے بازو کو اپنے تیر کا نشانہ بنایا۔ اس کو دیگر چند افغانوں کے ساتھ میرے سامنے لایا گیا۔ سزا دینے کی غرض سے ان میں سے بعض کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔

ضلع ننگرہار میں ہم قلعہ آدینہ پورے کے سامنے قیام پذیر ہوئے۔ اس سے قبل دوراندیشی کے تحت کسی جگہ خیمے نصب کرنے کا ارادہ نہیں کیا گیا تھا۔ ہمیں کہاں پہنچنا ہے اس کے لئے کوئی جگہ مقرر نہیں تھی اور کہاں

۱۷۔ شاہ بیگم بابر کی سوتیلی نانی اور یونس خاں کی بیوہ تھیں ان کے والد سلطان شاہ محمد بدخشاں کے بادشاہ تھے۔ مرزا حیدر دوغلت نے یہ قصہ تفصیل سے تحریر کیا ہے (ص ۲۰۳ اور نوٹ ۴)

۱۸۔ خضر خیل اور شموخیل دونوں بی بی ماتو غلومی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں (تاریخ خاں جہانی ص ۸۰۴) خرلچی اور خوگیانی کے لئے دیکھیں نوٹ ۵۴ حالات ۹۱۰ھ

قیام کرنا ہے اس کے لئے کوئی منزل متعین نہ تھی۔ ہم چار دستے بنا کر کوچ کر رہے تھے تا کہ یہ دستے اوپر یا نیچے سے کوئی نئی خبر لاسکیں۔ یہ موسم خزاں کا آخری زمانہ تھا۔ اکثر جگہ دھان کی کاشت اٹھالی گئی تھی۔ لوگوں نے جو یہاں سے واقف تھے عرض کیا کہ بالائے دریا' ضلع علیشنگ میں میل قبیلے کے کفار دھان کی بہت زیادہ کاشت کرتے ہیں۔ موسم سرما میں لشکر کے لوگوں کے کھانے کے لئے غلّہ شاید وہاں سے حاصل ہو سکے؟ چناں چہ ننگر ہار کے کوہستانی درّے سے اپنے گھوڑوں پر تیزی سے روانہ ہوئے اور شایگل نامی جگہ کو عبور کر کے وادی پر امین پہنچ گئے۔ لشکر کے لوگوں نے یہاں سے کثیر تعداد میں دھان حاصل کیا۔ یہاں دھان کے کھیت پہاڑ کے سرے پر واقع ہیں۔ ہمیں دیکھ کر یہاں کے لوگ فرار ہونے لگے۔ ان میں سے چند کا فرقتل بھی ہوئے۔ پر امین میں پہاڑ کی نوک پر چند جوانوں کو کافروں کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا۔ جس وقت وہ واپس آرہے تھے تو چند کافروں نے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر وہاں سے تیر اندازی شروع کردی۔ وہ قاسم بیگ کے داماد پوران کے اس قدر قریب پہنچ گئے کہ وہ ان کے تیر کی زد پر آ گیا۔ وہ چاہتے ہی تھے کہ اسے پکڑ کر اپنے ساتھ لے جائیں کہ دوسرے جوانوں نے اپنی زور آزمائی سے دشمن کو بھگا دیا اور پوران کو ان کے چنگل سے آزاد کرا کے اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ دھان کے ان کھیتوں میں جن کے مالک کفار تھے ہم نے ایک رات قیام کیا اور وہاں سے کثیر تعداد میں غلّہ جمع کر کے اسے لشکر گاہ میں لے آئے۔

ان ہی دنوں ضلع منداور کے نواح میں مقیم کی بیٹی ماہ چوچک کی نسبت قاسم کو کلداش سے کی گئی جواب شاہ حسین کے حبالہ نکاح میں ہے۔

جب صلاح اس امر میں نہ دیکھی گئی کہ ہندستان کی جانب رُخ کیا جائے تو ملّا بابا پشاغری کو چند جوانوں کے ہمراہ کابل بھیجا گیا۔ منداور کے نواح سے کوچ کر کے ہم اتر دسیوہ نامی مقامات پر پہنچے۔ جہاں ہم چند روز مقیم رہے (ورق ۱۹۰) ادھر سے ہم کُنر اور نور گل کی جانب سیر و تفریح کی غرض سے روانہ ہوئے کُنر سے میں بیڑے پر سوار ہو کر لشکر گاہ پہنچا۔ اس سے پہلے میں چوں کہ کبھی بیڑے پر نہیں بیٹھا تھا۔ اسی لئے مجھے اس پر سوار ہونا بہت پسند آیا۔ اس کے بعد تو اس کا استعمال عام ہو گیا۔

شیبانی خاں کی قندھار سے واپسی

اسی عرصے میں ناصر مرزا کے پاس سے ملّا میر فرکتی قاصد آیا اور یہ خبر لایا کہ شیبانی خاں نے قلعۂ سنگین قندھار پر تو قبضہ کر لیا تھا مگر چونکہ اس کے حصار، (گڑھی) کو وہ فتح نہ کر سکا، اس لئے واپس چلا گیا۔ شیبانی خاں کے وہاں سے چلے جانے کے بعد کچھ وجوہ کی بنا پر ناصر مرزا نے قندھار کو خیر باد کہا اور غزنی پہنچ گیا۔

شیبانی خاں کی ہماری روانگی کے فوراً بعد اچانک قندھار پر حملے کے وقت قلعہ کو مستحکم نہیں کیا جا سکا تھا۔ اسلئے باہر اس کا قبضہ ہو گیا۔ اندرونی قلعہ (گڑھی) پر اس نے کئی جگہ نقب زنی کی۔ جس کے باعث کئی مرتبہ معرکے بھی ہوئے۔ ایک موقع پر تو ناصر مرزا کی گردن میں تیر آ کر لگا۔ نزدیک تھا کہ قلعے پر دشمن کا قبضہ ہو جائے کہ اتنے میں بحالت اضطراب سراسیمگی خواجہ محمد امین، خواجہ محمد دوست خاوند، محمد قلی پیادہ اور ساتی فصیل حصار پر سے چھلانگ لگا کر باہر نکل آئے اور فرار ہو گئے۔ اندرون حصار قلعہ جو سپاہی موجود تھے وہ مایوس ہو کر قلعے کو دشمن کے حوالے کر دینا ہی چاہتے تھے کہ شیبانی خاں نے صلح کی پیش کش کر دی اور قندھار پر سے محاصرہ اٹھالیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے جس وقت قندھار کی جانب رخ کیا تھا تو اپنے حرم کی عورتوں کو نیرہ تو کی جانب روانہ کر دیا تھا۔ جہاں کسی شخص نے بغاوت کر دی اور قلعے پر قابض ہو گیا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے صلح کر لی اور واپس چلا گیا۔

اگر چہ سردی خوب پڑ رہی تھی مگر چند روز بعد بادیج کے راستے سے ہم کابل پہنچ گئے۔ جس وقت ہم

بادیخ پہنچے تو میں نے حکم دیا کہ ایک چٹان پر اس جگہ عبور کرنے کی تاریخ کندہ کریں۔ حافظ خرک نے تاریخ کہی اور شاہ محمد سنگتراس نے اسے کندہ کیا۔ عجلت کے باعث عمدہ کندہ کاری نہ ہو سکی۔

آل تیمور کی بادشاہی

میں نے ناصر مرزا کو غزنی عطا کر دیا اور ننگر ہار، منداور، دڑہ نور و نور گل کے اضلاع عبدالرزاق کے حوالے کر دیئے اگرچہ تیمور بیگ کی اولاد صاحب مملکت و سلطنت تھے مگر اس وقت انھیں مرزا[19] کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ میں نے حکم دیا کہ آج کے بعد سے انھیں بادشاہ کے لقب سے خطاب کیا جائے۔

ہمایوں کی پیدائش

اس سال کے آخر میں اس وقت جب کہ سورج برج حوت میں تھا منگل کے دن چار تاریخ ماہ ذی قعدہ قلعہ کابل میں ہمایوں کی ولادت ہوئی۔ مولانا مسندی شاعر نے تاریخ ولادت "سلطان ہمایوں خاں" (۹۱۳) سے نکالی۔ کابل کے ایک غیر معروف شاعر نے "شاہ فیروزہ قدر" کہا۔ تین چار دن بعد اس نومولود کا نام ہمایوں رکھا گیا۔ ہمایوں کی ولادت کے پانچ چھ دن بعد میں چار باغ میں پہنچا اور اس ولادت کی خوشی میں ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔ تمام امرا جن میں خورد و کلاں سب ہی شامل تھے تحائف لے کر آئے۔ چاندی کے ٹنکے اس قدر وافر مقدار میں جمع ہو گئے کہ اس سے پہلے دیکھے نہیں۔ یہ ضیافت بڑی ہی بارونق رہی۔

۱۹۔ بابر کی بادشاہت۔ چنگیز خاں کے دوسرے بیٹے چغتائی کی حکومت مرکزی ترکستان میں تھی۔ ان کی اولاد جب کمزور ہوئی تو یہ سلطنت ماوراء النہر اور مغلستان میں تقسیم ہوئی۔ ماوراء النہر میں جب امیر تیمور کا عروج ہوا تو انہوں نے چغتائی خاں کو کٹھ پتلی حکمراں کے طور پر قائم رکھا اور خود مرزا کا خطاب اپنایا (تاریخ رشیدی ص ۳۷۔۳۸) لیکن بابر کے دادا ابوسعید مرزا نے یونس خاں، بابر کے نانا کو الگ حکومت دے کر یہ سلسلہ ختم کر دیا۔ اس لئے اب کوئی وجہ نہیں تھی کہ تیموری اپنے آپ کو بادشاہ نہ کہلوائیں، لیکن یہ قدم بھی آخر بابر نے ہی اٹھایا۔

واقعات ۹۱۴ھ

(۲ مئی ۱۵۰۸ء - ۲۱ اپریل ۱۵۰۹ء)

اس سال موسم بہار میں نغریک نامی مقام کے نزدیک افغانوں کے مہمند قبیلے کے ایک دستے پر حملہ کیا گیا، اس یورش کے بعد ہم واپس آ گئے۔ چند روز بعد قوچ بیگ، فقیر علی کریم داد اور بابا چہرہ نے فرار ہونے کی سازش کی۔ (ورق ۱۹۱) جس کا راز فاش ہو گیا۔ انہیں گرفتار کرنے کے لئے آدمی روانہ کئے گئے اور استرغچ[1] کی سرحد سے انہیں گرفتار کر کے لایا گیا۔ جہانگیر مرزا کے زمانہ حیات میں بھی ان کے بارے میں کچھ فضول باتیں بیان کی گئی تھیں۔ میں نے حکم دیا کہ سر بازار انہیں سزا دیں۔ انہیں شہر کے دروازے پر لے جایا گیا۔ ان کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالا ہی گیا تھا کہ قاسم بیگ نے خلیفہ کو میرے پاس بھیجا اور ان کے قصور معاف کرنے کی عاجزی کے ساتھ درخواست کی۔ چنانچہ میں قاسم بیگ کی خاطر ان کی خونریزی سے باز رہا اور حکم دیا کہ انہیں قید خانے میں ڈال دیں۔

اس عرصے میں اہالی حصار وقندوز، چکمہ علی، سید شکمہ، شیر قلی، دیکو سالم، خسرو شاہ کے تربیت و مراعات یافتہ مغل سردار سلطان علی چہرہ، خدا بخش چغتائی اور ان کے ساتھیوں اور ترکمانوں میں سے سیوندوک، شاہ نظر اس کے متعلقین اور دو تین ہزار سپاہ نے سازش کر کے بغاوت کا فیصلہ کیا یہ لوگ جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے خواجہ ریواج نامی مقام کے مقابل واقع سنگ قورغان سبزہ زار سے چالاک مرغزار تک پھیلے ہوئے تھے۔ عبدالرزاق مرزا بھی ننگرہار سے آ گیا اور وہ افغان نامی مقام پر قیام پذیر ہو گیا۔

محب علی قورچی نے ایک دو مرتبہ اس سازش کے بارے میں خلیفہ اور ملا بابا سے ذکر کیا اور مجھے بھی اشارہ و کنایہ میں اس کے بارے میں بتایا۔ یہ بات چونکہ ناقابل یقین تھی اس لئے اس کی جانب توجہ نہ کی گئی۔ ایک رات چار باغ کے دیوان خانے میں میری نشست تھی۔ نماز عشا کا وقت گزر چکا تھا کہ اتنے میں موسیٰ خواجہ اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا شخص دوڑے ہوئے آئے اور میرے کان میں کہا کہ یہ مصدقہ خبر ہے کہ مغل سرداروں نے بغاوت کا تہیہ کر لیا ہے۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اپنے عزم میں عبدالرزاق کو شامل کر سکے ہیں یا نہیں۔ لیکن یہ یقین نہیں کہ وہ آج رات ہی بغاوت کریں گے۔ میں نے اس وقت تغافل ظاہر کیا اور ایک لحظہ بعد حرم کی جانب رخ کیا۔ اس وقت خواتین حرم پردہ باغ اور سہ برگہ باغ میں تھیں۔ جس وقت میں حرم میں داخل ہوا تو نوکر چاکر اور پاسبان وہاں سے چلے گئے۔ ان لوگوں کے وہاں سے چلے جانے کے بعد میں سرور نامی غلام کے ساتھ شہر کی طرف روانہ ہوا۔ خندق کے راستے سے میں آہنی دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ سامنے سے خواجہ محمد علی بازار کی جانب سے آتا ہوا نظر آیا اور ہمارے ہمراہ ہو گیا۔[2]

(پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ چند سال کے واقعات تحریر نہیں کئے گئے ہیں اس کے بعد یہاں گیارہ سال کے واقعات قلمبند نہیں ہو سکے ہیں اس لئے سنہ ۹۱۴ کے بعد سنہ ۹۲۵ کے واقعات بیان کئے جا رہے ہیں۔)

۱۔ استرغچ۔ یہ وادی کابل کے شمال میں مزار شریف جانے والے روڈ پر واقعہ ہے۔ اس کی خوبصورتی سے متعلق دیکھیں بابر کا بیان ۹۱۰ھ کے حالات میں ورق ۱۱۶

۲۔ ۹۰۸ھ/۱۵۰۲ کے بعد یہ دوسرا خلا ہے جو کافی طویل ہے کیونکہ اس کے بعد گیارہ سال کے واقعات غائب ہیں اور پھر ۹۲۵ھ/۱۵۱۹ سے حالات ملتے ہیں۔

واقعات ۹۲۵ھ

(۳ جنوری ۔ ۲۳ دسمبر ۱۵۱۹ء)

پیر کے دن بتاریخ اول ماہ محرم جندول نامی تنگ درّے میں ایسا شدید زلزلہ برپا ہوا کہ تقریباً آدھے گھنٹے تک زمین لرزتی رہی۔

اگلے دن صبح کے وقت ہم نے اس منزل سے کوچ کیا۔ قلعہ باجوڑ[1] پر قبضہ کرنے کی غرض سے ہم اس کے نزدیک قیام پذیر ہوئے۔ دلہ زاک[2] نامی قبیلے کے افغانون کے پاس ہم نے اپنا ایک معتبر آدمی باجوڑ کی جانب روانہ کیا تا کہ سلطان باجوڑ اور وہاں کے لوگوں سے کہے کہ وہ میری اطاعت وفرمانبرداری قبول کر کے قلعہ میرے حوالے کر دیں۔ ان میں سے بعض بدنصیب جاہل لوگوں نے میری اس نصیحت کو قبول نہ کیا اور پراگندہ قسم کے جوابات دیئے۔ چنانچہ میں نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ قلعہ گیری کے دیگر آلات واسباب تیار کر لیں۔ اس مقصد کے لئے ہم ایک دن اس منزل پر قیام پذیر ہوئے۔

(ورق ۱۹۲) محرم کی چار تاریخ بروز جمعرات اہل لشکر کو میں نے حکم دیا کہ وہ زرہ بکتر پہن کر گھوڑوں پر سوار ہوں۔ جوانغار دستے کو حکم دیا کہ وہ پیشقدمی کر کے قلعہ باجوڑ کی چڑھائی کی طرف بڑھے اور دریا عبور کرنے کے بعد اس قلعے کے شمال میں قیام پذیر ہو۔ غول کے سپاہی قلعے کے مغرب وشمال میں دریا عبور کئے بغیر پست وبلند ناہموار زمین پر جا کر پڑاؤ کریں۔ برانغار دستے کے سپاہی قلعے کی مغربی جانب نشیبی دروازے پر پہنچ کر وہاں اتریں۔ دوست بیگ اور جوانغار دستے کے امرا جس وقت دریا عبور کر کے قلعے کے نزدیک پہنچ گئے تو قلعے میں سے سو اور ڈیڑھ سو کی ٹکڑیوں میں سپاہی باہر نکل آئے اور تیراندازی شروع کر دی۔ ہمارے امیر بھی سینہ سپر ہو گئے اور ان پر تیروں کی بارش کرتے ہوئے تعاقب کیا اور پسپا کرتے کرتے قلعے کی جانب اس کی فصیل تک انہیں پہنچا دیا۔ ملا عبدالملک خوستی دیوانہ وار اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا فصیل تک پہنچ گیا۔ اگر اس وقت زینے تیار ہوتے اور دن نہ بیت گیا ہوتا تو قلعہ اسی دن فتح ہو گیا ہوتا۔ ملا ترک علی اور تینکر بیردی نے دشمن کی سپاہ کے ساتھ نبرد آزمائی کی اور ان کے سروں کو کاٹ کر اپنے ساتھ لے کر آئے۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ یہ وعدہ کیا گیا کہ انہیں انعام سے نوازا جائے گا۔

باجوڑ کے لوگوں نے اس سے پہلے تفنگ[3] نہیں دیکھی تھی۔ وہ ان سے پریشان نہ ہوئے بلکہ جب انہوں نے تفنگوں کی آواز سنی تو ان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور مضحکہ اڑاتے اور بے ہودہ اشارے کرنے لگے[4]۔

استاد علی قلی نے پانچ آدمیوں کو تفنگ[5] سے گرا دیا۔ اس کے علاوہ دیگر تفنگ اندازوں نے بھی تفنگ اندازی کے جوہر دکھائے اور بہت ہی جانفشانی سے کام لیا۔ رات تک شاید سات آٹھ یا دس باجوڑی تفنگ کی ضرب سے گرا لئے گئے۔ اس کے بعد حکم دیا گیا کہ اب رات ہو گئی ہے لشکر کے سپاہی واپس آئیں۔ اگلے دن صبح اسباب قلعہ گیری فراہم کر کے اس پر پوری تن دہی سے زور آزمائی کریں۔

روز جمعہ پانچ محرم نماز فجر کے وقت حکم دیا گیا کہ جنگ کا نقارہ بجایا جائے اور جو شخص جہاں بھی مقرر ہو وہ وہاں سے قلعے پر پوری قوت سے زور آزمائی کرے۔ جوانغار اور غول دستے اپنے اپنے مورچوں سے یکدست ہو کر زور آزما ہوئے اور زینے لگا کر برسرپیکار ہو گئے۔ خلیفہ شاہ حسن ارغون اور احمد یوسف اپنے ساتھیوں کے

۱۔ باجوڑ (بجور) یہ وادی دیر اور سوات کو پشاور کے میدانوں سے ملاتی ہے۔ یہ دلفریب وادی ہے جس میں مرغزار اور گھاس کے میدان بکثرت ہیں یہاں گیہوں عمدہ ہوتا ہے۔ یہ آجکل مالاکنڈ ایجنسی میں شامل ہے (کیرو ۱۹۶، ۲۱۳، ۳۲۱، ۳۸۶) مرتب نے ۲۰۰۴ میں یہاں کا سفر کیا۔ اب بھی یہ دور دراز علاقہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم فاتح یہاں پہنچے ان میں بابر شامل ہے۔ یہاں چاروں طرف پہاڑوں سے گھری ہوئی یہ عمدہ وادی ہے۔ یہاں کا مرکزی شہر خار ہے۔ برابر دریائے باجوڑ اور کوہ مور ہیں۔ یہ علاقہ آج بھی باجوڑ ہی مشہور ہے اور خار اتنا معروف نہیں اسی لئے بابر بھی بجوڑ (باجوڑ) کا ذکر کرتا ہے خار کا نہیں۔

۲۔ دلہ ذاک کے لئے دیکھیں سنہ ۹۱۰ میں نوٹ ۶۵۔

۳۔ تفنگ۔ بندوق

تفنگ وتیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
الہی پھر جو دلبر تاک کر مارا تو کیا مارا
(ذوق، ایک مطالعہ ص ۱۲)

۴۔ یہ جملہ برٹش لائبریری کے مخطوطے ۲۴۴۱۶ میں نہیں ہے۔ لیکن ارسکن نے اپنے ترجمے میں اس کو شامل کیا ہے اور حیدرآباد کے مخطوطے میں بھی ہے۔

۵۔ یہ چیز نوٹ کرنے کی ہے کہ یہ پہلی دفعہ آتشی اسلحہ کا ذکر ہو رہا ہے اس سے پہلے بابرنامے میں یہ ذکر نہیں آیا۔ گمشدہ حصوں کا کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

کاریز کا نقشہ

باجوڑ
دریائے پنج کورہ
دریائے سوات
کابل
دریائے کابل
دریائے سندھ
علی مسجد
صوابی
پرشاور
کوہاٹ
نیلاب
پرہالہ
دریائے کرم
بنوں
ڈیرہ غازی خاں
سخی سرور
جہلم
کلر کہار
بھیرہ
بہلول پور
دریائے جہلم
دریائے چناب
سیالکوٹ
سید پور
پسرور
لاہور
دریائے راوی
ملتان
کلانور
دریائے ستلج
دریائے سندھ
پانی پت

شمال مغربی ہند
بابر کے زمانے میں

ہمراہ غول کے بائیں دستے کی کمان سنبھالے ہوئے تھے۔ اس دستے کو حکم دیا گیا کہ وہ جوانغار دستے کی مدد کو پہنچیں۔ دوست بیگ کے سپاہی قلعے کے اس برج تک گئے جو مشرق وشمال کے درمیان واقع ہے اور اس کی بنیاد میں نقب لگانے اور گرانے میں مشغول ہوگئے۔ استاد علی قلی بھی وہاں موجود تھا۔ اس دن اس نے بھی تفنگ اندازی کے خوب جوہر دکھائے اور دو مرتبہ فرنگی [6] سے سنگباری کی۔ ولی خازن نے بھی اپنی تفنگ سے ایک شخص کو مار گرایا۔ غول کے بائیں دستے سے ملک علی قطبی سب سے پہلے زینے پر سے اوپر پہنچا اور دیر تک دشمن کے ساتھ برسرپیکار رہا۔ غول کے مورچے سے محمد علی جنگ جنگ اور اس کا بھائی دونوں ہی علیحدہ علیحدہ زینوں پر سے اوپر پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے نیزہ وشمشیر سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ ایک اور زینے سے بابا یشاول اوپر پہنچ گیا۔ وہاں وہ تیر چلانے اور قلعے کی چھت گرانے میں مصروف ہوگیا۔ اکثر عمدہ وکارآمد جوان بھی وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے شمشیرزنی کے ایسے جوہر دکھائے کہ دشمن کو باہر نکلنے کی مہلت تک نہ دی۔ ان کے علاوہ دیگر جوانوں نے بھی غنیم کی نبرد آزمائی اور زورمندی کی پرواہ کئے بغیر اور ان کے تیروکمان اور چلّوں [7] کو خاطر نہ لاتے ہوئے قلعے میں نقب لگانے اور اسے برباد کرنے میں مشغول ہوگئے۔ دوست بیگ کے ساتھی قلعے کے اس برج میں نقب لگا رہے تھے جو اس کے مشرق وشمال (ورق ۱۹۳) میں واقع تھا۔ چنانچہ چاشت تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے اور دشمن کے آدمیوں کو وہاں سے بھگا کر خود برج پر پہنچ گئے۔ اسی اثنا میں غول دستے کی سپاہی بھی اس جگہ پہنچ گئے۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ کی مہربانی وعنایت سے ایسا محکم ومضبوط قلعہ دو گھنٹے کے اندر فتح ہوگیا۔ ہمارے خورد کلاں ساتھیوں میں سے جس سے جس قدر ممکن ہوسکتا تھا اس نے اس خدمت کو بحسن وخوبی انجام دیا اور جوہر مردانگی وبہادری دکھا کر شہرت وآبرومندی حاصل کی۔

باجوڑ کے لوگ قتل ہوئے اور ان کے اہل وعیال کو قید کرلیا گیا۔ اس جنگ میں تقریباً تین ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ہوگا۔ قلعے کو فتح کرنے کے بعد ہم اس میں داخل ہوئے۔ سلاطین کے جو مکانات تھے ان میں ہم نے قیام کا۔ ولایت باجوڑ خواجہ کلاں کو عنایت کردی گئی۔ مدد کے لئے عمدہ جوانوں کو وہاں متعین کر کے ہم نماز مغرب کے وقت لشکرگاہ میں آئے۔ چند قیدی جو وہاں رہ گئے تھے ان کے قصور خواجہ کلاں کی سفارش پر معاف کردیئے گئے اور ان کے اہل وعیال کو ان کے ہمراہ جانے کی اجازت دے دی گئی۔ بعض سلاطین اور ان کے سرکش ساتھیوں کو بھی ان کے کئے کی سزا دی گئی۔ چنانچہ سلاطین کے سروں کے ساتھ دیگر سو آدمیوں کے سر فتح کی خبر کے ساتھ کابل بھیجے گئے۔ سروں کے ساتھ فتح نامے بدخشاں، قندوز اور بلخ کی جانب بھی روانہ کئے گئے۔

شاہ منصور یوسف زئی اپنے قبیلے یوسف زئی [8] کی طرف سے آیا تھا۔ اس فتح وقتل عام کے موقعے پر وہ بھی موجود تھا۔ اسے لباس فاخرہ پہنایا گیا اور یوسف زئی قبیلے کے لوگوں کی تنبیہ کے لئے فرمان لکھ کر اسے جانے کی اجازت دی گئی۔

قلعہ باجوڑ کی مہمات سے خاطر جمع ہو کر بتاریخ ۹ محرم منگل کے دن ہم نے کوچ کیا۔ اس تنگ درّے میں ایک کروہ نیچے اتر کر ہم نے قیام کیا، اور حکم دیا کہ یہاں ایک بلند جگہ پر مقتولین کے سروں کا مینار [9] بنایا جائے۔

بدھ کے دن بتاریخ دس محرم ہم سیر کی غرض سے سوار ہوئے اور قلعہ باجوڑ پہنچے۔ شراب کے چند مشکیزے ساتھ لائے گئے تھے۔ باجوڑ میں نہ صرف شراب بلکہ میوے بھی کافرستان کے گردونواح سے لائے جاتے ہیں۔ [10]

ہم نے رات یہیں بسر کی۔ اگلے دن صبح بروج اور فصیل کا معائنہ کر کے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور واپس لشکرگاہ پہنچے۔ اگلے دن صبح وہاں سے کوچ کیا اور دریائے جندول پر قیام کیا۔

۶۔ فرنگی۔ پنت کے مطابق یہ ایک گھومنے والی تفنگ ہوسکتی ہے جو ایک تکون چوکی پر سے چلائی جاتی تھی (ص ۱۶۰) لیکن بابر اس کا استعمال تفنگ سے مختلف بتا رہا ہے۔

استاد علی قلی نے اسکو دو مرتبہ ہی استعمال کیا اور اس سے سنگباری کی گئی اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ توپ کی قسم ہے جس سے آتش گیر مادے سے سنگ باری کی جاتی تھی۔ بارود چین میں ایجاد ہوا تھا۔ اسی لئے اسکو چینی نمک یا چینی برف بھی کہتے ہیں۔ اسلامی عروج کے زمانے میں اسلامی سرحدیں چین تک تھیں۔ عربوں نے چین سے یہ معلومات حاصل کیں چنانچہ تیرھویں صدی عیسوی میں عرب شورہ، گندھک اور کوئلے کا استعمال جنگوں میں کرتے تھے۔ منگول جب وسط ایشیا آئے تو جدید معلومات ان کے ساتھ آئیں۔ امیر تیمور نے دمشق پر حملے میں بجلی کی کڑک وچمک کا استعمال کیا اور ایک مشین ملائی سے ان کو پھینکا۔ امیر تیمور نے ہی ترکی کے بایزید سے جنگ میں ہاتھی پر سے آگ کے شعلے بھی پھینکے تھے۔ ۱۴۲۲ء میں جب ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تو انہوں نے دھات کو توپیں استعمال کی تھیں۔ پندرھویں صدی کے شروع میں ہی سکندر بت شکن نے کشمیر کے حملے میں وہاں کے سب مندر تباہ کردیئے تھے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ تباہی اتنی مکمل تھی کے بارود کے بغیر ممکن نہیں۔ سکندر کا انتقال ۱۴۱۶ء میں ہوا مغربی ہندستاں اور جنوبی ہندستاں کے روابط عربوں سے بہت قدیم ہیں تو پیں بھی انہی بحری روابط کے ذریعہ ہندستاں پہنچیں۔ اس میں شک نہیں کہ توپیں پرتگالیوں کے ہندستاں ۱۴۹۸ء میں وارد ہونے سے پہلے موجود تھیں۔ گجرات ومغربی ہندستاں میں ان کا استعمال ہوا ہے لیکن بابر وہ پہلا حکمراں ہے جس نے توپوں کا باقاعدہ منظم استعمال جنگوں میں کیا۔ (ایلیٹ ڈاسن ص ۴۵۵، پنت ص ۲۰۱)

۷۔ چلہ۔ زہ کمان، کمان کا چڑھاؤ، کمان کی تانت (سید احمد دہلوی ۲، ۱۱۸)

۸۔ یوسف زئی۔ یہ سرحد کے مشرق میں آباد قبیلے خیرالدین سرنبری کی اولاد دیر، سوات اور بونیر میں آباد ہیں (کیرو ص ۱۲)

۹۔ سروں کا مینار۔ (کلہ مینار) فتح کی نشانی اور دشمن میں خوف پیدا کرنے کا ذریعہ۔ ابن بطوطہ جب (۷۳۴/۱۳۳۳) سیہون، سندھ پہنچا تو اس نے شہر کے بیچ میں سروں کے مینار دیکھے۔ اس کے بیان کے مطابق یہ کافی بڑے تھے۔ سلطان محمد تغلق کے حاکم عماد الملک نے شہر کے باغیوں کو سزا دینے کے بعد یہ بنائے تھے۔ (قم، ابن بطوطہ ص ۱۵۳) اسپین کے سفیر نے جو تیمور کے پاس

یہاں سے فرمان صادر کیا گیا کہ جس دستے کے افراد نے لکھا ہے کہ وہ باجوڑ کی مدد کے لئے جانا چاہتے ہیں وہ خود ہی وہاں پہنچ جائیں۔

اتوار کے دن بتاریخ چودہ محرم خواجہ کلاں کو توغ عطا کر کے قلعہ باجوڑ کی طرف جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کے چلے جانے کے ایک دوروز بعد یہ قطعہ ذہن میں آیا جو لکھ کر اسے بھیج دیا گیا۔ قطعہ:

قرار وعهد بیار این چنین نبود مرا گزید هجرو مرا کرد بی قرار آخر
بعشو یای زمانه چه چاره سازود کس بجور کرد جدایارا از یار آخر

نہ تھا ایسا عہدوپیاں یہ یار آخر جدا ہو کر گیا بے قرار آخر
خلاف قسمت ہتھیار کیا آزماؤں یار کو کردیا جداباجوڑ یہ یار آخر

بدھ کے دن بتاریخ ۱۷ محرم علاءالدین سواتی جس کی سلطان ویس سواتی کے ساتھ ہم چشمی ورقابت تھی حاضر خدمت ہوا۔

جمعرات کے دن بتاریخ ۱۸ ماہ محرم اس پہاڑ پر جو باجوڑ اور جندول کے درمیان واقع ہے شکار کیا گیا۔ یہاں کے بھینسے اور بارہ سنگھے کالے رنگ کے ہوتے ہیں مگر ان کی دموں کا رنگ مختلف ہوتا ہے (ورق ۱۹۴) یہاں سے ذرا نیچے اتر کر ہندوستان کے بھینسے اور بارہ سنگھے غالباً سیاہ ہی ہوتے ہیں۔ اس روز ہم نے ایک پرندہ مار گرایا۔ یہ بھی سر سے پیر تک کالا تھا[11]۔ اسی دن برکوت (شاہین) نے ایک ہرن پکڑ لیا۔

لشکر کے لوگوں کے درمیان اناج کم ہونے لگا تھا چنانچہ درۂ کہراج سے اناج فراہم کیا گیا اور اس ارادے سے ہم نے کوچ کیا کہ سوات میں آباد یوسف زئی قبیلے کے افغانوں کو تاراج کیا جائے۔ جمعے کے دن ہم نے کوچ کیا اور دریائے جندول، دریائے باجوڑ اور دریائے پنج گورہ کے سنگم پر ہم قیام پذیر ہوئے۔ شاہ منصور یوسف زئی کچھ نشہ آور خوش مزہ گولیاں لے آیا تھا جس کے تین حصے کئے گئے۔ ان کا ایک حصہ میں نے کھایا، دوسرا گدائی طغائی کو دیا اور تیسرا عبداللہ کتابدار کو۔ اس نے ایسی سرور کی کیفیت پیدا کر دی کہ مغرب کے وقت جب امرا صلاح ومشورے کے لئے جمع ہوئے تو پینک کے باعث میں ان کے ساتھ شریک نہ ہوسکا۔ یہ بھی بڑی عجیب بات ہے۔ اگر اسی قسم کی گولی آج میں پوری کھالوں تو معلوم نہیں کہ اس کا نشہ اس کے نصف برابر بھی ہوسکے گا یا نہیں[12]

یہاں سے کوچ کر کے جہاں درۂ کہراج اور درۂ پیش گرام کے دہانے ہیں وہاں ہم دریائے پنج گورہ کے سامنے قیام پذیر ہوئے۔ جس وقت ہم اس منزل پر قیام کئے ہوئے تھے تو برف باری ہونے لگی۔ چونکہ اس جگہ برف باری شاذونادر ہی ہوتی ہے اسی لئے لوگوں کو اس وقت برف گرنے پر حیرت تھی۔ سلطان ویس سواتی سے معاہدہ کر کے لشکر کی ضرورت کے پیش نظر کہراج کے لوگوں پر چار ہزار خروار دھان[13] بطور خراج مسلط کیا گیا۔ جسے وصول کرنے کے لئے سلطان ویس سواتی کو روانہ کیا گیا۔ پہاڑ اور دیہات کے لوگوں پر چونکہ اس قسم کا خراج کبھی مسلط نہیں کیا گیا تھا اسی لئے وہ اسے برداشت نہیں کر سکے اور اسی لئے وہ تباہ وبرباد ہوگئے۔

منگل کے دن بتاریخ ۲۳ محرم لشکر کو ہندو بیگ کے ہمراہ کر کے پنج گورہ کی جانب تاخت وتاراج کے لئے روانہ کیا گیا۔ یہ جگہ گجر کوہ نامی پہاڑ کی کمر سے ذرا بلندی پر واقع ہے۔ چونکہ پہاڑ کی ڈھلان تیز ہے اس لئے یہاں تک پہنچنے کے لئے پہاڑ سے لگے لگے تقریباً ایک کروہ کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ یہاں کے لوگ اپنے اپنے گھر چھوڑ کر بھاگ چکے تھے۔ اس وجہ سے ہمارے آدمی اپنے ساتھ جانوروں کے گلے، گائیں، بیل اور اناج لے کر آئے۔ اگلے دن صبح لشکر کو قوچ بیگ کے ہمراہ تاخت وتاراج کے لئے روانہ کیا گیا۔

جمعرات ۲۵ محرم غلہ وصول کرنے کے غرض سے لشکر کے آدمی درۂ کہراج اور ماندیش نامی گاؤں میں قیام پذیر ہوئے۔

گیا تھا (۸۰۶-۸۰۹/ ۱۴۰۶-۱۴۰۳) نے بھی دمغان (ایران) شہر سے ایک تیر کی دوری پر دو سروں کے مینار دیکھے۔ اس کا بیان ہے کہ یہ ایک پتھر پھینکنے کی حد تک اونچے تھے۔ یہ مٹی اور سروں کی تہوں سے بنائے گئے تھے ایک تہ سروں کی اور دوسری تہ کچی مٹی کی اینٹوں کی۔ زیادہ تر سر آق قوینلوں ترکمانوں کے تھے۔ اس کے علاوہ دو اور بھی مینار قریب ہی تھے جو گر چکے تھے۔ (کلاجیوہ ص ۱۷۳) مولف نے کند بادام (تاجکستان) کے ایک مدرسہ میں جواب میوزیم ہے ایک مصور کی بنائی ہوئی تصویر دیکھی جس میں سروں کا مینار ایک تکون ڈھیر ہے جس کی اونچائی تقریباً آٹھ دس فٹ ہوگی۔

کئی مغربی مصنفین امیر تیمور کو اس کا الزام دیتے ہیں (اپنی ماری شمل ص ۸۹) لیکن جیسا کہ اوپر ذکر ہے ابن بطوطہ نے ۷۳۴/۱۳۳۳ میں خود سروں کے مینار کا معائنہ کیا۔ تیمور کی پیدائش ۱۳۳۶ء میں ہوئی تھی۔

تاریخ جہاں گشا ذکر ہے کہ جب منگولوں نے ۶۱۸ھ (۱۲۲۱ء) میں مرو پر حملہ کیا تو اتنے لوگ مارے کے ڈھیریاں پہاڑیوں میں تبدیل ہوگئیں۔ (ص ۱۶۲) اس سے زیادہ تفصیل اسی سال جب وہ نیشاپور پہنچے تو ملتی ہے انہوں نے مقتولوں کے سرجسم سے الگ کئے اور ان کے ڈھیر لگا دیئے۔ مرد سروں کو عورتوں اور بچوں کے سروں سے الگ جمع کیا (ص ۱۷۸) ان بیانات سے اس میں شک نہیں رہتا کہ منگول ہی اس قبیح رسم کے موجد ہیں۔

۱۰۔ کافرستان۔ باجوڑ کے شمال میں واقع ہے

۱۱۔ ساریق قوش۔ یہاں بابر نے پرندے کو ساریق قوش کہا ہے۔ یہ پرندہ بیج کھانا پسند کرتا ہے۔ جب کھیت تیار ہوں تو وہاں موجود ہوتا ہے۔ دھاری دار ہوتا ہے۔ قوش کسی بھی بڑے پرندے کے لئے استعمال ہوتا ہے (شاہ ۲۱۴) ساریق پیلے رنگ کو کہتے ہیں۔ شاہ نے سریغ سوندوک اور سریغ قوچقاچ دو قسموں کا ذکر کیا ہے پہلا پیلے رنگ کا اور دوسرا سرخ (شاہ ۲۱۲) لیکن بابر نے جو پرندہ یہاں گرایا اس کا رنگ سیاہ تھا۔

۱۲۔ یعنی اب نشہ کی عادت بڑھ چکی ہے اور اس کا اثر کم ہوگا۔

۱۳۔ خروار دھان۔ اتنے چاول جس کا بوجھ ایک گدھا برداشت کر سکے۔

ماہم کی خواہش

اس سال ہمایوں کے بعد اور بھی کئی بچے پیدا ہوئے مگر ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ رہا۔ ہندال کی ابھی ولادت نہیں ہوئی تھی ان ہی دنوں جب کہ ہم اس جگہ کے گردونواح میں ہی تھے کہ ماہم کا خط مجھے ملا۔ جس میں لکھا ہوا تھا کہ یہ میرا مقدر ہے کہ تیرے گھر میں اگلا بچہ لڑکا ہو یا لڑکی لیکن میں اسے گود لے کر پالوں گی۔ اگرچہ ہندال کی ابھی ولادت نہیں ہوئی تھی مگر جمعہ ۲۶ محرم اسی منزل سے ماہم کو خط لکھا گیا کہ اگلا بچہ انہیں دے دیا جائے گا۔ اور یہ خط رکابدار کو دیا گیا کہ وہ اسے کابل پہنچادے۔[۱۴]

اس منزل پر ولایت ماندیش میں درّہ کے درمیان ایک بلند جگہ پر پتھروں سے ایک وسیع چبوترہ بنایا گیا۔ وہاں پیشخانہ کے سامنے ہمارے سفید خیمے نصب ہوسکیں۔ اس چبوترے کی تعمیر کے لئے میرے قرابت دار اور سپاہی پتھر لے کر آئے۔

یوسف زئی افغانوں میں سے ملک سلیمان شاہ کا لڑکا ملک شاہ منصور (ورق ۱۹۵) ملاقات کے لئے میرے پاس آیا۔ اس کا شمار میرے خیر خواہوں میں ہوتا تھا۔ قبیلہ یوسف زئی کے ساتھ خوشگوار تعلقات کے پیش نظر مصلحت اس امر میں سمجھی گئی کہ میں اس کی بیٹی کا ہاتھ مانگوں۔ اس منزل پر مجھے یہ اطلاع ملی کہ شاہ منصور کی بیٹی، قبیلہ یوسف زئی کے مال و متاع کے ساتھ آرہی ہے۔ نماز مغرب کے بعد محفل جام و مینا آراستہ کی گئی جس میں سلطان علاء الدین کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ اسے بیٹھنے کے لئے جگہ دی گئی اور خلعت خاص سے نوازا گیا۔

مبارکہ سے شادی

اتوار کے دن بتاریخ ۲۸ محرم ہم نے کوچ کیا اور کہراج گاؤں سے باہر آکر قیام پذیر ہوئے۔ شاہ منصور کا برادر خورد طاؤس خان مجھ سے منسوب اپنی بھتیجی کو لے کر اسی منزل پر پہنچا۔

بیسوت کے لوگوں اور اہالی قلعہ باجوڑ کے درمیان چونکہ باہمی ربط و تعلق ہے اس لئے اس منزل سے یوسف علی بکاول کو بھیجا گیا کہ وہ وہاں کے لوگوں کو کوچ کرا کے انہیں قلعہ باجوڑ میں پہنچادے جو لشکر کابل میں رہ گیا تھا اسے بلانے کے لئے تحریری فرامین جاری کئے گئے۔

۳ صفر دریائے باجوڑ اور دریائے پنج گورہ کے سنگم پر ہم نے قیام کیا۔

اتوار کے دن بتاریخ ۵ صفر اس منزل گاہ سے روانہ ہو کر ہم باجوڑ پہنچے جہاں خواجہ کلاں کے دولت کدے پر محفل جام و بادہ ترتیب دی گئی۔

منگل ۷ صفر امرا اور دلہ زاک قبیلے کے افغانوں کے طلب کر کے ان کے ساتھ صلاح و مشورہ کیا گیا۔ متفقہ فیصلہ اس امر پر ہوا کہ سال تمام ہونے کو ہے۔[۱۵] ماہ حوت (فروری، مارچ) کے ختم ہونے میں ایک دو دن باقی رہ گئے ہیں۔ جو اناج کھیتوں میں پڑا ہوا تھا وہ سب اٹھالیا گیا ہے۔ اگر ہم سوات کی جانب جائیں تو لشکر کے لوگوں کو غلّہ پانی نہیں ملے گا، جس کے باعث وہ سخت صعوبت سے دوچار ہوں گے۔ اس لئے امباہر اور پانی مانی کے راستے سے ہشنغر کے کنارے بالا بالا دریائے سوات کو عبور کر کے یوسف زئی قبیلے کی پناہ گاہ ماہورا کے سامنے ان افغانوں پر جو دشت و صحرا میں آباد ہیں اور یوسف زئی محمد زئی قبائل پر مشتمل ہیں یلغار کر دینی چاہئے۔ آئندہ سال اس سے قبل کہ فصل تیار ہو ہم یہاں پہنچ کر ہم اس امر پر غور و فکر کریں گے کہ کس طرح ان افغانوں کی تہ تک پہنچا جائے۔ اور بات یہیں ختم ہوگئی۔

بدھ کے دن سلطان ویس اور سلطان علاؤالدین کو گھوڑوں کے ساتھ خلعتیں عنایت کی گئیں اور خوب

۱۴۔ ہندال کو گود میں دینے کا وعدہ۔ بابر نے یہ ذکر اس سال کی بچوں کی موت سے ملا کر کیا ہے۔ اس میں یہ نیت شامل معلوم ہوتی ہے کہ کیونکہ بچے زندہ نہیں بچ رہے تو، ہم کے گھر میں اللہ تعالیٰ بہتری کرے۔ ماہم بھی بابر کی بیوی تھیں لیکن بچہ دلدار بیگم کے ہاں ہورہا تھا۔

۱۵۔ اس سے یہ مراد معلوم ہوتی ہے کہ فصلی سال اختتام پذیر ہے اور فصلیں اٹھالی گئی ہیں۔
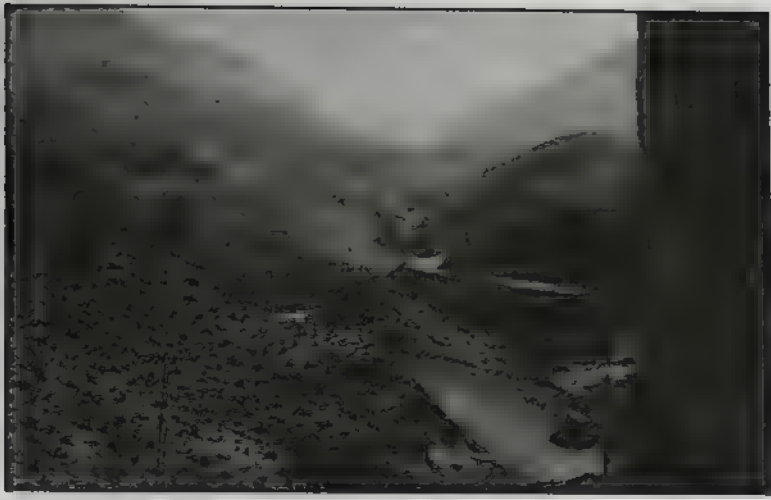
درہ خیبر۔ ہندستان میں داخلے کا مشہور درہ جس نے بے شمار حملہ آوروں کو راہ دی۔

علی مسجد۔ درہ خیبر کے تنگ ترین حصہ میں سڑک کے اوپر یہ مسجد اب بھی موجود ہے۔

گورک چھتری۔ یہ دروازہ بابر کے بعد کا بنا ہوا ہے۔ بابر کے بیان کردہ آثار باقی نہیں۔

خاطر ومدارت کر کے رخصت کیا گیا۔ یہاں سے ہم نے کوچ کیا اور باجوڑ کے مقابل قیام پذیر ہوئے۔ شاہ منصور کی بیٹی کو اس وقت تک کے لئے کہ جب تک لشکر واپس آئے قلعہ باجوڑ میں بھیج دیا گیا۔

اگلے دن صبح ہم نے کوچ کیا۔ خواجہ خضر نامی مقام سے گزر کر ہم قیام پذیر ہوئے۔ اس منزل میں خواجہ کلاں کو واپس جانے کی اجازت دے دی گئی۔ بھاری ساز وسامان کنر کے راستے سے لمغان بھیج دیا گیا۔[16] اگلے دن صبح کوچ کیا۔ بھاری ساز وسامان اور اونٹوں کو خواجہ میران کے حوالے اس مقصد سے کیا گیا ہے کہ وہ جور غاتو اور دروازہ کی راہ سے درّہ فرا کو بہ کے راستے کی طرف پہنچے، ادھر ہم اپنے سواروں کے ساتھ یلغار کرتے ہوئے روانہ ہوئے۔ چنانچہ درہ ابناہر اور ایک بڑے تنگ درّے کو عبور کر کے نماز ظہر سے ذرا قبل پانی مانی نامی مقام پر قیام پذیر ہوئے۔ اوغان بردی کو کچھ لوگوں کے ساتھ آگے بھیجا گیا کہ کچھ سن گن لے کر آئیں۔ چونکہ ہمارے اور افغانوں کے درمیان اب فاصلہ زیادہ نہ تھا اسی لئے ہم نے صبح جلد کوچ نہ کیا۔ دن چڑھے اوغان بردی آیا اس نے ایک افغان کو (ورق ۱۹۶) پکڑ لیا تھا۔ جس کا سر کاٹ کر وہ اپنے ساتھ لا رہا تھا لیکن یہ سر راستے میں ہی اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ چنانچہ وہ ایسی کوئی خبر لے کر نہیں آیا جس سے خاطر جمعی ہو۔ دوپہر کے وقت ہم نے کوچ کیا۔ دریائے سوات کو عبور کر کے عصر کے وقت سے ذرا قبل ہم قیام پذیر ہوئے۔ عشاء کے وقت سوار ہو کر ہم تیزی سے روانہ ہوئے۔ رستم ترکمان کو جاسوس بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اگلے دن صبح اس وقت جب کہ سورج ایک نیزہ چڑھ چکا تھا وہ واپس آیا اور اس نے یہ اطلاع دی کہ افغانوں کو ہماری آمد کی خبر ہو گئی ہے اور وہ ہر طرف منتشر ہو گئے ہیں اور ان میں سے ایک دستہ پہاڑی راستے سے اوپر کی طرف جا رہا ہے۔ یہ سنتے ہی ہم نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ یلغاری دستے کو علیحدہ کر کے ہم نے پہلے ہی اسے آگے روانہ کر دیا تھا۔ جس نے کچھ افغانوں کو قتل کر کے ان کے سر کاٹ لئے۔ ایک گروہ کو قیدی بنا کر اسے گائیں اور بھیڑوں کے ریوڑ کے ساتھ لے آئے۔ دلہ زاک قبیلے کے افغان بھی چند لوگوں کے سر کاٹ کر اپنے ساتھ لائے۔ یہاں سے کوچ کر کے ہم کاتلنگ کے نواح میں قیام پذیر ہوئے۔ خواجہ میر میران کی جانب قاصد روانہ کیا گیا کہ اس ساز وسامان کو لے کر جو اس کے ہمراہ کیا گیا تھا وہ مقام نامی جگہ پر پہنچے اور وہاں ہم سے آن ملے۔ اگلے دن صبح یہاں سے کوچ کیا گیا اور یلانگ نامی راستے سے گزر کر ہم مقام نامی جگہ پر قیام پذیر ہوئے۔ یہاں شاہ منصور کا فرستادہ آدمی ہمارے پاس پہنچا۔ خسرو کوکلداش اور احمدی پروانچی کو ایک دستے کے ساتھ ساز وسامان لانے کے لئے روانہ کیا۔

منگل ۱۴ کو جس وقت ہم مقام نامی جگہ پر قیام پذیر ہوئے تو ہمارا بھاری ساز وسامان بھی وہاں پہنچ گیا۔ شہباز قلندر ایک ملحد اس جگہ رہا کرتا تھا۔ اس نے یوسف زئی اور دلہ زاک قبائل کے افغانوں میں سے ایک ایک دستے کو ملحد کر دیا تھا۔ مقام نامی پہاڑ کی نوک پر ایک ٹیلہ ہے جہاں سے اس کے گرد ونواح میں جو دشت ومیدان ہیں وہ سب صاف نظر آتے ہیں۔ یہ نہایت ہی پر فضا، دل کش اور خوش منظر جگہ ہے۔ اس شہباز قلندر کی قبر بھی یہیں تھی۔ میں نے اس خوش منظر مقام کی سیر کی اور اس کی قبر پر پہنچ کر اس جگہ کا معائنہ کیا۔ جسے دیکھ کر میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ایسے حسین ودل کش مقام پر کسی ملحد قلندر کی قبر کا ہونا نا مناسب ہے چنانچہ حکم دیا گیا کہ اسے گرا کر مسمار کر کے زمین کے برابر کر دیں۔ چونکہ یہ جگہ انتہائی دل کش اور پر فضا تھی اسی لئے میں نے معجون کی گولی نکالی اور اس کی چسکی لی اور کچھ دیر یہاں دم لیا۔

ہندستان میں داخلہ

باجوڑ سے ہم اس خیال کے پیش نظر چلے تھے کہ یہاں سے بھیرہ[17] کی جانب روانہ ہوں گے۔ جب سے ہم کابل آئے تھے ہندوستان کا ارادہ تھا مگر کچھ موانع کے باعث یہ ممکن نہ ہو سکا تھا۔ باجوڑ کی لشکر کشی میں تین چار ماہ

۱۶۔ اس راستے پر آج بھی مسافر رواں ہیں۔ یہ قبائلی علاقہ ہے۔ قبائل سرحد پاک وافغانستان کے دونوں طرف بستے اور آپس میں ملتے جلتے ہیں۔

۱۷۔ بھیرہ: دریائے جہلم پر واقع ہے۔ بابر کے زمانے کا شہر دریائے کے دائیں کنارے پر آباد تھا۔ آج کا بھیرا نیا ہے اور شیر شاہ سوری کا بسایا ہوا ہے۔ یہ جہلم کے بائیں کنارے پر آباد ہے۔

کا عرصہ لگ گیا اور سپاہ کے ہاتھ کوئی قابل ذکر چیز بھی نہ آئی۔ چونکہ بھیرہ ہندوستان کی سرحد پر واقع ہے اور اس جگہ سے نزدیک، اسی لئے یہ خیال آیا کہ کیوں نہ براہ راست اس کی جانب رخ کیا جائے تا کہ اہل لشکر کے ہاتھ کوئی چیز لگ سکے۔ چنانچہ اس خیال کے پیش نظر ہم وہاں سے واپس آئے اور افغانوں پر یورش کردی۔ واپس ہوتے ہوئے جس وقت ہم مقام نامی جگہ پر قیام پذیر ہوئے تو بعض خیر خواہوں نے عرض کیا کہ اگر ہمیں ہندوستان میں داخل ہی ہونا ہے تو اس کی کوئی اساس و بنیاد ہونی چاہئے۔ لشکر میں بعض لوگ کابل میں رہ گئے تھے۔ ان میں سے ایک عمدہ دستے کو باجوڑ میں تعینات کردیا تھا۔ بہت سے لوگ لشکر کے گھوڑوں کے لاغر و کمزور ہوجانے کے باعث لمغان کی جانب چلے گئے تھے جو لوگ ہمارے ساتھ تھے ان کے گھوڑوں کی بھی حالت ایسی زبوں ہوگئی تھی کہ ان میں اتنی سکت باقی نہیں رہ گئی تھی کہ ایک دن بھی سفر کی صعوبت برداشت کرسکیں (ورق ۱۹۷) اگر چہ ان کی یہ بات معقول تھی لیکن ہم چونکہ فیصلہ کرچکے تھے اسی لئے ان باتوں کو نظر انداز کرکے اگلے دن صبح کوچ کیا اور دریائے سندھ عبور کرنے کے لئے روانہ ہوئے۔ جس جگہ سے دریائے سندھ کو عبور کیا جاسکتا تھا اس کا معائنہ کرنے کے لئے میر محمد جالہ بان کو اس کے بھائیوں اور دیگر چند جوانوں کو ہمراہ روانہ کیا گیا تا کہ وہ دریائے سندھ کے گھاٹوں کے بالائی و زیریں حصّوں کا جائزہ لے سکیں۔

گینڈے کا شکار

لشکر گاہ کو دریا کی جانب روانہ کرکے میں صوابی کی طرف جسے کرگ خانہ (گینڈا گھر) بھی کہتے ہیں گینڈوں کا شکار کرنے کے لئے رخ کیا۔ کچھ گینڈے نظر بھی آئے چونکہ جنگل گھنا تھا اسی لئے اس میں سے کوئی باہر نہیں آیا۔ بہرصورت ایک گینڈی اپنے بچے کے ساتھ میدان میں نظر آئی جو ہمیں دیکھ کر بھاگ نکلی۔ اگر چہ اس پر تیروں کی بارش کی گئی مگر چونکہ جنگل نزدیک ہی تھا اسی لئے وہ اس میں گھس گئی۔ اگر چہ جنگل میں آگ بھی لگائی گئی مگر اس کے باوجود وہ ہمارے ہاتھ نہ لگی۔ ایک دوسرا گینڈا نظر آیا جو آگ میں جل چکا تھا اور تڑپ تڑپ کر ہاتھ پاؤں زمین پر مار رہا تھا، اسے ذبح کیا گیا اور ہر شخص نے اس کا حصّہ بطور نشانی کے لیا۔ صوابی سے واپس آکر بہت زیادہ سرگردانی کے بعد لشکر گاہ میں عشا کے وقت داخل ہوئے۔ وہ دستہ جو دریائے سندھ کے گھاٹوں کا معائنہ کرنے کے لئے گیا تھا واپس آگیا۔ اگلے دن بروز بدھ صبح کے وقت ۱۶ تاریخ کو گھوڑوں اور اونٹوں کو ساز و سامان کے ساتھ دریائے سندھ عبور کرایا گیا۔ لشکر، اردو بازار کے دوکانداروں اور پیادہ لوگوں کو بیڑے پر بٹھا کر ملاّحوں نے دریا عبور کرایا۔ اسی روز اس وقت جب کہ ہم ابھی دریا کے گھاٹ پر ہی تھے کہ نیلاب کے باشندے وہاں پہنچ گئے انہوں نے ایک زرہ بکتر بند گھوڑا اور تین سو شاہرخی سکّے پیش کئے۔ دریا کو عبور کرتے ہی تمام لوگ اسی دن نماز ظہر کے وقت روانہ ہوئے۔ ایک پہر رات گزر جانے کے بعد ہم نے کچہ کوٹ دریا کے نزدیک قیام کیا۔[۱۸] اگلے دن صبح کے وقت ہم نے اس دریا کو عبور کیا اور راتوں رات سنگڈا کی نامی تنگ درّے سے گزر کر قیام پذیر ہوئے۔ سیّد قاسم ایشیک آغا عقب سپاہ کا کماندار تھا اس نے ان چند گوجروں[۱۹] کو پکڑ لیا جو لشکر گاہ کے پیچھے پیچھے چلے آرہے تھے۔ اور ان میں سے چند کے سر کاٹ کر لے آیا۔ صبح کے وقت سنگڈالی سے کوچ کیا اور نماز ظہر کے وقت تک دریائے سون[۲۰] عبور کرکے قیام پذیر ہوئے۔ لشکر گاہ کے عقب میں جو لوگ چلے آرہے تھے وہ بھی آدھی رات تک پہنچ گئے۔ ہمارا یہ کوچ سخت دشوار اور کافی طولانی تھا جس کا سبب ہمارے گھوڑوں کی کمزوری تھی۔ ان میں سے کئی گھوڑوں کی تو طاقت ہی سلب ہوگئی اور بہت سے پیچھے رہ گئے۔

سلسلہ کوہ نمک

بھیرہ سے سات کروہ کے فاصلے پر شمالی جانب ایک پہاڑ ہمارے راستے میں آیا، جسے ظفر نامہ[۲۱] اور دیگر

۱۸۔ یہ دریائے ہرو ہے۔ اسلام آباد اور دریائے سندھ کے درمیان کے سفر میں ملتا ہے۔ نیچے جا کر یہ دریائے سندھ میں مل جاتا ہے۔

۱۹۔ گوجر: یہ قبیلہ گرجستان (وسط ایشیا) سے متعلق ہے۔ ریوڑ چراتے ہوئے یہ لوگ کابل سے پنجاب، کشمیر اور گنگا جمنا کے دوآبے میں بس گئے۔ باقی کچھ درہ بولان سے گزر کر کاٹھیاواڑ میں آباد ہوگئے چنانچہ دونوں جگہ گجرات موجود ہے۔ گجرانوالہ بھی انہی کے نام پر ہے۔ ان کے شاہی خاندان کا مشہور بادشاہ مظفر گجراتی ہے جس کو خان خاناں عبدالرحیم نے اکبر کے عہد میں ۹۹۱/۱۵۸۳ء میں شکست دے کر گجرات کو فتح کیا۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۱/۷: ۵۲۶ خان خاناں نامہ ص ۲۲)

۲۰۔ دریائے سون۔ یہ راولپنڈی کے جنوب سے گزرتا ہے۔ یہ بھی آگے جا کر دریاسندھ میں مل جاتا ہے۔

۲۱۔ ظفر نامہ۔ امیر تیمور کی داستان فتح جو ۸۲۹/۱۴۲۵ء میں ابراہیم سلطان کے لئے لکھی گئی۔ یہ امیر تیمور کے پوتے تھے۔ مصنف شرف الدین علی یزدی ہیں۔ یہ بہت مشہور و معروف کتاب ہے (تھیکسٹن، ہنجری اوف پرنسیس ص ۶۳)

کتابوں میں ''کوہ جود'' لکھا گیا ہے۔ اس کی پہلے وجہ تسمیہ معلوم نہ ہوسکی تھی لیکن اب یہ علم ہوا کہ اس پہاڑ پر ایک باپ کی نسل کے دو قبیلے آباد تھے۔ ان میں سے ایک قبیلے کا نام [۲۲] جود تھا اور دوسرا جھنجوعہ [۲۳]۔ اس پہاڑ پر جو لوگ آباد ہیں اور ان اقوام وقبائل کے لوگ جو نیلاب و بھیرہ کے درمیان بسے ہوئے ہیں ان پر قدیم زمانے سے ہی اس نسل کے افراد فرمانروا چلے آرہے ہیں۔ جن کا روّیہ رعیّت کے ساتھ دوستانہ و برادرانہ ہے۔ اگر وہ چاہیں کہ اپنی مرضی سے کسی چیز کا رعیت سے مطالبہ کریں تو وہ ایسا نہیں کرسکتے۔ البتہ قدیم زمانے سے ایک رسم چلی آرہی ہے جس کے مطابق ایک خاص رقم متعیّن کردی گئی ہے چنانچہ وہ اس مقررہ رقم سے نہ زیادہ وصول کرسکتے ہیں اور نا کم، مقرر یہ ہے کہ وہ ہر مویشی پر ایک شاہرخی سکہ دیتے ہیں اور سات شاہرخی ہر گھر پر۔ ان کو لشکر کے ساتھ بھی جانا پڑتا ہے۔ (ورق ۱۹۸) جود قبیلے کی طرح جھنجوعہ قبیلے کے لوگ بھی کئی شاخوں میں تقسیم ہوگئے ہیں۔ کوہستان کشمیر و کوہ ہندوکش ایک ہی سلسلے سے پیوستہ ہیں مگر یہ پہاڑ جو بھیرہ سے سات کروہ کے فاصلے پر واقع ہے ان دونوں سلسلوں سے علیحدہ مغرب و جنوب کے درمیان دور تک چلا گیا ہے اور دریائے سندھ پر دینکوٹ کے مقام پر ختم ہوتا ہے اس میں نصف کوہستانی منطقہ جود کہلاتا ہے اور نصف جھنجوعہ۔ چنانچہ اس منطقے کو جود سے منسوب کرکے اس کا نام کوہ جود رکھ دیا ہے۔ ان میں سے سربرآوردہ معتبر شخص کو رائے کا خطاب دیا جاتا ہے۔ اس کے برادران خورد اور فرزندان کو ملک کہتے ہیں۔ جھنجوعہ قبیلے کے لوگ رشتے میں لنگر خاں [۲۴] کے ماموں ہوتے ہیں۔

دریائے سون کے نواح میں جس قوم و قبیلے کے لوگ آباد ہیں اس کے فرمانروا کو ملک ہست کہتے ہیں۔ اگرچہ اس کا اصلی نام اسد ہے لیکن ہندوستان میں بعض متحرک اعراب کو ساکن کردیتے ہیں چنانچہ خبر (بفتح اوّل و دوم)، کو خبر (بفتح اوّل وسکون دوم) تلفظ کرتے ہیں اسی لئے رفتہ رفتہ اسد (بفتح اوّل و دوم)، اسد (بفتح اوّل وسکون دوم) ہوگیا اور پھر اس لفظ نے تبدیل ہوتے ہوتے ہست کی شکل اختیار کرلی۔

لنگر خان کو ملک ہست کو بلانے کے لئے بھیجا گیا۔ وہ دوڑا ہوا آیا لنگر خاں نے اسے ہماری شفقت وعنایت کا یقین دلا کر رات کو نماز عشا کے وقت اپنے ساتھ لے کر آیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک زرہ بکتر بند گھوڑا بطور پیشکش لے کر حاضر ہوا۔ اس وقت اس کی عمر بائیس یا تئیس سال ہوگی۔ وہاں جو لوگ آباد ہیں ان کے جانوروں کے گلّے ہماری لشکرگاہ کے اطراف میں بکثرت موجود تھے۔

ہماری یہ دیرینہ آرزو تھی کہ ہندوستان کو فتح کیا جائے اور چونکہ بھیرہ، خوشاب، چناب اور چنیوٹ جیسی ریاستیں ترکوں کے تحت تصرّف رہ چکی تھیں اسی لئے ہم ان ولایات کو اپنا ہی ملک تصوّر کرتے تھے۔ اور ہمیں یہ یقین تھا کہ خواہ بزور و زبردستی یا صلح وآشتی کے ذریعے ہم ان پر قبضہ کرلیں گے۔ اس مقصد کی برآری کے لئے واجب ولازم تھا کہ اس پہاڑ پر آباد لوگوں کے ساتھ عمدہ روّیہ اختیار کیا جائے۔ چنانچہ یہ حکم جاری کیا گیا کہ کوئی شخص ان کے گلّوں کو ضرر نقصان تو کیا رسّی کے ٹکڑے اور سوئی تک کو ہاتھ نہ لگائے۔

اگلے روز صبح یہاں سے کوچ کرکے ظہر کے وقت کلر کہار نامی مقام پر پہنچ کر وہاں قیام پذیر ہوئے۔ جس کے گرد و نواح میں کشت زار ہی کشت زار تھے۔ کلر کہار کا محل وقوع یہ ہے کہ بھیرہ سے دو کروہ کے فاصلے پر کوہ جود کے درمیان ایک ہموار میدان ہے جس کے بیچ میں بارش سے جھیل بن گئی ہے جس میں پانی اطراف کے پہاڑوں سے بہہ کر جمع ہوجاتا ہے۔ اس جھیل کا محیط تقریباً تین کروہ ہوگا۔ اس کے شمال میں ایک نہایت ہی عمدہ سبزہ زار ہے۔ مغربی جانب پہاڑ کے دامن پر چشمہ ہے جس کا پانی ان پہاڑوں کی بلندیوں کے درمیان جمع ہوتا رہتا ہے جو اس جھیل سے متصل ہیں۔ چونکہ جگہ عمدہ تھی اسی لئے میں نے یہاں ایک باغ لگوایا اور اس کا نام ''باغ صفا'' [۲۵] رکھا۔ یہ باغ نہایت ہی حسین و دلکش جگہ پر واقع ہے چنانچہ اس کی تفصیل بعد میں بیان کی جائے گی۔

۲۲۔ جود۔ یہ قبیلہ اب تقریباً معدوم ہے (میکلیگن روز ص ۱۵۸)

۲۳۔ جھنجوعہ۔ آج کل کوہ نمک کے مشرقی اور وسطی حصوں میں آباد ہیں۔ گکھڑوں اور اعوانوں نے جنجوعوں کو شمال و مغرب کی طرف دھکیل دیا ہے۔ جنجوعہ کے راجہ ہی کھیوڑا کانوں کے مالک تھے جب تک کے انگریزوں نے ان کانوں پر قبضہ نہ کرلیا (میکلیگن، روز ص ۱۵۵)

۲۴۔ لنگر خاں۔ یہ بابر کا لشکری تھا اور مقامی رہبر

۲۵۔ باغ صفا۔ اس باغ کے اثرات اب بھی کلر کہار میں موجود ہیں۔ یہ شمالی پنجاب میں ہے۔ اب بھی خوبصورت جگہ ہے۔ پہاڑوں کے بیچ میں وادی اور جھیل ہے جس کے مغرب میں درختوں کے جھنڈ ہیں۔ دیکھ بھال کی کمی کی وجہ سے حالت خراب ہے۔ بہت اچھا سیر وتفریح کا مقام یہاں بنایا جاسکتا ہے۔

کلر کہار سے ہم اگلے روز صبح کے وقت سوار ہوئے۔ ہم جس وقت ہمتا تو نامی تنگ درّے سے گزر رہے تھے تو راہ میں لوگ کئی جگہ معمولی سی پیشکش لے کر حاضر ہوئے اور خدمت بجالائے۔ جو لوگ حاضر خدمت ہوئے تھے انہیں عبدالرحیم شغاول کے ہمراہ کے بھیرہ کی جانب روانہ کیا گیا کہ وہ بھیرہ کے لوگوں کو (ورق ۱۹۹) نرمی سے سمجھائیں اور ان سے یہ کہیں کہ ان ولایات کا عہد قدیم سے ترکوں کے ساتھ تعلق چلا آرہا ہے۔ وہ ہرگز اپنے دلوں میں خوف نہ لائیں اور لوگوں کو تباہی سے بچائیں کیوں اس ولایات اور یہاں کے لوگوں سے ہمارا ربط و تعلق ہے انہیں تاخت و تاراج نہیں کیا جائے گا۔

بوقت چاشت ہم تنگ درّے کے آخری سرے پر پہنچ کر وہاں قیام پذیر ہوئے۔ قربان چرخی اور عبدالملوک مستی کو سات آٹھ آدمیوں کے ہمراہ خبر لانے کے لئے آگے روانہ کر دیا گیا تھا۔ جن لوگوں کو آگے روانہ کیا گیا تھا ان میں سے ایک شخص مہدی خواجہ کا آدمی میر محمد تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک شخص کو لے کر آیا۔ اس اثنا میں افغانوں کے سربرآوردہ لوگوں میں سے چند لوگ پیشکش لے کر حاضر ہوئے اور خدمت بجالائے۔ انہیں لنگر خاں کے ہمراہ بھیرہ[۲۶] کے لوگوں کی دلجوئی کے لئے روانہ کیا گیا۔ تنگ درّے سے نکل کر ہم جنگل میں آئے۔ برانغار، جوانغار اور قول دستوں کو ترتیب دے کر ہم بھیرہ کی جانب روانہ ہوئے، جس وقت ہم بھیرہ کے نزدیک پہنچے تو دولت خان یوسف خیل کے ملازمین میں سے علی خاں، دیوہ ہندو اور سکتو کا دوسرا لڑکا بھیرہ کے سرداروں کے ہمراہ ایک گھوڑا بطور پیشکش لے کر آئے اور خدمت بجالائے۔ نماز ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔ بھیرہ پہنچ کر ہم نے اس بات کا خیال رکھا کہ یہاں کے لوگوں کے لئے باعث زحمت و تکلیف نہ ہوں اور اس کے مشرق میں دریائے بہت[۲۷] کے کنارے قیام پذیر ہوئے۔

جس وقت تیمور بیگ ہندوستان سے واپس ہوئے اس وقت سے بھیرہ، خوشاب، اور چنیوٹ نامی ولایات آل تیمور کے تحت تصرّف چلی آرہی تھیں۔ اور ان کے جانشین ولواحقین ان پر حکومت کرتے چلے آرہے تھے۔ سلطان مسعود مرزا ولد سیور غتمش شاہرخ کا پوتا تھا۔ وہ کابل و زابل صوبوں کا حکمران تھا اس لئے اسے سلطان مسعود حسین کابلی کہا کرتے تھے۔ جن لوگوں کی اس نے تربیت کی تھی ان میں میر علی بیگ کے تین لڑکے بابا کابلی، دریا خاں اور اپاق خاں بھی شامل تھے۔ آپاق خاں کو لوگ بعد میں غازی خاں بھی کہنے لگے تھے۔ سلطان مسعود مرزا اور اس کے لڑکے علی اصغر مرزا کی وفات کے بعد ان تینوں کا صوبہ جات کابل و زابل اور ہندوستان کی مذکورہ بالا ریاستوں پر غلبہ و تسلّط ہو گیا۔

۹۱۰ھ میں پہلی مرتبہ کابل سے میں اس داعوے کے ساتھ روانہ ہوا کہ ہندستان کی جانب رخ کروں۔ درّہ خیبر کو عبور کر کے میں پشاور پہنچ گیا۔ لیکن باقی چغانیانی کی سعی و کوشش سے ہم بنگش کی آخری سرحد کوہاٹ تک پہنچ گئے۔ افغانستان کے ایک بہت وسیع حصے، بنّو اور دشت کو تاخت و تاراج کرتے ہوئے ڈوگی پہنچ گئے۔ اس وقت بھیرہ، خوشاب اور چناب کی حکومت سیّد علی خاں بن غازی خاں بن میر علی بیگ کے تحت تصرّف تھی۔ اور چونکہ وہ اسکندر بہلول کا مطیع و تابع تھا اسی لئے خطبہ اسی کے نام کا پڑھا جاتا تھا۔ ہمارے سواروں کی آمد سے اس پر ایسا خوف طاری ہوا کہ وہ بھیرہ سے چلا گیا اور دریائے بہت کو عبور کر کے ضلع بھیرہ کے گاؤں شیر کوٹ میں اپنا مسکن بنا لیا۔ افغان اسے پسند نہیں کرتے تھے اسی لئے ایک دو سال کے بعد وہ اس کی طرف سے بدظن ہو گئے۔ اور چونکہ ان کے دلوں میں خوف غالب آگیا تھا (ورق ۲۰۰) اس لئے انہوں نے یہ ولایت، تاتارخان یوسف خیل کے فرزند دولت خان کے حوالے کر دی جو اس وقت حاکم لاہور تھا۔ دولت خان نے بھیرہ اپنے بڑے لڑکے علی خان کی تحویل میں دے دیا تھا۔ اس وقت بھیرہ پر علی خان کی ہی حکومت تھی۔ دولت خان کا باپ تاتار خان ان چھ سات سرداروں میں شامل تھا جنہوں نے علم بغاوت بلند کر کے ہندستان پر قبضہ کیا اور بہلول کو اپنا

۲۶۔ بھیرہ دو لفظوں "بھے" اور "ہرہ" سے مل کر بنا ہے۔ بھے کے معنی ڈر و خوف اور ہرہ سے مراد پاک کے ہیں۔ اس طرح بھیرہ کا مطلب ہوا ایسی جگہ جہاں ڈر اور خوف نہ ہو (تذکرہ صاحب زادہ ابرار احمد گلوی ص ۳)

۲۷۔ دریا بہت۔ یہ دریا جہلم کا پرانا نام ہے۔

بادشاہ تسلیم کر لیا۔ بھیرہ اور دوسری ولایات جو دریائے ستلج کے شمال میں واقع تھیں تاتار خان کے تحت تصرّف تھیں۔ ان ولایات سے کل آمدنی تین کروڑ درم سے زیادہ تھی۔ تاتار خاں کی وفات کے بعد سلطان سکندر نے اپنی دورِ حکومت میں ان ولایات سے تاتار خان کے لڑکوں کو بے دخل کر دیا۔ ہمارے کابل میں پہنچنے سے دو سال قبل بس ایک لاہور ہی تھا جو دولت خان کو دے دیا گیا تھا۔

اگلے روز صبح بعض مناسب جگہوں پر حملہ آور دستے بھیجے گئے۔ اسی روز میں بھیرہ کی سیر کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ سنکر خاں جھنجوعہ نے اسی روز حاضر ہو کر گھوڑا پیش کیا اور خدمت بجالایا۔

بدھ کے دن ۲۲ تاریخ کو بھیرہ کے سرداروں اور چودھریوں کو طلب کیا گیا۔ اس امر پر اتفاق ہوا کہ وہ اپنے جان و مال کی حفاظت کے لئے چار لاکھ شاہرخی ادا کریں، جس کے لئے محصّل مقرر کئے گئے۔ اس کے بعد میں سوار ہوا اور سیر کرنے کی خاطر نکلا۔ ایک جگہ کشتی میں بیٹھ کر معجون کی چسکی لی۔ بلوچ [۲۸] لوگوں کے پاس جو ولایات بھیرہ اور خوشاب میں آباد ہیں حیدر علمدار کو بھیجا گیا۔ وہ گل بادام کے رنگ کا ایک تپچاق گھوڑا بطور پیشکش اپنے ساتھ لایا اور میری خدمت میں حاضر ہوا مجھ سے عرض کیا کہ اہل لشکر بھیرہ کے لوگوں کے ساتھ بدسلوکی پر اتر آئے ہیں اور ان کے مال پر دست اندازی کر رہے ہیں۔ چند لوگوں کو ان کی گرفت کے لئے بھیجا گیا اور جن لوگوں نے بدسلوکی کی تھی انہیں ان کے کئے کی سزا دی گئی۔ جن میں سے چند کی ناک میں شگاف لگا کر کے انہیں لشکر گاہ کے گرد چکر لگانے کے لئے کہا گیا۔ [۲۹]

ایلچی کی ہندستان روانگی

وہ ولایات جو ترکوں کی تحت تھیں چونکہ ہمارے تحت آ گئی تھیں اس لئے ان کا تاخت و تاراج نہیں کیا گیا۔ وہاں کے لوگ اس امر پر متفق رہے کہ مصالحت کی غرض سے ایلچی اس پیغام کے ساتھ روانہ کیا جائے کہ وہ ولایات جو ترکوں کے تحت تھیں انہیں سپرد کر دو۔ چنانچہ ملا مرشد کو ایلچی مقرر کر کے سلطان ابراہیم کے پاس روانہ کیا گیا۔ اس کے باپ سکندر کا انتقال پانچ چھ دن پہلے ہی ہوا تھا اور حکومت سلطان ابراہیم کو ورثے میں ملی تھی۔ اسے اس پیغام کے ساتھ بھیجا گیا کہ وہ ولایات جو قدیم زمانے سے ترکوں سے متعلق چلی آ رہی ہیں وہ میرے حوالے کر دی جائیں۔ وہ خطوط جو دولت خان اور سلطان ابراہیم کے نام لکھے گئے تھے اس کے سپرد کئے گئے۔ اور اس کے علاوہ کچھ زبانی پیغام بھی دے کر ملا مرشد کو رخصت کیا گیا۔

ہندستان کے لوگ بالخصوص افغان عجب بے عقل و خرد اور رائے و تدبیر سے بیگانہ واقع ہوئے ہیں۔ انہیں نہ تو سرکشی و بغاوت کے طور طریقے آتے ہیں اور نا ہی وہ دوستی کر سکتے ہیں۔ اس شخص کو جسے ایلچی بنا کر بھیجا گیا تھا دولت خان نے لاہور میں، نا تو اس سے ملاقات کی اور نا ہی اسے ابراہیم کے پاس جانے کی اجازت دی۔ وہ شخص اپنے ساتھیوں کے ساتھ کئی دن تک لاہور میں مقیم رہا لیکن (ورق ۲۰۱) جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو واپس کابل آ گیا۔

بروز جمعہ خوشاب کے لوگوں کی عرض داشت پہنچی۔ شاہ حسین ولد شاہ شجاع ارغون کو وہاں بھیجنے کے لئے متعین کیا گیا۔ ہفتے کے دن ۲۵ تاریخ وہ خوشاب کی جانب روانہ ہوا۔ اتوار کے دن ایسی موسلا دھار بارش ہوئی کہ تمام دشت پانی سے بھر گیا۔ بھیرہ اور ان پہاڑوں کے درمیان جہاں سے اتر کر ہم نیچے آئے تھے ایک پتلا سا نالہ تھا، ظہر کے وقت اس کا پاٹ اتنا چوڑا ہو گیا کہ اچھی خاصی بڑی جھیل بن گیا۔ بھیرہ کے آس پاس تیر کی رسائی سے زیادہ فاصلے پر کہیں کوئی گھاٹ نہ تھا چنانچہ تیر کر لوگوں نے اس نالے کو پار کر لیا۔ ظہر و عصر کے درمیان

۲۸۔ بلوچ قوم کی تاریخ پر مکمل اتفاق نہیں۔ سامی النسل۔ ان کا اصل وطن بحیرہ خزر اور بحیرہ اسود کا درمیانی اور ساحلی علاقہ ہے۔ ایران، پاکستان اور افغانستان میں ان کی آبادی ہے ان میں خانہ بدوش قبائل اب بھی ملتے ہیں۔ بلند کردار و دلیر قوم ہے۔ سندھ اور پنجاب میں ہجرت اور حکمرانی بھی کرتے رہے ہیں (اردو دائرہ ۸۶۰)

۲۹۔ ناک میں شگاف۔ اس سزا میں ناک کے نتھنے کو کاٹا جاتا ہوگا۔ تاکہ جرم عیاں نظر آئے۔

میں اس پانی کی سیر کرنے کے لئے گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا۔ بارش اور ہوا اس قدر تیز تھی کہ ہمیں یہ گمان ہونے لگا کہ شاید واپس لشکر گاہ تک نہ پہنچ سکیں۔ لاچار ہم بھی پانی میں اترے اور گھوڑوں کو تیرا کر اس جھیل کو پار کیا۔ لشکر کے آدمیوں پر بھی خوف و ہراس طاری تھا۔ چنانچہ ان میں سے بیشتر لوگوں نے اپنا اپنا ڈیرہ، خیمہ اور بھاری ساز و سامان پیچھے چھوڑ دیا۔ خود زرہ بکتر، اسلحہ، زین اور گھوڑوں کے ساز کو کندھوں پر لاد کر گھوڑوں کو ننگی پیٹھ تیراتے ہوئے اس دشت سے نکلے۔ دشت میں ہر جگہ پانی ہی پانی تھا۔ اگلے دن صبح کے وقت دریا سے کشتیاں لائی گئیں۔ لشکر کے اکثر و بیشتر لوگ اپنے خیمے اور سامان کو اس پر لاد کر خود بھی اس پر سوار ہوئے۔ قوچ بیگ کے آدمی پانی کے بہاؤ کے خلاف اوپر کی جانب روانہ ہوئے۔ ایک کروہ شرعی جانے کے بعد نماز مغرب کے وقت انہیں گھاٹ نظر آیا جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے انہوں نے اس گھاٹ پر سے نالے کو پار کیا۔ بھیرہ کے قلعے کو جہاں نما[30] کہتے ہیں ہم نے اس میں ایک دن قیام کیا۔ منگل کے دن صبح کے وقت ہم نے یہاں سے کوچ کیا، بارش اور سیلاب کے خوف سے ہم ان پہاڑوں پر قیام پذیر ہوئے جو بھیرہ کے نزدیک اس کے شمال میں واقع ہیں۔ بھیرہ کے لوگ اس رقم کو پیش کرنے میں جس کی ادائیگی انہوں نے قبول کر لی تھی لیت و لعل سے کام رہے تھے۔[31] چنانچہ اس پورے منطقے کو چار سرکار میں تقسیم کیا گیا اور ہر سرکار پر ایک امیر کا تقرر عمل میں آیا۔ اس اعتبار سے ایک سرکار پر خلیفہ کا تعین ہوا۔ دوسری پر قوچ بیگ کا، تیسری پر دوست ناصر کا اور چوتھی پر سید قاسم و محب علی کو مقرر کیا گیا۔

ہندال کی پیدائش

جمعہ ۲ شعبان شیباق پیادہ اور درویش پیادہ (یہ شخص اب تفنگ انداز ہے) کابل سے عرضداشتوں کے ساتھ ہندال کی ولادت کا مژدہ لے کر حاضر ہوئے۔ چونکہ یہ خوشخبری ہندستان کی تسخیر کے دوران لائی گئی تھی اسی لئے اس خبر کو نیک فال جان کر میں نے اس نوزاد بچے کا نام ہندال رکھ دیا۔[32] اسی اثنا میں قنبر بیگ نے بلخ سے محمد زماں کے بارے میں عرضداشتیں روانہ کیں۔

اگلے دن صبح، دیوان برخاست کرنے کے بعد میں سیر کے لئے روانہ ہوا۔ کشتی میں سوار ہو کر بادہ نوشی کی محفل آراستہ کی گئی۔ جس میں خواجہ دوست خاوند، خسرو، میرم، مرزا قلی، محمدی، گدا، نعمان، لشکر خاں، روح دم، قاسم علی تریاکی، یوسف علی اور تنگر قلی شریک تھے۔ کشتی کے سرے پر کمرہ ہوا بنا ہوا تھا، جس کی چھت ہموار تھی۔ میں چند لوگوں کے ساتھ اس پر بیٹھا ہوا تھا۔ چند لوگ اس کے نیچے کمرے میں بیٹھے۔ کشتی کی جس طرف دُم تھی وہاں بھی بیٹھنے کی جگہ تھی۔ محمدی، گدائی اور نعمان وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ نماز عصر تک بادہ پیائی کا یہ دور چلتا رہا۔ شراب کی تلخی سے تنگ آ کر ہم نے معجون کی چسکی لینا شروع کر دی۔ جو لوگ اس کشتی میں سوار تھے انہیں یہ علم نہ تھا کہ میں معجون کے مزے لے رہا ہوں۔ اسی لئے وہ میخواری میں مشغول رہے۔ نماز عشا کے وقت ہم کشتی سے اتر کر گھوڑوں پر سوار ہوئے (ورق ۲۰۲) اور واپس لشکر گاہ میں پہنچ گئے۔ اس وقت محمدی اور گدائی یہ تصور کر رہے تھے کہ میں اب بھی کیف بادہ نوشی سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ چنانچہ اس خیال کے پیش نظر کہ حق خدمت بحسن و خوبی بجالائیں شراب کا وہ خم گھوڑے پر سے اتار لائے جسے باری باری ساتھ لے کر وہ چل رہے تھے۔ عجیب کیف و سرور کی حالت میں وہ میرے پاس پہنچے اور انہوں نے جتا کر کہا کہ ایسی سیاہ رات میں اس خم کو باری باری اٹھا کر یہاں تک لے آئے ہیں لیکن انہیں جلدی ہی اس بات کا علم ہو گیا کہ یہاں رنگ محفل کچھ جدا ہے۔ کچھ لوگ افیون کی پینگ میں مگن ہیں اور کچھ شراب کے نشے کے باعث مست۔ چونکہ افیونچیوں کی سنگت اور محفل بادہ خواری کے درمیان کوئی تال میل نہیں اسی لئے وہ اپنے کئے پر بہت پشیمان ہوئے۔ اس پر میں نے کہا کہ اس محفل کو درہم برہم نہ کرو۔ جس کا جی چاہے بادہ نوشی کرے اور جس کا دل چاہے معجون کی چسکیاں لے مگر کوئی شخص

۳۰۔ جہاں نما: اس قلعہ کے اب کوئی آثار باقی نہیں۔ ہم نے پرانے بھیری کے آس پاس کافی تلاش کیا۔

۳۱۔ بھیرہ کے لوگوں پر جو خراج لگایا گیا تھا اس کی طرف اشارہ ہے۔

۳۲۔ ہندال: بابر کے امرا میں ہندو بیگ تو پہلے ہی موجود تھے۔ لیکن نومولود بھی کیونکہ ہند کی تسخیر کے دوران پیدا ہوئے اس لئے بابر نے ہند کی یہ دوسری صفت بنا کر ان کو ہندال کر دیا۔

دوسرے پر کسی قسم کا اعتراض نہ کرے۔ چنانچہ ان میں سے بعض مے نوشی میں مشغول ہو گئے اور بعض نے معجون کی چسکیاں لینی شروع کر دیں۔ چنانچہ کچھ عرصے تک صحبت و گفتگو پر تکلف کا رنگ غالب رہا۔ اس وقت بابا جان قبوز نوازکشی میں نہ تھا۔ جس وقت ہم سفید خیمہ گاہ میں پہنچے تو اسے طلب کیا گیا اور اسے بھی بادہ خواروں میں شامل کر لیا گیا۔

بادہ خواروں نے عالم مستی میں ہر طرف شور غوغا بپا کرنا شروع کر دیا۔ ان کا بیشتر اعتراض افیون اور افیونچیوں پر تھا۔ اس وقت بابا خاں بھی مستی کے عالم میں تھا۔ وہ بھی پراگندہ گفتگو کرنے لگا۔ شراب کے متوالوں نے تردی محمد کو پے در پے جام بھر بھر کر پلانا شروع کر دیئے۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی بہکی بہکی باتیں کرنے لگا۔ اس امر کی ہر ممکن کوشش کی گئی کہ آپس میں صلح وصفائی ہو جائے لیکن اس وقت کچھ پیش نہ گئی۔ آپس میں اس قدر زیادہ بحث وتکرار بڑھی کہ مجلس کا سارا مزہ کرکرا ہو گیا اور یار ہم نشین ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔

اس مہینے کی پانچ تاریخ کو بروز پیر ولایت بھیرہ ہندو بیگ کے سپرد کر دی گئی اور ولایت چناب حسین اکراک کو عطا کر دی گئی۔ اس کے بعد حسین اکراک اور چناب کے لوگوں کو رخصت کیا گیا۔ ان ہی دنوں سید علی خاں کے فرزند منوچہر خاں نے ہمیں ہندوستان سے آنے کی اطلاع دی۔ جس وقت وہ بالائی راہ سے آرہا تھا اس کی ملاقات تاتار خاں گھکڑ[۳۳] سے ہو گئی۔ اس نے منوچہر کو آگے جانے کی اجازت نہیں دی بلکہ اسے اپنے ہمراہ رکھا اور اپنی بیٹی کو اس کے حبالۂ نکاح میں دے کر اسے اپنی دامادی میں قبول کر لیا۔ کچھ عرصے تک وہ اپنے سسر کے ساتھ رہ کر میری خدمت میں حاضر ہوا۔ نیلاب و بھیرہ کے درمیان جو کوہستانی سلسلہ واقع ہے اس میں جود اور جھنجوعہ قبائل کے علاوہ جاٹ[۳۴]، گوجر نیز دیگر قوم و برادریوں کے لوگ بھی کثیر تعداد میں آباد ہیں اور ان کی آبادیوں کا یہ سلسلہ ان پہاڑوں تک چلا گیا ہے جو کشمیر سے متصل ہیں۔ وہ ہر پشتے اور درّے میں گاؤں بسا کر وہاں آباد ہیں۔ ان کا حاکم گھکڑ قبیلے کا فرد ہے۔ ان کی حکومت کا نظام بھی جود و جھنجوعہ کے قبائل جیسا ہی ہے۔ اس وقت ان لوگوں پر جو پہاڑ کے دامن میں آباد ہیں تاتار گھکڑ اور ہاتھی گھکڑ کی حکومت تھی جو رشتے میں ایک دوسرے کے چچازاد بھائی ہیں۔ درّوں اور گھاٹیوں پر ان کا پورا قبضہ ہے۔ تاتار کی حکومت کا مرکز پرہالہ ہے، جو برف سے ڈھکے پہاڑوں سے نیچے واقع ہے۔ جو ولایات پہاڑ سے متصل ہیں ان میں سے ایک کالنجر ہے۔ یہ ولایت بابو خاں سے متعلق تھی۔ جسے ہاتھی گھکڑ نے اپنے علاقے میں شامل کر لیا۔ تاتار گھکڑ نے دولتِ خان سے ملاقات کی۔ وہ دولت خاں سے جس طرح پیش آیا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کا مطیع وفرمانبردار ہے۔ مگر ہاتھی کی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اس بنا پر اس نے سرکشی کا روّیہ اختیار کر رکھا تھا۔ تاتار نے ہندوستان کے امرا سے گفتگو کرنے کے بعد ان کے مشورے سے ہاتھی سے کچھ فاصلے پر لشکر بٹھا کر محاصرہ کر لیا۔ (ورق ۲۰۳) جس وقت ہم بھیرہ میں مقیم تھے اس وقت ہاتھی نے شکار کے بہانے سے اچانک تاتار پر حملہ کر دیا۔ اسے قتل کرنے کے بعد اس نے اس کے حرم کی عورتوں نیز مال و دولت پر قبضہ کر لیا۔

ظہر کی نماز کے وقت میں سیر کے لئے گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا۔ کشتی میں بیٹھ کر بادہ نوشی کی گئی۔ اس وقت دوست بیگ، مرزا قلی، احمدی، گدائی، محمد علی جنگ جنگ اور اوغان بیردی مغل شریک محفل تھے۔ روح دم، بابا خاں، قاسم علی تینگر قلی، ابوالقاسم، رمضان لولی نغمہ نوازی کر رہے تھے۔ عشا کے وقت تک دور بادہ پیمائی جاری رہا۔ اس کے بعد ہم انتہائی کیف و مستی سے اتر کر کنارے پر آئے اور اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ میں مشعل ہاتھ میں لئے دریا کے کنارے کنارے خیمہ گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ کیف مستی کا یہ عالم تھا کہ گھوڑے کی پیٹھ پر کبھی جھوم کر ایک طرف جھک جاتا اور کبھی دوسری طرف۔ میں نے گھوڑے کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دی تھیں جس کے باعث وہ سرپٹ دوڑ رہا

۳۳۔ گکر (گکھڑ) یہ قبیلہ راولپنڈی، اٹک، جہلم، ہزارہ اور چناب کے مغرب اور ریاست جموں کے علاقوں میں آباد ہے۔ زیادہ تر زراعت پیشہ ہیں۔ یہ اپنا سلسلہ کے گوھر سے شروع کرتے ہیں جو اصفہان کا بادشاہ تھا۔ کئی نسلوں تک ان کی حکمرانی تبت پر رہی اور پھر کابل بھی ان کے زیر اقتدار رہا۔ ناصر الدین سبکتگین سے ان کے ایک حکمراں سلطان قابل کی لڑائی اور پھر دوستی ہو گئی تھی۔ سلطان محمود غزنوی کے ساتھ سلطان قابل کا بیٹا گھکڑ شاہ ہمراہ تھا۔ اسی کے نام پر قبیلہ ہے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ)

۳۴۔ جاٹ۔ یہ قبیلہ پنجاب، سندھ، راجستھان اور یوپی میں ملتا ہے۔ یہ آریائی نسل سے ہیں۔ دراز قد، گٹھا ہوا جسم مضبوط اور سانولہ رنگ۔ ان میں مسلمان سکھ اور ہندو تینوں شامل ہیں۔ زیادہ تر مسلمان اورنگزیب کے بعد کے دور میں ہوئے۔ جاٹ گنوارہ پن اور بے وقوفی میں ضرب المثال ہیں۔ ہم جنسوں کے مقابلے میں اپنی بھینسوں اور گائیوں کا کہیں زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ دلیر اور اچھے سپاہی ہوتے ہیں (اردو دائرہ معارف اسلامیہ)

تھا۔ مجھ پر عجیب مستی طاری تھی۔ اگلے دن صبح مجھے تفصیل سے بتایا گیا کہ میں کس طرح مشعل ہاتھ میں لئے ہوئے خیمہ گاہ تک پہنچا۔ مجھے قطعی یہ باتیں یاد نہ تھیں۔ خیمے میں پہنچنے کے بعد میں نے بہت قے کی۔

بروز جمعہ سیر کرنے کے لئے گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا۔ کشتی کے ذریعے دریا پار کیا۔ دریا کے اس پار باغوں اور شگوفوں کی سیر کرتا ہوا ان کھیتوں تک پہنچ گیا جہاں گنے کی کاشت کی جاتی ہے۔ کسانوں کے ڈول اور ان کی چرخیاں وہاں نظر آئیں جن سے ہم نے پانی کھینچا اور ان سے دریافت کیا کہ وہ کسی طرح پانی کھینچتے ہیں۔ ان سے محض پوچھا ہی نہیں بلکہ ان سے بار بار کہا کہ پانی کھینچ کر دکھائیں۔[۳۵] سیر کے دوران معجون کی چسکیاں لی گئیں وہاں سے واپس ہو کر ہم پھر کشتی میں سوار ہوئے۔ معجون کی چسکیوں میں منوچہر خاں کو بھی شریک کر لیا گیا۔ وہ افیون کا ایسا عادی ہو چکا تھا کہ جس وقت اس پر نشہ سوار ہوتا تو دو آدمی بازو سے پکڑ کر اس کو سہارا دیتے تو وہ اپنی جگہ کھڑا رہ سکتا تھا۔ کچھ دیر کے لئے بیچ دریا میں لنگر ڈال دیا گیا جس کے باعث کشتی اپنی جگہ رک گئی۔ اس کے بعد پانی کے بہاؤ کی طرف ہم بہت دور تک نکل گئے۔ پھر دوبارہ کشتی کو اوپر کی جانب کھینے کا حکم دیا گیا۔ وہ رات ہم نے کشتی میں ہی سو کر بسر کی اور صبح واپس خیمہ گاہ میں آئے۔

دس ربیع الاول بروز ہفتہ آفتاب برج محل میں داخل ہوا۔ اسی دن ظہر کے وقت ہم گھوڑے پر سوار ہوئے اور کشتی میں پہنچ گئے جہاں میکشی کی گئی۔ اس محفل میں خواجہ دوست خاوند، دوست بیگ، میرم، مرزا قلی، محمدی، احمدی، یونس علی، محمد علی جنگ جنگ، گدای طغائی، میر خورد اور عیسی شامل تھے۔ مجلس نغمہ و سرود گرم کرنے کے لئے روح دم، بابا جان، قاسم علی، یوسف علی، تنگری قلی، رمضان ازبک اور شاہ خیالی جمع ہو گئے تھے۔ کچھ عرصے تک پانی کے بہاؤ کی طرف کشتی کو کھیتے رہے۔ جس جگہ ہم کشتی پر روانہ ہوئے تھے اس سے کافی دور تک ہم نیچے کی طرف آ گئے تھے اور اسی وجہ سے دیر سے واپس خیمہ گاہ میں پہنچے۔

شاہ حسین اسی دن خوشاب سے واپس آیا جہاں اسے ایلچی بنا کر بھیجا گیا تھا اور ان ولایات کا مطالبہ کیا گیا تھا جو قدیم زمانے سے ترکوں کی ملکیت چلی آ رہی تھیں۔ صلح کی بات درمیان میں لائی گئی۔ وہ رقم جس کے وصول کرنے کی توجیہ پیش کی گئی تھی وہ ذرا بھی ہاتھ نہ آئی۔ گرمی کا موسم قریب آ چلا تھا۔ ہندو شاہ کی مدد کے لئے شاہ محمد مہردار، اس کے چھوٹے بھائی دوست مہردار اور بعض مناسب جوانوں کو متعین کیا گیا اور ہر شخص کو اس کی حیثیت کے مطابق استقامت و پائیداری کے لئے مخصوص رقم عطا کی گئی۔ لشکر خاں چونکہ اس یورش میں ساعی و کوشاں رہا تھا اور اصلی محرک بھی وہی تھا (ورق ۲۰۴) اسی لئے خوشاب کا علاقہ اسے عطا کر کے اعزازی پرچم سے نوازا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے بھی ہندو بیگ کی مدد کے لئے متعین کر دیا گیا۔ ترک سپاہ کی ایک جماعت اور ان مقامی سپاہ کو جو بھیرہ میں مقیم تھی اس کے مخارج معاش میں اضافہ کیا گیا اور انہیں بھی ہندو بیگ کی مدد کے لئے مقرر کر دیا گیا۔ جن لوگوں کو وہاں متعین کیا گیا تھا ان میں ایک منوچہر خاں تھا جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ دوسرا شخص نظر علی ترک تھا اس کی منوچہر خاں کے ساتھ قرابت داری تھی۔ دیگر دو اشخاص سنگر خاں جنجوعہ اور ملک ہست جنجوعہ تھے۔ اس ولایت کے انتظامی امور کو متعین کر کے یہ امید رکھتے ہوئے کہ یہاں صلح کی کیفیت برقرار رہے اتوار کے دن بتاریخ گیارہ ربیع الاول ہم نے بھیرہ سے کوچ کیا اور کابل کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں کلر کہار پر قیام کیا۔ جس دن ہم وہاں پہنچے اس دن بھی بڑے عجیب و غریب طریقے سے پانی برس رہا تھا۔ برساتی کا ہونا یا نا ہونا یکساں تھا۔ لشکر گاہ کا دہرہ جو آخری سرے پر تھ نماز عشا کے بعد پہنچا۔

ہاتھی گھکڑ کے خلاف مہم

جو لوگ ان ولایات کی بود و باش سے واقف تھے بالخصوص جنجوعہ قبیلے کے افراد جو عہد قدیم سے گھکڑ قبیلے کے دشمن چلے آ رہے تھے نے بتایا کہ گھکڑ قبیلے کے افراد میں ہاتھی گھکڑ نہایت ہی بدسرشت واقع ہوا ہے۔ وہ

۳۵۔ رہٹ۔ بابر پہلی دفعہ رہٹ دیکھ رہا ہے۔ فرغنہ میں کھیتوں کو پانی ندی نالوں سے ملتا ہے رہٹ کا وہاں رواج نہیں۔ آر، ناتھ کا کہنا ہے کہ رہٹ خاص ہندوستانی ایجاد ہے اور ہزاروں سال سے یہاں رائج ہے۔ اسکو پرشیں وہیل کہنا غلط ہے (آر، ناتھ۔ رہنٹ یا پرشین وہیل ص ۸۲)

قبیلے کے لوگوں کی راہزنی کر کے انہیں تباہ وتاراج کئے ہوئے ہے۔ کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ اس کو یہاں سے نکال دیا جائے یا سختی کے ساتھ تنبیہ کی جائے۔ اس اتفاق واتحاد کے بعد اگلے دن صبح خواجہ میر میران اور میرم ناصر کا لشکر گاہ پر متعین کیا گیا اور دن چڑھے وہاں سے روانہ ہو کر ہم نے ہاتھی گھکڑ کو شکست دینے کے لئے ولایت پرہالہ[۳۶] کی جانب رخ کیا کیونکہ اس نے چند روز قبل ہی تاتار کو قتل کر کے اس کی ولایت پر قبضہ کر لیا تھا۔ ظہر کے وقت ہم وہاں پہنچ کر قیام پذیر ہوئے۔ گھوڑوں کو چارہ پانی دے کر عشا کے وقت وہاں سے اپنے گھوڑوں پر روانگی اختیار کی۔ ہمارا رہبر ملک ہست کا سرپرنامی گوجر تھا۔ رات کے وقت سفر بخیر وخوبی طے کر کے صبح قیام پذیر ہوئے۔ بیگ محمد مغل کو واپس لشکر گاہ کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ دن کی روشنی میں ہم دوبارہ سوار ہوئے۔ چاشت کے وقت ہم زرہ بکتر پہن کر تیزی کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ابھی ہم پرہالہ سے ایک کروہ کے فاصلے پر ہی تھے کہ اس کے حوالی وآثار نظر آنے لگے۔ تاخت وتاراج کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ برانغار پہلو پرہالہ کے مشرق میں چلا گیا۔ قوچ بیگ چونکہ برانغار کی جانب تھا اسی لئے عقب سے اسے کمک پہنچائی گئی۔ جوانغار پرے کے لوگوں کو بھی کمک فراہم کی گئی۔ جوانغار اور غول کی سپاہ نے پرہالہ پر حملہ کر دیا۔ دوست کو ہدایت کی گئی کہ وہ جوانغار کے عقب سے کمک پہنچائے۔

پرہالہ دراصل تنگ گہرے درّوں کے درمیان واقع ہے۔ اس تک پہنچنے کے دو راستے ہیں۔ ان میں سے ایک تو جنوب مشرق میں ہے اور یہ وہی راستہ ہے جس سے ہم گزرے۔ یہ راستہ ایسے درّوں کے اوپر سے گزرتا ہے جس کی دونوں جانب شہر کے دروازے تک گہری گھاٹیوں کے علاوہ ایسے تنگ راستے ہیں جن پر سے صرف ایک سوار گزر سکتا ہے وہ بھی تیر کی رسائی تک۔ اسی لئے راستہ انتہائی احتیاط کے ساتھ طے کیا۔ دوسرا راستہ اس کے شمال مغرب میں ہے جو کشارہ درّے کے درمیان سے گزرتا ہے۔ یہ راستہ بھی اتنا تنگ ہے کہ بس ایک آدمی ہی اس پر سے گزر سکتا ہے۔ ان دو راستوں کے علاوہ یہاں تک پہنچنے کے لئے اور کوئی راہ نہیں۔ اگرچہ اس کے گرد فصیل اور کنگورے نہیں ہیں تاہم یہ جگہ ایسی بھی نہیں جہاں زور آزمائی کی جا سکے۔ اس کے اطراف میں سات آٹھ ایسے درّے ہیں جن کا عرض تیر کی رسائی تک ہے۔ (ورق ۲۰۵) جوانغار کے لوگ تنگ راہوں سے گزر کر دروازے پر پہنچے اور اس کو گرا کر اندر داخل ہو گئے۔ ہاتھی کے تیس چالیس بکتر پوش سپاہیوں نے جن کے گھوڑے بھی برگستوان[۳۷] سے لیس تھے بہت سے پیادوں کے ساتھ ہمارے حملے کو پسپا کر دیا۔ دوست بیگ کو چونکہ عقب سے کمک پہنچانے کے لئے متعین کیا گیا تھا۔ وہ وہاں پہنچ گیا اور خوب زور آزمائی کی اس نے بہت سے سواروں کو ان کے گھوڑوں پر سے اتار دیا اور دشمن کو زیر کر لیا۔ ہاتھی گھکڑ وہاں کے لوگوں میں اپنی مردانگی کے لئے مشہور تھا۔ اگرچہ اس نے بہت زیادہ جنگ وجدال کی مگر چونکہ استقامت وپائیداری نصیب نہ ہو سکی اسی لئے فرار ہو گیا۔ وہ تنگ درّوں میں بھی اپنی جگہ قائم نہ رہ سکا اور جب اس نے قلعے کی جانب رخ کیا تو وہاں بھی وہ قلعے کو مستحکم نہ کر سکا۔ حملہ آور اس کے عقب سے قلعے میں داخل ہو گئے اور وہ اس دروازے سے جو شمال مغرب میں واقع تھا تن تنہا بھاگ نکلا۔ یہاں بھی دوست محمد نے خوب اپنی مردانگی کے جوہر دکھائے۔ اور خوب نام پیدا کیا۔

اسی اثنا میں میں بھی قلعے میں داخل ہو گیا اور تاتار کے گھر میں قیام پذیر ہوا۔ چونکہ بہت سے حملہ آور سپاہی میرے ساتھ ہو گئے تھے اسی لئے ان کے قیام کا بھی بندوبست کیا گیا۔ لیکن بعض حملہ آور ایسے بھی تھے جو مجھ سے علیحدہ ہو کر آگے چلے گئے تھے۔ ان میں امین محمد راؤ، قراچہ راؤ اور ترخان ارغون شامل تھے۔ چنانچہ اس جرم کی پاداش میں انہیں سرپا گوجر کی زیر نگرانی لشکر گاہ کے سامنے وسیع میدان میں بے سروپا، عبا وقبا چھوڑ دیا گیا۔ اگلے دن صبح ہم نے شمال مغرب میں واقع تنگ درّوں کو عبور کیا اور ایک جگہ کشت زار میں پہنچ گئے۔ ولی خزانچی کے ہمراہ چند جوانوں کو ساز وسامان کے ہمراہ لشکر گاہ کی جانب روانہ کیا گیا۔

۳۶۔ پرہالہ۔ راولپنڈی کے شمال میں تقریباً ۳۰ کلومیٹر پر یہ قلعہ دریا سون کے کنارے ہے۔ خوبصورت علاقہ ہے۔ اس قلعہ کے آثار اب بھی باقی ہیں۔ آدھا قلعہ پہاڑ پر اور آدھا اس کے نیچے میدان میں ہے۔ آج کل اس قلعہ کے اندر گاؤں آباد ہے جس کا نام بھی پرہالہ ہے۔

۳۷۔ برگستواں۔ گھوڑوں کی زرہ بکتر۔ جو لوہے کی چوڑیوں کو ایک دوسرے میں پرو کر بنائی جاتی تھی۔

پندرہ تاریخ کو جمعہ کے دن ہم اندانہ نامی مقام پر جو دریائے سون کے کنارے واقع ہے قیام پذیر ہوئے۔ قلعہ اندرانہ عہد قدیم سے ملک ہست کے والد سے متعلق چلا آرہا تھا لیکن جب ہاتھی گھکڑ نے ملک ہست کے باپ کو قتل کیا تو یہ قلعہ ویران ہو گیا، ان دنوں میں بھی یہ ویران تھا۔ لشکر گاہ کے لوگ جو کلر کہار پر ہم سے علیحدہ ہو گئے تھے عشاء کے وقت ہم سے آن ملے۔

جب تاتار کے قلعے پر ہمارا قبضہ ہو گیا تو ہاتھی نے پربت نامی اپنے ایک قرابت دار کو برگستواں پوش گھوڑے اور پیشکش کے ساتھ میرے پاس بھیجا۔ اس سے قبل کہ وہ میری خدمت میں حاضر ہو اس کا سامان ان لوگوں سے ہو گیا جو لشکر گاہ کے عقب میں رہ گئے تھے۔ وہ اپنے قرابت داروں کے ہمراہ پیشکش پر مشتمل تحائف لے کر حاضر ہوا اور خدمت بجالایا۔ لشکر خاں بعض مہمات انجام دینے کی خاطر اپنے قرابت داروں کے ہمراہ بھیرہ سے ہی پیچھے رہ گیا تھا۔ چنانچہ اپنے معاملات کو درست کرنے کے بعد وہ بھی آن پہنچا۔ اسے اور بعض زمینداروں کو جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کے بعد ہم نے کوچ کیا اور دریائے سون کو عبور کر کے ایک پشتے پر قیام پذیر ہوئے۔ ہاتھی کے قرابت دار پربت کو خلعت سے نوازا گیا اور ایسے فرامین جاری کئے گئے جن سے ہاتھی کی دلجوئی ہو سکے۔ محمد علی جنگ جنگ کے ملازم کو ان فرامین کے ساتھ اس کے پاس روانہ کیا گیا۔ نیلاب اور ہزارہ قارلوق کے علاقے ہمایوں کو عطا کر دیئے گئے چنانچہ اس کے بہت سے نوکر بابا دوست وہاں کے منصب داروغگی سنبھالنے کی غرض سے حاضر ہوئے۔ مرزا ملوی قارلوق بیس چالیس قارلوق سرداروں کو ساتھ میرے پاس آیا۔ انہوں نے ایک برگستواں گھوڑا پیش کیا اور خدمت بجالائے۔ دلہ زاک افغان لشکر بھی حاضر خدمت ہوا۔ اگلے دن صبح ہم نے وہاں سے کوچ کیا۔ (ورق ۲۰۶) اور دو کروہ کا فاصلہ طے کر کے ایک بلند جگہ پر پہنچ کر لشکر گاہ کا معائنہ کیا گیا۔ میں نے حکم دیا کہ اونٹوں کا شمار کیا جائے، وہ تعداد میں پانچ سو ستر تھے۔ سنبل کے درخت کی تعریف سنی تھی یہ ہمیں اسی منزل پر نظر آیا[۳۸] اس پہاڑ کے دامن پر اس کی پیداوار نسبتاً کم ہوتی ہے لیکن آگے پہاڑوں پر اس کی پیداوار زیادہ ہے، اس کا ذکر آگے ہندوستان کے حیوانات اور دشت و بیابان کے ضمن میں آئے گا۔

صبح نمودار ہونے کا جیسے ہی نقارہ بجا ہم نے اس منزل سے کوچ کیا۔ بوقت چاشت سنگڈا کی نامی تنگ درّے کے سرے پر رکے۔ ظہر کے وقت یہاں سے کوچ ہوا۔ اس تنگ درّے سے نکل کر اور دریا عبور کر کے ایک بلند مقام پر قیام کرنے کے لئے اترے۔ یہاں سے ہم نے آدھی رات کے وقت کوچ کیا۔ بھیرہ جاتے وقت ہم جس گھاٹ سے گزرے تھے اس کو پار کرنے کے بعد ہمیں اناج کا ایک بیڑا دلدل میں پھنسا ہوا نظر آیا۔ اس کے مالکوں نے ہر چند چاہا کہ اسے اس دلدل سے نکال لیں مگر وہ بیڑا ذرا بھی اپنی جگہ سے نہ ہل سکا۔ ہم نے اس اناج پر قبضہ کیا اور جو لوگ ہمارے ساتھ تھے ان کے درمیان تقسیم کر دیا۔ یہ غلہ بہت صحیح وقت پر ہمارے ہاتھ آیا۔

شام ہوتے ہوتے دریائے سندھ اور دریائے کابل کے سنگم پر پرانے نیلاب سے ذرا نیچے اور سنگم سے ذرا اوپر ہم قیام کرنے کے لئے اترے۔ نیلاب سے چھ کشتیاں لائی گئیں جنہیں برانغار، جوانغار اور غول کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ سپاہی بڑے لگن سے دریا پار کرنے میں لگ گئے۔ ہمارے سپاہی پیر کے دن رات، منگل کے دن رات اور بدھ کے دن تک دریا عبور کرتے رہے۔ کچھ لوگوں نے جمعرات کو بھی دریا پار کیا۔ ہاتھی کا رشتہ دار پربت، اندرانہ سے ہی محمد علی جنگ جنگ کے ملازم کے ساتھ ہو گیا تھا، وہ دریا کے کنارے تک آیا وہ ہاتھی کی جانب سے ایک برگستوان پوش گھوڑا بطور پیشکش لے کر حاضر ہوا۔ نیلاب کے لوگ بھی ایک برگستوان پوش گھوڑا بطور پیشکش لے کر حاضر ہوئے اور خدمت بجالائے محمد علی جنگ جنگ کی آرزو تھی کہ وہ بھیرہ میں مقیم رہے مگر چونکہ وہ ولایت ہندو بیگ کو عنایت کی گئی تھی اسی لئے بھیرہ و دریائے سندھ کے درمیان واقع قاروق، ہزارہ، ہاتی

۳۸۔ سنبل۔ ایک خوشبودار درخت جسے بالچھڑ بھی کہتے ہیں، بلبل اس پر عاشق ہے۔ شعرا معشوقوں کی زلف کو اس سے تشبیہ دیتے ہیں۔ خوشۂ گندم کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس کا رنگ نیلاہٹ لئے ہوتا ہے۔
سنبل مرا تازیانہ لانا شمشاد انہیں سولی پر چڑھانا (گلزار نسیم)

اورغیاث وال اور کیب جیسے علاقے اس کو عطا کردیئے گئے کیونکہ جو کوئی رعیت کی طرح سر تسلیم خم کردے اس کو رعیت کی طرح نوازنا چاہئے اور جو کوئی اطاعت پذیر نہ ہو اس کا سر کچل دینا چاہئے۔ اس ضمن میں کسی نے کیا خوب کہا ہے:

هر کنیم که بویون قویماسه الی یتکای
چاپقای تالا غای مطیع ومنقاد ایتکای

(جو شخص بھی سر اطاعت تسلیم نہ کرے اس کا سدِ باب کر دینا چاہئے۔ اس پر حملہ کیا جانا چاہئے تاکہ وہ مطیع و فرمانبردار ہو)

یہ علاقے عطا کرنے کے ساتھ ہی میں نے محمد علی جنگ جنگ کو سیاہ مخمل کے قلماقی زرہ بکتر اور پرچم سے بھی نوازا۔ ہاتھی کے قرابت دار کو جانے کی اجازت دے دی گئی۔ جس کے ہمراہ ہاتھی کے لئے شمشیر، خلعت اور اس کی دلجوئی کی خاطر فرامین بھی روانہ کئے گئے۔

جمعرات کے دن جب سورج چڑھ گیا تو ہم نے دریا کے کنارے سے کوچ کیا اس روز معجون کی چسکی بھی لی (ورق ۲۰۷) اس کے نشے میں باغ وگلزار کی سیر نے عجب لطف دیا۔ ایک جگہ قطعۂ زمین پر بس ارغوانی ہی پھول تھے اور دوسری جگہ زرد ہی زرد جہاں ایک جگہ ارغوانی پھول پوری طرح کھل چکے تھے تو دوسری جگہ زرد پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ بعض جگہ یہ زرد و ارغوانی پھول اس طرح کھلے ہوئے تھے کہ لگتا تھا کہ افشاں بکھیر دی گئی ہے۔ لشکرگاہ کے نزدیک ہم ایک بلند جگہ بیٹھے اور پھولوں سے لطف اندوز ہوئے۔ اسی پشتے کے چاروں طرف زرد و ارغوانی پھولوں کی اس انداز میں طرح امیزی کی گئی تھی کہ گویا کسی نے خطوط کھینچ کر مسدس شکلیں بنا دی ہوں۔ دوسری دو جانب پھولوں کی تعداد ذرا کم تھی لیکن جہاں تک نظر کام کرتی تھی بس گلزار ہی گلزار تھے۔ پشاور کے گرد و نواح میں جب کہ فصل بہار ہو تو گلزار پوری طرح کھلتے ہیں۔

شیر کا شکار

صبح کے وقت ہم نے اس منزل سے کوچ کیا۔ راستے میں دریا کے کنارے ایک بَبر گرجتا ہوا نکلا۔ گھوڑوں نے جیسے ہی اس کی گرج سنی اپنے سواروں سمیت بے اختیار تنگ دروں اور گھاٹیوں کی طرف لپکے۔ بَبر وہاں سے پلٹا اور جنگل کی طرف چلا گیا۔ میں نے حکم دیا کہ بھینسا لا کر جنگل میں چھوڑ دیا جائے۔ اسے دیکھ کر بَبر دوبارہ گرجتا ہوا آیا۔ ہر طرف سے اس پر تیروں کی بارش کی گئی، میں نے بھی تیر چلایا۔ جس وقت خانو نامی پیادے نے اس پر نیزے سے وار کیا تو اس نے اس کی نوک کو کھنڈا کر کے پھینک دیا۔ اب وہ بہت زیادہ تیر کھا کر جھاڑی میں گھس گیا اور وہیں کھڑا ہو گیا۔ اس پر بابا یساول اپنی تلوار سونت کر آگے بڑھا اور نزدیک پہنچ کر اس کے سر پر وار کیا۔ اس کے بعد علی سیستانی نے اس کی کمر پر کئی وار کئے۔ یہ حالت دیکھ کر بَبر نے پانی میں چھلانگ لگا دی جہاں اس کو مار گرایا گیا۔ میں نے یہ حکم دیا کہ اس کو باہر نکال کر کھال اتار لیں۔

اگلے دن صبح کے وقت ہم نے وہاں سے کوچ کیا اور بگرام پہنچ کر گورک[۳۹] چھتری دیکھنے کے لئے روانہ ہوئے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ایک تنگ و تاریک کوٹھری نظر آئی۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو ایک دروازہ دکھائی دیا۔ ایک دو سیڑھیاں اتر کر یہ جگہ ایسی تنگ و تاریک ہو گئی تھی کہ بس آدمی لیٹ کر ہی اندر رینگ سکتا تھا۔ یہاں شمع کی روشنی کے بغیر کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے آس پاس سر کے بالوں اور منڈی ہوئی ڈاڑھیوں کا بے انتہا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ گورک چھتری کے اطراف میں ایسے کمرے نظر آئے جو ساخت میں مدرسے اور سرائے کے حجروں جیسے تھے۔ جس سال میں پہلی مرتبہ کابل سے آیا تھا اور کوہاٹ، بنو اور دشت کو فتح کیا تھا تو میں نے

[۳۹] گورک چھتری: یہ اب بیچ پشاور شہر میں ہے۔ پہلے یہ بدھ مت کا عبادت خانہ تھا۔ بابر کے زمانے میں ہندو زیارت گاہ۔ آجکل کچھ حصہ مغلیہ دور کی سرائے کا ہے اور کچھ سکھ دور کا گردوارہ۔

بگرام میں بڑھ کا گھنا درخت تو دیکھ لیا تھا مگر گور کھ چھتری نہ دیکھنے کا افسوس تھا۔ لیکن یہ جگہ ایسی نہ نکلی جس کے نہ دیکھنے کا ملال رہتا۔ اُس دن میرا بہت ہی عمدہ شاہین گم ہوگیا جس کی نگرانی میر شکار شیخم کیا کرتا تھا۔ کلنگ اور لق لق جیسے پرندوں کا خوب شکار کرتا تھا۔ یہ دو تین مرتبہ اپنے پر جھاڑ چکا تھا۔ اس نے ایسے ایسے پرندے شکار کئے تھے کہ مجھ جیسے شکار کے شوقین کو جس نے میر شکار بھی مقرر کر رکھا تھا اب مزید شکار کرنے کی تمنا نہیں رہی تھی۔

ہندوستان کی سوغاتوں سے دلہ زاک قبیلے کے افغان سرداروں کو جو ملک برخاں اور ملک موسیٰ کے ہمراہ تھے چھ سربرآوردہ افراد سو سو مثقال چاندی کے حقدار قرار دیئے گئے نیز فی گھر تین بیل اور ایک بھینس دی گئی۔ ان کے علاوہ دوسرے افراد میں سے ہر شخص کو اس کی حیثیت کے مطابق سونے چاندی کے سکے، کپڑے، گائے اور بھینس (ورق ۲۰۸) عطا کی گئیں۔

جس وقت ہم علی مسجد[۴۰] نامی مقام پر قیام پذیر ہوئے تو دلہ زاک قبیلے سے یعقوب خیل کا معروف نامی شخص دس بھیڑیں، دو بورے چاول اور آٹھ پنیر کے بڑے بڑے پنڈ بطور پیشکش لے کر حاضر ہوا۔ علی مسجد سے روانہ ہو کر بدہ پیر نامی جگہ پر قیام کے لئے اُترے۔ یہاں سے روانہ ہو کر جوے شاہی ظہر کے وقت پہنچے اور قیام پذیر ہوئے۔ اسی دن دوست بیگ شدید بخار کے عارضے میں مبتلا ہوگیا۔ اگلے دن صبح کے وقت ہم نے جوے شاہی سے کوچ کیا۔ باغ وفا میں آدھا دن گزار کر وہاں سے ظہر کے وقت ہم روانہ ہوئے۔ جس وقت ہم نے گندمک جو ہڑ کو پار کیا تو نماز مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ ہم نے اپنے گھوڑوں کو سبزہ زار میں چرنے کے لئے چھوڑ دیا تاکہ دم لے سکیں۔ ایک یا دو گھڑی گزرنے کے بعد ہم پھر سوار ہوئے۔ سُرخاب کو عبور کر کے ہم گُرگ پہنچے اور سو گئے۔ صبح نمودار ہونے سے قبل گھوڑوں پر سوار ہو کر ہم گرگ سے روانہ ہوئے۔ جس جگہ سے قراتوں کی جانب جانے کا راستہ علیحدہ ہوتا ہے وہاں میں نے پانچ چھ آدمیوں کو ساتھ لیا اور اس باغ کی سیر کرنے کے لئے چلا گیا جو میں نے قراتوں میں لگایا تھا۔ خلیفہ شاہ حسن بیگ اور دیگر افراد کو میں نے براہ راست روانہ کیا قورو ق سائی نامی جگہ پر پہنچ کر میرا انتظار کریں۔ جس وقت قراتو پہنچے شاہ بیگ ارغون کا قیری مخبر قیزیل یہ خبر لے کر آیا کہ شاہ بیگ نے کاہان پر حملہ کیا اور تاخت وتاراج کر کے واپس چلا گیا۔

اس وقت فرمان جاری کیا گیا کہ کوئی بھی شخص ہماری پیش قدمی کے بارے میں خبر آگے نہ پہنچائے۔ ابھی ظہر کا وقت ہوا ہی تھا کہ ہم کابل پہنچ گئے۔ قتلق قدم نامی پُل کے سرے پر پہنچے تو ہماری آمد کی کسی کو بھی ذرا خبر نہ ہوئی۔ لیکن اسکے بعد ہمایوں اور کامران کو ہمارے آنے کی اطلاع ہوگئی۔ انھیں اتنا موقع نہ مل سکا کہ وہ گھوڑوں پر سوار ہوں (ورق ۲۰۸) انھوں نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا کہ وہ دروازہ شہر اور دروازہ قلعہ کے درمیان پہنچیں۔ یہاں پہنچ کر وہ دونوں میری خدمت میں حاضر ہوئے۔

قاسم بیگ، قاضی شہر اور دیگر ملازمین جو کابل میں تھے عصر کے وقت حاضر ہوئے اور خدمت بجالائے۔

چاندرات ماہ ربیع الاخر بروز جمعہ بوقت عصر محفل بادہ خواری ترتیب دی گئی۔ شاہ حسن کو میں نے خلعت خاصہ سے نوازا۔ ہفتے کے دن صبح ہم کشتی میں سوار ہوئے صبوحی کا اہتمام کیا۔ نور بیگ اس محفل عیش طرب میں عودنوازی کر رہا تھا۔ اس وقت تک وہ میخواری سے تائب نہیں ہوا تھا۔ ظہر کے وقت ہم کشتی سے اترے اور اس باغ کی سیر کرنے نکل گئے جو میں نے گلکنہ[۴۱] اور دامن کوہ کے درمیان لگایا تھا۔ عصر کے وقت باغ بنفشہ میں پہنچے مے نوشی کی گئی۔ گلکنہ کی جانب جو فصیل ہے میں اس پر پہنچا اور وہاں سے قلعہ میں داخل ہوا۔

دوست بیگ کی وفات

منگل کے دن بتاریخ ۵ ربیع الاخر دوست بیگ جس کو راستے میں شدید بخار ہوگیا تھا واصل بحق ہوا۔ اس

۴۰۔ علی مسجد۔ یہ درہ خیبر کا تنگ ترین حصہ ہے۔ حضرت علی سے متعلق دو روایات کی وجہ سے مشہور ہے۔ ایک ان کی زیارت گاہ جو مسجد کے برابر بنی ہوئی ہے جہاں ان کے آنے کا ذکر ہے۔ دوسرے مسجد کے سامنے پہاڑ پر ایک بڑا پتھر لٹکا ہوا ہے جو روایت کے مطابق حضرت علی نے اپنی انگشت شہادت سے روک دیا تھا۔

۴۱۔ گلکنہ۔ شاہ کابل کے دامن میں علاقے کا نام جس کا ذکر بابر ۹۱۱ھ کے بیان کابل میں کرتا ہے۔

کی موت کا مجھے سخت رنج ہوا۔ اس کی لاش کو غزنی لے جایا گیا اور دروازہ روضۂ سلطان کے روبرو سپرد خاک کیا گیا۔ وہ ایک بہت ہی عمدہ جواں تھا۔ مرتبہ امارت پر روز بروز ترقی کر رہا تھا۔ مرتبہ امارت تک پہنچنے سے قبل وہ میرا مقرب خاص رہ چکا تھا۔ مزید تقرب حاصل کرنے کی خاطر اس نے کئی مرتبہ بہت عمدہ کام انجام دیئے، ان میں سے ایک کارنامہ تو یہ تھا کہ اس وقت جب کہ میں اندجان سے ایک فرسنگ دور زوق سرائے میں تھا سلطان احمد تنبل نے شبخوں مارا اس وقت میں نے اپنے دس پندرہ ساتھیوں کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور اس کے حملے کو پسپا کر دیا جس وقت ہم اس کے قول لشکر میں داخل ہوئے تو اس وقت تقریباً سو آدمی ہمارے روبرو تھے اور میرے ساتھ بس تین آدمی (ورق ۲۰۹) اور اگر چوتھا شخص کوئی تھا تو وہ میں خود ہی تھا ان تین افراد میں ایک تو دوست ناصر تھا دوسرا امرز قلی کو کلداش اور تیسرا کریم داد، میں جیبا[۴۲] پہنے ہوئے تھا تنبل اور ایک شخص اپنے پرے کے آگے کھڑا تھا اس کے پرے اور اس کے درمیان بس اتنا ہی فاصلہ تھا جتنا دردہلیز اور دروازۂ صحن کے درمیان ہوتا ہے میں تنبل کے مقابل آیا اور اس کی خود کو اپنے تیر کا نشانہ بنایا۔ دوسرے تیر سے اس کے سرخود کو نشانہ بنایا جو خود کے پار اس کے استر میں پیوست ہو گیا ادھر سے ایک تیر ایسا آیا کہ میری گردن کے پاس سے گزر گیا اس کے بعد تنبل نے میرے سر پر حملہ کیا اس وقت میرے سر پر وہ چار گوشہ ٹوپی تھی جو خود کے نیچے پہنی جاتی ہے حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کا تو ایک تار تک نہ ٹوٹا لیکن میرا سر بری طرح زخمی ہو گیا[۴۳] اس وقت کوئی بھی شخص میری مدد کو نہ پہنچا اور ایک آدمی بھی میرے ساتھ نہ رہا۔ چناں چہ وقت کا تقاضہ تھا کہ اپنے گھوڑے کی باگیں پھیر میدان چھوڑ دوں میرے پیچھے تھوڑے سے فاصلے پر دوست بیگ تھا تنبل نے مجھے چھوڑ کر اس پر تلوار کا وار کیا۔

اس کا دوسرا کارنامہ یہ تھا کہ جس وقت ہم اخسی سے گزر رہے تھے اس کا مقابلہ باقی زنخے سے ہو گیا اگر چہ اس کو زنخا کہا کرتے تھے مگر وہ تلوار کا دھنی تھا جس وقت میں اخسی سے باہر آیا تو اس وقت میرے ساتھ بس آٹھ آدمی تھے دشمن نے دو افراد کے بعد جس تیسرے شخص کو اس کے گھوڑے محروم کیا وہ دوست بیگ تھا۔

جس وقت وہ مرتبہ امارت پر پہنچ گیا تو اس وقت سیونچک خاں نے ازبک سلاطین کو ساتھ لے کر تاشقند میں احمد قاسم کا محاصرہ کر لیا تھا اس نے وہاں انھیں زیر کیا اور شہر میں داخل ہو گیا محاصرے کے دوران وہ کئی مرتبہ اپنی جان پر کھیل گیا، اگر چہ احمد قاسم نے اس کے ساتھیوں کو مطلع کئے بغیر شہر خالی کر دیا اور وہاں سے فرار ہو گیا مگر اسکے باوجود دوست بیگ نے تاشقند میں خان سرداروں اور ازبک سلاطین کو اچھی طرح زیر کر لیا۔

اس کے بعد جس وقت شیرم طغائی فرید اور ان کے ساتھیوں نے بغاوت کر دی تو یہ دوست بیگ ہی تھا جو غزنی سے اپنے دو سو تین سو ساتھیوں کے ہمراہ یلغار کرتا ہوا آیا ادھر سے مغلوں نے اپنے چار سو عمدہ جوانوں کو اس کے مقابلہ کرنے کے لئے روانہ کیا شیر وکان کے نواح میں اس نے جوانوں کو جو میدان کارزار میں پیش پیش تھے اچھی طرح زیر کر لیا اس نے بہت سے لوگوں کے گھوڑے چھین لئے اور کثیر تعداد میں لوگوں کے سر کاٹ کر اپنے ساتھ لایا۔ باجوڑ کے قلعے میں بھی دوست اور اس کے ساتھیوں کا دستہ ہی تھا جو دوسرے لوگوں سے پہلے فصیل قلعے پر پہنچ گیا پرھالہ میں بھی دوست ہی سینہ سپر رہا جہاں اس نے باقی کو زیر کیا اور اسے فرار ہونے پر مجبور کر دیا اس طرح پرھالہ فتح ہو گیا۔ دوست بیگ کی وفات کے بعد اس کی ولایت اس کے برادر خورد میرم ناصر کو عطا کر دی گئی۔

جمعہ آٹھ ربیع الآخر میں قلعہ سے چار باغ کی جانب روانہ ہوا منگل کے دن اس مہینے کی بارہ تاریخ کو سلطان حسین مرزا کی بڑی بیٹی سلطانم بیگم جو عرصۂ معطلی کے دوران خوارزم میں مقیم تھیں بلی بارس سلطان کے

۴۲۔ جیبا: یہ لباس تہہ جامہ ہے۔ تنبل شب خوں مار رہا ہے۔ دوسری طرف بالکل تیاری نہیں تھی۔ سر پر بھی صرف چو گوشہ ٹوپی تھی۔ چغتائی ترکی میں جبے کو جیبا کہتے ہیں۔ (سنگلاخ ص ۱۳۳) اردو فارسی اور رومی ترکی میں یہ جبہ کہلاتا ہے

۴۳۔ سر کا زخمی ہونا: سر کا بھنا جانا۔ دماغ اگر کھوپڑی کی چوٹ کی وجہ سے لرز جائے تو عارضی طور پر زخمی ہو جاتا ہے۔ جس کو آج کل کے کارٹون بنانے والے سر کے اطراف تارے دکھا کر ظاہر کرتے ہیں۔ پرسش کو مری کون مرے گھر نہیں آتا
تیور نہیں آتے کہ چکر نہیں آتا (امیر)
(معین الشعراء ص ۱۰۲)

برادر خورد ایسن قلی سلطان کے ہمراہ جس نے انکی لڑکی سے شادی کرلی تھی کابل پہنچ گئیں۔ ان کے قیام کے لئے ایسے باغ میں انتظام کیا گیا جہاں خلوت وتنہائی تھی۔ جب وہ وہاں قیام پذیر ہوگئیں تو میں ان میں سے ملاقات کرنے کے لئے گیا چونکہ رشتہ میں وہ میری بڑی بہن تھیں۔ اس لئے میں ان کے احترام کی خاطر اپنے زانو کے بل ان کے سامنے بیٹھ گیا وہ بھی زانو کے بل بیٹھ کر احترام بجالائیں اس کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور ہم نے ایک دوسرے سے ملاقات کی۔ اس کے بعد بھی انھوں نے آدب کو ہر مرتبہ ملحوظ رکھا۔

بابا شیخ اپنی نمک حرامی کے باعث کافی عرصے سے قید تھا۔ سترہ تاریخ کو بروز اتوار (ورق ۲۱۰) میں نے اس کا قصور معاف کر کے اور قید سے نجات دلا کر اسے خلعت وانعام سے نوازا۔[۴۴]

انیس تاریخ کو منگل کے دن دوپہر کے وقت خواجہ سہ یاراں کی سیر کرنے کے لئے ہم روانہ ہوئے اس روز میں نے روزہ رکھا تھا جس پر یونس علی اور دوسرے لوگوں نے حیران ہو کر کہا کہ "آپ اور روزہ! وہ بھی منگل کے دن یہ بات تو بالکل عجیب ہے"۔ بہرزادی پہنچ کر ہم قاضی کے مکان پر قیام پذیر ہوئے۔ جہاں رات کے وقت محفل گرم ہوئی۔ اس پر قاضی نے عرض کیا کہ اس سے قبل میرے گھر پر اس قسم کی تقریب نہیں ہوئی۔ آپ بادشاہ ہیں۔ آگے آپ کو اختیار ہے، مگر اس کے باوجود محفل کا اہتمام کیا گیا لیکن قاضی کی دلجوئی کے لئے بادہ خواری موقوف کر دیا گیا۔[۴۵] بدھ کے دن ہم خواجہ سہ ران کی سیر کرنے کے لئے نکلے۔

اکیس تاریخ کو جمعرات کے دن اس پہاڑ کی نوک پر ایک چبوترہ بنانے کا حکم دیا جہاں پہلے ہی ایک باغ میں بنوا چکا تھا۔

بروز جمعہ پل پر سے ہم بیڑے پر سوار ہوئے۔ جس وقت ہم شکاریوں کے گھر کے سامنے پہنچے تو وہ میرے لئے دیک (دیونس) پکڑ لائے اس سے پہلے یہ پرندہ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی عجیب وضع وشکل تھی۔ اس کا تفصیل سے ذکر حیوانات ہندوستان میں کیا جائے گا۔

تیئیس تاریخ کو ہفتے کے دن اس گول چبوترے پر چنار اور بید کے پودے لگائے گئے۔ بعد دوپہر شراب کی محفل آراستہ کی گئی۔ اگلے دن بوقت سحر اسی چبوترے پر ہی صبوحی کا انتظام کیا گیا۔ نصف روز گزر جانے کے بعد ہم نے گھوڑوں پر سوار ہو کر کابل کی جانب رخ کیا۔ جس وقت ہم خواجہ حسن پہنچے تو نشے میں چور تھے۔ اس لئے سو گئے خواجہ حسن سے سوار ہو کر (ورق ۲۱۰) بوقت نصف شب ہم چار باغ میں قیام پذیر ہوئے جس وقت ہم خواجہ حسن میں تھے تو عبداللہ نشے کی حالت میں معہ جامہ وخلعت پانی میں کود گیا۔ جب صبح نمودار ہوئی تو اسے ایسی ٹھنڈ لگ چکی تھی کہ وہ ہمارے ساتھ نہ چل سکا اور اس لئے اس نے رات قتلق خواجہ کے تنبو میں بسر کی۔ اگلے دن صبح اسے گزشتہ روز کی بے اعتدالی کے بارے میں تنبیہہ کی گئی تو اس نے اپنے کئے پر پشیمان ہو کر توبہ کر لی میں نے اس سے کہا کہ معلوم نہیں کہ تو اپنی اس توبہ قائم بھی رہے گا یا نہیں۔ بہرصورت تو اس وقت یہ توبہ کر ہی لے کہ ہمارے محفل مہ نوشی کے علاوہ کسی اور جگہ میخواری نہ کرے گا۔ چند مہینے تک تو وہ اپنی بات پر قائم رہا مگر اس کے بعد وہ اپنے عہد کی پابندی نہ کر سکا۔

ہندو بیگ کی واپسی

پچیس تاریخ کو پیر کے دن ہندو بیگ واپس آ گیا۔ بھیرہ اور اس سے وابستہ ولایت اس کی تحویل میں تھی صلح وصفائی کی امید تھی اسی لئے افراد وسامان کی وہاں کمی تھی جوں ہی ہم وہاں سے واپس ہوئے بہت سے افغان اور ہندوستانی جمع ہو کر ہندو بیگ کو تاراج کرنے کے لئے بھیرہ میں اٹھ کھڑے ہوئے، مقامی زمین دار بھی افغانوں کے ہمنوا ہو گئے۔ بھیرہ میں ہندو بیگ اپنی استقامت وپائیداری برقرار نہ رکھ سکا اسی لئے وہ

۴۴۔ بابا شیخ اس بغاوت میں شامل تھا جو غزنی میں ناصر مرزا کے انتقال کے بعد ۹۲۱ھ/ ۱۵۱۵ء میں ہوئی تھی۔ بابر کی یہ صفحات موجود نہیں۔ لیکن حیدر مرزا دوغلت نے اس کا ذکر کیا ہے (ص ۳۵۶)

۴۵۔ قاضی کے ہاں مجلس۔ وہ تو اچھا ہوا کہ بادہ خواری بابر نے موقوف کر دی۔ ورنہ قاضی کے دل پر کیا گزرتی۔
ساقی شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر

خوشاب کی جانب روانہ ہوگیا۔ دینکوٹ سے گزر کر وہ نیلاب پہنچا اور وہاں سے اس نے کابل کا رخ کیا۔ سکتو کے لڑکے دیو ہندو اور دیگر ہندو سرداروں کو قیدی بنا کر وہ بھیرہ سے لے آیا۔ ان کو تاوان لے کر آزاد کر دیا گیا۔ چنانچہ ان کو گھوڑے اور خلعت انعام میں دے کر رخصت ہونے کی اجازت دے دی گئی۔

انتیس تاریخ بروز جمعہ مجھے اپنے جسم میں بخار کی حرارت محسوس ہوئی جس کے لئے میں نے فصد کھلوائی مگر اس کے باوجود بخار کبھی دو دن بعد اور کبھی تین روز بعد آنے لگا۔ (ورق ۲۱۱) جب تک پسینہ نہ آجاتا بخار نہ اترتا دس بارہ دن بعد ملا خواجہ نے شراب میں گل نرگس حل کر کے پلائے۔ اگرچہ میں نے یہ محلول ایک دو مرتبہ پیا مگر افاقہ نہ ہوا۔

پندرہ جمادی الاول بروز اتوار خواجہ محمد علی میرے پاس خوست سے آیا اس نے زین دار گھوڑے کے ساتھ ہی صدقہ اتارنے کے لئے بھی رقم پیش کی۔ محمد علی کے ہمراہ محمد شریف نجومی اور خواست کے مرزا زادگان بھی حاضر خدمت ہوئے۔ پیر کے دن صبح کے وقت کاشغر سے ملا کبیر آیا وہ ولایت اندجان سے کاشغر ہوتا ہوا کابل پہنچا تھا۔

اس مہینے کی تئیس تاریخ کو پیر کے دن ملک منصور شاہ یوسف زئی اپنے ساتھ پانچ چھ یوسف زئی قبیلے کے سرداروں کو لے کر سوات سے آیا اور حاضر خدمت ہوا۔ چاند رات جمادی الآخر پیر کے دن یوسف زئی قبیلے کے سرداروں کو جو شاہ منصور کے ہمراہ آئے خلعت پہنائی گئی شاہ منصور کو جامۂ قماش تکمہ دار، ایک کو پلک دار جامۂ قماش اور دیگر چھ سرداروں کو جامۂ قماش پہنا کر رخصت کیا گیا۔[۴۶] ان کے ساتھ یہ قرار پایا کہ ابوہہ سے اوپر ولایت سوات میں وہ داخل اندازی نہ کریں۔ اور وہاں کی تمام رعیت کو اپنے پاس سے جانے کی اجازت دے دیں۔ اس کے علاوہ باجوڑ اور سوات میں جو افغان کاشتکاری کرتے ہیں وہ چھ ہزار دھان کے بورے دیوان کو پیش کیا کریں۔

تین تاریخ کو بروز بدھ میں نے جلاب لیا۔

اس مہینے کی آٹھ تاریخ کو پیر کے دن قاسم بیگ کے پسر خورد حمزہ کی جانب سے خلیفہ کی بڑی لڑکی کے لئے ساچق بھیجی گئی۔ جو ایک ہزار شاہرخی اور ایک زین دار گھوڑے پر مشتمل تھی۔

منگل کے دن شاہ حسن بیگ نے محفل مے خواری ترتیب دینے کی اجازت چاہی۔ بعض امرا کو محمد علی اور قرابت دار لوگوں کے ہمراہ وہ اپنے گھر لے گیا۔ یونس علی اور گدائی طغائی میرے پاس تھے۔ میں اس وقت چوں کہ شراب نوشی سے گریزاں تھا اس لئے میں نے کہا کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں ہوشیار بیٹھا رہوں اور سب لوگ بادہ نوشی کے مرتکب ہوتے رہیں۔ یا یہ کہ میں صحیح وسلامت ایک طرف کھڑا رہوں اور دوسری طرف پورا ایک گروہ خود کو غرق شراب کریں۔ تم سب آؤ اور میرے سامنے مے نوشی کرو تا کہ تھوڑی دیر کے لئے تفریح رہے۔ اور میں یہ دیکھ سکوں کہ بادہ خوار اور ہوشیار کس طرح پیش آتے ہیں۔ اس نگار خانے کے جنوب مشرقی جانب جس کا اہتمام چار باغ کے دروازے میں کیا گیا تھا ایک مختصر سفید خیمہ نصب رہتا تھا میں کبھی کبھی وہاں جا کر بیٹھ جاتا تھا اور نشست ہو جاتی تھی تھوڑی دیر بعد ہمارے خاندان کا مسخرہ غیاث بھی آ گیا۔ میں نے بطور دل لگی کہا کہ اسے اس مجلس سے باہر نکال دو۔ اس نے ایسا شور وغل کیا اور ایسا مسخرہ پن کہ بالآخر اس کو محفل میں روک ہی لیا گیا۔ تردی محمد قبچاق اور ملا کتابدار کو بھی دعوت دی گئی۔ ملا کتابدار نے شاہ حسین اور دوسرے لوگوں کو جنھوں نے یہ محفل ترتیب دی تھی ایک رباعی فی البدیہ کہہ کر بھیج دی۔

احباب کے بزمید گلستان خس تور   یوق لیک الاریز میدابیز کا دستور
اوّل جمع ذاکر حضور وجمعیت بار   یوزشکر بوجمع بی حضور ابریم ماستور

۴۶۔ جامہ قماش۔ ریشم کا جبہ جس کو بہتر بنانے کے لئے اس پر اگر پلکوں کی طرح بیل لگا دی جائے تو پلک دار اور اگر گھنڈیاں لگا دی جائیں تو تکمہ دار جامہ ہوگیا۔ یہاں بابر کے بیان کے مطابق بنیادی خلعت جامہ قماش تھا۔ اس سے اعلی پلک دار اور اس سے بہتر تکمہ دار جامہ ہوتا تھا۔

(احباب کی اس محفل گلستاں میں ہمارا وجود تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر اس محفل میں لوگوں کی جمعیت خاطر میسّر ہے تو ہزار شکر کے یہاں بھی ہمارے لئے کوئی چیز بار خاطر نہیں)

یہ رباعی ابراہیم چہرہ کے ہاتھ بھیجی گئی ظہر و عصر کے درمیان اس مجلس کا کیف و سرور شباب پر تھا۔ (ورق ۲۱۲) اس کے بعد اہل مجلس عالم مستی میں ہی منتشر ہو گئے۔

طبیعت کی ناسازی کے دوران میں ڈولے پر سوار ہو کر گھومنے کے لئے نکلتا تھا۔ اس سے چند روز قبل میں نے شراب مرکب[۴۷] پی تھی مگر اس کے پینے سے چوں کہ مرض میں افاقہ نہ ہوا اسی لئے اس کا پینا ترک کر دیا۔ البتہ نقاہت کے آخری دنوں میں بالا چمن کے جنوب مغرب میں نشیب کے درخت کے نیچے جو محفل ترتیب دی گئی اس میں میں نے شراب مرکب پی تھی۔

بارہ تاریخ کو بروز جمعہ احمد بیگ اور سلطان محمد ڈولی مجھ سے ملاقات کے لئے حاضر ہوئے۔ ان دونوں کو باجوڑ کمک کے طور پر متعین کیا گیا تھا۔

سترہ تاریخ کو بروز بدھ باغ حیدر تقی میں تنگری بردی نے بعض امرا اور جوانوں کے لئے بادہ نوشی کی مجلس آراستہ کی۔ میں نے بھی اس میں شریک ہو کر مے نوشی کی۔ عشا کا وقت گزر جانے کے بعد یہ محفل برخاست ہوئی۔ وہاں سے آ کر سفید خیمہ کلاں میں مزید شراب نوشی کی۔

پچیس تاریخ کو بروز جمعرات ملّا محمود خاں کو اس مقصد کے لئے مقرر کیا گیا کہ وہ فقہ کا درس دیا کرے۔

مہینے کی آخری تاریخ کو بروز منگل شاہ شجاع کا ایلچی ابو مسلم کوکلداش حاضر ہوا اور اس نے تیچاق نسل کا گھوڑا بطور پیشکش مجھے نذر کیا۔ اسی دن یوسف علی رکابدار نے چار باغ کے حوض میں تیراکی کا مظاہرہ کیا۔ تالیاں بجا بجا کر اس نے اس حوض کے سو چکر لگائے۔ اسے خلعت اور زین دار گھوڑے سے نوازا گیا۔

آٹھ رجب بروز بدھ شاہ حسین کے گھر میں پہنچ کر میں نے شراب نوشی کی۔ اس محفل میں بہت سے امرا اور عزیز و اقارب موجود تھے۔

اس مہینہ کی گیارہ تاریخ کو بروز ہفتہ ایک محفل آراستہ کی گئی عصر و مغرب کے درمیان کبوتر خانے کی چھت پر بادہ نوشی ہوئی۔ دیر گئے کچھ سوار قریہ افغان کی جانب سے آتے ہوئے نظر آئے جو شہر کی طرف آ رہے تھے۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ درویش محمد ساربان تھا جو ایلچی ہو کر مرزا خان کی طرف سے آ رہا تھا۔ اسے کبوتر خانے کی چھت پر ہی بلایا گیا اور کہا گیا کہ ایلچی گیری کے آداب برطرف کر کے بے تکلفی سے یہاں چلے آؤ۔ وہ میرے پاس آیا اور پیشکش اپنی طرف سے گزاری اور مجلس میں بیٹھ گیا۔ اس نے چوں کہ شراب نوشی سے توبہ کر رکھی تھی اسی لئے پینے میں شریک نہ ہوا۔ لیکن ہم نے اتنی زیادہ پی لی تھی کہ مستی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اگلے دن صبح وہ تمام آداب و رسوم کے مطابق دیوان میں حاضر ہوا۔ اور وہ تحائف جو مرزا خاں نے بطور پیشکش ارسال کئے تھے اس نے میری نظر سے گزارے

گزشتہ سال بمشکل وعدہ وعید پر ایماق اور قبیلے کے لوگوں کو ہندوکش سے کوچ کرا کے کابل لایا گیا تھا۔ سرزمین کابل اتنی کشادہ نہیں کہ جہاں ترک اور ایماق قبائل کے لوگ اپنے مویشیوں کو موسم گرما و سرما میں پرورش کر سکیں۔ صحرا نشین لوگوں کو ان کی مرضی و اختیار پر چھوڑ دیا جائے تو وہ ہرگز کابل آنے کی تمنا نہ کریں گے۔ وہ لوگ قاسم بیگ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ انھیں واپس ہندوکش کی جانب جانے دیا جائے۔ اس نے انتہائی مبالغہ آرائی سے کام لے کر بالآخر یہ اجازت حاصل کر لی کہ ایماق قبیلے کے لوگ قندوز اور بغلان کی جانب کوچ کر جائیں۔

۴۷۔ شراب مرکب۔ بابر نے یہاں لفظ ممزوج استعمال کیا ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ شراب میں کچھ ملایا گیا تھا۔ ظاہر ہے اس بیماری سے صحت یاب ہونے کے زمانے میں یہ کوئی دوا ہی ہوگی۔ طبی نقطۂ نگاہ سے یہ ملاوٹ پانی کی بھی ہو سکتی ہے۔ ویسے غالب کو بھی اس ملاوٹ سے خوف تھا۔

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں (دیوان ص ۸۹)

حافظ میر کاتب کا بڑا بھائی سمرقند سے آیا ہوا تھا۔ اسے ان ہی دنوں سمرقند جانے کی اجازت دے دی گئی میں نے اپنا دیوان پولاد سلطان کے لئے اس کے ساتھ روانہ کر دیا۔ اور اس کی پشت پر یہ قطعہ لکھ دیا۔ (ورق ۲۱۲)

اول سرونینک حریمیغہ کریتسانک ای صبا
بیر کیل بوھجر خستہ سھادین یاد کو نکلنی کا
رحم ایلا بان غیما سا عتمادی بابرنی بار امید
سالغای خدای رحم نی پولاد کا نکلی کا

(اے صبا! اگر تو اس سرو کے حرم میں پہنچے تو اِس ہجر کے مارے کی یاد دلا دینا خدا اُس پر رحم کرے، جس نے بابر کو یاد نہ کیا خدا سے امید ہے کہ وہ اس کے فولادی دل میں رحم ڈال دے)

سترہ تاریخ کو بروز جمعہ زماں مرزا کی طرف سے شاہ مرید کوکلداش صدقات، اور پیشکش کا گھوڑا لے کر حاضر ہوا اس دن شاہ بیگ کے ایلچی ابو مسلم کو خلعت پہنا کر اور انعام سے نواز کر جانے کی اجازت دی گئی۔ خواجہ محمد علی اور تنگری بردی کو بھی ان کی ولایت خوست اور اندراب کی جانب جانیکی رخصت دے دی گئی۔

تئیس تاریخ بروز جمعرات محمد علی جنگ جنگ جسے کچہ کوٹ اور قایوق کے نواح میں متعین کیا گیا تھا اور شاہ حسین مرزا ملوی قارلوق [۴۸] کے لڑکے کے ہمراہ آیا۔ اس کے ہاتھ ہاتھی کے بھی چند افراد تھے۔ ملا علی خاں اپنی زوجہ کو لینے کے لئے سمرقند گیا تھا، وہ بھی اسی دن آیا اور حاضر خدمت ہوا۔

عبدالرحمن افغان کے ساتھی گردیز کی سرحد پر تعین تھے۔ وہ مال کی ادائیگی اور دیگر معاملات میں صحیح نہ تھے۔ کارواں جو وہاں سے گزرتے تھے وہ ان کو پریشان کرتے تھے۔ انتیس تاریخ بروز بدھ ان افغانوں کو درست کرنے کی غرض سے میں سوار ہوا۔ (ورق ۲۱۳) درّہ غجاں کے نواح میں ہم رکے اور کھانا کھا کر روانہ ہوئے۔

رات کے وقت راستہ بھول گئے بانجاب شخنہ کے جنوب مشرق کے درمیان پشتوں اور میدانوں میں سرگردان و پریشان رہے۔ کچھ عرصے کے بعد راستہ مل گیا۔ چشمہ ترہ نامی تنگ درّے سے گزر کر ہم گردیز کی جانب باقیش لیق درّے میں داخل ہوئے۔ میدانی علاقے میں پہنچتے ہی جیسے موقع ہاتھ آیا ایک دستے کو حملے کے لیے روانہ کیا گیا۔ کوہ کرمانس گردیز کے جنوب مشرق میں بھی ایک حملہ آور دستہ روانہ کیا۔ ان دستوں کے عقب میں خسرو، مرزا قلی، سید علی اور قان کے ساتھیوں کو غول کی دائیں جانب روانہ کیا گیا۔ لشکر کے بیشتر لوگ گردیز کے مشرق میں وادی کی بالائی طرف حملہ کرنے کی غرض سے روانہ ہوئے۔ ان حملہ آور دستوں کے عقب میں جن لوگوں کو بھیجا گیا تھا ان میں قاسم ایشک آغا، میر شاہ قوچین، قیام ہندو بیگ، قتلق قدم اور حسین کے آدمی شامل تھے۔

چونکہ لشکر کے بیشتر لوگ درّوں اور وادیوں کی جانب حملے کے لئے جا چکے تھے اسی لئے انھیں بھیج دے نے کے بعد میں ان کے عقب میں روانہ ہوا۔ وادی کے بالائی حصّے میں لوگ ذرا دور فاصلے پر تھے۔ وہ لوگ جو وادی کی بالائی سمت روانہ ہوئے تھے ان کے گھوڑے تھک چکے تھے۔ اس لئے ان لوگوں کے ہاتھ افغانوں کا قابل ذکر مال و اسباب نہ آیا۔ تقریباً چالیس پچاس افغان دشت و صحرا میں نظر آئے۔ وہ لوگ جو عقب دستے کی جانب سے گئے تھے وہ ان افغانوں کی جانب متوجہ ہوئے اور میرے پاس قاصد دوڑایا چنانچہ میں بھی تیزی کے ساتھ ان کی طرف روانہ ہوا۔ (ورق ۲۱۴) میرے وہاں پہنچنے تک حسین حسن بلاوجہ وسبب تن تنہا اپنا گھوڑا افغانوں کی طرف بڑھا کر ان پر ٹوٹ پڑا۔ جس وقت وہ اپنی تلوار سے وار کر رہا تھا تو افغانوں نے اس کے گھوڑے کو اپنے

۴۸۔ ملوی۔ اس ترکی لفظ کے معنی "تل کھایا ہوا" ہیں۔

تیر کا نشانہ بنایا اور اس کو زمین پر گرا دیا۔ زمین پر گرنے کے فوراً بعد ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھا افغانوں نے اس کے پیروں پر تلوار کے ایسے وار کئے کہ وہ زمین پر آ رہا اور اس پر اپنی چھریوں اور تلواروں سے اتنے وار کئے کہ اسکی تکہ بوٹی کر ڈالی۔ میرے ہمراہی وہاں کھڑے یہ سب منظر دیکھ رہے تھے اور ایسے بے بس تھے کہ وہ اسکی مدد نہ کر سکتے تھے۔ اس واقعے کی اطلاع ملتے ہی میں نے گدائی طغائی، پائندہ محمد قیلان، ابوالحسن قورچی، مومن آتکہ کے ساتھ ہی اپنے ندیموں اور جوانوں کو سرپٹ دوڑایا اور خود بھی انتہائی تیزی کے ساتھ روانہ ہوا۔ مومن آتکہ نے سب سے پہلے بڑھ کر وار کیا، ایک افغان کو اپنے تیر کا نشانہ بنا کر اسے مار گرایا اور اس کا سر کاٹ کر میرے پاس لایا۔ ابوالحسن قورچی اگرچہ مسلح نہ تھا مگر اس نے بھی ہمت و جرأت سے کام لیا اور افغانوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اسی اثنا میں اس نے ایک افغان پر تلوار سے وار کیا اور اس کا سر کاٹ لایا۔ اس لڑائی میں اس نے تین زخم کھائے اور اس کے گھوڑے کے بھی ایک زخم لگا۔ پائندہ محمد قیلان نے بھی اپنی مردانگی کے خوب جوہر دکھائے۔ اس نے بھی ایک افغان کو اپنی تلوار سے مار گرایا اور اس کا سر کاٹ لایا۔ اگرچہ ابوالحسن اور پائندہ قیلان کی بہادری کے جوہر پہلے ہی کھل چکے تھے مگر اس یورش میں وہ اپنے تمام کارناموں پر سبقت لے گئے۔ ان افغانوں کو قتل کرنے کے بعد ہم ایک کھیت میں پہنچے، جہاں میں نے حکم دیا کہ ان کے سروں سے ایک مینار بنایا جائے۔ جس وقت ہم راستہ طے کر رہے تھے تو میں نے ان امرا سے جو حسین کے ساتھ تھے قہر و غضب کے لہجے میں کہا کہ تم نے اتنی تعداد میں ہوتے ہوئے بھی چند پیادہ افغانوں کے ہاتھوں کھلے میدان میں ایسے عمدہ جوان کو گرفتار کرا دیا گویا وہ ایک تماشہ تھے جسے تم کھڑے دیکھ رہے تھے۔ میں تمہیں تمہارے اعلیٰ مقامات و مراتب سے اتار دوں گا۔ جن پرگنات اور ولایات سے تمہیں نوازا گیا ہے ان سے تم محروم کر دئے جاؤ گے۔ تمہاری ڈاڑھیاں منڈوا کر تمہیں شہر میں گشت لگوایا جائے تاکہ لوگ دیکھ لیں کہ تم نے ایسے عمدہ جوان کو اس قسم کے دشمن کے ہاتھوں کیسے گرفتار کرا دیا اور یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ میدان تمہارے ہاتھ میں ہے پھر بھی کھڑے تماشا دیکھتے رہے۔ بس اس کی سزا یہی ہے کہ جو تمہیں دی جا رہی ہے

لشکر کے وہ لوگ جو کرماس کی طرف گئے تھے وہ بھیڑیں اور مال غنیمت لے کر واپس آئے۔ ان کے ساتھ بابا قشقہ بیگ بھی گیا تھا۔ جب اس پر ایک افغان نے تلوار سے وار کرنا چاہا تو وہ اپنی جگہ ڈٹ گیا اور اس افغان کو اس نے اپنے تیر سے مار گرایا۔

اگلے روز صبح ہم نے کوچ کیا اور کابل روانہ ہوئے۔ محمد بخشی، عبدالعزیز اور میر خورد بکاول کو حکم دیا کہ وہ چشمہ ترہ پر پہنچ کر قیام کریں اور وہاں کچھ مرغ زرین کا شکار کریں۔ میں خود چند لوگوں کو ساتھ لے کر اسی راستے پر روانہ ہوا جو میدان رستم کی طرف جاتا ہے۔ یہ وہ جگہ تھی جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ جگہ پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ پہاڑ کی چوٹی کے نزدیک بہت ہی پرفضا مقام ہے۔ وہ پہاڑوں کے درمیان وسیع کشادہ میدان ہے۔ اس کے جنوب میں ایک پشتے کے دامن پر چھوٹا سا چشمہ جاری ہے جس کے اطراف گھنے صنوبر کے درخت ہیں۔ وہ راستہ جو گردیز سے میدان رستم کی جانب آتا ہے وہاں بھی بہت سے چشمے ہیں اور درخت بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ مگر قد و قامت میں چھوٹے ہیں۔ یہاں کی گھاٹی کی وادی اگرچہ نسبتاً تنگ ہے لیکن درختوں کے نیچے جو جگہیں ہیں وہ نہایت ہی سرسبز و خرم ہیں (ورق ۲۱۵) گویا ہموار میدان و پرفضا مقام ہے۔ ہم اس پہاڑ کی جانب جا نکلے جو میدان رستم کی جنوب میں واقع ہے۔ یہاں سے ماش اور بنگش کوہستانی سلسلے قدموں کے نیچے نظر آتے ہیں۔

کرماس پہاڑوں کے دوسری طرف بادل خوب چھائے ہوئے تھے۔ وہ ولایات جن میں بارش نہیں ہوتی وہاں بادل بھی کہیں نہیں پائے جاتے۔

ظہر کے وقت ہم ہونی پہنچے اور یہاں قیام پذیر ہوئے۔ اگلے دن صبح ہم محمد آغا کے گاؤں کے حدود میں تھے۔ اس جگہ پر اتر کر معجون سے لطف اندوز ہونے کا اہتمام کیا گیا۔ مچھلی کا شکار کرنے کے لیے ہم نے پانی میں دوا ڈال کر کچھ مچھلیاں بھی پکڑیں۔

بتاریخ تین شعبان اتوار کے دن، ہم کابل پہنچے۔

منگل کے دن بتاریخ پانچ شعبان ہم نے درویش محمد فضلی اور خسرو کے ملازمین سے حسین کے دشمن کے قابو میں آجانے پر گفتگو کی۔ جن لوگوں نے حوصلہ مندی میں کوتاہی کی تھی ان کی وضع کیفیت کے بارے میں صورت حال کی تحقیق کی گئی جس کے بعد انھیں ان کے مقام و مرتبے سے محروم کر دیا گیا۔ دوپہر کے وقت درخت چنار کے نیچے شراب کی محفل آراستہ کی گئی۔ بابا قشقہ مغل کو خلعت و انعام سے نوازا گیا۔

آٹھ تاریخ کو بروز جمعہ کتہ جسے مرزا کے پاس بھیجا گیا تھا واپس آ گیا۔

جمعرات کو کوہ داماں سہ یاراں اور باران کے دامن میں سیر کرنے کے لئے ہم گھوڑوں پر روانہ ہوئے۔ عشا کے وقت ہم ماما خاتون نامی جگہ پر قیام پذیر ہوئے۔ اگلے دن صبح معجون کی چسکی لی گئی۔ ہفتے کے دن استالیف میں بادہ نوشی کی محفل آراستہ کی گئی۔ اگلے دن صبح وہاں سے روانہ ہوئے اور درّہ مسجد کے درمیان سے گزرے۔ جس وقت ہم خواجہ سہ یاراں کے نزدیک پہنچے تو ایک ایسا سانپ مارا جو انسان کی کلائی کے برابر موٹا اور لمبائی میں آدمی کے قد جیسا تھا۔ (ورق ۲۱۵) جب اس سانپ کو چاک کیا تو اس کے اندر ایک اور سانپ نکلا جسے بظاہر اس نے کچھ وقت قبل نگلا ہوگا۔ کیونکہ اس کا پورا بدن بالکل صحیح و سالم تھا۔ اور کوئی بھی حصہ ابھی تک گلا نہ تھا۔ اس پتلے سانپ کے اندر سے ایک سالم چوہا نکلا۔

سہ یاراں پہنچ کر محفل مے نوشی آراستہ کی گئی۔ اس کے ساتھ ہی لچکینہ نامی رات کے چوکیدار کے ہاتھ یہ فرامین ان افراد کو روانہ کئے گئے جو ہندوکش کی دوسری جانب تھے کہ لشکر سوار ہو چکا ہے وہ مقررہ جگہ پہنچ جائیں۔

اگلے دن صبح ہم وہاں سے سوار ہوئے اور معجون کی چسکی لی۔ پروان دریا کے سنگم پر وہاں کے ماہی گیروں کی طرح ہم نے بھی دوا ڈال کر بہت سی مچھلیوں کا شکار کیا۔ میر شاہ بیگ نے کھانے اور پینے کا انتظام کیا۔ یہاں سے سوار ہو کر ہم گلبہار پہنچے۔ غروب آفتاب کے بعد بزم مے نوشی آراستہ کی گئی۔ جس میں درویش محمد ساربان بھی شریک تھا اگرچہ جوان تھا اور جری سپاہی مگر شراب نوشی کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ وہ اس سے تائب تھا۔ قتلق خواجہ کوکلداش نے کافی عرصہ قبل سپاہ گری کو ترک کر دیا تھا، اور درویشی اختیار کر لی تھی۔ عمر طولانی پائی تھی اور ڈاڑھی بالکل سفید ہو چکی تھی لیکن شراب کی محفلوں میں اب بھی شریک رہتا تھا۔ میں درویش محمد سے بطور تمسخر کہا کرتا تھا کہ تجھے قتلق خواجہ درویش اور اس کی ریش سفید دیکھ کر غیرت آنی چاہئے کہ وہ اس پیری میں بھی پیتا ہے اور تو جوان و سیاہ ریش ہو کر بھی اس سے گریز کرتا ہے! آخر اس کا باعث کیا ہے؟ میری روش یہ نہ تھی کہ جو شخص شراب نہ پیتا ہو اس کو پینے پر مجبور کروں (ورق ۲۱۶) چنانچہ اسی ہنسی مذاق پر بات ختم ہوگئی اور اسے شراب پینے کے لئے مجبور نہ کیا گیا۔ اس کے اگلے روز صبح کے وقت صبوحی کا اہتمام کیا گیا۔

بدھ کے دن ہم گلبہار سے روانہ ہوئے اور آتون کے گاؤں میں قیام پذیر ہوئے۔ یہاں کھانا کھا کر ہم پھر سوار ہوئے اور باغات جم پہنچ کر وہاں قیام کیا۔ بعد از ظہر مے نوشی کی محفل آراستہ ہوئی۔

اگلے دن صبح وہاں سے سوار ہو کر ہم خواجہ خاں سعید کے مزار پر پہنچے اور اس کا طواف کر کے واپس آئے۔ چینہ گڑھی پہنچ کر بیڑے پر سوار ہوئے۔ پنجشیر کے سنگم پر یہ بیڑا ایک ابھری ہوئی پہاڑی سے ٹکرا گیا اور ڈوبنے لگا۔ جیسے ہی یہ بیڑا اس پہاڑی کے نزدیک پہنچا روح دم، تنگری قلی اور بیڑے کا مانجھی ملاح میر محمد پانی میں کود پڑے۔

روح دم اور تنگری قلی کو تو بمشکل تمام پانی سے نکال کر بیڑے پر کھینچ لیا گیا لیکن میرا چینی کا پیالہ، چمچہ اور دف پانی میں ڈوب گئے۔ یہاں سے گزر کر جب ہم اس جگہ پہنچے جو سنگ بریدہ کہلاتی ہے۔ پھر یہ بیڑا معلوم نہیں کسی درخت کے تنے یا بند کے ڈھیر سے ٹکرا گیا۔ جھٹکا لگنے سے شاہ حسین بیگ پیچھے پانی میں جا گرا۔ گرتے وقت اس نے مرزا قلی کا سہارا لینا چاہا اور اسے پکڑ لیا جس کے باعث وہ بھی اس کے ساتھ پانی میں جا گرا۔ درویش محمد ساربان بھی غوطے کھانے لگا۔ مرزا قلی کے ہاتھ میں گرنے سے پہلے خربوزہ کاٹنے کی چھری تھی وہ جسے صاف کرنے کے لئے بورے پر رگڑ رہا تھا جو بیڑے پر بچھا ہوا تھا۔ اسی اثنا میں وہ پانی میں گر گیا۔ پانی میں گرنے کے بعد وہ بیڑے کی طرف نہیں آیا بلکہ کپڑوں سمیت تیرتا ہوا نکل گیا۔ وہ رات ہم نے بیڑہ مانجھی کے گھر میں بسر کی۔ یہاں درویش محمد نے ہو بہو ویسا ہی ہفت رنگی پیالہ مجھے پیش کیا جو پانی میں ڈوب گیا تھا۔

بروز جمعہ دریا کے کنارے سے روانہ ہوئے۔ ہم پہاڑی تنگ درّے سے گزر کر نیچے کی طرف چلے اور کوہ بچہ کے دامن میں پہنچ گئے۔ یہاں میں نے خود اپنے ہاتھ سے مسواکیں جمع کیں۔ ظہر کے وقت ہم طغائی گاؤں پہنچے جو قتلق خواجہ کی جاگیر ہے اور یہاں قیام پذیر ہوئے۔ قتلق خواجہ نے ماحضر پیش کیا جسے تناول کرنے کے بعد ہم کابل پہنچ گئے۔

پچیس تاریخ کو پیر کے دن درویش محمد ساربان کو خلعت خاصہ اور زین دار گھوڑے سے نوازا گیا اور اس سے کہا گیا کہ وہ میری ملازمت اختیار کرے۔ جواباً اظہار قبولیت کے لئے وہ زمین پر دوزانو بیٹھ گیا۔ گزشتہ چار پانچ ماہ میں میں نے حجامت نہیں بنوائی تھی چنانچہ ستائیس تاریخ کو بدھ کے دن اپنی اصلاح کروائی اور اسی دن شراب نوشی کی محفل بھی آراستہ کی گئی۔

انتیس تاریخ کو بروز جمعہ میر خورد سے کہا گیا کہ وہ ہندال کی اتالیقی قبول کرے۔ جس کا اظہار اس نے دوزانو بیٹھ کر کیا اور ہزار شاہرخی سکّے بطور تحفہ پیش کئے۔

بدھ کے دن بتاریخ پانچ ماہ رمضان تولک کوکلداش کا برلاس چکنی نام ملازم یہ عرضداشت لے کر حاضر ہوا کہ ازبک لٹیرے (بدخشاں) کے نواح میں داخل ہو گئے تو لک نے ان کے ساتھ جنگ میں پیش قدمی کی جس میں اس نے ایک ازبک کو زندہ گرفتار کر لیا اور دوسرے کا سر کاٹ لایا۔

اس مہینے کی آٹھ تاریخ کو منگل کے دن ہم قاسم بیگ کے گھر پہنچے اور روزہ افطار کیا۔ اس نے ایک زین دار گھوڑا بطور پیشکش مجھے نذر کیا۔

ہفتے کی شام کو ہم نے روزہ خلیفہ کے گھر پر افطار کیا۔ اس نے بھی ایک زین دار گھوڑا بطور پیشکش نذر کیا۔ (ورق ۲۱۷) خواجہ محمد علی اور جان ناصر کو لشکر کی مصلحت کے پیش نظر طلب کیا تھا۔ اگلے دن صبح وہ اپنی ولایات سے آپہنچے۔

بارہ تاریخ کو بدھ کے دن کامران کے ماموں سلطان مرزا بھی آگئے۔ اوپر اس بات کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ جس سال میں خوست سے کابل گیا تھا وہ کاشغر کی جانب چلے گئے تھے۔

تیرہ تاریخ کو بروز جمعرات یوسف زئی کا قصہ پاک کر دینے کے محکم ارادے سے ہم سوار ہوئے اور اس سبزہ زار میں قیام کیا جو کابل کی جانب سے وہ یعقوب کے قریب ہے۔ جس وقت ہم سوار ہوئے تو ہمارے داروغہ اصطبل نے بابا جان گھوڑے کو اچھی طرح تیار نہیں کیا گیا تھا۔ جس پر مجھے غصہ آگیا اور اس کے منہ پر ایسا گھونسا تان کر مارا کہ میری بیچ والی انگلی کی جڑ میں چوٹ آگئی اگرچہ اس وقت تو بہت زیادہ[۴۹] درد نہ ہوا مگر جس وقت ہم منزل پر پہنچے تو درد تشویشناک ہو گیا۔ کافی عرصے تک ایسی شدید تکلیف رہی کہ میں قطعی لکھ نہیں سکتا تھا۔

۴۹۔ چوٹ ہاتھ کے کس حصہ میں آئی اس میں ارسکن (ص ۲۷۴) مرزا نصیر الدین حیدر (ص ۱۴۳) اینیٹ بیورج (ص ۴۰۹) اور تھیکسٹن (ص ۲۹۶) سب مختلف رائے رکھتے ہیں۔ ہر مترجم نے اس کا مختلف ترجمہ کیا ہے۔ میڈیکل سائنس یہ کہتی ہے کہ اگر کسی کو گھونسہ مارا جائے تو جو چوٹ آتی ہے وہ عام طور پر انگوٹھی پہنے والی انگلی یا چھنگلی کے اوپر جو ہڈی ہتھیلی میں ہوتی ہے وہ ٹوٹ جاتی ہے اور اس کے جڑنے میں کئی ہفتے لگتے ہیں جیسا کہ یہاں ہوا۔ اس کا ذکر بابر آگے کرے گا (ورق ۲۲۰)

اس ایکسرے میں وہ ٹوٹی ہوئی ہڈی دکھائی گئی ہے جو گھونسہ مارنے سے ٹوٹ جاتی ہے

بالآخر یہ اپنی جگہ پر ٹھیک ہوگئی۔ اسی منزل گاہ پر میری خالہ دولت سلطان بیگم، جو کاشغر میں تھیں، کا رضاعی بھائی قتلق قدم خط وخبر لے کر آیا۔ اسی دن دلہ زاک قبیلے کے سردار نوحانی اور موسیٰ حاضر خدمت ہوئے۔

سولہ تاریخ کو اتوار کے دن قوچ بیگ آیا۔

انیس تاریخ کو بروز بدھ ہم نے کوچ کیا بتخاک کو عبور کر کے جس جگہ ہم ہمیشہ قیام پذیر ہوتے تھے اسی جگہ دریائے بتخاک کے کنارے قیام کیا۔ چونکہ بامیاں، کہمر داور غوری ولایات جو قوچ بیگ سے متعلق تھیں ازبک اس کے قرب وجوار ہی میں بسے ہوئے تھے۔ اس لئے اس کو اس یورش سے معاف رکھا گیا۔ چنانچہ اسی منزل پر میں نے اس کے سر پر وہی پگڑی رکھ دی جو میں پہنے بیٹھا تھا۔ اور اسے اپنی ولایت کی جانب جانے کی اجازت دے دی۔

اکیس تاریخ کو جمعہ کے دن ہم بادام چشمہ نامی مقام پر قیام پذیر ہوئے۔ اگلے دن صبح ہم باریک آب پہنچ کر وہاں فروکش ہوئے۔ یہاں میں نے قراتو کی سیر کی۔ اس منزل پر ہم کو ایک درخت سے شہد حاصل ہوا۔ یہاں سے بھی ہم کوچ بکوچ آگے روانہ ہوئے۔

پچیس تاریخ بروز بدھ ہم باغ وفا میں قیام پذیر ہوئے۔ بروز جمعرات یہیں مقیم رہے۔ بروز جمعہ کوچ کیا۔ اور سلطانپور کو پار کر کے پڑاؤ کرنے کے لئے اترے۔ اسی روز شاہ میر حسین اپنی ولایت سے آیا۔ اسی دن دلہ ذاک قبیلے کے سردار بوخاں اور موسیٰ کی زیر قیادت دیگر دلہ زاک قبیلے کے لوگ حاضر خدمت ہوئے۔ میرا یہ عزم تھا کہ سوات میں یوسف زئی کا قلق قمع کر دیا جائے۔ دلہ ذاک کے ملک سرداروں نے مجھے بتایا کہ وہاں بہت سے قبائل آباد ہیں۔ وہاں غلّہ بھی بکثرت موجود ہے۔ ان کا اصرار تھا کہ ہشنغر کی جانب رخ کیا جائے۔ چناں چہ اس کے لئے مشورہ کیا گیا۔ اور متفقہ فیصلہ اس امر پر ہوا کہ ہشنغر کے نواح میں تاخت وتاراج کر کے قلعہ ہشنغر، قلعہ پشاور کو منظم کر کے وہاں غلّہ ذخیرہ کیا جائے اور شاہ میر حسین نوجوانوں کے ایک دستے کے ہمراہ وہاں متعین کر دیا جائے، اس کے لیے شاہ میر حسین کو پندرہ روز کی رخصت دی گئی کہ وہ اپنی ولایت میں پہنچ کر (ورق ۲۱۸) خود کو مسلح کر کے واپس آئے۔

اگلے دن صبح وہاں سے کوچ کر کے ہم جوے شاہی پہنچے اور وہاں قیام پذیر ہوئے۔ تنگری بردی اور سلطان محمد دولدائی جو عقب میں آرہے تھے اس منزل پر ہم سے آن ملے۔ حمزہ بھی قندوز سے اسی روز یہاں آن پہنچا۔

مہینے کے آخری دن بروز اتوار جوے شاہی سے ہم نے کوچ کیا۔ ہلال عید ہمیں اسی منزل پر نظر آیا۔ درّہ نور سے شراب کو خچروں پر لاد کر لایا گیا۔ جس کے باعث محفل میں مے نوشی کی تشکیل ہوئی۔ جس میں محب علی قورچی، خواجہ محمد علی کتابدار، شاہ بیگ کالڑکا شاہ حسن، سلطان محمد شامل تھے مے نوشی سے سلطان محمد تائب تھا۔ کم عمری سے ہی میں اس اصول پر کاربند تھا کہ جو شخص شراب نوشی میں شریک نہ ہونا چاہیے اس سے پینے کے لئے اصرار نہ کیا جائے۔ اگر چہ درویش محمد ایسی محفلوں میں شریک تو رہتا مگر شراب پینے کے لئے مجبور نہ کیا جاتا۔ مگر خواجہ محمد علی اپنی حرکت سے باز نہ آیا۔ وہ بار بار اس امر پر اصرار کرتا کہ وہ بھی بادہ کشی میں شریک ہو۔

عید کے دن بروز پیر صبح کے وقت ہم نے کوچ کیا۔ راستے میں خمار شکنی کے لئے معجون کا سہارا لیا گیا۔ جس وقت اس کی چسکیاں لی جا رہی تھیں تو کسی شخص نے اندر سے اس کا پھل لاکر دکھایا۔[۵۰] درویش محمد نے یہ پھل کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ ہندوستان کا تربوز ہے اور اس کی ایک کرچ کاٹ کر اس کو دی۔ بڑی رغبت سے اس نے اس پر دانت مارا لیکن اس کی کڑواہٹ رات تک اس کے منہ سے نہ گئی۔

گرم چشمہ پہنچ کر ہم نے یہاں ایک پشتے پر قیام کیا۔ ابھی ہم یخنی پی رہے تھے کہ اسی اثنا میں لنگر خاں

۵۰۔ افیون کا پوست۔ بابر نے یہاں لفظ حنظل استعمال کیا ہے اینیٹ بیورج (ص ۴۱۰) اور تھیکسٹن (ص ۲۹۷) نے اس کو کولوسنتھ (اندارین کڑوا کھیرا) بتایا ہے لیکن کیونکہ بات معجون (افیون) کی ہو رہی ہے تو ظاہر ہے پھل اسی سے متعلق ہونا چاہیے۔ بابر نے لفظ حنظل صحیح استعمال نہیں کیا پوست زیادہ درست ہے

حاضر ہوا۔ یہ اس جگہ پر بہت عرصے سے مقیم تھا۔ حاضر خدمت ہو کر اس نے ایک گھوڑا اور معجون پیش کی۔[51] اس کے بعد ہم یدہ بیر نامی جگہ پر قیام پذیر ہوئے۔ عصر کے وقت میرے کچھ مخصوص ندیم بیڑے پر سوار ہوئے (ورق ۲۱۸) جو تیرتا ہوا تقریباً ایک کوس نیچے کی طرف نکل گیا۔ اس سے اتر کر اگلے روز صبح ہم نے وہاں سے کوچ کیا اور درّہ خیبر کے سرے پر قیام پذیر ہوئے سلطان بایزید کو جیسے ہی ہمارے بارے میں اطلاع ملی وہ بھی پیچھے سے روانہ ہوا اور بارہ کی سڑک پر چل کر نیلاب سے ہمارے پاس پہنچ گیا۔ اس نے اطلاع دی کہ آفریدی افغان[52] اپنے خاندان اور مال متاع کے ساتھ بارہ میں رہ رہے ہیں۔ انھوں نے دھان کی بہت اچھی کاشت کی ہے جواب تیار کھڑی ہے۔ چوں کہ ہمارا یہ پختہ ارادہ تھا کہ ہشنغر پر حملہ کر کے یوسف زئی خاندانوں کو تاخت وتاراج کیا جائے اس لیے ہم نے ان کے بارے میں کوئی پرواہ نہ کی۔

دوپہر کے بعد محمد علی کی منزل گاہ پر شراب نوشی آراستہ کی گئی۔ اسی محفل میں یہاں تک پہنچنے کی پوری کیفیت تفصیل کے ساتھ لکھ کر سلطان تراہی کے ہاتھ خواجہ کلاں کے لئے باجوڑ روانہ کی گئی۔ اور اس کے حاشئے پر یہ شعر بھی لکھ دیا:

صبابہ لطف بگو آن غزال رعنارا　　　که سر بگو و بیابان تو داده مارا[53]

(اے صبا اس غزال زیبا کو یہ پیغام دینا کہ تو نے ہی ہمیں کوہ و بیابان میں سرگرداں کر رکھا ہے)

اگلے دن ہم نے صبح وہاں سے کوچ کیا۔ کربان اور خیبر کے تنگ راستوں سے گزر کر علی مسجد پہنچ کر وہاں قیام پذیر ہوئے اور یہاں اپنے ساز وسامان کو خیر باد کہا۔ جس وقت ہم دریائے کابل کے کنارے پہنچے دوپہر رات گزر چکی تھی اور تھوڑی دیر سو کر آرام کیا۔ بوقت سحر ہمیں ایک بیڑا نظر آ گیا جس پر ہم نے دریا کو پار کیا۔ قراول دستہ کے ذریعے پتہ لگا کہ افغانوں کو چونکہ ہماری آمد کی اطلاع ہوگئی ہے اس لیے وہ فرار ہوگئے ہیں۔ ہم نے دریائے سوات کو عبور کر کے اس میدان میں قیام کیا جہاں افغان کاشت کیا کرتے تھے۔ جس قدر اناج کا ذخیرہ بتایا گیا تھا اتنا تو کیا اس کا چوتھائی حصّہ بھی ہمارے ہاتھ نہ آیا (ورق ۲۱۹) ہشنغر کو مستحکم کرنے کا منصوبہ اس بنا پر تیار کیا گیا کہ یہاں سے غلّہ ملنے کی امید تھی لیکن اب اس کو بدل دیا گیا۔ دلہ ذاک کے وہ ملک جو اس یورش میں شامل تھے انھیں اس صورت حال پر سخت پشیمانی تھی۔

اس روز ظہر کے وقت ہم نے دریائے سوات کو کابل کی جانب عبور کر کے اس کے ساحل پر اترے۔ اگلے دن صبح دریائے سوات سے کوچ کر کے دریائے کابل سے گزرے اور اس کے ساحل پر قیام پذیر ہوئے۔ وہ امر جو صلاح ومشورے میں شریک رہے تھے انھیں طلب کیا گیا اور متفقہ فیصلہ اس امر پر ہوا کہ سلطان بایزید کی تجویز کے پیش نظر آفریدی افغانوں پر یورش کی جائے۔ ان کے مال وغلے کو پشاور میں ذخیرہ کیا جائے اور کسی شخص کو اس کی نگہبانی کے لئے مقرر کیا جائے۔ ہندو بیگ اور خوست کے امیر زادگان اسی منزل پر ہم سے آ ملے۔ آج معجون کی چسکیاں لی گئیں۔ درویش محمد ساربان، محمد کوکلداش، گدائی طغائی اور عسس اوغان تو اس وقت وہاں موجود ہی تھے اس کے بعد ہم نے شاہ حسین کو بھی بلا لیا۔ ظہر کے وقت ہم بیڑے پر سوار ہوئے اور عصر کے وقت اس سے اتر کر ہم خیمہ گاہ پہنچ گئے۔

فیصلہ کے مطابق ہم نے صبح دریا کنارے سے کوچ کیا اور جام نامی جگہ سے دریا کو پار کر کے اس جگہ فروکش ہوئے جہاں سے دریا علی مسجد کے پاس نکلتا ہے۔ سلطان علی کا آدمی ابوالہاشم ہمارے عقب میں چلا آ رہا تھا۔ اس نے پہنچ کر بتایا کہ شب عرفہ[54] اس وقت جب کہ میں جوئے شاہی عبور کر رہا تھا میری ایک ایسے شخص سے اتفاقاً ملاقات ہوگئی جو بدخشاں کی جانب سے آ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے آنے کا سبب کیا ہے جس پر اس نے بتایا کہ میں بادشاہ کو یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ (سلطان سعید خان نے بدخشاں پر حملہ کر دیا)

۵۱۔ پوست کی کاشت جو آجکل بڑا مسئلہ ہے ہمیشہ سے وہاں آ گائی جاتی رہی ہے اور اس کو یہاں بطور تحفہ پیش کیا جا رہا ہے۔

۵۲۔ آفریدی پٹھان۔ کرلانڑی پٹھان ہیں جس کے لئے دیکھیں کرلانڑی کا حال سنہ ۹۱۰ھ نوٹ ۵۴

۵۳۔ یہ شعر دیوان حافظ (ص ۱۵) سے ہے۔ اینٹ بیورج نے اس شعر کو اور پولاد سلطان کے لئے جو شعر لکھا گیا (ورق ۲۱۳) دونوں کا مخاطب کسی خاتون کو سمجھا۔ دو مردوں یا عورتوں کے درمیاں غیر جنسی دوستی کا مغرب میں تصور نہیں۔

۵۴۔ شب عرفہ۔ یہاں اینٹ بیورج (ص ۴۱۲) تھیکسٹن (ص ۲۹۸) اور ارسکن (ص ۲۷۷) اس بات پر متفق ہیں کہ شب عرفہ غلطی ہے۔ یہ شب عید ہونا چاہیے جو ۲۶ ستمبر ۱۵۱۹ کو پڑی تھی۔ عربی لفظ عرفات ہے لیکن ترکی میں عرفہ بھی مشہور ومعلوم ہے (ترکی انگلش ڈکشنری ص ۱۲۹۵) شب عرفات اسلامی اصول سے عرفات سے پہلے والی رات ہوئی یعنی ۸ ذوالحج

اس خبر کے سنتے ہی مشورے کے لیے امرا کو طلب کیا گیا۔ وہاں کا قلعہ مضبوط کرنے میں مصلحت نظر نہ آئی۔ اب ہم نے بدخشاں کی طرف جانے کا عزم کیا۔ لنگر خاں کو خلعت سے نوازا گیا۔ محمد علی جنگ جنگ کو اس کا مددگار متعین کر کے اسے ساتھ جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اس رات (ورق ۲۱۹) خواجہ محمد علی کے خیمے میں محفل مے نوشی آراستہ کی گئی۔ اگلے روز بوقت صبح وہاں سے کوچ کر کے ہم نے درۂ خیبر کی تنگ راہوں کو طے کیا اور وہاں سے نکل کر اس کے سرے پر قیام پذیر ہوئے۔

خضر خیل کی جانب سے بہت سی ناشائستہ حرکات سرزد ہو چکی تھیں۔ وہ لشکر جو عقب میں رہ گیا تھا اور وہ فوجی دستے جو ابھی دریا کے کنارے پر مقیم تھے ان کی آمد و رفت پر تیر اندازی کر کے کچھ لوگ مشکلات پیدا کر رہے تھے، اور دریا کے کنارے مقیم سپاہ کے گھوڑے زبردستی چھین رہے تھے۔ انھیں ان کے کئے کی سزا دینا اور ان کی گوشمالی کرنا اب لازم ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس خیال کے پیش نظر درّے کے زیرین حصے سے میں نے بوقت سحر کوچ کیا۔ وہ غلامان میں نصف روز گزار کر اور نماز ظہر ادا کر کے گھوڑوں کو دانہ پانی دیکر ہم پھر سوار ہوئے۔ محمد حسین قورچی کو کابل کی جانب دوڑا گیا کہ وہاں جتنے بھی خضر خیل کے افراد ہیں انھیں گرفتار کیا جائے۔ اگر بدخشاں کی جانب سے کوئی خبر نہ آئے تو اس کا مفصل حال لکھ کر کسی بھی شخص کے ہاتھ جلدی روانہ کریں۔ اس رات میں دو گھڑی وقت گزر جانے کے بعد تک ہم اپنے گھوڑوں پر سفر کرتے رہے۔ سلطان پور سے تھوڑی دور آگے نکل جانے کے بعد ہم نے کچھ دیر کے لئے قیام کیا۔ تھوڑی دیر سو کر دوبارہ سوار ہوئے خضر خیل کے لوگ بہار اور پنج گرام سے کرسو تک آباد ہیں۔ صبح ہونے تک ہم ان کے سروں پر آ رہے اور ان پر حملہ کر دیا۔ ان کا بیشتر مال و متاع اور بہت سے بچے ہماری سپاہ کے ہاتھ لگے۔ چونکہ پہاڑ نزدیک ہی تھا اسی لئے ان میں سے کچھ نے پسپا ہو کر وہاں پناہ لی۔

اگلے روز صبح قیلا غو نامی جگہ پر قیام پذیر ہوئے۔ ہمارا ساز و سامان جو عقب میں رہ گیا تھا وہ ہمیں اس منزل پر مل گیا۔ وزیری[55] افغانوں نے کبھی بھی اطمینان بخش خراج ادا نہیں کیا۔ مگر جب گوشمالی کی گئی تو اس کی پاداش میں وہ تین سو (ورق ۲۲۰) بھیڑیں بطور پیشکش لے کر حاضر ہوئے۔

جس دن سے میرا ہاتھ میں چوٹ لگی تھی نے اس وقت سے کوئی بھی چیز قلمبند نہیں کی تھی۔ اسی منزل پر چودہ تاریخ کو بروز اتوار میں نے تھوڑا لکھا۔[56]

اگلے دن صبح افغان سردار قبائل خرلچی اور شمو خیل حاضر خدمت ہوئے۔ دلہ ذاک قبیلے کے سرداروں نے انتہائی عاجزی سے درخواست کی کہ میں ان کے قصور معاف کر دوں۔ چنانچہ میں نے ان کے قصور معاف کر دیئے۔ ان کے قیدیوں کو رہائی دے دی گئی اور مقرر کیا گیا کہ وہ چار ہزار بھیڑیں بطور خراج پیش کریں۔ ان کے امرا کو خلعت سے نوازا گیا اور تحصیل دار مقرر کر کے انھیں وصولیابی کے لیے روانہ کیا گیا۔ ان کاموں سے فارغ ہونے کے بعد اٹھارہ تاریخ بروز جمعرات ہم نے کوچ کیا۔

باغ وفا

بہار پنج گرام پہنچ کر وہاں قیام پذیر ہوئے۔ اگلے دن صبح میں باغ وفا پہنچا۔ اس وقت اس باغ کا حسن اپنے پورے شباب پر تھا۔ اس کے تمام صحن سرسبز تھے انار اس وقت پک کر ایسے دلکش زرد رنگ کے ہو گئے تھے جیسے خزاں کے موسم میں ہو جاتے ہیں۔ نارنج کے درخت سرسبز و شاداب نظر آ رہے تھے جن پر بے شمار نارنج لدے ہوئے تھے لیکن یہ ابھی خاطر خواہ حد تک زرد نہیں ہوئے تھے۔ اگرچہ یہاں کے انار بہت ہی عمدہ ہوتے ہیں مگر اتنے اچھے نہیں جتنے ہمارے ولایت میں پائے جاتے ہیں۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ ہم باغ وفا کی دلکشی سے محظوظ ہوئے۔ ہم باغ وفا میں تین چار دن مقیم رہے۔ اس عرصے میں ہمارے لشکر کے تمام لوگوں نے کثرت سے انار کھائے۔

۵۵۔ وزیری افغان۔ یہ کرلانڑی پٹھان ہیں۔ گفتگو زم پشتو میں کرتے ہیں۔ اپنے بال لمبے رکھتے ہیں (کیرو ص ۲۰)

۵۶۔ ہاتھ پر چوٹ ۱۳ ستمبر ۱۵۱۹ کو لگی تھی اور پہلی مرتبہ ۱۹ اکتوبر کو بابر نے لکھنا شروع کیا یعنی ۲۶ دن بعد۔

تخت بابری۔ کلر کہار

باغ صفا

تخت بابری۔ کلر کہار

قلعہ پرحالہ کے کھنڈرات فصیل اور دو دروازے باقی ہیں۔

پیر کے دن ہم نے باغ وفا سے کوچ کیا۔ میں وہاں ایک پہر تک رُکا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ نارنج جمع کر لیں۔ شاہ حسن کو دو درختوں کے نارنج بطور انعام دیئے گئے۔ امرا میں سے بعض کو ایک درخت اور بعض کو دو نارنج کے درخت کے پھل انعام میں دیئے گئے۔ چوں کہ موسم سرما میں لمغان کی سیر کا ارادہ تھا اسی لیے میں نے حکم دیا کہ حوض کے اطراف میں جو نارنج کے درخت ہیں ان میں سے بیس درختوں کی میرے لئے حفاظت کریں۔ اس روز ہم گندمک میں قیام پذیر ہوئے اور اگلے دن ہمارا قیام جکدالیک نامی مقام پر ہوا۔ غروب آفتاب کے وقت محفل بادہ نوشی ترتیب دی گئی۔ جس میں اکثر قرابت دار شریک تھے۔ محفل کی برخاستگی کے قریب قاسم بیگ کے بھانجے گدائی محمد نے نشے میں شرارت کی۔ اور اس تکیے کا سہارا لیا جو میرے پہلو میں تھا۔ گدائی طغائی نے اس کو وہاں سے اٹھایا اور اسے باہر لے گیا۔

اس منزل سے اگلے دن ہم نے کوچ کیا۔ اور میں قورروق سائی کی جانب باریک آب کی سیر کے لیے چڑھائی کی طرف روانہ ہوا۔ فصل خزاں میں چند صنوبر کے درخت اپنے پورے شباب پر آچکے تھے ہم اس جگہ فروکش ہوگئے اور پھر یخنی پی۔ موسم خزاں اس امر کا باعث ہوا کہ اس جگہ محفل بادہ نوشی ترتیب دی جائے۔ راستے میں ایک بھیڑ مل گئی۔ یار لوگ اسے پکڑ لائے چنانچہ میں نے حکم دیا کہ اس کو بھون کر کباب بنائے جائیں۔ بلوط کے درخت کی شاخوں کو روشن کر کے تفریح کرتے رہے۔

عبدالملک دیوانہ کی درخواست پر اس کو میرے یہاں آنے کی اطلاع کابل پہنچانے کے لئے روانہ کیا گیا مرزا خاں سے علیحدہ ہو کر حسن نبیرہ میرے پاس آ گیا تھا۔ وہ اسی منزل پر حاضر خدمت ہوا۔ اور میری ملازمت اس نے اختیار کر لی۔ غروب آفتاب تک یہاں بادہ نوشی کا دور جاری رہا۔ اس کے بعد ہم یہاں سے سوار ہوئے۔ اہل محفل شراب نوشی کے باعث بدمست ہو چکے تھے۔ سیّد قاسم کی تو عالم مستی میں یہ حالت ہوگئی تھی کہ دو آدمیوں نے (ورق ۲۲۱) بمشکل تمام اسے گھوڑے پر لاد کر خیمہ گاہ تک پہنچایا۔ دوست محمد باقر ایسا مست ہو چکا تھا کہ محمد امیر ترخاں، مستی چہرہ اور اس کے ساتھیوں نے ہر چند گھوڑے پر اس کو سوار کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اگر چہ اس کے سر پر پانی بھی پھینکا گیا مگر اسے ہوش نہ آیا۔ اسی اثنا میں افغانوں کا ایک دستہ نظر آیا۔ امین محمد ترخاں تو عالم بدمستی میں یہ تک سوچنے لگا کہ اس سے پہلے کہ افغانوں کا دستہ دوست محمد کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے جائے کیوں نہ ہم اس کا سر کاٹ کر اپنے ساتھ لے چلیں۔ بمشکل تمام اسے گھوڑے پر لادا اور سہارا دیے ہوئے لے کر آئے۔ بلآخر آدھی رات کے وقت ہم کابل پہنچ گئے۔

قل بیگ ایلچی کی حیثیت سے سلطان سعید خان کے پاس کاشغر ہو گیا تھا۔ اگلے روز وہ دیوان میں پہنچا اور خدمت بجالایا اس کے ساتھ بشکہ مرزا ایتارچی [57] ایلچی بن کر آیا تھا۔ وہ اپنی ولایت سے سوغات کا بہت سا سامان لے کر یہاں پہنچا تھا۔

چاند رات ذیقعد بروز بدھ میں اکیلا ہی گور قابیل پر پہنچا [58] اور وہاں صبوحی کا اہتمام کیا۔ اسکے بعد وہاں اہل مجلس میں سے ایک دو لوگ اور بھی آ گئے۔ جس وقت آفتاب کے باعث حرارت اور بھی زیادہ ہوگئی تو ہم باغ بنفشہ میں پہنچ گئے اور وہاں حوض کے کنارے بادہ نوشی شروع کر دی۔ دوپہر کے وقت ہم آرام کرنے کے لیے سو رہے۔ جب دوپہر کا وقت ڈھل گیا تو دوبارہ مہ خواری کا دور چلا۔ اس محفل میں جن لوگوں کو بادہ آشامی سے محروم رکھا گیا تھا میں نے انھیں شراب پینے کے لیے دی۔ عشا کے وقت میں نے حمام کی جانب رُخ کیا اور وہ رات حمام میں ہی بسر کی۔

بروز جمعرات ہندوستان کے سوداگروں کو جن کا سردار یحییٰ نوحانی تھا خلعتوں نے نواز کر جانے کی اجازت دی گئی۔

۵۷۔ بشکہ مرزا ایتارچی۔ یہ کاشغر کے قبیلے کے سردار تھے (حیدر مرزا دوغلت ص ۳۰۷)

۵۸۔ ہابیل اور قابیل۔ کابل کے جنوب مغرب میں ایک پہاڑی ہے جس کو بابر "شاہ کابل" کہتا ہے (ورق ۱۰۸ ب) اس جگہ قابیل کی قبر ہوا کرتی تھی۔ ارسکن کے بموجب (ص ۱۳۶ نوٹ ۵) اب یہ بابر کے نام سے مشہور ہے اور بابر کی قبر یہیں ہے۔ کابل کا نام بھی قابیل پر ہے۔ ہابیل اور قابیل اسلامی ادب میں مشہور نام ہیں۔ قران میں بھی ان کا ذکر آدم کے بیٹوں کے نام سے آیا ہے (۵: ۲۷۔۳۱) احادیث اور قصص الانبیاء میں ذکر ہے کہ کس طرح قابیل نے ہابیل کو قتل کیا اور پھر کوؤں کو دیکھ کر ان کی نقل کرتے ہوئے ہابیل کی لاش چھپا دی (قصص الانبیاء ۱۹۔۲۱)

بشکہ مرزا جو کاشغر سے آیا ہوا تھا۔ چار تاریخ کو بروز ہفتہ اسے بھی خلعت پہنا کر اور انعام سے نواز کر جانے کی اجازت دے دی گئی۔

اتوار کے دن اس نگارخانے میں جو صدر باغ کے چار دروازے کی بالائی منزل پر واقع ہے محفل گرم رہی۔ اگرچہ یہ حجرہ تنگ ہی ہے لیکن اہل مجلس میں سے سولہ فرد اس میں سما ہی گئے۔

پیر کے دن ہم موسم خزاں کا منظر دیکھنے کے لیے استالیف تک نکل گئے۔ آج کے دن معجون سے لطف اٹھانے کا اہتمام کیا گیا۔ اس رات چوں کہ بارش کثرت سے ہوئی تھی اسی لیے میرے وہ اکثر قرابت دار جو ہمراہ تھے میرے خیمے میں آگئے جو باغ میں نصب کیا گیا تھا۔ اگلے دن صبح اسی باغ میں محفل بادہ نوشی کا اہتمام کیا گیا۔ چنانچہ رات تک یہ دور چلتا رہا اگلے دن صبوحی کا اہتمام کیا گیا اور سب عالم مستی میں سوگئے۔ ظہر کے وقت اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر ہم استالیف سے روانہ ہوئے۔ اور راستے میں معجون کی چسکیاں لیتے رہے۔ عصر کے وقت ہم بہزادی۔ جس وقت فصل خزاں کا حسن اپنے شباب پر تھا اسی وقت معجون کی چسکیاں خوب لی جاچکیں تھی مگر اس کے باوجود ان درختوں کے نیچے بیٹھ کر جن پر خزاں کا نکھار چھایا ہوا تھا مے نوشی کی گئی۔ عشا کے وقت تک ہمارے نشت اسی جگہ رہی۔ خلیفہ کا ملاّ محمود بھی اس جگہ آنکلا۔ ہم نے اسے بھی محفل میں شریک کرلیا۔ عبداللہ پر نشہ بہت زیادہ تھا۔ خلیفہ کے خلاف اس کے بات نکل ہی گئی۔ اس نے ملاّ محمود کی پرواہ کیے بغیر یہ مصرعہ پڑھ دیا:

درهر که بنگری بهمین داغ[59] مبتلاست

(جس کو بھی دیکھو وہ اسی عیب میں مبتلا ہے)

(ورق ۲۲۲) ملاّ محمود نشے میں نہیں تھا چوں کہ عبداللہ نے یہ مصراع بطور ہزل پڑھا تھا اسی لئے اس نے اس پر اعتراض کر دیا۔ عبداللہ نے موقع کی نزاکت کو جان لیا اس لیے نادم و پشیماں ہو کر چاپلوسی شروع کر دی۔

سولہ تاریخ کو بروز جمعرات باغ بنفشہ میں معجون کی چسکیاں لی گئیں۔ میں خواص کے ساتھ کشتی میں سوار ہوا۔ بعد میں ہمایوں اور کامران بھی آگئے۔ ہمایوں نے ایک مرغابی پر کامیاب نشانہ تانو اور اسے گرالیا۔

اٹھارہ تاریخ کو بروز ہفتہ ہم دوپہر کے وقت چار باغ پر سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ میں نے پہرہ دار اور داروغہ اصطبل کو واپس بھیج دیا۔ پل بابا کو عبور کر کے دیورین کی تنگ راہوں سے گزر کر قوش نادور کا چکر کاٹتے کاریز[60] خسر سخانہ کے پیچھے سے تردی بیگ خاکسار کاریز پر پہنچ گئے۔ تیردی بیگ کو جیسے ہی ہماری آمد کی اطلاع ملی مضطرب وسراسیمہ دوڑتا ہوا آیا۔ چوں کہ مجھے معلوم تھا کہ وہ قلاش ہے اسی لیے سوشاہرخی سکے میں نے اپنے ساتھ لے لے تھے جو میں نے اسی کے حوالے کردیئے۔ اور کہا کہ شراب نیز دیگر اشیاء کا اہتمام کرے کیونکہ میرا ارادہ ہے کہ خلوت میں محفل عیش ونوش بپا کروں۔ شراب لانے کے لیے تردی بیگ نے بہزادی کی جانب رُخ کیا۔ میں نے تردی بیگ کے غلام کو اپنا گھوڑا دیکر ایک درّے کی طرف روانہ کردیا۔ اور خود کاریز کے پیچھے ایک پشتے پر جا کر بیٹھ رہا۔ ایک گھڑی اس وقت گزری تھی کہ شراب کا خم لیے تردی بیگ آن پہنچا۔ اور ہم مے نوشی میں مشغول ہوگئے۔ جس وقت شراب کا کوزہ تردی بیگ اپنے ساتھ لا رہا تھا محمد قاسم (ورق ۲۲۲ ب) برلاس اور شاہزادہ نے اسے لاتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس بات سے بے خبر کہ میں وہاں موجود ہوں وہ بھی تردی بیگ کے پیچھے پیچھے آگئے۔ ہم نے انھیں بھی اسی محفل میں شریک کرلیا۔ اسی اثنا میں تردی بیگ نے کہا ہل انیکہ کی یہ تمنا ہے کہ وہ بھی شریک محفل ہو کر بادہ نوشی کرے۔

میں نے اس سے کہا کہ اس سے قبل میں نے ہرگز کسی عورت کو شراب نوشی کرتے نہیں دیکھا چنانچہ اسے بھی شریک محفل ہونے کی دعوت دی گئی۔ شاہی قلندر اور اس رباب نواز کو بھی شامل محفل کرلیا جو کاریز

۵۹۔ داغ۔ مولوی سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ میں داغ کے معنی دھبا، نشان، چتی، جھائیں، کلنک اور عیب کے لکھے ہیں۔ یہاں شعر میں عیب سے بہتر کوئی معنی نکلتے نہیں (ج ۲/ص ۲۲۲)

۶۰۔ کاریز: وہ زمین دوز نالیاں جن سے پہاڑوں سے پانی میدانی خشک علاقوں میں لایا جاتا ہے۔ بنجر زمینوں تک یہ پانی پہنچانے کا عمدہ طریقہ ہے۔ کاریز کو عربی میں قنات کہتے ہیں۔ یہی وسط اشیاء، ایران افغانستان اور بلوچستان میں پائی جاتی ہیں۔ اسلامی دور میں ان کو ترقی دی گئی۔ کاریز کی دیکھ بھال پانی کی تقسیم اور اس کی اجرت کے لئے علیحدہ نظام وعمال مقرر تھے۔ زمین دوز پانی کی ترسیل سے خشک علاقوں میں پانی آبی بخارات بن کر کم ضائع ہوتا ہے۔ یہ اس قدر گنجائش کی ہوتی ہیں کہ ایک آدمی لیٹ کر اندر جا سکتا ہے۔

پہاڑوں میں مختلف سطحوں پر زیر زمین پانی جمع ہوتا ہے۔ اس تک ایک کنواں کھودا جاتا ہے۔ ایک دوسری نالی جہاں پانی لے جانا ہوتا ہے وہاں سے اس کنویں تک لائی جاتی ہے اس کی پیائش ۴×۳ فٹ تک ہوتی ہے اور یہ عمودی کنویں کے پانی کی سطح کے نیچے آکر ملتی ہے۔ افقی بہریا نالی می کچھ کچھ فاصلے پر عمودی نالیاں کھودی جاتی ہے تاکہ زیر زمین بہتے پانی تک پہنچا جاسکے اور اس کو ہوا ملتی رہے۔ افقی نالیوں کی ڈھلان بہت معمولی رکھی جاتی ہے کہ پانی کا بہاؤ کم اور ہلکا ہو۔ اور وہ اپنے ساتھ مٹی نہ لے جائے جس سے کاریز بند ہو جاتیں۔ عمودی نالیاں دو فٹ چھ انچ قطر کی ہوتی ہیں۔

کاریز کی لمبائی ۵ سے ۱۰ میل تک عام طور پر ہوتی ہے لیکن بعض تو ۳۰ میل لمبی بھی ہیں۔ اصل کنواں گہرائی میں ۲۵ فٹ سے ہزار فٹ تک ہوسکتا ہے۔

کاریز بنانے اور اس کی دیکھ بھال کرنے والے مقنی کہلاتے ہیں۔ (انسائیکلوپیڈیا اوف اسلام۔ کے این چودھری۔ ایشیاء بیفور یورپ ص ۲۴۱۔)

سے وابستہ تھا۔ کاریز کے عقب میں جو پشتہ تھا اس پر بیٹھ کر ہم غروب آفتاب تک شراب نوشی کرتے رہے۔ اس کے بعد ہم دی بیگ کے گھر پہنچ گئے۔ یہاں بھی شمع کی روشنی میں دیر تک شغل بادہ پیمائی کرتے رہے۔ عجب پر کیف عیش کی محفل تھی۔ میں تکیہ کا سہارا لیکر بیٹھ گیا۔ اہل مجلس دوسرے مکان میں چلے گئے جہاں نصف شب کا نقارہ بجنے تک پینے کا شغل کرتے رہے۔ بل اہل انیکہ آئی اور زیادہ شور غوغا کرتی رہی بالآخر میں نے یہ ظاہر کر کے یہ شراب کے نشے میں بدمست ہوں اس کے شر سے نجات حاصل کی۔

میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ لوگوں کو خبر کیے بغیر خود ہی تنہا گھوڑے پر سوار استرغچ کی جانب چلا جاؤں لیکن انھیں میرے ارادے کا علم ہوگیا اور یہ مقصد پورا نہ ہوسکا۔ آخر کار جس وقت آدھی رات کا ڈنکا بجا میں سوار ہوا اور تردی بیگ اور شاہزادہ کو مطلع کر کے ہم تین آدمی استرغچ کی جانب روانہ ہوئے۔ بوقت فجر ہم خواجہ حسن پہنچے جو استالف کے آخری سرے پر واقع ہے۔ یہاں ہم کچھ دیر تک قیام پذیر رہے۔ اس اثناء میں معجون کی چسکیاں بھی لیں اور موسم خزاں کا بھی لطف۔ طلوع آفتاب کے وقت باغ استالف میں پہنچ کر قیام کیا اور یہاں کے انگور کھا کر پھر سوار ہوئے۔ یہاں سے خواجہ شہاب نامی گاؤں پہنچے جو استالف کے تابع واقع ہے۔ اور آرام کرنے کے لیے سوگئے (ورق ۲۲۳) داروغہ اصطبل اتا میر آخور ہیں موجود تھا۔ ہمارے بیدار ہونے تک اس نے شوربا آش تیار کرلیا تھا جسے اس نے شراب کے ساتھ ہمیں پینے کے لیے پیش کیا۔ موسم سرما کا حسن شباب پر تھا۔ ہم چند پیالے پی کر پھر اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ ظہر کے وقت استرغچ کے ایک دل نشیں باغ میں پہنچ کر وہاں قیام پذیر ہوئے۔ یہاں بھی مجلس ہمنشینی تشکیل دی۔ اسی لحظہ بعد خواجہ محمد امین وہاں آن پہنچا۔ چنانچہ رات کو دیر تک عیش ونوش کا دور جاری رہا۔ اسی دن اور رات کے دوران عبداللہ نور بیگ اور یوسف علی کابل سے آگئے۔ اگلے صبح شوربا پی کر ہم اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ استرغچ کے نشیب میں بادشاہی باغ ہے۔ جہاں جا کر ہم نے اس کی خوب سیر کی۔ سیب کے ایک پورے پر عجیب خزاں کا نکھار تھا۔ اس کے تنے سے جو شاخیں نکل رہی تھیں ان میں سے کچھ پر پانچ چھ پتے لگے رہ گیے تھے۔ اگر نقاش چاہتے بھی کہ اس نہال کی تصویر کشی کریں تو سعی وکوشش کے باوجود وہ ایسی دل کش نقاشی نہیں کرسکتے تھے۔ خواجہ حسن میں کھانا کھا کر ہم گھوڑوں پر سوار ہوئے اور مغرب کے وقت بہزادی پہنچ گئے۔ خواجہ محمد امین کا ملازم محمد نامی شخص تھا جس کے گھر میں بادہ پیمائی کی۔

اگلے دن صبح بروز ہفتہ ہم کابل کے چار باغ میں قیام پذیر ہوئے۔ تئیس تاریخ کو بروز جمعرات ہم نے کوچ کیا اور قلعے میں قیام پذیر ہوئے۔ بروز جمعہ محمد علی حیدر رکابدار ایک شاہین پکڑ لایا اور مجھے پیش کیا۔

پچیس تاریخ کو بروز منگل چنار باغ میں محفل ترتیب دی گئی۔ عشا کے وقت ہم گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ سیّد قاسم پچھلے واقعہ سے پشیماں تھا جو اس سے سرزد ہوا تھا۔[۶۱] اس کے گھر پہنچ کر (ورق ۲۲۳) ہم وہاں پر فروکش ہوئے اور چند پیالوں سے بادہ آشامی کی۔

چاندرات الحجہ بروز جمعرات قندہار سے تاج الدین محمود آیا اور حاضر خدمت ہوا۔

انیس تاریخ کو بروز پیر محمد علی جنگ جنگ نیلاب سے میرے پاس پہنچ گیا۔

منگل کے دن بھیرہ سے سنکر خان جنجوہہ سے آیا اور حاضر خدمت ہوا۔ جمعہ تیئس تاریخ کو میں نے علی شیر بیگ کے چار دیوانوں میں سے انتخاب کیا۔ ستائیس تاریخ کو بروز منگل قلعے میں محفل ترتیب دی گئی۔ اس نشت میں یہ فرمان صادر کیا گیا کہ اگر کوئی شخص بعالم مستی حد سے تجاوز کرجائے تو اس کو نکال دیا جائے اور اس کی جگہ کسی دوسرے شخص کو اس محفل میں شرکت کی دعوت دی جائے۔

آخری ذوالحجہ بروز جمعہ ہم لمغان کی سیر کرنے کے ارادے سے سوار ہوئے۔

۶۱۔ سید قاسم کی پشیمانی: سید قاسم نشے میں دھت ہوگیا تھا اور لوگوں نے اس کو بمشکل گھوڑے پر سوار کرایا تھا (ورق ۲۲۰۔ ۲۲۱)

واقعات ۹۲۶ھ

(۲۳ ۔ دسمبر ۱۵۱۹ء ۔ ۱۲ دسمبر ۱۵۲۰ء)

پہلی محرم بروز ہفتہ ہم خواجہ سہہ یاراں نامی مقام پر پہنچے۔ اس جگہ پشتے پر جو نہر نکال کر لائی گئی تھی اس کے کنارے پر محفل بادہ نوشی آراستہ کی گئی۔ اگلے دن اس جگہ سے سوار ہو کر ہم ریگِ رواں کی سیر کرنے کیلئے روانہ ہوئے۔ یہاں سیّد قاسم کے بلبلی خانے میں قیام پذیر ہوئے۔ یہاں بھی محفل ہم نشینی کا اہتمام کیا گیا۔ اگلے دن صبح یہاں سے سوار ہوئے۔ راستے میں معجون کی چسکیاں لیتے رہے اور ملکر پہنچ کر وہاں فروکش ہوئے۔ اگرچہ اس رات ہم نے شراب نوشی تو نہیں کی مگر اگلے دن صبوحی کا اہتمام ضرور کیا گیا۔ ظہر سے قبل ہم دُرنامہ پہنچے اور محفل مے نوشی آراستہ کی۔ اسکے اگلے دن صبوحی سے بھی لطف اندوز ہوئے۔ دُرنامہ کے چودھری حق داد نے اپنے باغ کی پیشکش کی۔

بروز جمعرات ہم سوار ہوئے۔ نجراؤ پہنچ کر ہم تاجکوں کے ایک گاؤں میں قیام پذیر ہوئے۔

بروز جمعہ اس پہاڑی پر جو چہل قلبہ اور (ورق ۲۲۴) دریائے باران کے درمیان واقع ہے ہم شکار کے لئے سوار ہوئے۔ یہاں ہم نے کثیر تعداد میں ہرنوں کا شکار کیا۔ جس وقت سے میرے ہاتھ میں چوٹ لگی تھی میں نے تیر اندازی نہیں کی تھی[1]۔ اس مرتبہ اس ہلکی کمان سے جو میرے ساتھ رہتی تھی ہرن کے کندھے پر اس طرح نشانہ لگایا کہ تیر کے اوپر کا نصف حصہ تک اس کے شانے میں اتر گیا۔ عصر کے وقت ہم شکار سے واپس آئے اور نجراؤ میں پہنچ گئے۔ اگلے دن یہ فیصلہ کیا گیا کہ نجراؤ کے لوگ ساٹھ مثقال سونا بطور پیشکش ادا کریں۔

پیر کے دن ہم لمغان کی سیر کرنے کے قصد سے سوار ہوئے۔ ارادہ تو یہ تھا کہ ہمایوں کو ساتھ لے چلیں مگر اس نے سیر پر آرام کو ترجیح دی۔ چنانچہ اسے درّہ کورہ سے واپس چلے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ بدراو نامی جگہ پر پہنچ کر ہم وہاں قیام پذیر ہوئے۔ دریائے باران پر ماہی گیروں نے مچھلیاں کافی مقدار میں پکڑ رکھی تھیں۔ عصر کے وقت بیڑے میں بیٹھ کر بادہ نوشی کی، اور جب آفتاب غروب ہو گیا تو بیڑے نکل کر کنارے پر آئے۔ سفید خیمے میں بھی مے نوشی کی گئی حیدر علمدار کو ہم نے کفار کی جانب شراب لانے کے لئے روانہ کیا تھا۔ چنانچہ دوراتین کے سرے پر جو کافر آباد ہیں ان کے چودھری کچھ مشکیزے لے کر حاضر ہوئے اور خدمت بجالائے۔ جسوقت ہم درّے سے نیچے کی جانب اتر رہے تھے تو ہمیں بہت کثیر تعداد میں عجیب قسم کے ٹڈیاں نظر آئیں[2]۔ اگلے دن صبح ہم بیڑے پر سوار ہوئے اور معجون کی چسکیاں لیتے ہوئے بولان سے ذرا نیچے کی طرف اتر کر لشکر گاہ میں پہنچ گئے۔

جمعہ کے دن ہم نے کوچ کیا اردمند اور سے ذرا نیچے دامن کوہ پر قیام پذیر ہوئے۔ اس بار محفل بادہ نوشی بھی آراستہ کی گئی۔

بروز ہفتہ بیڑے پر سوار ہوئے اور درونۃ کی تنگ گذرگاہ کو عبور کر کے جہاں نمائی جگہ سے ذرا بلندی پر بیڑے سے اتر گئے آدینہ پور کے سامنے باغِ وفا ہے ہم اس باغ میں گئے جسوقت ہم اس بیڑے سے اترے تو ننگنہار کا حاکم، قیوم اردوشاہ حاضر ہوا اور خدمت بجالایا۔ لنگر خاں نیازی تو کچھ عرصہ قبل سے ہی نیلاب ہی مقیم تھا ابھی ہم راستے میں ہی تھے تو وہ حاضر ہوا اور خدمت بجالایا۔ جسوقت ہم باغِ وفا میں فروکش ہوئے تو نارنج اچھی طرح پک کر زرد ہو چکے تھے اور اس جگہ سبزہ بھی خوب لہرا رہا تھا جسکے باعث فضا بہت صاف و پاکیزہ ہو گئی تھی ہم پانچ چھ دن تک باغِ وفا میں قیام پذیر رہے۔ میرے دل میں یہ خیال و ارادہ تھا کہ چالیس سال کی عمر میں میخواری

[1] بابر کے ہاتھ کی ہڈی ۹ ستمبر ۱۵۱۹ء کو ٹوٹی تھی اور آج یعنی ۲۹ دسمبر ۱۵۱۹ء کو کوئی چار مہینے سے کچھ کم عرصہ میں ہاتھ سے محنت کا کام کیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے یہ ہڈی کا جوڑ نہیں اترا تھا بلکہ ٹوٹی ہوئی ہڈی جڑی تھی۔

[2] ٹڈیاں۔ بابر نے لفظ چور ڈکا استعمال کیا ہے۔ عبدالرحیم خان خاناں نے اس کو یوں ہی رہنے دیا ہے (ص ۲۲۴) الفنسٹن نے اس کا ترجمہ چکور کیا (ص ۲۸۲) اینٹ بیورج (ص ۴۲۱) اور تھمیکنن نے اس کو ٹڈی بتایا ہے۔ لیکن دونوں اس پر متفق ہیں کہ جنوری کے مہینے میں ٹڈیاں کہاں؟ سنگلاخ میں اس کے معنی ٹڈیوں کے ہی دیئے ہوئے ہیں (ص ۱۶۹)

ترک کر کے تائب ہو جاؤں اب چالیس سال کی عمر ہونے میں ایک سال سے کچھ کم ہی عرصہ رہ گیا تھا اسی لئے میں کثرت سے بادہ نوشی کر رہا تھا۔

سولہ تاریخ کو بروز اتوار صبوحی کے بعد میں ہوش میں آیا۔ جس وقت میں معجون کی چسکیاں لینے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ملّا یارک نے ایک مخمس پنچگاہ کی دھن پر تیار کی اور مجھے گا کر سنائی۔ اس دھن پر اس نے واقعی عمدہ بندش کی تھی۔ کچھ عرصے سے میں اسی قسم کی چیزوں کی جانب متوجہ نہ تھا۔ اس وقت میرے دل میں بھی خیال آیا کہ میں بھی اس قسم کی کوئی دھن تیار کروں۔ چنانچہ میں نے بھی چہارگاہ کی دھن پر ایک نغمہ تیار کیا جس کا ذکر آگے مُناسب جگہ پر کیا جائیگا[3]۔

بُدھ کے دن جس وقت صبوحی کا دور چل رہا تھا تو میں نے بطور مذاق کہا کہ جو کوئی تاجیک زبان میں نغمہ سنائے گا اسے ایک پیالہ شراب دیا جائے گا۔ چنانچہ اس طرح سے بہت سے لوگوں نے جام پیئے۔ سبزازار میں بید مجنوں کے کچھ درخت تھے ہم نماز فجر کی سنتوں کے وقت ان کے نیچے جا کر بیٹھ گئے۔ اب میں نے کہا کہ جو شخص ترکی زبان میں نغمہ سُنائے گا اسے شراب کا ایک پیالہ پینے کے لئے دیا جائے گا۔ اس موقعہ پر بھی بہت لوگوں نے شراب پی۔ جس وقت سورج ذرا چڑھ گیا (ورق ۲۲۵) تو ہم نارنج کے درختوں کے نیچے چلے گئے اور حوض کے کنارے بادہ نوشی کی۔

اگلے دن صبح ہم درونتہ سے بیڑے پر سوار ہوئے اور جوئے شاہی سے گزر کر اُتر پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم گھوڑوں پر سوار ہوئے اور درّہ نور کی سیر کرتے ہوئے سوشان گاؤں تک نکل آئے۔ اس جگہ سے واپس آ کر املہ میں ہم نے قیام کیا۔

خواجہ کلاں کے باعث باجوڑ کا نظم و نسق بہت عمدہ ہو چکا تھا۔ چوں کہ وہ میرا مصاحب تھا اس لئے اسے طلب کیا گیا اور شاہ میر حسین کو وہاں کا عہدہ دار مقرر کیا گیا۔

بائیس تاریخ کو بروز ہفتہ میر شاہ حسین کو رخصت ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ آج بھی املہ میں بادہ نوشی کی گئی۔

اگلے دن صبح بارش ہوئی کنار سے ہم کلہ گرام پہنچے جہاں ملک قلی کا گھر تھا ہم اس کے منجھلے لڑکے کے گھر میں قیام پذیر ہوئے جس کی بلندی پر سے نارنج باغ صاف نظر آتا تھا۔ یہاں بھی بادہ نوشی کا دور چلا اور بارش بہت زیادہ زور و شور سے ہوئی۔ مجھے ایک ٹوٹکا آتا تھا جو میں نے ملّا علی جان کو بتا دیا۔ اس نے کاغذ کے چار ٹکڑوں پر اس ٹوٹکے کو لکھا اور انھیں چار سمتوں میں بکھیر دیا۔ جس کے بعد بارش فوراً رُک گئی اور موسم بالکل صاف ہونے لگا۔

اس روز صبح کے وقت ہم بیڑے پر سوار ہوئے دوسرے بیڑے پر بعض دیگر جوان سوار تھے۔ سوات، باجوڑ اور اس کے گرد و نواح میں بوزہ[4] کشید کی جاتی ہے۔ کیم نام کی ایک چیز ہوتی ہے جو گھاس کی پتیوں کے سروں کو بعض مصالحوں کے ساتھ ملا کر بنائی جاتی ہے اور اسے نان کی طرح خشک کر دیا جاتا ہے۔ اس کا مایہ وخمیر ہی کیم ہے۔ ان میں سے بعض بوزہ عجیب پر کیف ہوتی ہیں۔ لیکن بوزہ تلخ ہوتا ہے۔ اگر چہ ہم نے بوزہ پینے کا رادہ کیا لیکن اس کی تلخی کے باعث پی نہ سکے اور معجون کی چُسکیوں پر ہی اکتفا کیا۔

عس حسن ایکرک اور مستی دوسرے بیڑے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے انھیں شراب پینے کا کہا۔ چنانچہ انھوں نے پی اور مست ہو گئے۔ حسن ایکرک نے بدمزہ ہو کر ناشائستہ حرکات شروع کر دیں کہ ہم اس سے تنگ آ گئے۔ میرے دل میں تو یہ بھی خیال آیا کہ اسے بیڑے سے نکال کر باہر دریا کے پانی میں پھینک دوں لیکن بعض لوگوں نے درخواست کی کہ میں ایسا نہ کروں۔

اس عرصے میں شاہ میر (حسین) باجوڑ کا علاقہ عطا کر کے خواجہ کلاں کو میں نے اپنے پاس اس لئے

۳۔ چہارگاہ کی دھن۔ موسیقی تخلیق دینے کے لئے جو وقت اور سکون چاہیے بظاہر اس کی کمی کی وجہ سے یہ میدان رہ گیا۔

۴۔ بوزہ: بیر۔ بابر نے کیونکہ اس کی تلخی کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ بیر ہی ہو سکتی ہے۔ بعض بیروں میں سخت نشہ ہوتا ہے۔

بلالیا تھا کہ وہ میرا مصاحب تھا اور باجوڑ میں اس کا قیام کافی طویل ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ میری دانست میں باجوڑ کا نظم ونسق برقرار رکھنا بھی سادہ وآسان کام تھا۔ جس وقت میں دریائے کنر کے گھاٹ سے گزر رہا تھا تو شاہ میر حسن مجھ سے ملاقات کرنے کے لئے آن پہنچا۔ چنانچہ اسے بلالیا گیا اور زبانی کچھ باتیں سمجھائی گئیں۔ ور اپنا زرہ بکتر پوش اسے عطا کر کے رخصت ہونے کی اجازت دی۔

جس وقت ہم نورگل کے مقابل پہنچے تو ایک بوڑھا آدمی بھیک مانگتا ہوا آیا۔ وہ لوگ جو بیڑے پر سوار تھے ان میں سے کسی نے اس کو جبہ دے دیا۔ کسی نے دستار اور کسی نے اس کو اپنی لنگی دے دی۔ اور اس طرح فقیر کا تھیلا بھر گیا۔ منجدھار میں ہمارا بیڑا کسی چیز کے ساتھ جھٹکے سے ٹکرایا جس کے باعث ہر شخص سہم گیا۔ خیر گزری کہ وہ غرق نہ ہوا۔ میر محمد مانجھی مگر پانی میں گر گیا۔ رات کے وقت ہم اُتر کر نزدیک اکے۔

منگل کے دن ہم مندراور پہنچے۔ یہاں قتلق قدم اور اس کے والد (ورق ۲۲۶) دولت قدم نے محفل بادہ نوشی آراستہ کر رکھی تھی۔ اگرچہ بادہ آشامی کے لئے یہ کوئی مناسب جگہ نہ تھی مگر اس کی دلداری کے لئے چند جام نوش کئے۔ عصر کے وقت ہم واپس اپنی لشکر گاہ پہنچ گئے۔

بروز بدھ ہم کند گر چشمے کی سیر کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ ضلع مندراور کا ایک گاؤں ہے۔ لمغان کے تمام علاقوں میں بس یہی جگہ ایسی ہے جہاں کھجور پائی جاتی ہے۔ یہ گاؤں دامن کوہ سے ذرا بلندی پر بسا ہوا ہے جس کے مشرق میں نخلستان ہے اور چشمہ اس کے کنارے پر واقع ہے۔ اس سرچشمے کے کنارے پر چھ سات گز نیچے پتھروں کو چن کر غسل کرنے کے لئے اوٹ بنائی گئی ہے۔ جہاں سے چشمے کا پانی جاری ہوتا ہے اسے اس جگہ سے اس طرح متصل کر دیا گیا ہے کہ جس وقت کوئی شخص غسل کرنا چاہتا ہے تو پانی اس کے سر پر گرتا ہے۔ اس کا پانی گوارا ہے۔ موسم سرما میں اگر کوئی شخص غسل کرتا ہے تو شروع میں اسے ذرا خنکی محسوس ہوتی ہے لیکن اس کے بعد وہ اس کے نیچے جس وقت تک رہے اسے یہ پانی خوشگوار لگتا ہے۔

بروز جمعرات شیر خاں نے اپنے گھر میں قیام کرنے کی دعوت اور ضیافت کا اہتمام کیا۔ ظہر کے وقت ہم وہاں سے سوار ہوئے اور ان تالابوں تک پہنچ گئے جو مچھلیاں پالنے کے لئے بنائے گئے تھے۔ ان تالابوں کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے۔ چنانچہ یہاں ہم نے ءکچھ مچھلیوں کو شکار کیا۔

بروز جمعہ ہم خواجہ میر میراں نامی گاؤں میں قیام پذیر ہوئے۔ اس دن شام کے وقت محفل آراستہ کی گئی۔

بروز ہفتہ علی شنگ اور النیگار نامی مقامات کے دوران شکار کیا گیا۔ ایک طرف سے النیگار کے لوگوں نے (ورق ۲۲۶ب) اور دوسری طرف سے اہالی علی شنگ نے نرغہ لگایا اور ہرنوں کو ہانکتے ہوئے پہاڑوں سے نیچے کی طرف لے آئے۔ ہم نے بہت سے ہرنوں کا شکار کیا۔ النگار میں ہم نے باغ ملکان میں قیام کیا اور مجلس آراستہ کی۔

میرے سامنے کا ایک دانت آدھا ٹوٹ چکا تھا۔ باقی آدھا موجود تھا۔ آج کھانا کھاتے وقت وہ بھی بھی ٹوٹ گیا۔

اگلے دن ہم سوار ہوئے، اور مچھلیاں پکڑنے کے لئے جال لگائے۔ دوپہر کے وقت ہم علیشنگ میں وارد ہوئے اور وہاں باغ میں پہنچ کر بادہ نوشی کی۔ علیشنگ کا چودھری حمزہ خان رعیت کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آتا تھا۔ اس نے بہت سے لوگوں کا خون ناحق کیا تھا۔ اس کو مقتولین کے افراد خاندان کے حوالے کر دیا گیا کہ وہ اس سے قصاص وصول کریں۔

بروز منگل اور وردو وظائف ادا کرنے بعد میں نے یان بولاغ کے راستے سے کابل کی جانب رُخ کیا۔ عصر کے وقت دریائے الغتو عبور کیا اور مغرب کے وقت قیراتوں پہنچ گئے۔ گھوڑوں کو دانہ دیا اور کھانے کے لئے جو ماحضر تھا وہ لایا گیا اور جیسے ہی گھوڑوں نے جو کھا کر ختم کئے ہم پھر سوار ہوئے۔
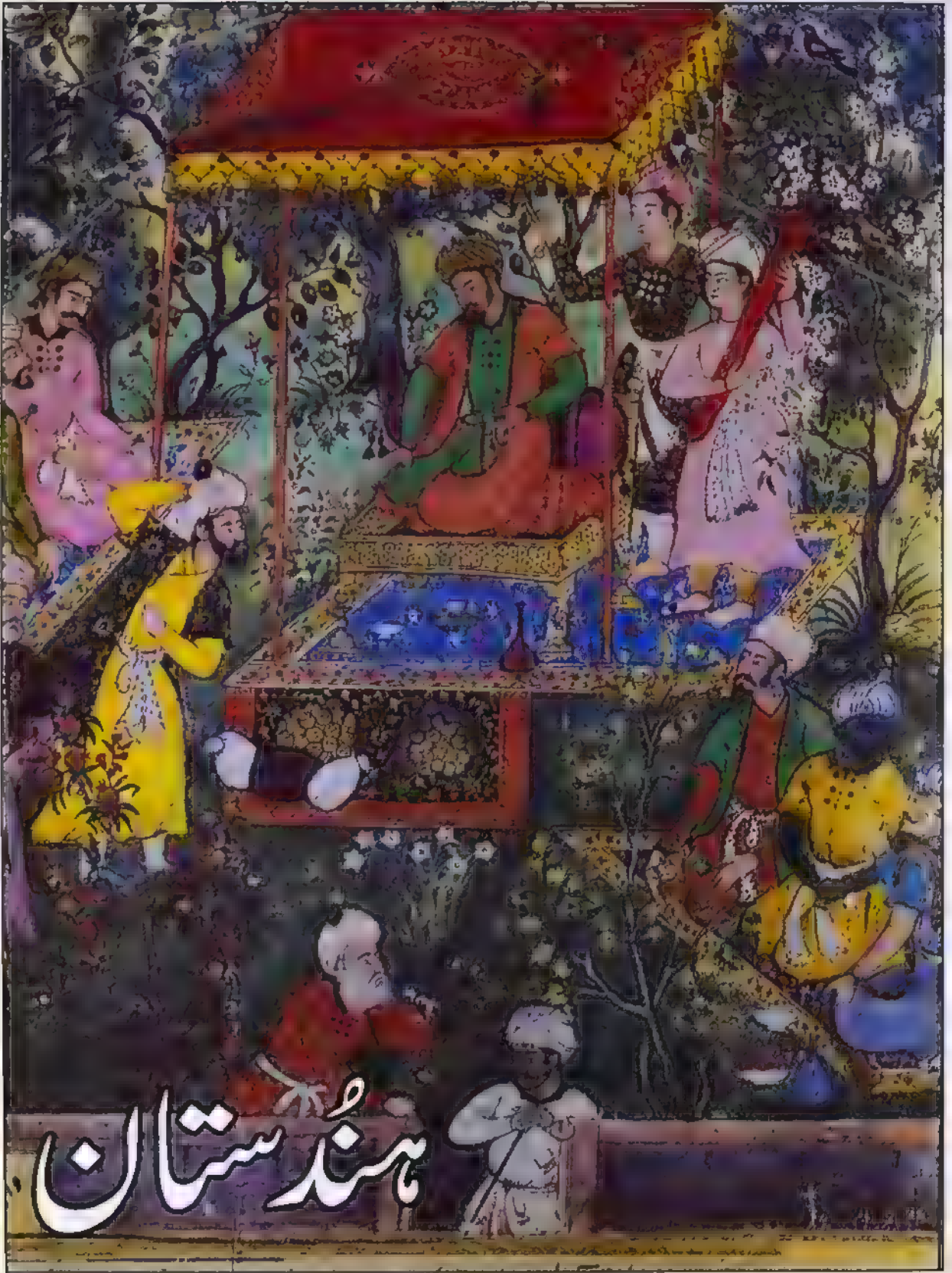
۹۳۵ھ (۲۹-۱۵۲۸ء) میں بابر نے ایک محفل ضیافت آگرہ میں سجائی جس میں ازبک، قزلباش و ہندو ایلچی وسفرا موجود تھے۔ اس ضیافت میں بابر ایک شامیانے کے نیچے (تصویر وکٹوریہ والبرٹ میوزیم ۰۲۶۹۴۳-وی)

بابری ہند
۹۳۵ھ (۱۵۲۸-۱۵۲۹ء)

سندھ
جہلم
چناب
بہلول پور
سیالکوٹ
راوی
کلانور
جالندھر
ستلج
سندھ دریا
ہمالیہ
جمنا دریا
پانی پت
دہلی
سیکری
بیانہ
دھولپور
آگرہ
اٹاوہ
جمنا
کالپی
لکھنو
اودھ
پریاگ
بنارس
منیر
گنڈک دریا
برہم پتر
سون دریا
گوالیر
چندیری
بحیرہ عرب
ہندستان
بحیرہ بنگال

گل افشاں، بابر کا باغ جس کا نام جہانگیر نے آرام باغ رکھ دیا تھا۔ آج کل اس کو رام باغ کہا جاتا ہے
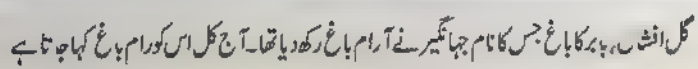
واقعات ۹۳۲ھ

(۱۸ اکتوبر ۱۵۲۵ء - ۸ اکتوبر ۱۵۲۶ء)

۹۳۲ میں اس وقت جب کہ سورج برج قوس میں تھا، میں نے ہندستان کی جانب سفر کرنے کا عزم کیا۔ پشتہ یک لنگر کو عبور کر کے اس سبزہ زار میں جو دریا کی مغربی جانب واقع ہے وہ یعقوب نامی جگہ پر قیام پذیر ہوئے۔

عبدالملک قورچی جو سات آٹھ مہینے پہلے سلطان سعید خاں[1] کے پاس ایلچی بن کر گیا تھا وہ خان کے رضاعی بھائی یاتگی بیگ کو کلداش کے ساتھ واپس آیا۔ وہ خواتین اور سلطان سعید خان کی جانب سے مراسلات (ورق ۲۲۷) کچھ معمولی تحائف اور ان کی نیک خواہشات لے کر آیا تھا۔ ہم لشکر کو جمع کرنے کی خاطر دو روز اس جگہ مقیم رہے۔ یہاں سے کوچ کر کے ایک دن اور ایک رات کا سفر طے کرنے کے بعد اگلے دن بادام چشمہ پہنچ کر وہاں قیام پذیر ہوئے۔ اس منزل پر ہم نے معجون کی چسکیاں بھی لیں۔

بروز بدھ جس وقت ہم باریک آب نامی جگہ پر قیام پذیر ہوئے تو لاہور کے دیوان خواجہ حسین نے بیس ہزار شاہرخی قیمت کا سونا، اشرفیاں اور ٹنکے روانہ کئے۔ نور بیگ نے جو خود ہندستان میں تھا یہ مال متاع اپنے بھائی کے ساتھ میرے پاس بھیجا۔ اس میں سے بیشتر مال بلخ کی فلاح و بہبود کیلئے وہاں کے ایک سردار ملا احمد کے ہاتھ روانہ کر دیا گیا۔

آٹھ تاریخ بروز جمعہ ہم گندمک پہنچے جہاں مجھے انتہائی شدید نزلہ ہوا۔ خدا کا شکر کہ خیریت رہی۔ بروز ہفتہ ہم باغ وفا میں فروکش ہوئے۔ ہمایوں کی آمد اور ہندوکش کے پار سے لشکر کے پہنچ جانے کے انتظار میں چند روز وہاں مقیم رہے۔ باغ وفا کی حدود، صفائی و عمدگی کا کئی مرتبہ ذکر آ چکا ہے[2]۔ واقعی بہت ہی پر فضا و باصفا باغ ہے جو شخص اس باغ کو خریدار کی نظر سے دیکھے وہ اس کے اوصاف کو پرکھ سکے گا۔ جن چند دنوں ہم یہاں مقیم رہے اس موسم کا تقاضا تھا کہ مے نوشی کی جائے۔ ہم نے اکثر و بیشتر مواقع پر یہ محفل سجائی۔ جن دنوں میں شراب سے گریز کیا کرتا تو معجون کی چسکیوں سے محفل آراستہ کی جاتی۔ ہمایوں نے چونکہ مقررہ وقت پر پہنچنے میں دیر کر دی تھی اس لئے میں نے اسے جو خط لکھے ان میں اس کے لئے سخت الفاظ استعمال کئے اور درشت لہجہ اپنایا۔

ماہ صفر سترہ تاریخ بروز اتوار جب کہ صبوحی کا دور ختم ہو چکا تھا ہمایوں آن پہنچا۔ اس کے اتنے عرصے کے بعد پہنچنے پر میں نے اس کو ڈانٹا۔[3] خواجہ کلاں بھی آج غزنی سے آن پہنچا۔ اسی پیر کو رات کے وقت ہم نے وہاں سے کوچ کیا سلطان پور اور خواجہ رستم کے درمیان جس نئے باغ کی طرح اندازی کی گئی تھی اس میں قیام پذیر ہوئے۔

بروز بدھ ہم نے یہاں سے کوچ کیا اور بیڑے پر سوار ہو گئے۔ اور قوس گنبد تک شراب کا دور چلتا رہا۔ اس جگہ پہنچنے کے بعد ہم بیڑے سے اُترے اور لشکر گاہ میں پہنچ گئے۔ اگلے روز صبح پوری لشکر گاہ کو کوچ کرنے کا حکم دیا اور ہم سب بیڑے پر سوار ہو گئے اور یہاں بھی معجون کی چسکیاں لیتے رہے۔ قرق اریق نامی جگہ پر ہماری مستقل قیام گاہ تھی۔ جس وقت ہم اس کے مقابل پہنچے تو وہاں ہم نے ہر چند کوشش کی کہ لشکر گاہ کی علامت ونشانی نظر آئے مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ وہاں گھوڑے تک نظر نہ آئے۔ اس وقت میرے دل میں یہ خیال گزرا کہ گرم چشمہ نزدیک ہی ہے اور جگہ بھی سایہ دار ہے۔ شاید لشکر وہاں پہنچ گیا ہو۔ چنانچہ اس بنا پر ہم نے وہاں سے روانگی اختیار کی۔ جس وقت ہم گرم چشمہ پر پہنچے تو دن چھپ چکا تھا۔ ہم نے اس جگہ بھی قیام نہ کیا اور تمام رات سفر کرتے رہے یہاں تک کہ دن نکل آیا۔ ایک جگہ ہم نے بیڑے کو روکا اور تھوڑی دیر کے لئے سو گئے۔ نماز فجر کے

۱۔ سلطان سعید خاں۔ والی کاشغر اور بابر کے خالہ زاد بھائی حیدر مرزا دوغلت کے سرپرست۔

۲۔ باغ وفا۔ اس باغ کا ذکر ۹۱۰ ہجری کے بیان میں ورق ۱۱۲ میں ہے۔

۳۔ ہمایوں کی عمر اس وقت اٹھارہ سال تھی۔ اس کی پیدائش ۱۵۰۶ عیسوی (۹۱۳ ہجری) میں ہوئی تھی۔

وقت ہم یدہ بیر نامی مقام پر پہنچے۔ جیسے ہی سورج چڑھنا شروع ہوا لشکر کے لوگ بھی آنا شروع ہو گئے۔ اگر چہ لشکر تو پہلے ہی قرق اریق پہنچ چکا تھا مگر ہماری نظر اس پر نہ گئی۔

بیڑے میں ایسے بہت سے لوگ موجود تھے جو شعر کہہ سکتے تھے۔ ان میں شیخ ابوالواجد[4] (ورق ۲۲۸) شیخ زین[5] ملا علی جان اور تردی بیگ خاکسار[6] کے علاوہ بھی دیگر افراد تھے۔ صحبت و گفتگو کے دوران محمد صالح کا[7] یہ شعر پڑھا گیا:

محبوی هر عشوه گری راچه کندکس　　　حالی که توباشی دگری راچه کندکس

(میرے نازک اندام محبوب کا کوئی کیا کرے۔ جس جگہ تو موجود ہو تو پھر کسی دوسرے کا کوئی کیا کرے۔)

فرمائش کی گئی کہ اسی زمین میں شعر کہیں۔ جن لوگوں نے طبع موزوں پائی تھی انہوں نے شعر گوئی کی سعی و کوششیں شروع کر دیں۔ چونکہ ملا علی جان کے ساتھ بہت زیادہ شوخی و دل لگی رہتی تھی اسی لئے یہ بیت بطور ہزل فی البدیہہ میرے ذہن میں آئی:

مانند تو مدهوش گری راچه کندکس　　　هر گاؤ گن ماده خری راچه کندکس

(تجھ جیسے مدہوش گر کا کوئی کیا کرے۔ ہر بیوقوف گدھی کا کوئی کیا کرے۔)[8]

اس سے قبل کوئی بھی مناسب یا نامناسب، سنجیدہ و غیر سنجیدہ کلام میرے ذہن میں آتا تھا میں اس کی ہزل بنا لیا کرتا تھا اور جو کوئی بھی درشت و قبیح کلام موزوں ہو جاتا تھا اسے قلم بند کر لیا کرتا تھا۔ جس زمانے میں میں رسالہ مبیّن نظم کر رہا تھا[9] میرے ذہن میں یہ بات آئی اور دل غمگین ہوا کہ جس زبان سے ایسے عمدہ الفاظ نکلتے ہوں وہ زبان قبیح گوئی اور ناشائستگی میں خود کو مصروف رکھے۔ حیف ہے کہ جس دل میں ایسے اعلیٰ خیالات جلوہ گر ہوتے ہوں اسی دل میں ایسے پست خیالات گزریں۔ چنانچہ اس کے بعد میں نے ہجوگوئی اور ہزل سرائی سے توبہ کر لی۔ لیکن جس وقت میں نے ملا علی جان کے شعر کی ہجو کی تھی اس وقت میں قطعی خالی الذہن تھا۔ بگرام پہنچے کہ ایک دو دن بعد میرے منہ سے خون آنے لگا اس کے بعد میں بخار میں مبتلا ہو گیا اور یہی خون ریزی کھانسی کا سبب ہوئی۔ چنانچہ جب کھانسی ہوتی میرے منہ سے خون آنے لگتا۔[10] اس مرض کے باعث مجھے احساس ہوا کہ یہ تنبیہ ہے اور میری تکلیف اس عمل کی پاداش میں ہے۔

فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ وَ مَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ ٥

"اب جو اس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ذات پر ہوگا۔ اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا۔" (۴۸:۱۰)

نـی قیبلا یین سینینک بیله ای تیل　　　جهتینکدین مینیک ایچیم قاندور

نیچه بخشی دیسانک بوهزل ایله　　　بیریسی فحش و بیری بالغان دور

کر دیسانک کو یماین بو جرم بیله　　　حبیلا دنکنی بو عرصه دین یاندور

(اے زبان تیرا کیا کیا جائے، تیری وجہ سے میرا تن بدن خون ہے۔ تو کب تک ایسا دل شکن ہزلیہ کلام کہتی رہے گی کہ جس میں سے ایک فحش ہے اور دوسرا جھوٹ۔ اگر تو چاہتی ہے کہ گناہ کی آگ میں نہ جلے تو اس فحش گوئی کے میدان سے اپنی باگیں پھیر لے۔

ربنا ظَلمنا انفسنا وان لَم تغفرلَنا و تُرحمنا لنكونن من الخَاسرين۔ (۷:۲۳)

اے رب! ہم نے اپنے اوپر ستم کیا۔ اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے)

اس کے بعد میں نے پھر ایک بار اپنے گناہوں سے توبہ کی اور اس قسم کے باطل خیالات اور اس طرح کے بیہودہ مشاغل سے منہ پھیر لیا اور قلم کو توڑ دیا۔ بارگاہ خداوندی سے اس قسم کی تنبیہات اس کے گنہگار بندوں کے لئے کسی دعوت عظمیٰ سے کم نہیں۔ اور اگر کسی عاصی و گنہگار بندے نے اس طرح کی باتوں سے عبرت حاصل کر لی تو گویا اسے سعادت عظیم حاصل ہو گئی۔

۴۔ شیخ ابوالواجد: شیخ زین مولف طبقات بابر کے ماموں (طبقات ص ۲۳ نوٹ ۲۳)

۵۔ شیخ زین: مولف طبقات بابری

۶۔ تردی بیگ خاں: جن کے نام کی ایک کاریز کا ذکر بابر نے ۹۲۵ ہجری کے بیان میں ورق ۲۴۴ پر کیا ہے۔

۷۔ محمد صالح: ان کا پورا نام امیر محمد صالح اور تخلص شرف ہے۔ (شیخ زین، طبقات بابری ص ۱۵) ہیکسٹن نے ان میں اور محمد صالح مصنف شیبانی نامہ میں کوئی فرق نہیں کیا (ص ۳۱۲ نوٹ ۴)، اینٹ بیورج ان میں فرق کرتی ہیں (ص ۴۴۸ نوٹ ۳)

۸۔ بابر کے اس شعر کے الفاظ و معنی صاف نہیں ہیں۔ ہر مرتب و مترجم نے اپنی بساط کے مواقف کوشش کی ہے۔ اوپر جو شعر نقل کیا گیا ہے وہ فارسی مخطوطے (برٹش لائبریری ۲۴۴۱۶ ص ۲۲۸) اور ترکی مخطوطے (آئی جی ماتو ص ۴۰۵) میں ایک ہی ہے۔ لیکن یورپی مصنفین دوسرے مصرعے میں ڈنڈی مار جاتے ہیں:

"ترگادکس مادہ خری راچہ کندکس"

ان کا زور "کس" پر ہے۔ ت ہیکسٹن (ص ۳۱۲) اور ڈیل (ص ۲۸۶)۔ اینٹ بیورج یہ کہہ کر جان بچاتی ہیں کہ یہاں دو اضداد کا ذکر آنا چاہیے (ص ۴۴۸ نوٹ ۵) اور میں اس کے مطلب کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔

قمر ریکس صاحب جنہوں نے ازبکستان میں بیس سال گزارے اور "ظہیر الدین بابر، شخص، شخصیت اور شاعری میں بابر کے اشعار کا ترجمہ پیش کیا ہے اس مصرعے کا مطلب یہ لکھتے ہیں:

جہاں سانڈ موجود ہو وہاں مادہ خر کا کوئی کیا کرے

(ص ۳۷) لیکن بابر کو یہ شعر کہنے کے بعد اس میں کیا خرابات نظر آئیں اس سے واضح نہیں ہوتا۔

۹۔ مبیّن: دو ہزار دو سو اٹھاون اشعار پر مشتمل یہ کتاب بابر نے کامران کی راہنمائی کے لئے لکھی تھی۔ یہ ترکی زبان میں ہے اور اشعار میں فقہ حنفی کے احکامات ہیں۔ حمد و نعت کے بعد ایمان، نماز، روزہ، زکات اور حج سے متعلق تفصیلات درج ہیں۔ یہ کتاب تصحیح کے ساتھ استنبول سے ڈاکٹر سیہان کی ادارت میں ۲۰۰۴ میں شائع ہو گئی ہے۔ جب بابر ہندستان فتح کرنے کے لئے روانہ ہوا اس وقت کامران کو کابل میں حکمران چھوڑ گیا تھا۔ باپ نے بیٹے کی فقہی تعلیم کے لئے یہ انتظام کیا تھا۔ ایک طرف ہندستان فتح ہو رہا ہے اور دوسری طرف کامران کو صحیح مسلمان بنایا جا رہا ہے۔

ملا بدایونی نے اس کو مبیّن (راہنما) اور اس کی شرح جو شیخ زین نے لکھی کو مبین (وضاحتیں) کہا ہے۔ (منتخب التواریخ ج ۱ ص ۴۵۰)

روس کے ترکستان غصب کرنے سے پہلے تک بقول ڈاکٹر محمد صابر مبیّن مدرسے کے بچوں کو ازبر کرائی جاتی تھی (ماہ نو ستمبر ۱۹۶۵ ص ۵۴)

کتاب کا اصل نام نفائس الماثر در فقہ مبیّن ہے (سید حسن عسکری، حواشی نمبر ۲۶ ص ۱۸۵)

۱۰۔ کھانسی کے ساتھ خون آنا پھیپڑوں کی ٹی بی کی نشانی ہے۔

یہاں سے کوچ کرنے کے بعد ہم نے علی مسجد پہنچ کر قیام کیا۔ میں نے اسی منزل پر چونکہ ہمیشہ جگہ کی تنگی پائی تھی اسی لئے میری قیام گاہ پشتہ کوہ پر رہا کرتی تھی اور لشکر کے لوگ وادی میں قیام پذیر ہوتے تھے۔[11] جس پشتے پر میں قیام کرتا تھا اس پر سے پوری وادی نظر آتی تھی۔ رات کے وقت اہل لشکر نے آگ روشن کی جس کے باعث منظر عجیب روشن و حسین ہوگیا۔ میں جب بھی اسی منزل پر قیام پذیر ہوتا (ورق ۲۲۹) بادہ نوشی سے ضرور لطف اندوز ہوتا۔ اس مرتبہ محفل بادہ پیمائی آراستہ کی گئی۔ طلوع آفتاب سے ذرا قبل معجون کی چسکیاں لے کر ہم گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ اس دن ہم نے روزہ بھی رکھا۔ اور بگرام[12] پہنچ کر وہاں قیام پذیر ہوئے۔

گینڈے کا شکار

اگلے دن اس منزل پر ٹھہرنے کے بعد ہم گینڈوں کا شکار کرنے کے لئے سوار ہوئے۔ بگرام کے سامنے سیاہ آب پار کر کے پانی کے بہاؤ کی طرف ہم نے نرغہ ڈالا۔ ابھی ہم نے تھوڑا ہی راستہ طے کیا تھا کہ پیچھے سے ایک شخص آیا اور کہا کہ بگرام کے نزدیک چھوٹا سا جنگل ہے جہاں گینڈے گھس آئے ہیں۔ اور انہوں نے اس جنگل کو گھیر لیا ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنے گھوڑوں کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں اور سرپٹ اس جانب روانہ ہوئے اور جنگل میں ہانکا لگا دیا گیا۔ جیسے ہی شور و غل شروع ہوا گینڈے میدان میں نکل آئے اور اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ ہمایوں اور اس کے ساتھیوں نے جو ہندوکش کے پار سے آئے تھے کبھی گینڈے نہیں دیکھے تھے۔ انہوں نے خاطر خواہ ان جانوروں سے تفریح کی۔ ہم نے ایک کروہ تک ان کا تعاقب کیا اور کثیر تعداد میں ان پر تیر برسا کر انہیں گرا لیا۔ جس گینڈے کا ہم نے شکار کیا تھا اس نے کسی شخص یا گھوڑے پر حملہ نہیں کیا۔ اس کے علاوہ ہم نے ایک اور گینڈے کو مار گرایا۔ اس وقت سے مسلسل یہ خیال میرے دل میں گزر رہا تھا کہ اگر ہاتھی کو گینڈے کے مقابل کیا جائے تو وہ کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ پیش آئیں گے۔ اسی اثنا میں جب کہ فیل بان ہاتھیوں کو لا رہے تھے سامنے سے ایک گینڈا آگیا۔ فیلبانوں نے جیسے ہی ہاتھیوں کو آگے کی طرف ہانکا گینڈا سامنے نہیں آیا بلکہ دوسرے طرف بھاگ گیا۔

لشکر کا شمار

جس روز ہم نے بگرام میں قیام کیا وہاں میں نے امرا، قرابت داروں، بخشی[13] اور دیوان[14] نیلاب کے گھاٹ پر کشتیوں کے اوپر مقرر کئے کہ وہ لشکر کے تمام لوگوں کے نام درج کر کے ان کا شمار کریں۔ اس رات بھی مجھے تھوڑا سا خون آیا اور بخار ہوگیا۔ اس خون نکلنے کے باعث مجھے کھانسی ہونے لگی۔ جتنی مرتبہ بھی کھانسی ہوتی اس کے ساتھ خون بھی آتا۔ چنانچہ اسی وجہ سے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ایک دو دن میں یہ عارضہ دور ہوگیا۔ ہم بگرام سے چلے تو بارش ہوئی۔ ہم دریائے کابل کے کنارے رُکے۔ خبر آئی کہ دولت خاں[15] اور غازی خاں نے بیس تیس ہزار فوج جمع کر لی ہے۔ کالانور پر قبضہ کر کے اب لاہور پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اسی وقت مومن علی تواچی کو دوڑایا گیا اس پیغام کے ساتھ کہ ہم آرہے ہیں منزل بہ منزل ہمارے پہنچنے تک جنگ نہ کریں۔

بگرام سے کوچ کر کے ہم نے دو جگہ پڑاؤ کیا اور آٹھ تاریخ کو بروز جمعرات دریا سندھ کے کنارے قیام پذیر ہوئے۔

ماہ ربیع الاوّل کی پہلی تاریخ بروز ہفتہ ہم نے دریائے سندھ عبور کیا۔ اس کے بعد کچہ کوٹ پر دریا[16] کو پار کر کے اس کے کنارے قیام پذیر ہوئے۔ ان امیروں، بخشیوں اور دیوانی امور کے کارپردازوں نے جنہیں کشتیوں پر متعین کیا گیا تھا لشکر کے ان لوگوں کو ترتیب دیا جنہوں نے میری ملازمت اختیار کی تھی۔ اور انہیں

۱۱۔ علی مسجد درہ خیبر کا تنگ ترین حصہ ہے۔ یہ درہ کے تقریباً درمیان میں ہے۔ آج بھی اس طرح ہی ہے جیسا یہاں بیان کیا گیا ہے۔ وادی کے ایک طرف پہاڑ اور دوسری طرف علی مسجد موجود ہے۔ پہاڑ کے اوپر سے وادی دلکش نظر آتی ہے۔ رات کو جب پورے لشکر میں دیئے جگمگاتے ہونگے تو نظارہ اور زیادہ حسین ہو جاتا ہوگا۔

۱۲۔ بگرام کس جگہ واقع ہے اس کا علم نہیں۔ احمد حسن دانی کے مطابق یہ کابل، جلال آباد اور پشاور تینوں جگہ ہوسکتا ہے (پشاور ص ۱۷)۔ ابوالفضل کا کہنا ہے کہ یہ پشاور کا ہی دوسرا نام ہے (اکبرنامہ ج ا ص ۲۴۸) یہ بیان ہی درست معلوم ہوتا ہے۔

۱۳۔ بخشی: افواج لشکر کی تنخواہ رکھنے والا اور حساب کتاب کا ذمہ دار

۱۴۔ دیوان: محکمہ مال کا افسر

۱۵۔ دولت خاں حاکم پنجاب کی تقرری ابراہیم لودھی نے کی تھی۔ غازی خاں اس کا بیٹا تھا۔ ایک دوسرا بیٹا دلاور خاں تھا جو بابر کا حامی تھا۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

۱۶۔ یہ دریائے ہرو ہے جو راولپنڈی اور پشاور کے درمیان اب بھی رواں ہے۔

معائنے کے لئے میری سامنے پیش کیا۔ خورد کلاں، نیک و بد اور ملازم و غیر ملازم جن لوگوں کے نام قلمبند کئے گئے تھے ان کی تعداد بارہ ہزار تھی۔

اس سال میدانوں میں برسات کے موسم میں بارش کم ہوئی تھی۔ لیکن کوہستانی علاقوں میں بارش اچھی ہوئی تھی۔ دامن کوہ سے غلّہ حاصل کرنے کی خاطر ہم نے سیالکوٹ جانے والی راہ اختیار کی۔ جس وقت ہم علاقہ ہاتھی گکھڑ[17] کے مقابل پہنچے دریا کا پانی جگہ جگہ وافر مقدار میں ٹھہر گیا تھا اور اس پر برف کی تہہ جم گئی تھی۔ اگرچہ یہ بہت دبیز نہ تھی، زیادہ سے زیادہ ایک بالشت ہوگی لیکن ہندستان میں اس طرح برف کا ہونا عجیب بات نظر آئی۔ یہ برف بس یہیں دیکھی گئی تھی۔ گزشتہ چند سالوں کے دوران ہم جب تک ہندستان میں مقیم رہے برف و یخ کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔

ہم نے سندھ سے پانچ کوچ کئے (ورق ۲۳۰)۔ چھٹے کوچ پر کوہ[18] جود سے متصل بال ناتھ جوگی پہاڑ کے دامن میں اس جگہ جہاں بکیالوں کی بستی تھی قیام پذیر ہوئے۔ اگلی دن غلّہ فراہم کرنے کے لئے اسی منزل پر قیام کیا اور بادہ نوشی کی۔ اگرچہ ملا محمد پرغری کی یہ عادت نہ تھی کہ زیادہ بولے لیکن اس دن جب وہ بولنے پر آیا تو بس کسی طرح خاموش نہیں ہوتا تھا۔ البتہ ملا شمس بہت باتونی تھا جب بولنے پر آتا تو لگاتار بولے ہی چلا جاتا اور قصّے پر قصّے سناتا چلا جاتا۔ صبح سے شام ہو جاتی مگر اس کی کہانی ختم ہونے پر نہ آتی۔ غلام نوکر چاکر اور دیگر جو بھی بھلے اور برے لوگ غلّہ لانے کے لیے گئے تھے وہ غلّہ تو نہ لائے بلکہ جنگل و بیابان اور پہاڑوں کے درمیان دشوار گزار جگہوں پر پہنچ کر راستہ بھول گئے۔ چونکہ مسلح نہیں تھے اس لیے ان میں سے کچھ گرفتار بھی کر لیے گئے۔ چنانچہ رات کا پاسبان لکھینہ تو وہیں جاں بحق ہوا۔

وہاں سے کوچ کر کے دریائے بھٹ[19] کو ہم نے جہلم سے ذرا نیچے گھاٹ پر عبور کیا اور اسی جگہ قیام پذیر ہوگئے۔ ولی قزیل کو جو پرگنہ بحرہ گڑھی کا حاکم تھا اس کام پر مقرر کیا گیا تھا کہ وہ سیالکوٹ کمک پہنچائے۔ اس منزل پر وہ میری خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ چونکہ سیالکوٹ کو بچانے کا حق ادا نہ کر سکا تھا اس لیے میں اس کے ساتھ درشتی سے پیش آیا۔ جواب کے طور پر اس نے عرض کیا کہ میں تو اپنے پرگنے میں تیار تھا لیکن خسرو کوکلداش[20] جس وقت سیالکوٹ سے روانہ ہوا تو اس نے اس کے بارے میں مجھے ذرا بھی خبر نہ کی۔ اس کے اس عذر کو میں نے غور سے سنا اور کہا کہ جب تو سیالکوٹ کی نگہبانی نہ کر سکا تو امرا کے پاس لاہور کیوں نہ گیا۔ اس پر وہ خاموش ہوگیا۔ اب چونکہ وقت کارزار نزدیک تھا اس لیے میں نے اس کے قصور سے چشم پوشی کی۔

میں نے اسی منزل سے سیدّ طوفان اور سیدّ لاچین کو گھوڑوں کی ڈاک کے ہمراہ ان امرا کے پاس جو لاہور میں مقیم تھے اس ہدایت کے ساتھ تیز رفتاری سے روانہ کیا کہ بر سر پیکار نہ ہوں۔ سیالکوٹ یا پسرور میں آ کر ہمارے ہمراہ ہو جائیں۔ تمام لوگوں کا اس امر پر اتفاق تھا کہ غازی خاں نے تیس چالیس ہزار آدمیوں کو جمع کر رکھا ہے۔ دولت خاں نے پیرانہ سالی کے باوجود اپنی کمر پر دو تلواریں باندھ لی ہیں۔ وہ یقیناً جنگ کا عزم کریں گے۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ کہاوت ہے کہ نو سے دس بھلے۔ اس سے قبل کہ معاملہ قابو سے باہر ہو جائے صلاح اس امر میں ہے کہ جو لوگ لاہور میں ہیں انہیں ساتھ لے کر جنگ و پیکار کریں۔ چنانچہ ایک طرف تو ہم نے امرا کے پاس چند لوگ روانہ کئے اور دوسری طرف خود دو منزلوں کو ایک کرتے ہوئے دریائے چناب کے کنارے پہنچ گئے۔ اور وہاں قیام پذیر ہوئے۔ بہلول پور کا تعلق مال خالصہ سے ہے۔ وہاں سے گزرتے ہوئے ہم نے اس جگہ کی سیر کی۔ اس کا قلعہ دریائے چناب کے کنارے ایک اونچی ڈھلواں چٹان پر بنا ہوا ہے۔ یہ قلعہ مجھے دیکھنے میں بہت اچھا لگا میں نے سوچا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ سیالکوٹ کے لوگوں کو یہاں منتقل کر دیا جائے۔ خداوند تعالیٰ کو منظور ہوا تو جیسے ہی موقعہ ہاتھ آئیگا انہیں اس جگہ منتقل کر دیا جائے گا۔ بہلول پور سے ہم

۱۷۔ پرحالہ: ہاتھی گکھڑ کی حکومت پرحالہ پر تھی جواب راولپنڈی ایئرپورٹ کے سامنے لہتر ر روڈ پر بیس کلومیٹر دور ہے۔

۱۸۔ کوہ جود: یہ کوہ نمک اور کھیوڑا کا علاقہ ہے۔

۱۹۔ دریائے بھٹ، دریائے جہلم

۲۰۔ بابر نے خسرو کوکلداش کو حاکم سیالکوٹ اپنے ہندستان کے چوتھے حملے سے واپسی پر ۹۳۰/۱۵۲۴ میں بنایا تھا۔ اسی وقت ولی قزیل کو سیالکوٹ کی مدد کے لئے مقرر کیا گیا تھا (ارسکن، بابر ص ۲۸۸)

کشتی کے ذریعہ واپس لشکر گاہ میں پہنچے اور محفل آراستہ کی۔ بعض نے بادہ خواری کی اور بعض نے آب جو پر اکتفا کیا اور کچھ لوگوں نے معجون کی چسکیاں لیں۔ کشتی سے عشا کے وقت ہم اترے اور خیمہ گاہ میں پہنچ کر بادہ آشامی کی۔ گھوڑوں کے آرام کی خاطر ہم نے انہیں دریا کے کنارے چھوڑ دیا تاکہ دم لے سکیں۔

بتاریخ چودہ ربیع الاوّل بروز جمعہ ہم سیالکوٹ میں قیام پذیر ہوئے۔ جب کبھی ہم نے ہندُستان کی جانب رخ کیا تو ہمیشہ کوہستان ومیدان سے لاتعداد جاٹ [۲۱] و گوجر [۲۲] نکل کر آتے تاکہ ہمارے گائے، بیل اور بھینس لوٹ کر لے جاسکیں۔ جن لوگوں نے جور وستم برپا کر رکھا تھا۔ عقل سے عاری (ورق ۲۳۱) وہ بھی بدبخت لوگ تھے۔ اس سے قبل چونکہ یہ ولایات سرکش اور باغی تھیں اسی لئے ان لوگوں پر کوئی سخت گرفت نہ تھی۔ لیکن اب جب کہ یہ تمام ولایات مطیع وفرمانبردار ہوچکی تھیں انہوں نے وہی پہلی جیسی حرکات شروع کردیں۔ چنانچہ اس مرتبہ سیالکوٹ سے جو بھوکے، ننگے، اور گداومسکین لشکر گاہ کی طرف آرہے تھے ان میں ایک دم شور وغل بپا ہوا اور غارتگری کا بازار گرم ہوگیا۔ جن لوگوں نے یہ شورش بپا کی تھی ان کا سراغ لگالیا گیا۔ ان میں سے دوتین لوگوں کے لیے میں نے حکم دیا کہ ان کی تکہ بوٹی کردیں۔ شاہم اور نور بیگ کو سیالکوٹ سے لاہور سرداروں کے پاس روانہ کیا گیا کہ معلوم کریں باغی کہاں ہیں اور واقف علاقہ لوگوں سے یہ معلومات لے کر آئیں کہ سردار کہاں آسکتے ہیں اور اس کے متعلق خبریں روانہ کریں۔

عالم خاں پر سلطان ابراہیم کی فتح

اسی منزل پر ایک تاجر آیا۔ اس نے بتایا کہ سلطان ابراہیم نے عالم خاں کو زیر کرلیا ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ عالم خاں جب مجھ سے رخصت [۲۳] ہوا تو اس نے یہ نہ سوچا کہ گرمی کے آتشبار موسم میں اس کے ساتھیوں کا کیا حشر ہوگا۔ وہ دو منزلوں کا ایک کرتا ہوا لاہور پہنچ گیا۔ جس وقت عالم خاں کو ہندُستان جانے کی اجازت دی گئی تو اس وقت سلاطین ازبک اور خانوں نے بلخ کا محاصرہ کرلیا۔ ایک طرف تو عالم خاں کو ہندُستان جانے کی اجازت دی گئی اور دوسری طرف ہم بلخ کی جانب سوار ہوئے۔ لاہور پہنچنے کے بعد عالم خاں نے ان امرا سے جو ہندُستان میں تھے کہا [۲۴] تمہارے بادشاہ نے مجھے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ تم مجھے کمک فراہم کرو۔ اب تم ملکر میرے ساتھ آؤ تاکہ غازی خاں کو بھی ہمراہ لے کر دہلی وآگرہ کی جانب رخ کریں۔

اس پر انہوں نے کہا کہ ہم کس امید پر غازی خاں کے ہمراہ جائیں۔ بادشاہ کا فرمان یہ ہے کہ جس وقت غازی خاں اپنے برادر خورد حاجی خاں کو اپنے لڑکے کے ہمراہ دربار میں بطور یرغمال بھیج دے یا لاہور کی جانب روانہ کردے تو تم اس کے ہمراہ ہوجانا اگر ایسا نہ ہو تو تمہیں حق ہے کہ اس کا ساتھ نہ دو۔ کل ہی تم نے اس کے ساتھ جنگ کی تھی جس میں شکست سے دوچار ہوئے۔ اس کے بعد اب کس امید پر تم اس کا ساتھ دینا چاہتے ہو۔ تمہارے لیے خیر اسی میں ہے کہ اس کی ہمراہی اختیار نہ کرو۔

اگرچہ اس کو سمجھانے اور منع کرنے کی کوشش کی گئی لیکن بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس نے اپنے لڑکے شیر خاں کو بھیجا کہ وہ دولت خاں اور غازی خاں سے ملاقات کرکے ان کے ساتھ گفتگو کرے۔ اس نے اپنے ساتھ دلاور خاں کو بھی لے لیا۔ جسے کچھ عرصہ قید میں رکھا گیا تھا اور دوتین ماہ قبل قید وبند سے فرار ہوکر وہ لاہور پہنچ گیا تھا۔ خانجہاں کے لڑکے محمود خاں کو جس کے پاس لاہور کا ایک پرگنہ تھا اس کو بھی ساتھ لے لیا۔ انہوں نے اس امر پر اتفاق کیا کہ دولت خاں اور غازی خاں نہ صرف ان امرا کی ذمہ داری میں جنہیں ہندُستان میں متعین کیا گیا ہے اس طرف کے تمام منطقے کی ذمہ داری قبول کریں۔ اس کے علاوہ وہ دلاور خاں اور حاجی خاں کو عالم خاں کے ہمراہ روانہ کریں تاکہ وہ دہلی اور آگرہ کی ذمہ داری سنبھال لے۔ اس کے بعد اسماعیل جلوانی [۲۵]

۲۱۔ جاٹ، اردو زبان میں جاٹ اور پنجابی میں جٹ، ایک قبیلہ جو ہندو پاکستان میں پنجاب، سندھ، راجستھان اور مغربی اتر پردیش میں ملتا ہے۔ ان کا زیادہ تر پیشہ کاشتکاری ہے۔ ان میں مسلمان، ہندو اور سکھ شامل ہیں۔ جاٹ دراز قد ہوتے ہیں۔ ان کا جسم گٹھا ہوا اور مضبوط، رنگ سانولا ہوتا ہے۔ پنجاب میں زیادہ تر جاٹ قبیلے حضرت جلال الدین حسین بخاری اور حضرت فرید الدین گنج شکر کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۷، ص ۱۵ مکلیگن، ذاتوں کا انسائیکلوپیڈیا ص ۱۳۶)

۲۲۔ گوجر ایک بڑی قوم ہے جو شمال مغربی ہند وپاکستان میں بستی ہے۔ یہ تنومند اور جسمانی اعتبار سے جاٹ جیسے ہی ہیں۔ یہ ایک چرواہا قبیلہ ہے اور وسط ایشیائے سے جنوب کی طرف ہجرت کرکے آئے ہیں۔ گجرات، گجرانوالہ اور گوجر خاں ان کے نام پر ہی رکھے گئے ہیں۔ (ذاتوں کا انسائیکلوپیڈیا ص ۳۶۸، اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۱۷، ص ۵۶۲)

۲۳۔ عالم خاں کی رخصت: عالم خاں کابل میں ۹۳۱ ہجری (۱۵۲۴۔۱۵۲۵ء) میں بابر کے پاس آیا تھا۔

۲۴۔ یہ امرا بابر نے عالم خاں لودھی کے ساتھ کئے تھے اور انہوں نے سیالکوٹ اور لاہور کے آس پاس اکثر مقامات کو فتح کرلیا تھا (تاریخ خان جہانی ومخزن افغانی ص ۲۰۶)

۲۵۔ اسماعیل جلوانی، امیر سلطان ابراہیم لودھی، ابراہیم لودھی نے جب آگرہ کو اپنے بھائی جلال خاں لودھی سے بچانے کے لئے افواج روانہ کی تھیں۔ اس میں اسماعیل جلوانی بطور کمک کے گئے تھے (تاریخ خان جہانی ومخزن افغانی ص ۱۹۶)

اور بعض امرانے آکر عالم خان سے ملاقات کی اور بلا توقف کوچ پر کوچ کرتے ہوئے دہلی کی جانب روانہ ہو گئے۔ جس وقت وہ اندری پہنچے تو سلمان شیخ زادہ [۲۶] بھی آن پہنچا اور ان سے ملاقات کی۔ اب ان کی تعداد تیس چالیس ہزار افراد تک پہنچ گئی۔ چنانچہ انہوں نے دہلی پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن وہ جرأت نہ کر سکے کہ جنگ کریں یا وہاں کے قلعے کو ضرر پہنچائیں۔

جب سلطان ابراہیم کو اس محاصرہ کا علم ہوا تو اس نے اپنے لشکر کو گھوڑوں پر سوار کیا (ورق ۲۳۲)۔ جس وقت وہ ان کے نزدیک پہنچ گیا تو انہیں اس کی آمد کی خبر ہوئی۔ انہوں نے قلعہ سے محاصرہ اٹھا لیا اور دوبارہ جمع ہوئے۔ اب ان کا موضوع گفتگو یہ تھا کہ اگر ہم دن کے وقت جنگ وجدال کرتے ہیں تو افغان اپنی عزت و ناموس کا پاس کرتے ہوئے ایک دوسرے کی مدد سے گریز نہ کریں گے۔ اگر شبخون مارتے ہیں تو رات کی تاریکی میں ایک دوسرے کو کوئی نہ دیکھ سکے گا اور ہر سردار کا جدھر بھی منہ اُٹھے گا اس طرف نکل جائے گا۔ یہ باتیں کرتے ہوئے انہوں نے چھ کوس راستہ گھوڑوں پر طے کر لیا تا کہ شبخون مار سکیں۔ اس ارادے سے وہ دو مرتبہ دن کو دو پہر کے وقت گھوڑوں پر سوار ہو کر روانہ ہوئے اور دو تین پہر تک اسی طرح گھوڑوں پر سوار رہے۔ ان کی حالت ناتوان ہو گئی۔ ان سے آگے بڑھا جاتا تھا اور نہ ہی واپس آ سکتے تھے اور کوئی متفقہ فیصلہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ تیسری مرتبہ جب رات کا ایک پہر باقی رہ گیا تھا تو انہوں نے شبخون مارا۔ جس میں انہوں نے اتنا ہی کارنامہ سر کیا کہ دشمن کے خیموں اور جھونپڑیوں میں آگ لگا دی۔ یہ آگ رات کے آخری پہر تک جلتی رہی اور وہ وہاں شور وغوغا بپا کئے رہے۔ جلال خاں جگہت اور بعض دیگر امرا بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔

سلطان ابراہیم اپنے خیل کے لوگوں کے ساتھ اپنی جھولداری میں ہی بیٹھا رہا۔ اس نے وہاں سے ہلنے تک کی تکلیف گوارا نہ کی۔ یہاں تک کہ صبح نمودار ہوئی۔ ادھر عالم خاں کے ساتھ جو لوگ تھے وہ غارت گری اور مال غنیمت جمع کرنے میں لگ گئے۔ سلطان ابراہیم کے لشکر والوں نے جب دیکھا کہ یہ چند ہی لوگ ہیں تو وہ اسی محدود لشکر کے ہمراہ جو وہاں موجود تھا ایک ہاتھی ساتھ لے کر ان کی جانب روانہ ہوئے۔ جیسے ہی ہاتھی ان کے نزدیک پہنچا تو وہ برداشت نہ کر سکے اور فرار ہوتے ہوتے عالم خاں میان دوآبہ [۲۷] میں داخل ہو گیا اور پھر اور پانی پت کے گرد نواح سے ہوتا ہوا خاص پانی پت پہنچ گیا۔ جس وقت وہ اندری پہنچا تو اس نے میاں سلیمانی سے کوئی بہانہ بنا کر چار لاکھ کی رقم وصول کر لی جو اس کے اپنے حساب میں داخل ہو گئی۔ اسی اثنا میں اسمٰعیل جلوانی بٹن اور عالم خاں کے بڑے لڑکے جلال خاں نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی اور دوآبہ میں پہنچ گئے۔ عالم خاں نے جو لشکر جمع کیا تھا اس میں سے سیف خاں، دریاں خاں، محمود خاں، خاں جہاں، شیخ جہان فرملی اور بعض دیگر لوگ جنگ سے قبل ہی فرار ہو کر ابراہیم کے پاس پہنچ گئے۔ عالم خاں، دلاور خاں اور حاجی خاں نے جب سرہند کو عبور کر لیا تو انہیں یہ اطلاع ملی کہ ہم نے ملوٹ پہنچ کر اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ دلاور خاں [۲۸] چونکہ میری حکومت کا ہمیشہ خیر خواہ رہا تھا اور ہماری خاطر اس نے تین چار ماہ تک قید و بند کی صعوبت برداشت کی تھی اسی لئے ان سے علیحدہ ہو کر وہ سلطان پور میں اپنے افراد خاندان کے پاس پہنچ گیا۔ ملوٹ پر ہمارا قبضہ ہو جانے کے تین چار دن بعد وہ اس کے نواح میں حاضر خدمت ہوا۔ کوہ دون اور دشت کے درمیان گنگوتہ نامی مقام پر ایک محکم قلعہ ہے۔ دریائے ستلج کو پار کر کے عالم خاں اور حاجی خاں اس میں داخل ہو گئے۔ ہمارے فوجی دستوں نے افغان اور ہزارہ کی بستیوں سے آ کر ان کا محاصرہ کر لیا۔ نزدیک تھا کہ وہ اس محکم قلعے پر قبضہ کر لیں کہ اتنے میں شام ہو گئی۔ چنانچہ عالم خاں اور حاجی خاں نے چاہا کہ واپس آ جائیں لیکن دروازے پر گھوڑوں کے گر جانے کے باعث وہ وہاں سے گزر نہ سکے (ورق ۲۳۳)۔ ان کے پاس ہاتھی بھی تھے۔ انہوں نے سوچا کہ ان کو آگے بڑھائیں مگر اس کام میں یہ خدشہ تھا کہ ہاتھیوں کے پیروں تلے گھوڑے کچل جائیں گے۔ اور اس کے بعد وہ گھوڑوں پر سوار باہر نہ نکل سکیں گے۔

۲۶۔ سلمان شیخ زادہ: یہ فرمل دریا کے آس پاس کے رہنے والے ہیں جو کابل اور غزنی کے علاقے میں ہے۔ دہلی اور آس پاس میں بسے ہوئے تھے (تاریخ خان جہانی و مخزن افغانی ص ۴۷۳)

۲۷۔ میان دوآبہ: گنگا اور جمنا کے بیچ کی زمین

۲۸۔ دلاور خاں: بابر نے دلاور خاں کی خیر خواہی اور مدد کے صلے میں اس کو خان خاناں کا خطاب عطا کیا تھا۔ یہ دور مان بابری کا پہلا خان خاناں ہے۔ لیکن خان خاناں کے نام کی نسبت سے سب سے زیادہ شہرت عبدالرحیم و بیرم خاں کو ہے، جن کو یہ خطاب جہانگیر اور اکبر نے دیا تھا۔ بابری سلطنت سے پہلے بھی ہندوستان میں خان خاناں کا خطاب تھا جیسے سلطان محمد نے خان خاناں کا خطاب بہلول لودھی کو دیا تھا (اردو دائرہ معارف اسلامیہ (۸، ص ۸۴۱)، خان خاناں نامہ ص ۸، اور تاریخ خان جہانی و مخزن افغانی ص ۱۳۲)

بہر حال ہزار مشکل وہ رات کی تاریکی میں پیادہ باہر نکل سکے اور غازی خاں کے پاس پہنچ گئے جو ملوٹ میں داخل نہ ہو سکنے کے باعث پہاڑوں کی طرف فرار ہو گیا تھا۔ آشنائی کے باوجود غازی خاں نے کچھ زیادہ گرم جوشی نہیں دکھائی۔ اس کے بعد عالم خاں دون سے نیچے اُتر کر پھلّور نامی مقام پر پہنچ گیا اور میری خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ لوگ جو لاہور میں مقیم تھے ان میں سے ایک شخص سیالکوٹ پہنچا۔ اس نے یہ مشورہ دیا کہ اگلے روز صبح کے وقت وہ لوگ خدمت بجالائیں گے۔ چنانچہ اگلے دن سویرے ہی ہم نے کوچ کیا اور پسرور پہنچ کر وہاں قیام پذیر ہوئے۔ یہاں محمد علی جنگ جنگ خواجہ حسین اور دیگر بعض جوان میری خدمت میں حاضر ہوئے۔

غنیم کا خیمہ دریائے راوی کے اس پار لاہور کی جانب تھا۔ ہم نے بوچکہ کو اس کے ساتھیوں کے ہمراہ اطلاع فراہم کرنے کی غرض سے روانہ کیا۔ تقریباً رات کے تین پہر گزر چکے تھے کہ یہ اطلاع ملی کہ غنیم کو جیسے ہی ہماری آمد کے بارے میں معلوم ہوا تو کوئی ایک دوسرے کا پرسان حال نہ رہا اور فرار ہو گئے۔ اگلے دن ہم نے وہاں سے کوچ کیا۔ اس روز لوازمات شاہی اور وابستگان کو خیرباد کہہ کر انہیں تو شاہ حسین اور دیگر افراد کی تحویل میں دیا اور خود تیزی کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ظہر اور عصر کے درمیان ہم کلانور پہنچے اور وہاں پر قیام پذیر ہوئے جہاں محمد سلطان مرزا، عادل سلطان اور دیگر امرا حاضر خدمت ہوئے۔

غازی خاں کا فرار

کلانور سے ہم اگلے روز صبح روانہ ہوئے۔ راہ میں یہ سراغ لگا کہ غازی خاں اور دیگر مفرورین آس پاس ہی ہیں۔ محمدی، احمدی اور دیگر امرا کو جنہیں اس مرتبہ کابل میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ میرے سامنے دوزانوں باادب بیٹھیں (کیونکہ وہ درجہ امرا پر فائز ہو گئے تھے)۔ ان میں سے بعض کو اس اقدام کے لئے علیحدہ کیا گیا کہ وہ مفرورین کا تعاقب کریں اور یہ قرار پایا کہ اگر وہ ان تک پہنچ سکیں تو اس سے کیا ہی اچھا ہو اور اگر نہ پہنچ سکیں تو قلعہ ملوٹ[29] کے اطراف اچھی طرح نگرانی کریں تاکہ قلعہ کے لوگ فرار نہ ہو سکیں۔ قلعہ ملوٹ کی طرف جانے اور اس احتیاط کو بروئے کار لانے کے پس پشت جو مقصد کارفرما تھا وہ غازی خاں کی ذات تھی۔ ان امرا کو آگے روانہ کرنے کے بعد کانوواہن کے قریب سے گزر کر ہم نے دریائے بیاس کو عبور کیا اور وہاں قیام پذیر ہوئے۔ یہاں سے دو منزلوں کو ایک کرتے ہوئے ہم اس درّے کے دامن میں پہنچ گئے جس میں قلعہ ملوٹ بنا ہوا ہے اور یہاں قیام پذیر ہوئے۔ وہ امرا جو پیشتر روانہ ہو چکے تھے انہیں اور ہندوستان کے امرا کو یہ حکم دیا گیا کہ قلعہ کا نزدیک سے محاصرہ کر کے وہ وہاں رُکے رہیں۔ دولت خاں کا پوتا، علی خاں کا بیٹا اور دولت خاں کا بڑا لڑکا اسمٰعیل خاں یہاں پہنچ گئے۔ انہیں چند بار وعدہ وعید، منت و خوشامد اور ڈرا دھمکا کر قلعے میں بھیجا گیا۔

دولت خاں کی اطاعت

بروز جمعہ لشکر کو آگے کوچ کرنے کا حکم دیا گیا قلعہ سے نصف کروہ کے فاصلے پر یہ لشکر قیام پذیر ہوا۔ قلعے کا معائنہ کرنے برانغار و جوانغار اور غول کے مورچے مقرر کرنے کے بعد میں وہاں سے واپس آیا اور لشکر میں پہنچ کر قیام کیا۔ دولت خاں نے اپنا آدمی میرے پاس بھیجا۔ اس نے میری خدمت میں عرض کیا کہ غازی خاں فرار ہو کر پہاڑوں کی طرف چلا گیا ہے۔ اگر آپ میرا قصور معاف کر دیں تو غلامی قبول کر کے قلعہ آپ کے حوالے کر دوں۔ میں نے اپنی جانب سے خواجہ میر میران کو روانہ کیا کہ وہ اس کے دل سے خوف و خطر دور کر کے یہاں لے آئے۔ چنانچہ وہ اپنے لڑکے علی خاں کی ہمراہ (ورق ۲۳۴) آیا۔ میں نے حکم دیا کہ انہی دونوں تلواروں کو جو اس نے مجھ سے جنگ و جدل کے لیے کمر پر کس رکھی تھیں اس کی گردن میں لٹکا دیں۔ چنانچہ ان دونوں کی گردن میں تلواریں لٹکا کر میرے روبرو لایا گیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ عجب گنوار اور احمق قسم کا انسان ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ

۲۹۔ ملوٹ: یہ قلعہ ضلع ہوشیار پور میں ہے۔

گئی ہے اور یہ ابھی تک بہانے تلاش کر رہا ہے۔ اسے میرے روبرو لایا گیا۔ میں نے حکم دیا کہ تلواریں اس کی گردن میں سے اُتار لیں۔ جب اسے حکم دیا گیا کہ ادب سے دوزانو میرے سامنے بیٹھے تو اس نے تاخیر کی۔ میں نے حکم دیا کہ اس کی ٹانگیں کھینچ کر اسے دوزانوں بٹھائیں۔ اسے اب میرے نزدیک بٹھایا گیا۔ ایک شخص جو ہندوستانی زبان جانتا تھا اس سے کہا کہ وہ ایک ایک بات اس سے اس طرح کہے کہ اسے ہر گزشتہ بات یاد آ جائے اور اسے جتائے کہ میں نے تجھے اپنا باپ سمجھا تو جس قدر مجھ سے تعظیم و احترام کا متوقع تھا میں نے اس سے زیادہ تیرا احترام کیا۔ میں نے تجھے اور تیرے لڑکے کو بلوچوں [30] کی طرح در بدر مارے مارے پھرنے سے نجات دلائی۔ تیرے قوم قبیلے اور حرم کی عورتوں کو ابراہیم کی قید و بند سے آزاد کرایا۔ تاتار خاں کی جاگیر کی تین کروڑ کی آمدنی دی۔ میں نے تیرے حق میں ایسی کون سی بدسلوکی کی تھی جس کے پاداش میں تو نے دو تلواریں کمر پر کس کر مجھ پر لشکر کشی کی اور میرے ولایات میں پہنچ کر تو نے فتنہ فساد بپا کیا۔

اس بوڑھے آدمی نے جواب حیران و مبہوت تھا ایک دو باتیں بڑبڑائیں۔ مگر اصل بات پر پھر بھی نہ آیا۔ اور کہتا بھی کیا اس کے پاس ان باتوں کا جواب ہی کہاں تھا۔ قرار یہ پایا کہ اس کے قوم قبیلے کے لوگوں اور حرم کی عورتوں کو اس کے حوالے کر دیا جائے مگر اس کے مال متاع کو ضبط کر لیا جائے۔ اور میں نے حکم دیا کہ وہ خواجہ میر میرن کے ہمراہ قیام کرے۔

بتاریخ ۲۲ ربیع الاوّل بروز ہفتہ اس کے قوم قبیلے اور حرم کی عورتوں کو صحیح و سالم نکالنے کے لیے میں خود ہی اس بلند جگہ پر پہنچ گیا (ورق ۲۳۴) جو دروازہ ملوٹ کے روبرو واقع ہے اور وہیں فروکش ہوا۔ اس اثنا میں علی خاں باہر نکل کر آیا اور کچھ اشرفیاں پیش کیں۔ ظہر کے وقت انہوں نے قوم قبیلے کے لوگوں اور حرم کی عورتوں کو نکالنا شروع کیا۔ عبدالعزیز، محمد علی جنگ جنگ، قتلق قدم، محمدی، احمدی اور دیگر چند قرابت داروں کو میں نے حکم دیا کہ وہ قلعے میں داخل ہو کر اس کے خزانے اور مال و متاع ضبط کر لیں۔ اگرچہ غازی خاں بھی قلعے سے نکل کر چلا گیا تھا مگر بعض لوگوں نے یہ کہا کہ ہم نے اسے قلعے میں دیکھا ہے۔ چنانچہ اس بنا پر میں نے بعض قرابت داروں اور خدمت گاروں کو دروازوں پر متعین کر دیا کہ نہ صرف کشتی میں بلکہ جہاں کہیں بھی اس کی موجودگی کا امکان ہو تلاش کریں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہمیں دھوکہ دے کر باہر نکل جائے۔ کلی اور اصلی تو وہ ہی تھا جس کی ہمیں تلاش تھی۔ اس کے علاوہ جواہرات و دیگر گراں بہا اشیا کو پوشیدگی سے باہر لے جانا چاہے تو انہیں ضبط کر لیں۔ قلعہ کے دروازے پر جو لوگ متعین تھے اگرچہ وہ بہت سختی سے نگرانی کر رہے تھے مگر وہاں گڑبڑ کی وجہ سے میں نے کچھ تیر چلائے جس میں سے ایک تیر بدبختی سے اچانک ہمایوں کے قصہ خواہوں کو جا لگا [31] اور وہ وہیں جاں بحق ہوا۔

کتب خانہ غازی خاں

دو راتیں اسی پشتے پر بسر کر کے پیر کے دن میں قلعے کا معائنہ کرنے کے لئے اس میں داخل ہوا اور غازی خاں کے کتب خانے میں جا پہنچا۔ جس میں چند نفیس کتابیں برآمد ہوئیں۔ ان میں سے کچھ کتابیں میں نے ہمایوں کو دے دیں اور کچھ کامران کے لیے بھیج دیں۔ اگرچہ یوں تو بہت سی عالمانہ کتابیں تھیں مگر جس قدر نفیس کتابوں کی توقع مجھے تھی اتنی وہاں سے نہ نکلیں۔ رات میں نے وہیں بسر کی اور صبح وہاں سے لشکر گاہ میں آیا۔

ہمارا خیال تھا کہ غازی خاں (ورق ۲۳۵) قلعے میں ہوگا مگر وہ مردود بے حیا اپنے والد، برادر خورد و کلاں، والدہ اور بہنوں کو قلعہ ملوٹ میں چھوڑ کر چند آدمیوں کے ساتھ پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔

مبین آن بی حمیت را کہ ہرگز — نخواہد دید روی نیک بختی
تن آسانی گزیند خوشتن را — زن و فرزند بگذاد بسختی [32]

(اس بے غیرت کو مت دیکھ کیونکہ وہ ہرگز خوش قسمتی کی صورت نہیں دیکھے گا جس نے اپنے لیے آسودگی اختیار کی اور بیوی بچوں کو مصیبت میں چھوڑ دیا۔)

۳۰۔ بلوچوں کی خانہ بدوشی کی طرف اشارہ ہے جواب بھی کسی حد تک قائم ہے۔

۳۱۔ قصہ خوانی: یہ ایک معروف تفریح اور تعلیم کا ذریعہ تھا۔ قصہ خواں اپنی آواز، حرکات و سکنات اور موسیقی کو ملا کر ڈرامے کی شکل میں کہانیوں کو پیش کرتے تھے۔ یہ ایک عمدہ ادارہ تھا۔ ایران میں اب بھی قصہ خواں شہروں اور چائے خانوں میں اپنا تماشہ دکھاتے ہیں اور لوگوں کو محظوظ کرتے ہیں۔

داستان اور امیر حمزہ، بوستان خیال، باغ و بہار، آرائش محفل اور فسانہ عجائب عظیم داستانیں ہیں۔ فن داستان گوئی زندہ نہیں لیکن داستانیں باقی ہیں (کلیم الدین، ص ۲۴۰) ہند میں تقسیم ہند سے قبل تک داستانیں سنائی جاتی رہی ہیں۔ اس آخری وقت کے مشہور قصہ خواں میر باقر علی داستان گو مشہور ہیں (ملا واحدی، دلی جو ایک شہر تھا، ص ۱۱۵)

۳۲۔ یہ قطعہ سعدی شیرازی کی کتاب گلستان سے ہے۔
حکایت ۱۶ در سیرت بادشاہان (گلستان سعدی ص ۵۵)

بروز بدھ ہم نے یہاں سے کوچ کیا اور اس پہاڑ کی جانب روانہ ہوئے جس کی جانب غازی خاں فرار ہوا تھا۔ اس منزل سے جو ملوٹ کے دامن میں تھی ہم ایک کروہ آگے آگئے اور ایک درّے میں قیام پذیر ہوئے۔ دلاور خاں یہاں حاضر ہوا اور خدمت بجالایا۔ دولت خاں، علی خاں، اسمٰعیل خاں اور ان کے چند امیروں کو قید کر کے کتبہ کے حوالے کر دیا گیا کہ وہ انہیں بھیرہ کے قلعۂ ملوٹ میں [۳۳] لے جائے اور ان پر وہاں پہرہ رکھے۔ دوسرے لوگوں کو ان افراد کے حوالے کر دیا گیا جنہوں نے انہیں گرفتار کیا تھا۔ اور ان کا خون بہا دلاور خاں سے متفق ہو کر مقرر کیا گیا تھا۔ بعض کو ان کے کفیل کے حوالے کر دیا گیا اور کچھ کو قید و بند میں رکھا گیا۔ کتبہ قیدیوں کو اپنے ساتھ لے گیا۔ جب دولت خاں سلطان پور [۳۴] پہنچا تو وہاں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد قلعہ ملوٹ کا عہدیدار محمد علی جنگ جنگ کو مقرر کیا گیا۔ جہاں اس نے اپنے بردار کلاں ارغوں کو جوانوں کے ایک دستے کیساتھ متعین کر دیا۔ ہزارہ اور افغانوں میں سے دو سو یا ڈھائی سو آدمی بطور کمک وہاں مقرر کیے گئے۔

خواجہ کلاں کچھ اونٹوں پر غزنی کی شرابیں لاد کر لایا تھا۔ اس کا خیمہ ایسی بلند جگہ پر نصب تھا جہاں سے قلعہ اور میدان لشکر گاہ صاف نظر آتا تھا۔ یہاں بھی محفل عیش و نوش آراستہ کی گئی۔ بعض نے بادہ خواری کی اور بعض نے محض عرق [۳۵] پر ہی اکتفا کیا۔ گویا یہ ایک مخلوط محفل تھی۔

یہاں سے کوچ کر کے ہم ان پہاڑوں سے گزرے جن میں بہت سی جھیلیں تھیں۔ اور اس طرح ملوٹ سے نکل کر ہم دون میں داخل ہو گئے۔ ہندستانی زبان میں صاف و ہموار زمین کو دون کہتے ہیں۔ [۳۶] ہندستان میں ایک دریا بھی یہاں دون میں بہتا ہے۔ [۳۷] جس کے اطراف میں بہت سے گاؤں آباد ہیں۔ یہ دون یعنی ہموار خطۂ ارض پرگنہ جسوال کہلاتا ہے۔ جہاں دلاور خاں کی ننہیال کے لوگ آباد تھے جس کے اطراف میں دریا کے آس پاس سرسبز چراگاہیں ہیں بعض جگہ دھان کے کھیت ہیں۔ منجدھار میں تین چار چکّی پانی ہوگا۔ جو آبشار کی طرح گرتا ہوا بہتا ہے۔ یہ میدان وسعت میں اوسطاً ایک اور دو کروہ کے درمیان ہوگا۔ بعض جگہ تین کروہ تک وسیع ہے۔ یہاں پہاڑیاں زیادہ اونچی نہیں۔ بس پشتوں کی طرح چلی گئی ہیں۔ یہاں کے تمام گاؤں ان پہاڑوں کے دامنوں پر ہی آباد ہیں۔ جس جگہ گاؤں آباد ہیں وہاں مور اور بندر بکثرت نظر آتے ہیں۔ پالتو مرغیوں کی طرح اور بھی پرندے پائے جاتے ہیں جو شکل و صورت میں پالتو مرغیوں جیسے ہی ہوتے ہیں مگر ان میں سے اکثر و بیشتر کا رنگ ایک ہی ہوتا ہے۔

کیونکہ یہ وثوق سے معلوم نہ تھا کہ غازی خاں کس جگہ پوشیدہ ہے اسی لیے ہم نے امیر تردی بیگ اور دیو مالنہاس کو مقرر کیا کہ تلاش کر کے غازی خاں جہاں کہیں بھی ہو اس تک رسائی حاصل کر لیں۔

ان نیچی پہاڑیوں میں جو دون کے اطراف میں واقع ہیں عجیب محکم و استوار قلعے بنے ہوئے ہیں۔ اس کے شمال مشرق میں ایک قلعہ ہے (ورق ۲۳۶) جو کوٹلہ کہلاتا ہے۔ جس کے اطراف میں ستر اسی گز گہرے کئی تنگ درّے ہیں اور جن کی چٹانیں بالکل سیدھی کھڑی ہیں۔ البتہ اس کے صدر دروازے کی جانب ان کی گہرائی تقریباً سات آٹھ گز ہوگی۔ جس جگہ پل رواں نصب کیا جا سکتا تھا اسکی چوڑائی تقریباً دس بارہ گز ہوگی۔ پل بنانے کے لئے وہاں شہتیر ڈالے گئے تھے جن پر سے گھوڑے اور دیگر جانوروں کے گلّے گزارے جاتے تھے۔ اس کوہستانی سلسلوں میں قلعوں کو غازی خاں نے مستحکم کیا تھا یہ ان میں سے ایک تھا۔ اس کے آدمی اس میں موجود تھے۔ ہمارے حملہ آور دستے وہاں پہنچے اور نبرد آزما ہوئے۔ قریب تھا کہ قلعہ فتح ہو جائے کہ شام ڈھلنے لگی۔ چنانچہ جو لوگ قلعہ میں موجود تھے وہ ایسے محکم قلعے کو خالی کر کے فرار ہو گئے۔ دون کے گرد و نواح میں جو دوسرا مضبوط قلعہ ہے وہ گنگوٹہ کہلاتا ہے۔ اگرچہ اس کے اطراف میں گہرے تنگ درّے ہیں لیکن یہ قلعہ استحکام کے اعتبار سے کوٹلہ کے برابر نہیں۔ اوپر اس امر کی جانب اشارہ کیا جا چکا ہے کہ عالم خاں اسی قلعہ گنگوٹہ میں داخل ہوا تھا۔

۳۳۔ ملوٹ: یہ ملوٹ بھیرہ اور کلر کہار کے پاس ہے۔ کلر کہار سے تیس کلومیٹر دور ایک انتہائی خراب سڑک یہاں جاتی ہے۔ یہاں اب بھی مندروں کی باقیات موجود ہیں۔

۳۴۔ سلطان پور: جالندھر اور دریائے بیاس کے درمیان ہے۔

۳۵۔ عرق: کشید کیا ہوا الکحل

۳۶۔ دون: مولوی سید احمد دہلوی نے اس کے معنی دامن کوہ کے لکھے ہیں اور مثال ڈیرہ دون کی دی ہے (ج ۲ ص ۲۸۵)

۳۷۔ دریائے ستلج

سلطان ابراہیم سے مقابلے کے لئے روانگی

غازی خاں یورش کے لئے جس دستے کو بھیجا گیا اس کو روانہ کرنے کے بعد ہم نے رکاب توکل میں پیر رکھ کر اور عنان توکل پر سنبھال کر سلطان ابراہیم ابن سلطان سکندر ابن سلطان بہلول لودی افغان کی جانب توجہ دی۔ اس کا پائے تخت اس وقت دہلی تھا۔ اور ہندستان کے بہت سے منطقے اس کے تحت تصرّف تھے۔ جس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ اس کے پاس ایک لاکھ کا لشکر ہر وقت مستعد دموجود رہتا ہے۔ اور اس کے امرا کی لشکر گاہوں میں تقریباً ہزار ہاتھی جھومتے نظر آتے ہیں۔ ایک کوچ کر لینے کے بعد باقی شغاول کو دیپالپور کا علاقہ عنایت کر کے اسے کمک دے کر بلخ کی جانب روانہ کیا گیا۔ بلخ کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے اس مال ومتاع میں سے جو فتح ملوٹ سے حاصل ہوا تھا بہت سا مال ان عزیز واقارب اور فرزندوں نیز کم عمر رشتہ داروں کو بطور سوغات روانہ کیا گیا جو کابل میں موجود تھے۔

دون سے نشیب کی جانب ایک یا دو کوچ کئے ہوں گے کہ آرائش خاں اور ملا محمد مذہب [38] کے خطوط لے کر شاہ عمادی شیرازی حاضر خدمت ہوا۔ جس میں انہوں نے کچھ حد تک اظہار خیر خواہی کیا تھا۔ اور اپنی طرف سے سعی وکوشش کے جو کچھ اہتمام ہو سکتا تھا اس کے لئے پیش قدمی کی تھی۔ ہم نے بھی اپنی طرف سے ایک پیادہ لطف وعنایت کا ایک فرمان دے کر روانہ کیا، اور آگے کی جانب روانہ ہوئے۔ وہ حملہ آور دستے جو ملوٹ کی جانب بھیجے گئے تھے انہوں نے ہرور، کہلور نیز ان کوہستانی قلعوں کو جو ان کے گردنواح میں واقع تھے اور جو اس قدر مستحکم تھے کہ ان کی طرف عرصہ سے کسی نے رُخ نہ کیا تھا نہ صرف ان تمام قلعوں پر قبضہ کر لیا بلکہ وہاں کے لوگوں کو تاخت وتاراج کر کے واپس آئے اور ہمارے ساتھ شریک ہو گئے۔ عالم خاں بھی بحالت خستہ وزبوں پیادہ اور برہنہ آیا۔ اس کی پیشوائی کے لیے ہم نے امرا اور قرابت داروں کو بھیجا جن کے ساتھ گھوڑے بھی روانہ کئے۔ ہم اسی مقام کے گردنواح میں تھے کہ وہ حاضر ہوا اور خدمت بجالایا۔

یہاں کے گردنواح میں جو پہاڑ اور درّے ہیں وہاں بھی حملہ آور دستوں کو بھیجا گیا جہاں وہ ایک دورات رہ کر واپس آ گئے۔ لیکن وہاں سے انہیں کوئی قابل ذکر چیز ہاتھ نہ لگی۔ شاہ میر حسن، حال بیگ، اور بعض دیگر جوان حملے آوری کی اجازت لے کر روانہ ہو گئے۔ جس وقت ہم دون میں مقیم تھے دو تین مرتبہ اسمٰعیل جلوانی اور بِبَن کی عرضداشتیں ہمارے پاس پہنچیں۔ اِدھر سے بھی انہیں ان کی حسب مرضی فرامین روانہ کیے گئے۔ دون سے کوچ کر کے ہم روپڑ پہنچ گئے۔ وہاں سخت بارش ہوئی اور اس قدر سردی ہوگئی کہ بہت سے ننگے بھوکے ہندستانی مارے گئے اور وہاں سے چل کر سرہند کے قریب کرل نامی مقام پر قیام پذیر ہوئے۔ (ورق ۲۳۷) تو ایک ہندستانی ہمارے پاس آیا اور خود کو اس نے ابراہیم کا ایلچی بتایا۔ اگرچہ اس کے پاس کوئی نامہ ومراسلہ نہ تھا لیکن اس نے ہم سے یہ درخواست کی کہ اپنی طرف سے کسی شخص کو ایلچی بنا کر بھیجیں۔ ہم نے بھی جواباً سوات کے ایک شخص کو جو رات کے وقت چوکیداری کرتا تھا بھیج دیا۔ جیسے ہی یہ دونوں غریب وہاں پہنچے ابراہیم نے انہیں قید کرنے کا حکم دیا چنانچہ جب ہم نے ابراہیم کو زیر کر لیا تو یہ چوکیدار وہاں سے فرار ہو کر ہمارے پاس واپس آیا۔

دو منزلوں کو ایک کرتے ہوئے ہم بنور اور سنور ندیوں کے تیز دھارے کے پاس قیام پذیر ہوئے۔ ہندستان میں جو دیگر دریا ہیں یہ ان سے علیحدہ ہے۔ اور اسے گھگر [39] کہتے ہیں۔ پانی کے بہاؤ کی بالائی سمت ہم سیر کرنے کے لئے گھوڑوں پر روانہ ہوئے۔ چتر اسی دریا کے کنارے واقع ہے۔ اس جگہ سے تین یا چار کوس اوپر اس دریا کا سرچشمہ ہے۔ اس سے اور اوپر جب ہم سیر کے لئے آگے بڑھے تو ہمیں ایسا کشادہ درّہ نظر آیا جس میں تقریباً چار یا پانچ چکی برابر [40] پانی ہوگا۔ یہ ایسی عجب جگہ ہے جہاں کی فضا بہت ہی لطیف وخوشگوار ہے۔ میں

۳۸۔ آرائش خاں اور ملا محمد مذہب سلطان ابراہیم کی فوج میں شامل تھے (زین خاں طبقات بابری ص ۶۵)

۳۹۔ دریائے گھگر: ایک زمانے میں دریائے سندھ میں پانچ دریاؤں کے نیچے مٹھن کوٹ کے قریب مل جاتا تھا۔ اس میں اب پانی نہیں رہا لیکن اس کا خشک راستہ اب بھی بہاولپور میں جگہ جگہ ملتا ہے (پنجاب انڈر گریٹ مغلز ص ۴)

۴۰۔ چار پانچ چکی پانی: یعنی اتنا پانی جو چار پانچ چکیوں سے نکالا جاسکے۔

نے حکم دیا کہ اسی دریا کے کنارے پر اسی کشادہ درّے میں ایک باغ ترتیب دیں۔ یہاں سے پانی بہتا ہوا میدان میں آتا ہے اور ایک دو کروہ فاصلہ طے کرنے کے بعد اسی دریا میں جاملتا ہے۔ جس جگہ پانی کا سرچشمہ واقع ہے اس سے تقریباً تین یا چار کروہ نیچے دریائے گھگر ہے۔ برسات کے موسم میں اس ندی میں پانی بہت زیادہ ہو جاتا ہے اور دریائے گھگر سے مل کر سامانہ اور سنام [۴۱] کی طرف چلا جاتا ہے۔

اس منزل پر یہ معلوم ہوا کہ سلطان ابراہیم جو دہلی کے اس طرف تھا وہاں سے کوچ کرتا ہوا آگے کی جانب بڑھ رہا ہے۔ دوسری طرف خاصہ خیل کا حمید خاں جو حصار فیروزہ کا شقدار تھا حصار فیروزہ کے لشکر کو ساتھ لے کر اُس طرف سے اِس طرف آ گیا ہے۔ چنانچہ کتبہ بیگ کو ابراہیم کی لشکر گاہ کی طرف اور مومن آتا کہ کو لشکر حصار فیروزہ کی جانب روانہ کیا گیا کہ وہاں سے کچھ خبر لے کر آئیں۔

اتوار کے دن بتاریخ ۱۳ جمادی الاوّل ہم نے ابنالہ سے کوچ کیا اور ایک جھیل کے کنارے قیام پذیر ہوئے ہی تھے کہ مومن آتکہ اور کتبہ بیگ اسی دن وہاں پہنچ گئے۔ ہمایوں کو براانغار کے پورے لشکر کے ساتھ جس میں خواجہ کلان، سلطان محمد دولدائی ولی خازن اور وہ امرا جو ہندستان میں رہ گئے تھے یعنی خسرو، ہندو بیگ، عبدالعزیز، محمد علی جنگ جنگ وغیرہ شامل تھے۔ حملے کے لئے مقرر کیا گیا۔ غول میں شاہ منصور برلاس کے عزیز و اقارب، کتبہ بیگ، محب علی بھی گروہ میں شامل تھے۔ بتن بھی اسی منزل پر آن پہنچا اور خدمت بجالایا۔ یہ افغان بھی بڑے ہی دیہاتی اور بے شعور قسم کے انسان ہیں۔ اگرچہ دلاور خاں نوکر ہی تھا مگر مرتبے میں اس سے کہیں بالاتر ہونے کے باوجود میرے سامنے بیٹھتا نہیں تھا۔ اسی طرح عالم خاں کے لڑکے جو شاہی خاندان سے ہیں میرے سامنے بیٹھتے نہیں تھے، مگر اس نامعقول آدمی نے بیٹھنے کی اجازت چاہی مگر اس کی اس نامعقول بات پر کون کان دھرتا۔ [۴۲]

ہمایوں کا حمید خاں پر حملہ

اس مہینے کی چوبیس تاریخ کو ہفتے کے دن صبح کے وقت (ورق ۲۳۸) ہمایوں نے حمید خاں کی جانب رُخ کیا اور اس پر حملہ آور ہوا۔ اس نے سوڈیڑھ سو سے زیادہ عمدہ جوانوں کو قراولی کے لیے علیحدہ کیا اور آگے کی طرف روانہ ہوا۔ قراول کے لوگوں نے پیش قدمی کی اور نبرد آزما ہو گئے۔ ایک دو مرتبہ مجادلہ بھی ہوا۔ اسی اثنا میں عقب سے ہمایوں کی سپاہ نمودار ہوئی۔ ان لوگوں کے وہاں پہنچتے ہی غنیم کی فوج نے فرار ہونا شروع کر دیا۔ سو دو سو آدمیوں کو ان کے گھوڑوں پر سے اُتارا گیا۔ نصف کے سر کاٹ کر اور نصف کو زندہ سات آٹھ ہاتھیوں کے ہمراہ لایا گیا۔ ہمایوں کو جو فتح نصیب ہوئی تھی اس کی خبر اٹھارہ تاریخ کو بروز جمعہ بیگ میرک مغل لے کر آیا۔ اسی وقت خلعت خاصہ اور طویلے میں سے ایک اسپ خاصہ عنایت کر کے ہمایوں کو اس انعام سے نوازا گیا اور مزید انعام و اکرام کا وعدہ کیا گیا۔

اکیس تاریخ کو پیر کے دن اسی مقام پر علی قلی اور دیگر تفنگ اندازوں کو حکم دیا گیا کہ ان سب کو سزا دینے کے لیے تفنگ سے موت کی نیند سلا دیں۔ اسی دن یعنی اکیس تاریخ کو بروز ہفتہ ہمایوں سو قیدی اور سات آٹھ ہاتھی لے کر حاضر خدمت ہوا۔ یہ اس کی اوّلین شورش تھی اور میدان کارزار میں پہلی کامیابی جسے نیک فال سمجھا گیا۔ ہمارے تعاقب کرنے والے دستے نے فرار ہونے والوں کا تعاقب کیا اور حصار فیروزہ کو تخت و تاراج کر کے واپس آئے۔ حصار فیروزہ اور اس کے تابع و لاحق علاقوں کی آمدنی ایک کروڑ ہے یہ ولایت مزید ایک کروڑ نقد رقم کے ساتھ ہمایوں کو انعام میں عطا کر دی گئی۔

اس منزل سے کوچ کر کے ہم شاہ آباد پہنچ گئے۔ سلطان ابراہیم کی لشکر گاہ میں کیا کچھ ہو رہا ہے اسے جاننے کے لیے ایک شخص کو روانہ کیا گیا۔ اور چند روز تک اسی منزل پر قیام پذیر رہے۔ رحمت پیادہ کو فتح نامے دے کر کابل روانہ کیا گیا۔

۴۱۔ سامانہ اور سنام: یہ دونوں پٹیالہ میں ہیں (ایلیٹ ص ۲۶۵) سامانہ پٹیالہ سے جنوب مغرب میں ہے۔

۴۲۔ آداب دربار کے مطابق وزیر اعلیٰ اور بزرگ وزرا، حکما، علما اور اعلیٰ شہزادگان بادشاہ کے سامنے بیٹھ سکتے تھے۔ باقی لوگ ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے تھے۔

اسی دن اسی منزل گاہ پر ہمایوں نے اپنے چہرے کی اصلاح کرائی [۴۳]۔ (جس طرح مرحوم ومغفور والد بزرگوار نے اپنے خط بنوانے کا ذکر ان واقعات میں کیا ہے [۴۴] اسی طرح بندہ داعی نے مرحوم کا تتبع کرتے ہوئے یہاں اس واقع کا ذکر کیا ہے۔ اُس وقت میری عمر اٹھارہ سال تھی اور اس وقت میری عمر تقریباً چھیالیس سال ہوگی۔ محررہ محمد ہمایوں۔) (یہ عبارت حضرت ہمایوں بادشاہ کے خط مبارک سے یہاں نقل کی گئی ہے)

اسی منزل پر پیر کے دن بتاریخ اٹھائیس جمادی الاوّل آفتاب برج محل میں منتقل ہوا۔ اب ابراہیم کی لشکرگاہ سے بھی متواتر خبریں آنے لگیں کہ وہ ہر روز ایک دو کوس کوچ کرکے اور ہر منزل پر دو یا تین دن قیام کرتا ہوا پیش قدمی کر رہا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی کوچ کیا اور شاہ آباد سے دو منزلوں کو ایک کرتے ہوئے دریائے جمنا کے کنارے سرساوہ کے سامنے قیام پذیر ہوئے۔ یہاں سے ہم نے خواجہ کلان کے ملازم حیدر قلعی کو بھیجا کہ گن سن کر کچھ خبر لائے۔ ہم دریائے جمنا کو گھاٹ پر سے پار کرکے سرساوہ پہنچ گئے اور وہاں کی سیر کو نکل گئے۔ اس روز ہم نے معجون کی بھی چسکیاں لیں۔ سرساوہ میں چشمہ بھی ہے۔ جس میں سے تھوڑا سا پانی نکل کر بہہ جاتا ہے۔ یہ جگہ بڑی نہیں۔ تردی بیگ خاکسار نے اس جگہ کی تعریف کی۔ جس پر میں نے کہا کہ (ورق ۲۳۹) اب یہ تیری ہوگئی چنانچہ اسی مناسبت سے یہ خطہ اسے عطا کردیا گیا۔

میں نے ایک کشتی پر سائبان بندھوالیا تھا۔ کبھی اس کشتی میں دریا کی سیر کرتا اور کبھی کوچ کرتے وقت اس پر سوار ہوتا۔ اس منزل سے میں نے دریا کے کنارے بہاؤ کی جانب دو کوچ سفر طے کیا۔ حیدر قلی کو خبر لانے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ چنانچہ وہ یہ خبر لے کر آیا کہ داؤد خاں اور ہیتم خاں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ چھ سات ہزار سواروں کو ساتھ لے کر دوآبے کو درمیان سے عبور کریں۔ چنانچہ انہوں نے سلطان ابراہیم کے ڈیرے سے تین چار کروہ پہلے ڈیرہ لگا رکھا ہے اور اسی جگہ وہ فروکش ہیں۔ اتوار کے دن بتاریخ اٹھارہ جمادی الآخر میں نے چین تیمور سلطان، مہدی خواجہ، محمد سلطان مرزا، اور عادل سلطان کو جوانغار کے تمام لوگوں کے ساتھ جو سلطان جنید، شاہ میر حسین، قتلق قدم پر مشتمل تھا علیحدہ کیا اور غول کے لئے یونس علی، عبداللہ واحمد کتہ بیگ کو علیحدہ کرکے انہیں یورش کے لیے روانہ کیا۔ ظہر کے وقت یہاں سے دریا کو عبور کرکے اور عصر ومغرب کے درمیان وہ وہاں سے روانہ ہوکر فجر کے وقت دشمن کے سر پر جا پہنچے۔ دشمن نے بھی تھوڑی سی پیشقدمی کی اور کچھ بندوبست بھی وہاں کیا۔ لیکن ہمارے لوگ جیسے ہی وہاں پہنچے انہوں نے اس پر قابو پالیا اور آگے کی جانب بڑھ گئے۔ یہاں تک کہ وہ ابراہیم کے ڈیرے تک پہنچ گئے۔ انہوں نے داؤد خاں کے بڑے بھائی ہیتم خاں اور ان کے ایک سردار کو گھوڑے پر سے اُتار لیا اور وہ ستر اسّی آدمیوں نیز چھ سات ہاتھیوں کے ہمراہ واپس آئے۔ جن میں سے بیشتر کو بطور تنبیہ سزائے موت کا مستحق قرار دیا گیا۔

تیاری جنگ پانی پت

وہاں سے کوچ کرکے میں نے برانغار جوانغار اور غول کے لشکروں کو ترتیب دے کر ان کا معائنہ کیا۔ جسے اصطلاحاً ویم کہتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ لشکر کے لوگوں کو گھوڑوں پر سوار کرادیا جاتا ہے۔ جن کے ہاتھ میں کمان ہوتی ہے یا چابک دے دیا جاتا ہے اور اس دستور کے مطابق جو ان کے درمیان مقرر ہے (کمانوں اور چابکوں کی تعداد سے) لشکر کی تعداد کا تخمینہ لگالیا جاتا ہے۔[۴۵] اس قاعدے کی رو سے قیاس تھا کہ اس قدر لشکر ہوگا لیکن وہ تعداد میں اتنا نہ تھا۔ اس منزل پر حکم دیا گیا کہ لشکر کے تمام لوگ جس مقام ومرتبے کے بھی ہوں گاڑیاں لے کر آئیں۔ اور اس طرح سات سو گاڑیاں جمع ہوگئیں۔[۴۶] استاد علی قلی کو حکم دیا گیا کہ ان گاڑیوں کو روم کی طرز پر زنجیروں سے باندھنے کے بجائے چمڑے کی رسیوں سے روم کی طرز پر ایک دوسرے کے ساتھ اس

۴۳۔ ہمایوں کا اضافہ: یہ عبارت ۹۵۹ھ/۱۵۵۱ء میں تحریر کی گئی ہوگی اس وقت ہمایوں کابل میں تھا۔

۴۴۔ بابر نے پہلا خط ۲۳ سال کی عمر میں بنایا تھا۔ اس کا ذکر ۹۱۰/۱۵۰۴ کے حالات میں ورق ۱۰۱ پر درج ہے۔

۴۵۔ ویم: یہ تفصیل ترکی مخطوطے میں نہیں ہے۔

۴۶۔ گاڑیاں: بابر نے یہاں لفظ "آرابہ" استعمال کیا ہے۔ شاہ کے مطابق یہ دو پہیوں والی گاڑی ہے (ص ۴) بابر کے مترجموں میں اختلاف ہے کہ آیا یہ عام گاڑیاں تھیں یا توپ ڈھونے والی گاڑیاں۔ بابر کے پاس کتنی توپیں اور اس کی گاڑیاں تھیں، اس کا کوئی صحیح ثبوت نہیں۔ مبارک شاہ نے آداب الحرب والشجاع جو تیرھویں صدی میں تصنیف ہوئی، میں آرابہ جملے میں استعمال ہونے والی پہیوں والی گاڑی کو ہی کہا ہے (نذیر جان ص ۳۲۹)

طرح باندھے کہ ہر دو گاڑیوں کے درمیان چھ ڈھالیں ہوں۔[47] تفنگ انداز سپاہی ان ڈھالوں اور گاڑیوں کے پیچھے سے کھڑے ہو کر تفنگوں سے نشانہ بازی کریں۔ ان وسائل کو ترتیب دینے کے لیے تمام باخبر امرا اور جوانوں کو مشورہ کرنے کے لئے جمع کیا گیا۔ یہ مشورہ عام تھا اور متفقہ فیصلہ اس امر پر ہوا کہ پانی پت ایسا شہر ہے جس میں بہت سے محلات اور مکانات ہیں۔ محلات و مکانات ایک طرف رہیں اور دوسری طرف کو گاڑیوں اور ڈھالوں سے مستحکم کر کے پیادہ سپاہ کو گاڑیوں اور ڈھالوں کے پیچھے رکھا جائے۔ اس بات پر متفق ہو جانے کے بعد ہم نے کوچ کیا اور دو منزلوں کو (ورق ۲۴۰) ایک کرتے ہوئے جمادی الآخر کے آخری دن بروز جمعرات پانی پت پہنچ گئے۔ ہماری دائیں جانب شہر اور اس کے محلات تھے۔ سامنے کی طرف گاڑیاں اور ڈھالیں تھیں جنھیں ہم نے وہاں ترتیب سے لگا رکھا تھا۔ بائیں طرف بعض جگہ خندق تھی اور بعض جگہ بندش کرنے کے لیے درختوں کے جھنڈ۔ ہر جگہ اتنے فاصلہ پر جہاں تیر کی رسائی ہو سکے، جگہ چھوڑ دی گئی کہ وہاں سے سو ڈیڑھ سو آدمی نکل سکیں۔[48] لشکر میں بعض لوگ شک و تردید اور خوف میں مبتلا تھے۔ شک و تردید میں مبتلا ہونا بے سود ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے روز ازل جو تقدیر میں لکھ دیا ہے وہ بدل نہیں سکتا۔ ان لوگوں کو بھی مورد الزام قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ دو تین ماہ قبل وہ وطن سے نکل کر آئے تھے۔ جس قوم سے ان کا واسطہ پڑا تھا وہ ان کے لیے قطعی اجنبی تھی۔ نہ تو ہم ان کی زبان جانتے تھے اور نہ ہی وہ ہماری بات سمجھتے تھے۔

پریشان جمعی و جمعی پریشان　　　گرفتار قومی و قومی عجایب

(کچھ جمعیت پریشان و سرگرداں اور کچھ جمعیت پریشان خاطر۔ وہ ایسی قوم سے دوچار ہوئے تھے جو بطور قوم ان کے لیے عجیب و غریب تھی)

ہمارے لشکر کا تخمینہ تھا کہ دشمن کی فوج ایک لاکھ ہو گی۔ مدمقابل اور اس کے امرا کے پاس جو ہاتھی ہیں ان کی تعداد ایک ہزار ہو گی۔ دو نسل یعنی باپ اور دادا کے جمع کردہ خزانے کے علاوہ اس کے پاس اپنا نقد روپیہ بھی موجود تھا۔ ہندستان میں یہ رسم ہے کہ جب کبھی اس قسم کا موقع آتا ہے تو نقد روپیہ دیکر معینہ مدت کے لیے آدمی کو نوکر رکھ لیا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو یہاں بدھندی[49] کہتے ہیں۔ اگر وہ چاہتا تو ایک دو لاکھ نوکر اجرت پر رکھ سکتا تھا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ وہ نا تو اپنے جوانوں کو راضی رکھ سکا اور نہ ہی اس نے اپنا خزانہ ان میں تقسیم کیا۔ آخر وہ جوانوں کو خوش بھی کیسے رکھ سکتا تھا کیونکہ بخل کنجوسی اس کی طبیعت پر بہت زیادہ غالب تھی اور خود مال و دولت جمع کرنے کا بیحد خواہاں۔ وہ ایک نا آزمودہ جوان تھا۔

اس وقت جب کہ پانی پت میں لشکر گاہ کو گاڑیوں، درخت کے تنوں اور خندقوں سے مرتب کیا جا رہا تھا درویش محمد ساربان نے عرض کیا۔ اس قدر احتیاط تدابیر اختیار کرنے کے بعد کیا یہ امکان باقی رہ جاتا ہے کہ وہ یہاں آئے گا۔ میں نے اس سے کہا کہ تو ان کا خانان اور سلاطین ازبک سے مقابلہ کر رہا ہے کیونکہ جس سال ہم سمرقند سے حصار آئے تو تمام ازبک خانان اور سلاطین نے یک جا جمع و متفق ہو کر ہم پر حملہ آور ہونے کے ارادے سے دربند کو عبور کیا تھا۔ ہم نے افراد و خاندان، مال و دولت، کل سپاہ اور مغلوں کو حصار کے محلوں میں پہنچا دیا تھا اور ان محلّوں کے گلی کوچوں کی ناکہ بندی کر کے انہیں محکم کر دیا تھا۔ چونکہ وہ ازبک خانان و سلاطین اس امر سے واقف تھے کہ کس طرح مقابلہ کریں اور کس طرح نکل کر جائیں اور انہیں یہ بھی علم تھا کہ ہم نے حصار کی حفاظت کے لیے جان تک کی بازی لگا دی ہے۔ اسی لیے انہوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ ہم سے برسرپیکار نہ ہوں چنانچہ نوندک سے ہی واپس چلے گئے۔ ان کا تو ان سے مقابلہ مت کر کارزار کے حساب و کتاب اور ساز و برگ جنگ کے بارے میں یہ لوگ صحیح اندازہ مشکل ہی سے لگا سکتے ہیں۔

خداوند تعالیٰ نے اچھا ہی کیا، وہی ہوا جو میں نے کہا تھا۔ جن سات آٹھ دن میں ہم پانی پت میں رہے ہمارے آدمی رفتہ رفتہ دشمن کے خیمے تک پہنچنے لگے اور اس کے بہت سے لوگوں کو اپنے تیروں کا نشانہ بنانے لگے

۴۷۔ گاڑیوں کو ایک دوسرے سے زنجیر سے باندھ کر ایک رکاوٹ پیدا کرنا مقصد ہے جس کے پیچھے سے بندوقچی نشانہ لگا سکیں۔ یہ طریقہ سلطان مراد اور سلطان سلیم دونوں نے شاہ اسماعیل کے خلاف آزمایا تھا (حبیب السیر ۳۶:۴) ۵۴۶:۴ مذکور از تھیکسٹن ص ۳۲۳، نوٹ ۱۸)

۴۸۔ نقشہ ترتیب لشکر۔

۴۹۔ بدھندی: دھندے کی اجرت یا دھاڑی پر کام کرنے والے کرائے کے فوجی۔

بابر کے مطابق ابراہیم کا لشکر ایک لاکھ تھا جس میں تقریباً ایک ہزار ہاتھی تھے۔ بابر کی سپاہ کی تعداد نیلاب پر بارہ ہزار تھی لیکن راستے میں اس میں مزید سپاہ شامل ہوئے ہونگے۔ پانی پت میں بابر نے اپنی فوج کی تعداد نہیں لکھی، اتنا لکھا ہے کہ یہ اندازے سے کم تھی۔ بابر کا تجزیہ ہے کہ اس کی فتح میں تیراندازوں کا بڑا حصہ تھا۔

(ورق ۲۴۱)۔ان کی طرف سے کوئی حرکت وجنبش نہیں ہوئی۔ ہم نے بعض ہندستانی امرا کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے جو میری حکومت کے خیر خواہ تھے مہدی خواجہ، محمد سلطان مرزا، عادل سلطان، خسرو شاہ، میر حسن، سلطان جنیدی برلاس، عبدالعزیز میر آخور، محمد علی جنگ جنگ، قتلق قدم، ولی خازن، خلیفہ محب علی، محمد بخشی، جان بیگ اور قراقوزی سرداروں کو چار پانچ ہزار آدمیوں کے ساتھ شبخون کے لئے روانہ کیا۔ چونکہ وہ باہمی طور پر رات کی وجہ سے اتفاق پیدا نہ کر سکے۔ منتشر و پراگندہ حالت میں وہاں پہنچے۔ اسی لیے وہاں انکی پیش نہ گئی۔ یہاں تک کہ صبح نمودار ہوگئی۔ جس وقت دن روشن ہوا تو وہ دشمن کی خیمہ گاہ کے نزدیک تھے۔ غنیم کے لوگ بھی نقارہ بجا کر اور اپنے ہاتھیوں کو ترتیب دیکر مقابلے کے لیے آگئے۔ لیکن معرکہ سر نہ کر سکے۔ اگرچہ وہ بہت سے لوگوں کے ساتھ نبرد آزما ہوئے لیکن کوئی بھی گرفتار نہ ہوا اور صحیح سالم نکل آئے۔ محمد علی جنگ جنگ کے پیر میں تیر آکر لگا تھا۔ اگر یہ مہلک تو نہ تھا مگر جنگ کے دوران وہ میدان کارزار میں نہ اُتر سکا۔ جیسے ہی مجھے یہ خبر ملی میں نے ہمایوں کو اس کے لشکر کے ساتھ ایک ڈیڑھ کوس آگے بڑھایا۔ میں خود بھی باقی لشکر کو ترتیب دے کر پیش قدمی کے لیے روانہ ہوا۔ جو لوگ شبخون کے لیے گئے تھے وہ ہمایوں کے ہمراہ ہوگئے۔ چونکہ دشمن کے کسی بھی آدمی نے پیش قدمی نہیں کی اسی لئے ہم بھی واپس آکر فروکش ہوگئے۔ اس رات لشکر گاہ میں غلط افواہوں کی بنا پر ہنگامہ بپا ہوگیا۔ تقریباً ایک گھڑی تک شور و غوغا و جنگی نعروں کی سی کیفیت برقرار رہی۔ جو لوگ اس قسم کے شور و غوغا کے عادی نہ تھے ان پر تو خوف طاری ہوگیا۔ لیکن کچھ دیر بعد یہ فتنہ فروکش ہوگیا۔

جنگ پانی پت

جمعہ ۸ رجب بوقت نماز فجر قراول دستے کی جانب سے یہ خبر آئی کہ دشمن اپنی فوج کو ترتیب دے کر چلا آرہا ہے۔ ہم نے بھی زرہ بکتر پہنا اور خود کو مسلح کر کے اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے برانغار ہمایوں، خواجہ کلاں، سلطان محمد دولدائی، ہندو بیگ، ولی خازن اور پیر قلی سیتانی پر مشتمل تھا۔ جوانغار میں محمد سلطان مرزا، مہدی خواجہ، عادل سلطان، شاہ میر حسن، سلطان جنید برلاس، قتلق قدم، جان بیگ، محمد بخشی اور شاہ حسین یار مغل غانچی شامل تھے۔ غول میں چین تیمور سلطان، سلیمان مرزا، محمدی کوکلداش، شاہ منصور برلاس، یونس علی، درویش محمد ساربان، عبداللہ کتابدار تھے۔ غول کے بائیں جانب خلیفہ، مرزا بیگ ترخاں، ہراول خسرو کوکلداش، محمد علی جنگ جنگ تھے۔ عبدالعزیز، میر آخور کو محفوظ دستے میں رکھا گیا تھا۔ ابتداً برانغار پر ولی قیزیل، ملک قاسم اور بابا قشقہ کو اس کے مغل دستے کے ہمراہ یورش کے لیے مقرر کیا گیا۔ ابتداً جوانغار میں قراقوزی، ابو المحمد نیزہ باز، شیخ علی، شیخ جمال بارین، مہدی، تلنگری قلی مغل کو تاخت و تاراج کے لیے متعین کیا گیا تاکہ دشمن جیسے ہی نزدیک آئے وہ دائیں اور بائیں سے اس کے عقب میں پہنچ جائیں۔

جس وقت سیاہ دشمن کی گرد و غبار نمودار ہوئی تو اندازہ ہوگیا کہ اس کا میلان برانغار کی جانب بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ عبدالعزیز کو محفوظ دستے کے طور پر متعین کیا گیا تھا (ورق ۲۴۲) اس لیے اسے برانغار کی کمک کے لیے روانہ کیا گیا۔ سلطان ابراہیم کی فوج دور سے نظر آئی جو بے تحاشہ دوڑی چلی آرہی تھی۔ جب وہ مزید آگے آئی تو اسے ہماری سپاہ کا گرد و غبار نظر آنے لگا۔ نیز اس نے ہماری فوج کے پروں کی ترتیب دیکھی تو شش و پنج میں پڑ گئی کہ وہ اپنی جگہ رُک جائے یا آگے کی طرف پیش قدمی کرے۔ مگر وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے اب وہ نہ تو اپنی جگہ قائم رہے اور نہ ہی پہلے کی طرح بے تحاشہ بڑھے۔

حکم دیا گیا کہ وہ لوگ جو حملہ آور دستہ میں متعین کیے گئے ہیں وہ دشمن کو دائیں بائیں جانب اور عقب سے نرغے میں لے لیں۔ اور اس پر تیر برساتے ہوئے جنگ شروع کر دیں۔ ادھر برانغار اور جوانغار دستے بھی آگے

بڑھ کر دشمن تک پہنچ جائیں۔ حملہ آور دستے کے لوگوں نے غنیم کو نرغے میں لے لیا اور اس پر تیر برسانے شروع کر دیئے۔ جوانغار میں سے مہدی خواجہ تو پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ دشمن کی فوج ایک ہاتھی کے ساتھ اس کی مقابل تھی لیکن اس نے اس کثرت سے ان پر تیر برسائے کہ انہوں نے پسپا ہونے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ غول میں سے جوانغار کی کمک کے لیے احمدی پروانچی، تردی بیگ، قوچ بیگ، اور محب علی خلیفہ کو بھیجا گیا۔ برانغار بھی جنگ میں شامل ہوگیا۔ محمدی کوکلداش، شاہ منصور برلاس، یونس علی، اور عبداللہ کو حکم دیا گیا کہ وہ سامنے کی طرف سے غول لشکر کی جانب بڑھیں اور برسر پیکار ہوں۔ استاد علی قلی نے بھی غول سے مقابل پر کئی مرتبہ خوب وار داغے۔ مصطفیٰ توپچی نے غول کی بائیں جانب سے گولوں کی خوب بارش کی۔ برانغار، جوانغار غول اور حملہ آور دستوں نے دشمن کو ہر طرف سے اپنے نرغے میں لے لیا اور تیروں سے ایسی سخت جنگ کی کہ جان کی بازی لگا دی۔ دشمن نے ایک دو مرتبہ ہمارے برانغار، جوانغار پروں پر چھوٹے چھوٹے حملے بھی کیے لیکن ہمارے لوگوں نے تیر بازی کے ذریعہ انہیں واپس غول میں دھکیل دیا۔ غول کے دائیں اور بائیں پرے یکجا جمع ہو گئے اور انہوں نے دشمن کو ایسا گھیر لیا کہ اب وہ نہ تو آگے ہی بڑھ سکتا تھا اور نہ ہی اس کے لیے فرار کی کوئی راہ تھی۔

جس وقت آفتاب طلوع ہو کر ایک نیزے کے برابر اوپر آ گیا تو میدان جنگ اپنے پورے ہیجان پر تھا۔ جنگ دوپہر تک جاری رہی جس میں دشمن کے سپاہی مغلوب ہونے لگے اور ہمارے دوست شادو مسرور۔ خداوند تعالیٰ نے ہم پر اپنا بڑا فضل و کرم کیا اور ایسے سخت و دشوار کام کو ہمارے لئے آسان کر دیا۔ اور ایسا کثیر لشکر آدھے دن میں خاک برابر ہوگیا۔ ابراہیم کے نزدیک ایک جگہ ہی پانچ چھ ہزار آدمیوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ دوسری جگہوں پر بھی لاشوں کے ہی ڈھیر تھے۔ چنانچہ ہم نے یہ تخمینہ لگایا کہ اس جنگ میں تقریباً پندرہ سولہ ہزار لوگ مارے گئے ہیں۔ لیکن ہم جس وقت آگرہ پہنچے تو لوگوں نے ہمیں بتایا کہ اس جنگ میں تقریباً چالیس پچاس ہزار لوگ کام آئے۔ دشمن کو زیر کر کے اس کی سپاہ کو اس کے گھوڑوں پر سے اُتار کر ہم آگے روانہ ہوئے۔ راستے میں ہمارے سپاہی ان امرا کو جنہیں گھوڑوں پر سے اُتارا گیا تھا اور افغانوں کو پکڑ پکڑ کر لانے لگے۔ وہ ہاتھیوں کے جھنڈ کے جھنڈ ان کے مہاوتوں کے ساتھ پکڑ کر لائے اور میرے سامنے پیش کیے۔ یہ قیاس لگا کر ابراہیم فرار ہو گیا ہوگا ہم نے قسمتائی مرزا، بابا چہرہ اور بوجکہ کو مع اس کے ساتھیوں کے روانہ کیا کہ وہ اس کے لشکر کے عقب میں پہنچ کر اس کا تعاقب کریں اور جلد از جلد آگرہ پہنچیں (ورق ۲۶۴)۔ ابراہیم کی لشکرگاہ سے گزر کر ہم نے اس کے گھروں و مکانات کا معائنہ کیا اور وہاں سے آ کر ایک جوہڑ کے کنارے قیام پذیر ہوئے۔ ظہر کے وقت طاہر تبری' خلیفہ کے بہنوئی کو لاشوں کے ڈھیر میں سے ابراہیم کی لاش مل گئی۔ چنانچہ وہ اس کا سر کاٹ کر میرے پاس لے کر آیا۔

اسی دن ہمایوں مرزا کو خواجہ کلاں، محمدی، شاہ منصور برلاس، یونس علی، عبداللہ اور ولی خازن کے ساتھ اس امر کے لئے متعین کیا گیا کہ وہ بلا تاخیر تیزی کے ساتھ روانہ ہوں اور آگرہ پر قبضہ کر کے وہاں کے خزانے کو قابو میں لے لیں۔ مہدی خواجہ، محمد سلطان مرزا، عادل سلطان برلاس اور قتلق قدم کو اس کام کے لئے مقرر کیا گیا کہ وہ خود کو اپنے ساز و سامان سے علیحدہ کر کے قلعہ دہلی میں داخل ہوں اور وہاں کے خزانے کی حفاظت کریں۔ اگلے دن صبح کے وقت، ہم نے وہاں سے کوچ کیا اور ایک کروہ راستہ طے کرنے کے بعد گھوڑوں کے آرام کی خاطر دریائے جمنا کے کنارے قیام پذیر ہوئے۔

دہلی میں داخلہ

دو منزلوں کو ایک کرتے ہوئے منگل کے دن میں نے حضرت نظام الدین اولیا[۵۰] کے مزار پر پہنچ کر اس کا طواف کیا اور دہلی کے روبرو دریائے جمنا کے کنارے قیام پذیر ہوا۔ بدھ کی رات میں نے قلعہ دہلی کا معائنہ کیا۔ رات وہاں بسر کر کے اگلے روز یعنی بدھ کے دن میں نے حضرت خواجہ قطب الدین[۵۱] کے مزار کا طواف

۵۰۔ حضرت نظام الدین اولیاء: چشتیہ صوفی سلسلے کے بزرگ برصغیر میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ آپ ۱۲۳۶/۶۳۴ میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ پچیس سال کی عمر میں دہلی تشریف لائے شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر سے بیعت تھے۔ اسلامی معاشرے کی بنیادیں مستحکم کرنے میں آپ نے بے پناہ خدمات انجام دیں۔ ۷۲۵/ ۱۳۲۴ میں رحلت فرمائی۔ تاریخ وفات ''شہنشاہ دیں'' سے نکلتی ہے۔ آپ کا مزار جس علاقے میں ہے وہ اب نظام الدین کہلاتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں نے جن میں سلاطین اور امرا شامل ہیں خواہش کی ہے کہ وفات کے بعد اسی احاطے میں دفن ہوں۔ مزار کی اصل عمارت ۱۵۲۶/۹۳۳ میں فریدوں خاں نے بنوائی تھی جس میں تبدیلیاں اور اضافے ہوتے رہے ہیں۔ (آثار ص ۳۸) آپ نے اپنے پیر فریدالدین گنج شکر کے ملفوظات تحریر کیے ہیں اور کتاب کا نام ''راحت القلوب'' ہے (دلی کے بائیس خواجہ ص ۱۳۲)

۵۱۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی۔ آپ اوش (ماوراءالنہر) میں پیدا ہوئے اور خواجہ معین الدین چشتی کے خلیفہ تھے۔ سلطان شمس الدین التتمش آپ کا بے حد معتقد تھا لیکن آپ نے کبھی اس کا پیش کیا ہوا عہدہ قبول نہ کیا اور غربت کی زندگی کو ترجیح دی۔ دہلی کے جنوب میں آپ کا مقبرہ ہے اور قبر کچی ہے۔ آپ کی وفات سماع کے دوران حالت وجد میں ہوئی اور چار روز تک اسی حالت میں رہنے کے بعد انتقال کیا۔ وفات ۱۲۳۵/۶۳۳ میں ہوئی (آثار ص ۹۶)

کیا۔ اس کے بعد سلطان غیاث الدین بلبن [52] کے مقبرے و عمارات، سلطان علاء الدین خلجی کے مقبرہ و منار، [53] حوض شمسی، [54] حوض خاص [55] اور سلطان بہلول [56] اور سلطان سکندر [57] کے مقابر و باغات کی سیر کر کے لشکر گاہ میں پہنچ گیا۔ اور وہاں سے کشتی میں سوار ہو کر عرق نوشی کی گئی۔

میں نے ولی قزیل کو دہلی کا شقدار مقرر کیا اور دوست کو دہلی کا دیوان بنا کر وہاں کے خزانوں کو مہر بند کر کے ان کی تحویل میں دے دیا۔

بروز جمعرات وہاں سے کوچ کر کے تغلق آباد کے مقابل دریائے جمنا کے کنارے قیام پذیر ہوئے۔

بروز جمعہ ہمارا وہیں قیام رہا۔ مولانا محمود، شیخ زین و دیگر حضرات نے دہلی میں نماز جمعہ ادا کی اور میرے نام کا خطبہ پڑھا۔ فقرا مساکین میں کچھ رقم تقسیم کر کے وہ واپس لشکر گاہ میں آ گئے۔ [58]

بروز ہفتہ ہمارا وہاں سے کوچ ہوا۔ منزل بہ منزل کوچ کرتے ہوئے ہمارا رُخ آگرہ کی جانب تھا۔ اسی اثنا میں میں تغلق آباد کی جانب روانہ ہوا اور وہاں کی سیر کر کے لشکر گاہ میں آ گیا۔

بتاریخ بائیس رجب بروز جمعہ آگرہ کے محلات میں سے میں نے سلیمان فرملی [59] کے محل کو قیام کے لئے پسند کیا۔ چونکہ اس کا محل قلعہ سے بہت دور تھا اس لئے اگلے دن وہاں سے کوچ کر کے ترک جلال خاں جگہت کے محل میں میں نے سکونت اختیار کی۔ ہمایوں یہاں پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ وہ لوگ جو قلعہ میں موجود تھے وہ عذر اور بہانے بنائے جا رہے تھے۔ اگرچہ ہمایوں ان کی خودسری دیکھ رہا تھا لیکن اس خیال کے پیش نظر کہ کہیں وہ لوگ خزانے کو خورد و برد نہ کریں اس نے احتیاط سے کام لیا اور ہمارے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

قیمتی ہیرا

وکرما [60] جیت گوالیار کا ہندو راجہ تھا اس کے آباو اجداد سو سال سے بھی زیادہ عرصے سے وہاں حکومت کرتے چلے آ رہے تھے۔ اس کے ملک پر قبضہ کرنے کے خیال سے سکندر (ورق ۲۴۴) کئی سال تک آگرہ میں مقیم رہا۔ اس کے بعد ابراہیم کے زمانے میں اعظم ہمایوں سروانی کچھ عرصے تک سنجیدگی سے اس مہم میں لگا رہا۔ بالآخر صلح کے ذریعے اس ملک پر اس کا قبضہ ہو گیا اور وہاں کے راجہ کو شمس آباد کا علاقہ دے دیا گیا۔ ابراہیم کی شکست کے وقت وہ واصل بجہنم ہوا۔ اس وقت اس کی اولاد اور قوم قبیلے کے لوگ آگرہ میں تھے۔ جس وقت ہمایوں اس شہر میں داخل ہوا تو اس کی قوم و قبیلے کے لوگوں نے وہاں سے فرار ہونے کا ارادہ کر لیا تھا، لیکن وہاں جن لوگوں کو ہمایوں نے متعین کیا تھا انہوں نے ان کو جانے سے روکا اور ان کی حفاظت کرنے لگے۔ خود ہمایوں نے بھی اس امر کی اجازت نہیں دی کہ انہیں تاخت و تاراج کیا جائے چنانچہ انہوں نے خود ہی بربنا رغبت جواہرات اور مرصع زیورات بطور پیشکش ہمایوں کی نذر کئے۔ انہی میں وہ مشہور معروف ہیرا شامل تھا جو سلطان علاؤ الدین اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ [61] اس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ ایک جوہری نے اس کی قیمت آنکی تھی کہ جس سے پوری دنیا کے نصف دن کے اخراجات پورے ہو سکیں۔ اس کا وزن غالباً آٹھ مثقال ہے۔ جس وقت میں آگرہ پہنچا تو ہمایوں نے یہ ہیرا مجھے پیش کیا لیکن میں نے اسے ہی بخش دیا۔

اندرون قلعہ جو سپاہ موجود تھی ان کے سرغنہ ملک داد کرزانی، ملی سوروک اور فیروز خان میواتی تھے۔ ان کا مکر و فریب ظاہر ہو گیا تھا جس لئے انہیں سزائے موت کا حکم دے دیا گیا تھا۔ جس وقت ملک داد کررانی کو باہر نکال کر لایا گیا تو بعض لوگوں نے اس کی جان بخشنے کے لئے استدعا کی۔ اس مقصد کی برآری کے لئے لوگوں کی آمد و رفت اور کسی فیصلہ کن گفتگو تک پہنچنے میں چار پانچ دن کا وقت صرف ہو گیا۔ ان کی درخواست کے مطابق شفقت و عنایت کا سلوک روا رکھا گیا اور ان کا تمام مال متاع معاف کر کے انہیں ہی عطا کر دیا گیا۔ ابراہیم کی

۵۲۔ سلطان غیاث الدین بلبن کا مزار دہلی کے جنوب میں قطب کے علاقے میں کھنڈر کی حالت میں ہے۔ اس کا انتقال ۶۹۶/۱۲۸۷ میں ہوا۔ وہ اسلامی سلطنت کے معماروں میں سے تھا۔ یہ منگولوں کا زمانہ تھا جن کا راستہ روکنے کے لئے اس نے شمال مغربی سرحدوں کو مستحکم کیا۔ ملک میں امن و امان قائم کیا۔ خاندان غلامان میں سے نامور بادشاہ ہے (منتخب التواریخ ۱۸۳: اردو دائرہ معارف ج ۴، ص ۷۵۱)

۵۳۔ سلطان علاؤ الدین خلجی: مسجد قوت اسلام کے پاس اس کی قبر ہے۔ ۷۱۵/۱۳۱۵ میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کا تعلق ایک ترک قبیلے سے تھا جو افغانستان میں آ کر بس گیا تھا اور غلزی (خلجی) کہلانے لگا۔ علاء الدین ۶۹۶/۱۲۹۶ میں تخت دہلی پر بیٹھا۔ اس کے سب سے مشہور احکام وہ ہیں جن کی رو سے اس نے ضروریات زندگی کی چیزوں کی قیمتیں مقرر کر دی تھیں (اردو دائرہ معارف ج ۸، ص ۱۰۱۳) علاء الدین نے جو مینار بنوانا شروع کیا تھا وہ نامکمل ہے۔ مکمل مینار قطب الدین ایبک کا بنوایا ہوا ہے۔

۵۴۔ حوض شمسی: اس حوض کو سلطان شمس الدین التمش نے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مشورے سے جگہ چن کر بنایا تھا۔ سلطان علاؤ الدین خلجی نے اس کو صاف کروایا اور فیروز شاہ نے اس کا پانی جاری کیا (آثار ص ۹۲)

۵۵۔ حوض خاص: یہ حوض سلطان علاء الدین خلجی کا بنوایا ہوا ہے۔ امیر تیمور نے دہلی پر حملے کے بعد اس حوض کے کنارے قیام کیا تھا۔ (آثار ص ۱۰۹)

۵۶۔ سلطان بہلول لودھی: اس کا مقبرہ حضرت روشن چراغ دہلی کے پیچھے ہے۔ سادہ عمارت ہے۔ اس نے ۸۵۵/۱۴۵۱ سے ۸۹۵/۱۴۸۹ تک حکومت کی۔ وہ بہادر، فیاض اور متبع شریعت تھا۔ علی گڑھ سے کچھ فاصلے پر قصبہ سکیت میں وفات پائی۔

۵۷۔ مقبرہ سلطان سکندر لودھی: ابراہیم لودھی کے والد کا یہ مقبرہ شاید ابراہیم لودھی ہی نے ۹۲۴۔۹۲۳/۱۵۱۸۔۱۵۱۷ میں بنوایا تھا۔

۵۸۔ اینیٹ بیورج (ص ۴۷۶ نوٹ ۳) نے اس صدقے کی رقم کو خمس کہا ہے جو صحیح نہیں۔

۵۹۔ سلیمان فرملی: یہ ابراہیم لودھی کا امیر تھا۔ ابراہیم نے اور امرا کے ساتھ اس کو بھی لشکر دے کر گوالیار مدد کے لئے بھیجا تھا جہاں ابراہیم کی فوج محاصرہ کئے ہوئے تھی، فرملی افغانستان کے دریائے فرمل کے پاس کے رہنے والے ہیں۔ (تاریخ خان جہانی ص ۱۸۸)

۶۰۔ راجہ ورکرماجیت (بکرماجیت) اصل نام وکرم دتیا ہے۔ یہ تومار راجہ سلسلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس سلسلہ کے گیارہ راجاؤں کے نام قلعہ نارواڑ کے باہر ایک ستون پر کھدے ہوئے ہیں (کشوری سرن لال۔ ٹوی لائٹ اوف دی سلطنت ص ۱۹۹، فضل علی، کلیات گوالیار، ص ۱۹)

۶۱۔ مشہور و معروف ہیرا: اس قدر قیمتی ہیرا دنیا میں کوئی اور نہیں اس کا نام ہی آگے چل کر کوہ نور ہو۔ زیادہ تر بابری مصنفین کا یہی خیال ہے۔

ماں کو ایک پرگنہ عنایت کیا گیا جس کی نقد آمدنی سات لاکھ تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے امرا میں سے ہر ایک کو پرگنے عطا کیے گئے۔ اس کے علاوہ اس کی ماں کو اس کے مال و اسباب کے ساتھ آگرہ سے باہر نکال کر دریا کے بہاو کی جانب ایک کروہ کے فاصلے پر رہنے کے لئے مکان بھی دیا گیا۔

ماہ رجب کی اٹھائیس تاریخ کو بروز جمعرات ظہر کے وقت میں آگرے میں داخل ہو کر سلطان ابراہیم کی منزل گاہ میں قیام پذیر ہوا۔

میں نے ولایت کابل کی تسخیر ۹۱۰ھ (۱۵۰۴-۱۵۰۵) میں کی تھی۔ اس زمانے سے اب تک میری یہی آرزو چلی آ رہی تھی کہ ہندستان فتح کرلوں۔ کبھی تو امرا کی سست روی کے باعث اور کبھی بھائیوں کی ناچاقی کی وجہ سے ہندستان پر یورش کا موقعہ نہیں مل سکا تھا۔ اور ان ممالک کی تسخیر نہیں ہو رہی تھی۔ بالآخر اس قسم کے مواقع دور ہوئے اور ادنی لوگوں سے امرا تک کوئی شخص ایسا نہ رہا جو اس مقصد کے خلاف ایک لفظ بھی کہہ سکتا، ۹۲۵ھ (۱۵۱۹ء) میں ہم نے لشکر کشی اور قلعہ باجوڑ کو دو گھڑی میں اپنی قوت بازو سے فتح کرلیا۔ وہاں کے لوگوں کا قتل عام کر کے بھیرہ پہنچ گئے۔ ہم نے وہاں تاخت و تاراج نہ کی بلکہ ان کی جان و مال کی حفاظت کے لئے رقم کا ان سے مطالبہ کیا۔ نقد و جنس کی صورت میں چار لاکھ شاہرخی سکوں کے برابر رقم وصول ہوئی جسے لشکر کے لوگوں اور ملازمین میں ان کی تعداد کے مطابق تقسیم کر دیا۔ اس کے بعد ہم واپس کابل آ گئے۔

اُس سال سے ۹۳۲ھ تک میں سنجیدگی سے ہندستان میں دلچسپی لیتا رہا۔ سات آٹھ سال تک پانچ مرتبہ اس پر یورش کی۔[۶۲] چنانچہ پانچویں مرتبہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے سلطان ابراہیم جیسے دشمن کو مغلوب کیا اور ہندستان جیسے ممالک مسخر ہوئے (ورق ۲۴۵)۔

حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے اب تک اُس طرف کے بادشاہوں میں سے تین شخص ہی ایسے گزرے ہیں جو ولایت ہندستان پر مسلط ہوئے اور انہوں نے وہاں حکومت کی۔ ان میں سے ایک سلطان محمود غازی[۶۳] تھا۔ وہ اور اس کے جانشین کافی عرصے تک مملکت ہندستان کی سلطنت پر متمکن رہے۔ دوسرا شخص سلطان شہاب الدین غوری تھا۔[۶۴] اس نے اور اس کے غلامان و تابعین نے سالہا سال تک وہاں کے ممالک پر فرمانروائی کی۔ تیسرا حکمراں میں ہوں۔ میرا کام ان بادشاہوں کے کاموں جیسا نہیں کیونکہ سلطان محمود نے جب ہندستان کی تسخیر کی، خراساں کا تخت و سلطنت اس کے قبضے میں تھا۔ سلاطین خوارزم اور سرحدوں کے پار امیر اس کے مطیع و فرمابردار تھے۔ سمرقند کا بادشاہ اس کا تابع تھا۔ اس کا لشکر اگر دو لاکھ سپاہ پر مشتمل نہ تھا تو ایک لاکھ کے بارے میں تو کوئی کلام ہی نہیں۔ اسکے علاوہ اس کے دشمن راجہ تھے اور پورے ہندستان میں ایک بادشاہ کی حکومت نہ تھی اور ہر راجہ اپنی اپنی مملکت میں خود مختار تھا۔

سلطان شہاب الدین غوری کی سلطنت اگرچہ خراسان پر نہ تھی لیکن اس کا بڑا بھائی سلطان غیاث الدین غوری وہاں کا فرماں رواں تھا۔ طبقات ناصری[۶۵] میں یہ عبارت درج ہے کہ اس نے ایک مرتبہ ایک لاکھ بیس ہزار زرہ بکتر پوش سپاہ کو لے کر ہندستان پر حملہ کیا۔ اس کے دشمن رائے اور راجہ تھے۔ اس وقت بھی پورے ہندستان میں ایک شخص فرماں روانہ تھا۔ ہم بھیرہ پہنچے تو اس وقت ہمارے ساتھ ڈیڑھ دو ہزار آدمی ہونگے۔ پانچویں مرتبہ وہاں پہنچ کر میں نے سلطان ابراہیم کو زیر کر کے ہندستان کو فتح کیا۔ اس سے قبل ہندستان کے لشکر میں اس قدر تعداد میں لوگ نہیں لائے گئے تھے۔ وہ تمام لوگ جو اس لشکر میں ہمارے ہمراہ ہوئے وہ نوکر چاکروں اور سوداگروں سمیت بارہ ہزار قلمبند کیے گئے۔ وہ ولایات جو مجھ سے متعلق تھیں وہ بدخشاں، قندوز کابل اور قندھار پر مشتمل تھیں مگر ان سے کوئی معقول آمدنی نہیں ہوتی تھی۔ اور چونکہ دشمن ان کے نزدیک ہی تھا اس لئے ان کی مدد کرنی پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ ماوراء النہر کی کل ولایات ازبک خواتین و سلاطین کے تحت تصرف تھیں ان کے لشکر کی تعداد کا تخمینہ

۶۲۔ بابر کی ہندستان پر پانچ یورشیں اور ان کی تفصیلات معلوم نہیں اور مختلف تاریخ دانوں اور مترجموں میں اس کی تاریخوں پر مختلف آراء دی گئی ہیں۔

۶۳۔ سلطان محمود غزنوی۔ دیکھیں نوٹ ۴۴ حالات ۹۱۰ھ ہجری

۶۴۔ شہاب الدین غوری کا نام معز الدین محمد بن سام بھی مشہور ہے۔ اس نے ۵۷۵/ ۱۱۷۹ میں پشاور اور ۵۸۱/ ۱۱۸۵ میں سیالکوٹ لیا تھا ورا ہور ۵۸۲/۱۱۸۶ میں فتح کیا۔ (انسائیکلوپیڈیا اسلام)

۶۵۔ طبقات ناصری۔ ایک عمدہ تاریخ منہاج سراج کی لکھی ہوئی۔

ایک لاکھ لگایا جاتا تھا۔ ان کے ساتھ ہماری دشمنی قدیم چلی آرہی تھی۔ مملکت ہندستان پر بھیرہ سے بہار تک افغان فرمانروا سلطان ابراہیم کا قبضہ تھا۔ اس کی ولایت کو مدنظر رکھتے ہوئے حساب لگایا جائے تو اس کے لشکر کی تعداد بھی پانچ لاکھ کے قریب ہوگئی۔ لیکن اس کے بعض پورب کے امرا اس کی مخالفت پر اُترے ہوئے تھے۔ جو لشکر اس وقت اس کے پاس موجود تھا اس کا تخمینہ ایک لاکھ لگایا جا رہا تھا۔ خود اس کے اور اس کے امرا کے پاس ہزار کے قریب ہاتھی بتائے جاتے تھے۔ اس وضع و کیفیت میں خداوند تعالیٰ کی قوت پر توکل کر کے پرانے دشمن ازبکوں کو پس پشت ڈال کر اب سلطان ابراہیم جیسے صاحب لشکر اور اس کے وسیع ملک کے مدمقابل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ پر چونکہ ہم نے توکل اور بھروسہ کیا تھا اس لئے اس نے ہمارے رنج و تکلیف اور محنت و مشقت کو ضائع نہ کیا اور ایک دن وہ آیا کہ اس نے ہمارے عظیم دشمن کو ہمارے سامنے مغلوب کیا اور ہندستان جیسی وسیع مملکت (ورق ۲۴۶) پر فتح حاصل کر لی۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ حکومت میں نے اپنی طاقت و توانائی سے حاصل کی ہے اور یہ سعادت مجھے اپنی سعی و کوشش اور ہمت سے نصیب نہیں ہوئی ہے بلکہ یہ خداوند تعالیٰ کا کرم اور اس کی عنایت ہے۔

حالات ہندستان

ممالک ہندستان وسیع ہیں۔ جن کی آبادی گنجان ہے اور ولایات حاصل خیز۔ مشرق اور جنوب ہی میں نہیں بلکہ مغرب میں بھی ان کی سرحدیں سمندر سے ملتی ہیں۔ ان کے شمال میں پہاڑ ہیں جو کوہ ہندوکش کا فرستان اور کوہستان کشمیر سے ملتے ہیں۔ اس کے شمال مغرب میں کابل، غزنی، اور قندھار واقع ہیں۔ ان تمام ممالک کا پائے تخت دہلی تھا۔ سلطان شہاب الدین غوری کے بعد سے سلطان فیروز شاہ کے آخری عہد تک [۶۶] ہندستان کی اکثر و بیشتر مملکتیں سلاطین دہلی کے تحت تصرّف رہی ہیں۔ جس زمانے میں میں نے ہندستان کو فتح کیا اس وقت وہاں پانچ مسلم و دو غیر مسلم حکمراں فرمانروائی کر رہے تھے۔ اگرچہ ان کے علاوہ بہت سے چھوٹے چھوٹے رائے اور راجہ بھی پہاڑوں اور جنگلوں میں ہیں۔

حاکم

ان حکومتوں میں سے ایک حکومت افغانوں کی تھی جن کا پائے تخت دہلی تھا۔ اور بھیرہ سے بہار تک کے علاقے پر قابض تھے۔ افغانوں سے قبل جونپور سلطان حسین شرقی [۶۷] کے قبضے میں تھا۔ ان لوگوں کو پوربی کہا جاتا ہے۔ ان کے آباواجداد سلطان فیروز کی مجلس میں ساقی گری کیا کرتے تھے۔ جس کے بعد وہ مملکت جونپور پر مسلّط ہوگئے۔ شہر دہلی سلطان علاؤالدین [۶۸] کے تحت تصرّف تھا۔ یہ فرمانروا سیّد تھے۔ تیمور بیگ نے جس وقت دہلی کو فتح کیا تو انہوں نے دہلی ان کے آباواجداد کو عطا کر کے خود وہاں سے واپس چلے گئے تھے۔ سلطان بہلول لودی افغان اور اس کے لڑکے سلطان سکندر نے دہلی اور جونپور، دونوں شہر جو پائے تخت تھے پر قبضہ کر لیا اور اس طرح ایک مملکت قائم ہوگئی۔

دوسرا فرمانروا گجرات میں سلطان مظفر تھا۔ [۶۹] جس وقت میں نے سلطان ابراہیم پر فتح پائی تو اس سے چند روز قبل وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ بہت ہی شریعت کا پابند بادشاہ تھا۔ طالب علمانہ زندگی بسر کرتا اور حدیث کا مطالعہ کیا کرتا تھا، ہمیشہ کلام اللہ کی کتابت کرتا۔ یہ خاندان تانک کہلاتا ہے۔ ان کے آباواجداد بھی سلطان فیروز کی خدمت میں شراب داری کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اس کی وفات کے بعد وہ ولایت گجرات پر قابض ہوگئے۔

تیسرا خاندان دکن میں ہے۔ جو بہمنی [۷۰] کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن اس وقت اس خاندان کے بادشاہوں کا سلاطین دکن میں کوئی اقتدار و اختیار نہیں۔ ان کے تمام ولایات پر ان کے سربرآوردہ امرا مسلط ہیں۔ انہیں جس چیز کی بھی ضرورت ہوتی ہے وہ ان سے ہی طلب کرتے ہیں۔

۶۶۔ سلطان فیروز شاہ کا انتقال ۷۹۰/۱۳۸۸ میں ہوا۔

۶۷۔ سلطان حسین شرقی کا انتقال ۹۰۵/۱۵۰۰ میں ہوا۔

۶۸۔ سلطان علاؤالدین عالم شاہ کی حکومت ۸۵۰/۱۴۴۶ سے ۸۵۵/۱۴۵۱ تک رہی۔

۶۹۔ سلطان مظفر کی حکومت ۹۱۸/۱۵۱۲ سے ۹۳۳/۱۵۲۶ تک رہی

۷۰۔ بہمنی سلطنت حسن گنگو المعروف بہ سلطان علاؤالدین حسن بہمن شاہ نے ۷۴۸/۱۳۴۷ میں قائم کی۔

چوتھا فرمانروا سلطان محمود تھا[71] وہ ولایت مالوہ میں حکمرانی کرتا تھا جسے مانڈوں بھی کہتے ہیں۔ یہ خاندان خلجی کے نام سے مشہور ہے۔ اسے رانا سانگا کافر نے شکست دے کر اس مملکت کی بہت سی ولایات پر قبضہ کرلیا تھا۔ ان کے آباواجداد بھی سلطان فیروز شاہ کے ہی تربیت کردہ تھے۔ جس کی وفات کے بعد وہ ولایت مالوہ پر قابض ہو گئے۔

پانچویں ولایت بنگال تھی نصرت[72] شاہ حکمراں تھا۔ وہاں کی حکومت اس کے باپ نے حاصل کی تھی۔ وہ ذات کا سیّد تھا اور سلطان علاؤالدین لقب۔ اس اعتبار سے نصرت شاہ کو یہ حکومت ورثے میں ملی تھی (ورق ۲۴۷)۔ بنگال میں یہ عجیب رسم ہے کہ وہاں موروثی حکومت کم ہی کسی کے حصّے میں آتی ہے۔ بادشاہ کے لئے تخت مقرر ہے۔ اس کے ساتھ ہی امیروں، وزیروں اور صاحب منصب لوگوں کے لئے بھی جگہ مخصوص ہوتی ہے۔ بنگال کے لوگوں کے لئے تخت اور وہ مخصوص جگہیں بہت ہی قابل قدر سمجھی جاتی ہیں۔ ہر جگہ اور منصب کے لئے نوکر چاکر لوگوں میں سے تابع و مطیع لوگ ہی معیّن کئے جاتے ہیں۔ اگر بادشاہ کسی کو معزول یا کسی کو منصب پر مقرر کرنا چاہے تو جس شخص کو بھی وہ اس جگہ پر بٹھانا چاہے وہ انہیں نوکروں چاکروں، تابع و فرمانبردار لوگوں میں سے ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بادشاہ کے تخت پر بھی اسی خصوصیت کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ جس شخص کو بھی یہ موقع مل جائے کہ وہ بادشاہ کو قتل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہی شخص بادشاہ بن بیٹھتا ہے اور تمام امیر، وزیر، سپاہی، رعیت اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہیں اور سابق بادشاہ کی طرح اس بادشاہ کے فرمان کو بھی دل و جان سے قبول کرتے ہیں۔ بنگال کے لوگوں کا یہ قول ہے کہ ہم تخت کے وفادار ہیں اور جو شخص بھی تخت پر بیٹھے گا ہم اس کے مطیع و فرمان بردار ہونگے۔ نصرت شاہ کے باپ سلطان علاؤالدین سے پہلے ایک حبشی[73] نے اپنے بادشاہ کو قتل کر کے حکومت کی۔ حبشی کو سلطان علاؤالدین نے قتل کیا او وہ بادشاہ ہو گیا۔ اگرچہ نصرت شاہ نے حکومت اپنے باپ سلطان علاؤالدین سے ورثے میں حاصل کی تھی مگر اس سے قبل یہی سلسلہ جاری تھا۔ بنگال میں ایک رسم یہ بھی ہے کہ جو شخص بھی بادشاہ بن جاتا ہے وہ گزشتہ بادشاہ کے خزانے کو خرچ کرنا اپنے لئے عیب سمجھتا ہے۔ چنانچہ جو شخص بھی تخت و سلطنت پر قبضہ کرتا ہے وہ اپنے لئے خود ہی خزانہ مہیا کرتا ہے۔ خزانہ جمع کرنا وہاں کے لوگوں کے لئے فخر و مباحات کا ذریعہ ہے۔ وہاں قدیم زمانے سے یہ رسم بھی چلی آرہی ہے کہ نہ صرف شاہی خزانے اور مصارف بلکہ سلاطین کے تمام اخراجات کے لئے جاگیریں مقرر ہیں۔ جن کے علاوہ ان کے لئے کسی دوسری جگہ سے یہ اخراجات حاصل نہیں کئے جاسکتے۔

جن پانچ مسلمان بادشاہوں کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ ایسے حکمراں ہیں جن کے لشکر کی تعداد کثیر ہے۔

غیر مسلموں میں جو اپنی ولایت اور فوج کے اعتبار سے بڑے حکمراں شمار کئے جاتے ہیں ان میں سے پہلا بیجانگر کا راجہ ہے اور دوسرا رانا سانگا جس کا اصل ملک چتوڑ ہے جو حال ہی میں اپنی جرات اور شمشیر زنی کے باعث اس قدر عظیم فرمانروا ہو گیا کہ اس نے رنتھمبور سارنگ پور، بھیلسان اور چندیری جیسی ولایت پر جو مانڈوں سے متعلق تھیں قبضہ کرلیا تھا۔ چندیری کو جس نے دارالحرب کی شکل اختیار کرلی تھی خداوندتعالیٰ کی عنایت سے میں نے ۹۳۴ھ (۱۵۲۷۔۱۵۶۷) دو گھڑی کے اندر فتح کرلیا۔ اُس وقت وہاں میدنی راؤ موجود تھا جس کا رانا سانگاہ کے سربرآوردہ و معتبر لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہاں میں نے کفّار کا قتل عام کر کے اس جگہ کو دارالاسلام میں تبدیل کر دیا۔ اس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

اس کے علاوہ ہندستان کے اطراف و جوانب میں اور بھی بہت سے رائے اور راجے ہیں۔ ان میں سے بعض اسلام کے مطیع و فرمانبردار ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو راستوں کی دوری اور ریگستانی زمین کے باعث مسلمان بادشاہوں کی اطاعت نہیں کرتے۔

۷۱۔ سلطان محمود خلجی خاندان سے تھا۔ ان کی حکومت مالوے میں ۸۴۰/۱۴۳۶ سے ۹۳۸/۱۵۳۱ تک رہی۔

۷۲۔ نصرت شاہ کی حکومت ۹۲۵/۱۵۱۸ تا ۹۳۹/۱۵۳۲ تک رہی۔

۷۳۔ حبشی بادشاہ کا نام شمس الدین مظفر تھا اور اس نے ۹۰۰/۱۴۹۴ سے ۹۰۳/۱۴۹۷ تک حکومت کی۔

ہندُستان کا شمار اقلیم اوّل دوم اور سوم میں ہوتا ہے۔ اقلیم چہارم کی اس ملک میں جگہ نہیں۔ عجیب و غریب مملکت ہے۔ ہماری ولایات کی نسبت یہاں کی دنیا ہی دوسری ہے۔ پہاڑ دریا، جنگل وصحرا، حیوانات و نباتات اور لوگ ہی نہیں بلکہ یہاں کی بادو باران کا طور طریقہ تک جداگانہ ہے(ورق ۲۴۸)۔ کابل کے تابع وہ علاقے جن کا شمار مناطق حارّہ میں ہوتا ہے اس کی بعض چیزیں تو ہندُستان کی اشیا سے مشابہ ہیں لیکن کچھ ایسی ہیں جن میں کوئی مشابہت نہیں۔ دریائے سندھ کے پار کرتے ہی زمین، پانی، درخت، سنگ وحجر قوم قبائل آداب ورسوم سب ہی اہالی ہند کی طرح ہو جاتے ہیں۔

پہاڑی سلسلے اس کوہستانی سلسلے میں جو کشمیر کے تابع ہے پکھلی اور شمنگ جیسی ولایات واقع ہیں۔ اگرچہ موجودہ وقت میں وہ کشمیر کی اطاعت نہیں کرتے مگر ان میں سے بیشتر ولایت کشمیر میں ہی شامل ہیں۔ کشمیر کو عبور کرنے کے بعد اس کوہستانی سلسلے میں بیشمار قوم وقبائل کے لوگ، پرگنات اور ولایات ہیں۔ اس پہاڑ سے بنگال تک حتیٰ کہ سمندر کے کنارے تک آدمی ہی آدمی نظر آتے ہیں۔ اگرچہ ہندُستان کے لوگوں سے یہاں کے قبائل کے بارے میں کافی تلاش وجستجو کی گئی مگر کسی نے ایسی اطلاع بہم نہیں پہنچائی جو تحقیق کے معیار پر پوری اُتر سکے۔ انہوں نے بس اتنا ہی بتایا کہ جو لوگ پہاڑوں میں آباد ہیں انہیں کھس کہتے ہیں۔ ان کی اس بات سے میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ چونکہ ہندُستان کے لوگ حرف ''شین'' کو ''سین'' تلفظ کرتے ہیں۔ اور ان پہاڑوں میں چونکہ کشمیر ہی بس ایک مشہور ومعروف شہر ہے اسی لئے کشمیر کھس میر سے بنا ہے یعنی کھیسی لوگوں کا پہاڑ۔ چونکہ وہ لوگ پہاڑ کو ''میر'' کہتے ہیں اسی لئے وہاں کے پہاڑوں میں آباد لوگ کھیسہ کہلاتے ہیں۔ چونکہ کشمیر کے علاوہ ان پہاڑوں میں کسی شہر کا نام نہیں ملتا اس لئے احتمال یہی ہے کہ کھیسہ میر ہی کشمیر ہے۔ ان پہاڑوں میں آباد لوگوں کا مال ومتاع نافہ مشک، تبتی گائے کی دُم، زعفران، سیسہ اور تانبا جیسی چیزیں ہیں۔ اس پہاڑ کو ہندُستان کے لوگ سوالک پربت کہتے ہیں۔ ہندُستانی زبان میں ''سوا'' کا مطلب چوتھائی ہوتا ہے سو ہزار کو لاکھ اور پہاڑ کو پربت کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے سوالک پربت کے معنی سوالاکھ پہاڑ ہوئے۔ ان پہاڑوں پر سے برف کبھی نہیں پگھلتی ہندُستان کی بعض ولایات جیسے لاہور، سرہند اور سنبھل سے ان پہاڑوں پر جمی برف کی سفیدی نظر آتی ہے۔ یہ پہاڑ کابل میں ہندوکش کے نام سے مشہور ہے۔ اور یہی کوہستانی سلسلہ کابل سے مشرق کی جانب چلا گیا اور کچھ حد تک جنوب کی طرف مائل ہے۔

اس کے جنوب میں پورا ہندُستان ہے۔ اس پہاڑ کا شمالی حصّہ اور وہ نامعلوم اشخاص جو کھس کہلاتے ہیں ولایت تبت سے متعلق ہیں۔ اس پہاڑ سے بہت سے دریا نکلتے ہیں جو ہندُستان کو سیراب کرتے ہوئے گزرتے ہیں۔

دریا

سرہند کے شمال کی جانب سندھ، بھٹ، چناب، راوی، بیاس (بیا) اور ستلج نامی جو چھ دریا ہیں وہ اسی پہاڑ سے نکلتے ہیں اور ملتان کے نواح میں جب ایک ساتھ مل جاتے ہیں تو دریائے سندھ کہلاتے ہیں۔ یہ دریا مغرب کی طرف پہنچ کر ولایت ٹھٹھہ سے گزرتا ہوا بحر ہند سے ملحق ہو جاتا ہے۔ ان چھ دریاؤں کے علاوہ بھی جون (جمنا) گنگ (گنگا)، رہیب (راپتی)، گووتی (گومتی)، گگھر، سرو (سرجو) اور گندک نامی دریا ہیں۔ چنانچہ جب یہ سب ایک جگہ مل جاتے ہیں تو گنگا کہلاتے ہیں۔ دریائے گنگا مشرق کی طرف بہتا ہوا اور ولایات بنگال سے گزرتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے۔ ان سب دریاؤں کا سرچشمہ سوالک ہے۔ ان کے علاوہ بھی دیگر دریا ہیں جو ہندُستان کے پہاڑوں سے نکلتے ہیں۔ جن کے نام چنبل، بناس، بتوہ، اور سون ہیں یہ بھی دریائے گنگا سے جا ملتے ہیں(ورق ۲۴۹)

ہندُستان میں اور بھی پہاڑ ہیں جن میں سے ایک شمال سے جنوب کی طرف چلا گیا ہے۔ اس کا آغاز ولایات دہلی میں اس جگہ سے ہوتا ہے جہاں سلطان فیروز شاہ کے عہد کی عمارت جہاں نما[74] ہے اور یہ ایک سنگلاخ پہاڑی پر بنی ہوئی ہے۔ یہاں سے گزرنے کے بعد دہلی کے گرد نواح میں اور بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی سنگلاخ پہاڑیاں اِدھر اُدھر نظر آتی ہیں اور جب یہ سلسلہ ولایت میوات تک پہنچتا ہے تو اس کی پہاڑیاں بڑی ہوتی چلی جاتی ہیں۔ میوات سے گزر کر یہ پہاڑ ولایت بیانہ میں داخل ہوتا ہے۔ سیکری، باری اور دھول پور کی پہاڑیاں اس کی شاخیں ہیں مگر اس سے متصل نہیں۔ گوالیار کا پہاڑی سلسلہ جسے گالیور لکھتے ہیں اسی پہاڑ کی شاخ ہے۔ رنتھمبور، چیتوڑ، منڈو اور چندیری بھی اسی پہاڑ کی رگیں ہیں۔ بعض جگہوں پر یہ پہاڑ سات آٹھ کروہ تک ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ پہاڑ پست، سنگلاخ اور جنگلات سے پُر ہیں لیکن ان پر برف قطعی نہیں گرتی۔ ہندُستان میں بعض دریاؤں کے منابع یہی پہاڑ ہیں۔

آب رسانی

ہندُستان کی بیشتر ولایات میدانوں، اور ہموار زمین پر واقع ہیں۔ یہاں جتنے بھی ولایات اور شہر ہیں ان میں کہیں بھی آب رواں نہیں ملتا۔[75] یہاں کا آب رواں بس دریاؤں میں ہی ہوتا ہے۔ بعض جگہ جھیلیں بھی ہیں۔ بعض شہر ایسے بھی ہیں کہ نہریں کھودی جائیں تو پانی شہر تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس طریقے سے پانی حاصل نہیں کرتے جس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے ایک تو یہی کہ زراعت اور باغوں کو پانی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خریف کی فصلوں کو برسات کے موسم کی بارش سے پانی مل جاتا ہے۔ یہ بات بھی بڑی عجیب ہے کہ ربیع کی فصل کے لئے بارش نہ بھی ہو تو پیداوار ہو جاتی ہے۔ درختوں کے پودوں کو ایک یا دو سال تک رہٹ یا چرس کے ذریعے زمین سے پانی کھینچ کر سینچائی کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد پانی دینے کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ بعض سبزیوں کو پانی ضرور دیا جاتا ہے۔ لاہور، دیپال پور اور اس کے نواح میں سینچائی رہٹ سے کی جاتی ہے۔ دو لمبی رسیّوں سے کنویں کی گہرائی کے برابر حلقہ بنا لیا جاتا ہے۔ دونوں رسیّوں کے درمیان لکڑی کے ڈنڈے بندھے ہوئے ہوتے ہیں جن پر مٹّی کے لوٹے باندھ دیئے جاتے ہیں۔ ان دونوں رسیّوں کو جن پر لوٹے بندھے ہوئے تھے اس چکّر پر لٹکا دیا جاتا ہے جو کنویں کے اوپر چلتا ہے دائرے کے دوسرے سرے پر بھی ایک چکّر ہوتا ہے۔ اس چکّر کے پاس ایک اور چکّر ہوتا ہے جس پر سہارے کے ملّی سیدھی کھڑی ہوتی ہے۔ جب بیل اس چکّر کو گھماتا ہے تو اس کے پیر دوسرے چکّر کے پیروں سے جا کر ٹکراتے ہیں اور ان کی وجہ سے وہ چکّر جس پر لوٹے بندھے ہوئے ہوتے ہیں گھومنے لگتا ہے۔ اس چکّر کے گھومنے سے جس جگہ پانی آ کر گرتا ہے وہاں پر نالہ لگا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس پرنالے کی مدد سے جس طرف بھی چاہیں پانی پہنچایا جا سکتا ہے۔

آگرہ، بیانہ، چندوار اور اس کے نواح میں سینچائی چرس سے کی جاتی ہے۔ اس میں محنت بہت زیادہ لگتی ہے اور آس پاس گندگی بھی رہتی ہے۔ کنویں کی منڈیر پر دوشاخہ لکڑی مضبوطی سے لگا دی جاتی ہے۔ اس دوشاخہ لکڑی کے بیچ میں ایک چرخی لگا دی جاتی ہے۔ ایک سرے پر لمبے سے رسّے سے چرس کو باندھ کر اس چرخی پر رکھ دیتے ہیں (ورق ۲۵۵) دوسرے سرے پر بیل جوت دیا جاتا ہے۔ ایک آدمی آتا ہے اور اس بیل کو ہانکتا ہے۔ (اس طرح چرس کنویں کی منڈیر تک پہنچ جاتا ہے تو) دوسرا شخص اس چرس کو خالی کر دیتا ہے۔ بیل بار بار منڈیر تک آتا ہے اور چرس کو رسّے کے ذریعہ کھینچتا ہے۔ زمین پر جس جگہ رسّہ لگتا ہے اسی جگہ سے بیل بار بار گزرتا ہے۔ جس کے باعث اس کا پیشاب اور گوبر رسّے سے لگتا رہتا ہے اور جب یہ رسّہ کنویں میں جاتا ہے تو یہی گوبر اور پیشاب کنویں میں گر جاتا ہے۔

۷۴۔ جہاں نما۔ دیکھو آئین اکبری (۲:۹۸۲) یہ فیروز شاہ کوٹلہ کے محل کا نام ہے۔

۷۵۔ یہاں بابر آب کے ذرائع کا فرغنہ سے موازنہ کر رہا ہے جہاں بے شمار چھوٹے چھوٹے ندی نالے ہر جگہ مل جاتے ہیں۔ کیونکہ اس وادی کے تین طرف پہاڑ ہیں۔

بعض ایسی زراعتیں جن میں پانی کی ضرورت ہوتی ہے، کے لئے عورت اور مرد گھڑے سے بھر بھر کر پانی لے جاتے ہیں اور سینچائی کرتے ہیں۔ ہندستان کے شہروں اور ولایات میں رونق کا فقدان ہے۔ تمام شہروں اور زمینوں کی حالت ایک ہی جیسی ہے۔ یہاں کے باغات کے گرد باڑھ نہیں ہوتی۔ اور اکثر و بیشتر جگہیں میدان کی طرح صاف و ہموار نظر آتی ہیں۔

بعض دریا کے کناروں پر اور ندیوں میں برسات کے پانی کی وجہ سے پانی کھڑا ہو جاتا ہے جس کے باعث آمد و رفت دشوار ہو جاتی ہے۔ بعض میدانی علاقوں میں جنگل پائے جاتے ہیں جن میں خاردار درخت ہوتے ہیں۔ جن پرگنات میں یہ خاردار درخت اُگتے ہیں وہاں کے لوگ ان میں جا کر آرام سے بیٹھے رہتے ہیں اور لگان ادا کرنے میں سرکشی دکھاتے ہیں۔ یہاں دریاؤں کے علاوہ آب رواں کم ہی نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں جوہڑ بھی پائے جاتے ہیں۔ یہاں جتنی بھی نگریاں اور ولایات ہیں ان میں یا تو لوگ کنویں کے پانی پر اپنی زندگی بسر کرتے ہیں یا اس پانی پر جیتے ہیں جو حوضوں میں موسم برسات کی بارش سے جمع ہو جاتا ہے۔ یہاں کے دیہات ہی نہیں بلکہ شہر تک آن کی آن میں آباد ہوتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ویران ہو جاتے ہیں۔ ایسے بڑے بڑے شہر جہاں لوگ سالہا سال سے بستے چلے آرہے ہوں جب وہاں سے فرار ہونے پر آتے ہیں ایسے بھاگتے ہیں کہ ایک آدھ دن میں نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔ وہ اگر کسی بستی کی طرف رُخ کرتے ہیں تو وہاں انہیں نہریں کھودنے اور دیگر بندوبست کرنے کی نوبت نہیں آتی کیونکہ ان کی کاشتکاری کا انحصار سینچائی پر نہیں۔ آدمیوں کی وہاں کوئی انتہا نہیں۔ کچھ لوگ ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور مل جل کر حوض یا کنویں بنا لیتے ہیں۔ گھر بنانے اور دیوار اُٹھانے کی انہیں ضرورت نہیں۔ پھونس وافر مقدار میں ہوتا ہے اور درخت بے شمار۔ جس سے وہ چھپر ڈال لیتے ہیں اور آن کی آن میں گاؤں یا شہر بس جاتا ہے۔

جانور

ہاتھی

وہ جانور جو خاص طور پر ہندستان میں پائے جاتے ہیں ان میں سے ایک فیل ہے جسے وہاں کے لوگ ہاتھی کہتے ہیں۔ یہ جانور ولایت کالپی کی سرحدوں تک پایا جاتا ہے۔ اگر وہاں سے مشرق کی جانب ذرا آگے چلیں تو اور بھی زیادہ تعداد میں جنگلی ہاتھی پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ زیادہ تر ہاتھی اسی جگہ سے پکڑ کر لائے جاتے ہیں۔ کترہ اور مانک پوری چالیس گاؤں ایسے ہیں جہاں کے لوگوں کا کام ہی ہاتھی پکڑنا ہے اور دیوان فیل کو یہی لوگ جواب دہ ہوتے ہیں۔ ہاتھی عظیم الجثہ اور بہت ہی سمجھدار جانور ہے اس سے جو کچھ بھی کہا جائے وہ سب سمجھتا ہے اور جو بھی حکم اسے دیا جاتا ہے اس کی وہ اطاعت کرتا ہے۔ اس کی قیمت اس کے قد و قامت سے لگائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس کا جثہ جتنا بڑا ہوگا قیمت بھی زیادہ ہوگی۔ کہتے ہیں کہ بعض جزیرے ایسے بھی ہیں جہاں ہاتھی کی اونچائی دس گز ہوتی ہے۔ لیکن ابھی تک ایسا ہاتھی دیکھا نہیں جس کا قد چار پانچ گز سے زیادہ ہو۔ ہاتھی سونڈ سے ہی کھاتا ہے اور اسی سے پانی پیتا ہے۔ اگر اس کی سونڈ نہ ہو تو وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ سونڈ کے دونوں طرف اوپر کے جبڑے میں بڑے دانت ہوتے ہیں۔ وہ دیواروں اور درختوں کو ان دانتوں سے زور لگا کر نیچے گرا سکتا ہے۔ انہی دانتوں سے وہ نہ صرف جنگ بلکہ (ورق ۲۵۱) اور دوسرے وہ تمام کام کرتا ہے جس میں طاقت صرف ہوتی ہے۔ ان دانتوں کو عاج[۷۶] کہتے ہیں۔ ہندستان کو لوگ ان دانتوں کو بہت قدر کرتے ہیں۔ یہاں کے دوسرے حیوانات کی طرح ہاتھی کے بدن پر بال نہیں ہوتے۔ یہ جانور یہاں کے لوگوں کے لئے خاص اہمیت کا حامل

۷۶۔ عاج۔ فارسی لفظ جس کے معنی ہاتھی دانت کے ہیں (استائین گاس)

ہے۔فوج کا خواہ کوئی بھی لشکر ہو اس میں چند ہاتھی ضرور شامل ہوتے ہیں۔اس جانور میں کچھ عمدہ اوصاف بھی ہوتے ہیں۔بڑے بڑے دریاؤں سے جہاں پانی کا بہاؤ بہت تیز ہوتا ہے ہاتھی آسانی سے بھاری بوجھ کو لیکر گزر جاتا ہے۔بڑے بڑے چھکڑے جنھیں کھینچنے کے لئے چار پانچ سو آدمی درکار ہوں انہیں دو ہاتھی آسانی سے کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ہاتھی کا پیٹ بہت بڑا ہوتا ہے۔اونٹوں کی ایک یا دو قطاروں کو جس قدر چارا چاہئے اتنا ایک ہاتھی اکیلا کھا جاتا ہے۔

گینڈا

دوسرا جانور گینڈا ہے۔یہ بھی گراں ڈیل جانور ہے قد و قامت میں بھینس کے برابر ہوتا ہے۔ہماری ولایت میں جو یہ بات مشہور ہے کہ گینڈا اپنے سینگ پر ہاتھی کو اٹھا لیتا ہے قطعی غلط ہے۔اس کی ناک پر ایک سینگ ہوتا ہے۔جس کی لمبائی ایک بالشت سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ایسا کوئی گینڈا نہیں دیکھا گیا جس کا سینگ دو بالشت سے زیادہ ہو۔اس کے سینگ سے ایک آب خورہ اور نرد[77] کھیلنے کی گوٹ بنانے کے بعد بھی شاید چار انگشت ٹکڑا بچ رہے۔گینڈے کی کھال بہت سخت ہوتی ہے اگر سخت کمان پر اتنا زور لگا کر کہ بغل تک کھل جائے چلّہ چڑھا کر تیر اندازی کی جائے اور نشانہ ٹھیک بیٹھ جائے تو تیر تین چار انگشت تک اس کی کھال میں گھس سکتا ہے۔اس کی کھال میں بعض جگہیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں تیر کارگر ہو سکتا ہے۔یہ اگلی ٹانگوں اور رانوں کے بیچ میں ہوتی ہے جہاں جلد لٹکی ہوئی ہوتی ہے اس لئے دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے اس کے اوپر جھول ڈال رکھی ہو دیگر حیوانات کے مقابل یہ گھوڑے سے زیادہ مشابہ نظر آتا ہے۔جس طرح گھوڑے کا پیٹ بڑا نہیں ہوتا اس جانور کا پیٹ بھی نہیں ہوتا۔جس طرح گھوڑے کے ٹخنے اور اس کے سم کے بیچ میں ہڈی ہوتی ہے اسی طرح اس کے ٹخنے اور سم کے درمیان چھوٹی سی ہڈی پائی جاتی ہے۔اور جیسے گھوڑے کی اگلی ٹانگوں کے سم ہوتے ہیں اسی طرح اس کی اگلی ٹانگوں کے سم ہوتے ہیں۔درندگی میں یہ ہاتھی سے بڑھا ہوا ہے۔مگر ہاتھی کی طرح اسے سدھایا نہیں جا سکتا۔پشاور اور ہشتغر کے درمیان جنگلوں میں یہ جانور کثرت سے پایا جاتا ہے۔[78] اس کے علاوہ وہ ولایت جو دریائے سندھ اور بھیرہ کے درمیان واقع ہے وہاں کے جنگل میں بھی یہ جانور افراط سے پایا جاتا ہے۔ہندستان میں دریائے سرو[79] کے کنارے بھی یہ تعداد میں بہت زیادہ ہوتے ہیں۔جس وقت ہندستان یورش کی گئی تھی اس وقت ہشتغر کے درمیان جو جنگل ہے وہاں بہت سے گینڈے مارے گئے تھے۔اس کا سینگ ہتھیار کا کام کرتا ہے۔چنانچہ جب اس کا شکار کیا گیا تو اس نے بہت سے انسانوں اور گھوڑوں پر اپنے سینگ سے وار کیا۔ایک شکار میں تو اس نے مقصود نامی جوان کے گھوڑے کو اپنے سینگ پر نیزے کی برابر اچھال کر زمین پر گرا دیا تھا۔اس کے بعد یہ جوان بس مقصود گینڈے کے نام سے ہی مشہور ہو گیا۔

بھینسا

ایک جانور بھینسا کہلاتا ہے۔یہ عام بھینسے سے ڈیل ڈول میں کہیں بڑا ہوتا ہے۔اس کے سینگ بھینس کے سینگوں کی طرح پیچھے کی طرف مڑے ہوئے ہوتے ہیں مگر اس کی پیٹھ سے جا کر نہیں لگتے۔یہ بڑا ہی طاقتور اور خونخوار جانور ہے۔

نیل گائے

ایک جانور نیل گائے ہے۔یہ قد و قامت میں گھوڑے کے برابر ہوتی ہے۔لیکن جسامت میں گھوڑے سے کچھ کم۔اس کا رنگ نیلا ہوتا ہے۔غالباً یہی وجہ ہے کہ اس جانور کو نیل گائے کہا گیا ہے (ورق ۲۵۲)۔اس کے دو چھوٹے سینگ ہوتے ہیں۔اس کی گردن پر ایک بالشت یا ذرا لمبے بال گلے کے نیچے لٹکے رہتے ہیں۔جس

۷۷۔نرد، گوٹ:

قول و قرار کی جو نرد تھی پکی رہی
عشق بازی کی جو چوسر تھی وہ ہارے پیارے
(حضور آصف)(سید احمد دہلوی ج ۴ ص ۵۵۴)

۷۸۔گینڈا۔افسوس کہ یہ اب ان علاقوں میں ناپید ہے۔

۷۹۔دریائے سرو۔لکھنؤ کے شمال میں فیض آباد اس کے کنارے پر آباد ہے۔آگے جا کر یہ گنگا سے مل جاتا ہے۔

میں چند ہی بال ہوتے ہیں اور شکل تبتی گائے کی دم جیسی ہوتی ہے۔ اس کے کھر گائے کے کھر جیسے ہوتے ہیں۔ مادہ کا رنگ بارہ سنگھے کی کھال جیسا ہوتا ہے۔ مادہ کے سر پر نہ سینگ ہوتے ہیں اور نہ ہی بال۔ نر کے مقابلے میں مادہ زیادہ فربہ ہوتی ہے۔

کوہتہ پا ہرن

یہاں ایک قسم کا ہرن پایا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کا جثہ سفید ہرن کے برابر ہوتا ہے لیکن اس کی اگلی اور پچھلی ٹانگیں چھوٹی ہوتی ہیں اس لئے اسے کوہتہ پا (چھوٹی ٹانگوں والا) کہتے ہیں۔ اس کے سینگ بارہ سنگھے کے سینگ جیسے ہوتے ہیں۔ لیکن بارہ سنگھے کے سینگوں سے ذرا چھوٹے۔ بارہ سنگھے کی طرح اس کے سینگ بھی ہر سال گرتے ہیں۔ یہ تیز نہیں دوڑتا اسی لئے جنگل سے نکل کر باہر نہیں آتا۔

کلہرہ

یہاں ایک ہرن ایسا بھی پایا جاتا ہے جو نر غزال کی مانند ہوتا ہے۔ اس کی کمر کالی ہوتی ہے اور پیٹ کی کھال سفید۔ اس کے سینگ بارہ سنگھے کے سینگوں سے زیادہ لمبے اور بل دار ہوتے ہیں۔ ہندوستانی اسے کلہرہ کہتے ہیں۔ دراصل یہ لفظ کالا ہرن تھا جس کو مخفف کر کے کلہرہ بولنے لگے۔ اس کی مادہ سفید ہوتی ہے۔ اس کلہرہ کے ذریعے ہی لوگ جنگلی ہرن کا شکار کرتے ہیں۔ اس پالتو ہرن کے سینگوں میں جال مضبوطی سے کس دیا جاتا ہے۔ اور اس کے پیر میں پتھر کا بھاری سا گولا لٹکا کر باندھ دیتے ہیں۔ چنانچہ جس وقت ہرن اس سے علیحدہ ہو کر بھاگنا چاہتا ہے تو یہ پتھر اس کے چلنے میں مانع آتا ہے۔ اس کے بعد اس کلہرہ کو جنگلی ہرن کے مقابل لاتے ہیں۔ جن کو لڑنے میں بڑا مزا آتا ہے اور فوراً ہی لڑنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ یہ اپنے سینگوں کے بل پر لڑتا ہے۔ چنانچہ دونوں جانور ایک دوسرے کو آگے پیچھے دھکیلتے رہتے ہیں۔ اس دھکا پیل میں جنگلی ہرن کے سینگ اس جال میں پھنس جاتے ہیں جو پالتو ہرن کے سینگوں میں مضبوطی سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اگر جنگلی ہرن بھاگنا چاہے تو یہ پالتو ہرن نہیں بھاگتا اور اگر وہ بھاگنا بھی چاہے تو وہ پتھر مانع آتا ہے جو اس کے پیروں میں بندھا ہوتا ہے۔ اس طریقے سے بہت سے ہرن پکڑ لئے جاتے ہیں۔ جب وہ گرفت میں آجاتے ہیں تو انہیں سدھایا جاتا ہے تاکہ ان کے ذریعے مزید ہرن پکڑے جاسکیں۔ پالتوں ہرنوں کو گھر میں بھی لڑایا جاتا ہے اور وہ خوب لڑتے ہیں۔

ہندوستان کے دامن کوہ پر ایک ہرن اس سے بھی چھوٹا پایا جاتا ہے۔ اس میں بڑے سے بڑا قد و قامت کے اعتبار سے ایک سالہ جنگلی میمنے کے برابر ہوتا ہے۔

گینی

یہاں ایک قسم کی گائے بھی پائی جاتی ہے جو گینی کہلاتی ہے۔ یہ قد و قامت میں اتنی ہی بڑی ہوتی ہے جتنا ہمارے ملک کا مینڈھا۔ اس کا گوشت بہت نرم اور لذیذ ہوتا ہے۔

بندر

دوسرا جانور میمون ہے جسے ہندوستانی بندر (باندر) کہتے ہیں۔ اس کی بھی بہت سے قسمیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک قسم ایسی ہوتی ہے جسے لوگ ولایات میں لے جاتے ہیں۔ مداری انہیں کرتب سکھاتے ہیں۔ درّہ نور اور درّہ کوہ سفید کے کوہستانی سلسلے کے علاوہ خیبر کے گردونواح میں پہاڑ کے دامن پر اور اس سے نیچے پورے ہندوستان میں یہ جانور پایا جاتا ہے۔ ان جگہوں سے بالاتر مقامات پر بندر دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے بال زرد ہوتے ہیں۔ دم بھی بہت لمبی نہیں ہوتی (ورق ۳۵۳)۔

لنگور

یہاں ایک بندر اس قسم کا بھی پایا جاتا ہے جو باجوڑ (بجور) اور سوات کے نواح میں نظر نہیں آتا۔ وہ بندر جنہیں لوگ وہاں کی ولایات میں لے جاتے ہیں اس سے وہ جثے میں کافی بڑا ہوتا ہے۔ اس کی دم بھی بہت لمبی ہوتی ہے۔ اس کے بال نسبتاً سفید ہوتے ہیں اور چہرہ بالکل ہی کالا۔ اس قسم کے بندر کو لنگور کہتے ہیں۔ یہ جانور ہندستان کے پہاڑوں اور جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس کی ایک قسم ہوتی ہے جس کے نہ صرف بال بلکہ اعضائے بدن بالکل ہی کالے ہوتے ہیں۔ اس قسم کے بندر کو سمندروں کے بعض جزیروں سے یہاں لایا جاتا ہے۔ جن بندروں کو جزائر سے لایا جاتا ہے ان میں بندروں کی ایک اور قسم بھی ہوتی ہے۔ یہ رنگ میں زردی مائل اودا ہوتا ہے۔ اس کی کھال زیتون کے درخت کے چھال جیسی لگتی ہے۔ اس کا سر دیگر اقسام کے بندروں کے مقابل ذرا بڑا ہوتا ہے۔ بڑا ہی خونخوار جانور ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس کا عضو تناسل ہمیشہ تنا رہتا ہے اور کبھی بھی اس پر سستی واقع نہیں ہوتی۔

نول

ایک جانور نول کہلاتا ہے۔ جو جثے میں نیولے سے ذرا چھوٹا ہوتا ہے اور درخت پر چڑھ جاتا ہے۔ اسے بعض لوگ موش خرما بھی کہتے ہیں اور اس کو مبارک سمجھتے ہیں۔

گلہری

چوہے کے جثے جیسا ایک جانور اور بھی ہوتا ہے۔ اسے گلہری کہتے ہیں۔ یہ ہمیشہ درخت پر ہی رہتا ہے۔ درختوں پر اوپر اور نیچے اس کے تنے سے چپک کر عجیب طریقے سے دوڑتا رہتا ہے۔

پرندے

مور

پرندوں میں ایک پرندہ طاؤس (مور) کہلاتا ہے۔ اس کے پر بڑے ہی تیز رنگ اور دلکش ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا جسم اتنا زیبا اور دلکش نہیں جتنا اس کے پر۔ یہ جثے میں کلنگ کے برابر ہی ہوتا ہے۔ لیکن قد کلنگ کے برابر نہیں ہوتا۔ نر اور مادہ کے سر پر (ورق ۲۵۳) بیس تیس پر ہوتے ہیں۔ جن کی لمبائی دو انگشت سے زیادہ نہیں ہوتی۔ مادہ میں وہ زیبائی اور رنگینی نہیں پائی جاتی جو نر میں ہوتی ہے۔ نر کے پر چمکدار موسی رنگ کے ہوتے ہیں اور گردن گہری نیلی و خوشرنگ۔ گردن سے نیچے کمر کی تہ تک اس کے پروں پر زرد طوطے جیسے سبز نیلے اور بنفشی نقش و نگار ہوتے ہیں جو کمر پر چھوٹے چھوٹے پھولوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ کمر سے ذرا نیچے یہی نقش و نگار بڑے بڑے پھول بن جاتے ہیں اور دم کے آخر تک بنتے چلے جاتے ہیں۔ بعض موروں کی دم آدمی کے قد جتنی لمبی ہوتی ہے۔ اس منقش لمبی گلدار دم کے نیچے دوسرے پرندوں جیسی اس کی ایک چھوٹی دم بھی ہوتی ہے۔ اس اصلی دم اور بازوں کے پروں کا رنگ سُرخ ہوتا ہے۔ یہ پرندہ باجوڑ (بجور) سوات اور اس سے ذرا نیچے کے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ ان جگہوں سے بالاتر مناطق میں جیسے کنٹر اور لمغانات میں یہ پرندہ نظر نہیں آتا۔ اُڑنے میں یہ پرندہ مرغ زریں سے بھی زیادہ زبوں ولاچار ہے۔ ایک یا دو مرتبہ سے زیادہ نہیں اُڑ سکتا۔ چونکہ یہ اُڑنے میں عاجز اور لاچار ہوتا ہے اسی لئے کوہستانی سلسلہ اور جنگلوں میں رہتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جس جنگل میں مور پایا جاتا ہے وہاں بھیڑیے کثرت سے رہتے ہیں اور جس وقت یہ اپنی آدمی کے قد جتنی لمبی دم کے ساتھ ایک جنگل سے دوسرے میں پہنچتا ہے اسے بھیڑیوں سے نقصان نہیں پہنچتا۔ ہندستان میں طاؤس کو مور کہتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے مسلک میں حلال

ہے۔ اس کا گوشت بے مزہ نہیں ہوتا۔ ذائقے میں تیتر کے گوشت جیسا ہوتا ہے۔ لیکن کھاتے وقت اونٹ کے گوشت کی طرح کراہیت آتی ہے۔

طوطا

ایک پرندہ طوطا کہلاتا ہے (ورق ۲۵۴)۔ یہ بھی باجوڑ اور اس سے ذرا نیچے واقع ولایات میں پایا جاتا ہے۔ موسم بہار میں جس وقت ننگرہار اور لمغانات جیسی جگہوں پر شہتوت پک جاتا ہے تو یہ وہاں پہنچ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اور کسی موسم میں نظر نہیں آتا۔ طوطے کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ اس میں سے ایک قسم[80] وہ ہے جسے ہماری ولایات میں لے جاتے ہیں اور اسے بولنا سکھاتے ہیں۔ اس پرندے کی ایک اور قسم بھی ہوتی ہے جو قد و قامت میں ذرا چھوٹی ہوتی ہے۔ اسے بھی بولنا سکھایا جاتا ہے۔ اس قسم کے پرندے کو جنگلی[81] طوطا کہتے ہیں۔ اس قسم کا طوطا باجوڑ سوات اور اس کے گرد و نواح میں پایا جاتا ہے۔ جب یہ طوطے پانچ چھ ہزار کے جھنڈ میں اڑتے ہیں تو دونوں قسم کے طوطوں کے درمیان فرق ان کے جثے سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان سب طوطوں کا رنگ ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ بھی ایک اور قسم کا طوطا پایا جاتا ہے[82] جس کا جثہ جنگلی طوطے سے ذرا کم ہوتا ہے۔ سر کا رنگ سرخ ہوتا ہے اور بازوؤں کے بالائی پر بھی سرخ ہوتے ہیں۔ اس کی دم کا سرا دو انگل تک سفید ہوتا ہے۔ اسی قسم کے بعض طوطوں کی دم کا سرا کاسنی رنگ کا بھی ہوتا ہے۔ اس جنس کا طوطا بولنا نہیں جانتا۔ اسے کشمیری طوطا کہتے ہیں۔ طوطے ایک قسم[83] کے اور بھی ہوتے ہیں جو جثے میں جنگلی طوطے سے چھوٹے ہوتے ہیں اور چونچ لال۔ اس کی گردن پر سیاہ رنگ کا طوق بھی ہوتا ہے۔ بازوؤں کے بالائی حصے پر جو پر ہوتے ہیں ان کا رنگ بھی سُرخ ہوتا ہے۔ بولنا خوب جانتا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ طوطا اور مینا جو کچھ بولنا سیکھتے ہیں اسی کو دوہرا دیتے ہیں اور خود سوچ کر کچھ نہیں بولتے۔ لیکن میرے قریبی ملازمین میں سے ابوالقاسم جلایر نے عجیب بات بیان کی اس نے اس قسم کے طوطے کے پنجرے پر اندھیری ڈال دی۔ جس پر اس طوطے نے کہا کہ میرے سامنے سے اس اندھیری کو ہٹا دے میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ اس کے بعد ایک مرتبہ اس وقت جب کچھ کہارا سے اُٹھائے لے جا رہے تھے وہ دم لینے کے لئے ایک جگہ بیٹھ گئے اس وقت دوسرے لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ اس پر اس طوطے نے کہا سب لوگ تو چلے گئے کیا تم نہیں چلو گے۔ دروغ بر گردن راوی لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص اپنے کانوں سے نہ سن لے اسے یقین نہیں آ سکتا۔ طوطے کی ایک اور قسم بھی ہوتی ہے۔ جس کے پر سُرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس کے پروں پر دیگر رنگ بھی پائے جاتے ہیں لیکن چونکہ اب ذہن میں واضح طور پر اس کے بارے میں یادداشت نہیں رہی اس لئے اس کی شرح بیان کرنے سے گریز کر رہا ہوں۔ بہر حال بہت ہی خوش شکل پرندہ ہوتا ہے۔ اس کو بولنا بھی سکھایا جاتا ہے لیکن اس کا عیب یہ ہے کہ اس کی آواز ایسی کرخت ہوتی ہے گویا کوئی چینی کے برتن تانبے کے طباق پر گھس رہا ہو۔

مینا

ایک پرندے کا نام مینا ہے۔ لمغانات میں بکثرت پائی جاتی ہے۔ اس سے ذرا نیچے اُتر کر ہندستان میں تو اس کی افراط ہے۔ مینا کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک قسم لمغانات میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس کا سر سیاہ،[84] بدن سفید ہوتا ہے۔ البتہ جثے میں چکاوک سے ذرا بڑی ہوتی ہے اسے بولنا سکھایا جاتا ہے۔ اس کی ایک قسم اور بھی ہوتی ہے جسے بنداوی کہتے ہیں۔ اسے بنگال سے لاتے ہیں۔ اس کا رنگ کالا ہوتا ہے اور بدن عام مینا سے کہیں زیادہ بڑا۔ اس کی چونچ اور ٹانگیں زرد ہوتی ہیں۔ کانوں پر زرد رنگ کی کھال لٹکتی

۸۰۔ پہاڑی طوطا

۸۱۔ گلابی حلقہ دار طوطا

۸۲۔ نیلا سرخ سر طوطا

۸۳۔ ہمالیائی سیلٹی سر طوطا

۸۴۔ سیاہ سر مینا

رہتی ہے جو دیکھنے میں بدنُما لگتی ہے (ورق ۲۵۵)۔ اسے لوگ مینا کہتے ہیں اور بولنا سکھاتے ہیں۔ خوب بولتی ہے اور اس کی زبان بہت صاف ہوتی ہے۔ مینا کی ایک قسم اور بھی ہوتی ہے۔ یہ اس مینا سے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے کم جثہ ہوتی ہے۔ اس کی آنکھیں گول سُرخ ہوتی ہیں۔ اس قسم کی مینا بولنا نہیں جانتی۔ اسے شارک کہتے ہیں۔ جن دنوں میں نے دریائے گنگا پر پُل باندھ کر اور اسے پار کر کے دشمنوں کو بھگا دیا تھا لکھنو اور اودھ کے علاقوں میں ایک قسم کی شارک دیکھی تھی۔ اس کا سینہ سفید سرچتی دار[۸۵] اور کمر کالی ہوتی ہے۔ میں نے اس سے پہلے ایسی مینا نہیں دیکھی تھی۔ اس قسم کی مینا غالباً بولنا نہیں سیکھتی۔

لوچہ

ایک پرندہ لوچہ کہلاتا ہے جسے بوقلموں بھی کہتے ہیں۔[۸۶] اس کے سر سے دم تک پانچ مختلف رنگوں کے پر ہوتے ہیں جو کبوتر کی گردن کی طرح چمکتے ہیں۔ یہ جثے میں کبک دری کے برابر ہوتا ہے۔ غالباً ہندستان کی کبک دری یہی ہے۔ کیونکہ کبک دری اکثر پہاڑوں کی چوٹی پر رہتی ہے یہاں بھی یہ پرندہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہی نظر آتا ہے۔ ولایت کابل سے نجرو کے کوہستانی سلسلے تک اور اس سے ذرا نیچے پہاڑوں پر ہر جگہ یہ پرندہ پایا جاتا ہے اس سے زیادہ بلند مقام پر نظر نہیں آتا۔ اس کے بارے میں عجیب چیز یہ بتائی گئی کہ جب موسم سرما آتا ہے تو یہ پرندہ پہاڑ کے دامن میں نیچے کی طرف چلا جاتا ہے۔ اگر انگور کے باغ میں جا اُترے تو پھر وہاں سے اُڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ اس لئے لوگ اسے پکڑ لیتے ہیں۔ اس کا گوشت کھایا جا سکتا ہے جو بہت لذیذ ہوتا ہے۔

تیتر

ایک پرندہ اور بھی ہوتا ہے جو محض ہندستان سے ہی مخصوص نہیں بلکہ ان تمام ولایات میں جن کا شمار مناطق حارّہ میں ہوتا ہے پایا جاتا ہے۔ لیکن اس پرندے کی چونکہ بعض اقسام ایسی بھی ہیں جو ہندستان کے علاوہ کہیں اور نہیں پائی جاتی ہیں اس مناسبت سے ان کا یہاں ذکر کر دیا گیا ہے۔[۸۷] تیتر کا بدن برفانی تیتر جتنا ہی ہوتا ہے۔ اس کی نر کی کمر کا رنگ مرغ زریں کی مادہ کے رنگ جیسا ہوتا ہے۔ گلہ اور سینہ سیاہ جس پر سفید بال ہوتے ہیں۔ اس کی آنکھوں کے دونوں طرف سُرخ لکیریں بھی ہوتی ہیں۔ جس وقت بولتا ہے تو آواز ایسی لگتی ہے گویا کہہ رہا ہے "شیر دارم شکرک" [میرے پاس دودھ (تو) ہے تھوڑی سی شکر (بھی)]۔ لفظ "شیر" کو "قیر" کی مانند بولتا ہے اور "دارم شکرک" کا تلفظ بالکل صاف سمجھ میں آتا ہے۔ استر آباد کا تیتر جب بولتا ہے تو ایسا سنائی دیتا ہے گویا کہہ رہا ہو "قات مینی توتی لار" [جلدی کرو، انہوں نے مجھے پکڑ لیا ہے] جب کہ عربستان اور اسی کے نواح کے تیتر کی آواز سنائی دیتی ہے "بالشکر تدوم النعم" [شکر کے ساتھ عیش میں دوام آجاتا ہے]۔[۸۸] اس کی مادہ کا رنگ مرغ زریں کے چوزے کی طرح ہوتا ہے اور یہ پرندہ نجراو سے نیچے کی طرف پایا جاتا ہے۔

تیتر کی ایک قسم اور بھی ہوتی ہے جسے بھورا تیتر کہتے ہیں۔ اس کا بدن بھی تیتر کے جسم کے برابر ہوتا ہے۔ اس کی آوازیں اور کبک کی آواز میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔ مگر اس کی آواز بہت تیز ہوتی ہے۔ نر اور مادہ کے رنگ میں فرق کم ہی ہوتا ہے۔ اس قسم کا پرندہ ولایت پشاور، ہشتنغر اور ان سے ذرا نیچے جو مقامات ہیں وہاں پایا جاتا ہے مگر ان ولایات سے بالاتر مقامات پر اس کا فقدان ہے۔

سینگ مونال

اس کی ایک اور قسم سینگ مونال کہلاتی ہے۔ یہ قد و قامت میں کبک دری کے برابر ہوتا ہے اور بدن میں اتنا ہی جتنی پالتو مرغی۔ اس کا رنگ مرغی جیسا ہی ہوتا ہے۔ پیشانی سے سینے تک کا حصہ سرخ شوخ رنگ کا (ورق ۲۵۶) یہ پرندہ ہندستان کے کوہستانی علاقے میں پایا جاتا ہے۔

۸۵۔ گلابی مینا

۸۶۔ چکور تیتر

۸۷۔ کالا تیتر

۸۸۔ تیتر کی آواز۔ ہندو پاکستان میں اس آواز کو "سبحان تیری قدرت" کہا جاتا ہے۔

مرغ جنگلی

اس کی ایک قسم جنگلی مرغی کہلاتی ہے۔ پالتو مرغی اور اس میں بس فرق اتنا ہی ہے کہ یہ پرندہ یعنی مُرغ زریں کی طرح پرواز کرتا ہے۔ اس کے علاوہ پالتو مُرغیوں کی طرح یہ پرندہ ہر رنگ کا نہیں ہوتا۔ یہ باجوڑ کے کوہستانوں اور کوہستانی علاقوں میں پایا جاتا ہے جو اس سے نیچے واقع ہیں۔ باجوڑ سے بلند تر مقامات پر یہ پرندہ نظر نہیں آتا۔

چیڑ مرغ زریں

اس کی ایک قسم چیڑ مرغ زریں کہلاتی ہے۔ یہ پرندہ بدن میں سینگ مونال کے برابر ہوتا ہے۔ مگر رنگ میں اس سے زیادہ خوش رنگ شوخ اور بجور کے کوہستانوں میں پایا جاتا ہے۔

مرغ زریں

ایک پرندہ مرغ زریں کہلاتا ہے۔ یہ قد و قامت میں پالتو مرغی کے برابر ہوتا ہے اور اس کے رنگ دلکش ولا جواب۔

بٹیر

ایک پرندہ بٹیر کہلاتا ہے جو محض ہندستان تک ہی محدود نہیں۔ مگر اس کی چار پانچ قسمیں ایسی بھی ہیں جو صرف ہندستان میں پائی جاتی ہیں۔ انہی میں ایک قسم ایسی بھی ہے جو ہماری ولایات تک پہنچتی ہے۔[۸۹] یہ عام بٹیر سے بڑا اور زیادہ فربہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس پرندے کی ایک قسم اور ہوتی ہے۔[۹۰] یہ بٹیر اس بٹیر سے ذرا سا چھوٹا ہوتا ہے جو ہماری ولایات تک پہنچتا ہے۔ اس کے بازو اور دم کے پر سرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔ یہ پرندہ چڑیوں کی طرح جھنڈ میں اُڑتا ہے۔ اس کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے[۹۱] جس کا جسم اس بٹیر کے بدن سے کم ہوتا ہے جو ہماری ولایات تک پہنچتا ہے۔ اس کا گلہ اور سینہ گہرے سیاہ رنگ کا ہوتا ہے۔ اس کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے جو آہستہ آہستہ کابل تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ بھی جسم میں چھوٹا ہی ہوتا ہے مگر ابابیل سے ذرا بڑا۔ کابل میں اسے قراتو کہتے ہیں۔

خرچل

اس پرندے کی ایک قسم خرچل کہلاتی ہے[۹۲] یہ جثے میں تلور کے برابر ہی ہوگا۔ اسے ہندستان کا تلور کہا جا سکتا ہے۔ اس کا گوشت بہت لذیذ ہوتا ہے۔ اگرچہ بعض پرندوں کی ران کا گوشت بہت اچھا ہوتا ہے اور بعض کا سینہ۔ مگر خرچل کے گوشت کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے تمام اعضا کا گوشت لذّت بخش اور عمدہ ہوتا ہے۔

چرز

ایک پرندہ چرز کہلاتا ہے۔[۹۳] اس کا جسم تلور سے کم ہی ہوتا ہے۔ نر کی پیٹھ تلور جیسی ہوتی ہے مگر سینہ سیاہ۔ اس کی مادہ ایک ہی رنگ کی ہوتی ہے۔ چرز کا گوشت بھی بہت لذیذ ہوتا ہے اور ذائقہ میں خرچل کے گوشت سے مشابہ۔

بھٹ تیتر

ایک پرندہ ہندستان کا بھٹ تیتر جو عام بھٹ تیتر سے نسبتاً جسم میں ہلکا ہوتا ہے۔ اس کی آواز بھی ذرا باریک ہوتی ہے۔

۸۹۔ بھورا بٹیر

۹۰۔ جنگلی بٹیر

۹۱۔ برساتی بٹیر

۹۲۔ ہوبارہ تلور

۹۳۔ مشرقی چھوٹا تلور

ڈھینگو

ان کے علاوہ اور بھی پرندے ہیں جو یا تو پانی میں رہتے ہیں یا اس کے کنارے۔ ان میں سے ایک ڈھینگو [94] کہلاتا ہے جس کا جثہ بڑا ہوتا ہے۔ اور ہر بازو آدمی کے قد جتنا۔ اس کے سر اور گردن پر بال نہیں ہوتے۔ حلق کے نیچے گول تھیلی سی لٹکتی ہوئی نظر آتی ہے جو ہلتی نہیں۔ اس کی کمر سیاہ ہوتی ہے اور سینہ سفید۔ اتفاقاً یہ کابل بھی پہنچ جاتا ہے۔ ایک مرتبہ کابل میں یہ پکڑ کر لائے تھے اسے اچھی طرح سدھا لیا گیا تھا۔ چنانچہ جس وقت گوشت کی بوٹیاں اُچھالی جاتیں تو فوراً لپک لیتا اور ذرا بھی نہ چوکتا اور انہیں اپنی چونچ سے پکڑ لیتا۔ ایک مرتبہ تو وہ اس جوتی کو نگل گیا جس میں چھ نعل جڑے ہوئے تھے۔ دوسری مرتبہ وہ سالم مرغی بال و پر سمیت حلق سے نیچے اتار گیا۔

سارس

ایک پرندہ سارس [95] کہلاتا ہے (ورق ۲۵۷)۔ وہ ترک جو ہندستان میں رہتے ہیں وہ اسے تیوہ تورنہ (اونٹ کلنگ) کہتے ہیں۔ یہ جسم میں ڈھینگو سے ذرا چھوٹا ہے۔ مگر اس کی گردن ڈھینگو سے زیادہ لمبی ہوتی ہے اور سر کا رنگ سُرخ۔ لوگ اسے گھروں میں پالتے ہیں اور یہ اچھی طرح سدھ جاتا ہے۔

ایک پرندہ منکسا کہلاتا ہے۔ اس کا قد اگرچہ تقریباً سارس کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن جسم اس سے کم۔ اس میں اور لق لق میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔ لیکن لق لق سے یہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ اس کی چونچ لق لق سے لمبی اور کالے رنگ کی ہوتی ہے۔ اس کا سر سوسنی رنگ کا ہوتا ہے اور گردن سفید، بازو چتکبرے جن کے کناروں پر جو پر ہوتے ہیں ان کے علاوہ باقی پر سفید ہوتے ہیں اور پیٹھ کالی۔

لق لق

لق لق کی ایک قسم اور بھی ہوتی ہے۔ [96] جس کی گردن تو سفید ہوتی ہے لیکن سر اور تمام جسم سیاہ، یہ جسم میں اس پرندے سے چھوٹا ہوتا ہے جو ہماری ولایات میں پہنچتا ہے۔ اس لق لق کو ہندستان کے لوگ بک ڈھیک کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی لق لق کی ایک قسم ہوتی ہے [97] جس کا رنگ اس طرح کا ہوتا ہے جو ہماری ولایات تک پہنچتا ہے۔ اس کی چونچ بڑی اور لمبی ہوتی ہے اور جسامت میں یہ اس سے بہت چھوٹا۔

ایک پرندہ ایسا بھی ہوتا ہے جو بگلے اور لق لق سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس کی چونچ بگلے سے زیادہ لمبی اور بڑی ہوتی ہے اور جثہ لق لق سے ذرا چھوٹا۔ [98]

ایک پرندہ اور بھی ہوتا ہے جو کالا بزہ [99] کہلاتا ہے۔ یہ جسامت میں اتنا ہی بڑا ہوتا ہے جتنا سارس اس کے ہر دو بازوؤں کی پشت سفید ہوتی ہے۔ اور آواز اونچی۔ اس کی دوسری قسم سفید ہوتی ہے۔ [100] جس کا سر اور چونچ کالی ہوتی ہے یہ اس بزے سے ذرا بڑا ہوتا ہے جو ہماری ولایت تک پہنچتا ہے مگر ہندستان کے بزے سے ذرا چھوٹا ہوتا ہے۔

مرغابی

یہاں ایک مرغابی کی قسم ہوتی ہے [101] جسے غرمپائی (چتی چونچ) کہتے ہیں۔ یہ عام مرغابی سے جسامت میں بڑی ہوتی ہے۔ اور نر و مادہ کا رنگ ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ یہ مرغابی ہشنغر میں ہمیشہ نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی یہ لمغانات تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ اس کا گوشت بہت لذیذ ہوتا ہے۔

۹۴۔ دیوفنس، ورق ۲۱۰ میں بھی اس کا ذکر ہے جب کابل میں شکاری ایک دیوفنس بابر کے لئے پکڑ کر لائے تھے۔

۹۵۔ بڑی سفید کونج

۹۶۔ سفید گردن لق لق

۹۷۔ سیاہ لق لق

۹۸۔ حاجی لق لق

۹۹۔ دیو بگلا

۱۰۰۔ بڑا سفید بگلا

۱۰۱۔ چھوٹی بنخ

ایک مرغابی شہ مرغ کہلاتی ہے۔ جسامت میں قاز سے ذرا چھوٹی ہوتی ہے۔ اس کی ناک اوپر سے پھولی ہوئی ہوتی ہے۔ سینہ سفید اور کمر کالی اور گوشت خوش ذائقہ ہوتا ہے۔

ایک پرندہ زمج کہلاتا ہے۔ یہ جسامت میں باز کے برابر ہوتا ہے اور رنگ کالا۔

ایک پرندہ سار کہلاتا ہے۔ یہ کالے رنگ کا ہوتا ہے اس کی جو دوسری قسم ہوتی ہے اس کی دم اور پیٹھ کا رنگ سُرخ ہوتا ہے۔

ایک پرندہ ہندستان کا کالا کوا ہے۔ جو ہماری ولایات کے کوؤں سے دبلا اور چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کی گردن پر ذرا سی سفیدی بھی نظر آتی ہے۔

یہاں ایک پرندہ اور بھی پایا جاتا ہے جو کوے کے مشابہ ہوتا ہے۔ لمغانات میں اسے پرندہ جنگل کہتے ہیں۔ اس کا سر اور سینہ سیاہ ہوتا ہے۔ بازو اور دم کے پر سُرخ اور آنکھیں گہرے سُرخ رنگ کی۔ چونکہ پرواز کرنے سے عاجز رہتا ہے اس لئے جنگل سے نکل کر باہر نہیں آتا۔ اور اسی بنا پر اسے مُرغ جنگل کہتے ہیں۔[۱۰۲]

ایک پرندہ کو چگاڈر کہتے ہیں۔ جسامت میں یہ الو کے برابر ہوگا (ورق ۲۵۸)۔ اس کا سر چھوٹا اور پلّے جیسا ہوتا ہے۔ جس درخت پر یہ رہنا چاہتا ہے اس کی کسی شاخ پر پنجوں کے بل لٹک جاتا ہے[۱۰۳] اور یہ عجیب بات ہے۔

ایک پرندہ ہندُستان کا عکہ ہے جسے متا کہتے ہیں۔ یہ جسامت میں عکہ سے ذرا چھوٹا ہوتا ہے۔ عکہ پر سفید اور سیاہ چتیاں ہوتی ہیں لیکن متا کی چتیاں کالی اور ننھی ہوتی ہیں۔[۱۰۴]

ایک پرندہ یک کہلاتا ہے۔ جو جسامت میں ممولے کے برابر ہوگا۔ اس کا رنگ شوخ سُرخ ہوتا ہے۔ اور بازوؤں پر چھوٹے چھوٹے سیاہ ممولے جیسے کالے تل۔[۱۰۵]

ایک پرندہ کرچہ کہلاتا ہے۔ جو شکل میں ابابیل جیسا ہوتا ہے لیکن جسامت میں اس سے بڑا اور رنگ سر سے پر تک بالکل سیاہ۔[۱۰۶]

ایک پرندہ کوئل ہے جو کوے کے برابر ہوتی ہے مگر اس سے ذرا دبلی۔ یہ اس طرح گاتی ہے کہ اس کو ہندوستا کی بلبل کہا جاتا ہے۔ ہندُستان کے لوگ بلبل کے قدردان ہیں۔ جن باغوں میں گھنے درخت ہوتے ہیں یہ وہاں رہتی ہے۔

یہاں ایک پرندہ شقراق کے مشابہ پایا جاتا ہے۔ یہ درخت سے چپکا رہتا ہے۔ جسامت میں شقراق کے برابر ہی ہوگا۔ یہ طوطے جیسے سبز رنگ کا ہوتا ہے۔

۱۰۲۔ مہوک

۱۰۳۔ چگاڈر۔ یہ پرندوں میں شمار نہیں ہوتی۔ بلکہ ممالی تھن دار جانوروں میں اس کا شمار ہے۔

۱۰۴۔) عام ککو

۱۰۵۔ ترکستانی گلابی سہرہ

۱۰۶۔ مشرقی کوہی ابابیل

دریائی جانور

مگرمچھ

دریائی جانوروں میں ایک مگرمچھ کہلاتا ہے۔ یہ جھیلوں اور تالابوں میں رہتا ہے اور شکل وصورت میں چھپکلی سے مشابہ، کہتے ہیں کہ آدمی کو ہی نہیں بلکہ بھینس تک کو پکڑ لیتا ہے۔

دوسرا جانور نہنگ کہلاتا ہے۔ یہ بھی شکل وصورت میں چھپکلی کے ہی وضع کا ہوتا ہے۔ اور ہندُستان کے ہر دریا میں پایا جاتا ہے۔ اسے پکڑ کر میرے پاس لائے تھے۔ اس کی لمبائی چار پانچ گز ہوگی۔ اس سے بھی بڑے نہنگ پائے جاتے ہیں۔ اس کا دہانہ آدھا گز سے کچھ زیادہ لمبا ہوگا۔ جس کے اوپر اور نیچے جبڑوں پر باریک باریک دانتوں کی قطار ہوتی ہے۔ یہ دریا کے کنارے پر آ کر اپنا شکار مار کر کھاتا ہے۔

خنزیرِ آبی

ایک جانور خنزیرِ[107] آبی کہلاتا ہے۔ یہ بھی ہندستان کے تمام دریاؤں میں پایا جاتا ہے۔ یہ ایک دم پانی کی سطح پر آتا ہے اور پلک جھپکتے ہی سر دکھا کر واپس پانی میں چلا جاتا ہے۔ لیکن اس کی دم نظر آتی رہتی ہے۔ اگرچہ اس کا دہانہ مگرمچھ کے دہانے کی طرح لمبا ہوتا ہے اور دانت بھی اس جیسے ہوتے ہیں، لیکن باقی سر اور بدن مچھلی جیسا ہوتا ہے۔ جس وقت یہ پانی میں کھیلتا ہے تو اس کا بدن مشک کی طرح نظر آتا ہے۔ دریائے سرو (گھاگرا) میں جس وقت یہ آبی خنزیر کھیلتے ہیں تو پانی سے باہر نکل آتے ہیں۔ مچھلی کی طرح پانی سے باہر زندہ نہیں رہ سکتے۔

گھڑیال

ایک جانور گھڑیال ہوتا ہے۔ جب بڑا ہو جاتا ہے تو آدمی کو پکڑ کر کھا جاتا ہے۔ چنانچہ دریائے سرو (گھاگرا) میں لشکر کے بہت سے آدمیوں نے یہ منظر دیکھا ہے۔ جس وقت ہم دریائے سرو (گھاگرا) کے کنارے مقیم تھے تو ہم نے دیکھا کہ وہ ایک یا دو بوڑھی مزدور عورتوں کو پکڑ کر لے گیا۔ غازی پور اور بنارس کے درمیان اس نے لشکرگاہ کے تین چار آدمیوں کو پکڑ لیا۔ اس جگہ کے گرد و نواح میں میں نے بھی ایک گھڑیال دور سے دیکھا تھا لیکن وہ بالکل صاف نظر نہیں آیا تھا۔

ککہ مچھلی

مچھلی کی ایک قسم ککہ مچھلی کہلاتی ہے۔ اس کے دونوں کانوں کے پاس تین انگل لمبی ہڈیاں اُبھری ہوئی ہوتی ہیں۔ جس وقت اس کو پکڑا جاتا ہے تو یہ ان ہڈیوں کو حرکت میں لاتی ہے (ورق ۲۵۹) جن میں سے عجیب قسم کی آواز نکلتی ہے۔ چنانچہ اسی آواز کی بنا پر اسے ککہ مچھلی کہا گیا ہے۔ عام طور پر ہندستان کی مچھلیوں کا گوشت لذیذ ہوتا ہے اور ان کے جسم میں کانٹے بھی نہیں پائے جاتے۔ بڑی عجیب ہی پھرتیلی مچھلیاں ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ دریا میں دونوں کناروں پر سے جال پھینکا گیا۔ اور حالانکہ جال کا ہر سرا پانی سے ایک گز اونچا تھا۔ ان میں سے بہت سی مچھلیاں ایسی تھیں کہ جال پر سے ایک گز اوپر اُچھل کر نکل گئیں۔

ہندستان کے بعض دریاؤں میں چھوٹی مچھلیاں بھی ہوتی ہیں۔ اگر کوئی زوردار آواز یا پیروں کے چلنے کی آواز سن لیں تو ایک یا آدھا گز تک اُچھل سکتی ہیں۔

ہندستان کے مینڈک

اگرچہ ہندستان میں مینڈک ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں کے مینڈک پانی کی سطح پر سات آٹھ گز تک دوڑ سکتے ہیں۔

پھل

آم

ہندستان سے جو نباتات مخصوص ہیں ان میں سے ایک انبہ (آم)[108] ہے۔ ہندستان کے اکثر لوگ حرف انبہ کی "ب" کو متحرک نہیں بولتے۔ اور چونکہ "ا" اور "ن" سے اس لفظ کا صحیح تلفظ نہیں ہوتا اسی لئے وہ اسے "نغرک" بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت خواجہ امیر خسرو[109] فرماتے ہیں:

نغرک ما نغز کن بوستان نغز ترین میوہ ہندستان[110]

(ہمارا نغرہ (آم) بوستان کو لطافت بخشتا ہے۔ یہ ہندستان کا لطیف ترین میوہ ہے)

۱۰۷۔ خنزیر آبی، ڈولفن، خوک مچھلی، یہ مچھلی پانی سے باہر سر نکال کر ہوا میں سانس لیتی ہے۔

۱۰۸۔ آم: یہ پھل ہندستان سے مخصوص ہے۔ ہندی میں اس کے کئی نام ہیں جیسے امب، آم، انبہ اور آمر۔ فارسی میں یہ آنبر سے آنبہ ہو گیا۔ لیکن جب ترک ہندستان آتے تھے تو ان کو اس کا تلفظ "آم" پسند نہیں آتا تھا۔ چنانچہ سید احمد دہلوی لکھتے ہیں کہ "محمود غزنوی جب ہندستان میں آیا اور آم کھایا تو بہت بھایا مگر نام سن کر ہنسا اور کہا سخت ستم ہے کہ ایسا میوہ اور نام یہ فحش (ترکی میں آم اندام نہانی کو کہتے ہیں) اسے نغرک کہنا چاہیے کہ اسم بامسمیٰ ہو" نغرک کے لفظی معنی عمدہ، خوب اور لطیف چیز کے ہیں اس لئے امیر خسرو کا جو شعر بابر نے لکھا ہے اس میں بھی نغرک ہی کہا گیا ہے۔ (ہندی اردو لغت ص ۷۷، فرہنگ آصفیہ ۱: ۲۲۱، ۴: ۵۸۰ اور ترکی انگلش لیکزیکون ص ۱۹۲)

۱۰۹۔ امیر خسرو۔ نابغہ روزگار شخصیت۔ ترک باپ اور ہندستانی ماں کی اولاد۔ پٹیالی نزد آگرہ ۶۵۱/ ۱۲۵۳ میں پیدا ہوئے۔ شاعری آٹھ سال کی عمر میں شروع کر دی تھی۔ فارسی کے علاوہ عربی اور ہندی میں بھی کلام ہے۔ فن موسیقی میں راگ، راگنیاں بھی ایجاد کیں۔ پانچ دیوان، خمسہ، مجموعہ غزلیات اور تاریخی مثنویاں چار دانگ عالم ہیں۔ ہندی کلام کا ایک نسخہ برلن میں موجود ہے جو حال ہی میں دہلی سے شائع ہوا ہے آخر عمر میں حضرت نظام الدین اولیا کے مرید ہو گئے تھے اور حضرت کے انتقال کے چھ مہینے بعد ۷۲۵/ ۱۳۲۵ میں خود بھی چل بسے۔ اس قرب کو قائم رکھنے کے واسطے حضرت کی وصیت کے مطابق ان کی پائنتی ہی دفن ہیں (ڈاکٹر وحید مرزا، امیر خسرو ص ۲۲، شعر العجم ۲: ۹۶، امیر خسرو کا ہندوی کلام ص ۱۳۵)

۱۱۰۔ امیر خسرو کا اصل شعر یہ ہے

نغرک خوش، نغز کن بوستان
نغز ترین میوہ ہندستاں

(قران السعدین ص ۹۱)

اگر آم خوش مزہ اور عمدہ قسم کا ہو تو خوب کھایا جاتا ہے۔ لیکن عمدہ قسم کا آم کم ہی ہوتا ہے۔ عام طور پر کچا پھل درخت پر سے اتار لیا جاتا ہے اور اسے گھر میں پال پر پکاتے ہیں۔ انبیہ کو سالن میں بطور ترشی استعمال کرتے ہیں۔ اس سے مربہ بھی بہت عمدہ تیار ہوتا ہے۔ امر واقعی یہ ہے کہ ہندستان کا بہترین پھل یہی ہے۔ اس کا درخت کافی اونچا ہوتا ہے۔ ہندستان کے لوگوں نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے کہ وہ سردے کے علاوہ ہر پھل پر اسے فوقیت دیتے ہیں۔ لیکن یہ ایسا پھل نہیں جس کی لوگ اتنی تعریف کریں۔ یہ اس شفتالو[111] سے مشابہ ہوتا ہے جسے قتلے کر کے کھایا جاتا ہے اور برسات کے موسم میں پک کر تیار ہو جاتا ہے۔ اسے دو طریقوں سے کھایا جاتا ہے۔ اس میں سے ایک تو یہ ہے کہ اس کو گھلا کر نرم کر لیا جاتا ہے اور ایک جگہ اس میں سوراخ کر کے اس کا رس چوستے ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح شفتالو کا چھلکا چھری سے اُتار لیا جاتا ہے اسی طرح اسے بھی چھیل لیتے ہیں۔ اور اس کے قتلے کھاتے ہیں۔ اس کے پتے شفتالو کے پتوں سے ذرا ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ اس کا درخت بدنُما ہوتا ہے اور تنا بھدہ۔ بنگال اور گجرات کا آم بہت عمدہ ہوتا ہے۔

کیلا

ایک پھل کیلا ہوتا ہے۔ جسے عرب لوگ موز کہتے ہیں۔ اس کا درخت بہت اونچا نہیں ہوتا بلکہ اسے درخت بھی نہیں کہا جاسکتا بس گھاس پات اور درخت کے درمیان کی چیز ہے۔ اس کا پتہ بھٹے کے مشابہ ہوتا ہے۔ لمبائی میں دو گز اور چوڑائی میں ایک گز کے قریب ہوتا ہے۔ پتوں کے بیچ میں سے دل جیسی ایک شاخ نکلتی ہے۔ جس کی کلی اسی شاخ میں ہوتی ہے۔ یہ کلی جب بڑی ہو جاتی ہے تو بھیڑ کے دل جیسی ہوتی ہے۔ جیسے ہی اس کلی پر پنکھڑی کھلتی ہے تو ہر کلی کی جڑ میں سے چھ ساتھ غنچوں کی قطار نمودار ہوتی ہے۔ یہی غنچے بڑے ہو کر کیلے کی پھاندی بن جاتے ہیں۔ جیسے ہی یہ دل کی شکل کی کلی بڑی ہو جاتی ہے تو بڑی کلی کے پتے کھلتے چلے جاتے ہیں اور کیلے کے غنچوں کی قطار مزید نمایاں ہو جاتی ہے۔ کیلے کی دو خوبیاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا چھلکا آسانی سے اُتر سکتا ہے۔ دوسری یہ کہ اس کے اندر کوئی بیج یا ریشہ نہیں ہوتا۔ یہ بینگن سے تھوڑا بڑا اور پتلا ہوتا ہے۔ جس میں بہت زیادہ مٹھاس نہیں ہوتی۔ کیلا چونکہ سبز اور خوش رنگ ہوتا ہے اسی لئے دیکھنے میں خوشنما ہوتا ہے۔

املی

ایک پھل املی ہوتا ہے۔ خرمائے ہندی اسی کو کہتے ہیں۔ اس کے پتے بہت باریک ہوتے ہیں جو مجموعی طور پر تیز پات جیسے لگتے ہیں۔ لیکن تیز پات سے زیادہ سخت۔ اس کا درخت خوش نما اور سایہ دار ہوتا ہے۔ یہ درخت بہت اونچا جاتا ہے۔ جنگلی املی کے درخت بھی بہت گھنے ہوتے ہیں۔

مہوا

ایک پھل مہوا[112] کہلاتا ہے۔ اسے گل چکان بھی کہتے ہیں۔ اس کا درخت بہت اونچا ہوتا ہے۔ ہندستان کے لوگ جو عمارت بناتے ہیں ان میں پیشتر اسی کی لکڑی استعمال کرتے ہیں۔ مہوہ کے پھول سے عرق کشید کیا جاتا ہے۔ پھول کو انگور کی طرح خشک کر کے کھاتے ہیں اور اس کا عرق بھی نکالتے ہیں۔ بطور مجموعی یہ کشمش کے مشابہ ہوتا ہے۔ مگر ذائقہ میں بدمزہ، تلخ۔ اس کے پھول کی بو بھی بری نہیں ہوتی جسے کھایا بھی جاسکتا ہے۔ اس کی ایک قسم جنگلی خودرو بھی ہوتی ہے۔

کھرنی

ایک پھل کھرنی[113] کہلاتا ہے۔ اگرچہ اس کا درخت بہت اونچا نہیں جاتا لیکن چھوٹا بھی نہیں۔ یہ پھل

۱۱۱۔ شفتالو۔ ایک قسم کا بڑا آڑو، پیوندی آڑو۔

طفل کی مانند اس پر رال ٹپکیگی مری۔
باغ عالم میں مجھے شفتالوئے لب جائیگا
(آتش، فرہنگ آصفیہ ۳:۱۸۱)

شفتالو فارسی کا لفظ ہے (محمد معین، فرہنگ فارسی ج ۲ ص ۲۰۵۱) اس کا رنگ گیرو ہوتا ہے۔

۱۱۲۔ مہوا۔ ایک درخت کا نام جس کے پھولوں کو کھاتے، پھولوں کی شراب بناتے اور بیجوں کا تیل نکالتے ہیں۔

قلم سے روز مرا مدعا ٹپکتا ہے
پر اس کو علم نہیں مجھے کیا ٹپکتا ہے
ہمیشہ اشک کی بارش ہے نخل مژگاں سے
شب فراق یہ مہوا بلا ٹپکتا ہے
(مصحفی)

فرہنگ آصفیہ ۴: ۴۹۵

۱۱۳۔ کھرنی۔ ایک درخت اور اس کے پھل کا نام جو نبولی یعنی نیم کے پھل سے مشابہ اور ذائقہ میں شیریں ہوتا ہے۔ (فرہنگ آصفیہ ۳:۶۲۳)

زرد رنگ کا ہوتا ہے۔ اور بیر سے ذرا پتلا۔ مجموعی طور پر ذائقہ انگور جیسا ہوتا ہے۔ مگر آخر میں ذرا سا کسیلا پن بھی پایا جاتا ہے جو نا گوار نہیں ہوتا۔ اسے کھایا جا سکتا ہے۔ اس کی گٹھلی پر باریک سے چھلکا ہوتا ہے۔

جامن

ایک پھل جامن[۱۱۴] کہلاتا ہے۔ جس کے پتے درخت بید کے پتوں کی مانند لگتے ہیں۔ دونوں میں بس فرق اتنا ہی ہوتا ہے کہ جامن کے پتے ذرا زیادہ گول اور ہرے ہوتے ہیں۔ درخت بھی حسن اور دلکشی سے خالی نہیں۔ اس کا پھل سیاہ انگور جیسا نظر آتا ہے۔ ذائقہ میں ترشی جس میں بہت زیادہ لذّت نہیں ہوتی۔

کمرک

ایک پھل کمرک کہلاتا ہے۔ یہ پنج گوشہ ہوتا ہے۔ اور جسامت میں عین آلو جتنا۔ لمبائی میں چار انگل کے برابر۔ جب پک جاتا ہے تو اس کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ اس میں بھی بیج نہیں ہوتا۔ اگر کچا پھل درخت پر سے اُتار لیا جائے تو بہت تلخ ہوتا ہے۔ لیکن جب اچھی طرح پک جاتا ہے تو مزے دار ترش ہو جاتا ہے جس کا ذائقہ برا اور لطافت سے خالی نہیں ہوتا۔

کٹھل

ایک پھل کٹھل ہوتا ہے۔ بڑا ہی بدزیب اور بدمزہ پھل ہے۔ شکل میں بالکل بھیڑ کی اوجھڑی کی طرح لگتا ہے جس کو پلٹ دیا گیا ہو۔ ذائقہ اگرچہ شیریں ہوتا ہے مگر اس پر زیادہ رغبت نہیں آتی۔ اس کے اندر دانے ہوتے ہیں۔ جو دیکھنے میں کھجور سے لگتے ہیں لیکن اس کی طرح بیضوی نہیں گول ہوتے ہیں۔ ان دانوں کے اندر کھجور سے زیادہ نرم گودا ہوتا ہے۔ جسے لوگ کھاتے ہیں۔ یہ بہت لیسدار ہوتا ہے چنانچہ اس لیس کے باعث لوگ ہاتھوں پر اور منہ پر تیل مل کر کھاتے ہیں۔ یہ پھل درخت کی شاخ اس کے تنے اور جڑوں میں اُگتا ہے۔ جسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ کسی درخت پر بھیڑ کی اوجھڑی چسپاں کر دی ہے۔

بڑھل

ایک پھل بڑھل[۱۱۵] کہلاتا ہے جو جسامت میں سیب کے برابر ہوتا ہے۔ اس کی بو نا گوار نہیں لگتی۔ عجب بے ہنگم اور بے مزہ چیز ہے۔

بیر

ایک پھل بیر کہلاتا ہے جسے فارسی میں کُنار کہتے ہیں۔ اس کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک قسم آلوچے سے ذرا بڑی ہوتی ہے۔ جسامت میں انگور جیسی (ورق ۲۷۱)۔ ان میں سے بیشتر خوش ذائقہ نہیں ہوتے۔ ہم نے باندیر میں اس کا پیڑ دیکھا تھا جو بہت عمدہ تھا۔ جس زمانے میں سورج برج سرطان (۲۰ اپریل سے ۲۱ مئی) اور جوزا (۲۱ مئی سے ۲۰ جون) میں ہوتا ہے یعنی برسات کے موسم میں تو اس میں نئے پتے آتے ہیں۔ اس کا پھل اس وقت پکتا ہے جب سورج برج دلو (۲۱ اگست سے ۲۰ ستمبر) اور حوت (۲۱ ستمبر سے ۲۰ اکتوبر) میں ہوتا ہے۔

گکروندہ

ایک پھل گکروندہ[۱۱۶] کہلاتا ہے۔ جو شکل میں ہماری ولایت کے پھل بہی جیسا ہوتا ہے۔ یہ جھاڑیوں میں اُگتا ہے بہی پہاڑوں پر پیدا ہوتا ہے اور گکروندہ میدانوں میں۔ ذائقے میں ریوند چینی سے زیادہ شیریں ہوتا ہے مگر رس میں اس سے ذرا کم۔

۱۱۴۔ جامن۔ ایک اودے رنگ کا ترش پھل اور اس کے درخت کا نام۔ پورب میں اس کو پھلینا کہتے ہیں۔
سوبا پڑا ہے کیاری نازک بدن اکیلا دل آم ہو کے ٹپکا جامن، اسے اٹھالا (شعر طلع)
(فرہنگ آصفیہ ج ۲ ص: ۳۱)

۱۱۵۔ بڑھل۔ ایک درخت اور اس کا کھٹ میٹھا زرد رنگ کا میوہ جو شریفے سے مشابہ ہوتا ہے۔ (فرہنگ آصفیہ ۱:۳۹۱)

۱۱۶۔ گکروندہ۔ ایک درخت اور اس کے پھل کا نام جو مزے میں ترش اور رنگ میں سرخ ہوتا ہے۔ لوگ اس کا اچار ڈالتے ہیں۔
(فرہنگ آصفیہ ۳:۲۴۳)

پنیالا

ایک پھل پنیالا[117] کہلاتا ہے۔ یہ جسامت میں آلوچے سے بڑا ہوتا ہے اور دیکھنے میں سُرخ کچے سیب جیسا لگتا ہے۔ یہ ذائقے میں ترش ہوتا ہے لیکن خوش مزہ۔ اس کا درخت انار کے درخت سے اونچا ہوتا ہے اور پتے برگ بادام جیسے لیکن بادام کے پتوں سے ذرا چھوٹے۔

گولر

ایک پھل گولر کہلاتا ہے۔ یہ درخت کی شاخوں پر اُگتا ہے اور شکل میں انجیر جیسا لگتا ہے۔ بڑا ہی نرم پھل ہے۔

آملہ

ایک پھل آملہ کہلاتا ہے۔ یہ بھی پنج پہلو ہوتا ہے۔ اور کپاس کے بن کھلے ڈوڈے جیسا لگتا ہے۔ سخت اور بے مزہ پھل ہے۔ اس کا مربہ برا نہیں ہوتا۔ لیکن بڑا ہی مفید پھل ہے۔ اس کا درخت دیکھنے میں خوشنما لگتا ہے۔ اس کے پتے بہت باریک ہوتے ہیں۔

چرونجی

ایک پھل چرونجی کہلاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا درخت پہاڑوں پر ہوتا ہے۔ اس کی گری ذائقے میں بری نہیں ہوتی۔ چہار مغز میں جو مغز شامل ہیں ان میں سے مغز بادام جیسی یہ ایک شئے ہے جو ناگوار نہیں لگتی۔ اس کی گری مغز پستہ سے ذرا چھوٹی ہوتی ہے اور گول۔ فالودے اور حلوے میں اسے ڈالتے ہیں۔

کھجور

ایک پھل کھجور ہوتا ہے۔ اگر چہ یہ ہندستان سے مخصوص نہیں لیکن چونکہ ہماری ولایت میں نہیں پایا جاتا اسی لئے یہاں اس کا ذکر کیا گیا ہے یہ پیڑ لمغان میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس کی شاخیں اوپر چوٹی پر ایک جگہ ہوتی ہیں۔ اس کے پتے شاخ کی جڑ اور اوپر یعنی دونوں طرف اُگتے ہیں۔ اس کا تنہ بہت کھردرا ہوتا ہے اور بدنُما لگتا ہے۔ اس کا پھل خوشۂ انگور کی مانند اُگتا ہے مگر جسامت میں اس سے بڑا۔ کہتے ہیں کہ نباتات میں درخت کھجور حیوانات سے مشابہ ہوتا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ جب کسی حیوان کا سر کاٹ دیا جاتا ہے۔ تو اس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب اس درخت کو چوٹی پر سے کاٹ دیا جائے تو پورا پیڑ سوکھ جاتا ہے۔ جس طرح حیوانات میں نر کی آمیزش کے بغیر کسی مادہ سے نتیجہ برآمد نہیں ہوتا اسی طرح مادہ کھجور کے درخت کے ساتھ نر درخت نہ لگائیں تو یہ پھل نہیں دیتا۔ معلوم نہیں کہ اس بات میں کتنی صداقت ہے۔ اوپر کھجور کے پیڑ کی جس چوٹی کا ذکر کیا گیا ہے اسے درخت کی پنیر کہتے ہیں۔ کیونکہ جس جگہ سے شاخ و برگ نکلتے ہیں وہ جگہ پنیر کی طرح سفید ہوتی ہے۔ چنانچہ پنیر جیسی اس سفیدی میں سے ہی شاخ و برگ اُگتے ہیں اور جیسے جیسے یہ پھیلتے چلے جاتے ہیں ان کا رنگ سبز ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس سفید مادّے کو پنیر خرما کہتے ہیں۔ ناگوار شئے نہیں۔ اس کی گری اخروٹ کی گری جیسی ہوتی ہے۔ جس جگہ یہ پنیر ہوتی ہے چیرہ لگا دیا جاتا ہے۔ جس جگہ چیرہ لگا دیا جاتا ہے وہاں کھجور کا پتہ اس طرح رکھ دیا جاتا ہے کہ (ورق ۲۶۲) جتنا بھی اس سے رس نکلتا ہے وہ اسی پتے پر سے ہو کر گزرتا ہے۔ پتے کو لوٹے کے منہ سے لگا کر اسے درخت سے باندھ دیتے ہیں۔ چنانچہ درخت سے جس قدر رس نکلتا ہے وہ اس لوٹے میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ اگر اسے فوراً ہی پی لیا جائے تو میٹھا ہوتا ہے۔ لیکن اس رس کو تین چار دن بعد پیا جائے تو اس سے سرور کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ ایک مرتبہ میں باڑی[118] کی سیر کرنے کے لئے گیا تھا۔ سیر کرتے ہوئے میں ان دیہات

۱۱۷۔ پنیالا۔ ایک قسم کا عنابی رنگ کا جامن کے برابر میوہ (فرہنگ آصفیہ ۱.۵۳۷)

۱۱۸۔ باڑی۔ یہ راجپوتانہ میں بیانہ اور دھولپور کے درمیان شکارگاہ ہے (اینٹ بیورج ص ۵.۹ نوٹ ۲)

میں پہنچ گیا جو دریائے چنبل کے کنارے آباد ہیں۔ راستے میں ایک درّے سے گزر ہوا جہاں لوگ اسی طریقے سے کھجور کا رس نکال کر پی رہے تھے۔ ہم نے بھی پیا۔ لیکن سرور کی کیفیت طاری نہیں ہوئی۔ شاید بہت زیادہ پینے کے بعد سرور کی حالت پیدا ہوتی ہو۔

ناریل

ایک پھل ناریل کہلاتا ہے جسے عربوں نے معرب [119] کر کے نارجیل کر دیا ہے۔ جسے ہندستان میں ناریل کہتے ہیں۔ غالباً یہ عام غلطی ہے۔ یہ ناریل کا ہی پھل جسے جوز ہندی کہتے ہیں۔ اس کے خول سے چمچے بنائے جاتے ہیں۔ اور اگر بڑا ہو تو اس سے کاسۂ ستار بناتے ہیں۔ اس کا درخت بالکل درخت کھجور کی طرح ہوتا ہے ناریل کی شاخوں پر پتے زیادہ ہوتے ہیں۔ اور پتوں کا رنگ بھی زیادہ چمکدار ہوتا ہے۔ چنانچہ جس طرح اخروٹ پر سبز چھال ہوتی ہے اس کے اوپر بھی سبز چھال پائی جاتی ہے۔ لیکن ناریل کی چھال ریشے دار ہوتی ہے۔ جس سے سمندری جہازوں اور دریائی کشتیوں کے رسّے بنائے جاتے ہیں۔ کشتیوں میں جوڑ لگانے کے لئے ناریل کے رسّے سے تیار کردہ رسیّوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جب ناریل کے خول پر سے اس کے ریشے صاف کئے جاتے ہیں تو اس کی ایک طرف تکونی شکل میں تین سوراخ نظر آتے ہیں۔ ان میں سے دو سخت ہوتے ہیں۔ اور ایک نرم جو ذرا سے اشارے پر کھل جاتا ہے۔ اس سے قبل کہ اس کی گری تک پہنچیں اس میں سے پانی نکلتا ہے۔ چنانچہ اس سوراخ کو کھول کر اس پانی کو لوگ پی لیتے ہیں۔ اس کا ذائقہ بُرا نہیں ہوتا۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی نے کھجور کے پیڑ کے پنیر کو گھلا کر پانی پانی کر دیا ہے۔

تاڑ

ایک پھل تاڑ کہلاتا ہے۔ اس کے پیڑ کی شاخیں بھی اس کی چوٹی پر ہی ہوتی ہیں۔ کھجور کے درخت کی طرح اس کے پیڑ پر بھی لوٹا باندھ دیتے ہیں اور اس کا رس پیتے ہیں۔ اس رس کو تاڑی کہتے ہیں۔ تاڑی میں نشہ کی کیفیت کھجور کے رس کی نشہ آور کیفیت سے ذرا زیادہ تیز ہوتی ہے۔ تاڑ کے پیڑ پر زمین سے ایک ڈیڑھ گز اوپر تک ایک بھی پتہ نہیں اُگتا۔ اس کے بعد ہر شاخ کے سر پر پنجے کی طرح پھیلتے ہوئے تیس چالیس پتے نکلتے ہیں۔ جو لمبائی میں تقریباً ایک گز کے برابر ہوتے ہیں۔ لوگ انہیں بطور دفتر (گرنتھ) استعمال کرتے ہیں اور ان پر ہندی زبان کی تحریریں لکھتے ہیں۔ ہندستان کے لوگ اپنے کانوں میں بڑے بڑے سوراخ کر لیتے ہیں۔ اگر ان سوراخوں میں بالے نہ ہوں تو ہوں تو تاڑ کے پتّیوں کے بالیاں بنا کر پہن لیتے ہیں۔ اسی تاڑ کے پتوں کی لوگ بالیاں بنا کر بازاروں میں فروخت کرتے ہیں۔ تاڑ کے پیڑ کا تنہ کھجور کے تنے کے مقابل بہتر ہوتا ہے اور جسامت میں بھی زیادہ۔

نارنگی

نارنج اور اس سے مشابہ پھل بھی یہاں ہوتے ہیں۔ یہ پھل لمغانات باجوڑ اور سوات میں کثرت سے ہوتا ہے۔ لمغانات کے نارنج جسامت میں ذرا چھوٹے (ورق ۲۶۳) ناف دار، بہت نازک ولطیف اور رسیلے ہوتے ہیں۔ وہ نارنج جو خراسان کے گردونواح میں ہوتے ہیں ان کا ان سے کوئی مقابلہ نہیں۔ اس کا چھلکا اتنا ہلکا ہوتا ہے کہ جب انہیں لمغانات سے کابل لایا جاتا ہے تیرہ چودہ فرسنگ سے زیادہ نہیں، لیکن بعض ان میں سے خراب ہو جاتے ہیں۔ استرآباد اور سمرقند کے درمیان دو سو ستر اسّی فرسنگ کا فاصلہ ہے مگر استرآباد کے نارنج سمرقند لے جائے جاتے ہیں چونکہ ان کا چھلکا موٹا ہوتا ہے اور رس بھی کم اسی لئے یہ خراب بھی نہیں ہوتے۔ باجوڑ

119۔ معرب۔ وہ الفاظ جن کو عربی زبان میں استعمال کے وقت بدل لیا گیا ہو۔ حکیم اجمل خان نے اپنے رسالے مقدمۃ اللغات الطبیہ میں الفاظ کے عربی میں منتقل کرنے کے اصولوں بیان کئے ہیں۔ طبی الفاظ واصطلاحات کے سلسلے میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس عمل کو تعریب کہا جاتا ہے۔ (محمد رضی الاسلام ندوی، حکیم اجمل خاں کی علمی خدمات، ص ۵۹)

کے نارنج تقریباً بہی کے برابر ہوتے ہیں۔ جن میں رس بہت زیادہ ہوتا ہے۔ دوسرے نارنج پھلوں کے مقابل اس کا رس زیادہ ترش ہوتا ہے۔ خواجہ کلاں نے مجھے بتایا کہ باجوڑ میں اسی قسم کے نارنج ایک درخت سے توڑ کر انہیں گِنا گیا تو تعداد میں ستر ہزار تھے۔ میرے ذہن میں ہمیشہ یہ خیال گزرتا تھا کہ لفظ "نارنج" معرب ہے نارنگ کا۔ چنانچہ ایسا ہی ثابت ہوا۔ باجوڑ اور سوات میں "نارنج" کو "نارنگ" کہتے ہیں۔

لیموں

ایک پھل لیموں کہلاتا ہے جو بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ جسامت میں یہ مرغی کے انڈے کے برابر ہوتا ہے۔ اس کے رس کو پانی میں اُبال کر کوئی ایسا شخص پیئے جسے زہر دیا گیا ہو تو زہر کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔

چکوترا

نارنج [۱۲۰] سے مشابہ ایک پھل ترنج ہوتا ہے۔ باجوڑ اور سوات کے لوگ اسے بالنگ کہتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ترنج کے چھلکے سے جو مربہ بنایا جاتا ہے لوگ اسے بالنگ کا مربہ کہتے ہیں۔ ہندستان کے لوگ "ترنج" کو "باجوڑی" کہتے ہیں۔ ترنج دو قسم کا ہوتا ہے۔ اس میں سے ایک میٹھا ہوتا ہے مگر بے مزہ اور ذرا کسیلا۔ میٹھا ترنج کھانے کے کام نہیں آتا۔ البتہ اس کے چھلکے سے مربہ بنایا جاتا ہے۔ لمغانات کے پھل بھی اسی طرح شیریں اور ذرا کسیلے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ باجوڑ اور ہندستان کے ترنج ترش ہی نہیں بلکہ بہت زیادہ ترش ہوتے ہیں۔ ان سے شربت بہت خوش مزہ اور خوش ذائقہ تیار ہوتا ہے۔ یہ ترنج جسامت میں چھوٹے خربوزے کے برابر ہوتا ہے۔ چھلکا بہت کھردارا اور ناہموار۔ یہ چوٹی پر بہت نوکدار اور ہموار ہوتا چلا جاتا ہے۔ ترنج رنگ کے اعتبار سے نارنج سے زیادہ زرد ہوتا ہے۔ یہ پھل جھاڑیوں میں پیدا ہوتا ہے اور اس کے پتے نارنج کے پتوں سے ذرا زیادہ بڑے ہوتے ہیں۔

سنگترہ

نارنج سے مشابہ دوسرا پھل سنگترہ ہے۔ یہ رنگ اور وضع میں ترنج جیسا ہوتا ہے۔ نارنج کا چھلکا ناہموار ہوتا ہے اور اس کا چھلکا بالکل صاف جسامت میں نارنج کے پتوں جیسا لگتا ہے۔ اس کی ترشی خوشگوار لگتی ہے۔ اس کا شربت بھی بہت لذیذ اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ لیمو کی طرح یہ بھی معدے کے لئے مقوی اور نارنج کی طرح ضعف معدہ نہیں۔

گل گل

نارنج سے مشابہ جو پھل پائے جاتے ہیں ان میں سے ایک بڑا لیمو ہے۔ جسے ہندستان میں گل گل لیمو (گلہ گلہ لیمو) کہتے ہیں۔ شکل میں یہ قاز کے انڈے جیسا لگتا ہے۔ لیکن انڈے کی طرح یہ دونوں طرف سے نوکدار نہیں ہوتا۔ اس کا چھلکا بھی سنگترے کے چھلکے کی طرح ہموار ہوتا ہے۔ اور بہت زیادہ رسیلا۔

ایک پھل جنبھری کہلاتا ہے۔ جو شکل میں نارنج کے مشابہ ہوتا ہے۔ اگر چہ جسامت میں نارنج جیسا ہوتا ہے لیکن رنگ میں زیادہ زرد (ورق ۲۶۴)۔ اگر چہ یہ نارنج کی قسم میں شامل نہیں لیکن نارنج سے مشابہ ہوتا ہے۔ اس کی ترشی بھی لذیذ ہوتی ہے۔

سدا پھل

نارنج سے مشابہ ایک پھل سدا پھل کہلاتا ہے۔ جو جسامت میں امرود کے برابر ہوتا ہے۔ رنگ میں

۱۲۰۔ چکوترا۔ ترنج کھٹے اور سنگترے میں پیوند لگا کر پیدا کیا گیا ہے۔ (فرہنگ آصفیہ ج ا ص ۶۵)

بھی جیسا ہوتا ہے اور ذائقے میں شیریں۔ لیکن نارنج کی طرح اس کی مٹھاس میں کسیلا پن نہیں ہوتا۔ نارنج سے مشابہ ایک پھل امرت پھل بھی ہوتا ہے۔ اس سے مشابہ دوسرا پھل کرنہ کہلاتا ہے۔ جسامت میں یہ لیمو کے ہی برابر ہوتا ہے اور ذائقے میں ترش۔

اصل بید

نارنج سے مشابہ ایک پھل اصل بید کہلاتا ہے۔ یہ اس سال حال ہی میں نظر آیا ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر اس کے اندر سوئی ڈالیں تو فوراً پگل جاتی ہے۔ شاید اس کی وجہ اس کی ترشی یا کوئی دیگر خصوصیت ہو۔ یہ اتنا ہی ترش ہوتا ہے جتنا نارنج اور لیمو۔

پھول

گڑھل

ہندستان میں انواع واقسام کے پھول پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک جاسون کہلاتا ہے جسے بعض ہندستانی گڑھل کہتے ہیں۔ یہ گھاس پات نہیں بلکہ اس کے پودے کا ڈنٹھل ہوتا ہے۔ اس کا پودا گلاب کے پودے سے ذرا بڑا ہوتا ہے۔ اور رنگ گل انار سے زیادہ گہرا۔ جسامت میں یہ گلاب کے برابر ہوتا ہے۔ جب اس کی کلی نکل آتی ہے تو ایک دم کھل جاتی ہے۔ جب کلی کھلتی ہے تو پہلی پنکھڑیوں کے درمیان دل جیسی ایک چیز نمایاں ہوتی ہے۔ اس کے بعد پھر پھول کی پنکھڑیاں نظر آتی ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں ہی پھول ہیں لیکن اس کے درمیان سے چونکہ دل جیسی ایک چیز نمودار ہوتی ہے اسی لئے لگتا ہے کہ یہ کوئی دوسرا پھول ہے جو ایک حیرت انگیز بات ہے۔ اپنے پودے پر یہ پھول بہت خوش رنگ نظر آتا ہے۔ یہ زیادہ دیر تر و تازہ نہیں رہتا۔ ایک دو دن میں پژمردہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ پھول یوں تو سارے ہی سال کھلا رہتا ہے مگر برسات کے چار مہینوں میں خوب فراواں ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اس میں کوئی بو باس نہیں ہوتی۔

کنیر

دوسرا پھول کنیر کہلاتا ہے۔ یہ سفید بھی ہوتا ہے اور سرخ بھی۔ گل شفتالو کی طرح اس میں بھی پانچ پنکھڑیاں ہوتی ہیں۔ سرخ کنیر اور گل شفتالو میں بہت ہی مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہ پھول چودہ پندرہ کی تعداد میں ایک ہی جگہ اس طرح کھلتے ہیں کہ دور سے دیکھنے پر ایسا نظر آتا ہے گویا یہ ایک ہی پھول ہے۔ اس کا بوٹہ گلاب کے بوٹے سے ذرا بڑا ہوتا ہے۔ سرخ کنیر میں بھینی بھینی خوشبو ہوتی ہے جو بہت بھلی لگتی ہے۔ یہ پھول بھی برسات کے چار مہینوں میں کھلتا ہے اور خوب بہار دکھاتا ہے مگر اس کے علاوہ بھی تمام سال نظر آتا ہے۔

کیوڑہ

ایک پھول کیوڑہ کہلاتا ہے۔ اس کی خوشبو بہت ہی زیادہ لطیف ہوتی ہے۔ عرب اسے کاری کہتے ہیں۔ مشک کا عیب یہ ہے کہ وہ کچھ حد تک خشک ہوتا ہے۔ لیکن اس پھول کو مشک تر کہا جا سکتا ہے۔ خوشبو تو اس کی واقعی دلکش ہوتی ہے مگر شکل وہیئت بہت ہی عجیب۔ یہ پھول لمبائی میں ڈیڑھ سے دو بالشت تک کا ہوتا ہے۔ اس کی پنکھڑیاں بانسری کے پتوں جیسی کانٹے دار ہوتی ہیں اگر اس پھول کو دبا کر کلی کی شکل دی جائے اس کی بیرونی پنکھڑیاں زیادہ سبز اور خاردار نظر آئیں گی۔ اس کی اندرونی پنکھڑیاں نرم اور سفید ہوتی ہیں۔ اندرونی پنکھڑیاں کے درمیان ایسی چیز نظر آئے گی جو پھولوں کے بیچ میں ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ خوشبو اسی جگہ سے نکلتی ہے۔ اس کا

بوٹہ (ورق ۲۶۵) سرکنڈے کے پودے جیسا لگتا ہے جس کا ابھی تنا نہ بنا ہو۔ لیکن اس کے پتے زیادہ چوڑے اور خاردار ہوتے ہیں۔ اس کا تنا بہت ہی بے ہنگم ہوتا ہے۔ اور جڑیں زمین سے باہر نظر آتی ہیں۔

چنبیلی

ایک پھول یاسمین ہوتا ہے جسے چنبیلی کہتے ہیں۔ چنبیلی ہماری ولایت کے گُل یاسمین سے ذرا زیادہ بڑی ہوتی ہے۔ اس کی خوشبو بہت تیز ہوتی ہے۔

موسم

ہماری ولایات میں چار موسم ہوتے ہیں لیکن ہندستان میں تین۔ یعنی چار ماہ گرمی، چار مہینے برسات اور چار ماہ موسم سرما۔ ہر مہینے کا آغاز نئے چاند سے ہوتا ہے۔ ہر تین سال بعد ایک مہینے کا اضافہ کر دیا جاتا ہے پہلے موسم برسات میں اس کے بعد تین سال گزر جانے پر موسم سرما کے آغاز میں ایک ماہ کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ اور اسی طرح موسم گرما کے آغاز میں۔ چنانچہ یہی ان کا سال کبیسہ[۱۲۱] کہلاتا ہے۔

چیت، بیساکھ، جیٹھ اور آساڑھ گرمی کے مہینے ہیں۔ جو حوت، حمل، ثور، اور جوزا کے مطابق واقع ہوتے ہیں۔ ساون، بھادوں کوار اور کاتک برسات کے مہینے ہیں۔ یعنی سرطان، اسد، سنبلہ، اور میزان کے مطابق۔ اگھن، پوس، ماگھ اور پھاگن موسم سرما کے مہینے ہیں۔ جو عقرب، قوس، جدی اور دلو کے مطابق آتے ہیں۔

ہندستان کے لوگوں نے چونکہ ہر موسم کی مدّت چار مہینے معین کی ہے۔ اسی لئے ان کے اعتبار سے ہر موسم میں کثرت سے گرمی، دو مہینے تیز بارش اور دو مہینے شدید سردی کے ہوتے ہیں۔ گرمی کے آخری دو مہینے جیٹھ اور آساڑھ کہلاتے ہیں۔ ان میں سخت گرمی پڑتی ہے۔ برسات کے دو ابتدائی مہینے ساون اور بھادوں کہلاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان دو مہینوں میں بہت تیز بارش ہوتی ہے۔ موسم سرما کے دو درمیانی مہینوں یعنی پوس اور ماگھ میں سردی کا بہت زیادہ زور ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کے ملک میں چھ موسم ہوتے ہیں۔

دن

انھوں نے دنوں کے نام بھی مقرر کر رکھے ہیں۔

سنیچر یعنی شنبہ، اتوار یعنی یکشنبہ، سوم وار یعنی دوشنبہ، منگل وار یعنی سہ شنبہ، بدھ وار یعنی چہار شنبہ، برسپت وار یعنی پنجشنبہ (جمعرات) اور شکر وار یعنی جمعہ

وقت

ہماری ولایات کی اصطلاح میں دن اور رات کو چوبیس حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور حصّے کو ساعت (گھنٹہ) کہا گیا ہے۔ ہر ساعت (گھنٹہ) کو ساٹھ اجزا میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جس میں سے ہر جز کو دقیقہ (منٹ) کہتے ہیں۔ چنانچہ شب و روز کے دوران ایک ہزار چار سو چالیس دقیقے (منٹ) ہوتے ہیں۔ ایک دقیقے کی مدت اتنی ہوتی ہے کہ سورۃ فاتحہ مع بسم اللہ چھ مرتبہ پڑھی جا سکے۔ چنانچہ ایک دن اور رات کے دوران بسم اللہ کے ساتھ سورۃ فاتحہ آٹھ ہزار چھ سو چالیس مرتبہ پڑھی جا سکتی ہے۔

ہندستان کے لوگوں نے دن اور رات کو ساٹھ اجزا میں تقسیم کیا ہے۔ ہر جز کو وہ گھڑی کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ رات کو چار حصّوں میں اور دن کو بھی چار حصّوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ جس میں سے ہر حصّہ پہر کہلاتا ہے۔ فارسی میں اسے پاس کہتے ہیں۔ اگرچہ اپنی ولایت میں "پاس" اور "پاسبان" جیسے الفاظ میں نے سن رکھے ہیں۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ان سے کیا مراد لی جاتی ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر ہندستان کے تمام اہم شہروں میں کچھ لوگ

۱۲۱۔ کبیسہ۔ اس کو ہندی میں لونڈ کا مہینہ کہتے ہیں۔ ہندی طریقے میں ہر سال سوا گیارہ دن کا فرق ہے۔ شمسی اور قمری سال کے درمیان اس لئے ہر تین سال بعد ایک مہینے کا اضافہ کر دیا جاتا تھا۔

مقرر (ورق ۲۶۶) ہیں جنہیں گھڑیالی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے پیتل کی دوانگل موٹی ٹکیہ ڈھال رکھی ہے۔ جو طباق کے برابر ہوگی۔ اس پیتل کی ٹکیہ کو گھڑیال کہتے ہیں۔ جسے ایک اونچی جگہ پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے پاس ایک پیالہ بھی ہوتا ہے جس کی وضع "جامِ ساعت" جیسی ہوتی ہے۔ اس کی تہہ میں شگاف بنا دیا جاتا ہے۔ یہ پیالہ ہر گھڑی میں بھر جاتا ہے۔ گھڑیال باری باری اس پیالے کو پانی کی سطح پر رکھ کر اس کے ڈوب جانے کے منتظر رہتے ہیں۔ مثلاً اس وقت جب کہ دن شروع ہوتا ہے وہ پیالے کو پانی کے اوپر رکھتے ہیں۔ جس وقت یہ پیالہ بھر جاتا ہے تو وہ اس موسل سے جو ان کے پاس ہوتی ہے ایک مرتبہ گھڑیال کو بجا دیتے ہیں۔ جب یہ پیالہ دوسری مرتبہ بھر جاتا ہے تو گھڑیال کو دو مرتبہ بجا دیتے ہیں۔ چنانچہ پہر کے پورے ہونے تک یہی کرتے رہتے ہیں۔

پہر کے پورے ہونے کی علامت یہ ہے کہ کئی مرتبہ لگاتار بجاتے ہیں۔ اگر دن کا پہلا پہر ہو تو جلدی جلدی بجانے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے رک جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایک مرتبہ گھڑیال کو بجاتے ہیں۔ دوسرے پہر کے خاتمے پر دو مرتبہ تیسرے پہر کے خاتمے پر تین مرتبہ اور چوتھے پہر کے خاتمے پر چار مرتبہ بجاتے ہیں۔ جب چار پہر ختم ہو جاتے ہیں تو رات کا پہر شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ رات کے چہار پہر بھی اسی طرح پورے کئے جاتے ہیں۔ یہ گھڑیالی اس وقت جب کہ پہر پورا ہو جاتا تھا گھڑیال بجاتے تھے۔ رات کو جو لوگ بیدار ہوتے انہیں اس طرح گھڑیال بجانے سے یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ رات تین گھڑیاں گزر ئی ہیں یا چار گھڑی یا رات کا دوسرا پہر ہے یا تیسرا (ورق ۲۶۶ ب) چنانچہ میں نے حکم دیا کہ رات کی گھڑیوں اور ان دنوں کی گھڑیوں کو ظاہر کرنے کے لئے جب کہ مطلع ابر آلود ہو پہر گزرنے کی علامت مقرر کریں۔ مثلاً پہلے پہر کی جب تین گھڑیاں بجا چکیں تو تھوڑی دیر رک جائیں اور اس کے بعد پھر پہلے پہر کو ظاہر کرنے کے لئے ایک مرتبہ گھڑیال کو بجائیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ پہلے پہر کی تین گھڑیاں تھیں جو گزر چکی ہیں۔ اسی طرح رات کے تیسرے پہر کی چوتھی گھڑی ظاہر کرنے کے لئے تھوڑی دیر کے لئے رُک جائیں۔ تیسرا پہر بتانے کے لئے گھڑیال کو تین مرتبہ بجائیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ تیسرے پہر کی چوتھی گھڑی ہے۔ یہ بہت ہی عمدہ اقدام تھا کیونکہ رات کے وقت جو کوئی بھی بیدار ہوتا اسے گھڑیال کی ان آوازوں سے معلوم ہو جاتا کس پہر کی کونسی گھڑی گزری ہے۔ اہل ہند نے ہر گھڑی کے ساٹھ حصے کئے ہیں جن میں سے انہوں نے ہر ایک کو پل کہا ہے۔ چنانچہ ایک دن اور رات میں تین ہزار چھ سو پل ہوتے ہیں۔ ایک پل کی مدت یہ ہے کہ اگر آنکھ کو ساٹھ مرتبہ جھپکایا جائے تو ایک پل گزرتا ہے۔ جو دن اور رات میں دو لاکھ سولہ ہزار مرتبہ پلکیں جھپکائے جانے کے برابر ہوگا۔ چنانچہ ہر ایک پل کے بارے میں تجربہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اگر بسم اللہ سمیت آٹھ مرتبہ سورہ قل ہواللہ پڑھی جائے تو ایک پل وقت لگے گا۔ اور اس طرح دن اور رات میں یہ اٹھائیس ہزار آٹھ سو مرتبہ قل ہو اللہ پڑھنے کے برابر ہوگا۔

اوزان

(ورق ۲۶۷) ہندُستان کے لوگوں نے وزن اس طرح مقرر کئے ہیں۔ آٹھ رتی کا ایک ماشہ، چار ماشے کا ایک ٹانک جو بتیس رتی کے برابر ہوا۔ پانچ ماشے کا ایک مثقال جو چالیس رتی کے برابر ہوا۔ بارہ ماشے کا ایک تولہ جو چھیانوے رتی کے برابر ہوا۔ چودہ تولے کا ایک سیر۔ یہ ہر جگہ مقرر ہے کہ چالیس سیر ایک من کے برابر ہوتا ہے۔ بارہ من ایک مانی کے برابر ہوتے ہیں۔ سو مانی کو ایک مُنیاسہ کہتے ہیں۔ جواہر و مروارید ٹانک کے ذریعے تولے جاتے ہیں۔

اعداد

ہندُستان کے لوگوں نے اعداد بھی خوب متعین کر رکھے ہیں۔ سو ہزار کو لاکھ کہتے ہیں۔ سو لاکھ کو کروڑ، سو

کروڑ کو ارب، سو ارب کو کھرب، سو کھرب کو نیل، سو نیل کو پدم، سو پدم کو سانک کہتے ہیں۔ یہ اعداد اس امر کی دلیل ہیں کہ ہندُستان میں مال فراوانی سے ہوتا ہے۔

ہندُستان کے اکثر و بیشتر لوگ کافر ہیں۔ ہندُستان کے لوگ کافر کو "ہندو" کہتے ہیں۔ بیشتر ہندو تناسخ کے قائل ہیں۔ محصّل، کاریگر اور دستکار سب ہی ہندو ہیں۔ ہماری ولایت میں خانہ بدوش لوگوں میں ہر قبیلے کا علیحدہ نام ہوتا ہے۔ یہاں جو لوگ ولایت اور گاؤں میں رہتے ہیں ان میں بھی ہر قبیلے کا جداگانہ نام ہوتا ہے۔ یہاں جو شخص بھی صنعت گری کرتا ہے اس کا باپ اور دادا بھی وہی صنعت و حرفت اختیار کئے ہوئے ہے۔

ہندُستان کی کمزوریاں

ہندُستان میں لطافت و نزاکت کا فقدان ہے لوگوں میں حسن و زیبائی نہیں۔ باہمی اختلاط و آمیزش نہیں۔ ایک دوسرے کے پاس آمدورفت نہیں۔ طبع میں ذوق نہیں۔ آداب و رسوم نہیں۔ کرم و مروّت نہیں۔ ہنرمندی و دستکاری میں کوئی اسلوب و تناسب نہیں۔ اچھی نسل کے گھوڑے نہیں۔ عمدہ قسم کا گوشت نہیں۔ انگور نہیں۔ خربوزہ نہیں۔ اچھے پھل نہیں۔ برف نہیں۔ ٹھنڈا پانی نہیں۔ اس کے بازاروں میں عمدہ کھانا اور اچھی روٹی نہیں۔ حمام نہیں۔ مدارس نہیں۔ شمع نہیں۔ مشعل نہیں۔ شمعدان نہیں۔

شمع اور مشعل کے بجائے کچھ میلے کچیلے آدمی ہوتے ہیں جنہیں دیوتی (دیواتی)[۱۲۲] کہتے ہیں۔ ان کے بائیں ہاتھ میں ایک چھوٹی تپائی ہوتی ہے۔ اس کے ایک پائے کے ساتھ شمع کی نوک جیسی لوہے کی شمع لکڑی پر مضبوطی سے باندھ دیتے ہیں۔ جس کے اندر انگوٹھے جتنا موٹا فتیلہ ہوتا ہے جس کو دوسرے پایے سے کس کر باندھ دیتے ہیں۔ ان کے دائیں ہاتھ میں لوکی کی شکل کی بنی ہوئی کپّی ہوتی ہے۔ جس میں اک باریک سوراخ ہوتا ہے۔ تیل اسی سوراخ میں سے ٹپک کر گرتا ہے۔ جس وقت بھی فلیتے پر تیل ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے اس کپّی سے تیل ٹپکا دیتے ہیں۔ یہاں کے بڑے آدمیوں ے پاس سو دو سو دیواتی ہوتے ہیں۔ جنہیں وہ مشعل کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ بادشاہوں اور امیروں کو اگر رات کے وقت روشنی کی ضرورت پیش آتی ہے تو یہی چیکٹ دیواتی (ورق ۲۶۸) بادشاہ یا امیر کے قریب کھڑے ہوجاتے ہیں۔

دریاؤں، تالابوں، درّوں، گھاٹیوں اور جوہڑوں میں پانی بہتا رہتا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ باغوں اور عمارتوں میں آبِ رواں نہیں پایا جاتا۔ یہاں کی عمارت میں نہ صفائی و پاکیزگی پائی جاتی ہے نہ ہوا اور نہ ہی تناسب و یکسانیت۔

رعیّت کے لوگ اور چھوٹے درجے کے آدمی ننگے بدن گھومتے پھرتے ہیں۔ بس ایک چیز جسے لنگوٹہ کہتے ہیں باندھے رہتے ہیں۔ ناف سے دو بالشت نیچے تک ایک تکونہ کپڑا لٹکا رہتا ہے۔ اس جانگیے کے نیچے ایک اور تکونہ کپڑا ہوتا ہے۔ جس کو اس لنگوٹے کے ساتھ جکڑ کر باندھ لیتے ہیں۔ ان کی عورتیں ایک لنگی باندھے رہتی ہیں۔ جس میں سے آدھی لنگی کمر کے گرد باندھ لیتی ہیں اور باقی سے اپنا سر ڈھک لیتی ہیں۔

ہندہستان کی اچھائیاں

یہاں کی زیبائی اور لطافت یہی ہے کہ یہ ایک وسیع ولایت ہے۔ جہاں سونے اور روپے کی فراوانی ہے۔ برسات کے زمانے میں موسم خوشگوار ہوجاتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ دس پندرہ بلکہ بیس مرتبہ بارش برستی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے سیلاب اُمنڈ آتا ہے۔ جہاں بارش نہیں ہو وہاں تک ندی نالے بہنے لگتے ہیں۔ جس وقت بارش ہوتی ہے اور ہو چکتی ہے موسم بڑا ہی سہانا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں اعتدال و لطافت کا عنصر باقی رہتا ہے۔ لیکن اس موسم کا یہ عیب ہے کہ ہوا میں بہت زیادہ نمی اور رطوبت پیدا ہوجاتی ہے۔

۱۲۲۔ دیوتی۔ دیواتی (دیواسے) چراغ اٹھانے والا (راجیہ راجیشور راؤ اصغر، ہندی اردو ڈکشنری ص ۳۳۲)

چنانچہ ہماری ولایت کے کمانوں سے برسات کے موسم میں یہاں تیر اندازی نہیں کی جاسکتی کیونکہ وہ ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ یہ رطوبت صرف کمانوں پر ہی نہیں بلکہ زرہ بکتروں، کتابوں، سبزہ اور برتنوں تک پر اثر انداز ہوتی ہے۔ عمارات بھی دیرپا نہیں ہوتیں۔ برسات کے علاوہ موسم گرما اور سرما میں بھی موسم بہتر ہو جاتا ہے لیکن اس وقت بادشمال چونکہ ہر وقت چلتی رہتی ہے اسی لئے یہاں گرد و خاک بہت زیادہ ہوتی ہے۔ برسات کی آمد سے قبل پانچ چھ مرتبہ ہوا کے بہت تیز جھونکے آتے ہیں۔ چنانچہ اس قدر گرد و خاک ہوتی ہے کہ آدمی ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتا۔ اسے ''آندھی'' کہتے ہیں۔ موسم گرما کے دوران جب کہ سورج، بروج ثور و جوزا میں ہوتا ہے، اگرچہ گرمی بہت ہوتی ہے مگر پھر بھی موسم معتدل رہتا ہے۔ اور یہ گرمی بلخ و قندھار کی گرمی کے برابر نہیں ہوتی۔ وہاں جتنے عرصے تک گرمی کا موسم رہتا ہے یہاں اس کی مدّت اس سے نصف ہوتی ہے۔

یہاں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ہر صنعت و حرفت میں کاریگروں اور دستکاروں کی فراوانی ہے۔ ہر کام اور ہر چیز کے لئے یہاں کچھ ایسے لوگ مقرر و معین ہیں جن کے باپ دادا بھی اسی کام کو کرتے چلے آرہے تھے اور وہی اس کام کے لئے مقرر تھے۔ چنانچہ ملّا شرف یزدی نے ''ظفر نامہ'' میں اس بات کو بہت آب و تاب سے لکھا ہے کہ تیمور بیگ کے عہد میں سنگی مسجد کی تعمیر میں آذربائیجان، فارس، ہندستان اور دیگر ممالک کے دو سو سنگتراش کام پر لگے ہوئے تھے۔ میری اُن عمارات میں جو آگرہ، سیکری، بیانہ، دھولپور، گوالیار اور (ورق ۲۶۹) کول میں تعمیر ہو رہی تھیں ان میں ایک ہزار چار سو اکیانوے سنگتراش ہر روز کام کر رہے تھے۔ صرف فن تعمیر میں ہی نہیں بلکہ ہر صنعت و حرفت اور ہر کام میں یہاں لوگ بیحد و بے شمار ہیں۔

ہندُستان کے محصولات

بھیرہ سے بہار تک یہاں کی ولایات اس وقت میرے تحت و تصرّف ہیں۔ ان کی آمدنی باون کروڑ (تنکہ) ہے۔ جن کی تفصیل میرے اس مجمل بیان سے واضح ہو جائے گی۔[۱۲۳] ان میں سے آٹھ نو کروڑ کی مالیت کے پرگنے ان راجہ اور رائے حکمرانوں کے تحت تصرّف ہیں جو قدیم زمانے سے ہی میری اطاعت کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ پرگنات انہیں یہاں استقامت کے لئے دیئے گئے ہیں۔

ولایت ہندُستان کے مختلف مقامات، یہاں کی زمین اور لوگوں کی خصوصیات و کیفیات کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوسکا وہ یہاں مذکور کر دیا گیا۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی ایسی چیز نظر آئی جو لکھنے کے قابل ہو تو اس کے بارے میں ضرور تحریر کروں گا اور اگر کوئی ایسی چیز سنی گئی جو سنانے کے لائق ہو تو اسے بھی بیان کروں گا۔

پیر کے دن بتاریخ ۲۹ رجب میں نے خزانے کا معائنہ کیا اور اس کی تقسیم شروع کر دی۔ ہمایوں کو ستره لاکھ کی رقم اس خزانے سے دی گئی۔ اس خزانے میں ایک کوٹھری ایسی بھی تھی جس کی تفصیلات درج نہیں کی گئی تھیں اور اس کے بارے میں تحقیقات بھی عمل میں نہیں آئی تھی۔ وہ کوٹھری بھی ہمایوں کو بطور انعام عطا کی گئی۔ بعض امرا کو دس لاکھ، بعض کو آٹھ لاکھ، ساتھ لاکھ اور چھ لاکھ تک دیئے گئے وہ افغان (ورق ۲۶۹ب) ہزارہ، عرب، اور بلوچ جو لشکر میں تھے ان کے ہر گروہ کو ان کے مرتبے کے مطابق اس خزانے سے نقد مال عطا کیا گیا۔ نہ صرف ہر سوداگر اور طالب علم بلکہ ہر وہ شخص جو اس لشکر میں ہمراہ تھا سب ہی بخشش و انعام سے بہرہ مند ہوئے اور ہر شخص نے اپنا مکمل حصّہ حاصل کیا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کو بھی بخشش و انعام کی رقم روانہ کی گئی تھی جو اس لشکر میں شریک نہ تھے۔ چنانچہ کامران کو ستره لاکھ، محمد زمان مرزا کو پندرہ لاکھ، عسکری و ہندال کے ساتھ ہی تمام عزیز و اقارب حتیٰ کم عمر وابستگان کو بھی سونے چاندی، بیش قیمت ملبوسات، جواہرات اور کنیز و غلام بطور سوغات بھیجے گئے۔ ان امیروں اور ان کے سپاہ کو جو اس ملک کے اُس پار تھے بہت سے انعام عطا کئے گئے۔ سمرقند، خراسان، کاشغر اور عراق میں جو عزیز و اقارب تھے انہیں بھی سوغاتیں بھیجی گئیں۔ جو مشائخ خراسان اور سمرقند میں تھے

۱۲۳۔ محصولات کی تفصیل فارسی نسخے میں نہیں ہے۔ حیدرآباد کے ترکی مخطوطے میں موجود ہے۔ یہ مندرجہ ذیل ہے۔

ہندُستان کے محصولات

نمبر	سرکار	رقم	
۱	سرکار پار ستلج بھیرہ، لاہور سیالکوٹ دیپالپور وغیرہ	۳،۳۳،۱۵۹۸۹	
۲	سرکار سرہند	۱،۲۹،۳۱۹۸۹	تنکہ
۳	سرکار حصار فیروز	۳۰،۷۵۱۷۳	تنکہ
۴	سرکار دار ملک دہلی و میون دوآبہ	۳،۶۹،۵۰۲۵۴	تنکہ
۵	سرکار میوات۔ سکندر کے زمانے میں حکومت میں شامل نہیں تھیں۔	۱،۶۹،۸۱۰۰۰	تنکہ
۶	سرکار بیانہ	۱،۴۴،۱۴۹۳۰	تنکہ
۷	سرکار آگرہ	۲،۹۷،۶۹۱۹	تنکہ
۸	سرکار مرکزی ولایت	۲۹۱۰۰۰۱۹	تنکہ
۹	سرکار گوالیار	۲،۲۳،۵۷۴۵۰	تنکہ
۱۰	سرکار کالپی	۲،۲۳،۵۷۴۵۰	تنکہ
۱۱	سرکار قنوج	۱،۳۶،۶۳۳۵۸	تنکہ
۱۲	سرکار سنبھل	۱،۳۸،۴۴۰۰۰	تنکہ
۱۳	سرکار لکھنور و بکسر	۳۹۸۲۴۳۳	تنکہ
۱۴	سرکار خیرآباد	۱۲،۶۵۰۰۰	تنکہ
۱۵	سرکار اودھ و بہرائچ	۱،۱۷۰۱۳۶۹	تنکہ
۱۶	سرکار جونپور	۴،۰۰،۸۸۳۳۳	تنکہ
۱۷	سرکار کرہ و مانکپور	۱،۶۲،۴۷۴۸۲	تنکہ
۱۸	سرکار بہار	۴،۰۵،۶۰۰۰۰	تنکہ
۱۹	سرکار سروار	۱،۵۵،۱۷۵۰۶	تنکہ
۲۰	سرکار سارن	۱،۱۰،۱۸۳۷۳	تنکہ
۲۱	سرکار چمپارن	۱،۹۰،۸۶۰۶۰	تنکہ
۲۲	سرکار کندلہ	۴۳،۳۰۳۰۰	تنکہ
۲۳	سرکار ترھت از خدمتانہ راجہ روپ نرائن	۲،۵۵۰۰۰	تنکہ چاندی تنکہ تانبا
۲۴	سرکار رنتھنبور مع بالی، چاتسو و طالانہ	۲۰،۰۰۰۰۰	تنکہ
۲۵	سرکار ناگور		
۲۶	سرکار بکرماجیت رنتھنبور		
۲۷	سرکار کلنجری		
۲۸	سرکار سنکھدیو		
۲۹	سرکار راجہ بکرم دیو		
۳۰	سرکار راجہ بکرم چند		

انہیں نذرانے بھیجے گئے۔ یہی نہیں بلکہ مکّہ اور مدینہ تک میں عطیات بھی روانہ کیے گئے۔ ولایت کابل اور ضلع وسک میں ہرزن ومرد، غلام وآزاد اور بالغ ونابالغ کو ایک ایک شاہرخی انعام میں دی گئی۔

جب ہم آگرہ میں پہلی مرتبہ وارد ہوئے تو ہمارے لوگوں اور یہاں کے لوگوں کے درمیان عجیب نفرت ومنافرت پائی جاتی تھی۔ وہاں کی سپاہ ورعیت ہمارے لوگوں سے دور بھاگتی تھی۔ دلّی اور آگرہ کے علاوہ جہاں بھی قلعے تھے وہاں قلعہ داروں نے ان قلعوں کو مضبوط کرلیا تھا۔ وہ اطاعت وفرماں برداری کے لئے تیار نہ تھے۔ سنبھل میں قاسم (ورق ۲۷۰) سنبھلی تھا اور بیانہ میں نظام خاں، میوات میں حسن خان میواتی مردک ملحد جو تمام شرارتوں اور شورہ پشتیوں کا سرغنہ تھا۔ دھولپور میں محمد زیتون گوالیار میں تاتار خان سارنگ خانی، راپڑی میں حسین خان نوحانی، اٹاوہ میں قطب خان، کالپی میں عالم خان موجود تھے۔ قنوج اور دریائے گنگا کے اس پار کا تمام علاقہ نصیر خان نوحانی، معروف فرملی، و دیگر بہت سے امرا کے تحت تصرف تھا۔ یہ سب ابراہیم کی وفات سے دو تین سال قبل باغی وسرکش ہوگئے تھے۔ جس زمانے میں میں نے ابراہیم کو زیر کیا تو وہ ان تمام ولایات پر قابض و متصرف ہوگئے جو اس شہر کے اُس طرف تھیں اور خود وہاں سے دو تین کوچ کا فاصلہ طے کرکے گھاٹ میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے دریا خان کے لڑکے پہاڑ خان کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلیا اور سلطان محمد کا لقب دیا۔ مرغوب اس کا غلام مہابن میں تھا جو قریب آگیا مگر اس کے بعد کچھ مدّت تک اس سے آگے پیش قدمی نہ کرسکا۔

لشکر میں نا اتفاقی

جس وقت ہم آگرہ میں وارد ہوئے تو گرمی کا موسم تھا۔ جو لوگ وہاں آباد تھے وہ ہمارے خوف سے فرار ہوگئے۔ جس کے باعث انسانوں اور گھوڑوں کے لئے غلّہ اور بھوسا میسّر نہ تھا۔ دیہات میں لوگ مخالفت اور منافرت کی بنا پر سرکشی اور غارت گری پر اُتر آئے تھے۔ راستوں پر آمدورفت جاری نہ تھی اور ابھی اتنا موقع نہیں مل سکا تھا کہ خزانے کو تقسیم کرکے ہر پرگنے اور ہر جگہ پر کسی مضبوط آدمی کو متعین ومقرر کریں۔ اس کے علاوہ یہاں اس سال گرمی بھی بہت زیادہ پڑی تھی۔ بہت سے لوگ لو لگنے کے باعث بیمار پڑ کر مرنے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ بیشتر امرا اور عمدہ جوانوں نے دل ہار دیا تھا اور وہ ہندستان میں رہنے کے لئے راضی نہ تھے۔ انہوں نے وہاں سے چلے جانے کا تہیہ کرلیا تھا اگر ان کے تجربہ کار بڑے امیر اس قسم کی باتیں کرتے تو اس میں کوئی حرج نہ تھا۔ کیونکہ جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں ان میں اتنا ہوش اور شعور تو تھا کہ وہ اپنی بات کہنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچ سکیں کہ فلاح و بہبود، فتنہ وسرکشی کس امر میں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان میں یہ صلاحیت بھی تھی کہ وہ اچھے اور برے کے درمیان تشخیص کرسکیں۔ کیونکہ ایسے لوگ جانتے ہیں کہ جب انہوں نے کسی کام کو انجام دینے کا فیصلہ کر ہی لیا تو اسے بار بار کہنے میں کوئی لطف نہیں۔ اس کے برعکس جب ادنی درجہ کے لوگ اس قسم کی باتیں کریں اور اُس کی رائے دیں تو اُن کی ان بے کیف باتوں کا کیا موقع ومحل ہوسکتا ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ سب باتیں وہ ادنی درجہ کے لوگ کررہے تھے جو اس مرتبہ ہمارے ساتھ کابل سے سوار ہوئے تھے اور جن میں سے چند کو درجہ امیری سے نوازا گیا تھا۔ جن سے یہ توقع تھی کہ اگر میں آگ اور پانی میں کود جاؤں اور اس میں سے نکل آؤں تو وہ بھی بے تحاشا میرے ساتھ اس میں کود جائیں گے اور اس میں سے نکل آئیں۔ میں جس طرف بھی جاؤں وہ میرے ساتھ ہوں۔ ان سے مجھے یہ اُمید نہ تھی وہ ایسی باتیں کریں گے جو میرے مقصد وارادے کے خلاف ہوں۔ کیونکہ ہر کام اور ہر مہم کو سر کرنے سے قبل میں نے باہمی صلاح ومشورہ کیا تھا اور متفق ہوکر ہی کوئی فیصلہ کن اقدم بروئے کار لایا تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس سے قبل کہ صلاح ومشورے کی مجلس برخاست ہو وہ خود اس کام اور مہم سے روگرداں ہوجاتے۔ اگرچہ ان کا یہ رویہّ اچھا نہ تھا (ورق ۲۷۱) لیکن احمدی پروانچی اور ولی خازن نے جو کچھ

کیا وہ اس سے بدتر تھا۔ کابل سے روانہ ہو کر ابراہیم کو شکست دینے اور آگرہ پر قبضہ کرنے میں خواجہ کلاں نے نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔ اس کی باتوں میں مردانگی تھی۔ جو بھی رائے دیتا اس سے ہمت اور حوصلہ مندی نمایاں ہوتی۔ لیکن آگرہ پر قبضہ کرنے کے چند روز بعد اس کی رائے پلٹ گئی۔ چنانچہ جو لوگ سنجیدگی سے روانہ ہونے کی بات کررہے تھے ان میں سے ایک خواجہ کلاں بھی تھا۔

جب میں نے لوگوں کا یہ رویہ دیکھا تو میں نے ان کو صلاح ومشورے کے لئے طلب کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ سلطنت پر جہانگیری بغیر اسباب اور آلات کے نہیں کی جاسکتی۔ بادشاہی اور امیری بغیر نوکر و ولایت ممکن نہیں۔ چند سال تک ہم سعی وکوشش کرتے رہے۔ مشکلات برداشت کیں۔ طویل راہیں طے کیں۔ ہم نے اپنے لشکر کو جنگ وجدال اور کشت وخون کے خطرات میں ڈالا۔ خداوند تعالیٰ کی عنایت اور مہربانی سے ایسی ولایات اور وسیع مملکتوں پر قابض ہوئے۔ اب ایسا کونسا دباؤ ہے اور ایسی کونسی ضرورت پیش آگئی کہ ان ولایات جنہیں ہم نے اپنی جان کی بازی لگا کر حاصل کیا ہے بلاوجہ منہ موڑ لیں اور دوبارہ کابل پہنچ کر افلاس وتنگدستی میں مبتلا ہو جائیں۔ چنانچہ ہر وہ شخص جو میری حکومت کا خیر خواہ ہے آئندہ وہ اس قسم کی باتیں نہ کرے۔ جس کسی میں تاب وتوانائی نہیں اور اس نے چلے جانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو چلا جائے مگر پھر واپس ادھر نہ آئے۔ اس قسم کی معقول باتوں کو ذہن نشین کرا کے میں نے ان کے ذہنوں سے خوف ودغدغے کو دور کر دیا۔

خواجہ کلاں کی روانگی

چونکہ خواجہ کلاں کا دل نہ تھا کہ وہ یہاں رہے اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ بہت سی سوغات لیکر اور ان نوکروں کو ساتھ لے کر جو کثیر تعداد میں اس کے ساتھ ہیں روانہ ہو جائے۔ کیونکہ کابل اور غزنی میں لوگوں کی کمی ہے اسی لئے وہاں پہنچ کر نظم ونسق سنبھالے اور امور انجام دے۔ غزنی، گردیز اور سلطان مسعودی ہزارہ اس کو عنایت کئے گئے۔ ہندوستان میں بھی پرگنہ کہرام اسے عطا کیا گیا جس کی آمدنی تین چار لاکھ تھی۔ خواجہ میر میران کو مقرر کیا گیا کہ وہ کابل جائے اور اپنی تحویل میں سوغات وہاں پہنچائے۔ ملا حسن صرّاف اور نوکہ ہندو ان سوغاتون کے نگراں تھے۔ خواجہ کلاں چونکہ ہندوستان سے بیزار تھا اسی لئے روانگی کے وقت اس نے دہلی میں اپنے گھر کی دیوار پر یہ شعر لکھ دیا:

اگر بخیر و سلامت گزر زسند کنم　　　سیاہ روی شوم گر ہوای ہند کنم

(اگر سندھ سے بخیر وسلامت گزر جاؤں۔ میرا منہ کالا ہو جو میں ہندوستان کی آرزو کروں)

میں ہندوستان میں مقیم ہوں اور وہ ایسا ظرافت آمیز شعر لکھے تو کیا صورت ہوسکتی ہے۔ اگرچہ اس کے جانے سے ہی دل میں میل آگیا تھا لیکن اس طرح کے ظرافت آمیز شعر نے دل میں مزید کدورت پیدا کر دی۔ چنانچہ میں نے بھی فی البدیہہ رباعی کہی اور اسے لکھ کر بھیج دی۔

یوز شکر دی بابر کہ کریم غفار　　　بیروی سنکا معز وهندو ملک و بسیار
ایسیق لیغی غہ کر سنکا یوقتور طاقت　　　ساووق یوزینی کور ای دیسانک غزنی بار

(ہزار شکر ادا کر بابر کہ غفور ورحیم نے۔ تجھے سندھ، ہند اور بہت سے ملک عطا کئے۔ اگر تجھے گرمی کی برداشت نہ تھی اور یہ کہتا تھا کہ مجھے سردی کا چہرہ دیکھنا ہے تو تیرے لئے غزنی موجود ہے)[۱۲۴]

ان دنوں میں ملا اپاق کا درجہ دیگر وبیشتر ملازمین کی نسبت بہت ہی کم تھا۔ دو تین سال قبل اس نے اپنے بھائیوں کو جمع کر کے عمدہ جمعیت تیار کر لی تھی۔ اسے اوروک زئی افغان (ورق ۲۷۲) اور بعض افغان جو سندھ کے کنارے آباد تھے، اس کی تحویل میں دے دیئے گئے تھے۔ اسے کول کی جانب راونہ کیا گیا تا کہ وہ ان ہندو سرکش سپاہیوں کو جو اس جگہ کے گرد ونواح میں تھے میری اطاعت پذیری کے قوانین پہنچا دے۔

۱۲۴۔ خواجہ کلاں۔ یہ وہی خواجہ کلاں ہیں جن کی باجوڑ روانگی کے وقت بابر نے دوست سے بچھڑنے کا اظہار رباعی میں کیا تھا دیکھیں ۹۲۵ ہجری کے حالات۔
گلبدن بیگم کہتی ہیں کہ بابر خواجہ کو چھوڑنے کو تیار نہیں تھا اور صرف بار بار اصرار کرنے پر راضی ہوا (ہمایوں نامہ ص ۹۵)

شیخ گھورن عقیدت واخلاص کے ساتھ حاضر ہوا اور خدمت بجالایا۔ وہ اپنے ساتھ دو تین ہزار ترکش ہندوؤں کو بھی لایا جو اس وقت دوآبے میں آباد تھے اور انہیں اس نے میری ملازمت میں داخل کر دیا۔

دلی اور آگرہ کے درمیان یونس علی راستہ بھول کر ہمایوں سے دور ہو گیا تھا اس کا مقابلہ علی خان فرملی کے لڑکوں اور رشتہ داروں سے ہو گیا۔ معمول سی جنگ کے بعد اس نے انہیں زیر کر لیا اور اس کے لڑکوں کو قیدی بنا کر میرے پاس لایا۔ اسی اثنا میں نے دولت قدم ترک کے لڑکے مرزا مغل کو علی خان کے ایک لڑکے کے ساتھ جو قید میں تھے ہمراہ کیا اور علی خان کے پاس اطاعت کے لئے روانہ کیا وہ اس وقت خراب حالات کے باعث میوات کی جانب چلا گیا تھا۔ وہ فرمان علی خان نے قبول کر لیا۔ اس مناسبت سے اسے ایسا پرگنہ عطا کیا گیا جس کی اس وقت آمدنی پچیس لاکھ تھی۔

سلطان ابراہیم نے مصطفیٰ فرملی اور فیروز خاں سارنگ خانی کو پورب کے باغیوں کی سرکوبی کے لئے متعین کیا تھا۔ مصطفیٰ نے ان امیروں کے ساتھ خوب جنگ کی اور کئی مرتبہ انہیں زیر بھی کر لیا۔ لیکن ابراہیم کی شکست سے قبل اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا چھوٹا بھائی شیخ بایزید اپنے بڑے بھائی کے آدمیوں کا نگراں تھا، اس نے فیروز خاں، محمود خاں نوحانی اور قاضی جیا کے ساتھ میری اطاعت قبول کر لی۔ ان کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ مراعات وعنایات کا سلوک روا رکھا گیا جس کی انہیں توقع تھی۔ فیروز خان کو جونپور سے ایک کروڑ چھیالیس لاکھ پانچ ہزار، شیخ بایزید کو اودھ سے ایک کروڑ اڑتالیس لاکھ پچاس ہزار، محمود خاں کو غازی پور سے نوے لاکھ پینتیس ہزار، قاضی جیا کو جونپور سے بیس لاکھ تنکہ عطا کئے گئے۔

عید شوال کے چند روز گزر جانے کے بعد اس گنبدی ایوان میں جس کے ستون پتھر سے بنائے گئے ہیں اور جو ابراہیم کے حرم میں واقع ہے ایک عظیم مجلس کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں ہمایوں کو چارقب [۱۲۵] شمشیر، سونے کی زین کیساتھ تپچاق گھوڑا عطا کیا گیا۔ چین تیمور سلطان، مہدی خواجہ اور محمد سلطان مرزا کو بھی چارقب وشمشیر سے نوازا گیا۔ دیگر امرا کو بھی ان کے مراتب کے مطابق شمشیر وخنجر کے پٹکے انعام میں دیے گئے۔ چنانچہ مجموعاً اس کی کیفیت یہاں درج ہے:

تپچاق گھوڑے مع زین اور تلوار کے پٹکے: ۲، مرصع خنجر ۲۵ عدد، مرصع کٹاریں ۱۶ عدد، چارقب ۲ عدد، اور سقرلات [۱۲۶] کے تھان ۲۸ عدد۔

جس روز مجلس تشکیل دی گئی تھی اس دن بہت زوردار بارش تیرہ مرتبہ ہوئی۔ بعض لوگ جنہیں باہر جگہ دی گئی تھی بارش سے شرابور ہو گئے۔

محمدی کوکلداش کو ولایت سامانہ عنایت کر کے اسے سنبھل یلغار کرنے کے لئے متعین کیا گیا۔ ہمایوں کو حصار فیروز بطور انعام عنایت کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سنبھل بھی میں نے ہمایوں (ورق ۲۷۳) کو عطا کر دیا اور ہندو بیگ کو ہمایوں کے ساتھ کر دیا۔ چنانچہ اس نسبت سے محمدی کی جگہ، ہندو بیگ کی قیادت میں کتہ بیگ، بابا قشقہ کے بھائی ملک قاسم نیز اس کے بھائیوں اور قرابت داروں، ملا اپاق اور شیخ گھورن کو ترکش ہندوں کے ہمراہ دوآبے پر یلغار کرنے کے لئے روانہ کیا گیا۔ قاسم سنبھلی کی جانب سے تین چار مرتبہ آدمی آچکے تھے۔ جنہوں نے بتایا کہ بتن حرامخور نے سنبھل پر قبضہ کر کے ہمیں عاجز وپریشان کر رکھا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اس پر یلغار کی جائے بتن ہمارے پاس سے بھاگ گیا تھا۔ اس نے پہاڑ کے دامن پر قبضہ کر کے افغانوں کو جمع کیا جو پریشان وسرگرداں تھے۔ زمانہ معطلی میں اس نے جب میدان صاف پایا تو سنبھل پر قبضہ کر لیا۔ ہندو بیگ، کتہ بیگ اور وہ دستہ جو یلغار کے لئے روانہ کیا گیا تھا اس کے سپاہی گھاٹوں پر پہنچ کر دریا پار کرنے لگے۔ بابا قشقہ کے بھائی ملک قاسم اور اس کے بھائیوں نے ایک دم یورش کر دی اور ظہر کے وقت سنبھل پہنچ گئے۔ بتن اپنے لشکر کو مرتب کر کے اپنی لشکرگاہ

۱۲۵۔ چارقب۔ ایک کڑھی ہوئی چادر جو توران میں بادشاہ عام طور پر استعمال کرتے ہیں (اسٹائین گلاس، پرشین انگلش ڈکشنری ص ۳۸۵)

۱۲۶۔ سقرلات۔ اونی چادریں (اسٹائین گاس، پرشین انگلش ڈکشنری ص ۶۸۶)

سے نکل کر باہر آیا۔ ملک قاسم اور اس کا دستہ بھی آگے بڑھا۔ قلعے کو پیچھے چھوڑ کر وہ بر سر پیکار ہو گئے۔ ہتن مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور فرار ہو گیا۔ ملک قاسم اس کے آدمیوں نے ایک گروہ کو قتل کر کے ان کے سر کاٹ لئے۔ اور کچھ ہاتھی گھوڑے اور بہت سامال غنیمت جمع کیا۔ وہ امرا جو یلغار کے لئے روانہ کئے گئے تھے اگلے دن صبح پہنچ گئے۔ قاسم سنبھلی ان سے ملاقات کرنے کے لئے آیا مگر اسے یہ پسند نہ تھا کہ قلعہ ان کے حوالے کر دے۔ چنانچہ اس نے حیلے بہانے تراشنے شروع کر دیئے۔ ایک دن شیخ گھورن کے ساتھ ہندو بیگ گفتگو کر رہا تھا جس میں یہ لوگ بھی شریک تھے۔ وہ کسی نہ کسی بہانے قاسم سنبھلی کو ان امرا کے درمیان لے آیا اور ہمارے آدمیوں کو سنبھل کے قلعے میں داخل کر دیا۔ قاسم سنبھلی کے افراد و خاندان اور متعلقین کو صحیح و سلامت باہر نکال کر اس کے پاس بھیج دیا۔

قلندر پیادے کو ان اشعار کے ساتھ جو فی البدیہہ کہے گئے تھے بیانہ کی جانب روانہ کیا گیا۔

بـاتـرک ستیـزه مکن ای میر بیانـه	چالاکی و مردانگی ترک عیان است
گـر زوئـی و نـصیحت نکنی گوش	آنجنه که عیان است چه حاجب به بیانست ۱۲۷
نہ جھگڑ ترک سے اے میر بیانہ	چالاکی و مردانگی ترک ہے عیاں
تو گر نہ آیا اور نصیحت نہ سنی	جو ہوگا اس کی نہیں ضرورت بیاں

بیانہ کا قلعہ ہندوستان کے مشہور قلعوں میں سے ایک ہے۔ ایک ناعاقبت اندیش و بزدل قلعے کے استحکام پر تکیہ کر کے اپنی حیثیت سے زیادہ چیزوں کا طالب اور دعویدار ہونے لگا۔ جس شخص کو اس نے اپنا ایلچی بنا کر بھیجا تھا اسے کوئی معقول جواب دینے کے بجائے ہم نے راتوں رات قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

باباقلی کے پاس محمد زیتون کو فرامین وعدہ کے ساتھ روانہ کیا گیا۔ وہ بھی عذر پیش کر کے حیلے بہانے بنانے لگا۔

جس وقت ہم کابل میں تھے تو رانا سانگاہ کافر کا ایلچی ہمارے پاس آیا تھا۔ اور اس نے میری حکومت کے ساتھ خیر خواہی کا اظہار کیا تھا۔ اس نے یہ اقرار کیا تھا کہ اگر بادشاہ سلامت اُس طرف سے دہلی کی نواح تک پہنچ جائیگے تو میں اِس طرف سے آگرہ کو روانہ ہو جاؤں گا۔ میں نے ابراہیم کو زیر کر لیا لیکن اس وقت تک اس کافر کی طرف سے (ورق ۲۷۴) کوئی حرکت عمل میں نہیں آئی۔ کندار نامی قلعہ مکھن کے لڑکے حسن کے تحت تصرّف تھا۔ حسن پر اس نے کچھ عرصے بعد حملہ کر دیا۔ حسن مکھن کی جانب سے کئی مرتبہ لوگ آئے مگر وہ خود ابھی تک ملاقات کے لئے نہیں آیا تھا۔ اطراف و جوانب کے قلعے جیسے اٹاوہ، دھولپور، گوالیار، اور بیانہ ابھی تک میرے تحت نہیں تھے۔ کیونکہ وہ افغان جو مشرق کی جانب تھے سرکشی اور دشمنی پر اُتر آئے تھے۔ قنوج سے دو تین پڑاؤ طے کر کے وہ آگرہ کی طرف پہنچ گئے تھے جہاں وہ لشکر گاہ قائم کر کے بیٹھ گئے تھے۔ اپنے نزدیکی علاقوں سے مجھے خاطر جمعی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ جس کے باعث میں اسے کمک نہیں بھیج سکا تھا۔ دو تین ماہ بعد حسن نے عاجز آ کر کندار کا قلعہ اس کے حوالے کر دیا۔

حسین خاں راپڑی میں تھا۔ اس نے خوفزدہ ہو کر راپڑی کو خالی کر دیا۔ جسے محمد علی جنگ کے حوالے کر دیا گیا۔

اٹاوہ میں قطب خاں تھا۔ اسے بھی چند فرمان وعدہ وعید کے ساتھ بھیجے گئے کہ آئے اور ملاقات کرے۔ لیکن وہ نہ تو ملاقات کرنے کے لئے آیا اور نہ ہی اس نے قلعہ خالی کیا۔ مہدی خواجہ کو اٹاوہ عطا کر کے محمد سلطان مرزا، سلطان محمد دولدای، محمد علی جنگ جنگ، عبدالعزیز میر آخور اور بعض مقربین کو بہت سے مددگار لوگوں کے

۱۲۷۔ دیکھئے اِس زمانے کی سیاست کے انداز۔ اشعار میں تنبیہ کی جا رہی ہے۔

ہمراہ اٹاوہ کی جانب روانہ کیا گیا۔ سلطان محمد دولدای کو قنوج دے دیا گیا فیروز خاں، محمد خاں شیخ بایزید قاضی جیا اوران امرا کے ساتھ جوان کے ہمراہ تھے بہت زیادہ مراعات دی گئیں اور انہیں پورب کی طرف پرگنے عطا کئے گئے انہیں بھی اٹاوہ کی جانب متعین کیا گیا۔

دھولپور میں محمد زیتون بیٹھا بہانے بنا رہا تھا مگر ملاقات کرنے کے لئے نہیں آرہا تھا۔ چنانچہ دھولپور سلطان جنید برلاس کو دے دیا گیا اس کے ساتھ ہی عادل سلطان' محمدی کوکلداش' شاہ منصور برلاس' قتلق قدم' ولی خازن' جان بیگ' پیر قلی' شاہ حسین یاربیگی جیسے سرداروں کو اس مقصد کے لئے متعین کیا گیا کہ وہ دھولپور کو بزورِ بازو دستی حاصل کر کے اسے سلطان جنید کے سپرد کر دیں اور اس کے بعد وہ بیانہ کی جانب روانہ ہوں۔

لشکروں کو متعین کرنے کے بعد ترک اور ہندستانی امرا کو مشورہ کے لئے طلب کیا گیا اور یہ بات ان کے درمیان رکھی گئی کہ پورب کے باغی امرا نصیر خان نوحانی، معروف فرملی اور ان امرا نے جو ان کے ساتھ ہیں چالیس پچاس ہزار کی جمعیت کے ساتھ دریائے گنگا پار کر کے قنوج پر قبضہ کر لیا ہے اور وہاں سے دو تین کوچ طے کر کے خیمہ زن ہیں۔ رانا سانگاہ کافر نے کندار پر قبضہ کر لیا ہے اور فتنہ وفساد پر اُتر آیا ہے۔ برسات کا موسم ختم ہونے کے نزدیک ہے اور یہ واجب ہے کہ یا تو باغی وسرکش لوگوں کی جانب رُخ کیا جائے یا اس کافر کی طرف۔ وہ قلعے جو گرد ونواح میں ہیں ان کا کام آسان ہے۔ جب ہم ان بڑے دشمنوں کو رفع دفع کریں گے تو اس کے بعد وہ کیا اقدام کریں گے۔ اس وقت رانا سانگاہ کو اتنی اہمیت نہیں دی جا رہی تھی۔ سب نے متفق ہو کر عرض کیا کہ اگر چہ رانا سانگاہ نسبتاً دور ہے مگر کیا خبر وہ نزدیک بھی آسکتا ہے۔ وہ باغی وسرکش جو نزدیک ہیں ان کی سرکوبی اہم ہے اور ان کا سدِّ باب پہلے (ورق ۲۷۵) کرنا چاہیے۔

میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر چاہتا ہی تھا کہ دشمنوں کی جانب رُخ کروں کہ ہمایوں نے عرض کیا کہ بادشاہ کو سوار ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ خدمت میں انجام دوں گا۔ سب کو یہ بات پسند آئی۔ ترک اور ہندستانی امرا نے اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ چنانچہ ہمایوں کو پورب کی جانب متعین کر کے احمد قاسم کے ایک کابلی (لشکری) کو ان لشکروں کی جانب دوڑایا گیا جنہیں دھولپور میں متعین کیا گیا تھا کہ وہ وہاں سے چل کر چندادور میں ہمایوں کے ہمراہ ہو جائیں۔

تیرہ تاریخ کو بروز جمعرات ہمایوں نے سفر اختیار کیا۔ اور جلسیر نامی گاؤں میں جو تین کروہ کے فاصلے پر ہوگا قیام پذیر ہوا۔ وہاں ایک دن قیام کرنے کے بعد وہ کوچ پر کوچ کرتا ہوا آگے کی جانب روانہ ہو گیا۔

اسی مہینے کی بیس تاریخ کو بروز جمعرات خواجہ کلاں کو کابل جانے کی اجازت دے دی گئی۔

باغ کی تعمیر

میرے دل میں یہ بات آئی کہ ہندستان کا ایک عیب یہ ہے کہ یہاں آبِ رواں نہیں ملتا۔ جو جگہ رہنے کے قابل ہو وہاں رہٹ لگا کر پانی جاری کیا جائے اور وہاں نقشہ کشی کے ذریعے اس کی آرائش کی جائے۔ آگرہ پہنچ کر چند روز بعد اس مقصد کے تحت میں نے چند جگہوں کو ملاحظہ کیا۔ وہ جگہیں ایسی بے رونق اور ویران تھیں کہ میں نے بہت کراہیت اور بددلی کے ساتھ وہاں سے دریا کو پار کیا۔ ان کراہیت آمیز جگہوں کو دیکھ کر میں نے چار باغ ترتیب دینے کا خیال ترک کر دیا۔ لیکن چونکہ آگرہ کے نزدیک ایسی کوئی دوسری جگہ نہ تھی اس لئے اسی جگہ کو منتخب کیا گیا۔

کام کی بنیاد اس کنویں پر رکھی گئی جس کا پانی حمام میں آتا ہے۔ اس کے بعد اس قطعہ زمین کو لیا گیا جہاں املی کے درخت ہیں اور آٹھ پہلو حوض بنا ہوا ہے۔ اس کے بعد بڑے حوض اور وسیع صحن کی باری آئی۔ اس کے بعد وہ حوض بنایا گیا جو سنگین عمارات اور وسیع دیوان کے سامنے واقع ہے۔ اس کے بعد خلوت خانے کی

عمارت کا باغیچہ ترتیب دیا گیا اور اس کے بعد حمام کی تعمیر ہوئی۔

اس طرح بدزیب اور بے قرینہ سرزمین ہند پر اس کے گوشوں میں معقول چمن زار لگائے گئے اور ہر چمن میں گل دشتر کی ترتیب و تکمیل کی گئی۔

ہندستان میں تین چیزیں ایسی ہیں جو ہمارے لئے باعث ضرر ہیں ان میں سے ایک تو گرمی ہے۔ دوسری یہاں کی آندھی اور تیسری یہاں کی گرد و خاک۔ حمام ہی ایسی جگہ ہے جہاں ان چیزوں سے پناہ مل سکتی ہے۔ بھلا حمام میں اس ہوا کا کیا گزر۔ گرمی کے موسم میں یہ حمام اتنے خنک ہوتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ آدمی اس خنکی سے تنگ آ جائیگا۔ حمام کے ایک حجرے میں وہ حوض ہے جس میں پانی سمویا جاتا ہے۔ یہ سرتاپا پتھر سے بنایا گیا ہے۔ اور آزارہ [128] سنگ مرمر کا مگر چھت اور فرش میں لال پتھر استعمال کیا گیا ہے جو بیانہ میں پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ خلیفہ، شیخ زین، یونس علی، اور ہر اس شخص نے جس کو دریا کے کنارے جگہ ملی تھی باقرینہ اور خوش طرح کے باغات ترتیب دیئے۔ لاہور اور دیپالپور کی طرح یہاں بھی رہٹ لگوائے گئے اور ان کے ذریعہ پانی جاری کیا گیا۔ ہندستان کے لوگوں نے کیونکہ خوش قرینہ اور عمدہ طرز پر بنائی گئی جگہیں نہیں دیکھی تھیں اسی لئے دریائے جمنا (ورق ۲۷۶) کے کناروں پر جو عمارات بنائی گئی تھیں اس کو دیکھ کر انہوں نے اس جگہ کا نام ہی کابل رکھ دیا۔ [129]

باؤلی کی تعمیر

قلعے کے اندر ابراہیم کی عمارات اور فصیل کے درمیان ایک جگہ خالی تھی میں نے حکم دیا کہ وہاں ایک ایسے بائین [130] کی تکمیل کریں جس کا ہر ضلع دس ہو۔ ہندستان کی اصطلاح میں ایسے اندارا [131] کنویں کو جس میں سیڑھیاں بنی ہوئی ہوں بائین کہتے ہیں۔ بائین چار باغ کے سامنے بنائی گئی۔ اس بائیں کی کھدائی کا کام عین برسات کے موسم میں شروع کیا گیا۔ جس کی وجہ سے مٹی کئی مرتبہ گرگئی اور اس کے نیچے مزدور دب گئے۔ اسکی تکمیل اس مقدس جنگ کے بعد ہوئی جو رانا سانگاہ کے ساتھ ہوئی تھی۔ چنانچہ اس پر جو کتبہ نصب ہے اس میں اس امر کی جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ اس کی تکمیل اس مقدس جنگ کے بعد ہوئی تھی۔ یہ بہت عمدہ بائیں ہے اور تین منزلہ عمارت ہے۔ اس تین منزلہ عمارت میں وہ منزل جو سب سے نیچے ہے اس میں تین ایوان ہیں۔ اس میں جو زینے وراستے بنے ہوئے ہیں وہ کنویں تک پہنچتے ہیں۔ ان تینوں ایوانوں میں اس ایوان سے جو سب سے نیچے ہے پانی کھینچا جاتا ہے تو پانی ایک سیڑھی نیچے اُتر جاتا ہے۔ برسات کے موسم میں چونکہ پانی بڑھ جاتا ہے اسی لئے وہ بالائی ایوان تک پہنچ جاتا ہے۔ اس تین طبقہ عمارت کی درمیانی منزل میں کندہ کاری کی گئی ہے۔ اس ایوان پر ایک گنبد تعمیر ہے جس میں رہٹ لگا ہوا ہے اور یہ اسی گنبد میں گھومتا ہے۔ اس کی بالائی منزل میں بھی ایک ایوان ہے۔ صحن سے باہر کنویں سے پانچ چھ سیڑھیاں اُتر کر دو طرف سیڑھیاں ہیں جن سے راستہ ایوان کی طرف جاتا ہے۔ اس کی دائیں جانب سامنے سر در پر سنگ لوح نصب ہے جس پر تاریخ کندہ ہے۔ اسی کنویں کی بغل میں ہی دوسرا کنواں اس طرح اٹھایا گیا ہے کہ اس کی تہہ پہلے کنویں کی درمیانی سطح سے نسبتاً اونچی ہے۔ جس گنبد کا ذکر کیا گیا ہے اس کے نیچے بیل رہٹ چلاتے ہیں۔ جس کے باعث پہلے کنویں سے پانی دوسرے کنویں میں آتا ہے۔ دوسرے کنویں پر بھی رہٹ لگا ہوا ہے جس سے پانی فصیل کی بلندی تک پہنچتا ہے اور اس باغیچے میں پانی پہنچتا ہے جو بالائی منزل پر واقع ہے۔ کنوئیں کے اندر اس جگہ جہاں سیڑھیاں ختم ہوتی ہیں ایک سنگی عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ اس کنویں کے احاطے کے باہر سنگی مسجد بھی تعمیر کرائی گئی تھی۔ لیکن عمارت دیدہ زیب نہیں کیونکہ اس میں ہندستان طرز تعمیر کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ [132]

۱۲۸۔ آزارہ۔ فارسی لفظ ہے جسے ہندستان میں عام طور پر اجارہ کہا جاتا ہے۔ سید احمد دہلوی کے مطابق یہ عمارت کا وہ حصہ ہے جو تہ زمین سے طاق تک ہوتا ہے اور اس پر کمر لگا کر بیٹھتے ہیں (ج ا ص ۱۱۷) اس کی اونچائی فرش سے تین رسوا تین فٹ تک ہوتی ہے۔ (اصطلاحات پیشہ وران ج ا ص ۹۸)

۱۲۹۔ باغ گل افشاں۔ بابر نے جو باغ آگرہ میں دریائے جمنا کے مشرقی کنارے پر ترتیب دیا تھا۔ آج کل اس کا نام رام باغ ہے۔ جہانگیر کے زمانے میں اس کا نام بدل کر دل آرام باغ کر دیا گیا تھا جس کی بگڑی شکل رام باغ ہو گیا۔ رام ناتھ نے اس باغ کی تفصیل فراہم کی ہے۔ پانی جمنا سے رہٹ کے ذریعہ ایک ٹنکی میں ذخیرہ ہوتا تھا اور وہاں سے چار باغ کے ترتیب شدہ طبقوں میں جھرنوں اور نالیوں کے ذریعہ رواں ہو جاتا تھا (رام ناتھ، باغ گل افشاں اوف بابر ایٹ آگرہ، انڈو ایرانیکا، ج ۲۳، ۳، ۱۰۳۔ ۸) مولف کے سفر آگرہ میں یہ باغ اجڑی حالت میں ہے۔ کچھ کام و مرمت جاری تھی۔ تالاب و دالان قائم ہیں اور پرانی شان کی گواہی دیتے ہیں۔

باغ زرافشاں۔ اس باغ کے بھی کچھ اثرات آگرہ میں موجود ہیں۔ یہ بھی جمنا کے مشرقی کنارے پر اعتمادالدولہ کے مقبرے کے پاس ہے گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ میں اس کا ذکر کیا ہے (ص ۹۷۔ ۹۸) رام ناتھ نے اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ اس کے بیچ میں ایک چوبرج ہے۔ اس کے چاروں طرف پانی رواں تھا اور پانی لانے کا طریقہ وہی جو باغ گل افشاں میں بیان کیا گیا ہے۔ یہاں مقامی طور پر یہ بابر سے ہی منسوب ہے اور پاس کی ایک مسجد "بابری مسجد" کہلاتی ہے جو بار بار مرمت کے بعد اصلی شکل سے بالکل بدل چکی ہے۔ آجکل اس باغ کو چوبرج کہا جاتا ہے۔ بابر کے انتقال کے بعد اس کو اس چوبرج میں دفن کیا گیا۔ یہاں ایک باقاعدہ مقبرہ تھا۔ جس کی دیکھ بھال کے لئے پانچ لاکھ روپے کی جاگیر مقرر تھی اور ساٹھ حافظ تلاوت قرآن پاک کے لئے مقرر تھے۔ اینٹ بیورج کا یہ کہنا (ص ۷۰۹) کے بابر کو باغ دل آرام میں دفن کیا گیا تھا صحیح نہیں۔ ۱۵۳۹ اور ۱۵۴۵ کے بیچ میں بابر کی باقیات کو کابل منتقل کیا گیا (رام ناتھ، دی ٹومب اوف بابر ایٹ آگرہ، اسلامک کلچر، ۴۸: ۴۹۔ ۱۵۸)

ہمایوں کی فتوحات

جس وقت ہمایوں سوار ہوا اس وقت نصیر خاں نوحانی، معروف فرملی اور دیگر باغی امرا جاجمو میں جمع ہو کر وہاں خیمے لگائے ہوئے تھے۔ اس جگہ سے پندرہ کروہ پہلے پہنچ کر مومن آتکہ کو ہمایوں نے خبر لانے کے لئے بھیجا مگر اس نے وہاں مال کی خاطر یورش کر دی اور خبر بھی اطمینان بخش لے کر نہیں آیا۔ جب باغیوں کو دشمن کی آمد کا سُراغ ملا وہ تاب نہ لاسکے اور وہاں سے فرار ہو گئے۔ مومن آتکہ کے بعد قسمتائی کو بابا چہرہ اور بوجکہ کے ہمراہ معلومات کے لئے روانہ کیا گیا۔ یہ وہاں سے خبر لے کر آئے کہ دشمن سراسیمہ ہو کر فرار ہو گیا ہے۔ ہمایوں نے پیش قدمی کی اور جاجمو پر قبضہ کر لیا۔ وہاں سے گزر کر جس وقت وہ واپس آ رہا تھا تو اس کا گزر دلمئو کے نواح سے ہوا جہاں فتح خاں سروانی نے آ کر اس سے ملاقات کی (ورق ۲۷۷)۔ اس نے مہدی خواجہ اور محمد سلطان مرزا کو میری خدمت میں روانہ کیا۔

مرو پر عبید خاں کا حملہ

اسی سال عبید خاں نے بخارا سے مرو پر لشکر کشی کر دی۔ اس وقت مرو کے قلعے میں پندرہ لوگ رعیت کے موجود تھے۔ اس نے انہیں پکڑ کر قتل کر دیا چالیس پچاس دن کے دوران اس نے مرو پر بند بنا کر سرخس کی جانب رُخ کیا اس وقت سرخس میں چالیس قزلباش موجود تھے انہوں نے قلعے کا دروازہ بند کر دیا اور قلعہ اس کے حوالے نہ کیا۔ اہل رعیت نے تذبذب میں آ کر دروازہ کھول دیا۔ ازبک قلعے میں داخل ہو گئے اور انہوں نے ان قزلباشوں کو بھی قتل کر دیا۔ سرکس پر قبضہ کر کے وہ طوس کی جانب روانہ ہوئے اور مشہد پہنچ گئے۔ مشہد کے لوگوں کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ انہیں داخل ہونے دیں۔ ان کا طوس پر آٹھ ماہ قبضہ رہا۔ جسے انہوں نے صلح کے ذریعے واپس تو کر دیا مگر اپنے عہد کا پاس نہ کیا وہاں کے مردوں کو تو انہوں نے قتل کر دیا اور عورتوں کو قید کر لیا۔

اسی سال سلطان مظفر گجراتی کے لڑکے بہادر خاں نے جو اس وقت باپ کی جگہ گجرات کا بادشاہ ہے باپ سے رنجیدہ خاطر ہو کر سلطان ابراہیم کے پاس پناہ لی جس نے اس کے ساتھ بے عزتی کا سلوک کیا جس وقت میں پانی پت کے نواح میں تھا اس کی عرض داشت میرے پاس پہنچی۔ میں نے اسے عنایت آمیز و مشفقانہ فرامین بھیجے اور اسے اپنے پاس بُلا لیا۔ اس کا ارادہ تو تھا کہ میرے پاس آ جائے مگر بعد میں اس نے اسے بدل دیا۔ ابراہیم کے لشکر سے جدا ہو کر وہ گجرات کی جانب روانہ ہوا۔ اسی عرصہ میں اس کے باپ سلطان مظفر کا انتقال ہو گیا اور اس کا بڑا بھائی سکندر شاہ جو سلطان مظفر کا بڑا لڑکا بھی تھا اپنے باپ کی جگہ گجرات کا بادشاہ ہوا۔ اس کی بدسلوکی سے تنگ آ کر عماد الملک نامی اس کے ایک غلام نے ایک جماعت کو متفق کر کے سکندر شاہ کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ بہادر خان ابھی راستے میں ہی تھا انہوں نے اسے (بہادر خاں) آنے کی دعوت دی اور باپ کی جگہ اسے تخت سلطنت پر بٹھا دیا جس نے بہادر شاہ کا لقب اختیار کیا۔ بہادر شاہ نے ایک اچھا کام یہ کیا کہ عماد الملک کو اس کی نمک حرامی پر قتل کر کے اسے اس کے کیئے کی سزا دی اس کے علاوہ اس نے ان امرا کو بھی جو اس کے باپ کے زمانے سے چلے آ رہے تھے قتل کرا دیا۔ اس کے اس روّیے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت ہی سفاک اور گستاخ جوان ہے۔

۱۳۱۔ اندارا کنواں۔ بہت چوڑا کنواں جس میں پانی کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے۔

۱۳۲۔ بابر کی اس بائیں کی باقیات آگرہ کے قلعے میں پھانسی گھر کے تہہ خانے میں ہیں۔ بائیں جہانگیری اور شاہ جہانی محلات کے نیچے دب گئی ہے۔ بابر جس کتبے کا ذکر کرتا ہے اس کا نام ونشاں نہیں۔ ابراہیم لودھی کی مسجد کے اثرات اینٹوں اور گارے کے لیپ کے ہیں (رام ناتھ، ہسٹری اوف مغل آرکیٹکچر ج:۱، ص۱۰۲) آگرہ کے قلعہ میں دیوان عام کے سامنے جو باؤلی ہے وہ شاہ جہاں کی بنائی ہوئی ہے۔

واقعات ۹۳۳ھ

(۸ اکتوبر ۱۵۲۶ء - ۲۷ ستمبر ۱۵۲۷ء)

ماہ محرم ولادت کی خبر بیگ ویس لے کر آیا۔ اگر چہ اس سے قبل یہ خبر ایک پیادہ بھی لا چکا تھا مگر یہ خبر وہ چونکہ خود ہی سنانا چاہتا تھا۔ اس لئے خود میرے پاس آیا۔ یہ ولادت جمعرات تیس شوال کو ہوئی تھی۔ نو مولود کا نام فاروق رکھا گیا تھا۔

استاد علی قلی کی توپ

بیانہ [۱] اور اس کے قلعوں کے لئے جن کی تسخیر ابھی عمل میں نہیں آئی تھی۔ استاد علی قلی کو حکم دیا گیا کہ ایک بڑی توپ تیار کرے۔ اس نے بھٹی اور ڈھلائی کا کل سامان تیار کر کے میرے پاس آدمی بھیجا۔

پیر کے دن بتاریخ پچیس محرم میں وہ بھٹی دیکھنے کے لئے گیا۔ جس جگہ ڈھلائی کا کام ہونا تھا۔ وہاں اس نے آٹھ بھٹیاں لگا کر دیگر آلات تیار کر رکھے تھے۔ بھٹی کے نیچے سے سانچے تک اس نے نالیاں نکال رکھی تھیں۔ (ورق ۲۷۸) جیسے ہی ہم وہاں پہنچے اس نے بھٹیوں کے دہانے کھول دیئے۔ چنانچہ ہر نالی میں سے مال پانی کی طرح بہتا ہوا سانچوں میں جانے لگا۔ ابھی سانچے بھرے نہیں تھے کہ ان بھٹیوں میں سے ایک ایک کر کے مال کا بہنا بند ہونے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ بھٹیوں یا مال میں کوئی نقص رہ گیا ہو۔ استاد علی قلی کی عجب حالت تھی۔ قریب تھا کہ وہ سانچوں میں بھرے ہوئے تانبے میں چھلانگ لگا دے کہ میں نے اس کی دلداری کی خاطر اس کو خلعت پہنا کر شرمساری سے نجات دلائی۔ ایک دو دن بعد جب سانچے ٹھنڈے ہو گئے تو انہیں کھولا گیا۔ استاد علی قلی نے انتہائی مسرت کے ساتھ ایک آدمی کو میرے پاس بھیجا کہ توپ کی نال میں کوئی عیب نہیں۔ اس میں داروخانے کو آسانی سے رکھا جا سکتا ہے۔ اس نے نال کو سانچے میں سے نکالا اور کچھ لوگوں کو اس کام پر لگایا کہ وہ اس کی صفائی کریں اور خود داروخانے کو نال میں لگانے میں لگ گیا۔

مہدی خواجہ، فتح خاں سروانی کو ساتھ لے کر ہمایوں کے پاس سے میری خدمت میں حاضر ہوا وہ ہمایوں سے دلماؤ پر علیحدہ ہو کر میرے پاس آیا تھا۔ فتح خاں پر میری خاص چشم عنایت رہی اور اس کے والد اعظم ہمایوں کے پرگنات میں نے اسے عطا کر دئے۔ اس کے علاوہ بھی اسے ایسی مزید ولایات سے نوازہ گیا جن کی آمدنی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ٹنکہ تھی۔

خطابات

ہندوستان میں امرا کے ساتھ نہایت عمدہ سلوک یہ ہے کہ ان کو خطابات دینے کا رواج ہے ان خطابوں میں سے ایک اعظم ہمایوں ہے، دوسرا خان جہاں اور تیسرا خان خاناں۔ فتح خاں کے باپ کا خطاب اعظم ہمایوں تھا۔ ہمایوں کے ہوتے ہوئے اس خطاب سے کسی اور شخص کو مخاطب کرنا کیسے مناسب ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس خطاب کو موقوف کر کے اسے خانجہاں کے خطاب سے نوازا۔

بدھ کے دن بتاریخ آٹھ ماہ صفر حوض کے کنارے املی کے درختوں سے ذرا اوپر شامیانہ نصب کرا کے وہاں محفل بادہ پیمائی ترتیب دی گئی۔ فتح خاں سروانی کو بھی اس محفل میں شریک کیا گیا۔ دعوت بادہ پیمائی کے ساتھ میں نے اسے دستار اور سرو پا سے نوازہ جسے میں پہن چکا تھا۔ ان عنایات اور الطاف سے سرافراز کر کے اسے اس

نوٹ: اس باب کے اوراق کے نمبر شمار الٹ سلٹ ہیں۔ مضمون کا تسلسل قائم رکھا گیا ہے۔

۱۔ بیانہ۔ آگرہ سے جنوب مغرب میں ہے۔ فتح پور سیکری سے اس کا راستہ ہے۔ اس کا قلعہ بادل گڑھ ہے۔

کی ولایت کی جانب جانے کی رخصت دے دی گئی۔ اور یہ قرار پایا کہ اس کا لڑکا محمود خاں ہمیشہ میری خدمت میں حاضر رہے۔

بیانہ کی پسپائی

بدھ کے دن بتاریخ چوبیس محرم، محمد علی حیدر رکابدار کو ہمایوں کے پاس نہایت تاکید کے ساتھ یہ مژدہ لے کر روانہ کیا کہ پورب [2] کے باغی فرار ہو گئے ہیں۔ جیسے ہی یہ شخص تیرے پاس پہنچے جونپور میں چند مناسب امیروں کو متعین کر کے اور لشکر کو ہمراہ لے کر جلدی ہی ہمارے پاس پہنچ جائے۔ کیونکہ رانا سانگاہ [3] کافر اپنی طاقت کے ساتھ کافی نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اس کے بارے میں ہمیں پہلے فکر کرنی چاہئے۔ پورب کی طرف لشکر روانہ کر کے قوچ بیگ کے فرزند تردی بیگ، اس کے چھوٹے بھائی شیر افگن، محمد خلیل آختہ بیگی (۴) برادران اور اسکے کارندوں کے ساتھ رستم ترکمان (ورق ۲۷۹) مع برادران اور راؤ روی سروانی کو دیگر ہندوستانی امرا کے ساتھ اس امر کے لئے مقرر کیا گیا کہ وہ بیانہ کے نواح میں پہنچ کر ان لوگوں کو جو قلعے کے اندر ہیں وعدہ وعید اور ترکیب کے ذریعے باہر نکالیں اور اگر یہ ممکن نہ ہو سکے تو دشمن کو ناتواں کر دیں۔ بیانہ کے نظام خاں کے ایک بڑے بھائی عالم خاں جو قلعہ تہنگوھ [5] میں تھا، کے آدمی کئی مرتبہ حاضر خدمت ہوئے اور انہوں نے اطاعت و بندگی، نیز میری خیر خواہی قبول کرنے کی درخواست کی۔ خود عالم خاں نے بھی یہ قول دیا کہ اگر بادشاہ کی جانب سے فوج مقرر کی جائے تو وہ بیانہ کے تمام ترکش بند جوانوں کو وعدہ و وعید اور ترغیب کے ذریعے قلعہ بیانہ سے باہر نکال کر قلعے پر قبضہ کر لے گا۔ یہ سوچتے ہوئے تردی بیگ کی ہمراہی میں یلغار کے لئے متعین جوانوں کو یہ فرمان دیا گیا کہ عالم خاں مقامی زمیندار نے بندگی و فرمانبرداری کو قبول کر لیا ہے۔ وہ بیانہ کی فلاح و بہبود جس امر میں دیکھیں اس کے مطابق عمل کریں۔ ہندستان کے لوگوں میں اگرچہ بعض لوگ تلوار کے دھنی ہیں۔ مگر ان میں سے بیشتر آداب سپاہگری، [6] استقامت و پائیداری، کشت کشتار اور سرداری سے بے بہرہ و نابلد ہیں۔ یہ عالم خاں بھی کسی کی بات پر غور و فکر نہیں کرتا اور کسی کام کے اچھے اور برے پہلو کو مدنظر نہیں رکھتا وہ ہمارے یلغاری دستے کو اپنے ساتھ لے کر بیانہ کے قریب پہنچ گیا اس میں تقریباً ڈھائی تین سو ترک اور دو ہزار سے کچھ زیادہ ہندوستانی نیز اطراف و نواح کے آدمی شامل تھے۔ نظام خاں کے افغانوں اور سپاہ بیانہ کی تعداد چار ہزار سواروں سے زیادہ تھی۔ اس کی پیادہ فوج بھی دس ہزار سے زیادہ افراد پر مشتمل تھی۔ نظام خاں نے ہماری محدود تعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پر اچانک حملہ کر دیا۔ چونکہ وہ لوگ تعداد میں کثیر تھے اور حملہ بھی ایک دم گھوڑوں سے کیا گیا تھا اسی لئے انہوں نے یلغاری دستے کو پسپا کر کے فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے عالم خاں تہنگو کو بھی اس کے گھوڑے پر سے اتار دیا۔ پانچ چھ آدمی بھی گرفتار کر لئے اور کچھ ساز و سامان بھی اپنے ہمراہ لے کر چلے گئے۔ ان کی اس حرکت کے باوجود اس کے ساتھ جو وعدے اور دلجوئی کے لئے اقدامات کیے گئے ان کے پیش نظر اس کے سابق جرائم کو معاف کر کے اس کے نام فرامین جاری کر دئے گئے۔

جیسے ہی رانا سانگاہ کافر کے آنے کی خبر تیزی سے پھیلنے لگی تو نظام خاں کے لئے کوئی چارہ نہ رہا چنانچہ اس نے سید رفیع کو بلایا اور اس کے ذریعے قلعہ ہمارے آدمیوں کے حوالے کر کے میری خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل کیا۔ میں نے دوآب کے درمیان اسے وہ پرگنہ عنایت کیا جس کی آمدنی بیس لاکھ تھی۔ دوست ایشک آغا کو بیانہ کی جانب عارضی طور پر روانہ کیا گیا اس کے چند روز بعد یہ علاقہ مہدی خواجہ کی تحویل میں دے دیا گیا ستر لاکھ کی رقم اس کی تنخواہ مقرر کر کے اسے بیانہ کی جانب جانے کی اجازت دی گئی۔

۲۔ پورب۔ مشرق

۳۔ رانا سانگاہ۔ اس کا اصل نام رانا سنگرام سنگھ تھا۔ چتوڑ کے تخت پر ۱۵۰۹/۹۱۰ میں حاکم ہوا (بیلا بنالیہ، ادے پور ص ۶۵) یہ اب ادے پور کے نام سے معروف ہے۔

۴۔ آختہ بیگی۔ اس محکمے کا کام خصی کرنا تھا (فرہنگ آصفیہ ج اص ۱۴۴)

۵۔ تہنگوھ۔ یہ قرولی راجپوتانہ میں ہے (اینٹ بیورج ص ۵۳۸ نوٹ ۲)

۶۔ آداب سپاہ گری۔ جنیوا کنونشن سے پہلے بھی جنگ کے دوران جزا، سزا کے اصول مقرر تھے۔

رحیم داد کا گوالیار پر قبضہ

تاتار خاں سارنگ خانی (ورق ۲۸۰) اس وقت گوالیار میں تھا۔ اس کا آدمی مسلسل آتا اور اور اطاعت وبندگی کے ساتھ میری حکومت سے خیر خواہی کا اظہار کرتا۔ کندار پر قبضہ کر لینے کے بعد جب کا فربیانہ کے نزدیک پہنچا تو اس وقت گوالیار کے راجگان میں سے راجہ دھرم کنت اور خان جہاں نامی کافر نے گوالیر کے نواح میں پہنچ کر اس قلعے پر قبضہ کرنے کی غرض سے فتنہ انگیزی شروع کردی۔ تاتار خاں نزدیک تھا کہ تنگ آکر گوالیار ترک کردے۔ اس وقت ہمارے امرا، مقربین اور لشکر کے عمدہ جوان ہر طرف لشکر کشی میں لگے ہوئے تھے۔ اس عرصے رحیم داد نے ایک دستہ تیار کیا جو بھیرہ اور لاہور کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ [7] ان کے ساتھ اس نے ہستی چی تنقتار اور اس کے بھائیوں کو بھی شامل کرلیا۔ مزکورہ دستے کو پرگنہ گوالیار عطا کر کے اس طرف روانہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی ملا اپاق اور شیخ گھورن کو بھی بھیجا گیا تاکہ وہ رحیم داد کی دلجمعی کر کے واپس آجائیں۔ یہ لوگ جیسے ہی گوالیار کے نزدیک پہنچے تاتار خاں کی نیت بدل گئی۔ اس نے ان کو قلعے کے اندر بازیابی کی اجازت نہیں دی۔ اس اثنا میں محمد غوث نامی [8] درویش نے جو ذکر حق میں مشغول رہتے ہیں اور جن کے بہت سے مرید ومصاحب بھی ہیں قلعہ گوالیار کے اندر سے رحیم داد کے پاس پیغام بھیجا کہ جس طرح ممکن ہو قلعے میں داخل ہو جاؤ کہ اس شخص (تاتار خاں) کا خیال بدل گیا ہے یہ سن کر رحیم داد نے تاتار خاں کے پاس آدمی بھیجا کہ باہر کافروں سے خطرہ ہے چند آدمیوں کو لے کر قلعے میں داخل ہونے دو باقی لوگ باہر رہیں گے۔ جب اس سے بہت زیادہ اصرار کیا گیا تو وہ اس اقدام کے لئے راضی ہوگیا۔ چنانچہ وہ چند لوگوں کے ساتھ قلعے میں داخل ہوگیا۔ اور کہا کہ دروازے کے باہر میرے پہرے دار رہنے دو۔ اس بناپر اس نے ہاتھی پول [9] پر آدمی مقرر کئے۔ اور اس رات دروازے سے اپنے آدمی قلعے کے اندر داخل کردئے۔ اگلے روز صبح تاتار خاں بالکل بے دست وپا تھا اور چار و ناچار اس نے قلعہ خالی کردیا۔ وہاں سے نکل کر اس نے آگرہ کی جانب رخ کیا اور میری خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کی استقامت وپائداری کے لئے بیس لاکھ کی آمدنی کا پرگنہ بیاوان [10] اسے عطا کیا گیا۔

دھولپور

محمد زیتون کے لئے بھی اب کوئی چارہ نہ تھا۔ دھولپور کو ترک کر کے وہ بھی میری خدمت میں حاضر ہوا۔ اسے بھی چند لاکھ سکوں کا پرگنہ عطا کیا گیا۔ اور دھول پور کو علاقہ خالصہ [11] میں شامل کرلیا گیا۔ جس کا شقدار ابوالفتح ترکمان کو مقرر کر کے اسے دھولپور کی جانب جانے کی اجازت دی گئی۔

حصار فیروز

حصار فیروزہ کے گردونواح میں حمید خاں سارنگ خانی، چند پنّی افغانوں [12] اور دیگر افغانوں نے تین چار ہزار آدمیوں کے فوج تیار کرلی اور شورش وفتنہ انگیزی پر آمادہ ہوگئے۔ بتاریخ پندرہ ماہ صفر بدھ کے دن چین تیمور سلطان، احمدی پروانچی، ابوالفتح ترکمان، ملک داد کرارانی اور مجاہد ملتانی کو ان افغانوں کا سدباب کرنے کے لئے روانہ کیا گیا۔ ان لوگوں نے اس طرف کا رخ کر کے دور سے ہی ان پر یورش کردی۔ اور ان افغانوں کو اچھی طرح زیر کرلیا۔ بہت سے لوگوں کو قتل کر کے ان کے سر ہمارے پاس بھیجے گئے۔

سفارت عراق عجمی

خواجگی اسد کو شاہزادہ طہماسپ (صفوی) کے پاس ایلچی گیری کے لئے عراق (عجم) کی جانب روانہ کیا گیا تھا۔ ماہ صفر کے آخر میں وہ سلیمان نامی ترکمان کے ہمراہ بہت سے تحائف لے کر حاضر ہوا۔ جن میں دو چرکس کنیزیں [13] بھی شامل تھیں۔ (ورق ۲۸۱)

۷۔ رحیم داد کے چچا خواجہ مہدی حاکم لاہور تھے (فضل علی، کلیات گوالیاری ص ۴۰)

۸۔ شیخ محمد غوث گوالیاری۔ شطاری سلسلہ صوفیہ کے عظیم ترین بزرگ ہیں۔ آپ ۱۵۰۲/۹۰۷ کو غازی پور یو پی میں پیدا ہوئے۔ بابر، ہمایوں اور اکبر سے آپ کے قریبی تعلقات تھے۔ آپ کا مزار گوالیار میں اکبر کے حکم کے تحت ہی تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ عمدہ عمارت ہے۔ آپ کی کئی تصانیف بھی معلوم ہیں۔ آپ کا انتقال ۱۵۶۲/۹۷۰ میں ہوا۔ (فضل علی کلیات گوالیاری ص ۴۱، شیخ محمد اکرم رود کوثر ص ۴۷) شیخ کو موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ یہ اتفاقی امر نہیں کہ تان سین آپ کے مزار کے احاطے میں ہی دفن ہے۔

۹۔ ہاتھی پول قلعہ گوالیار کے ایک پھاٹک کا نام جو آج بھی قائم ہے۔

۱۰۔ بیاوان۔ صوبہ آگرہ کا ایک علاقہ

۱۱۔ علاقہ خالصہ یا مال خالصہ۔ وہ سرکاری ملک یا زمین جس میں بادشاہ کے علاوہ کسی کا حق نہ ہو (فرہنگ آصفیہ ج ۲ ص ۷۷۱)

۱۲۔ پنی افغان۔ افغانوں کا یہ قبیلہ پنی یا پنری زیادہ تر بی بلوچستان میں آباد ہے (ہارون رشید ہسٹری اوف پٹھانس، ج ۱ ص ۱۹)

۱۳۔ چرکسی کنیزیں۔ چرکس کی رہنے والی۔ چرکس کا علاقہ بحیرہ قزوین (کیسپین) اور بحر اسود کے شمالی حصے کو کہتے ہیں۔

زہر خوارنی

بتاریخ ۱۶ ربیع الاول بروز جمعہ عجیب واقعہ پیش آیا۔ جس کا ذکر اس مکتوب میں مفصل کیا گیا ہے جو کابل روانہ کیا گیا تھا۔ اور یہی خط یہاں بے کم وکاست بیان کیا جارہا ہے۔

بروز جمعہ بتاریخ سولہ ربیع الاول ۹۳۳ ھجری ایک عظیم واقعہ پیش آیا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ ابراہیم کی بدبخت جاہل گنوار ماں نے کہیں سن لیا کہ میں ہندستان کے لوگوں کے ہاتھ کا کھانا کھانے لگا ہوں اس قصے کی حقیقت یہ ہے کہ اب سے تین چار مہینے پہلے تک میں نے ہندوستان کے کھانے دیکھے تک نہیں تھے۔ میں نے کہا کہ ابراہیم کے باورچیوں کو پیش کیا جائے۔۔ پچاس ساٹھ باورچی لائے گئے۔ جن میں سے میں نے چار آدمیوں کو روک لیا۔ جس کی بھنک بوا (ابراہیم کی ماں) کو لگ گئی اس نے احمد چاشنی گیر کو ایک آدمی بھیج کر اٹاوہ سے بلایا (ہندوستان میں خانساماں کو چاشنی گیر کہتے ہیں) اور ایک بڑھیا کے ہاتھ چار تہہ کی پڑیا بنا کر تولہ بھر زہر (جو دو مثقال سے ذرا زیادہ ہوتا ہے) احمد چاشنی گیر کو بھجوا دیا۔ احمد نے وہ پڑیا اس شخص کے حوالے کر دی جو ہمارے گھر میں باورچی تھا اور اس سے یہ وعدہ کیا کہ اگر وہ کسی طرح اسے کھانے میں ملا دے تو اسے چار پرگنے دے گی۔ جس بڑھیا کے ہاتھ زہر کی پڑیا احمد کو بھیجی گئی تھی اس کے پیچھے اس نے دوسرے بڑھیا کو روانہ کیا تاکہ یہ دیکھ لے کہ اس نے زہر پہنچایا کہ نہیں۔ خیر یہ گزری کہ اس نے زہر دیگ میں نہیں ڈالا بلکہ اسے طباق میں ڈال دیا دیگ میں نہ ڈالنے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے بکاولوں کو سخت تاکید کر دی تھی کہ وہ ہندوستانی باورچیوں کے پاس موجود رہیں۔ اور جس وقت کھانا پک رہا ہو وہ اسے چکھتے رہیں۔ جس وقت کھانا دسترخوان پر لگایا جارہا تھا ہمارے بدنصیب خانساماں ان کی طرف سے غافل ہو گئے۔ اس نے چینی کی رکابی پر چپاتی رکھ کر اس پر زہر جو پڑیا میں تھا آدھے سے کم چھڑک دیا اور زہر کے اوپر اس نے روغن کی تہہ لگا دی وہ قلیے پر یا دیگ میں زہر چھڑک دیتا تو بہت برا ہوتا۔ گھبرا کر اس نے آدھے سے زیادہ زہر چولہے میں جھونک دیا۔

بروز جمعہ نماز ظہر کے بعد دسترخوان لگایا گیا، میں نے خرگوش کا گوشت بہت رغبت سے کھایا۔ گاجر کا سالن خوب کھایا کسی بھی کھانے کا ذائقہ ناگوار نہ تھا۔ خشک گوشت کے بھی ایک دو لقمے لئے۔ جس وقت میں خشک گوشت کھا رہا تھا تو مجھے ایک لقمہ بدمزہ محسوس ہوا۔ میرا جی متلایا پھر مجھے دوبارہ متلی ہوئی۔ اس کے بعد دسترخوان پر بیٹھے بیٹھے ہی دو تین مرتبہ میرا جی متلایا۔ قریب تھا کہ قے کر دوں۔ لیکن قے نہیں ہوئی تو اپنی جگہ پر سے اٹھا اور آبدست خانے کی طرف رخ کیا۔ راستے میں ایک بار پھر مجھے محسوس ہوا کہ قے ہو جائے گی۔ آبدست خانے کے سامنے پہنچ کر (ورق ۳۰۴) میں نے بہت زیادہ قے کی۔ مجھے کھانے کے بعد کبھی قے نہیں ہوئی تھی۔ شراب نوشی کے بعد بھی کبھی قے نہیں ہوئی۔ میرے دل میں شک گزرا۔ میں نے باورچی کو روک لیا اور حکم دیا کہ یہ غذا کتے کو کھلائی جائے اور اس پر نظر رکھیں۔ اگلے دن صبح ایک پہر کے نزدیک کتے کا حال ابتر ہونے لگا۔ اور اس کا پیٹ پھول گیا۔ اس کا حال ایسا خراب ہوا کہ پتھر مار مار کر ہر چند اسے بھگانا چاہا اور اسے اپنی جگہ سے ہٹانے کی کوشش بھی کی مگر وہ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہل سکا۔ نصف روز تک اس کی یہی کیفیت رہی۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مرا نہیں۔ ایک دو چھوکروں نے بھی وہ کھانا کھایا تھا۔ اگلے روز انہوں نے بھی بہت زیادہ قے کی۔ ایک کی حالت تو بہت ہی زیادہ خراب ہوئی۔ مگر آخر مصیبت سے سب نجات پا گئے۔

رسیدہ بود بلائی ولی گذشت
(بلا تو آئی تھی مگر خیر سے گذر گئی)

اللہ تعالیٰ نے مجھے نئی زندگی عطا کی۔ گویا ماں کی کوکھ سے نیا جنم لیا تھا۔

من خستہ مردہ بودم، زندہ شدم
قدر جان را باللہ حالا دانستم

(میں بے چارہ تو مر چکا تھا۔ پھر سے زندہ ہو گیا۔ خدا کی قسم جان کی قدر میں نے اب جانی۔)

میں نے سلطان محمد بخشی کو حکم دیا کہ وہ باورچی پر نظر رکھے۔ جب اس کو اذیت دی گئی تو اس نے ایک ایک کر کے تمام واقعات کی قلعی کھول دی جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

پیر کے دن میں نے دیوان اور اکابر و اشراف اور امرا اور وزرا کو حکم دیا کہ حاضر دیوان رہیں۔ ان دو مردوں اور دونوں عورتوں کو روبرو لا کر ان سے باز پرس کریں۔ جب ان پر سختی کی گئی تو انہوں نے ہر بات تفصیل سے بیان کر دی۔ اس خانساماں کی میں نے تکہ بوٹی کرادی۔ باورچی کے لئے یہ حکم دیا کہ زندہ اس کی کھال اتار لیں۔

ان عورتوں میں سے ایک کو میں نے ہاتھی کے پیروں تلے روندوا دیا اور دوسری کے لئے یہ حکم صادر کیا کہ اس کو گولی ماردیں۔ بوا کے لئے یہ ہدایت دی کہ اس کی نگرانی کریں۔ کیونکہ جو فعل اس سے سرزد ہوا ہے۔ اسے اس کے کئے کی سزا ملے گی۔

بروز ہفتہ میں نے دودھ سے بھرا ایک پیالہ پیا۔

بروز اتوار میں نے دودھ میں گل مختوم [14] حل کر کے پیا۔

بروز پیر میں نے دودھ میں گل مختوم اور میں تریاق فاروق [15] کی آمیزش کی اور اسے پیا۔ دودھ نے میرے جسم میں بڑی کاوش کی۔ ہفتے کے دن میں نے پہلے دن کی طرح قے کی جس میں صفرہ جیسا سیاہ سوختہ مادہ خارج ہوا۔ شکر ہے کہ کوئی اور نقصان نہیں ہوا جان ایسی عزیز چیز ہے اس کی قدر میں نہیں جانتا تھا۔

مردن می رسد او قدر جان می داند

(جب کوئی شخص مرنے کی حالت کو پہنچ جاتا ہے وہ جان کی قدر جانتا ہے)

جس وقت بھی یہ ہولناک واقعہ میرے ذہن سے گزرتا ہے تو میری کیفیت خود ہی متغیر ہو جاتی ہے۔ یہ خدا کی عنایت تھی کہ اس نے از سر نو زندگی عطا کی۔ اس نعمت کا شکر میں کس زبان سے ادا کر سکتا ہوں۔

اس خیال کے پیش نظر کہ لوگوں کے دلوں میں تردد وسواس پیدا نہ ہو میں نے جو واقعہ پیش آیا تھا پوری تفصیل سے لکھ دیا ہے۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس کو بیان کرنے کو زبان و بیان قاصر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مجھے ابھی کچھ دن اور دیکھنے تھے۔ اسی لئے ہر چیز بخیر و خوبی گزر گئی چنانچہ اب لوگ اپنے دلوں میں کسی قسم کے تردّد و وسواس کو جگہ نہ دیں۔

یہ واقعہ بتاریخ بیس ربیع الاوّل جمعہ میں چہار باغ میں تھا وقوع پزیر ہوا۔ (ورق ۲۸۵) اس کام کو انجام دینے کے بعد یہ خط لکھا گیا اور اسے کابل روانہ کیا گیا۔

اس عظیم جرم کی مرتکب چونکہ بد بخت بوا ہوئی تھی اس لئے اس کو یونس علی اور خواجگی اسد کی حراست میں دیدیا گیا اور اس کے نقد و جنس اور غلام و کنیز کو ضبط کر لیا گیا اسے عبدالرحیم شقاول کے سپرد کر دیا گیا کہ اس کی سخت نگرانی کرے۔ بوا کے پوتے یعنی ابراہیم کے لڑکے کو بہت عزت و احترام کے ساتھ رکھا جا رہا تھا۔ جب اس قسم کا کام اس طبقے کی جانب سے کیا گیا تو ابراہیم کے لڑکے کو وہاں رکھنا قرین مصلحت نہ سمجھا گیا۔ کامران کی جانب سے ملّا سرسانی بعض اہم امور کے لئے آیا ہوا تھا۔ جمعرات کے دن بتاریخ نو ربیع الاوّل اسے (ابراہیم کے لڑکے کو) اس کے حوالے کر دیا گیا کہ وہ اسے کامران کے پاس لے جائے

باغیوں کی سرکوبی کے لئے ہمایوں پورب کی جانب گیا ہوا تھا۔ جونپور کو فتح کرنے کے بعد اس نے نصیر

۱۴۔ گل مختوم۔ چکنی مٹی جس کی ہر ٹکیہ پر کارخانے کی مہر لگائی جاتی ہے۔

۱۵: تریاق فاروق۔ ایک مرکب دوا جس میں شہد اور افیون بھی شامل کرتے ہیں۔ یہ زہر مہرہ کا کام دیتی

خاں کی سرکوبی کے لئے غازی پور کی جانب رخ کیا۔ وہاں کے افغانوں کو اس کی آمد کا علم ہو گیا۔ چنانچہ وہ دریائے سرو[16] کے اس پار چلے گئے۔ لشکر کے لوگ خرید[17] کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد واپس آ گئے۔ ہمایوں نے میرے کہنے کے مطابق شاہ میر حسین اور سلطان جنید کو عمدہ جوانوں کے ایک دستے کے ہمراہ جونپور میں معہ قاضی جیہ متعین کیا گیا۔ شیخ بایزید کا تقرر اودھ میں عمل پذیر ہوا۔ ان مہمات پر قابو پانے اور سرانجام دینے کے بعد اس نے کڑہ مانکپور کے نواح سے دریائے گنگا کو پار کیا اور براہ کالپی روانہ ہوا۔ اس وقت جلال خاں جگہت کا لڑکا عالم خاں کالپی میں تھا۔ اس نے ایک آدمی اس کے پاس بھیجا۔ جو اس کے دل سے خوف و ہراس دور کر کے اسے اپنے ساتھ لایا۔ اتوار کے دن بتاریخ تین ربیع الاوّل باغ ہشت بہشت[18] میں ہمایوں حاضر ہوا اور خدمت بجا لایا۔ اسی دن خواجہ دوست خاوند بھی کابل سے وہاں پہنچا۔

حسن خاں کی عیاری

انہی دنوں میں مہدی خواجہ کے آدمی پے در پے آنے شروع ہو گئے اور بتایا کہ رانا کی آمد تحقیق شدہ امر ہے۔ حسن خاں میواتی بھی اس کے ہمراہ آ رہا ہے۔ اس کا سدباب بنیادی محور پر کیا جانا چاہئے۔ لشکر کے آنے سے قبل اگر ایک دستہ بطور کمک بیانہ پہنچ جائے تو یہ مناسب ہو گا اس سے پہلے کہ لشکر کو سوار کرنے کا عزم کیا جائے محمد سلطان مرزا، یونس علی، شاہ منصور برلاس، کتہ بیگ، اور بوچکہ کو بیانہ کی جانب بطور یلغار روانہ کیا گیا۔ حسن خاں میواتی کا ناہر خان نامی لڑکا ابراہیم کے ساتھ جنگ میں گرفتار ہوا تھا۔ وہ ہمارے پاس بطور یرغمال محفوظ تھا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ اس کا باپ حسن خاں مسلسل اپنی آمد و رفت برقرار رکھے ہوئے تھا اور لگا تار اپنے لڑکے کو واپس کرنے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال گزرا کہ اگر حسن خاں کی دلجوئی کے لئے اس کے لڑکے کو اس کے پاس بھیج دیا جائے تو وہ شکر گزار ہو کر پہلے سے کہیں زیادہ بہتر خدمت انجام دے گا چنانچہ حسن خاں کے لڑکے ناہر خاں کو خلعت پہنا کر وعدہ وعید کے ساتھ اس کے باپ کی جانب جانے کے لئے رخصت کیا گیا۔ یہ بدبخت آدمی اپنے بیٹے کی رہائی کا ہی منتظر تھا۔ اسے جیسے ہی بیٹے کے رہا ہونے خبر ملی (ورق ۲۹۳) اس سے پہلے کہ اس کا بیٹا الور پہنچے وہ رانا سانگا کے ہمراہ ہو گیا۔ اس کے لڑکے کو ایسے وقت میں رہا کر کے رخصت کی اجازت دینا اس قیاس کے منافی تھا جو لگایا گیا تھا۔

انہی دنوں بارش بکثرت ہوئی۔ جس کے پیش نظر بزم آرائی کا اہتمام کیا گیا۔ ان محافل میں ہمایوں بھی شریک رہتا۔ اگرچہ وہ متنفر تھا لیکن ان چند دنوں وہ بھی مرتکب ہوا۔

بلخ پر ازبکوں کا قبضہ

اس عرصے کے دوران عجیب واقعات رونما ہوئے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہمایوں جس وقت قلعہ ظفر سے ہندوستان کے لشکر کی جانب آ رہا تھا راستے میں ملا بابا پشاغری اور اس کا برادر خورد بابا شیخ فرار ہو کر کیتین قرا سلطان کے پاس چلے گئے۔ بلخ کے لوگ چونکہ کمزور تھے اس لئے اس پر کیتین قرا سلطان کا قبضہ ہو گیا ملا بابا نکلے اور اس کے برادر خورد نے اس طرف کے اہم امور کی ذمہ داری اپنے سر لے لی چنانچہ وہ ایبک، خرم اور سار باغ کے نواح میں پہنچ گئے۔ ان کے بلخ میں داخل ہونے کے باعث شاہ سکندر بے دست و پا ہو کر رہ گیا اور قلعہ غوری ازبکوں کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ ملا بابا اور بابا شیخ چند ازبکوں کے ساتھ لے کر قلعے میں داخلہ ہوئے

چونکہ میر ہمہ کا قلعہ بھی نزدیک ہی تھا اس لئے اس نے بھی لاچار ہو کر اسے ازبکوں کے حوالے کر دیا۔ چند روز بعد میر ہمہ نے بربنائے مصلحت اپنے دستے کے ہمراہ وہاں سے کوچ کیا۔ جس کے بعد بابا شیخ چند ازبکوں کو ساتھ لے کر اس کے قلعے میں داخل ہو گیا میر ہمہ نے بابا شیخ کو اپنے قلعے میں جگہ دی اور دوسروں کے لئے بھی

16۔ دریائے سرو۔ دریائے سرجو (گھاگرا)

17۔ خرید۔ آئین اکبری کے مطابق یہ جونپور شالی میں واقع ہے (ج ۲ص ۱۶۴) جو بنارس کے شمال مغرب میں ہے۔

18۔ باغ ہشت بہشت۔ آگرہ میں بابر کا ایک باغ۔ اس کا نام بعد میں باغ زرافشاں بھی تھا۔ بابر کے انتقال کے بعد اس کو یہاں ہی دفن کیا گیا۔ یہ باغ دریا جمنا کے بائیں کنارے پر مقبرہ اعتماد الدولہ کے پاس ہے اس کے آثارات میں سے ایک چوبرجی عمارت موجود ہے۔ (رام ناتھ۔ دی ٹومب اوف بابرا یٹ آگرہ۔ (اسلامک کلچر ۱۹۷۴:۴۸، ۱۴۹۔۱۵۸)

جہاں کہیں ممکن ہو سکا قیام گاہ مقرر کر دی۔ میر ہمہ نے موقع پا کر بابا شیخ پر تلوار سے وار کیا اور اس کے چند ساتھیوں کو قید کر لیا۔ اس نے تنگری بردی کے طرف قندوز میں اپنا قاصد دوڑایا۔ جس نے یار علی اور عبدالطیف کو چند جوانوں کے ہمراہ روانہ کر دیا۔ جب وہ وہاں پہنچے تو ملا بابا اور اس کے ازبک ساتھیوں کے ساتھ قلعہ میر ہمہ میں داخل ہوئے اور چاہا کہ جنگ کریں مگر اس مقصد میں انہیں کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ اب انہوں نے تنگری بردی کے لوگوں کو ساتھ لیا اور قندوز کی جانب روانہ ہو گئے۔ بابا شیخ کا زخم چونکہ بہت زیادہ فاسد ہو چکا تھا اسی لئے میر ہمہ نے اس کا سر کاٹ لیا اور انہی دنوں میں وہ اسے وہاں سے لے کر میرے پاس پہنچا۔ میں نے اسے عنایات و نوازشات سے سرفراز کر کے اسے اس کے ہم مرتبہ لوگوں سے مشخص و ممتاز کیا۔ جس وقت باقی شغاول روانہ ہو رہا تھا تو میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ ان دونوں بدبختوں کا سر کاٹ کر لائے تو ہر سر کے عوض اسے ایک سیر سونا دیا جائے گا۔ چنانچہ اپنے اس وعدے کے مطابق میں نے ایک سیر سونا میر ہمہ کو عطا کیا۔

اس عرصے کے دوران بیانہ کی جانب قسمتی یلغار کی غرض سے گیا ہوا تھا۔ وہ بھی اپنے ساتھ چند سر کاٹ کر لایا۔ جس وقت وہ قسمتی بوچکہ اور دیگر جوانوں کے ساتھ جاسوسی کے لئے گیا ہوا تھا اس نے کفار کے دو گشتی دستوں کو زیر کر کے ان میں سے ستر اسی آدمیوں کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لایا۔ قسمتی اپنے ساتھ یہ تحقیق شدہ خبر بھی لے کر آیا کہ (حسن خاں) میواتی اور رانا ایک ساتھ مل گئے ہیں۔

اتوار کے دن مہینے کی آٹھ تاریخ کو میں وہ بڑی توپ دیکھنے کے لئے روانہ ہوا جس کے لئے استاد علی قلی نے گولے ڈھال کر تیار کئے تھے۔ اور ڈھلائی کے بعد یہ ہر اعتبار سے مکمل تھے۔ اس کے بعد اس نے ان میں بارود رکھنے کی جگہ ڈھال کر بنائی۔ گولہ اندازی کے وقت میں بطور تفریح وہاں پہنچا ظہر کے وقت میں نے گولہ اندازی دیکھی۔ توپ نے ایک ہزار چھ سو قدم کے فاصلے تک وار کیا (ورق ۲۹۴) جس کے صلے میں استاد کو کمر خنجر، خلعت اور تپچاق گھوڑا اعنایت کیا گیا۔

رانا سانگاہ کی طرف

پیر بتاریخ نو جمادی الاوّل میں نے کفار کے ساتھ جنگ کے ارادے سے سفر اختیار کیا اور شہر کے محلات سے نکل کر میدان میں پڑاؤ لگایا۔ لشکر کو جمع کرنے اور اسے مرتب کرنے کے لئے ہم یہاں تین چار دن مقیم رہے۔ چونکہ مجھے ہندستان کے لوگوں پر زیادہ اعتماد نہ تھا اس لئے ہندستان کے امرا کو میں نے ہر طرف یلغار کرنے کے لئے لکھا۔ عالم خاں کو لکھا گیا کہ وہ گوالیار کی جانب یلغار کر کے وہاں وہ رحیم داد کو کمک پہنچائے مکھن، قاسم بیگ سنبھلی، محمد زیتون حامد کو اس کے بڑے اور چھوٹے بھائی کے ساتھ سنبھلی کی جانب یلغار کرنے کے لئے لکھا گیا اسی منزل پر معلوم ہوا کہ رانا سانگا اپنے پورے لشکر کے ساتھ بیانہ کے نزدیک پہنچ گیا ہے اور وہاں اس نے تاخت تاراج شروع کر دی ہے۔ جو لوگ قراولی کے لئے بھیجے گئے تھے کوئی خبر نہ لا سکے۔ یہی نہیں بلکہ وہ قلعے میں بھی داخل نہ ہو سکے جو لوگ قلعے میں تھے وہ دور تک باہر نکل آئے ان کا یہ اقدام دور اندیشی کے قطعی منافی تھا۔ دشمن وہاں ان سے پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ دشمن نے انہیں زیر کر لیا۔ سنگر خاں جنجوہہ اس جنگ میں شہید ہوا۔ جس وقت کتہ بیگ نے شور و غوغا سنا تو وہ بلا زرہ بکتر پہنے دوڑا چلا آیا۔ اس نے ایک کافر کو گھوڑے پر سے اتار دیا۔ جس وقت وہ گھوڑے کو اپنے قبضے میں کر رہا تھا تو اس کافر نے کتہ بیگ کے نوکر سے تلوار چھین لی، اور کتہ بیگ کے شانے پر وار کیا۔ جس کی تکلیف کی وجہ سے وہ سانگاہ کے ساتھ مقدس جنگ میں حصہ نہ لے سکا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کا بازو ٹھیک تو ہو گیا مگر جنگ کے لئے ناکارہ ہو گیا۔

قسمتی، شاہ منصور برلاس اور جو شخص بھی بیانہ سے آیا اس پر دشمن کا خوف غالب تھا یا وہ لوگوں کو ڈرانا

چاہتے تھے۔ بہر جہت انہوں نے دشمن کے لشکر کی چالاکی اور دلیری کی بہت زیادہ تعریف کی۔ اسی منزل سے ہم نے سفر کیا۔ قاسم خاں کو بیلداروں کے ساتھ روانہ کیا گیا کہ وہ پرگنہ مندھاکو پہنچے۔ جہاں ہم قیام پذیر ہوئے۔ اگلے دن صبح کے وقت ہم نے وہاں سے کوچ کیا۔ اس اثنا میں مجھے یہ خیال آیا کہ وہ جگہیں جہاں پانی کی اتنی فروانی ہو کہ وہ لشکر کی ضرورت کو پورا کر سکے ان میں سے ایک سیکری ہے۔ اس امر کا احتمال ہے کہ دشمن ایسی جگہ پر قبضہ کر کے وہاں فروکش ہو جائے۔ چنانچہ اسی بنا پر لشکر کو برانغار، جوانغار، اور قلب دستوں میں تقسیم کر کے ہم آگے روانہ ہوئے۔ درویش محمد ساربان اور قسمتی جو بیانہ جا کر راستے میں جگہوں کا معائینہ کر کے واپس آئے تھے۔ انہیں آگے ان مقصد کے لئے بھیجا گیا کہ وہ سیکری پہنچ کر اس کے تالاب کے کنارے ایسی جگہ تلاش کریں جہاں قیام کیا جا سکے۔ ہم منزل بہ منزل قیام کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ مہدی خواجہ اور اس کے دستے کے پاس جو بیانہ میں مقیم تھا آدمی دوڑایا گیا کہ وہ بلا توقف آ کر ہمارے ساتھ شریک ہوں۔ ہمایوں کے ملازم بیگ میرک مغل کو چند جوانوں کے ساتھ کافر کے بارے میں معلومات حاصل کے لئے روانہ کیا گیا۔ وہ رات کے وقت گئے تھے اور صبح یہ خبر لے کر آئے کہ دشمن کے آدمی بسھاور سے ایک کروہ آگے بڑھ آئے ہیں اور وہیں قیام کئے ہوئے ہیں۔ اسی دن مہدی خواجہ، محمد سلطان مرزا اور اس یلغاری دستے کے لوگ جو بیانہ گئے ہوئے تھے آن پہنچے۔ اور ہمارے ہمراہ ہو گئے۔

امرا کو اس امر کے لئے مقرر کیا گیا کہ وہ باری باری گشتی پہرے کا فرض انجام دیں۔ جس روز عبدالعزیز کی باری تھی (ورق ۲۹۵) وہ پس و پیش کا اندازہ کئے بغیر ہی خانوہ تک پہنچ گیا جو سیکری سے پانچ کروہ کے فاصلے پر ہے کافر کوچ کر کے آگے آ چکا تھا۔ جب اس (رانا) نے اس طرح ان کی بے اسلحہ پیشقدمی دیکھی تو چار پانچ ہزار آدمی اچانک وہاں بھیجدئے۔ عبدالعزیز اور ملا آپاق کے ساتھ اس وقت تقریباً ہزار یا ڈیڑھ ہزار آدمی ہوں گے۔ انہوں نے یہ تخمینہ لگائے بغیر ہی کہ دشمن کے آدمی کتنے ہیں ان کے ساتھ برسر پیکار ہو گئے۔ دشمن نے وہاں پہنچتے ہی انہیں پکڑ لیا اور بہت سوں کو اپنے ساتھ لے کر وہاں سے چلے گئے ہم تک جیسے ہی یہ خبر پہنچی تو ہم نے محب علی خلیفہ کو اس کے ملازمین کے ساتھ روانہ کیا۔ ملا حسین اور بعض دیگر افراد کو فی الفور ان کی مدد کے لئے بھیجا اس کے بعد محمد علی جنگ جنگ کو بھی مدد کے لئے روانگی کی اجازت دی گئی۔ ان کے وہاں پہنچنے سے قبل وہ لوگ جو وہاں متعین تھے جن میں محب علی خلیفہ اور دیگر افراد شامل تھے ان میں سے کافروں نے عبدالعزیز اور اس کے ساتھیوں کو بے بس کر کے ان کا پرچم چھین لیا۔ ملاّ نعمت، ملاّ داؤد اور اس کے بھائی ملاّ آپاق کو اور چند دیگر افراد کو گرفتار کر کے انہیں شہید کر دیا۔ دشمن کے آدمی جیسے ہی محب علی کے ماموں طاہر بیردی کی جانب بڑھے اس نے ان پر حملہ کر دیا چونکہ ان تک ابھی کمک نہیں پہنچی تھی طاہر کو تو انہوں نے اسی جگہ گرفتار کر لیا اور محب علی جنگ کرتے ہوئے زمین پر گر پڑا۔ لیکن بالتو نے عقب سے وہاں پہنچ کر اسے زمین پر سے اٹھا لیا۔ دشمن کے آدمیوں نے ایک کروہ تک ان کا تعاقب کیا لیکن محمد علی جنگ جنگ کی سپاہ کے جب دور سے آثار نمایاں ہوئے تو وہ تعاقب کرنے سے باز رہے اور اپنی جگہ پر رک گئے۔

لشکر کا استحکام

ہمیں یہ خبریں متواتر مل رہی تھیں کہ دشمن کے آدمی نزدیک آ گئے ہیں۔ ہم نے بھی زرہ بکتر پہنے، گھوڑوں کو مسلح کر کے حملہ کے لئے روانہ ہوئے۔ میں نے حکم دیا کہ گاڑیوں کو کھینچتے ہوئے لائیں ہم ایک کروہ تک بڑھ کر آگے آ گئے۔ دشمن کے آدمی اس جگہ سے واپس چلے گئے تھے۔ ہمارے قریب ہی ایک بہت بڑا تالاب تھا۔ اس مصلحت کے پیش نظر کہ پانی وہاں موجود ہے ہم وہیں قیام پذیر ہو گئے۔ گاڑیوں کو ہم نے اپنے

آگے مضبوط کر دیا تھا اور انہیں زنجیروں سے ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ ہر دو گاڑیوں کے درمیان تقریباً سات آٹھ گز کا فاصلہ چھوڑ کر انہیں زنجیروں کے ذریعے متصل رکھا گیا تھا۔ مصطفی رومی نے اہل روم[19] کی طرح اپنی گاڑیوں کو آراستہ کیا تھا۔ یہ گاڑیاں بڑی ہی تیز رفتار ایک دوسرے سے چسپاں اور بہت ہی عمدہ تھیں۔ استاد علی قلی کو اس کے ساتھ چونکہ ضد تھی اسی لئے مصطفی کو برانغار میں ہمایوں کے سامنے متعین کیا گیا تھا۔ جہاں گاڑیاں نہیں پہنچ سکتی تھیں وہاں خراسانی اور ہندوستانی بیلداروں اور کدالیوں کو لگایا گیا کہ وہ خندق کھودیں۔ کافر جس تیز قدمی سے بیانہ پہنچا تھا اور اس نے وہاں جنگ کی تھی اس کی تعریف و توصیف میں شاہ منصور، قسمتی اور دیگر لوگ جو بیانہ سے آئے تھے رطب اللسان تھے اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ لشکر کے لوگوں میں بد دلی ہے۔ عبدالعزیز کو جس طرح زیر کیا گیا تھا اسے پیش پیش رکھا جا رہا تھا۔

لوگوں کے اطمینان کی خاطر اور لشکر کے ظاہری استحکام کی غرض سے جن جگہوں پر گاڑیاں نہیں پہنچ سکتی تھیں وہاں لکڑیوں سے تپائیاں بنا کر نصب کر دی گئی تھیں ان تپائیوں کے درمیان تقریباً سات آٹھ گز کا فاصلہ ہو گا (ورق ۲۹۶) ان تپائیوں کے درمیان بیل کے چمڑے کی رسّیاں کھینچ دی گئی تھیں اور اس طرح انہیں مضبوط اور ایک دوسرے سے متصل کر دیا گیا تھا۔ ان اسباب و آلات کے مہیا اور مکمل ہونے میں بیس پچیس دن لگ گئے۔

کابل سے مدد کی آمد

انہی دنوں میں سلطان حسین مرزا کا نواسا قاسم حسین سلطان سیّد یوسف کے فرزند احمد یوسف، قوام اردو شاہ اور دیگر ایک دو افراد کے ساتھ کابل سے آیا مجموعی طور پر پانچ سو آدمی اس کے ساتھ تھے۔ محمد شریف نجومی، منحوس بھی ان کے ہمراہ تھا۔ بابا دوست سوچی جو شراب لینے کے لئے کابل گیا تھا وہ بھی ان کے ساتھ اونٹوں کی تین قطاریں لے کر پہنچ گیا۔ ان اونٹوں پر غزنی کی عمدہ شرابوں کے خم لدے ہوئے تھے۔ وہ واقعات اور حالات جو مجھ پر بیت رہے تھے اور وہ پریشان کن اقوال و کلمات جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے کے باعث لشکر میں توہم و تردد کی کیفیت طاری تھی ان کے پیش نظر محمد شریف منحوس نجومی میں اتنی جرأت تو نہ تھی کہ وہ مجھ سے کچھ کہہ سکے۔ البتہ جس شخص سے بھی وہ ملتا اس سے مبالغہ آرائی کے ساتھ کہتا کہ ان دنوں مریخ سیارہ مغرب کی جانب ہے جو شخص بھی اس طرف (مشرق) سے جنگ کرے گا وہ مغلوب ہوگا۔ جب اس منحوس سے لوگ پوچھتے تو ان حوصلہ شکن لوگوں کا دل پہلے سے کہیں زیادہ شکستہ ہو جاتا۔ میں نے اس کی ان پریشان کن باتوں کی جانب قطعی توجہ نہ کی اور جو کام مجھے انجام دینے چاہئے تھے وہ میں نے اختیار کئے اور ہم جنگ و جدل کے لئے جان و دل سے مستعد و آمادہ ہو گئے۔

مہینے کی اکتیس تاریخ کو بروز اتوار شیخ جمالی کو روانہ کیا گیا کہ گنگا جمنا دوآبے اور دلّی سے جتنے بھی ترکش بند وہ جمع کر سکے انہیں جمع کر کے میوات کے دیہات پر حملہ کر کے انہیں تاخت و تاراج کر دے اور جو کچھ بھی اس کے ہاتھ لگے اسے حاصل کرنے میں وہ کوئی تقصیر و کوتاہی نہ کرے۔ کابل سے ملّا ترک علی آ رہا تھا اسے فرمان بھیجا گیا کہ وہ شیخ جمالی کے ہمراہ ہو کر میوات کو لوٹنے اور اس کی ویرانی میں کوئی کوتاہی بروئے کار نہ لائے۔ مغفور دیوان کو بھی اس طرح کا فرمان دیا گیا۔ چنانچہ وہ اس مقصد کے لئے روانہ ہوا۔ گرد و نواح کے کچھ دیہات کو برباد اور ویران کیا اور کچھ لوگوں کو قید کر کے لایا لیکن وہ اس قابل نہ تھے کہ انہیں اس آشفتگی و سراسیمگی کا بدل قرار دیا جا سکتا۔

پیر کے دن بتاریخ تیئس جمادی الاوّل میں سیر کرنے کی غرض سے گھوڑے پر سوار ہوا، سیر کرتے ہوئے میرے دل میں یہ خیال آیا کہ مجھ میں ہمیشہ توبہ کی خواہش رہی ہے اور خلاف شرع عمل کے مرتکب ہونے

۱۹۔ رومی طریقے کے لئے دیکھیں نوٹ ۷۴ سال ۹۳۲ھ کے احوال میں۔

کے باعث دل غبار آلود رہا ہے۔

چنانچہ میں نے کہا کہ اے نفس:

چند باشی زمعاصی مزہ کش — توبہ ہم بی مزہ نیست بچش
نیچہ عصیان بیلہ آلودہ لیغنک — نیچہ حرمان آرا آسودہ لیغنک
نیچہ نفسینکغہ بولور سین تابع — نیچہ عمرو نکنی قیلور سین ضایع
نیت غزوا یلہ کیم بورروب سین — اونما کینکی اوزو نکا کو روب سین
کیم کہ اولماک اوزی کا جرم ایتار — او شبّو حالت نہ بیلور سین کہ نیتار
دور ایتار جملہ مناھی دین او زین — ار تیور بار چہ کناھیدین اور زین
خوش قیلت اور زنی بو کیچما کلیک تین — توبہ قملیدم چاغیز ایچماک لیک دین
التون ونقرہ صراحی وایاق — مجلس الاتی تمامین اول چاق
حاضر اریلاب بارینی سندور دوم — ترک ایب نہ کہ رستہ ہے می نی کز کونکول تند ور دوم

ورق(۲۹۰)

(تو کب تک گناہوں میں آلودہ رہے گا — توبہ کر کہ یہ بھی بے مزہ نہیں)
(تو کتنا عرصہ گناہوں میں بر باد رہے گا — حکم عدولی تجھ کو کب تک خوش رکھے گی)
(کب تک تو اپنے نفس کے تابع رہے گا — کب تک تو اپنی عمر ضائع کرتا رہے گا)
(تو تو غزوہ کی نیت سے روانہ ہوا ہے — اور اپنی موت کو تو خود دیکھ رہا ہے)
(جو شخص اپنی موت کے لئے عزم کر لیتا ہے — اور جو جانتا ہے کس حالت پر وہ پہنچے گا۔)
(ممنوعہ چیزوں کو تو اپنے سے دور رکھ — خود کو سب گناہوں سے پاک وصاف رکھ)
(میں نے اپنے فائدے کی خاطر توبہ کی — میں نے حکم عدولی کو چھوڑ دیا شراب سے توبہ کرلی)
(سونے اور چاندی کی صراحیاں — اور جام میں نے سب کو منگایا)
(ان سب کو میں نے وہیں تڑوادیا — اپنے دل کو تسلی دی، شراب چھوڑ دی)

صراحیاں سونے اور چاندی کا شکستہ وریخت ساز وسامان ضرورتمندوں اور درویشوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ پہلا شخص جس نے توبہ میں مجھ سے اتفاق کیا وہ عسس تھا اس نے اس امر سے بھی اتفاق کیا کہ میں ڈاڑھی چھوڑ دوا اور خط نہ بنواؤں۔ اس رات اور اگلے دن صبح میرے امرا اور قرابت داروں میں تقریباً تین سو افراد نے جن میں سپاہی اور غیر سپاہی شامل تھے مے نوشی سے توبہ کی جو شرابیں موجود تھیں انہیں بہا دیا گیا اور جو شرابیں لائی گئی تھیں ان کے لئے میں نے بابا دوست کو حکم دیا کہ ان میں نمک چھڑک کر ان کا سرکہ بنا دے۔ جہاں شرابیں بہائی گئی تھیں اس جگہ کو کھود کر باولی بنائی گئی۔ میں نے نیت کی تھی کہ یہ باولی پتھروں سے تعمیر کی جائے اور اس کے نزدیک ایک ایسی عمارت بنائی جائے جس سے فیض جاری رہے۔ ماہ محرم ۹۳۵ھ جس وقت میں گوالیار سے دھولپور کے راستے سے سیکری کی جانب آ رہا تھا یہ باولی مکمل ہو چکی تھی۔ اس سے قبل میں نے یہ نیت کی تھی کہ اگر میں نے سانگاہ کافر پر فتح پائی تو میں مسلمانوں کا محصول معاف کر دوں گا۔ جس وقت میں توبہ واستغفار کر رہا تھا تو درویش محمد ساربان اور شیخ زین نے مجھے یاد دلایا کہ میں نے کیا نیت کی تھی میں نے ان سے کہا کہ تم نے اچھا ہی کیا کہ مجھے یاد دلا دیا چنانچہ جو ولایات میرے تحت تصرف ہیں ان میں مسلمانوں پر محصول معاف کر دیا گیا۔ اس مقصد کے تحت میں نے منشیوں کو بلایا اور انہیں حکم دیا کہ یہ جو دو عظیم البیان امور وقع پذیر ہوئے ہیں ان کی اطلاع کے لئے وہ فرامین تحریر میں لائیں۔ شیخ زین کی طرز انشا پردازی

پر فرامین تحریر ہوئے۔ جنہیں مملکت کی تمام حدود اور قلمرو میں روانہ کر دیا گیا فرمان کی عبارت یہ ہے:

فرمان ظہیر الدین محمد بابر[20]

تعریف ہے اس کی جو توبہ قبول کرتا ہے، توبہ کرنے والوں کو اور پاکیزہ لوگوں کو عزیز رکھتا ہے۔ شکر اس پروردگار کا جو گناہ گاروں کو ہدایت بخشتا ہے اور جو مغفرت کے طالب ہیں ان کی مغفرت فرماتا ہے۔ ہم دعا گو ہیں اللہ تعالیٰ کی عزیز ترین تخلیق محمد، ان کی بہترین اولاد اور پاک ترین اصحابہ پر۔ جن اہل بصیرت ارباب کے آئینہ دل پر عالم اسباب کی بہترین تصاویر منعکس ہوتی ہیں اور جن کے ذہن صدق وصواب کے دلکش وحسین جواہر کا خزانہ ہیں وہ ان درخشاں گوہروں کے بارے میں بھی باخبر ہوں گے کہ ان کی فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ طبقاً نفسانی لذتوں کی جانب مائل رہتی ہے اور ان خواہشات کا ترک کیا جانا توفیق یزدانی وتائید ربانی پر موقوف ہے۔ نفس انسانی، شہوات نفسانی سے بیگانہ و دور نہیں۔ (ورق ۲۹۱)۔ ''میں کچھ اپنے نفس کی برأت نہیں کر رہا ہوں۔ نفس تو بدی پر اکساتا ہے'' (قرآن ۱۲:۵۳) اور بری چیزوں سے اجتناب مالک غفور کی مہربانی کے بغیر ممکن نہیں۔ ''یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اللہ بڑا فضل والا ہے'' (قرآن ۵۷:۲۱)۔

اس رسالے کو بیان کرنے اور اس مقولے کو تحریر میں لانے سے یہ مقصود ہے کہ بشری تقاضے کے تحت، حسب ضرورت اہل جاہ وسپاہ کی عادت کے مطابق عہد عنوانی شباب میں بعض امور ممنوعہ اور کچھ مشاغل لہو ولعب کا میں مرتکب ہوا۔ جس کا صلہ چند روز بعد حسرت وندامت کی صورت میں ملا۔ چنانچہ میں نے تمام امور ممنوعہ میں سے ہر ایک کو ترک کر دیا اور توبتہ النصوح کی طرح ان کی طرف رجوع کرنے کے جو بھی ابواب ہو سکتے تھے وہ مسدود کر دئے گئے، لیکن شراب سے توبہ جو ان مطالب کا اصل مقصد ہے اس سے مقصود عظیم ضروریات کی بر اری ہے، وہ ابھی تک پردۂ حجاب میں اس بنا پر مخفی رہا کہ ہر کام کے ظہور پذیر ہونے کا کوئی وقت معیّن ہے یہاں تک کہ ان دنوں میں وہ مبارک ساعت آن پہنچی جبکہ ہم نے جہاد کے لئے احرام باندھا اور اسلامی افواج پسندیدہ اوصاف کفار کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہی تھے کہ غیبی اور ہاتف لاریبی کی جانب سے میں نے یہ ندا سنی: کیا ایمان والوں کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ڈر سے پگھلیں (قرآن ۵۷:۱۴)۔

اس بنا پر انحراف وگناہ کے اسباب ووسائل کا سنجیدگی کے ساتھ قلع قمع کرنے کی خاطر ہم نے توبہ کے دروازے پر دستک دی اور ہادی توفیق کے اس مضمون کے مطابق جو شخص بھی کسی دروازے پر دستک دیتا ہے اور ثابت قدم رہتا ہے وہ اس پر کھل جاتا ہے مجھ پر بھی اقبال مندی کا دروازہ کھل گیا اور اس نے اس جہاد کے شروع کرنے کا حکم دیا کیونکہ اس سے بڑا جہاد نفس کی مخالفت کرنا ہے۔ مختصر یہ کہ میں خلوص نیت سے یہ آیت زبان پر لایا ''اے رب، ہم نے اپنے اور پر ستم کیا'' (قرآن ۷:۲۳)۔

''اور میں سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں'' (قرآن ۷:۱۴۳) اور یہ آیت میں نے اپنے لوح دل پر نقش کی اور شراب سے توبہ کرنے کا ارادہ جو سینے میں پوشیدہ تھا، کو میں نے سچ کر دکھایا۔

خدام ظفر احتشام نے میرے حکم مبارک انجام کے بموجب جام وصراحی اور دیگر تمام چاندی اور سونے کے ان ظروف وآلات کو جو کثرت اعداد اور زیب وزینت میں بلند آسمان کے کواکب کی طرح محفل بادہ آشامی کو عجیب وغریب رونق وشان بخشتے تھے لیکن شریعت کے لئے باعث ننگ وذلت تھے کو دھات سے بنی ہوئی مورتیوں کی طرح چکنا چور کر دیا۔ انشا اللہ وہ دن دور نہیں جبکہ ہم دیگر مورتیوں کو بھی شکست وریخت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان شکستہ ظروف وآلات کے اجزا کو مسکین وعاجز ضرورت مندوں کو بخش دیا گیا ہے چنانچہ اس توبہ کی برکت سے جس نے قرب قبولیت حاصل کیا مقربان درگاہ نے اس قول کے مطابق کہ ''اے لوگو! اپنے حکمرانوں کا مسلک اختیار کرو'' اسی محفل میں شرف توبہ سے مشرف ہوئے۔ اور کلی طور پر نشہ آور

۲۰۔ شیخ زین کا لکھا ہوا یہ فرمان فارسی مسجع ومقفیٰ عبارت کا مثالی نمونہ ہے۔ مطالب لفاظی میں گم ہو جاتے ہیں۔ بابر کی تحریر جو صاف اور آسان ہے اس کو شیخ زین کی لفاظی سے اس تحریر کے علاوہ طبقات ناصری میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ فارسی سے یہ اثر اردو میں بھی آیا تھا۔ شکر ہے کہ یہ اب رواج نہیں رہا۔

مشروبات سے قطع تعلق کرلیا۔اب بھی وہ لوگ جو امر و نہی (امر معروف و نہی عن المنکر) کے مطیع و فرمانبردار ہیں جوق در جوق ساعت بساعت اس سعادت سے بہرہ مند ہو رہے ہیں۔امید ہے کہ اس قول کے مطابق کہ "جو بھی خیر و فلاح کی راہ دکھاتا ہے وہ گویا خود ہی کار ثواب انجام دیتا ہے"۔ یہ اعمال دولت خجستہ مآل نیز دولت و اقبال شاہی پر موثر ثابت ہوں گے اور اسی سعادت کی مبارکی سے فتح و نصرت میں روز بروز فراوانی ہوگی۔

اس نیت کے اتمام اور اس مقصد کی تکمیل کے بعد اس فرمان نے جہاں مطیع و فرمانبرداری میں جاری وساری ہونے کا یہ شرف حاصل کیا (ورق ۲۹۲) کل ممالک محروسہ میں، اللہ انہیں تمام آفات اور ہر خوف و ترس سے محفوظ رکھے۔ مخلوقات میں سے کوئی بھی فرد قطعاً نشہ آور مشروبات کے استعمال کا مرتکب نہ ہو اسے حاصل کرنے اور کشید کرنے کی کوشش نہ کرے۔ کوئی شخص اسے فروخت نہ کرے اور کوئی بھی اسے نہ خریدے۔ اسے ساتھ نہ رکھے، کسی جگہ ہمراہ لے کر نہ جائے اور نہ ہی لے کر آئے۔ "امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی" (قرآن ۵:۹۰)۔ اس فتح کے شکرانے اور صدق و صفا کے ساتھ توبۃ النصوح کے قبول ہونے کے باعث بادشاہ ازلی کا بحر بخشائیش جوش میں آ گیا بخشائیش و کرم کی وہ امواج جو عالم کی آبادانی اور بنی آدم کی عزّت و آبرو کا سبب بنتی ہیں انہیں اس نے جلوہ گر کر دکھایا۔ اگرچہ کل ممالک کا محصول اعداد و حساب کی حدود سے کہیں زیادہ تھا اور سلاطین عہد قدیم سے اس کی وصولیابی کا سلسلہ چلا آ رہا تھا مگر چونکہ اس کا حصول سید المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ کے اصول وضوابط کے منافی تھا اسی لئے یہ فرمان صادر کیا گیا کہ کسی شہر و بلاد کسی راہ گزر اور بندرگاہ سے محصول نہ لیں اور نہ لوگ اسے ادا کریں۔ اس کے اصول و قواعد میں تبدیلی و تغیر نہ آنے دیں "چنانچہ جنہوں نے وصیت سنی اور بعد میں اسے بدل دیا تو اس کا گناہ ان بدلنے والوں پر ہوگا (قرآن ۲:۱۸۱)۔ وہ ترک تاجیک، عرب و عجمی، ہندی و فارسی، سپاہ و رعیت کے افراد اور بنی آدم کے قبائل جو شاہی عاطفت کے زیر سایہ آ گئے ہیں ان کے لئے طریق و سبیل یہی ہے کہ اگر وہ مدد و اعانت کے متمنی امیدوار ہوں تو وہ اس حکومت ابد اتصال کی فلاح و بہبود کے لئے دعا کرتے رہیں اور ان احکام پر سے جن کا انجام و اختتام فرخندگی و مبارکی پر ہے انحراف و روگردانی نہ کریں انہیں چاہئے کہ اس فرمان کے مطابق عمل کر کے اس کے احکام بجا لائیں اور یہ اطمینان رکھیں کہ ان کی جو اشرف و اعلیٰ توقعات ہیں ان کے حصول میں وہ کامیاب ہوں گے۔ یہ فرمان جس کا نفاذ و اطلاق خداوند تعالیٰ کے حکم سے ہمیشہ ہوتا رہے امیر اعلیٰ کے حکم سے بتاریخ چوبیس جمادی الاوّل ۹۳۳ھ رقم پذیر ہوا۔

لشکر کو ترغیب

ان واقعات کے باعث جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے خورد و کلاں میں بہت زیادہ خوف و ہراس اور دغدغہ پایا جاتا تھا۔ کسی شخص کہ منہ سے بھی دلیری و مردانگی کی بات سنائی نہیں دیتی تھی۔ سخنوری وزیروں اور ولایت کے متمنی امیروں کے منہ سے کوئی حوصلہ مند بات نہ نکلتی تھی اور نہ ہی امرا کی تدابیر میں جرأت مردانگی پائی جاتی تھی البتہ اس یورش میں خلیفہ نے خوب مردانگی دکھائی ضبط و استحکام اور کوشش و اہتمام میں اس نے کوئی کوتاہی نہیں کی بالآخر جب میں نے لوگوں میں اس قسم کی بددلی پائی اور اس طرح کی سستی ان میں دیکھی ایک تدبیر میرے ذہن میں آئی۔ میں نے تمام امرا اور جوانوں کو طلب کیا اور ان سے کہا کہ:

ہر کہ آمد بہ جہان اہل فنا خواہد بود	آنکہ پاینده و باقیست خدا خواهد بود
هر کیم که حیات مجلسی غه کیریب تور	واقبت اجل پیمانہ سیلین ایچکور سیلور
دهر کیشی کیم تیریکیک منزلیغه کیلیب تور	آخر دنیا غمخانہ سیلین کیچکو سید دور

(جو کوئی اس دنیا میں آیا اس کا شمار اہل فنا میں ہے جو لافانی ہے وہ خدا ہے اور وہ ہی باقی رہے گا۔ جو شخص اس مجلس حیات میں وارد ہوا ہے اسے پیمانۂ اجل نوش کرنا ہے جس کسی نے منزل میں قدم رکھا ہے اسے اس غمخانۂ ہستی سے چلا جانا ہے۔ ذلّت و رسوائی کے ساتھ زندہ رہنے سے نیک

نامی کے ساتھ مرجانا کہیں بہتر ہے۔)

بہ نام نکو گر بمیرم رواست — مرا نام باید کہ تن مرگ راست

(اگر میں نیک نامی کے ساتھ مرجاؤں تو یہ میرے لئے روا ہے مجھے تو نیک نامی چاہئے کیونکہ موت تو جسم کو آتی ہے)

اللہ تعالیٰ کی سعادت ہمیں نصیب ہے وہ ایسی دولت سے ہمیں نوازے کہ جو شخص جنگ میں قتل ہو وہ شہید اور جس نے قتل کیا وہ غازی کہلائے۔ ہمیں خداوند تعالیٰ کی قسم (ورق ۲۹۳) کھا لینی چاہئے کہ کوئی بھی شخص اس قتل وکشتار سے روگرداں ہونے کا خیال تک دل میں نہیں لائے گا اور جب تک جان اس تن سے جدا نہیں ہوتی کوئی بھی اس حرب وجنگ سے دوری وگریزی اختیار نہیں کریگا۔ چنانچہ آقا، نوکر اور خورد وکلاں میں سے ہر شخص نے برضا ورغبت کلام مجید کو ہاتھ میں لے کر اسی مضمون کے مطابق اس عہد وشرط کی پابندی کا اعلان کیا اور یہ دور ونزدیک سے دیکھنے اور سننے والے نیز دوست ودشمن پر کارگر ثابت ہوئی۔ ان دنوں میں ہر طرف بغاوت اطراف وجوانب فتنہ وغوغا بپا ہوگیا۔ حسین خاں نوحانی نے راپڑی پر قبضہ کرلیا۔ چندوار پر قطب خاں کے آدمی قابض ہوگئے۔ رستم خاں نامی کسی پست آدمی نے دوآب میں کچھ ترکش بند سپاہی جمع کر کے کول کی جانب قصد کیا اور اس پر قبضہ کر کے کچک علی کو قید کردیا۔[21] زاہد نے سنبھل کو خیر باد کہا اور کسی طرف نکل گیا۔ سلطان محمد دولدائی نے قنوج کو ترک کردیا۔ گوالیار کا محاصرہ وہاں کے کفار نے کرلیا۔ عالم خاں کو گوالیار کی جانب کمک کے لئے بھیجا گیا تھا۔ وہ وہاں تو نہیں گیا البتہ اپنی ولایات میں داخل ہوگیا۔ اس طرح کی ہر روز کوئی نہ کوئی ناخوش گوار خبر پہنچ رہی تھی۔ لشکر میں سے بعض ہندوستانی فرار ہوگئے۔ ہیبت خاں گرگ انداز بھی فرار ہوکر سنبھل پہنچ گیا۔ حسین خاں باری وال فرار ہوکر کفار میں جا پہنچا۔

ہم نے ان واقعات کی ذرا بھی پرواہ نہیں کی البتہ اپنی پیش قدمی کی جانب متوجہ رہے۔ جب گاڑیاں، پہیئے دار تپائیاں اور دوسرا ساز وسامان جنگ کے لئے تیار ہوگیا تو ہم نے بروز منگل نو جمادی الآخر نوروز تہوار کے دن کوچ کیا۔

برانغار، جوانغار اور قلب کے دستوں کو ترتیب دیا۔ گاڑیاں اور پہیئے دار تپائیاں آگے بھیجی گئیں۔ گاڑیوں کے عقب میں استاد علی قلی کو اس کے تفنگ اندازوں کے ساتھ مقرر کیا گیا اور یہ ہدایت دی گئی کہ پیادہ سپاہ گاڑیوں سے علیحدہ نہ ہوں بلکہ قطاریں بنا کر روانہ ہوں۔ جب سپاہ کی ترتیب وتنظیم مکمل ہوگئی اور ہر شخص اپنی سپاہ کے دستوں کو انکی جگہ پر متعین کر کے اپنے مقام پر پہنچ گیا تو میں نے امرا، برانغار اور جوانغار دستوں کے سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کی۔ اور ہر گروہ کو یہ ہدایت دی کہ ان میں سے ہر شخص کس طرح اپنی جگہ پر قائم رہے، کس طریقے سے حرکت میں آئے اور کس طور سے وہ نبرد آزما ہو۔ اس ترتیب کے مطابق جب لشکر کا نظم ونسق مکمل ہوگیا تو ہم ایک کروہ فاصلہ طے کرنے کے بعد قیام پذیر ہوئے۔ کافر لوگوں کو بھی ہماری آمد کا پتہ چل گیا۔ اس کے جو دستے پیش پیش تھے انہیں اس نے ترتیب دے کر آگے روانہ کیا۔ یہاں قیام پذیر ہونے کے لئے ہم نے خندق اور گاڑیوں کے درمیان اپنی لشکر گاہ کو مستحکم ومضبوط کیا۔

چونکہ اس روز جنگ کرنے کا ارادہ نہ تھا اس لئے ہمارے کچھ آدمی آگے نکل گئے اور اتنے آگے گئے کہ دشمن ان کی دسترس میں تھا، جسے انہوں نے نیک فال سمجھا انہوں نے کچھ کافروں کو پکڑ لیا اور ان کے سر کاٹ کر اپنے ساتھ لے آئے۔ ملک قاسم بھی ایک کافر کا سر کاٹ لایا۔ اس کا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ جس کے باعث اہل لشکر کے دل قوی ہوگئے اور ان میں نیا جوش وخروش پیدا ہوگیا۔

اگلے دن صبح ہم نے وہاں سے کوچ کیا۔ ابھی جنگ کا ارادہ کیا ہی تھا کہ خلیفہ اور بعض حکومت کے خیر خواہوں نے عرض کیا کہ (ورق ۲۹۴) لشکر گاہ کی وہ منزل جو مقرر کی گئی ہے وہ نزدیک ہی ہے اس لئے سرکار کی فلاح کے لئے

۲۱۔ کچک علی۔ بابر نامے کے قلمبند ہونے کی تاریخ۔ کچک علی نے ۹۰۸ھ میں بڑی بہادری اور مردانگی دکھائی تھی۔ بابر اُس سال کے حالات میں لکھتا ہے "کچک علی نے جو اس وقت ضلع کول کا شقدار ہے"... (ورق ۹۶) یہاں اس وقت سے مراد وہ وقت جب بابر ۹۰۸ھ کے حالات قلمبند کر رہا تھا ہے۔ کچک علی رانا سانگا کی جنگ سے پہلے گرفتار ہوگیا تھا (ورق ۲۹۳) یعنی وہ ۹۳۲/۹۳۳ھ میں ضلع کول کا شقدار تھا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ بابر انہیں سالوں میں ۹۰۸ھ کے حالات لکھ رہا تھا۔

یہی مناسب رہے گا کہ پہلے وہاں خندق بنا کر اس جگہ کو مضبوط کر دیا جائے اور پھر آگے کوچ کریں۔ چنانچہ اس مصلحت کے پیش نظر خلیفہ گھوڑے پر سوار ہوا اور جن جگہوں پر خندقیں بنائی جانی تھیں وہاں بیلداروں کو کام پر لگا کر اور محصّل مقرر کر کے واپس آ گیا۔

رانا سانگاہ سے جنگ

ہفتے کے دن بتاریخ تیرہ جمادی الآخر ہم گاڑیوں کو کھینچ کر اپنے سامنے کی طرف لے کر آئے۔ برانغار، جوانغار اور غول کے دستے تقریباً ایک کروہ راستہ طے کر کے مقررہ منزل گاہ پر قیام کرنے کے لئے پہنچ گئے۔ بعض جگہ خیمے نصب کئے جا چکے تھے اور بعض جگہوں پر ابھی نصب ہی کئے جا رہے تھے کہ یہ معلوم ہوا کہ دشمن کے پرے نمایاں ہونے لگے ہیں۔ ہم فوراً ہی اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور حکم دیا کہ جن دستوں کو برانغار پر مقرر کیا گیا ہے وہ برانغار میں اور جنہیں جوانغار میں رکھا گیا ہے وہ جوانغار میں رہیں ان کے علاوہ جس شخص کو جہاں متعین کیا گیا ہے وہ اپنی جگہ پہنچ کر گاڑیوں اور دستوں کو مستحکم و مرتب کرے۔

اس مقصد کے پیش نظر اس فتحنامہ کے ذریعے جسے شیخ زین نے تحریر سے مزیّن کیا تھا لشکر اسلام کی کیفیت اور لشکر کفار کے پروں کی کمیت نیز لشکر اسلام کے سپاہی اور کفار کے دَلوں کے سنتری کس طرح نبرد آزما ہوئے واضح و روشن ہو جائے۔ یہ فتحنامہ ہی کم و کاست و اضافہ یہاں ضبط تحریر میں لایا جا رہا ہے۔

فتح نامہ

الحمد لله الذی صدق وعده ونصر عبد مواغر جنده وهزم الاحزاب وحده ولا شی وبعده۔ یامن رفع وعايم الاسلام بنصراولياء الراشدين ووضع قوايم الاصنام بقهر اعدائير المـاردين فقطع دابرا القوم (ورق ۲۹۴) الذين ظلموا الحمد لله رب العلمين وصلى الله على خير خلقه محمد سيد الغزاة واعجاهدين وعلى آله واصحابه الهداة اى يوم الدين

تعریف ہے اللہ کے لئے جس کا وعدہ برحق ہے، جو اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے۔ ان کے لشکر کو تقویت بخشتا ہے۔ بس اسی کی ذات واحد ہے اور اس کے علاوہ ہر چیز ہی فانی ہے۔ اس نے ہی اولیا برحق کو توفیق عطا کی کہ وہ اسلام کا بول بالا کریں۔ بتوں کو ان کے اعلیٰ اور ارفع مقام سے اتاریں اور سرکش باغیوں کو شکست دے کر سرنگوں کریں اور اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جنھوں نے ظلم کیا تھا، اور سب تعریف اللہ کے لئے ہی ہے۔ (قرآن ۴۵.۶) تا روز حساب رحمت ہو مجاہدین کے سالار محمد، ان کی اولاد اور اصحابہ پر۔

مسلسل ذکر نعمات سبحانی کثرت شکر و ثنائے یزدانی کا باعث بکثرت شکر و ثنائے یزدانی نعمات سبحانی کے تسلسل کا وارث، ہر نعمت پر شکر واجب، اور ہر نعمت کے شکر پر اس کی رحمت اس کی نعمتوں پر شکر کا جو حق ہے اس کو ادا کیا جانا انسان کی بساط سے باہر۔ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے میں اہل اقتدار بھی عاجز و زبوں ہیں۔ بالخصوص وہ شکر جو ہر نعمت کے مقابل ادا کیا جانا چاہئے۔ وہ دولت جس سے بڑھ کر نا اس دنیا میں ہو سکتی ہے اور نا ہی اس سے زیادہ افزوں سعادت عقبیٰ میں حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ نعمت ہے کفر پر فتح و نصرت، اور تسلط و غلبہ دولتمند فاجر لوگوں پر۔ چنانچہ یہ آیت

اولیك هم الكفر والفجره (قرآن ۸۰:۴۲)

یہی کافر و فاجر لوگ ہوں گے

ایسے ہی لوگوں کے لئے نازل ہوئی ہے ارباب بصیرت کی نظر میں اس سے بہتر و برتر کوئی سعادت نہیں ہوگی۔

المنۃ اللہ اس سعادت عظمیٰ و موہبت کبریٰ کی آرزو جو اس عہد سے اس عہد تک مطلوب اصلی اور مقصود حقیقی ضمیر خیر اندیش اور رائے صواب کیش میں چلی آ رہی تھی ان ایام خجستہ فرجام میں حضرت ملک علاّم کے لطف

فتح پور سیکری کے باغ فتح کی باولی

باغ فتح کی بارہ دری کی باقیات۔ یہ بارہ دری فتح پور سیکری میں ہے

فتح پور سیکری کے باغ فتح کا جل محل

وعنایت سے پردۂ خفا سے جلوہ نما ہوئی۔ اس فتاح بے منت اور فیاض بے علت نے از سر نو کلید فتح سے فیض کے دروازے ہمارے نواب نصرت مآل (حضرت بابر بادشاہ) پر کھول دئے (ورق ۲۹۵)۔ ہماری شاد و خرم افواج کے نام نامی غازیان گرامی مرتبت کی فہرست نامے میں درج کئے گئے۔ پرچم اسلام سپاہ ظفر انجام کی مدد سے بلندی وترقی کی اوج پر پہنچ گئے، اس سعادت کے صدور اور اس دولت واقبال کے ظہور کی کیفیت یہ ہے:

جب ہماری سپاہ اسلام پناہ کی شمشیروں کی شعاعوں نے ممالک ہند کو فتح وظفر کی نورانی تابانی سے منور کیا اور جس کا ذکر سابق فتوحات کے زمن میں کیا جا چکا ہے تو ان کی توفیق ومدد کے ہاتھوں نے ہمارے رایات ظفر آیات ممالک دہلی، آگرہ، جونپور، خرید بہار و دیگر مقامات پر لہرا دیا۔ اصحاب وکفر اور ارباب اسلام پر مشتمل اقوام کے اکثر و پیشتر قبائل نے ہمارے نواب فرخندہ انجام کی اطاعت وفرمان پذیر کو اختیار کر لیا اور جب سانگاہ نے اس آیت کے مطابق کہ ”وہ اپنی برائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا (قرآن ۲:۳۴) عمل کیا اور شیطان کی مانند سرکشی کر کے اس نے اس زمانے بھر کے لشکر کا سردار اور مہجور سپاہ کا سالار بن کر ایسے جتھوں کو جمع کیا جن میں سے بعض نے زنار کے لعنتی طوق کو گردن میں ڈال رکھا تھا اور بعض کے دامن دین سے برگشتگی (ارتداد) کے خارزار میں الجھے ہوئے تھے اس کافر لعین ذلیل وخوار تا یوم الدین کا غلبہ ولایت ہند میں اس طرح تھا کہ فرمانروائی شاہی آفتاب کے طلوع ہونے سے پیشتر اور خلافت شہنشاہی کے فروغ سے قبل اس کے باوجود کہ یہاں کے راجہ اور رائے جیسے عظیم حکمرانوں نے اس کے مقابلے میں فرمان کی اطاعت قبول کر لی تھی لیکن وہ حاکم و پیشوا جنہوں نے یہ وصف پیدا کیا تھا کہ وہ دین اسلام سے برگشتہ ہو گئے تھے۔ اگرچہ اس محاربہ و جنگ میں وہ اس کے ہمرکاب تھے مگر ان کے پیش نظر ان کے اپنے مقاصد تھے۔ جس کے باعث انہوں نے کسی معرکۂ جنگ میں نہ صرف متابعت نہیں کی بلکہ اس کے رفیق ومددگار تک ثابت نہ ہوئے اور کسی سفر میں طریق ہمراہی تک اختیار نہ کیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس راجہ کے آگے ایسے عاجز ولاچار تھے کہ وہ کسی نہ کسی حیلے بہانے سے اس کی خوشامد اور چاپلوسی میں لگے رہتے تھے اس نے تقریباً دو سو شہر و بلاد اسلام میں کفر کا پرچم لہرا رکھا تھا۔ مساجد وعبادت گاہوں کو ویران کر رکھا تھا مومنین کے اعیال واطفال ان شہر و بلاد میں اس کی قید میں تھے۔ درحقیقت اس کی طاقت وتوانائی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ اس قاعدے کی رو سے جو ہندوستان میں رائج تھا کہ ایک لاکھ پر مشتمل آبادی کی ولایت کے لئے سو گھڑ سوار مقرر، اور ایک کروڑ کی آبادی پر مشتمل ولایات کے لئے دس ہزار سوار مقرر کئے جائیں وہاں کفار کے اس سرغنہ کے مفتوحہ علاقوں کی آبادی دس کروڑ تھی جس کے معنی یہ تھے کہ اس کے پاس ایک لاکھ گھڑ سوار تھے۔ اگرچہ اس مدت میں کفار نے باہمی عداوت و دشمنی کے باعث اس کی مدد نہیں کی تھی مگر اسلامی افواج سے عداوت کی بنا پر انہوں نے اس کے ساتھ اپنے لشکر شقاوت اثر کا اضافہ کر دیا تھا۔ چنانچہ دس ایسے حاکم باستقلال نے جن میں سے ہر ایک دھوئیں کی مانند سرکشی کا دعویدار اور تمام پرگنات میں سے کسی پرگنے میں کفار کا قائد سالار تھا خود کو زنجیر وطوق کی مانند اس کے ساتھ منسلک کر لیا۔ ان عشرہ کفرہ (دس کافروں) نے عشرہ مبشرہ کے خلاف اپنا پرچم ستم افزوں اس آیت کے مطابق کہ ”ان کو دردناک سزا کی خوش خبری سنا دو (قرآن ۳:۲۱) لہرا دیا۔ جس کا سبب یہ تھا کہ ان کی پشت پناہ کے لئے ان کے تابع وپیروکار اور کثیر تعداد میں عساکر وسپاہ کے علاوہ (ورق ۲۸۷) وسیع وعریض پرگنات بھی موجود تھے۔ چنانچہ صلاح الدین[۲۲] کے پاس اتنی بڑی ولایت تھی جس میں تیس ہزار گھڑ سواروں کی نگہداشت کی جا سکے۔ راول اودے سنگھ ناگوری کے پس بارہ ہزار گھڑ سوار تھے۔ میدنی راو کے پاس بارہ ہزار سوار تھے حسن خاں میواتی کے پاس بارہ ہزار، بارمل ادری کے پاس چار ہزار۔ نرپت ہاڈا کے پاس سات ہزار سوار تھے۔ ستروی کچھی کے پاس چھ ہزار سوار، دھرم دیو کے پاس چار ہزار سوار، نرسنگھ دیو کے پاس چار ہزار سوار تھے۔ محمود خاں ولد سلطان سکندر اگرچہ کسی ولایت یا پرگنے کا مالک نہ تھا

۲۲۔ صلاح الدین۔ فرشتہ اس کو صلحادی کے نام سے یاد کرتا ہے (ج ۴ ص ۲۶۴)۔ مالوہ کے سلطان کی طرف سے یہ اک خطاب تھا جو اس نے اپنے ہندو سردار کو دیا تھا۔ صلاح الدین اس وقت حاکم سارنگ پور بھیلسا اور رائیسین تھا (ارسکن ہسٹری اوف انڈیا انڈر بابر، ص ۴۷، نوٹ)

مگرس نے بھی دس ہزار گھڑ سوار اس امید میں جمع کر لئے تھے کہ وہ بھی سردار بن جائے گا اور اس طرح ان لوگوں کی تعداد جو سلامت وامنیت کی وادی سے دور بھٹک رہے تھے پرگنات اور ولایات کے پیش نظر دو لاکھ ایک ہزار ہو گئی تھی۔

مختصر یہ کہ اس مغرور کافر، کور باطن اور شقی القلب نے ان کفار سیاہ بخت کو جن میں سے بعض کی تیرہ بختی دوسروں کے مقابل کچھ زیادہ ہی تھی متفق وہمنوا کر کے اہل اسلام کے خلاف جنگ وپیکار اور شریعت سیّد الانام حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی اساس وبنیاد منہدم کرنے کی غرض سے آمادہ ہو گیا چونکہ مجاہدین لشکر شاہی اس دجّال یک چشم پر قضائے الٰہی کی طرح نازل ووارد ہو گئے اور انہوں نے خوش سیرت، اصحاب بصیرت کے اس قول کو پیش نظر رکھ کر کہ ''جب قضا آتی ہے تو آدمی کی بصارت جاتی رہتی ہے''۔ اور اس آیت کو ''جو شخص بھی مجاہدہ کرے گا اپنے ہی بھلے کے لئے کرے گا (قرآن ۶:۲۹) ملحوظ خاطر رکھ کر اس فرمان واجب الاذعان کو ''کفار اور منافقین دونوں کا پوری قوت سے مقابلہ کرو (قرآن ۷۳:۹) کو بجالائے۔ بتاریخ تیرہ جمادی الثانی ۹۳۳ ہفتے کے دن کے مبارک ہونے کی خبر اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ موضع خانوہ [۲۳] کے نواح میں جو بیانہ کے مضافات میں واقع ہے۔ ایک پہاڑ کے نزدیک دو کروہ کے فاصلے پر دشمنان دین وکافر لعین کے دو دستے پہنچ گئے۔ ملّت محمدی کے دشمنوں نے ان اصحاب فیل کی مانند جو کعبۂ اہل اسلام کو نیست ونابود کرنے کی غرض سے آئے تھے کوہ پیکر و دیو منظر ہاتھیوں کو اپنا یار ومددگار بنالیا۔

بسان فیلها هندو انی ذلیل	شده غرّه مانند اصحاب فیل
چو شام اجل جمله مکروه وشوم	سیه ترز شب پیشتر از نجوم
همه همچو آتش ولیکن چو دود	کشیده سر از کین بچرخ کبود
چو مور آمد نداز یمیں ویسار	سوار وپیا ده هزاران هزار

(ان ہاتھیوں کے بل پر ذلیل وخوار ہندو اصحاب فیل کی طرح مغرور ہو گئے۔ شام اجل کی مانند وہ سب کریہ ومنحوس تھے۔ (ہیکل) میں رات سے زیادہ سیاہ اور (تعداد) میں ستاروں سے بیشتر تھے۔ وہ سب آگ کی طرح تھے لیکن دھوئیں کی مانند، انہوں نے دشمنی کی غرض سے اپنا سر نیلے آسمان تک اٹھا رکھا تھا۔ وہ دائیں اور بائیں جانب سے چیونٹیوں کی طرح آئے تھے۔ ان میں سوار وپیادہ ہزاروں ہزار تھے۔)

چنانچہ وہ قتل وغارتگری وکارزار کے ارادے سے لشکر گاہ افواج اسلام شعار کی جانب متوجہ ہوئے لشکر اسلام کے جانباز سپاہ نے جن کا شمار شجاعت کے باغات میں ہوتا ہے صنوبر کی مانند جنگ وجدال کے لئے قطاریں مرتب کرلیں اور ان کے گنبد نما صنوبر کی وضع کے کلاہ خود شعاع آفتاب کے باعث مجاہدین خدا کے قلوب کی مانند بلندی کی اوج پر پہنچ گئے۔ ان کی پر قطار آہن فام سدّ سکندری کی مانند محکم، استقامت میں مثل شریعت پیغمبر اکرم اس استوار اور استحکام وپائداری میں ان کی قوت متانت ایسی گویا کہ ''وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔'' (قرآن ۴:۶۱) فلاح وفیروزمندی میں ''ایسے لوگ جو اپنے رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں'' (قرآن ۵:۲)

در آن رخنه نی از طباع وهیم	جو رائی شهنشاه ودین قویم
علم های او عرش فرسا همه	الفها انّا فتحنا همه

(کسی واہمی آدمی کے خیالات کی طرح ان میں رخنہ وشگاف کی گنجائش نہ تھی۔ استحکام وپائداری میں ایسے جیسے شہنشاہ کی رائے اور دین کے ستون۔ ان کے علم ایسے بلند کہ عرش کو مس کریں۔ اور سب کے سب ایسے راست قامت گویا ''انّا فتحنا'' (ہم نے فتح دی) کے وہ الف ہوں)

(ورق ۲۸۸) ان کے محکم عزم وارادے کو مدّ نظر رکھتے ہوئے غازیان روم کی مانند ان تفنگ داروں اور برق اندازوں کے لئے جو سپاہ کے پیش پیش تھے گاڑیوں کی قطار ترتیب دے کر انہیں زنجیر کے ذریعے ایک

۲۳۔ خانوہ۔ آگرہ سے جنوب مغرب کی طرف سیکری اور بساور کے درمیان واقع ہے۔

دوسرے کے ساتھ متصل کر دیا گیا۔ مختصر یہ کہ سپاہ اسلام نے ایسا انتظام واستحکام پیدا کیا کہ چرخ اثیر کی عقل پیر بھی ان کی تدبیر وترتیب کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس ترتیب وانتظام اور استواری واستحکام میں مقرب حضرت سلطانی اور اعتماد دولت خاقانی نظام الدین علی خلیفہ نے سعی وکوشش اور اجتہاد کی داد دی۔ اس کی تمام تدابیر تقدیر کے موافق اور اس کے سپاہی امور سرداری وکارگزاری میں پسندیدہ واقع ہوئے۔

حضرت بادشاہ کا تقرر ومقام قلب میں مقرر کیا گیا۔ قلب کی دائیں جانب برادر اعز ارشد ارجمند سعادت یار المختص بعواطف الملک المستعان چین تیمور سلطان، فرزند اعز ارشد منظور انظار حضرت الہ سلیمان شاہ۔ جناب ہدایت مآب ولایت انتساب خواجہ کمال الدین دوست خاوند، معتمد السلطنۃ العلیہ مؤتمن الحضرۃ السعیہ مقرب خاص وزبدۂ اصحاب اختصاص کمال الدین یونس علی، عمدۃ الخواص کامل الاخلاص، جلال الدین شاہ منصور برلاس وعمدۃ الخواص زبدہ اصحاب اختصاص نظام الدین درویش محمد ساربان، عمدۃ الخواص صادق الاخلاص شہاب الدین عبداللہ کتابدار، اور نظام الدین دوست ایشیک آقا اپنی اپنی جگہوں پر متعین ہوگئے۔

قلب کے بائیں جانب سلطنت مآب خلافت انتساب المختص بعواطف الملک المستعان سلطان علاؤ الدین عالم خاں ابن سلطان بہلول لودی، مقرب الحضرت السلطانی مشار الیہ، دستور اعاظم الصدور بین الانام ملاذ الجمہور ومؤید الاسلام شیخ زین خوافی، عمدۃ الخواص کامل الاخلاص کمال الدین محب علی ولد مقرب حضرت سلطانی مشار الیہ، عمدۃ الخواص نظام الدین تردی بیگ برادر قوچ احمد مرحوم، عمدۃ الاعاظم والاعیان خاں اعظم آرائش خاں ولد قوچ بیگ مرحوم مشکور وشیر افگن، دستور اعاظم الوزرائے بین الامم خواجہ کمال الدین حسین اور اہل دیوان عظام میں سے ہر ایک اپنے مقام پر قائم ہوگئے۔

برانغار میں فرزند اعز ارشد ارجمند سعادت یار کامگار، منظور انظار، عنایات حضرت آفریدگار اختر برج سلطنت وکامگاری مہر سپہر خلافت وشہریاری المحمد وح بلسان العبد والحر معز السلطنۃ والخلافت محمد ہمایوں بہادر کو متمکن کیا گیا۔ اس سعادت قرین فرزند عزیز کی دائیں جانب جناب سلطنت مآب المختص بعوالطف الملک دیان قاسم حسین سلطان، عمدۃ الخواص نظام الدین احمد یوسف اوغلاقچی، معتمد الملک کامل الاخلاص جلال الدین ہندو بیگ قوچین، معتمد الملک صادق الاخلاص جلال الدین، خسرو کوکلتاش، معتمد الملک قوام بیگ اور اور دوشاہ، عمدۃ الخواص کامل العقیدہ والاخلاص ولی خازن قراقوزی، عمدۃ الخواص نظام الدین پیر قلی سیستانی، عمدۃ الوزرائے بین الامم خواجہ کمال الدین پہلوان بدخشی، معتمد الخواص نظام الدین عبدالشکور، (ورق ۲۸۹) عمدۃ الاعیان سلیمان آقا ایلچی عراق اور حسین آقا ایلچی سیستان مقرر کیے گئے۔ مزکورہ بالا فرزند کی بائیں ظفر آثار جانب عالی جناب سیادت مآب مرتضوی انتساب میر ہمہ، عمدۃ الخواص کامل الاخلاص شمس الدین محمد کوکلتاش اور خواجگی اسد خاندار متعین کیے گئے۔ برانغار کی جانب ہندوستان کے امرا میں سے عمدۃ الملک خانخاناں دلاور خاں، عمدۃ الاعیان ملک داد کرارانی اور عمدۃ الاعیان شیخ المساغ گورن کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے اپنے مقام پر قائم رہیں۔

عساکر اسلام شعار کے جوانغار میں عالیجاہ نقابت پناہ رفعت دستگار افتخار آل ویس قدوہ اولاد سید المرسلین سید مہدی خواجہ، برادر اعز ارشد کامگار منظور انظار عنایات حضرت آفریدگار محمد سلطان مرزا، سلطنت مآب خلافت انتساب المختص بعواطف الملک المستعان عادل سلطان ابن مہدی سلطان، معتمد الملک کامل الاخلاص معز الدین عبد العزیز میر آخور، معتمد الملک شمس الدین علی جنگ جنگ، عمدۃ الاخواص کامل الاخلاص جلال الدین قتلق قدم قراول، عمدۃ الاخواص کامل الاخلاص جلال الدین شاہ حسین یارکی مغل غانچی اور نظام الدین جان محمد بیگ آتکہ نے قطاریں بنالیں۔ اس طرف ہندستان کے امرا میں سے مزکورہ سلطان علاء الدین کے فرزندان کمال خاں وجلال خاں، عمدۃ الاعیان وعلی خاں شیخ زادہ فرملی اور عمدۃ الاعیا نظام خاں بیانہ متعین کیے

گئے۔

عقب کی جانب سے حملہ آوری کیلئے معتمد الخواص تردیکہ، اور بابا قشقہ کے بھائی ملک قاسم کو مغل دستے کے کچھ لوگوں کے ساتھ برانغار میں اور معتمد الملک خواص صادق الاخلاص مومن آتکہ اور معتمد الخواص رستم تر کمان باشلیغ کو تابینان خاصہ کی ایک جماعت کے ساتھ جوانغار کی طرف مقرر کیا گیا۔

عمدۃ الخواص کامل الاخلاص زبدہ اصحاب اختصاص نظام الدین سلطان محمد بخشی نے نماز یانی اسلام کے اعیان وارکان کو ان کے مقررہ مقامات ومواضع پر متعین کرنے کے بعد وہ خود ہمارے احکام سننے کے لئے مستعد وتیار ہوگیا اور مددگاروں نیز خبر رسانوں کو اطراف وجوانب میں روانہ کر کے ہمارے قابل اطاعت احکام کو لشکر وسپاہ کے ربط وضبط سے متعلق سلاطین عظام، امرائے کرام وتمام غازیان واجب الاحترام تک پہنچانے لگا۔

جب ارا کین لشکر قائم کر دیئے گئے تو ہر شخص جہاں، مقرر کیا گیا تھا اس طرف عجلت کے ساتھ روانہ ہوا۔ فرمان واجب الاذعان لازم الامتثال نے صادر ہونے کا یہ شرف حاصل کیا کہ کوئی بھی شخص اپنی متعینہ جگہ سے بغیر حکم حرکت نہ کرے اور جب تک اجازت نہ دی جائے جنگ وجدال میں پیش قدمی نہ کرے۔

مذکورہ دن کا تقریباً ایک پاس اور دو گھڑی وقت گزرا تھا کہ متقابل فریقین ایک دوسرے کے قریب آنے لگے اور اس طرح دونوں کے درمیان جنگ وحرب اور کارزار کا آغاز ہوگیا۔ دونوں جانب سے قلب کے لشکر مثل نور وظلمت ایک دوسرے کے روبرو تھے۔

برانغار اور جوانغار کے لشکر کے درمیان ایسا مقابلہ پیش آیا کہ زمین میں زلزلہ اور سپہر بریں پر ولولہ وغلغلہ پیدا ہوگیا۔ کفار شقاوت آثار کا دستہ جوانغار (ورق ۲۹۰) عسا کر اسلام کے میمنت وآثار دستہ برانغار کی جانب متوجہ ہوا اور خسرو کوکلداش اور بابا قشقہ کے بھائی ملک قاسم پر حملہ کیا۔ چین تیمور کا برادر اعزار شاد فرمان کے مطابق ان کی مدد کے لئے پہنچا اور مردانہ وار قتل وکشتار کا آغاز کر دیا جس کے باعث دستۂ کفار اپنی جگہ قائم نہ رہ سکا اور اس کو ایسا پسپا کیا کہ اس کے دستۂ قلب تک پہنچا دیا چنانچہ اس برادر عزیز کے لئے انعام مقرر کیا گیا۔

فرزند عزیزی ارشد کامگار منظور انظار حضرت آفریدگار الخس بعواطف الملک الذی یامر (بے شک اللہ ہی ممانعت کرتا ہے اور وہی حکم دیتا ہے) محمد ہمایوں بہادر کے دستۂ غول میں سے نادر العصری رومی گاڑیوں کو لے کر آگے بڑھا۔ اس نے تفنگوں اور دور مار توپوں کے ذریعے کفار کی سپہ کو ان کے دلوں کی طرح مسخر کرلیا۔ عین اس وقت جبکہ میدان کارزار گرم تھا قاسم حسین سلطان کے برادر اعزار شد، عمدۃ الخواص نظام الدین احمد یوسف اور قوام بیگ کو فرمان صادر کیا گیا کہ وہ مدد کے لئے پہنچیں چنانچہ وہ اس کی جانب دوڑتے ہوئے پہنچے چونکہ کفار کے پرے ہر زمان مسلسل ومتواتر یکے بعد دیگرے اپنے ساتھیوں کی مدد کے لئے چلے آرہے تھے اسی لئے ہم نے بھی معتمد الملک جلال الدین ہندو بیگ کو، اس کے عقب میں عمدۃ الخواص محمد کوکلتاش اور خواجگی اسد جاندار کو، ان کے بعد کمال الدین یونس علی کے مقرب خاص معتمد السلطنۃ العلیہ مؤتمن العتبہ السنیہ، عمدۃ الخواص کامل الاخلاص جلال الدین شاہ منصور برلاس، عمدۃ الاخواص شہاب الدین عبداللہ کتابدار کو ان کے عقب میں عمدۃ الخواص دوست ایشیک آقا اور شمس الدین محمد خلیل آختہ بیگی کو مدد کے لئے روانہ کیا گیا۔

کفار کے برانغار دستے بار بار لشکر اسلام کے جوانغار دستے کی جانب حملے کرتے رہے اور خود کو وہاں غازیان بالنجات تک پہنچاتے رہے۔ ادھر غازیان اسلام ہر مرتبہ کچھ کافروں کو اپنے ظفر فرجام تیروں کے زخموں سے دار النار کی طرف بھیجتے رہے۔ "اور وہ بدترین دار القرار ہے (قرآن ۲۹:۱۴)" بعض کے انھوں نے رخ پھیر دیئے۔ معتمد الخواص مومن رتکہ اور رستم سیاہ ظلمت دستگار کفار شقاوت پناہ کی عقب میں پہنچے۔ معتمد الخواص صادق الاخلاص خواجہ محمود علی رتکہ باشلیغ کا شمار مقرب حضرت سلطانی اعتماد الدولہ الخاقانی نظام الدین علی خلیفہ کے

ملازمین میں ہوتا ہے۔ اسے موصوف کی مدد کے لئے ہم نے روانہ کیا۔ برادر اعز ارشد محمد سلطان مرزا اور سلطنت مآب عادل سلطان، معتمد الملک معز الدین عبدالعزیز میر آخور، جلال الدین قتلق قدم قراول، شمس الدین محمد علی جنگ جنگ، عمدۃ الخواص شاہ حسین یارکی مغل غانچی نے قتال وجدال میں پیش دستی کر کے میدان کارزار میں اپنے قدم جمالئے۔ دستور اعاظم الوزراء مین الامم خواجہ کمال الدین حسین کو اہل دیوان کی جماعت کے ساتھ ان کی مدد کے لئے ہم نے روانہ کیا۔ تمام اہل جہاد انتہائی جہد اور اجتہاد کی خاطر جنگ وجدال کی طرف راغب ہوئے۔ جن کے پیش نظر قرآن مجید کی یہ آیت تھی: "ان سے کہو تم ہمارے معاملے میں جس چیز کے منتظر ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ دو بھلائیوں میں سے اک بھلائی ہے۔ (اللہ کی راہ میں شہادت یا اسلام کی فتح) اور چونکہ وہ عزم جانفشانی کئے ہوئے تھے اس لئے انہوں نے جاں ستانی کا پرچم لہرادیا۔

جب جنگ وجدال میں بہت دیر ہوگئی اور محاربہ طولانی ہوگیا تو فرمان واجب الاذعان نافذ کیا گیا کہ خاصہ بادشاہی کے تابین میں سے وہ جوانان جنگی اور شیرانی پیشہ یکرنگی (ورق ۳۰۰) جو گاڑیوں کے پیچھے ان شیروں کی مانند تھے جنہیں زنجیروں سے باندھ دیا گیا ہو غول دائیں اور بائیں جانب سے باہر آئیں۔ وہ اپنے درمیان تفنگچیوں کے لئے جگہ بنائے رکھیں۔ اس کے بعد وہ ہر جانب سے حملہ آور ہوں۔ چنانچہ وہ گاڑیوں کے پیچھے سے صبح صادق کی طرح نمودار ہوتے ہوئے پردہ افق سے دوڑتے ہوئے نکل کر باہر آئے اور کفار نابنجار کے خون شفق گون کو اس میدان کارزار میں جو آسمان کی طرح گرداں تھا بہا کر بہت سے سرکشوں کے سروں کو فلک کے وجود سے مثل ستارگاں محو و نابود کر دیا۔ نادر العصر استاد مخلی قلی نے جو اپنے رو کاروں کے ہمراہ غول دستے کے سامنے موجود تھا مردانگی کے جوہر دکھائے۔ اس نے ایسے بڑے بڑے پتھر کہ جنہیں پہہ ترازی میں رکھا جاتا تو وہ پکار اٹھتے اس وقت "جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاں پائیں گے۔" (قرآن ۲۳:۱۰۲) اور اگر استوار و بلند پہاڑوں پر انہیں پھینکا جاتا تو "وہ دھنکے ہوئے اون کی طرح" (قرآن ۱۰۱:۵) زمین پر آرہتے، صف کفار کے آہن وآثار قلعے کی جانب برسائے۔ اس نے سنگ اندازی، دور مار توپوں کی گولہ اندازی اور تفنگ زنی کے ذریعے کفار کے اجسام کی بنیادوں کو منہدم ونگوں کر دیا۔

شاہی تفنگ انداز فرمان کے مطابق گاڑیوں کے پیچھے سے نکل کر میدان کارزار میں وارد ہوئے۔ جس میں سے ہر ایک نے بہت سے کفار کو موت کا زہر چکھایا۔ اس وقت پیادہ سپاہیوں نے بھی بہت ہی سخت خطرہ اپنے سر لے کر اپنا نام پیشہ مردانگی کے شیروں اور معرکہ جواں مردی کے دلیروں میں نمایاں کر دیا۔ اس کیفیت وحالت کے دوران حضرت خاناں کا یہ فرمان نازل ہوا کہ قلب دستے کی گاڑیوں کو آگے لایا جائے۔ حضرت بادشاہ فتح ودولت بنفس نفیس نصرت اقبال کی برکت کے باعث بائیں جانب سے کفار کی جانب حرکت میں آئے۔ جب اطراف وجوانب سے عساکر ظفر مناقب نے اس کیفیت کو ملاحظہ کیا تو لشکر نصرت شعار کے تمام بحر ذکار میں جوش وخروش آگیا اور اس سمندر کے نہنگان شناور کی شجاعت وبہادری کی قوت عمل میں تبدیل ہوگئی ظلمت کی سیاہی کی مانند ابر تمام میدان کارزار پر چھا گیا۔ شمشیروں کی تابانی کی تحریرین بجلی کی درخشانی کو مات کر گئیں۔ گرد وغبار کے جوش وہیجان نے خورشید کے چہرے کو آئینے کی پشت کی مانند روشنی سے محروم کر دیا۔ ضرب زن ومضروب اور غالب ومغلوب اس طرح دست وگریباں ہوئے کہ دونوں کے درمیان مرتبہ فرق وامتیاز نظروں سے پنہاں ہوگیا۔ زمانہ سحر کار نے ایسی رات کا منظر پیش کیا کہ جس میں تیروں کے سیاروں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا، اور اس معرکہ کارزار میں کواکب ثابت تھے تو بس ثابت قدم سواروں کے دستے۔

فرو رفت و بر رفت روز نبرد نم خون بماهی و بر ماه کرد

(اس جنگ کے دن خون کی نمی (پاتال کی) مچھلی تک اور گرد وخاک چاند تک پہنچ گئی)

زسم ستوران دران پهن دشت زمین شش شد و آسمان گشت هشت

مجاہدان غازی عین اس وقت جبکہ وہ سراندازی و جانبازی میں لگے ہوئے تھے ہاتف غیبی سے یہ خوش خبری سن رہے تھے تم دل شکستہ نہ ہو۔ غم نہ کرو۔ ''تم ہی غالب رہو گے اگر تم مؤمن ہو'' (قرآن ۳:۱۳۹) اور منتہی لا ریبی سے اللہ کی طرف نصرت اور قریب ہی حاصل ہو جانے والی فتح ''اے نبی اہل ایمان کو اس کی بشارت دے دو'' (قرآن ۶۱:۱۳) کا پیغام پا رہے تھے وہ اس ذوق شوق سے جنگ وجدال کر رہے تھے (ورق ۳۰۱) کہ قدسیان ملا اعلا بھی اس کی داد دے رہے تھے اور اس کی صدائے تحسین ان تک پہنچ رہی تھی اور ملا یک مقرب بھی پروانہ واران کے سروں کے گرد گرداں تھے۔

ظہر وعصر کے درمیان آتش جنگ کچھ اس طرح برافروختہ ہوئی کہ اس کے شعلوں کے علم آسماں تک سر فراز ہونے لگے۔ اس جنگ نے لشکر اسلام کے برانغار جوانغار اور کفار کے جوانغار و برانغار نا فرجام کو ان کے قلب میں ایک جگہ جمع کر دیا۔ جس وقت نامور مجاہدین کی علامات فیروزی اور اسلامی پرچموں کی بلندی ظاہر وعیاں ہونے لگی تو کچھ دیر کے لئے لعین اور اشرار بے دین اپنی حالت پر حیران وحیرت زدہ رہ گئے۔ بالآخر اپنی جانوں سے ہاتھ دھو کر انہوں نے قلب کے دائیں اور بائیں جانب دستوں پر حملہ کر دیا۔ ان کا حملہ بیشتر بائیں جانب تھا جس کے باعث وہ ہمارے نزدیک پہنچ گئے لیکن غازیان شجاعت آثار نے ثمرۂ ثواب کی خاطر تیروں کے نونہال ان کے سینوں کی زمین میں پیوست کر دئے اور ان سب کے منہ ان کے بخت سیاہ کی طرح پھیر دئے۔ اسی وضع وکیفیت کے دوران نسیم نصرت اقبال نواب خجستہ مال کے چمن دولت پر چلنی شروع ہوگئی اور اس نے ''ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کردی'' (قرآن ۴۸:۱) کی خوش خبری پہنچائی۔ شاید فتح ونصرت کا جمال عالم آرا'' اور ''تم کو زبر اور دست نصرت بخشے'' (قرآن ۴۸:۳) کے طرّے سے مزیّن ہو گے۔ پوشیدہ و پنہاں اقبال کی سعادت مندی نے رونما ہو کر یاوری و مددگی اور ہمنوا بھی ہوگئی۔

جب باطل حال ہندوؤں نے خود کو مشکل و پریشانیمیں دیکھا تو وہ رنگ برنگے دھنکے ہوئے اون کی طرح'' (قرآن ۱۰۱:۵) اور بکھرے ہوئے ''پروانوں کی طرح'' (قرآن ۱۰۱:۴) منتشر ہوگئے۔ بہت سے لوگ قتل ہو کر میدان کارزار میں گر گئے۔ کثیر تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو سر کی بازی لگا کر جنگل و بیاباں میں حیران و سرگرداں ہو کر نکل گئے اور وہاں وہ زاغ وزغن کا لقمہ بن گئے۔ قتل وکشتار کا یہ عالم تھا کہ کشتہ لوگوں کے پشتے بن گئے اور ان کے سروں سے مینار تعمیر کئے گئے۔

حسن خاں میواتی تفنگ کی ضرب سے مردہ لوگوں کی صف میں شریک کر لیا گیا۔ اسی طرح بیش وسرکشاں ضلالت نشان جن کا شمار اس قوم کے سربرآوردہ لوگوں میں ہوتا تھا۔ تیر وتفنگ کا ایسا نشانہ بنے کہ یوم حیات ان پر قطع ہوگیا۔ ان میں بارہ ہزار گھڑسواروں کا مالک ڈنگر پور کا راجہ راول اودے سنگھ، چار ہزار سوار کا مالک چندر بھائی چوہان وہاں، چھ ہزار سواروں کا مالک ریاست چندیری کا حاکم بھوپت راؤ ولد صلاح الدین مذکور، مانک چند چوہان، چار ہزار سواروں کا مالک دلپت راؤ گنگو، کرم سنگھ، تین ہزار گھڑسواروں کا مالک ڈنگرسی اور کچھ دیگر سردار شامل تھے۔ جن میں سے ہر ایک کسی بڑے گروہ کا سرکردہ اور سب ہی صاحب شان وشوکت حاکم وفرماں رواں تھے۔ ان سب نے راہ دوزخ اختیار کی اور اس گارے کے گھروندے سے نکل کر جہنم کی تہہ میں پہنچ گئے۔ دار الحرب کا راستہ زخمیوں سے اس طرح بھر گیا جیسے لاشوں سے راہ جہنم۔ منافقین نے اپنی جان مالک دوزخ کے سپرد کردی جس نے انہیں وہاں کے پست ترین طبقے میں دھکیل کر بھر دیا۔ اسلامی افواج میں ہر شخص جس طرف بھی دوڑا ہوا جاتا وہ ہر گام پر کسی خود سر وخود کام شخص کو مقتول پاتا۔ ہمارا نامور لشکر شکست خوردہ لوگوں کے تعاقب میں جتنے بھی کوچ کرتا کسی بھی قدم پر بھی اسے کوئی جگہ نظر نہ آتی جہاں کوئی فرسودہ صاحب حشم وذیشان نہ پایا جاتا ہو۔

(ورق ۳۰۲)

همه هندوان کشته زار و زلیل   بسنگ تفک همچو اصحاب فیل

(تمام ذلیل وخوار ہندو تفنگ کی گولی سے اصحاب فیل کی طرح مارے گئے)

زتنها بسی کو ه ها شد عیان   بهر کوه از آن چشمه خون روان

(مردہ جسموں کے بہت سے پہاڑ بن گئے اور ہر پہاڑ سے خون کا چشمہ جاری تھا)

زسهم سهام صف پر شکوه   گریزان گریزان به هر دشت و کوه

(ہمارے تیروں کے خوف سے پرشکوہ صفیں۔ ہر جنگل اور پہاڑ پر فرار ہوتی ہوئی نظر آئیں)

ولو علی ادبار ہم نفوراً (قرآن ۴۶:۱۷)

(وہ پلٹ کر کمر دکھاتے ہوئے فرار ہوتے ہیں)

وکان امر الله قدراً مقدوراً (قرآن ۳۳:۳۸)

(اللہ کا حکم ایک قطعی طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے۔)

ہم اللہ کی حمد کرتے ہیں والله سمیع علیم (قرآن ۱۲۱:۳) کہ وہ سننے اور جاننے والا ہے۔ فتح اللہ کی طرف سے ہوتی ہے جو عاقل اور طاقت ور ہے۔

یہ فرمان بتاریخ پچیس ماہ جمادی الآخر ۹۳۳ھ تحریر پذیر ہوا۔

۲۳۔ قل لا یعلم من فی السموات والارض الغیب الا اللـه " ان سے کہو، اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا (قرآن ۶۵:۲۷)

خطاب غازی

اس فتح کے بعد فرامین کے عنوانات میں میرے نام کے ساتھ غازی لکھا جانے لگا۔ عنوان کے نیچے میں نے یہ رباعی درج کی

اسلام او چون آو ره یازی بولدوم   کفار و هنود حسر بسازی بولدوم

جو زم ایلاب ایدیم اوزنی شهید اولما ققه   المنته الله که غازی بولدوم

(اسلام کی خاطر میں جنگل وصحرا میں سرگرداں رہا۔ اس دین کے لئے میں کفار اور ہندوؤں سے برسر پیکار ہوا۔ اگرچہ میرا عزم تو شہید ہونا تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ غازی بن گیا۔)

تاریخ فتح

شیخ زین نے اس موقع پر ''فتح بادشاہ اسلام'' (۹۳۳)۔ سے تاریخ نکالی۔ جو کابل سے آرہے تھے ان میں سے میر گیسو نے بھی انہی الفاظ سے تاریخ نکالی اور اسے رباعی میں بیان کر کے میرے پاس بھیجی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ دونوں کی تاریخ میں توارد ہو گیا۔ شیخ زین اور میر گیسو کی فلاح و بہبود کے پیش نظر ان کی رباعیات کو انہی کے الفاظ میں درج کر لیا گیا۔ پچھلی مرتبہ فتح دیپال پور کے موقع پر بھی ایسا ہی ہوا تھا شیخ زین نے ''وسط شہر ربیع الاوّل'' (۹۳۰) سے تاریخ نکالی اور میر گیسو نے بھی انہی الفاظ سے تاریخ نکالی تھی۔

باغی کو زیر کر کے ہم آگے روانہ ہوئے۔ کفار کا ڈیرا ہماری لشکر گاہ سے دو کروہ کے فاصلے پر ہوگا۔ اس کی لشکرہ گاہ تک پہنچ کر محمدی، عبدالعزیز علی خاں اور بعض دیگر افراد کو دشمن کی لشکر گاہ تک تعاقب کرنے کے لئے بھیجا گیا لیکن انہوں نے ذرا تساہل سے کام لیا۔ اچھا ہوتا کہ میں ان پر بھروسہ نہ کرتا اور خود ہی روانہ ہوتا میں کفار کے ڈیرے سے تقریباً ایک کروہ آگے نکل چکا تھا لیکن دن چونکہ کافی ڈھل چکا تھا اس لئے میں وہاں سے واپس آ گیا، اور عشا کے وقت اپنی لشکر گاہ میں پہنچا۔ محمد شریف نجومی نے کیا کیا منحوس فال منہ سے نہیں نکالی تھی۔ وہ بھی فتح کی مبارکباد دینے کے لئے آیا[۲۴]۔ میں نے اسے بہت برا بھلا کہا اور اپنے دل کا غبار نکالا۔ اگر چہ وہ بے

ایمان و بدنفس، مغرور و سرد مزاج آدمی تھا۔ لیکن چونکہ کافی عرصے سے خدمت کرتا چلا آرہا تھا اس لئے ایک لاکھ انعام دے کر اس حکم کے ساتھ رخصت کیا کہ وہ میری قلمرو میں کہیں نہ رہے۔

اگلے دن صبح اس منزل پر ہم قیام پذیر ہوئے۔ محمد علی جنگ جنگ، شیخ گورن اور عبدالملک قورچی کو کثیر فوج کے ہمراہ الیاس[۲۵] خاں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا گیا۔ اس نے دوآبہ میں علم بغاوت بلند کر کے کول پر قبضہ کر لیا تھا اور کچک علی کو قید کر دیا تھا وہ جس وقت وہاں پہنچے تو اس میں اتنی تاب و توانائی نہ تھی جنگ کر سکے کیونکہ اس کے آدمی خستہ حال ہو کر ہر طرف منتشر ہو گئے تھے جب میں آگرہ پہنچا تو اسکے چند روز بعد اسے گرفتار کر کے لایا گیا۔ میں نے حکم دیا کہ اس زندہ کی کھال اتار لیں۔

کوہ بچہ نامی پہاڑ جس پر ہماری جنگ ہوئی اس پر (ورق ۳۰۳) میں نے حکم دیا کہ کفار کے سروں سے کلہ مینار تعمیر کریں۔ اس جگہ سے ہم دو منزلوں پر قیام کرتے ہوئے بیانہ پہنچ گئے۔ صرف بیانہ ہی نہیں بلکہ الور اور میوات تک کفار اور مرتدین کی لاتعداد لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے بیانہ کا معائنہ کیا اور واپس لشکرگاہ آ گیا میں نے ترک و ہندستانی امرا کو بلایا اور ان سے کافر کی ولایت پر یورش کرنے کے لئے مشورہ کیا راستے میں پانی کی قلت اور گرمی کی شدت کے باعث یورش کا ارادہ ملتوی کر دیا گیا۔

میوات دہلی کے نزدیک ہی واقع ہے جس کی آمدنی تخمیناً تین چار کروڑ ہے یہاں حسن خاں میواتی نسل در نسل تقریباً دو سو سال سے مستقلاً حکومت کرتا چلا آرہا تھا۔ اس کے آباد و اجداد سلاطین دہلی کے بس برائے نام ہی مطیع و فرماں بردار تھے۔ سلاطین ہند نے بھی اپنی ولایت کی وسعت کے باعث یا اس ولایت کے کوہستانی ہونے کی وجہ سے اس پر دھیان نہیں دیا اور اس کے نظم و نسق کے بارے میں بھی خاص توجہ نہ دی۔ بس ان کی اطاعت و فرمانبراری پر اکتفا کیا۔ ہم نے بھی ہندوستان کی فتح کے بعد سابقہ سلاطین کی طرح حسن خاں کے ساتھ مراعات کا سلوک روا رکھنا چاہا لیکن یہ حق ناشناس کافر و ملحد ہمارے الطاف عنایات کو خاطر میں نہ لایا اور اس کے ساتھ جو حسن تربیت و رعایت کا رویہ اختیار کیا گیا تھا اس کا شکر گزار نہ ہوا۔ چنانچہ وہ تمام فسادات اور اعمال بد جو رونما ہوئے اور جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے ان کا محرک یہی تھا۔

جب یہ یورش ملتوی ہو گئی تو ہم ولایت میوات کی تسخیر کی جانب متوجہ ہوئے۔ چار منزلیں طے کرنے کے بعد ہم قلعہ الور سے چھ کروہ کے فاصلے پر جو اس ولایت کا پائے تخت ہے۔ دریائے منسنی کے کنارے قیام پذیر ہوئے۔ حسن خاں کے آباد و اجداد کا مسکن تجارہ تھا۔ جس سال میں ہندوستان کی جانب متوجہ ہوا اور پہاڑ خاں کو زیر کر کے لاہور و دیپالپور پر قبضہ کیا تو انہیں میری جانب سے تردّد ہوا اس لئے انہوں نے اس قلعے کی تعمیر شروع کر دی۔ کرم چند نامی شخص حسن خاں کا معتبر تھا۔ جس وقت میں آگرہ میں مقیم تھا تو اس کا لڑکا مجھ سے ملاقات کرنے کے لئے وہاں آیا۔ لڑکے کی آمد سے قبل وہ خود بھی آ چکا تھا اور امان چاہی تھی۔ عبدالرحیم شقاول کو اس کے ہمراہ کر کے اس کی دلجوئی کے فرامین روانہ کئے گئے وہ حسن خاں کے لڑکے بابر خاں کو اپنے ساتھ لے کر آیا۔ ایک بار پھر اس کے ساتھ عنایات کا سلوک کیا گیا۔ ایک پرگنہ جس کی آمدنی کئی لاکھ تک تھی اسے عطا کیا گیا۔

جنگ میں خسرو نے چونکہ نمایاں کارنامہ انجام دیا تھا اس لئے اس کی اس سعی و کوشش کو مدنظر رکھتے ہوئے پچاس لاکھ وظیفہ مقرر کر کے اسے الور کا علاقہ قبول کرنے کے لئے کہا گیا۔ وہ ایسا بدبخت تھا کہ وہ اس پر راضی نہ ہوا بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کارنامہ تو چین تیمور سلطان نے سر کیا تھا۔ میوات کا پائے تخت شہر تجارہ ہے۔ اس کو یہ شہر عطا کر کے پچاس لاکھ کی رقم بطور وظیفہ عطا کی گئی۔

سانگاہ کی جنگ میں دائیں جانب کا دستہ تردیکہ کی زیرنگرانی تھا۔ اس نے اس جنگ میں دوسروں کی نسبت۔ (ورق ۳۰۴) بہتر کارنامہ انجام دیا تھا۔ اس کا وظیفہ پندرہ لاکھ مقرر کر کے الور کا قلعہ اسے عنایت کر دیا گیا

۲۵۔ الیاس خاں۔ یہاں بھول چوک معلوم ہوتی ہے، کیونکہ ورق ۲۹۳ میں بابر نے تحریر کیا ہے کہ جس شخص نے دوآبہ میں بغاوت کر کے کچک علی کو قید کیا وہ "پست آدمی رستم خاں" تھا۔

الور کا خزانہ اور جو کچھ اس کے قلعے میں موجود تھا وہ ہمایوں کو عطا کر دیا گیا۔

بتاریخ اوّل ماہ رجب بدھ کے دن اس منزل سے کوچ کر کے ہم الور سے دو کروہ کے فاصلے پر قیام پذیر ہوئے۔ میں نے قلعہ الور میں پہنچ کر اس کا معائنہ کیا۔ وہ رات میں نے وہیں بسر کی اور صبح واپس لشکر گاہ میں پہنچا۔ اس سے پہلے اس بات کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ کافر کے ساتھ دینی جنگ کرنے سے قبل یہ قسم دی گئی تھی کہ فتح کے بعد خورد و کلاں پر پابندی نہ رہے گی۔ جو شخص بھی جانا چاہے گا اسے جانے کی اجازت دی جائے گی۔ ہمایوں کے بیشتر ملازمین بدخشانی تھے۔ ان لوگوں نے دو مہینے کا طویل سفر کیا تھا۔ وہ جنگ سے پہلے ہی چونکہ ہمت ہار چکے تھے اسی لئے ان کے ساتھ یہ وعدہ کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کابل بھی خالی تھا۔ اس بنا پر سب کی رائے نے اس امر پر متفق تھی کہ ہمایوں کو کابل جانے کی اجازت دے دی جائے۔

اس کے بعد بات یہیں پر ختم ہوگئی۔ بتاریخ ۹ ماہ رجب جمعرات کے دن ہم نے الور سے چار پانچ کروہ کوچ کر کے دریائے مناسنی کے کنارے رکے۔ مہدی خواجہ کو بھی چونکہ سخت تشویش لاحق تھی۔ اس لئے ایسے کابل جانے کی اجازت دے دی گئی اور دوست ایشیک آغاز کو بیانہ کا شقدار مقرر کر دیا گیا۔

اس سے قبل اٹاوہ مہدی خواجہ کے نام تھا جب قطب خاں اس کو ترک کر کے وہاں سے فرار ہوگیا تو مہدی خواجہ کے لڑکے جعفر خواجہ کو اٹاوہ عنایت کر دیا گیا۔ ہمایوں کو رخصت کرنے کے لئے ہم نے تین چار دن اسی منزل پر قیام کیا۔ اسی منزل سے مومن علی قورچی کو فتح نامہ کے ساتھ کابل روانہ کیا گیا۔ چشمہ فیروز پور اور کوٹلہ کی جھیل کی بڑی تعریف سنی تھی۔ ہمایوں کو رخصت کرنے اور ان جگہوں کی سیر کرنے کی خاطر بروز اتوار ہم لشکر کو اسی منزل پر چھوڑ کر اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ اس روز ہم نے فیروز پورا اور اس کے چشمے کی سیر کی۔ یہاں ہم نے معجون کی چسکیاں بھی لیں۔ جس درّے میں اس چشمے کا پانی بہہ کر آتا ہے وہاں کنیر کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ جگہ صفائی و پاکیزگی سے خالی نہیں لیکن جس قدر اس کی تعریف کی گئی تھی اتنی عمدہ نہیں۔ اسی درّے میں اس جگہ جہاں ندی کچھ چوڑی ہوگئی ہے میں نے حکم دیا کہ پتھروں کو تراش کر یہاں دس گز لمبا اور دس گز چوڑا حوض تیار کیں۔ وہ رات ہم نے اسی درّے میں بسر کی۔ اگلے دن صبح کے وقت گھوڑے پر سوار ہو کر میں نے کوٹلہ کی جھیل کا معائنہ کیا اس کے ایک کنارے پر پہاڑ کا دامن ہے۔ اس جھیل کے اطراف میں چھوٹی چھوٹی بہت سی کشتیاں نظر آتی ہیں۔ اس جھیل کے اطراف میں جو گاؤں آباد ہیں وہاں کے لوگ جب کوئی شور غوغا ہوتا ہے تو اس سے نجات پانے کے لئے ان کشتیوں میں سوار ہو جاتے ہیں تاکہ وہ خود کو اس سے نجات دلا سکیں۔ جب ہم وہاں پہنچے تو اس وقت بھی لوگوں کا ایک گروہ کشتیوں پر سوار ہو کر جھیل کے بیچ میں پہنچ گیا اس جھیل کی سیر کر کے ہم واپس آئے اور ہمایوں کی لشکر گاہ میں قیام پذیر ہو کر آرام کیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہمایوں اور اس کے امرا کو خلعتیں پہنائیں۔ عشا کے وقت (ورق ۳۰۵) ہمایوں کو رخصت کرنے کے بعد ہم گھوڑوں پر سوار ہوئے اور راستے میں ایک جگہ سو گئے۔ صبح کے وقت پرگنہ کھڑی سے گزر کر ہم نے پھر تھوڑی دیر سو کر آرام کیا۔ لشکر گاہ کو پہلے ہی تودہ نامی مقام پر نصب کیا جا چکا تھا چنانچہ ہم بھی وہاں پہنچ گئے۔

حسن خاں میواتی کے لڑکے ناہر خاں کو عبدالرحیم کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ جس وقت ہم سونی گڑھ میں قیام پذیر ہوئے تو وہ وہاں سے فرار ہوگیا۔ یہاں ایک جگہ بیچ میں رات بسر کر کے اس چشمے پر پہنچ گئے جو بسا ور اور چوسہ کے درمیان پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے۔ یہاں ہم قیام پذیر ہوئے اور شامیانے نصب کر کے معجون کی چسکیاں لینے کا اہتمام کیا۔ جس وقت ہمارا لشکر اس جگہ سے گزر رہا تھا تو تردی بیگ خاکسار نے اس چشمے کی بہت تعریف کی تھی۔ یہاں پہنچ کر میں گھوڑے پر سوار ہوا اور اس جگہ کا معائنہ کرنے کے لئے نکلا۔ عجب پر کیف چشمہ ہے۔

ہندستان میں جہاں آب رواں کا فقدان ہو وہاں چشمے کی کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ اگر چہ یہ چشمہ ہی ہے مگر اس میں پانی زمین سے رستا ہے اور اس طرح جوش مارتا ہوا نہیں نکلتا جیسا ہمارے ملک کی زمینوں میں ہوتا ہے۔ اس چشمے کا پانی تقریباً نصف پن چکی [۲۶] کے برابر ہوگا۔ پہاڑ کے دامن پر پہنچ کر اس کا پانی جوش مارنے لگتا ہے۔ اس کے اطراف میں جو سبزہ زار ہیں وہ سب ہی مجھے دلکش نظر آئے۔ میں نے حکم دی کہ اس چشمے پر پتھیروں کو تراش کر آٹھ پہلو حوض بنائیں۔ چشمے کے کنارے، جس وقت معجون کا شغل ہو رہا تھا تردی بیگ بار بار یہ کہے جا رہا تھا کہ چونکہ یہ جگہ مجھے پسند آئی ہے اس لئے اس جگہ کا کچھ نام رکھا جانا چاہئے۔ اس پر عبداللہ بیگ نے کہا کہ اس کا نام "تردی بیگ کا پسندیدہ بادشاہی چشمہ" ہونا چاہئے۔ چنانچہ اس بات پر سب کو ہنسی آگئی اور خوب دل لگی رہی۔

دوست ایشیک آغا بیانہ سے اسی چشمے پر حاضر خدمت ہوا۔ یہاں سے روانہ ہو کر ہم نے دوسری مرتبہ بیانہ کا معائنہ کیا وہاں سے سیکری پہنچ گئے اور اس باغ کے قریب قیام پذیر ہوئے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ میں نے یہاں دو روز قیام کیا اور باغ کی تیاری کا اہتمام کر کے جمعرات کی صبح بتاریخ ۲۳ رجب آگرہ پہنچ گیا۔

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ چندوار اور راپڑی میں مخالفین شور و غوغا بپا کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ محمد علی جنگ جنگ، تردی بیگ، قوچ بیگ، عبدالملوک قورچ اور حسین خاں کو دریا خانیوں کے ہمراہ چندوار اور راپڑی کی جانب روانہ کیا گیا۔ چندوار میں قطب خاں کے آدمی موجود تھے۔ جیسے ہی یہ لوگ اس جگہ کے نواح میں پہنچے اور اندر کے لوگوں کو اس کا علم ہوا تو وہ وہاں سے فرار ہو گئے اور اس طرح چندوار پر ہمارا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے راپڑی کی جانب رخ کیا۔ حسین خاں نوحانی کے لوگ گلی کوچوں کی ناکہ بندی کر کے جنگ کرنے کے لئے آئے لیکن جب ہمارے آدمی اپنی پوری قوت کے ساتھ نزدیک پہنچے تو وہ اس کی تاب نہ لا سکے اور فرار ہو گئے۔ حسین خاں ہاتھی پر سوار تھا۔ وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ دریائے جمنا میں کود گیا اور اس میں غرق ہو گیا۔ جب قطب خاں کو اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو وہ بھی اٹاوہ خالی کر کے فرار ہو گیا۔ چونکہ اٹاوہ ابتدا میں ہی مہدی خواجہ کے نام کر دیا گیا تھا اس لئے اس کے لڑکے جعفر خواجہ کو مہدی خواجہ کی جگہ اٹاوہ کی جانب روانہ کر دیا گیا۔ (ورق ۳۰۶)

اس سے قبل اس بات کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ جب سانگا کافر نے سرکشی کی تو اکثر ہندوستانی اور کافر فرمانروا اپنی اپنی ولایت اور پرگنوں مین واپس آکر ان پر متصرف ہو گئے سلطان محمد دولدی قنوج کو ترک کر کے میرے پاس آگیا تھا۔ اس نے یا تو خوف کے باعث یا عزت و ناموس کی بنا پر قنوج کی جانب جانا قبول نہ کیا۔ اس نے تیس لاکھ آمدنی کے قنوج کے علاقے سے پندرہ لاکھ کی آمدنی کا سرہند بدل لیا۔ چنانچہ قنوج کا علاقہ محمد سلطان مرزا کو عنایت کر کے اس کا وظیفہ تیس لاکھ مقرر کر دیا گیا۔ بدایوں کا علاقہ قاسم حسین کو عنایت کر کے اسکو محمد سلطان مرزا کے ہمراہ کر دیا گیا۔ ان کے ساتھ، ترک امرا، بابا قشقہ کا ملک قاسم مع برادران و ہمراہی مغل، ابوالمحمد نیزہ باز، معید مع اس کے والد سے وابستہ ملازمین، سلطان محمد دولدی، حسین خاں معہ اس کے دریا خانی وابستگان اور سلطان محمد دولدی بھی ساتھ گئے۔ ہندوستانی امرا میں سے علی خاں فرملی، ملک داد کرارانی، شیخ محمد، شیخ بھکری اور تا تار خاں خان جہاں کو محمد سلطان مرزا کے ہمراہ کر کے اسے ببن کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا گیا کیونکہ سانگاہ کافر کی شورش کے دوران اس نے لکھنور [۲۷] پہنچ کر اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ جس وقت یہ فوج دریائے گنگا کو عبور کر رہی تھی ببن کو اس کا علم ہو گیا۔ چنانچہ وہ اپنا مال و متاع چھوڑ کر وہاں سے فرار ہو گیا۔ اس فوج نے اس کا خیر آباد تک تعاقب کیا اور کچھ دن وہاں قیام کر کے واپس آگئی۔ اس کے بعد خزانہ تقسیم کیا گیا۔ ابھی ولایات اور پرگنات کی تقسیم کا موقع نہیں ملا تھا کہ کافر کے ساتھ دینی جنگ کا مسئلہ پیش آگیا۔

ولایت کی تقسیم

کافر و دینی جنگ سے فارغ ہونے کے بعد ولایات اور پرگنات کو تقسیم کیا گیا۔ چونکہ برسات کا موسم نزدیک آگیا

۲۶۔ پن چکی۔ پانی کے بہاؤ کی طاقت سے کسی مشین کو چلانا۔ اس کو مختلف کاموں میں استعمال کیا جاسکتا ہے جیسے پانی نکالنے کے لئے، گیہوں پیسنے کے لئے، پتھر چورا کرنے کے لئے اور اوزاروں کو تیز کرنے کے لئے۔ پن چکیوں کا استعمال پہلی صدی قبل مسیح میں چین میں معلوم تھا (برٹینیکا ۱۲:۲۲۵، ۱۸:۴۵۳) پن چکی کی قوت کئی چیزوں پر منحصر ہے جیسے پانی کی مقدار، پانی کے بہاؤ کی رفتار اور وہ اونچائی جہاں سے پانی گر رہا ہے۔ یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ بابر جس پن چکی کا ذکر کر رہا ہے وہ کس استعمال میں تھی۔ ہندوستان میں زیادہ تر پن چکیاں پانی نکالنے کے استعمال میں تھیں۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے:

ہماری چشم گریاں سے مقابل جو پن چکی ہوئی پانی بھرا کی (شاد)

مہذب اللغات ج ۳ ص ۱۰۶

۲۷۔ لکھنور۔ سرکار سنبھل میں شاہ آباد کا پرانا نام (آئین اکبری ج ۲ ص ۹۹۷) جو اب رام پور میں ہے۔

تھا اس لئے یہ مقرر کیا گیا کہ ہر شخص اپنے اپنے پرگنے کی جانب چلا جائے اور وہاں خود کو مسلح کرے اور جب بارش کا موسم گزر جائے تو واپس آ کر حاضر خدمت ہوں۔

ہمایوں کی ناشائستگی

اس اثنا میں خبر آئی کہ ہمایوں دلی پہنچ گیا ہے اور وہ خزانے جو وہاں موجود تھے ان میں سے چند کو کھول کر وہ ان پر بلا حکم قابض ہو گیا ہے۔ مجھے اس سے ایسی توقع ہرگز نہ تھی۔ اس کا یہ قدم میرے دل پر بہت شاق گزرا۔ اس باب میں میں نے اسے سخت نصائح لکھ کر روانہ کیں۔

عراقی (ایرانی) سفارت کی واپسی

خواجگی اسد کو ایلچی بنا کر عراق عجم بھیجا گیا تھا بتاریخ ۱۵ شعبان جمعرات کے دن وہ واپس آیا اور اپنے ساتھ سلیمان ترکمان کو لایا۔ اسکو دوبارہ سلیمان کے ہمراہ کر دیا گیا اور شاہزادہ طہماسپ کے لئے ایسے تحائف جو ایلچی گیری کے لئے مناسب ہو سکتے تھے بطور سوغات روانہ کئے۔

تردی بیگ خاکسار نے درویشی اختیار کر رکھی تھی۔ میں نے اسے سپاہ گری کی ترغیب دی۔ چند سال وہ میری خدمت میں ملازم رہا مگر اس پر دوبارہ جذبہ درویشی غالب آ گیا۔ اس نے مجھ سے رخصت چاہی۔ جو اسے دے دی گئی اور کامران کے پاس میں نے اسے اپنا ایلچی بنا کر بھیجا۔ گزشتہ سال میں نے ان لوگوں کے حسب حال اک مختصر قطعہ کہا تھا جو میرے پاس سے چلے گئے تھے۔ یہ قطعہ تردی بیگ کے توسط سے ملا علی خاں کو بھیجا گیا تھا۔ وہ قطعہ یہ ہے:

ای الار کیم بو هند کشوریدین	بار دینگیز انکلاب اوز کا رنج والم
کابل وخوش هوا سینی سا غینب	هند دین کرم بار دینگز اول دم
کور دینگیز تا بینگیز ایکن الدا	عشرت وعیش بیرله ناز ونعم (ورق ۳۰۷)
بیز داغی اولما دوک بحمدلله	کرچه کوب رنج ابدی بیحد غم
حظ نفسنی مشقت بدنی	سیز دین اوتی واوتی بهتر دیں هم

اے لوگو! جو ملک ہند کی زمین سے چلے گئے ہو، جانتے ہو کہ رنج الم کیا ہوتا ہے۔ جس دم تم نے کابل اور اس کی خوش کن آب و ہوا کو پسند کیا، ہند کی گرم سرزمین کو خیر باد کہہ گئے۔ وہاں تم عیش و عشرت اور ناز کی زندگی بسر کر رہے ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ یہاں ہم بھی زندہ ہیں اگرچہ یہاں تکلیف اور غم بیحد ہیں۔ حظ نفس اور بدنی کوفت تمہاری تو دور ہو گئی اور ہماری بھی البتہ کم ہو گئی ہے۔)

اس سال ماہ رمضان باغ ہشت بہشت میں گزارا گیا۔ تراویح غسل کرنے کے بعد ادا کی گئیں۔ گیارہ سال کی عمر سے اب تک میں نے کسی بھی جگہ دو عیدیں ایک ساتھ نہیں منائیں تھیں۔ گزشتہ سال ماہ رمضان کی عید میں نے آگرہ میں منائی تھی۔ اس خیال کے پیش نظر کہ اس روایت میں خلل واقع نہ ہو۔ میں نے حکم دیا کہ ماہ رمضان کے آخری دن بروز اتوار عید منانے کے لئے سیکری پہنچا جائے۔ باغ فتح کے شمال مشرق میں سنگی صفہ تیار ہو چکا تھا۔ وہاں خیمہ نصب کر کے نماز عید ادا کی گئی۔ جس رات میں آگرہ سے گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہوا میر علی قورچی کو شاہ حسین کے پاس ٹھٹھہ کی جانب روانہ کیا۔ اس کو گنجیفہ بازی[۲۸] کا بہت شوق تھا چونکہ اس نے اس کے پتوں کی گڈی مانگی تھی جو بھیج دی گئی۔ اتوار کے دن بتاریخ ۵ ذی قعدہ میری طبیعت ناساز ہو گئی۔ اور سترہ روز تک میں علیل رہا۔

اسی مہینے کی چوبیس (۲۴) تاریخ کو میں دھولپور کا معائنہ کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ نصف فاصلہ طے

۲۸۔ گنجیفہ۔ اس کو گنجفہ بھی کہتے ہیں۔ ایک کھیل جو تاش کی طرح کھیلا جاتا ہے۔ اس میں ۹۶ پتے اور آٹھ رنگ ہوتے ہیں۔ اس کو تین کھلاڑی کھیلتے ہیں (فرہنگ آصفیہ ج ۴ ص ۷۹) اکبر کے زمانے میں اس میں بارہ رنگ ہوتے تھے اکبر نے اس کھیل کے اصولوں میں کچھ تبدیلیاں بھی کی تھیں (آئین اکبری ج ۱ ص ۳۶۹)

پانی پت کی کابلی باغ مسجد

کرنے کے بعد ہم نے ایک جگہ رات بسر کی۔ اگلے دن صبح میں نے سلطان سکندر کے تیار کردہ بند پر پہنچ کر پڑاؤ کیا۔ بند سے ذرا نیچے اس جگہ جہاں پہاڑ ختم ہوتا ہے وہاں سرخ رنگ کے عمارتی پتھر کی چٹان تھی۔ استاد شاہ محمد سنگتراش کو طلب کیا گیا۔ اسے حکم دیا کہ اگر پوری چٹان کو تراش کر ایک کمرہ بنایا جا سکتا ہو تو اس چٹان کو تراشے اور اگر یہ نیچی ہو کہ کمرہ نہ بن سکے تو اس کو ہموار کر کے یہاں حوض تعمیر کریں۔[29]

دھولپور سے ہم باڑی کی جانب روانہ ہوئے۔ اگلے دن صبح باڑی سے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور اس پہاڑ سے گزر کر جو باڑی اور چنبل کے درمیان واقع ہے دریائے چنبل کا معائنہ کرنے وہاں پہنچے اور اس جگہ کی سیر کرنے کے بعد واپس آ گئے۔ اس پہاڑ پر جو چنبل اور باڑی کے درمیان ہے آبنوس کا درخت نظر آیا۔ اس کے پھل کو وہاں کے لوگ تنڈو کہتے ہیں۔ یہاں آبنوس کے سفید درخت بھی ہوتے ہیں۔ اس پہاڑ پر آبنوس کے اکثر درخت سفید ہی تھے۔ باڑی سے روانہ ہو کر ہم نے سیکری کا معائنہ کیا اور اسی مہینے کی ۲۹ تاریخ کو بدھ کے دن ہم آگرہ پہنچ گئے۔ انہی دنوں میں شیخ بایزید کے بارے میں پریشان کن خبریں سنی گئیں۔ سلطان علی ترک کو بیس دن کی میعاد پر شیخ بایزید کے پاس بھیجا گیا۔

ذی الحجہ بروز جمعہ میں نے ورد کا آغاز کیا جو اکتالیس مرتبہ پڑھ جاتا ہے۔ انہی دنوں میں نے اپنے اس شعر کی تقطیع پانچ سو چار اوزان میں کی۔

کوز وقاش وسوز وتیلی نی مودی　　　　قدوخدو ساچ بیلی نی مودی

(مجھے بتاؤ کہ یہ اس کی آنکھیں ہیں، ابرو ہیں، اس کا دہن ہے یہ زبان۔ یہ اس کا قامت ہے، اس کے رخسار ہیں، اس کی زلفیں ہیں یا کمر)

اس مقصد کے تحت میں نے ایک رسالہ بھی مرتب کیا۔[30] اس مرتبہ بھی طبیعت ناساز ہو گئی اور مزاج کی یہ کیفیت نو دن تک رہی۔ ماہ ذی الحجہ کی ۲۹ تاریخ کو جمعرات کے دن میں کول اور سنبھل کا معائنہ کرنے کے لئے گھوڑے پر (ورق ۳۰۸) سوار ہو کر روانہ ہوا۔

۲۹۔ بابر کا یہ حوض اب بھی قائم ہے۔ میں نے دسمبر ۲۰۰۵ میں اس کو اپنے سفر دھولپور میں ڈاکٹر ناتھ کے ساتھ دیکھا محکمہ آثار قدیمہ نے اس پر ایک بورڈ لگا دیا ہے۔ لیکن چاروں طرف گاؤں آباد ہے اور صفائی ستھرائی کی سخت ضرورت ہے۔ قریب ہی سکندر لودھی کا بند اور ایک کنواں بھی موجود ہے جو اب بھی کھیتوں میں پانی دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

۳۰۔ رسالہ اوزان۔ بابر کا یہ رسالہ حال ہی میں دستیاب ہوا ہے۔ یہ تہران میں موجود کلیات بابر میں شامل ہے۔ اینٹ بیورج نے اس کا مختصر ذکر رامپور دیوان کے ضمیمے میں کیا ہے (ضمیمہ کیو ص ۶۶) تفصیلی ذکر اور معلومات آئی جی مانو نے بابر کے مجموعہ کتب کے ذکر میں کیا ہے جو سلطنتی کتب خانے میں موجود ہے (ص ۱۸۴) اب تک بابر کے جو مخطوطات کا علم ہے اس میں صرف یہ ہی مسودہ ہے جس میں بابر کے ۵۰۴ اوزان ایک شعر سے متعلق ہیں۔

واقعات ۹۳۴ھ

(۲۷ ستمبر ۱۵۲۷ء - ۱۵ ستمبر ۱۵۲۸ء)

ہفتے کے دن بتاریخ اوّل ماہ محرم ہم نے کول[1] میں قیام کیا۔ درویش علی اور علی یوسف کو ہمایوں نے سنبھل میں مقرر کر دیا تھا۔ انہوں نے دریا پار کر کے قطب سروانی اور کچھ راجاؤں کو شکست دے کر ان کے سر اور ایک ہاتھی ہمارے پاس روانہ کیا جس وقت ہم کول میں قیام کئے ہوئے تھے، ہم نے دو روز تک کول کا معائنہ کیا اور شیخ گھورن کی درخواست پر اُس کے گھر پر قیام کیا۔ اس نے ضیافت کا اہتمام کر کے چند پیشکش نذر کیں۔ وہاں سے گھوڑوں پر سوار ہو کر اترولی[2] پہنچے اور وہاں قیام پذیر ہوئے

بدھ کے دن ہم نے دریائے گنگا کو پار کر کے ضلع سنبھل[3] کے درمیان قیام کیا۔

بروز جمعرات سنبھل پہنچ کر وہاں قیام پذیر ہوئے۔ سنبھل کا دو روز معائینہ کر کے ہفتہ کے دن بوقت سحر سنبھل سے واپس آ گئے۔

اتوار کے دن ہم سکندرہ پہنچے اور راؤ سروانی کے گھر میں قیام پذیر ہوئے۔ اس نے پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا اور خدمت بجالایا۔ وہاں سے طلوع آفتاب سے قبل گھوڑوں پر سوار ہو کر آگے کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں بہانہ بنا کر میں اپنے ساتھیوں سے الگ ہو گیا۔ اور تن تنہا گھوڑے کو اتنا دوڑایا کہ آگرہ ایک کروہ دور رہ گیا۔ اس کے بعد واپس آیا اور ان سے آن ملا۔ ظہر کے وقت آگرہ پہنچ کر ہم وہاں قیام پذیر ہوئے۔

اتوار کے دن بتاریخ سولہ محرم میں بخار میں مبتلا ہو گیا اور سردی کی وجہ سے میرا بدن لرزنے لگا۔ یہ پچیس چھبیس دن تک رہا۔ میں نے مُلیّن دواؤں کا استعمال کیا جس سے مرض میں تو افاقہ ہوا لیکن پیاس اور نیند نہ آنے کی وجہ سے کافی تکلیف رہی۔ ان دنوں جب کہ میں صاحب فراش تھا تین چار رباعیاں موزوں ہو گئیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے:

جسمیدا ایسیتمہ کوندا محکم بولا دور	کوز دبن اوجادور اویقو چواختشام بولا دور
ہر یکالاسی غنیم بیلہ صبریم دیک	بار غانسابی ہوارتا دو اول کم بولا دور

(دن کے وقت میرے بدن میں تیز بخار ہو جاتا ہے اور رات کو نیند آنکھوں سے غائب ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں گویا میرے غم اور صبر کی طرح ہیں جب ایک بڑھتا ہے تو دوسرا کم ہو جاتا ہے)

بتاریخ آٹھ ماہ صفر ہفتے کے دن میری پھوپھیاں فخر جہاں بیگم اور خدیجہ سلطان بیگم پہنچ گئیں میں کشتی میں سوار ہو کر سکندر آباد سے اوپر کی طرف روانہ ہوا اور ان کی خدمت بجالایا۔

اتوار کے دن استاد علی قلی نے بڑی توپ سے گولہ داغا۔ اگر چہ گولہ دور تک گیا مگر توپ کے ٹکڑے اڑ گئے۔ ہر ٹکڑا جہاں بھی گرا اس نے کچھ لوگوں کو زخمی کر دیا جن میں سے آٹھ لوگ جان سے گئے۔

پیر کے دن بتاریخ سات ربیع الاوّل میں سیکری کا معاینہ کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ جس تالاب میں میں نے ہشت پہلو سنگی تخت بنانے کا حکم دیا تھا وہ تیار ہو چکا تھا۔ کشتی میں بیٹھ کر وہاں پہنچا اس جگہ شامیانہ لگایا گیا جس کے نیچے بیٹھ کر معجون کی چسکیوں کا شوق کیا گیا۔ سیکری کا معائینہ کر کے ہم وہاں سے واپس آ گئے۔

پیر کی رات کو بتاریخ چودہ ربیع الاوّل میں نے کفار کے خلاف جنگ کی نیت سے چندیری کی جانب رخ کیا۔ تین کروہ تک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم جلیسر پہنچے اور وہاں قیام پذیر ہوئے اور دو روز وہاں اس مقصد کے تحت توقف کیا کہ ہمارے آدمی مسلح و مستعد ہو سکیں۔ بروز جمعرات (ورق ۳۰۹) ہم نے وہاں سے کوچ کیا۔ اور انواڑ پہنچ کر وہاں قیام پذیر ہوئے۔ وہاں سے ہم کشتی میں سوار ہوئے اور چندواڑ پہنچ گئے اور وہاں سے

[1] کول۔ علی گڑھ کا پرانا نام ہے۔
[2] اترولی۔ علی گڑھ سے بیس میل شمال مشرق میں ہے۔
[3] سنبھل۔ یہ قصبہ وضلع ہے۔ قصبہ علی گڑھ سے پچاس میل شمال مشرق میں ہے۔

کوچ پر کوچ کرتے ہوئے بتاریخ اٹھائیس ربیع الاوّل پیر کے دن کنار گھاٹ پر ہم نے قیام کیا۔

جمعرات دس ربیع الثانی ہم نے دریا پار کیا۔ چار پانچ دن تک دریا کے اس کنارے اور اس کنارے پر ہم توقف کرتے رہے تاکہ ہمارے لوگ اس پر سے گزر جائیں۔ ان چند دن کے دوران ہم نے کشتی میں بیٹھ کر معجون کا بھی شوق کیا۔ دریائے چنبل کا سنگم کنار گھاٹ سے ایک دو کروہ بلندی پر واقع ہے۔ بروز جمعہ کشتی میں بیٹھ کر ہم نے چنبل کا سفر کیا اور سنگم پار کر کے واپس لشکر گاہ پہنچ گئے۔

اگرچہ شیخ بایزید کی طرف سے علانیہ سرکشی کا اظہار نہیں کیا جا رہا تھا لیکن اس کی حرکات اور اس کے انفعال سے یہ یقین ہونے لگا تھا کہ اس کا ارادہ سرکشی کا ہے۔ اس مصلحت کی بنا پر محمد علی جنگ جنگ کو لشکر سے علیحدہ کر کے اس کی طرف روانہ کیا گیا کہ وہ قنوج سے محمد سلطان مرزا، قاسم حسین سلطان، تیمور سلطان، ملک قاسم کوکی اور ابو المحمد نیزہ باز جیسے سلاطین و امرا نیز منوچہر خاں اور اس کے دریا خانی بھائیوں کو جمع کر کے سرکش افغانوں کی سرکوبی کے لئے سردار کی جانب روانہ ہو۔ اور شیخ بایزید کو بھی شریک ہونے کی دعوت دے۔ اگر مطیع و فرمانبردار ہو کر وہ ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو جائے تو سب مل کر روانہ ہوں اور اگر وہ ساتھ آنے کے لئے تیار نہ ہو تو پہلے اس کا سدّ باب کریں۔ محمد علی نے کچھ ہاتھی مانگنے چنانچہ اسے دس ہاتھی دے دیے گئے۔ محمد علی کو رخصت کرنے کے بعد بابا چہرہ کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ بھی ان کے ہمراہ روانہ ہو۔

کنار سے گزر کر ہم کالپی سے ایک کروہ کے فاصلے پر قیام پذیر ہوئے۔ سلطان سعید کا حقیقی برادر خورد بابا سلطان اور فرزند سلطان خلیل اس منزل پر پہنچ کر خدمت بجا لائے۔ گزشتہ سال وہ اپنے بھائی سعید خان کے پاس سے فرار ہو کر آیا تھا لیکن اندراب کی حدود میں پہنچ کر وہ پشیمان ہوا اور واپس چلا گیا۔ جس وقت وہ کاشغر کے نزدیک پہنچا تو (سعید) خاں نے حیدر مرزا کو اس مقصد کے تحت روانہ کیا کہ اس کا مقابلہ کر کے اسے پسپا کر دے۔

اگلے دن صبح ہم کالپی میں عالم خاں کے گھر میں قیام پذیر ہوئے۔ ہندوستان کے طور طریق کے مطابق اس نے ضیافت کا اہتمام کیا اور پیشکش نذر کی۔

بتاریخ تیرہ ربیع الثانی پیر کے دن ہم نے کالپی سے کوچ کیا۔ بروز جمعہ ایرج میں رکے بروز ہفتہ ہم نے بھانڈیر میں قیام کیا۔

چندیری پر حملہ

انیس تاریخ کو اتوار کے دن چھ سات ہزار آدمی چین تیمور سلطان کے ہمراہ میں نے اپنی روانگی سے قبل چندیری [۴] کی جانب روانہ کیے۔ جن امرا کو اس طرف بھیجا گیا تھا ان میں باقی منگ باشی، قوچ بیگ کا بھائی عاشق بکاول۔ ملا اپاق اور محسن دولدی شامل تھے۔ ہندوستانی امرا میں سے شیخ گھورن کو ان میں شریک کیا گیا تھا۔

مہینے کی چوبیس تاریخ کو بروز جمعہ ہم نے کھجوہ کے نزدیک قیام کیا۔ وہاں کے لوگوں کی خاطر جمعی کر کے وہ علاقہ بدرالدین کے فرزند کو عطا کر دیا گیا۔ شہر کچھ اس طرح واقع ہوا ہے کہ اس کے اطراف میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں جو اس کے مشرق اور شمال میں ہیں ان پر بند اس طرح تعمیر کیا گیا ہے کہ وہاں بہت بڑا تالاب بن گیا ہے اس کا حدود اربعہ تقریباً پانچ چھ کروہ ہوگا۔ اس تالاب میں ایسی چھوٹی چھوٹی کشتیاں تیرتی ہیں جن میں تین چار آدمیوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ (ورق ۳۱۰) جس وقت فرار ہونے کی نوبت پیش آتی ہے تو لوگ ان میں بیٹھ کر تالاب کے درمیان پہنچ جاتے ہیں۔ کھجوہ پہنچنے سے پہلے دو جگہوں پر اسی طرح پہاڑیوں کے درمیان بند تیار کر کے تالاب بنائے گئے ہیں لیکن یہ تالاب کھجوہ کے تالاب سے ذرا چھوٹے ہیں۔ ہم نے یہاں ایک دن قیام کیا اور کچھ کارندے اور بیلدار مقرر کیے کہ وہ راستے کی پستی و بلندی اور ناہمواری کو صاف کر کے جنگلوں کو کاٹ دیں تاکہ

۴۔ چندیری۔ شمالی وسطی ہند کا شہر اور قلعہ۔ جھانسی سے ساٹھ میل جنوب مغرب میں ہے۔ اس کے مشرق میں دریائے بیتوا اور اس کی وادی ہے۔

گاڑیاں اور توپیں وہاں سے بلاتردد گزر سکیں۔ کچھوہ اور چندیری کے درمیان گھنا جنگل ہے۔ کچھوہ سے ایک منزل پر قیام کرنے کے بعد ہم چندیری سے تین کروہ کے فاصلے پر دریائے بان پور کو عبور کر کے قیام پذیر ہوئے۔ چندیری کا قلعہ پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے۔ جبکہ شہر پہاڑ کے درمیان ہے۔ گاڑیوں کے گزرنے کے لئے جو راستہ ہموار کیا گیا تھا وہ قلعے کے نیچے سے گزرتا ہے برہان پور سے کوچ کر کے ضرورت کے تحت ہم نے گاڑیاں تیار کیں اور اس شہر سے ذرا نیچے پہنچ کر وہاں بسیرا کیا اور مہینے کی اٹھائیس تاریخ کو منگل کے دن بہجت خان حوض کے کنارے اس کے پشتے پر ہم قیام پذیر ہوئے۔ اگلے دن صبح میں وہاں سے گھوڑوں پر سوار ہوا اور اطراف قلعے کو غول، برانغار اور جوانغار کے مورچوں پر تقسیم کر دیا۔ استاد علی قلی نے گولہ اندازی کے لئے ایسی ہموار جگہ کا انتخاب کیا جہاں کوئی نشیب و فراز نہ تھا۔ کارندے اور بیلدار اس کام کے لئے متعین کئے گئے کہ مورچے کے لئے ایسا چبوترہ بنائیں جس پر توپ رکھی جاسکے۔ لشکر کے تمام لوگوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ڈھالیں سیڑھیاں قلابوں کی کمندیں تیار کریں۔

اس سے قبل چندیری پر منداو خاندان کے بادشاہوں کی حکومت تھی۔ سلطان ناصرالدین کی وفات کے بعد مانڈو اور اس کے نواحی علاقے اس کے ایک لڑکے سلطان محمود کے تحت آ گئے۔ اس وقت وہ مانڈو میں ہی مقیم ہے۔ اس کے دوسرے لڑکے کا نام محمد شاہ ہے۔ اس نے چندیری پر قبضہ کر کے سلطان سکندر سے پشت پناہی کی درخواست کی۔ جس نے کثیر تعداد میں لشکر بھیج کر اس کی مدد کی۔ سلطان سکندر کے بعد ابراہیم کے عہد میں محمد شاہ کا انتقال ہو گیا۔ سلطان ابراہیم نے اس کے کم عمر لڑکے احمد شاہ کو برطرف کر کے وہاں اپنے آدمی مقرر کر دیئے۔ جس وقت سلطان ابراہیم کا تعاقب کرتے ہوئے رانا سانگاہ دھولپور تک پہنچ گیا تو سلطان ابراہیم کے امرا سرکش ہو گئے۔ انہی دنوں چندیری پر رانا سانگاہ نے قبضہ کر کے اسے میدنی راو کے حوالے کر دیا جو بہت بارسوخ کافر تھا۔ اس وقت میدنی راو کے چار پانچ ہزار آدمی چندیری کے قلعے میں تھے۔ اس کی آرائش خاں کے ساتھ واقفیت تھی۔ چنانچہ میں نے اسکے ساتھ شیخ گھورن کو روانہ کیا۔ میری شفقت و عنایت کا ذکر کریں اور یہ وعدہ کیا گیا کہ چندیری کے بدلے شمس آباد اسے دے دیا جائے گا۔ اس کے ایک دو معتبر آدمی (ورق ۳۱۱) میرے پاس آئے۔ معلوم نہیں کہ انہوں نے مجھ پر اعتبار نہ کیا یا وہ اپنے قلعے پر مغرور ہو گئے۔ بہر صورت صلح کی گفتگو سے کوئی حل نہ نکل سکا۔ چندیری پر زور آزمائی کے ارادے سے منگل کی صبح بتاریخ چھ جمادی الاوّل ہم نے حوض بہجت خاں سے کوچ کیا اور اس درمیانی حوض کے کنارے جو قلعے کے نزدیک واقع ہے قیام پذیر ہوئے۔ اسی روز صبح روانگی کے وقت خلیفہ ایک دو خط لے کر حاضر ہوا۔ جن کا مضمون یہ تھا کہ پورب کی طرف جو لشکر روانہ کیا گیا تھا چونکہ وہ نظم و ضبط برقرار نہ رکھ سکا اس لئے شکست سے دوچار ہوا اور وہ لکھنؤ کو ترک کر کے قنوج پہنچ گیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس مسئلے کے بارے میں خلیفہ کو بہت زیادہ تشویش اور فکر دامنگیر تھی۔ میں نے کہا تردد اور تشویش بے وجہ ہے جو کچھ خداوند تعالیٰ نے تقدیر میں لکھ دیا اس کے برعکس کچھ نہ ہوگا۔ چونکہ اس وقت یہ مہم درپیش ہے اس لئے اس بات کو منہ سے نہیں نکالنا چاہئے۔ کل ہم قلعہ پر زور آزمائی کریں گے، اس کے بعد دیکھیں گے کہ کیا پیش آتا ہے۔ ادھر دشمن نے بھی قلعے کو مضبوط کر لیا تھا۔ ایک ایک دو دو آدمی قلعے کے پہرے پر مقرر کر دیئے۔ اس رات لشکر کے آدمیوں نے ہر طرف سے قلعے کے بیرونی حصار پر یورش کر دی۔ جہاں اس وقت چند ہی لوگ تھے۔ جنگ نہ ہوئی وہ لوگ بھاگ کر قلعے میں چلے گئے۔

سات جمادی الاوّل بدھ کے دن صبح کے وقت لشکر کے لوگوں کو حکم دیا گیا کہ مسلح ہو جائیں اور جو سپاہی مورچوں پر مقرر ہیں وہ اپنے اپنے مورچے پر پہنچ کر جنگ کریں اور جس وقت میں علم اور نقارہ لے کر گھوڑے پر سوار ہو جاؤں تو وہ ہر طرف زور آزمائی کریں۔ اس سے قبل کہ جنگ شروع ہو میں نے علم اور نقارے کو تو ایک طرف رکھا اور خود اس طرف نکل گیا جہاں استاد علی قلی نے گولہ اندازی کا اہتمام کیا تھا۔ اس نے تین چار گولے

داغے۔ چونکہ یہ جگہ ہموار تھی اور قلعے کی فصیل بہت محکم اور سرتاپا پتھر کی بنی ہوئی تھی۔ اس لئے گولہ اندازی کارگر ثابت نہ ہوئی۔ یہ پہلے ہی بیان کیا جاچکا ہے کہ چندیری کا قلعہ پہاڑ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس کے ایک طرف پانی کے لئے دوہری دیوار بنائی گئی ہے۔ یہ دوہری فصیل پہاڑ سے ذرا نیچے ہے اور ایسی جگہ ہے جہاں سے زور آزمائی کی جاسکتی تھی۔ غول کے بائیں اور دائیں جانب کے پروں اور شاہی دستے کے سپاہیوں نے اپنے مورچے یہاں تک پہنچادئے تھے۔ چنانچہ ہر طرف سے یورش شروع کردی گئی اس جگہ سے بیشتر زور آزمائی کی گئی۔ اگرچہ کفار کی جانب سے ہر چند سنگ باری کی گئی اور انھوں نے آگ بھی برسائی مگر ہمارے جوان پسپا نہ ہوئے بلا آخر جس جگہ قلعے کی فصیل سے آب رسانی کی دوہری دیوار متصل ہوتی ہے وہاں نور بیگ کا بھائی شاہم پہنچ گیا۔ دیگر دو تین جگہوں سے بھی ہمارے جوان دیوار سے چسپاں اوپر پہنچ گئے۔ وہ کفار جو دوہری فصیل پر رہ گئے تھے فرار ہوگئے۔ اور اس دوہری دیوار پر ہمارا قبضہ ہوگیا۔ قلعے کے بالائی حصے میں بھی کوئی قابل ذکر جنگ نہ ہوئی۔ دشمن کے سپاہی جلد ہی فرار ہوگئے۔ ہمارے بہت سے سپاہی فصیل سے چسپاں قلعے کے بالائی حصے میں پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر بعد تمام کافر بالکل ہی برہنہ ہوکر جنگ کرنے پر اتر آئے۔ انھوں نے ہمارے بہت سے آدمیوں کو بھگادیا۔ اور خود فصیل پر پہنچ گئے (ورق ۳۱۲) چند لوگوں کو انھوں نے تلواروں سے قتل کردیا۔ کفار کا فصیل پر سے جلدی چلے جانے کا مقصد یہ تھا کہ اب انھوں نے یہ قطعی فیصلہ کرلیا تھا کہ اب انھیں مرنا ہی ہے لہٰذا انھوں نے اپنی عورتوں اور محرم خواتین کو قتل کردیا اور خود مرنے کے لئے مستعد ہوکر تن کے کپڑے تک اتاردئے اور جنگ کرنے کی لئے آمادہ ہوگئے۔[5] ہماری سپاہ نے ہر طرف سے زور آزمائی کرکے دشمن کے سپاہیوں کو فصیل پر سے بھگادیا۔ دو تین سو کافر میدنی راؤ کی حویلی میں داخل ہوگئے یہاں اکثر نے ایک دوسرے کو قتل کرڈالا۔ ان میں سے ایک نے اپنے ہاتھ میں تلوار لی اور دوسرے برضا و رغبت اپنی گردن کٹانے کے لئے کھڑے ہوگئے[6]۔ ان میں سے بیشتر لوگ اسی طرح واصل بجہنم ہوئے۔

خداوند تعالےٰ کی عنایت سے ایسا نامور قلعہ دو تین گھڑی میں فتح ہوگیا کہ وہ نوبت ہی نہ آئی کہ سخت جنگ ہو، جس میں علم بلند کرکے اور نقارہ بجانے کی ضرورت پیش آئے۔ اس پہاڑ پر جو چندیری کے شمال مغرب میں واقع ہے کفار کے سروں سے مینار تعمیر کیا گیا۔ اس فتح کی تاریخ ''فتح دارالحرب'' (۹۳۴) سے نکالی گئی۔ میں نے اس شعر میں اس کو بیان کیا۔

بود چندی مقام چندیری | پرز کفار دار حربی ضرب
فتح کردم بحرب قلعہ او | گشتِ تاریخ ''فتح دارالحرب''

(میرا چندیری میں چند روز تک قیام رہا۔ یہ دارالحرب کفار سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے جنگ کرکے راؤ کے قلعے کو فتح کیا۔ جس کی تاریخ ''فتح دارالحرب'' سے نکلی)

چندیری

ولایت چندیری ایسی جگہ واقع ہے جہاں اس کے گردونواح میں آبِ رواں کی فراوانی ہے۔ اس کا قلعہ پہاڑ کی بلندی پر واقع ہے۔ جس کے بیچ میں پتھر کاٹ کر تالاب بنایا گیا ہے۔ دوسرا بڑا تالاب اس دوہری دیوار میں تھا جہاں زور آزمائی کرکے قلعہ فتح کیا گیا تھا۔ تمام لوگوں کے مکانات خواہ وہ ادنیٰ ہوں یا اعلیٰ پتھر سے بنے ہوئے ہیں۔ بڑے آدمیوں کے مکانات پتھروں کو تراش کر پوری نقش ونگار زیب وزینت کے ساتھ تیار کئے گئے ہیں۔ اگرچہ ادنیٰ لوگوں کے مکانات بھی پتھر سے ہی بنائے گئے ہیں۔ لیکن ان پر نقش ونگار نہیں۔ مکانات کی چھتیں پتھر کی سلوں سے بنائی گئی ہیں۔ قلعے کے سامنے تین بڑے تالاب ہیں ان کے اطراف میں

۵۔ یہ راجپوت طریقہ جنگ آخری دم تک لڑنے کی خواہش و ارادہ ہے۔ بیوی بچوں کو ختم کرکے خود کو بھی فنا کرنا۔

۶۔ یہ رسم جوہر کہلاتی ہے۔

عہد سلف کے حکمرانوں نے بند بنا کر یہ تالاب بنائے ہیں۔ جو سطح مرتفع پر واقع ہیں چندیری سے تین کروہ کے فاصلے پر ایک جھیل ہے جو بیتوا کہلاتی ہے۔ ہندستان میں بیتوا کا پانی اپنے خوش مزہ ہونے کے باعث مشہور ہے۔ یہ حقیقت میں جھیل ہے۔ اس کے بیچ میں جگہ جگہ چٹانیں ابھری ہوئی ہیں۔ جن کا پتھر عمارات کے لئے بہت موزوں ہے یہ شہر (چندیری) آگرہ کے جنوب میں یہاں سے نوّے کروہ کے فاصلے پر واقع ہے۔ جدی ستارے کی بلندی اس جگہ پچیس درجہ ہے۔

اگلے دن یعنی جمعرات کی صبح ہم قلعے کے گردونواح سے کوچ کر کے حوض ملّو خاں کے کنارے قیام پذیر ہوئے۔ یہاں ہمارے آنے کا مقصد چندیری کو فتح کرنے کے بعد رائے سین بھلیسان اور سارنگپور کی ولایات پر قبضہ کرنا تھا۔ یہ ولایات کفار سے متعلق ہیں اور صلاح دین کافر ان پر حکمراں ہے۔ تاکہ اسے قتل کر کے اور ان پر قابض ہو کر چتوڑ میں (رانا) سانگاہ پر حملہ کیا جائے۔ لیکن جب پریشان کن خبر (ورق ۳۱۴) ہمیں ملی تو امرا کو مشورے کے لئے طلب کیا گیا ترجیح اس امر کو دی گئی کہ ان فتنہ پردازوں اور سرکشوں کے شر کو پہلے رفع کرنا زیادہ مناسب ہے۔ چنانچہ سلطان ناصرالدین شاہ کے پوتے احمد شاہ کو چندیری کا علاقہ عطا کر دیا گیا۔ اس سرزمین کی رقم حق ملکیت پچاس لاکھ خزانہ خالصہ کے لئے متعیّن کی گئی۔ ملاّ آپاق کو یہاں کا شقدار مقرر کر کے احمد شاہ کی مدد کے لئے دو تین ہزار ترک اور ہندوستانی سپاہیوں کو وہاں رہنے دیا گیا۔

ان امور کو ترتیب دینے کے بعد ہم اتوار کے دن بتاریخ گیارہ جمادی الاوّل واپس جانے کے ارادے سے حوض ملّو خاں سے کوچ کر کے دریائے برہان پور کے کنارے قیام پذیر ہوئے۔ اس کے بعد یکہ خواجہ اور جعفر خواجہ کو بھانڈیر سے روانہ کیا گیا کہ وہ کالپی کی کشتیوں کو کنار دریا کے گھاٹ پر لے آئیں۔

مہینے کے چوبیس تاریخ کو بروز ہفتہ ہم کنار کے گھاٹ پر قیام پذیر ہوئے۔ حکم دیا گیا کہ لشکر کے لوگ دریا کو عبور کرنے میں لگے رہیں۔ انہیں دنوں میں یہ خبر آئی کہ جن لوگوں کو یلغار کے لئے بھیجا گیا تھا انھوں نے پسپا ہو کر قنوج کو بھی ترک کر دیا ہے اور واپس راپڑی آگئے ہیں۔ ابوالمحمد نیزہ باز نے شمس آباد کے قلعے کو مضبوط کر لیا اور بہت سے لوگ وہاں پہنچ کر بزور وزبردستی اس پر قابض ہو گئے ہیں۔ لشکر کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر اترنے کے لئے ہم نے تین چار روز تک توقف کیا۔ دریا کو عبور کر کے کوچ بکوچ منزلیں سر کرتے ہوئے ہم قنوج کی طرف روانہ ہوئے۔ کچھ قزاقوں کو دشمن کے بارے میں معلومات کے لئے ہم نے پہلے ہی خود سے علیحدہ کر کے بھیج دیا تھا ابھی ہم قنوج سے دو تین کوچ کے فاصلے پر ہی تھے کہ مجھے یہ اطلاع ملی کہ معروف کے لڑکے نے جب اس قزاق دستے کو دیکھا تو وہ قنوج سے فرار ہو گیا۔ جب بّن، بایزید اور معروف کو ہماری آمد کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ دریائے گنگا کو عبور کر کے قنوج کے مقابل دریائے گنگا کے مشرقی کنارے بیٹھ گئے کہ وہاں سے ہمارے گزرنے کا راستہ بند ہو جائے۔

جمعرات کے دن بتاریخ چھ جمادی الآخر قنوج سے گزر کر دریائے گنگا کے مغربی کنارے پر ہم قیام پذیر ہوئے۔ ہمارے جوانوں نے دشمنوں کی طرف بڑھ کر ان کی کچھ کشتیاں بزور بازوان سے چھین لیں۔ اس طرح دریا میں چھوٹی بڑی تیس چالیس کشتیاں جمع ہو گئیں۔ میر محمد دریابان اس مقصد کے لئے روانہ کیا گیا وہ دریا پر پل باندھنے کے لئے مناسب جگہ کا انتخاب کرے جہاں سے لشکر گزر سکے۔ وہ پہاڑ کی طرف ایک کروہ کے فاصلے پر جگہ پسند کر کے واپس آیا۔ پل سازی کا سامان جمع کرنے کے لئے چست و چالاک کارندے متعیّن کئے گئے۔ جس جگہ پل بنایا جا رہا تھا اس کے نزدیک ہی استاد علی قلی توپ اندازی کا سامان لے کر پہنچ گیا اور ایسی جگہ اس نے پسند کر لی جہاں سے گولہ باری کی جا سکے۔ اس کے بعد وہ گولہ اندازی میں لگ گیا۔ جس جگہ پل بنایا جانا تھا وہاں بہاؤ کی طرف مصطفی رومی توپ گاڑیاں لے کر ایک جزیرے پر پہنچ گیا اور وہاں سے اس نے گولہ اندازی شروع

کردی۔ بہاڑ کی اوپر کی طرف بھی گولہ اندازی کا سامان نصب کر دیا گیا جہاں سے گولہ اندازوں نے گولہ باری شروع کر دی۔ بابا سلطان اور درویش سلطان دس پندرہ آدمیوں کو ساتھ لے کر مغرب کے وقت بلاوجہ کشتیوں میں سوار ہو کر نکل گئے جنگ کی اور نہ کوئی معرکہ سر کیا اور واپس آ گئے۔ اس طرح سے ان کے چلے جانے پر ان کی سخت سرزنش کی گئی۔ ایک دو مرتبہ ملک قاسم مغل اور بعض جوان کشتی میں سوار ہو کر دریا کے اس پار نکل گئے۔ جہاں انہیں چند لوگ نظر آئے ان کے ساتھ ان کی خوب چپقلش رہی۔ جس جگہ پل باندھا جا رہا تھا وہاں (ورق ۳۱۴) توپ گاڑیوں کو ذرا نیچے ایک قطار میں نصب کرایا گیا۔ اور وہاں سے گولہ اندازی شروع کی گئی۔ پل سے ذرا اونچی جگہ سے تفنگ اندازوں نے خوب تفنگ اندازی کی۔ اس طرح ان کے حوصلے بلند ہو گئے یہاں تک کہ ملک قاسم نے چند آدمیوں کو ساتھ لے کر دشمن کو ایسا پسپا کیا کہ اسے اس کی لشکر گاہ تک دھکیل دیا اور خود صاف نکل آیا۔ دشمن کے بہت سے لوگ ایک ہاتھی ساتھ لے آئے اور نبرد آزمائی شروع کر دی۔ جس سے انہوں نے ہمارے حملے کو ناکارہ کر دیا۔ اس کے بعد ہمارے آدمی کشتی پر سوار ہو گئے۔ جیسے ہی کشتی روانہ ہونے لگی ہاتھی وہاں پہنچ گیا اور اس نے کشتی کو ڈبو دیا۔ اور یہاں ملک قاسم ہلاک ہو گیا۔

ان چند دنوں کے دوران جب کہ پل باندھا جا رہا تھا استاد علی قلی نے خوب گولہ باری کی۔ پہلے دن اس نے آٹھ گولے داغے۔ دوسرے روز ان کی تعداد سولہ تھی۔ چنانچہ تین چار روز تک وہ اسی طرح گولہ اندازی کرتا رہا۔ جس توپ سے اس نے یہ گولے داغے تھے اس کا نام اس نے غازی رکھ دیا۔ یہ وہی توپ تھی جس نے سانگاہ کافر پر جنگ میں فتح حاصل کی تھی اسی لئے اس نے اس کو "غازی" کا نام دے دیا تھا۔ اس نے ایک اور توپ بھی جو اس سے زیادہ بڑی تھی نصب کی تھی۔ لیکن اس نے ابھی ایک ہی گولہ داغا تھا کہ وہ شق ہو گئی۔ تفنگ اندازوں نے بھی بہت زیادہ آتش بازی کی جس کے باعث بہت سے لوگ اور گھوڑے تلف ہوئے۔ پیادہ فوج نے بھی اپنی تیر اندازی کے جوہر دکھائے اور بہت سے سانڈ اور گھوڑے مار گرائے۔

پل سازی کا کام ختم ہونے کے قریب ہی تھا کہ بدھ کے دن بتاریخ انیس ماہ جمادی الآخر ہم کوچ کر کے سر پل پہنچ گئے۔ پل بندی میں جو تاخیر ہو رہی تھی اس بنا پر افغان بہت مذاق اڑا رہے تھے۔

بروز جمعرات ہم سر پل پہنچ گئے۔ پل بن کر تیار ہو چکا تھا۔ کچھ پیادوں اور لاہوریوں نے اسے عبور کیا اور چپقلش بھی رہی۔

بروز جمعہ شاہی دستے کے سپاہیوں، غول کی دائیں اور بائیں جانب کے جوانوں اور تفنگ اندازوں اور پیادوں نے اس پل کو عبور کیا۔ مکمل طور پر مسلح افغانوں نے گھوڑوں اور ہاتھیوں کی مدد سے نبرد آزمائی شروع کر دی اور بائیں جانب کے بیڑے کو پسپا کر دیا۔ غول اور دائیں جانب کے آدمی اپنی جگہ قائم رہے۔ انہوں نے بھی غنیم کے منہ پھیر دیئے۔ ہمارے دو آدمی اپنے تمام ساتھیوں سے علیحدہ ہو کر دشمن پر حملہ آور ہو گئے۔ دشمنوں نے ان میں سے ایک کا گھوڑا چھین کر اسے نیچے اتار دیا۔ دوسرے کے گھوڑے اور اس کو خوب زدوکوب کیا۔ اس کا گھوڑا گرتا پڑتا واپس آیا اور اپنی آدمیوں کے درمیان گر پڑا۔ اسی دن سات آٹھ آدمیوں کے سر کاٹ کر لائے گئے۔ دشمن کے بہت سے لوگ تیر و تفنگ سے زخمی اور گھائل ہوئے تھے۔ جنگ اتنی دیر تک جاری رہی کہ عصر کا وقت تنگ ہو چکا تھا۔ رات کے وقت ان تمام لوگوں کو واپس بھیج دیا گیا۔ جو پل سے گزرے تھے۔ اگر ہفتہ کی رات کو لوگ وہیں رہ جاتے تو اس امر کا احتمال تھا کہ دشمن کے بہت سے سپاہی گرفتار کر لئے جاتے لیکن میرے دل میں یہ خیال گزرا کہ گزشتہ سال منگل کے دن نوروز کے موقعے پر ہم نے سیکری سے سانگاہ کے ساتھ جنگ کا ارادہ کر کے کوچ کیا تھا اور دشمن کو ہفتے کو زیر کر لیا تھا۔ اس سال نوروز کا تہوار چونکہ بدھ کے دن واقع ہوا ہے۔ اس لئے ہم نے اس ارادے کے تحت دشمن کی جانب کوچ کیا کہ اگر اتوار کے دن ہم فتح حاصل کریں تو یہ ایک مطابقت ہو گی۔ چنانچہ یہی وجہ تھی (ورق ۳۱۵) کہ کسی

بھی شخص کو پل پر سے گزرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ہفتے کے دن دشمن کے سپاہی نبرد آزمائی کے لئے آگے نہ بڑھے بلکہ دور ہی قطاریں ترتیب دے کر اپنی جگہ کھڑے رہے۔

اسی دن ہم نے گاڑیاں پل پر سے گزاریں اور اسی دن بوقت سحر حکم دیا گیا کہ لوگ اس پر سے گزریں۔ نقارہ بجنے کے وقت قراول کی جانب سے یہ خبر آئی کہ غنیم فرار ہو گیا ہے۔ چین تیمور سلطان کو حکم دیا گیا کہ لشکر کو ترتیب دے کر دشمن کا تعاقب کرے۔ اس کے ساتھ ہی محمد علی جنگ جنگ، حسام الدین علی بن خلیفہ، محب علی بن خلیفہ، کوکی بن بابا قشقہ، باقی تاشقندی اور ولی قزیل جیسے سرداروں کو اس امر کے لئے مقرر کیا گیا کہ وہ چین تیمور سلطان کی پیروی کریں اور اس کے حکم سے روگرداں نہ ہوں۔ بوقتِ سنت فجر میں نے بھی پل کو عبور کیا۔ اونٹوں کے لئے یہ حکم جاری کیا گیا کہ انہیں اس نچلے گھاٹ پر سے گزار جائے جو پہلے ہی دیکھ لیا گیا تھا۔

بروز اتوار بنگر ماؤ سے ایک کروہ دور جوہڑ کے کنارے ہم قیام پذیر ہوئے۔ جس دستے کو تعاقب کے لئے روانہ کیا گیا تھا اس کی کارگزاری اچھی نہ رہی۔ اس کے آدمیوں نے بھی بنگر ماؤ میں ہی قیام کر لیا اسی روز ظہر کے وقت ہم بنگر ماؤ سے روانہ ہوئے۔ اگلے دن صبح اس تالاب کے کنارے جو بنگر ماؤ کے مقابل ہے قیام پذیر ہوئے۔

اسی دن میرے خان دادا کا چھوٹا لڑکا تختہ بوغا سلطان وہاں پہنچا اور خدمت بجالایا۔

ہفتے کے دن بتاریخ نو جمادی الآخر ہم نے لکھنؤ کا معائنہ کیا اور دریائے گومتی کو عبور کر کے وہاں قیام پذیر ہوئے۔ اسی دن میں نے گومتی کے پانی میں غسل کیا معلوم نہیں کہ میرے کان میں پانی چلا[8] گیا یا وہاں کی ہوا کا اثر تھا کہ میرا دایاں کان بند ہو گیا اور چند دن اس میں ہلکا ہلکا درد بھی رہا۔ اودھ ابھی ایک یا دو منزل دور تھا کہ تیمور سلطان کی جانب سے آدمی آیا اور اس نے بتایا کہ دشمن دریائے سرو کے اس پار آن بیٹھا ہے مدد بھیجئے۔ غول کے جوانوں میں سے ہزار تک کی تعداد میں جوانوں کو علیحدہ کر کے انہیں قراچہ کی کمان میں مدد کے لئے روانہ کیا گیا۔

ہفتہ سات رجب اودھ سے دو تین کوس اوپر گھاگرا اور سردا[9] کے سنگم پر ہم قیام پذیر ہوئے۔ اس روز تک اودھ کے مقابل دریائے سرو کے اس پار شیخ بایزید کو پہنچ جانا چاہئے تھا۔ اس نے سلطان کو خط بھیج کر اس کے ساتھ ساز باز کرنی چاہی تھی مگر سلطان اس کی اس حیلہ سازی کو سمجھ گیا اور قراچہ کے پاس ظہر کے وقت اس نے آدمی بھیجا کہ وہ دریا پار کرنے کے لئے آمادہ رہے۔ جب قراچہ اور سلطان ہمراہ ہو گئے تو انہوں نے بلا توقف دریا پار کر لیا اس وقت بایزید کے پاس پچاس گھڑ سوار اور تین چار ہاتھی ہوں گے۔ اس وقت اس میں ان کے ساتھ مقابلہ کرنے کی چونکہ تاب نہ تھی اسی لئے وہ فرار ہو گیا۔ ان میں سے چند لوگوں کے گھوڑے چھین کر ان پر سے انہیں اتار لیا گیا اور ان کے سر کاٹ کر میرے پاس بھیج دئے گئے۔ سلطان کے بعد بیخوف سلطان، تردی بیگ، قوچ بیگ، بابا چہرہ اور باقی شغاول نے دریا کو عبور کیا۔ وہ لوگ جو ان سے قبل دریا کے اس پار چلے گئے تھے انہوں نے شیخ بایزید کا مغرب کے وقت تک تعاقب کیا۔ اس نے جنگل میں گھس کر وہاں پناہ لی اور بچ گیا۔ چین تیمور سلطان نے رات کو جوہڑ کے کنارے قیام کیا اور آدھی رات کے وقت وہ گھوڑے پر سوار ہو کر (ورق ۳۱۶) دشمن کے تعاقب میں نکلا۔ چالیس کروہ راستہ طے کرنے کے بعد وہ اس جگہ پہنچ گیا۔ جہاں بایزید کے خاندان کا پڑاؤ تھا۔ لیکن دشمن وہاں سے بھاگ نکلا یہاں سے ہمارا متلاشی دستہ علیحدہ ہو کر اس کی تلاش میں نکلا۔ باقی شغاول کے ساتھ چند جوان دشمن کے تعاقب میں گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے روانہ ہوئے اور اس کے قوم و قبیلے کے لوگوں تک پہنچ گئے اور کچھ افغان لڑکوں کو قیدی بنا کر لے آئے۔

اودھ[10] اور اس کے گرد و نواح سے متعلق نظم و نسق برقرار رکھنے کی خاطر چند روز ہم نے یہاں قیام کیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ دریائے سرو کے کنارے اس سے سات آٹھ کروہ اوپر شکار گاہ ہے جس کی لوگوں نے بہت تعریف کی۔ میر محمد کشتی بان کو وہاں بھیجا گیا۔ وہ دریائے گھاگرا اور دریائے سردا کے گھاٹوں کا معائنہ کر کے واپس آیا۔ چنانچہ بارہ تاریخ کو جمعرات کے دن ہم شکار کھیلنے کے خیال سے اس طرف روانہ ہوئے۔

۸۔ کان میں پانی چلا جائے تو کان کا میل پھول جاتا ہے جس سے کان بند ہو سکتا ہے۔ اگر صرف پانی جانے سے کان بند ہوتا ہے تو کان میں درد نہیں ہونا چاہیے تھا۔

۹۔ گھاگر سے ملنے والے اس دریا کو بابری مولف مختلف نام دیتے ہیں سردا (خان خاناں ورق ۳۱۶) سرو (ارسکن سے مو آبریس او بابر ص ۳۸۱، بالو، بابر نامہ، ص ۵۸۹) سرد (اینٹ بیورج، بابر نامہ ص ۶۰۲) سرود (مرزا نصیر الدین حیدر، تزک بابری ص ۳۳۹) سرجو (تھیکسٹن، بابر نامہ ص ۴۰۲) اس علاقے میں اس نام سے ملتا جلتا صرف ایک دریا "سردا" ہے اور یہی نام صحیح معلوم ہوتا ہے۔

۱۰۔ اودھ یا ایودھیا۔ ایک شہر جس کے نام پر صوبے کا نام بھی ہے۔ اودھ ایک قدیم شہر ہے جہاں بدھ مت کے پیرو بڑی تعداد میں رہتے تھے۔ یہ ہندو تہذیب کا بھی بڑا مرکز ہے اور رام چندر جی کی جائے پیدائش یہاں بتائی جاتی ہے۔ بابر یہاں سے دو تین کوس اوپر چند دن تک قیام پذیر رہا تاکہ یہاں کا نظم و نسق درست کیا جا سکے۔ اس کے بعد سات آٹھ کوس اوپر شکار گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں پر ہی مشہور مسجد ہے جو بابر سے منسوب کی جاتی ہے۔ اینٹ بیورج نے مسجد کی تعمیر سے متعلق اس موقعہ پر خیالی پلاؤ پکایا ہے (ضمیمہ یو ص ۸ کے نوٹ ۱) کہ مسجد بنانے کا حکم اودھ میں دیا تھا۔ اگر سال ۹۳۴ھ کے واقعات مکمل ہوتے تو یقین سے کہا جا سکتا تھا کہ کیا ہوا اور کیا نہیں۔ لیکن اس موقعہ پر کچھ فرض کر لینا بھس میں چنگاری ڈالنے کے علاوہ کچھ نہیں۔

فیض آباد جو اس علاقے میں اب بڑا شہر ہے بابر کے زمانے میں موجود نہیں تھا۔ یہ ۱۷۳۲ء میں نواب سعادت خاں کے یہاں ایک محل تعمیر کرنے کے بعد آباد ہوا۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۳:۵۱۶) آج کا اودھ ایک ہرا بھرا اور زرخیز مقام ہے۔ دریائے گھاگر ایک بڑا دریا ہے جس کے کنارے پر یہ شہر ہے۔ بڑا افسوس ہے کہ ایسا تاریخی مقام سیاحت کے لئے بند ہے اور ہر طرف پہرہ ہے۔ ہمارے رکشہ والے نے تنبیہ کر دی تھی کہ کوئی کیمرہ وغیرہ ساتھ نہیں ہونا چاہیے۔ مسجد کے علاقے کو آہنی جنگلہ لگا کر آمد و رفت بند کر دی گئی ہے۔

واقعات ۹۳۵ھ

(۱۵ ستمبر ۱۵۲۸ء - ۵ ستمبر ۱۵۲۹ء)

ملتان کا نظم ونسق عسکری [1] کے سپرد تھا۔ چندیری پر یورش کرنے سے قبل میں نے اسے طلب کیا۔ وہ آیا اور خلوت خانے میں خدمت بجالایا۔ اگلے دن صبح خواندامیر [2] مورخ، مولانا شہاب معمائی اور یونس علی کا قرابت دار میر ابراہیم قانونی حاضرِ خدمت ہوئے۔ یہ لوگ کافی عرصے سے میری ملازمت اختیار کرنے کی خاطر ہرات سے آئے ہوئے تھے۔

مہینے کی پانچ تاریخ کو اتوار کے دن بوقتِ ظہر گوالیار کا معائینہ کرنے کے لئے جسے کتابوں میں گالیور لکھا گیا ہے، میں نے دریائے جمنا کو عبور کیا اور قلعۂ آگرہ پہنچ گیا۔ فخر جہاں بیگم اور خدیجہ سلطان بیگم کو خیر باد کہنے کے لئے میں گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے پاس پہنچا۔ یہ خواتین ایک دو دن میں ہی کابل جانے کے ارادے سے روانہ ہونا چاہتی تھیں۔

محمد زماں مرزا نے رخصت چاہی اور وہ آگرہ میں ہی رہ گیا۔ اس رات ہم نے چار پانچ کروہ سفر طے کر کے ایک بڑے تالاب کے کنارے قیام کیا اور رات وہیں بسر کی۔ نماز فجر ہم نے قبل از وقت ہی ادا کر لی۔ اس کے بعد ہم سوار ہوئے اور دو پہر کو گمبھیر دریا کے کنارے آرام کیا ظہر کے وقت وہاں سے گھوڑوں پر سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ ملا رفیع نے سفوف تیار کر کے ہمیں دیا جو ہم نے ستو کے ساتھ کھایا۔ [3] تا کہ اس کا شوق کرنے سے سرور آ جائے۔ میں نے اسے نگل تو لیا مگر بہت بدمزہ تھا۔ دھولپور سے ایک کروہ کے فاصلے پر اس کی مغربی سمت میں میں نے باغ لگانے اور وہاں عمارات تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا۔ عصر کے وقت میں اس میں قیام پذیر ہوا۔ یہ باغ اور عمارات ایک پہاڑ کی نوک پر واقع ہیں۔ پہاڑ کی یہ نوک سنگ سرخ کی ایسی سالم چٹان ہے، جس کو مکانات کی تعمیر میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ میں نے حکم دیا کہ اس چٹان کو کاٹیں۔ اگر چہ سالم چٹان اتنی ہو کہ اسے تراش کر پوری ایک عمارت بنائی جا سکے تو اسے تراش کر عمارت تیار کریں اور اگر یہ اتنی اونچی نہ ہو تو اس کو باغ کی عمارت کے ہموار شدہ صحن میں لے جائیں اور وہاں اسے تراش کر حوض تیار کریں۔ یہ سالم چٹان اتنی اونچی نہ تھی کہ اس سے کوئی عمارت بن سکے لہذا استاد محمد شاہ سنگتراش کو حکم دیا گیا کہ وہ اس سے ایسا آٹھ پہلو حوض (ورق ۳۱۷) تیار کرے جس کے اوپر گنبد دار چھت بھی ہو اور سنگتراشوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ سنجیدگی سے اس کام میں مشغول ہوں۔ جس جگہ اس سالم چٹان کو تراش کر حوض بنانے کا حکم دیا گیا تھا اس کے شمال میں درخت کثرت سے موجود ہیں۔ جن میں آم اور جامن کے علاوہ اور بھی انواع واقسام کے درخت ہیں۔ میں نے حکم دیا کہ ان درختوں کے درمیان ایسا کنواں بنایا جائے جو طول وعرض میں دس ضرب دس ہو۔ یہ کنواں اب مکمل ہونے کے قریب ہی ہے۔ اس کا پانی اس حوض میں آتا ہے۔ اس حوض کے مغرب میں سلطان سکندر نے بند بنوایا تھا۔ اس بند کے اوپر اس نے مکانات بھی تعمیر کرائے تھے۔ بند سے ذرا اوپر جب برسات کا پانی جمع ہو جاتا ہے تو گویا جھیل جیسا بڑا تالاب بن جاتا ہے۔ اس جھیل کے اطراف میں پہاڑ ہیں۔ میں نے حکم دیا کہ اس جھیل کے مشرق میں بھی سالم چٹان کو کاٹ کر اس سے ایک چبوترہ تیار کریں۔ اس کے مغرب میں مسجد کی تعمیر کا حکم دیا گیا۔ منگل اور بدھ کے دن ان مسائل کی وجہ سے مصلحتاً دھولپور میں ہمارا قیام رہا۔

جمعرات کے دن گھوڑے پر سوار ہوئے دریائے چنبل کو پار کیا اور نماز ظہر اس کے کنارے ادا کی۔ ظہر و عصر کے درمیان میں نے دریائے چنبل سے سوار ہو کر مغرب وعشا کے درمیان دریائے کنواری سے گزر کر قیام

۱۔ عسکری۔ بابر کا بیٹا جو کامران سے چھوٹا تھا۔

۲۔ خواندامیر: مورخ۔ ان کا نام غیاث الدین تھا۔ ان کی پیدائش غالباً ۸۸۰/ ۱۴۷۵ میں ہرات میں ہوئی۔ والد ہمام الدین سلطان محمود، بابر کے چچا کا وزیر تھا۔ خواندامیر پہلے بدیع الزماں کے پاس ہرات میں نوکر رہا۔ ہرات پر شیبانی خاں کے قبضے کے بعد ہندستان بابر کے پاس آ گیا۔ اس کی کتابیں خلاصۃ الاخبار، حبیب السیر اور ہمایوں نامہ مشہور ہیں۔ اس کا انتقال ۹۴۱/ ۵-۱۵۳۴ میں گجرات سے واپسی میں ہوا۔ (ایلیٹ اینڈ ڈوسن، ہسٹری اوف انڈیا ج ۴ ص ۱۵۴، اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۹ ص ۳۸)

۳۔ ستو: بابر نے یہاں لفظ تالقان، استعمال کیا ہے (شاد، فرہنگ ترکی ص ۶۵)

کیا۔ برسات کی وجہ سے دریا کا پاٹ پھیل گیا تھا اور پانی اتنا چڑھ گیا تھا کہ گھوڑے کو تیرا کر پار پہنچایا گیا اور ہم خود کشتی میں بیٹھ کر دریا پار ہوئے۔

اگلے دن یعنی بروز جمعہ یوم عاشورہ تھا۔ اس دن صبح ہم وہاں سے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ راستے میں ایک گاؤں آیا۔ دوپہر کا وقت اسی جگہ گزار کر عشا کے وقت گوالیار سے ایک کروہ شمالی جانب اس جگہ جہاں گزشتہ سال میں نے باغ لگانے کا حکم دیا تھا قیام پذیر ہوئے۔

اگلے دن وقت ظہر سے قبل ہم گھوڑوں پر سوار ہوئے اور گوالیار کے شمالی پشتوں نیز وہاں کے عبادت خانوں کا معائنہ کر کے واپس آئے۔ اس کے بعد ہم ہتھیا پول [4] دروازے سے قلعہ گوالیار میں داخل ہوئے۔ راجہ مان سنگھ [5] کے محلات اسی دروازے سے متصل ہیں۔ اس کے محلات سے گزرتے ہوئے عصر کے وقت راجہ وکرما جیت [6] کے محلات میں پہنچے، جن پر اب رحیم داد کا قبضہ ہے۔ وہاں سے واپس آ کر ہم نے قیام کیا۔

اس رات کان میں تکلیف [7] ہونے کے باعث میں نے افیون [8] کا سہارا لیا اس کا ایک اور باعث چاندنی رات [9] بھی تھی۔ اگلے دن صبح کے وقت افیوں کا خمار کافی تکلیف دہ تھا۔ میں نے بہت زیادہ قے کی۔ خمار کے باوجود میں نے مان سنگھ اور وکرما جیت کی تمام عمارات کا وہاں گھوم پھر کر معائنہ کیا۔

گوالیار کی سیر

یہ عمارات بھی بہت عجیب وغریب ہیں۔ اگرچہ سب ہی ناموزوں اور بے ترتیب ہیں لیکن تراشیدہ پتھروں سے بنائی گئی ہیں۔ ان تمام عمارات میں مان سنگھ کی عمارات زیادہ بہتر اور عمدہ ہیں۔

راجہ مان سنگھ کے محلات کی دیوار کا ایک ضلع مشرق کی جانب ہے۔ جس میں دیگر اضلاع کی نسبت بیشتر تکلف سے کام لیا گیا ہے۔ ان عمارات کے بلندی تقریباً چالیس پچاس گز ہوگی۔ سب ہی تراشیدہ پتھر سے بنائی گئی ہیں اور چونا پھیر کر انہیں سفید کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض عمارات چار منزلہ ہیں۔ [10] پہلی دو منزلوں میں اندھیرا رہتا ہے۔ (ورق ۳۱۸) تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد مدھم سی روشنی نظر آتی ہے۔ میں نے ان کا معائنہ شمع روشن کر کے کیا۔ اس کے ہر ضلع میں پانچ گنبد ہیں۔ گنبدوں کے بیچ میں چھوٹی چھوٹی ہندوستانی طرز کی چوکھنڈیاں ہیں۔ ان پانچ بڑے گنبدوں کے اوپر تانبے کے پتھروں پر سونے کا ملمع کر کے نصب کیا گیا ہے۔ ان دیواروں کی بیرونی سطح پر سبز رنگ کے روغنی خشت پارے چسپاں کئے گئے ہیں۔ جن پر کیلے کے درخت کے نقوش نمایاں ہیں۔ اس عمارت کے مشرقی ضلع میں ہتھیا پول دروازہ ہے۔ یہاں فیل کو ہاتھی کہتے ہیں اور دروازے کو پول۔ جس جگہ دروازے سے باہر آتے ہیں وہاں ہاتھی کا مجسمہ نصب کر کے ان پر دو فیلبان بھی بنا کر بٹھائے گئے ہیں۔ یہ مجسمہ ہو بہو ہاتھی کے قد وقامت کا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر اسے ہتھیا پول کہتے ہیں۔ [11] اس چار منزلہ عمارت کی سب سے نیچے کی منزل میں اسی جگہ جہاں یہ مجسمہ نصب ہے وہاں ایک روزن ہے یہاں سے یہ ہاتھی نزدیک معلوم ہوتا ہے۔ اس سے بالا تر منزل میں وہ گنبد ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ دوسری منزل میں اس کے رہائشی کمرے ہیں۔ ان میں سے بعض کمروں کی سطح نیچی ہے۔ اگرچہ آرائش میں ہندوستانی طرز کو بروئے کار لایا گیا ہے لیکن وہاں ہوا کا گزر نہیں۔

مان سنگھ کے لڑکے وکرما جیت کے محلات قلعے کی شمالی سمت میں درمیانی جگہ پر واقع ہیں۔ بیٹے کے محلات باپ کے مکانات کے ہم پلہ و برابر نہیں۔ وہاں ایک بڑا گنبد ہے جو بہت تاریک ہے۔ کافی دیر تک وہاں کھڑے رہنے کے بعد ہی روشنی نظر آتی ہے۔ اس بڑے گنبد کے نیچے بھی ایک چھوٹی عمارت ہے۔ جس میں کسی طرف سے روشنی داخل نہیں ہوتی۔ اس کے گنبد کے اوپر ہی رحیم داد نے ایک چھوٹا سا ایوان بنا رکھا تھا۔ وہ

۴۔ ہتھیا پول: دروازہ اب بھی قائم ہے۔ گوالیار میں یہ ہتھیا پور کہلاتا ہے۔

۵۔ راجہ مان سنگھ: گوالیار کے تومار خاندان کا آخری سے پہلا راجہ اس نے ۸۹۱/۱۴۸۶ سے ۹۲۳/۱۵۱۷ تک حکومت کی۔ اس کی لڑائی بہلول لودھی سے کافی عرصے تک جاری رہی۔ آخر میں راجہ نے اسی ہزار کا نسی کا ٹنکہ دے کر جان چھڑائی۔ (فضل علی، کلیات گوالیاری ص ۸) راجہ مان سنگھ کو راگوں کا شوق تھا۔ اس کی کتاب 'من کوتوہل' کا مخطوطہ رام پور میں ہے۔ اس کے چار گویے بخشو، چارجو، کرن اور بھانو راگوں کو ترتیب دیا کرتے تھے (نعیم قریشی، گوالیار کے آس پاس ص ۲۰)۔

۶۔ وکرما جیت: یہ راجہ مان سنگھ کا بیٹا اور گوالیار کے تومان راجاؤں کا آخری حکمراں تھا۔ اس نے تین سال حکومت کی، ابراہیم لودھی کے ساتھ بابر سے جنگ کرتے ہوئے مارا گیا (فضل علی کلیات گوالیاری ص ۲۰)۔

۷۔ اس کان کے درد کے متعلق بابر نے تفصیلات فراہم نہیں کیں۔ یہ پہلے کان کے درد کے چھ مہینے بعد ہو رہا ہے۔ یہ ایک آدھ دن میں بہتر ہو گیا تھا۔ اس کان کے درد سے متعلق گوالیار میں نظم مشہور ہے جس کا آخری مصرعہ ہے "اچھو کان بھیو تین گھڑی" اس کے علاوہ یہ بھی مشہور ہے کہ اس درد سے صحت مند ہونے میں شیخ غوث گوالیاری کی دعائیں بھی شامل تھیں (بیوز، کلیات گوالیاری ص ۶۱)۔

۸۔ بابر یہاں افیون کھانے کا ذکر کرتا ہے۔ اس سے پہلے جگہ جگہ جو معجون کھانے کا جو ذکر ہو رہا ہے وہ ظاہر ہے خالص نہیں افیون کا مرکب ہوگا۔ یہاں دوا استعمال ہو رہی ہے۔

۹۔

منظر جاں نواز ہے چاندنی رات کا عجب
خنکی ہے موج باد میں دل میں ہے گرمیٔ طرب

(مطلع انوار، اردو لغت ج ۷ ص ۳۰۸)

۱۰۔ یہ عمارات چار منزلہ مشرقی طرف ہیں۔ مغرب اور شمال کی طرف تین یا دو منزلہ ہیں جہاں راستہ صحن میں کھلتا ہے (بیوز، کلیات گوالیاری ص ۶۴)

۱۱۔ ہاتھی۔ ہتھیا پول پر پتھر کا یہ ہاتھی اب قائم نہیں رہا۔ اکبر کے زمانے کی ایک مرقع تصویر میں موجود ہے۔ ہاتھی پر مہاوت اور کوئی راجہ بیٹھا ہے۔ یہ مجسمہ شاید آٹھویں صدی عیسوی کا اور مان سنگھ سے بہت پہلے کا ہے (بیوز، فضل علی، کلیات گوالیاری ص ۶۴)

۱۲۔ وکرما جیت کی عمارات اب بہت خستہ حالت میں ہیں۔ نچلی

وکرماجیت کی انہی عمارات میں رہا کرتا تھا۔ وکرماجیت کی انہی عمارات میں ایک سرنگ بنائی گئی ہے۔ جو اس کے باپ کی عمارات میں جا کر نکلتی ہے۔ سرنگ باہر سے نظر نہیں آتی۔ اندر سے بھی اس کے کسی جگہ آثار معلوم نہیں ہوتے البتہ اس میں روشنی کسی طرف سے ضرور آتی ہے۔ یہ عجیب وغریب ہی سرنگ ہے۔[12]

رحیم داد کا مدرسہ و باغیچہ

ان عمارات کا معائنہ کرنے کے بعد ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر اس مدرسے کی جانب گئے جس کی تعمیر رحیم داد نے کرائی تھی۔[13] قلعے کی جنوبی سمت میں بڑے حوض کے کنارے رحیم داد نے باغ لگوایا تھا۔ اس کی سیر کرنے کے بعد ہم کافی دیر بعد چار باغ میں واپس آ گئے جہاں ہمارا لشکر قیام پذیر تھا۔ اس باغ کی کیاریوں میں انواع و اقسام کے پھول بوئے گئے تھے۔ کنیر کے خوش رنگ پھول وافر مقدار میں تھے۔ اگرچہ یہاں کا کنیر گل شفتالو[14] جیسا ہوتا ہے۔ لیکن گوالیار کا کنیر سرخ اور انتہائی دلکش ہوتا ہے۔ میں گوالیار سے کچھ کنیر کے پھول ساتھ لے کر آیا اور انہیں آگرہ کے باغوں میں لگوایا۔ جنوب کی جانب جو پہاڑ ہے وہاں ایک بہت بڑی جھیل ہے۔ برسات کا پانی اس جھیل میں جمع ہو جاتا ہے۔ اس جھیل کے مغربی کنارے پر ایک بہت اونچا مندر ہے۔ سلطان شمس الدین التمش نے اس بتکدے کے پہلو میں جامع مسجد تعمیر کرائی تھی۔ یہ بتخانہ بہت ہی اونچی عمارت ہے۔ قلعے کے اندر اس سے زیادہ اونچی کوئی عمارت نہیں۔ (ورق ۳۱۹) دھولپور کے پہاڑ پر سے یہ قلعہ اور مندر صاف نظر آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس مندر کے پتھر اسی بڑی جھیل میں سے کاٹ کر لے جائے گئے تھے۔ رحیم داد نے اس باغ میں ایک چوبی ایوان بنوایا تھا۔ جو انتہائی ادنیٰ درجہ کی بدوضع عمارت ہے۔ اس باغ کے دروازے پر بھی اس نے ہندوستانی طرز کے بدزیب ایوان بنوائے ہیں۔

اگلے دن ظہر کے وقت میں ان تین عمارتوں کا معائنہ کرنے کے ارادے سے گھوڑے پر سوار ہوا جنہیں میں نے دیکھا نہیں تھا۔ مان سنگھ قلعے کے باہر ایک عمارت جس کا نام بادل گڑھ ہے۔[15] میں اس کا معائنہ کر کے دروازہ ہتھیا پول سے واپس قلعے میں آیا۔ وہاں سے ارواہ نامی[16] جگہ کو دیکھنے کے لئے گیا۔ یہ جگہ قلعے کی مغربی جانب ایک درّے میں واقع ہے۔ اگرچہ یہ درّہ اس فصیل سے باہر ہے جو پہاڑ پر بنائی گئی ہے۔ مگر اس کے باوجود اس درّے کے دہانے پر دوگنا اونچی فصیل اٹھائی گئی ہے۔ یہ فصیل بلندی پر قلعے کی دائیں اور بائیں جانب سے متصل ہوتی ہے۔ اس فصیل کے درمیان اس فصیل سے ذرا نیچی ایک اور فصیل بنائی گئی ہے۔ لیکن یہ فصیل ایک سرے سے دوسرے سرے تک کسی دیوار سے متصل نہیں ہوتی۔ یہ محض پوشیدگی سے آب رسان کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس فصیل کے درمیان پانی حاصل کرنے کے لئے باؤلی ہے۔ دس پندرہ سیڑھیاں اتر کر پانی تک پہنچا جا سکتا ہے۔ بڑی فصیل کے دروازے سے جو راستہ باؤلی کی طرف جاتا ہے وہاں دروازے کے اوپر ایک پتھر کی سل نصب ہے۔ جس پر سلطان شمس الدین التمش کندہ ہے اور تاریخ ۶۳۰ھ ثبت ہے۔[17] قلعے کی بیرونی فصیل کے نیچے قلعے سے باہر بہت بڑا تالاب ہے۔ کبھی کبھی اس میں پانی اتنا کم ہو جاتا ہے کہ یہ تالاب نہیں رہتا۔ کیونکہ یہاں کا پانی اس نالے میں چلا جاتا ہے جہاں سے پوشیدہ طور پر پانی قلعے میں جاتا ہے اس کے اور ارواہ کے درمیان مزید دو تالاب ہیں۔ قلعے کے لوگ اس تالاب کے پانی کو دوسرے تالابوں کے مقابل ترجیح دیتے ہیں۔ اس ارواہ کے تین طرف ایک ہی پہاڑ ہے۔ اگرچہ اس کا رنگ سرخ ہے مگر ایسا نہیں جیسا بیانہ کے پتھر کا ہے۔ اس کا رنگ بیانہ کے پتھر سے ذرا ہلکا ہی ہوتا ہے۔ ارواہ کے اطراف میں جو پتھر ہیں انہیں تراش کر دیوتاؤں کی چھوٹی بڑی مورتیاں بنائی گئی ہیں۔ اس کے جنوب میں ایک بہت بڑی مورتی ہے جو تقریباً بیس گز اونچی ہوگی۔ یہ تمام مورتیاں ننگی ہیں جن کے آلات تناسل تک کو پوشیدہ نہیں رکھا گیا۔ ارواہ میں ان دو تالابوں کے چاروں طرف بیس

منزل میں ایک ایوان اور اوپر کھلی چھت پر ایک کرہ مع گنبد باقی ہیں۔

۱۳۔ رحیم داد کا مدرسہ۔ اس کی باقیات میں اسی کھمبہ نام کی عمارت ہے جس میں ایک خشک باؤلی اور ناگری خط میں ایک کتبہ ہے (ہیوز، کلیات گوالیاری ص ۶۷)۔

۱۴۔ شفتالو کے لئے دیکھیں ۹۳۲ھ کے حالات میں حواشی نمبر ۱۱۱۔

۱۵۔ بادل گڑھ کی عمارات ہندولہ پھاٹک سے ملحق ہیں جو ایک مشرقی دروازہ ہے (نعیم قریشی، گوالیار کے آس پاس ص ۲۹)

۱۶۔ ارواہ وادی۔ یہ چھوٹی وادی ہے اور ایلورہ کی وادی سے ملتی جلتی ہے۔ یہاں زیادہ تر بت جینی لوگوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ زیادہ تر بت بابر کے حکم پر بگاڑنے کے بعد دوبارہ بنا دیئے گئے ہیں۔

۱۷۔ التمش کا یہ کتبہ اب باقی نہیں۔ ہیوز نے اس کتبہ کا ایک ٹکڑا ساس بہو مندر کے پاس دیکھا تھا۔ خواجہ رشید الدین نے اس کے متعلق ایک مضمون لکھا تھا (کلیات گوالیاری ص ۶۸/ ۶۹)۔

۱۸۔ وکرماجیت۔ یہ وکرمادتیہ جتو ژمی ہیں۔ گوالیاری نہیں (بیلہ

پچیس کنویں بنائے گئے ہیں۔ یہاں سے پانی کھینچ کر سینچائی کے کام میں لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس جگہ کو سرسبز کر کے یہاں پھولوں کی کیاریاں بنائی گئی ہیں اور درخت اُگائے گئے ہیں۔ ارواہ بری جگہ نہیں۔ بس اس میں کوئی عیب ہے تو یہی ہے کہ یہاں مورتیاں ہیں۔ میں نے حکم دیا کہ ان کو توڑ ڈالیں۔ ارواہ سے میں قلعے میں داخل ہوا اور سلطان پول پہنچا۔ کفار کے عہد سے یہاں باریابی ممنوع ہے۔ اس جگہ کا تفریحاً معائنہ کرنے کے بعد میں مغرب کے وقت اس باغ میں قیام پذیر ہوا جو رحیم داد نے لگوایا تھا۔ رات میں نے وہیں بسر کی۔

منگل کے دن مہینے کی چودہ تاریخ کو رانا سانگاہ کے دوسرے بیٹے (ورق ۳۲۰) وکرماجیت [18] کی جانب سے آدمی آئے وہ اپنی ماں پدماوتی کے ساتھ قلعۂ رنتھمبور میں مقیم تھا۔ اس سے قبل کہ میں رنتھنبور کا معائنہ کرنے کے لئے سوار ہو کر جاؤں اشوک نامی ایک ہندو جو وکرماجیت کا معتبر آدمی ہے آچکا تھا۔ اس نے اظہار اطاعت و بندگی کیا اور خدمت بجالایا۔ وکرماجیت نے اپنی استقامت کے لئے ستر لاکھ کی درخواست کی تھی۔ اس کے ساتھ یہ قرار پایا کہ وہ جیسے ہی قلعۂ رنتھمبور خالی کر دے گا اس کی درخواست کے مطابق اسے پرگنات عطا کر دیئے جائیں گے اس قرارداد کے بعد اس کے آدمیوں کو روانہ کر دیا گیا۔

جس وقت میں گوالیار کا معائنہ کرنے کے لئے جا رہا تھا تو اس (کرماجیت) کے آدمیوں سے کہا تھا کہ وہ میرے ساتھ وہاں ملاقات کریں۔ وہ وقت مقررسے کئی دن بعد آئے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اشوک نامی یہ ہندو وکرماجیت کی ماں پدماوتی کا قرابت دار ہے۔ اس نے تمام کیفیت ماں اور اس کے بیٹے کے سامنے بیان کر دی۔ انہوں نے اشوک کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے میری حکومت کی خیرخواہی کا اعلان اور میری خدمت بجالانا قبول کیا۔ سلطان محمود (خلجی) [19] کو جس وقت رانا سانگا کافر نے شکست دی تھی اور اسے قید کیا تھا تو جو تاج کلاہ اور سونے کا پٹکا وہ اس وقت پہنے ہوئے تھا وہ اس وقت سے وکرماجیت کے پاس چلا آرہا تھا اس کا بڑا بھائی تلسی جب باپ کی جگہ رانا بن کر گدی نشین ہوا (اور اب وہ چتوڑ پر قابض ہے) اس نے وہ تاج کلاہ اور سونے کا پٹکا اور چھوٹے بھائی سے مانگا۔ جس کو اس نے دینے سے انکار کر دیا۔ جب اس کے آدمی مجھ سے ملاقات کرنے آئے تھے اس نے کہلوایا تھا کہ وہ یہ تاج کلاہ اور سونے کا پٹکا اس شرط پر دینے کو تیار ہے کہ رنتھنبور کے عوض اسے بیانہ عطا کر دیا جائے۔ میں نے ان سے کہا کہ بیانہ کی بات سے تو وہ منحرف ہو جائیں اور یہ وعدہ کیا کہ رنتھنبور کے عوض شمس آباد دیا جا سکتا ہے۔ جس روز اس کے آدمی آئے تھے اسی دن انہیں خلعت پہنائی گئی تھی اور انہیں یہ کہہ کر جانے کی اجازت دے دی گئی تھی کہ نو دن بعد وہ بیانہ میں آکر حاضر خدمت ہوں۔

اس باغ سے سوار ہو کر میں گوالیار کے مندروں [20] کی سیر کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ ان میں سے بعض دومنزلہ اور سہ منزلہ ہیں۔ جن کی چھتیں نیچی ہیں اور قدیم طرز پر تعمیر کئے گئے ہیں سنگی کرسیوں پر پتھر کی مورتیاں کندہ کی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض مندر، مدرسے کی طرز پر تعمیر کئے گئے ہیں۔ جس کے صدر دالان میں ایسے ہی اونچے اور بڑے گنبد ہیں جیسے مدارس کی عمارت میں بنائے جاتے ہیں۔ ہر حجرے کے اوپر کئی چھوٹے چھوٹے گنبد پتھروں کو تراش کر بنائے ہیں۔ نیچے کی منزل میں جو حجرے ہیں ان میں پتھروں کی مورتیاں رکھی گئی ہیں۔ ان مندروں کی سیر کرنے کے بعد میں گوالیار کے مغربی دروازے سے باہر آیا اور قلعے کی جنوبی سمت میں چلا گیا۔ اس جگہ کا معائنہ کرنے کے بعد میں واپس رحیم داد کے لگائے ہوئے چار باغ میں آگیا یہ ہتھیا پول کے سامنے واقع ہے یہاں آکر ہی میں اپنے گھوڑے پر سے اترا۔

رحیم داد نے اس چار باغ میں ضیافت کا اہتمام کیا تھا اور انواع واقسام کے کھانے تیار کرائے تھے۔ اس نے پیشکش کے ساتھ کئی قسم کے تحائف مجھے نذر کئے نقد و جنس کو شامل کر کے ان سب کی قیمت چار لاکھ کے برابر تھی۔ اس کے چار باغ سے گھوڑے پر سوار ہو کر میں اپنے چار باغ میں شام کے وقت آیا۔

۱۹۔ سلطان محمود دوم حاکم مالوہ کو ۹۲۴/۱۵۱۹ میں رانا سانگاہ اور میدنی راؤ کی فوجوں سے شکست ہوئی تھی (فرشتہ ج ۴، ص ۲۶۲)

۲۰۔ ان مندروں میں سب سے اونچا تیلی کا مندر ہے جو طرز تعمیر کے لحاظ سے جنوبی طرز پر ہے۔ اس کا اصل نام تنگ مندر ہے۔ اس کے بعد ساس بہو کا مندر ہے۔ (نعیم قریشی، گوالیار کے آس پاس، ص ۳۰)۔ یہ دو مندر ہیں ساس کا بڑا اور بہو کا چھوٹا۔ سب کتابیں اس کو ایک نام سے ہی یاد کرتی ہیں۔ الگ الگ ذکر نہیں۔ یہ معلوم نہیں کہ ساس ظالم تھی یا بہو خودسر۔ اس کے بعد سورج کنڈ مندر تھا جو چھٹی صدی عیسوی کا بنایا ہوا تھا اس کا ایک مربع نما طلاب باقی ہے

۲۱۔ آبشار۔ یہ جھرنا اب باقی نہیں۔ جنوب مشرق میں زیادہ تر

جھرنے کی سیر

بدھ کے دن مہینے کی پندرہ تاریخ کو میں اس آبشار کی سیر کو گیا[21] جو گوالیار کے جنوب مشرق میں واقع ہے اور یہاں سے چھ کروہ کے فاصلے پر ہے۔ چونکہ (ورق ۳۲۱) ہم جس وقت گھوڑوں پر سوار ہوئے تھے اس وقت دن چڑھ چکا تھا اس لئے ہم وہاں ظہر گزر جانے کے بعد ہی پہنچے۔ یہ تقریباً بیس ہاتھ اونچی چٹان ہے۔ جس پر سے پانی چادر بن کر گرتا ہے اس کے نیچے بھی چٹان ہے۔ اس پانی سے جگہ جگہ جھیلیں بن گئی ہیں۔ اس آبشار کے آس پاس چھوٹی چھوٹی ایسی چٹانیں ہیں جن پر بیٹھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں پانی ہر وقت نہیں رہتا۔ ہم نے اس آبشار کے اوپر بیٹھ کر معجون کی چسکیاں لیں اور سیر کرتے ہوئے اونچائی کی طرف وہاں تک پہنچ گئے جہاں اس پانی کا سرچشمہ ہے۔ وہاں سے واپس آ کر ایک بلند جگہ پر تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ گئے۔ موسیقاروں نے اپنے سازوں کے ذریعے نغمہ نوازی کی اور قوالوں نے کچھ کلام سنایا آبنوس[22] کے درخت کو ہندستان کے لوگ تندو کہتے ہیں۔ جن لوگوں نے پہلے یہ درخت نہیں دیکھا تھا انہیں یہ درخت دکھایا گیا۔

وہاں سے واپس آ کر ہم پہاڑ سے نیچے اترے۔ مغرب وعشا کے درمیان ہم اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور آدھی رات کے وقت ایک جگہ پہنچ کر سو گئے۔ جس وقت ہم چار باغ پہنچے ایک پہر دن چڑھ چکا تھا۔

مہینے کی سترہ تاریخ کو بروز جمعہ ہم نے سوہجنہ نامی گاؤں کا دورہ کیا۔ جو صلحادی[23] کی جائے پیدائش ہے۔ اس گاؤں سے اوپر پہاڑ اور درّے ہیں۔ ہم نے لیمو اور سدا پھل کے باغوں کی سیر کی۔ ایک پہر گزرنے کے بعد ہم واپس آ کر چار باغ میں فروکش ہوئے۔

مہینے کی انیس تاریخ بروز اتوار ہم چار باغ سے صبح کے وقت سوار ہوئے۔ دریائے کنواری کو پار کر کے ایک جگہ دوپہر کا وقت گزارا۔ ظہر کے وقت ہم وہاں سے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور بوقت غروب آفتاب ہم نے دریائے چنبل کو عبور کیا۔ مغرب وعشا کے درمیان ہم نے قلعہ دھولپور میں داخل ہو کر چراغوں کی روشنی میں اس حمام کی سیر کی جس کی تعمیر ابوالفتح[24] نے کرائی تھی۔ اس جگہ کی سیر کر کے ہم گھوڑوں پر سوار ہوئے اور اس جگہ پہنچ گئے جہاں ایک نئے باغ کی طرح اندازی کی جا رہی تھی۔ پشتے کی بلندی پر پہنچ کر ہم وہاں قیام پذیر ہوئے اگلے دن صبح میں نے ان مقامات کی سیر کی جن کے بنانے کا میں حکم دے چکا تھا۔ اس گنبددار حوض کا چہرہ جسے میں نے سالم چٹان کاٹ کر بنانے کا حکم دیا تھا ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ میں نے حکم دیا کہ مزید سنگتراش فراہم کئے جائیں۔ تاکہ وہ حوض کی تہ تیار کر سکیں اور اس میں پانی بھر کر اس کی سطح کی ہمواری دیکھ لیں۔ عصر کا وقت گزرنے تک انہوں نے حوض کا چہرہ مکمل کر لیا تھا۔ میں نے حکم دیا کہ اسے پانی سے پر کریں۔ چنانچہ اس میں پانی بھر کر وہ اس کی سطح کو متوازن و ہموار کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اس مرتبہ میں نے حکم دیا کہ اس جگہ جہاں سالم چٹان ہے اسے کاٹ کر آب خانہ تیار کریں اور اس میں ہی سالم چٹان کاٹ کر ایک چھوٹا حوض بنایا جائے۔

پیر کے دن معجون کی چسکیوں سے محفل آراستہ کی گئی۔ منگل کے دن میں اسی جگہ مقیم رہا۔ بدھ کی شام کو میں نے روزہ افطار کیا اور تھوڑا سا کھانا کھا کر سیکری جانے کے ارادے سے گھوڑے پر سوار ہوا۔ دوپہر کے وقت ایک جگہ اتر کر سو گیا۔ بظاہر میرے کان پر سردی یا اس جیسی کسی ہوا کا اثر ہو گیا تھا۔ اس رات اس میں اتنا شدید درد تھا (ورق ۳۲۲) کہ میں سو نہ سکا۔[25] علی الصباح ہم یہاں سے روانہ ہوئے اور ایک پہر کے اندر اس باغ میں جو میں نے سیکری میں لگایا ہے پہنچ کر وہاں قیام پذیر ہوئے۔[26] باغ کی دیواروں اور کنوں کی عمارت چونکہ میری دلخواہ نہ تھیں اسی لئے ان لوگوں کو جو وہاں برسر کار تھے تنبیہ کی گئی اور سزا بھی دی گئی۔[27]

علاقہ خشک ہے اور پہاڑیاں نیچی ہیں (ہیوز، کلیات گوالیار، ص ۷۰)۔

۲۲۔ آبنوس۔ ایک کیاب درخت، عمدہ قسم کی لکڑی جو دستکارانہ اشیا بنانے کے کام آتی ہے۔ یہ پانی میں ڈوب جاتی ہے۔ طب مشرق میں اس کو مختلف امراض کے لئے مفید پایا گیا ہے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج اص ۷)۔

۲۳۔ صلحادی۔ صلاح الدین کے لئے دیکھیں ۹۳۲ھ کے حالات میں حواشی نمبر ۲۲۔

۲۴۔ ابوالفتح ترکمان۔ بابر نے دھولپور کو اپنی جاگیر قرار دیا (علاقہ خالصہ) اس وقت ابوالفتح کو اس کا حکمران بنا کر بھیجا تھا (ورق ۲۸۰، ۹۳۳ھ کے واقعات)۔

۲۵۔ نزلہ کان کی نالیاں بند کر سکتا ہے۔ اس وجہ سے کان میں سوجن ہو کر درد ہو سکتا ہے۔

۲۶۔ باغ فتح۔ فتح پور سیکری میں پہاڑی سے جنوب مغرب کی طرف اس باغ کی عمارات باقی ہیں۔ اس کا راستہ نگر گاؤں سے ہے، اور جھیل اب موتی جھیل کہلاتی ہے۔ رام ناتھ نے اس باغ کی عمارات کا مفصل ذکر کیا ہے۔ ہرن مینار سے آگے الٹے ہاتھ پر ایک تین منزلہ باؤلی ہے جس پر ایک کتبہ موجود ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں بابر نے جنگ خانوہ سے پہلے شراب بہانے اور ظروف توڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کو اب باؤلی عبداللہ شاہ کہا جاتا ہے۔ اس سے جنوب مغرب اجمیری دروازے کی طرف جائیں تو بارہ دری ہے جو اب بہت چھوٹی رہ گئی ہے۔ اور آگے چل کر سیدھے ہاتھ پر جل محل اور موتی جھیل ہے۔ جل محل اس وقت پورا جھیل کے اندر تھا۔ اس میں ایک اندرونی دالان دائرہ نما ہے جس کے چاروں طرف پانی تھا۔ پانی کے چاروں طرف ایک اور دالان یہ سب عمارات لال پتھر کی بنی ہوئی ہیں (رام ناتھ، بابرس جل محل ایٹ فتح پور سیکری، اسٹڈیز ان اسلام 1981، ۱۵۳-۱۶۰) یہ اب بھی پرکشش جگہ ہے، فتح پور سیکری آنے والا عام سیاح اس طرف کم ہی آتا ہے۔ بابر کے وقت میں عیش و آرام کی جگہ ہو گی۔

۲۷۔ کارندے اس زمانے میں بھی تسلی بخش کام نہیں کرتے تھے

اور آج بھی یہی حال ہے۔ لیکن اب تنبیہ و سزا کا تصور نہیں۔

عصر اور مغرب کے درمیان ہم گھوڑوں پر سوار ہوئے اور مدھا کور سے گزر کر ایک جگہ ہم نے قیام کیا اور وہاں سو گئے۔

وہاں سے سوار ہو کر ایک پہر گزر جانے کے بعد ہم آگرہ پہنچے۔ فخر جہاں بیگم تو روانہ ہو گئی تھیں لیکن خدیجہ سلطان بیگم ابھی بعض امور کی بنا پر وہیں مقیم تھیں۔ ان سے میں نے ملاقات کی۔ دریائے جمنا کو عبور کر کے میں باغ ہشت بہشت میں پہنچا۔

ماہ صفر کی تین تاریخ بروز ہفتہ میں گہر شاد بیگم، بدیع الجمال بیگم اور آق بیگم تین بڑی بیگمات سے جو رشتے میں میری پھوپی اور چچی ہوتی تھیں اور چھوٹی بیگمات یعنی سلطان مسعود مرزا کی بیٹی خانزادہ بیگم، سلطان بخت بیگم اور اپنی چہیتی چچی کی پوتی زینب سلطان بیگم سے عصر اور مغرب کے درمیان ملنے کے لئے گیا۔ وہ دریا پار کر کے محلات کے قریب قیام پذیر تھیں، وہاں سے میں کشتی میں سوار ہو کر واپس آیا۔

ہفتے کے دن پانچ صفر دیوا کے لڑکے ہموسی کو جو بھیرہ سے میری خدمت میں چلا آ رہا تھا۔ وکر ماجیت کے پہلے سے آئے ہوئے اور آخری ایلچی کے ہمراہ روانہ کیا گیا تا کہ وہ رن تھمبور کو ہمارے حوالے کرنے (ورق ۳۲۲) اور اطاعت پذیری کی جو شرائط رنتھمبور سے باہر آنے اور خدمت گاری کے جو آداب و طریق ہیں ان شرائط کے مطابق انجام دے جو ان کے ہاں مروج ہیں۔ جس شخص کو بھیجا جا رہا تھا اس سے کہا گیا کہ وہ حالات کا جائزہ لے کر، انہیں خوب دیکھ اور سمجھ کر واپس آئے۔ اگر وہ اپنے قول پر قائم ہے تو میں بھی اپنے وعدے پر برقرار ہوں۔ خدا نے چاہا تو میں اس کے باپ کی بجائے اسے رانا کی گدی پر چتوڑ میں بٹھا دوں گا۔

اسی اثنا میں دہلی، آگرہ، میں سکندر اور ابراہیم کے خزانے خالی ہو گئے۔ لشکر کو مسلح کرنے اور توپ و تفنگ کے مسالوں کے لئے جمعرات کے دن بتاریخ آٹھ صفر تمام وظیفہ داروں کے نام حکم جاری کیا گیا ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا تیس فی صد داخل دیوان کریں اور یہ رقم اسباب و آلات کے مصرف و خرچ میں لائی جائے۔

ہفتے کے دن مہینے کی دس تاریخ کو محمد سلطان بخشی کا شاہ قاسم نامی پیادہ جو پہلے ایک مرتبہ اہالی خراسان کی دلجمعی کے لئے پیغام لے گیا تھا دوسری مرتبہ اس مضمون کے فرامین لے کر روانہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے مشرق و مغرب کے سرکشوں اور کافروں کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔ اگر خدا نے کارسازی کی تو اسی بہار کے موسم میں جس طرح بھی ہو سکے گا ہم اپنی منزل پہنچ جائیں گے۔ احمد افشار کے لئے خط جو روانہ کیا گیا تھا اس کے حاشیے پر میں نے اپنے ہاتھ سے یہ عبارت بھی درج کر دی کہ میں نے فریدوں قابوز نواز کو آنے کا حکم دیا ہے۔

اسی دن میں نے ظہر کے وقت سیماب کا استعمال شروع کیا۔[۲۸] مہینے کی اکیس تاریخ کو بدھ کے دن ایک ہندوستانی ہرکارہ کامران اور خواجہ دوست خاوند کی عرض داشتیں (ورق ۳۲۳) لے حاضر ہوا۔ خواجہ دوست خاوند بتاریخ دس ذی الحجہ کابل پہنچ کر ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہونے کا متمنی تھا۔ اسی اثنا میں کامران کا آدمی خواجہ کے پاس یہ پیغام لے کر پہنچا کہ خواجہ صاحب تشریف لائیں ان کے سپرد جو بھی فرمان کیا گیا ہے وہ پہنچائیں اور جو کوئی پیغام دینا ہو یا بات کہنی ہو وہ بتا کر چلے جائیں۔ کامران بتاریخ سترہ ذی الحجہ کابل پہنچ گیا تھا۔ اس نے خواجہ سے گفتگو کرنے کے بعد انہیں بتاریخ اٹھائیس ذی الحجہ قلعہ ظفر کی جانب روانہ کیا۔

خبریں

یہ موصولہ عرضداشتیں اچھی خبروں پر مشتمل تھیں۔ شاہزادہ طہماسپ نے ازبکوں کا قلعہ فتح کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے انہیں دامغان میں گرفتار کر کے نہ صرف تہ تیغ کیا بلکہ ان کے آدمیوں کا بھی قتل عام کر دیا۔ عبید خان کو جب قزلباشوں کے اس اقدام کی اطلاع ہوئی تو اس نے ہرات پر سے محاصرہ اٹھا لیا۔ وہاں سے وہ

۲۸۔ سیماب۔ پارہ یا سیماب عام طور پر طب مشرق میں کشتوں میں استعمال ہوتا ہے جو دل و دماغ، معدہ و جگر کی کمزوری دور کرنے کے لئے تجویز کیا جاتا ہے (محمد عبداللہ، کنز المجربات ص ۹۰۲)۔

مرو پہنچا جہاں اس نے سمرقند اور اس کے نواح میں جتنے بھی سلاطین تھے ان کی جوانمردی کو للکارا۔ چنانچہ ماوراء النہر میں جتنے بھی سلاطین تھے۔ وہ اس کی مدد کرنے کے لئے مرو پہنچ گئے۔ وہی ہرکارہ یہ خبر بھی لے کر آیا کہ یادگار طغائی کی بیٹی کے بطن سے ہمایوں کے لڑکے کی ولادت ہوئی ہے۔ کامران بھی کابل میں اپنے چچا سلطان علی مرزا کی لڑکی کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگیا ہے۔ اسی دن دکنی شیرازی غیب گو کو خلعت پہنا کر انعام سے نوازا گیا اور یہ حکم دیا گیا کہ فوارہ والے کنوئیں کی وہ جس طرح بھی مناسب سمجھے تکمیل کرے۔

تئیس تاریخ کو بروز جمعہ میرے بدن میں ایسی شدید تپ نمایاں ہوئی کہ بمشکل ہی نماز جمعہ مسجد میں ادا کر سکا۔ چنانچہ میں نے بطور احتیاط باقی نماز کتب خانے میں آکر ادا کیں۔ اس کے بعد بھی کچھ عرصہ اسی تکلیف میں گزرا۔ دو دن بعد یعنی اتوار کو بخار کے ساتھ ہی ہلکا سا لرزہ بھی بدن میں ہونے لگا۔

رسالہ والدیہ

منگل، ستائیس صفر میرے دل میں یہ خیال آیا کہ حضرت خواجہ عبیداللہ کا رسالہ والدیہ[29] کو نظم کر دوں۔ چنانچہ میں نے حضرت خواجہ کی روح کو ثواب پہنچایا اور دل میں کہا کہ جس طرح مصنف کا قصیدہ[30] بردہ قبول ہوا اور انہوں نے فالج کے مرض سے شفا پائی اسی طرح میری نظم کو بھی قبولیت حاصل ہو تو میں بھی اس مرض سے چھٹکارا حاصل کروں گا۔ چنانچہ میں نے مولانا عبدالرحمٰن جامی کی مثنوی سبحۃ الابرار کے وزن بحر رمل مسدس مجنون اور عروض میں ضرب گاہ ابرگاہ مجنون محذوف اس رسالے کو نظم کرنا شروع کر دیا۔ اسی رات تیرہ اشعار ہو گئے۔ میں نے اس امر کا بھی التزام کیا کہ ہر روز کم از کم دس بیت نظم کروں بس ایک ہی دن ناغہ ہوئی۔ سال گزشتہ و اس سے پہلے جب بھی یہ عارضہ رونما ہوا میں اس میں تقریباً تمیں چالیس روز تک مبتلا رہا۔ خداوند تعالیٰ کی عنایت اور حضرت خواجہ کی برکت سے جمعرات کے دن مہینے کی انتیس تاریخ کو مرض میں کچھ حد تک افاقہ ہوا۔ اس کے بعد میں نے اس سے قطعی نجات حاصل کی۔ ہفتے کے دن بتاریخ آٹھ ربیع الاول یہ رسالہ نظم کی صورت میں اختتام پذیر ہوا۔ (ورق ۳۲۴) اس رسالے کو منظور کرنے میں ایک روز باون اشعار ہوئے۔

بدھ کے دن بتاریخ اٹھائیس اطراف و جوانب لشکروں کو یہ فرمان بھیجا گیا کہ خدا نے چاہا تو جلدی ہی لشکر کے ہمراہ سوار ہونگے۔ لشکر خود کو مسلح کر کے جلد پہنچ جائیں۔

اتوار کے دن بتاریخ نو ربیع الاول بیگ محمد تعلیق چی[31] میرے پاس واپس آیا۔ گزشتہ سال وہ ماہ محرم کے آخر میں ہمایوں کے لئے خلعت اور گھوڑا لے کر گیا تھا۔

پیر کے دن مہینے کی دس تاریخ کو بیگینہ ویس لاغری اور بیان شیخ نامی ہمایوں کا نوکر ہمایوں کے پاس سے آئے۔ بیگینہ یہ خوشخبری لے کر آیا تھا کہ ہمایوں کے گھر میں لڑکے کی ولادت ہوئی ہے۔ جس کا نام اس نے الامان رکھا تھا۔ شیخ ابوالواحد نے اس کی تاریخ ولادت شہ سعادتمند (۹۳۴) سے نکالی تھی۔

بیان شیخ، بیگینہ سے بہت بعد میں چلا تھا۔ وہ بروز جمعہ نو صفر کشم سے جو دوشنبہ نامی جگہ کے آخری سرے پر واقع ہے۔ ہمایوں کے پاس سے روانہ ہوا تھا۔ وہ پیر کے دن بتاریخ دس ربیع الاول آگرہ پہنچا تھا۔ اس اعتبار سے وہ جلدی ہی پہنچ گیا تھا۔ ایک مرتبہ پہلے بھی یہاں بیان شیخ قلعہ ظفر سے قندھار گیارہ دن میں پہنچا تھا۔ وہ شاہزادہ طہماسپ کی آمد اور ازبکوں کی اس شکست کے بارے میں خبر لے کر آیا تھا جس کی تفصیل یہاں درج ہے:

اُزبکوں کی شکست

شاہزادہ طہماسپ رومی قواعد کے مطابق چالیس ہزار آدمیوں کو تفنگ اور توپ گاڑیوں سے لیس کر کے

۲۹۔ رسالہ والدیہ۔ خواجہ عبیداللہ احرار نے یہ مختصر رسالہ اپنے والد کے کہنے پر فارسی میں تحریر کیا تھا۔ اس میں انہوں نے نقشبندی طریقے کے اصول بیان کئے ہیں۔ مذہب کے احکامات پر سختی سے کاربند رہنے کو روحانیت حاصل کرنے کا ذریعہ بتایا ہے اور کسی قسم کے غیر شرعی کام جیسے سماع وغیرہ سے دور رہنے کی ہدایت کی ہے۔ اس کا صحت شدہ متن اکمل ایوبی نے علی گڑھ سے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا۔ تصحیح شدہ نثر عارف نوشاہی نے ۱۳۷۳ شمسی میں رسالہ تحقیقات اسلامی تہران سے شائع کیا۔

یہ رسالہ بابر کے دیوان رام پور اور استنبول میں شامل ہے۔

۳۰۔ قصیدہ بردہ۔ ابو عبداللہ شرف الدین بوصیری کا مشہور قصیدہ۔ بوصیری ۶۰۸/ ۱۲۱۲ میں مصر میں پیدا ہوئے۔ بربری نسل سے تعلق تھا۔ انہیں سیرت سے شغف تھا، عیسائیوں اور یہودیوں سے مناظرے کا شوق۔ ان کی مشہوری شاعری کی وجہ سے ہے۔ ان کو فالج ہوگیا تھا۔ اسی دوران انہوں نے یہ قصیدہ مکمل کیا۔ بار بار قصیدے کو پڑھ کر اپنے صحت مند ہونے کی دعا کی۔ ایک رات خواب میں نبی اکرمؐ کو دیکھا کہ انہوں نے بوصیری کے بیمار جسم پر ہاتھ پھیرا اور پھر ان پر ایک چادر (بردہ) ڈال دی، جس سے آپ صحت مند ہو گئے۔ یہ قصیدہ ۱۶۲ اشعار پر مشتمل ہے۔ ان کا انتقال قاہرہ میں ۶۹۶/ ۷-۱۲۹۶ میں ہوا (اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۵ ص ۵۳) اس قصیدے کا ایک شعر ہے

مُحمدٌ سیدُ الکونینِ والثقلینِ
والفریقینِ مِنْ عُربٍ و مِنْ عجمِ

اس قصیدے کا ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے کیا ہے جن کا تعلق دیوبند سے ہے۔

اگر فالج کسی شریان میں انجماد خون سے ہو تو انجماد منتشر ہو سکتا ہے۔ خون کا سُدا بھی دوران خون کے زور کی وجہ سے ہٹ سکتا ہے اور اس طرح صحت یابی سائنسی لحاظ سے جلد بھی ممکن ہے۔

۳۱۔ تعلیق چی۔ تعلیق مال و اسباب کی ضبطی و مکان کی قرقی کو کہتے ہیں۔ بیگ محمد کا یہی کام ہوگا (اردو لغت ج ۵ ص ۳۰۹) ایبٹ بیورج نے (ص ۶۴۱ نوٹ ۲) اس کو تعلقہ دار سے جوڑا ہے جو صحیح نہیں۔

بہت تیزی کے ساتھ عراق سے روانہ ہوا۔ بسطام اور دامغان پہنچ کر اس نے رینش نامی ازبک کو گرفتار کیا اسکو اور اس کے تمام ساتھیوں کو قتل کر دیا۔ وہ اسی تیز رفتار سے پیش قدمی کرتا رہا۔ قزلباشوں نے کپک بیگ کے لڑکے قنبر علی اور اس کے ساتھیوں کو بھی زیر کر لیا۔ وہ اپنے چند لوگوں کے ہمراہ عبید خاں کے پاس پہنچا۔ عبید خاں نے عافیت اس امر میں سمجھی کہ ہرات کے نواح میں مقیم نہ رہے۔ چنانچہ اس نے بلخ، حصار، سمرقند اور تاشقند کے تمام خوانین و سلاطین کے پاس تیز رفتار قاصد روانہ کیئے اور خود مرو جا پہنچا۔ تمام خورد و کلاں خواتین و سلاطین جن میں سونچک خاں کا لڑکا برف سلطان تاشقند سے، سمرقند سے کوچوم خاں، ابو سعید سلطان، پولاد سلطان، جانی بیگ سلطان اور اس کے لڑکے، حصار سے حمزہ سلطان اور مہدی سلطان کے لڑکے بلخ سے اور کیتین قرا سلطان شامل تھے تیز رفتاری کے ساتھ روانہ ہوئے اور مرو میں عبید خاں کے ساتھ مل گئے۔ ان کی تعداد پچاس ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ ان کا مخبر یہ خبر لایا کہ شاہزادہ طہماسپ کا خیال تھا کہ عبید خاں چونکہ اپنے چند آدمیوں کے ہمراہ ہرات کے نواح میں مقیم ہے۔ اسی لئے وہ اپنے چالیس ہزار آدمیوں کے ہمراہ روانہ ہوا تھا۔ لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ مرو میں خوانین و سلاطین جمع ہوئے ہیں تو اس نے سبزہ زار رادگان کے اطراف میں خندق بنالی ہے اور اب وہ وہاں مقیم ہے۔ جب ازبکوں کو اس کے بارے میں یہ اطلاع ملی تو انہوں نے غنیم کو تو نظر انداز کر دیا اور خود اس بات پر گفتگو کرنے لگے کہ ہم خود تو مشہد پہنچ جائیں اور کچھ سلاطین کو بیس ہزار آدمیوں کے ساتھ اس کام پر متعین کر دیں گے کہ وہ قزلباشوں کے لشکر گاہ کے گرد محاصرہ رکھیں اور انہیں باہر نکلنے کی مہلت نہ دیں۔ ادھر جب آفتاب، برج عقرب میں داخل ہو تو ہم اپنے جادوگروں سے کہیں گے کہ وہ بادلوں کو گھیر کر لائیں اور دشمن کو عاجز کریں اس طرح ان پر غلبہ پالیں چنانچہ اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے (ورق ۳۲۵) وہ مرو سے کوچ کر گئے۔ شاہزادہ طہماسپ بھی مشہد سے نکل آیا جام اور خرگرد کے نواح میں دونوں کا مقابلہ ہوا۔ جس میں ازبکوں کو شکست ہوئی اور بہت سے سلاطین گرفتار ہو کر قتل ہوئے۔ ایک خط میں تو اس طرح لکھا گیا ہے کہ تحقیق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کوچوم خاں کے علاوہ کوئی اور سلطان زندہ بچا ہو کیونکہ وہ لوگ جو لشکر کے ہمراہ گئے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ابھی تک نہیں آیا۔ وہ سلاطین جو حصار میں مقیم تھے انہوں نے اس قلعے کو خالی کر دیا ہے اور خود وہاں سے چلے گئے ہیں۔ ابراہیم جانی کا بڑا بیٹا جس کا اصلی نام اسماعیل ہے وہ اب بھی قلعۂ حصار میں ہی مقیم ہے۔

ہمایوں اور کامران کو خطوط

میں نے ہمایوں اور کامران کو خط لکھے جو مہینے کی چودہ تاریخ کو بروز جمعہ کتابت ہو کر تیار ہو گئے۔ میں نے یہ خطوط اسی بیان شیخ کے سپرد کیئے اور یہ کہہ کر رخصت کیا کہ انہیں جلدی پہنچا دے۔ اسے پندرہ تاریخ کو بروز ہفتہ آگرہ سے روانہ کیا گیا۔ ہمایوں کو جو خط لکھا گیا تھا اس کا مسودہ یہ ہے۔ تم سے ملنے کی خواہش و اشتیاق و محبت کے ساتھ میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ دس ربیع الاوّل کو بروز پیر بیگینہ اور بیان شیخ حاضرِ خدمت ہوئے تمہارے خط سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہندوکش کی دونوں جانب کیا حالات ہیں۔

شکر ہیر میش سنکا حق فرزندی	سنکا فرزند و سنکا دلبندی
شکر خدا کہ اس نے تجھے نوازہ فرزند	تیرے لئے وہ فرزند میرے لئے دلبند

خداوند تعالیٰ سے یہی دعا ہے کہ وہ مجھے اور تمہیں ایسی ہی مسرتوں سے نوازتا ہے۔ آمین یارب العالمین خداوند تعالیٰ اسے اپنی حفظ و اماں میں رکھے اگرچہ تم نے یہ تو لکھ دیا کہ اس کا نام الامان رکھا ہے لیکن اس بات پر غور نہیں کیا کہ کثرت استعمال سے عام لوگ اسے الامایا اہلِ امان کہنے لگیں گے۔[۳۲] اس کے علاوہ ایسے نام جو ''ال'' سے شروع ہوتے ہوں شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ بہر صورت خداوند تعالیٰ اسے اور اس کے نام کو سلامت

۳۲۔ بابر نام کے معاملے میں محتاط ہے اور نام بگاڑنے پر یہ تنبیہ ہے۔ شاید اسی خطرے کے پیش نظر ظہیر الدین کے ساتھ بابر لگا۔

رکھے۔ نیز میری اور تیری خاطر وہ الامان کو سالہا سال تک ہی نہیں بلکہ قرنوں تک سعادتمندی کی دولت سے نوازے۔ خداوند تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ہمارے سب کام درست کر دیئے ہیں اور اب یہ ایسے واقعات ہیں جو سالہا سال بعد بھی وقوع پذیر نہیں ہوتے۔

پند: مہینے کی گیارہ تاریخ منگل کے دن یہ افواہ سنی گئی کہ اہالی بلخ نے قربان کو آنے کی دعوت دی ہے۔

پند: کامران اور امرائے کابل کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ تمہارے پاس پہنچ جائیں اور تم حصار یا سمرقند یا اس جانب کا رخ کرو جس سے ہمارا مفاد وابستہ ہو۔ خداوند تعالیٰ کے فضل و کرم سے دشمن کی سرکوبی میں کامیاب ہو۔ ان کی ولایت پر تمہارا قبضہ ہو اور دشمن کو سرنگوں کر کے دوستوں کو شاد و خرم کرو۔

خداوند تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تم اپنی جان کی بازی لگا دو۔ (ورق ۳۲۶) اور تلوار کے جوہر دکھاؤ اور قسمت آزمائی کا جو موقع ہاتھ آیا ہے اسے ہرگز نہ جانے دو۔

جهانگیری توقف برنیابد		جهان آنرا بود کو بشتابد

(جہانگیری کو لیت و لعل کی برداشت نہیں یہ دنیا اسی کی ہے جو اسے دوڑ کر پکڑے۔)

همه چیز ز روی کد خدائی		سکون می یابد الا پادشاهی [۳۳]

(شادی کے بعد اگرچہ ہر چیز سکون پذیر ہو جاتی ہے۔ مگر بادشاہی اس سے مستثنیٰ ہے۔)

اگر خداوند تعالیٰ کی عنایت سے بلخ اور حصار کی ولایت مسخر اور میسر ہو جائیں تو ان میں ایک تیرے آدمیوں میں سے اور ایک کامران کی طرف سے حصار اور بلخ میں متعین رہے۔ اگر خداوند تعالیٰ کے فضل و کرم سے سمرقند ہی مسخر ہو گیا تو تم وہاں مقیم رہو اور خدا کو منظور ہوا تو میں حصار کو زمین خالصہ میں شامل کر لوں گا۔ اگر کامران یہ سمجھتا ہو کہ ولایت بلخ اس کے لئے بہت چھوٹی ہے تو اس کے بارے میں مجھے لکھو۔ خدا نے چاہا تو میں اس کی تلافی دیگر ولایات عنایت کر کے کر دوں گا۔

پند: تمہیں معلوم ہے کہ اس قاعدے پر ہمیشہ سے عمل کیا جاتا رہا ہے کہ مملکت میں چھ حصے تیرے ہیں اور پانچ کامران کے تو اس قاعدے کی ہمیشہ پابندی کرنا اور کبھی اس سے تجاوز کرنے کی کوشش نہ کرنا۔

پند: اپنے برادر خورد کے ساتھ عمدہ رویہ اختیار کرنا کیونکہ بزرگوں کو تحمل و برداشت سے کام لینا چاہیے۔ امید ہے کہ تم اس کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کرو گے۔ وہ اب اس سن کو پہنچ گیا ہے کہ تمام شرعی امور بجا لائے اور عمدہ جوان ثابت ہو۔ اسے بھی تمہارے عزت و احترام میں کوئی تقصیر و کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔ (ورق ۳۲۶) مجھے تم سے یہ بھی گلہ ہے کہ ان دو تین سال کے عرصے میں تمہارا کوئی بھی آدمی میرے پاس نہیں آیا۔ البتہ میں نے جو اپنا آدمی تمہارے پاس بھیجا تھا وہ ٹھیک ایک سال بعد واپس آیا۔ کیا یہ مناسب تھا؟

پند: حکمرانی میں خلوت عیب ہے اپنی خلوت نشینی کا ذکر تو نے اپنے خطوط میں بار بار کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:۔

اگر پای بندی رضا پیش گیر		و گر یکسواری سر خویش گیر [۳۴]

(اگر تمہارے پاؤں بندھے ہوئے ہیں تو خاموش بیٹھو اگر تو اکیلا سوار ہے تو جدھر چاہے جا چونکہ فرمانروائی سے بڑھ کر کوئی قید نہیں اسی لئے فرمانروائی اور خلوت نشینی میں کوئی میل و رغبت نہیں۔)

پند: میں نے تم سے چونکہ خط لکھنے کے لئے کہا تھا اس لئے تم نے خط لکھ دیئے۔ لیکن تم نے انہیں پڑھا تک نہیں اگر تمہارے دل میں ان کے پڑھنے کی خواہش و تمنا ہوتی تو تم انہیں ضرور پڑھتے اور انہیں پڑھنے کے بعد ضرور ان میں تبدیلی کرتے تمہاری تحریر کو بمشکل پڑھا جا سکتا ہے کیونکہ وہ مبہم و پیچیدہ ہوتی ہے۔ آج تک کبھی کسی نے سنا ہے کہ نثر ایسی لکھے کہ اسے معمّا بنا دے۔ تمہاری املا بری نہیں لیکن یہ مکمل طور پر درست بھی نہیں۔ تم نے ''التفات'' کو ''التفاظ'' لکھا ہے اسی طرح ''تولنج'' کو ''قولنج'' تحریر کیا ہے۔ اگرچہ تمہاری تحریر کو کسی نہ کسی طرح پڑھا جا سکتا ہے

۳۳۔ نظامی گنجوی کا یہ شعر میر نسخے ''دیوان کامل'' (با مقدمہ دکتر معین فر، انتشارات زرین) میں درج ہے:

جہان آنکس برد کو بر دشتابد
جہانگیری توقف بر نتابد
ھمہ چیزی ز روی کہ خدائی
سکون بر تابد الا پادشاہی

(ص ۱۸۱، سال اشاعت کتاب میں درج نہیں)

۳۴۔ بوستان سعدی (ص ۳۰)

مگر پیچیدہ الفاظ کے استعمال کے باعث معنی واضح و روشن نہیں ہوتے۔ (ورق ۳۲۷) تمہارے خطوط لکھنے میں لیت ولعل کی غالباً وجہ یہ ہے کہ تم اپنی عبارات کو پیچیدہ الفاظ سے آراستہ و مزین کرنا چاہتے ہو۔ آئندہ جو بھی عبارت لکھو وہ قطعی پیچیدہ نہ ہو۔ بلکہ واضح اور صاف الفاظ لکھیں جائیں تا کہ لکھنے میں سہولت اور مکتوب الیہ کو پڑھنے میں دشواری کم ہو۔[۳۵]

پند: تم ایک بڑی مہم سر کرنے جا رہے ہو۔ اس بارے میں تمہیں آزمودہ و تجربہ کار امراء سے مشورہ کرنا چاہئے۔ تمام صورتِ حال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ جو صلاح دیں اس پر عمل کرنا چاہئے۔ اگر میری خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہو تو خلوت نشینی و آدم بیزاری سے گریز کرو۔ فیصلہ اپنے بھائی اور امراء پر مت چھوڑو بلکہ انہیں دن میں دو مرتبہ اپنے پاس آنے کی دعوت دو۔ جو بھی واقعات رونما ہوں ان کے بارے میں ان سے مشورہ کرو اور ہر کام حامی و خیر خواہوں کے تعاون و اتفاق رائے سے حل کرو۔

پند: خواجہ کلان کے ساتھ کافی عرصے سے میری ایسی بے تکلفی اور یاری تھی گویا کہ ہم ایک ہی گھر کے فرد ہوں۔ تمہیں بھی دوسروں کے ساتھ اسی طرح کا اختلاط پیدا کرنا چاہئے جیسا کہ میں نے کیا تھا۔ اگر خداوند تعالیٰ نے یاوری کی اور وہاں ایسے حالات ساز گار ہو گئے کہ زیادہ توجہ کے محتاج نہ رہیں اور تمہیں کامران کے تعاون کی ضرورت پیش نہ آئے تو تم بلخ میں قابلِ اعتماد آدمیوں کو مقرر کر کے اسے میرے پاس آنے کے لئے رخصت کر دو۔

پند: کابل میں رہتے ہوئے مجھے وہ فتوحات اور کامرانیاں حاصل ہوئیں کہ میں نے یہاں رہنا اپنے لئے نیک فال سمجھا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ میں نے اسے زمین خالصہ میں شامل کر لیا۔ تم میں سے کوئی اس پر حریصانہ نظر نہ رکھے۔

پند: تم نے اچھا کیا کہ اپنے حسنِ اخلاق سے سلطان ویس کے ساتھ صلح و دوستی کر لی۔ تم اسے اپنی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع دو اور اس کے مشورے پر عمل کرو کیونکہ وہ ایک تجربہ کار آدمی ہے۔ فوج کے نظم و نسق اور اس کی تربیت کی جانب توجہ دو۔ میں نے بیان شیخ کو زبانی کچھ ہدایات کی ہیں جو وہ تم تک پہنچا دے گا۔

تمہاری سلامت کا متمنی اور دید کا مشتاق ہوں۔ یہ خط بدھ کے دن بتاریخ تیرہ ربیع الاول رقم ہوا۔ اس مضمون پر مشتمل خطوط میں نے اپنے ہاتھ سے کامران اور خواجہ کلاں کو بھی لکھے اور انہیں روانہ کیا۔

فوج کشی کی تیاری

بدھ کے دن مہینے کی انتیس تاریخ کو میں نے امیر زادگان، سلاطین اور امرائے ترک و ہند کو طلب کیا تا کہ ان سے مشورہ کیا جائے۔ جس میں یہ بات طے ہوئی کہ اس سال فوج کو کسی سمت میں حرکت کرنی چاہئے۔ ہم سے پہلے عسکری کو پورب کی طرف رُخ کرنا چاہئے۔ وہ امراء اور سلاطین جو دریائے گنگا کے دوسرے کنارے پر ہیں اپنے لشکر کے ہمراہ آ کر عسکری کے ساتھ مل جائیں اور جو اقدام میری سرکار کی فلاح و بہبود میں ہو اسے وہ انجام دیں۔ چنانچہ ان تمام کیفیات کو لکھ کر بائیس تاریخ بروز ہفتہ غیاث الدین قواچی کو سلطان جنید برلاس اور امرائے پورب کی جانب دوڑایا گیا اور ان سے یہ زبانی باتیں کہی گئیں کہ وہ توپیں توپ گاڑیاں اور تفنگ جیسے آلات جنگ تیار کرائیں اور جب وہ تیار ہو جائیں تو انہیں اپنی روانگی سے قبل عسکری کے پاس بھیج دیں۔ اس کے بعد ان تمام امراء اور سلاطین کو جو دریائے گنگا کے اس پار تھے (ورق ۳۲۸) یہ فرمان دیا گیا کہ وہ عسکری کے گرد جمع ہو جائیں تا کہ جس طرف بھی حرکت کرنا میری سرکار کے حق میں سود مند ہو اس جانب وہ اللہ کے فضل و کرم سے روانہ ہوں۔ جو امراء ہماری فرمانروائی کے ہوا خواہ ہوں ان کے ساتھ صلاح و مشورہ کیا جائے اگر صورتِ حال یہ ہو کہ وہاں میری ضرورت پیش آئے تو جیسے ہی وہ شخص (غیاث الدین) جو کسی مقصد سے گیا ہوا ہے۔ واپس آئے گا

۳۵۔ آسان اور واضح زبان بابر نے خود بھی اپنائی ہے۔ اگر ہم بابر کی زبان اور شیخ زین کا موازنہ کریں تو بات صاف ہو جاتی ہے۔

میں انشا اللہ بلاتوقف سوار ہو کر وہاں پہنچ جاؤں گا۔ اگر بنگالی ہمارے ساتھ متحد و مخلص ہوں اور کام کی نوعیت اس طرح کی ہو جس میں میری ضرورت نہ ہو تو پھر بھی حالات تفصیل کے ساتھ مجھے لکھتے رہنا۔ کیونکہ میں یہاں رہ کر تماشا دیکھتا نہیں رہوں گا بلکہ کسی اور سمت میں جانے کا عزم کروں گا۔ میرے حامی و خیر خواہ عسکری کے ساتھ مشورہ کر کے اللہ تعالیٰ کی عنایت سے وہاں کے امور کو خود انجام دیں۔

عسکری کی ترقی

ہفتے کے دن بتاریخ نو ربیع الاوّل عسکری کو کمر خنجر اور شاہانہ خلعت سے نوازا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے کمر بند، خنجر، پرچم، نقارہ تپچاق نسل کے گھوڑے، دس ہاتھی، ایک قطار اونٹ، ایک قطار خچر اور دیگر شاہانہ ساز و سامان بطور انعام عنایت کیا گیا۔ حکم دیا گیا کہ وہ اب دیوان نشین ہوا کرے۔ اس کے ملّا اور دو نگہبانوں کو تکمہ دار نیز دیگر ملازمین کو تین تین جوڑی پارچے انعام میں دیئے گئے۔

اتوار کے دن مہینے کی آخری تاریخ کو میں سلطان محمد بخشی کے گھر گیا۔ اس نے میری تواضع کے لئے فرش پر قالین بچھایا اور بیش قیمت تحائف پیش کئے۔ نقد و جنس میں جو اشیا اس نے بطور پیش کش نظر کیں ان کی قیمت دو لاکھ سے زیادہ تھی۔ دستر خوان سے فارغ ہونے اور پیشکش قبول کرنے کے بعد میں دوسرے حجرے میں چلا گیا۔ وہاں ہم معجون کے سرور سے لطف اندوز ہوئے۔ وہاں سے میں بوقتِ سہ پہر روانہ ہوا اور دریا عبور کر کے اپنے خلوت کدے میں پہنچ گیا۔

ڈاک وراستے کا انتظام

جمعرات کے دن بتاریخ چار ربیع الآخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ چقماق بیگ اور شاہی محرر آگرہ سے کابل تک طناب کے ذریعے پیائش کریں اور ہر نو کروہ کے فاصلے پر بارہ گز اونچا مینار تعمیر کر کے اس پر چار دروازوں والا برج بنائیں۔ ہر اٹھارہ کروہ کے فاصلے پر ڈاک چوکی متعیّن کریں جس پر چھ ڈاک گھوڑے بندھے رہیں۔ ڈاک بان اور سائیس کے لئے سامان خوراک اور گھوڑوں کے لئے گھاس چارا مقرر کیا جائے۔ اس قسم کا فرمان جاری کیا گیا کہ جس جگہ ڈاک گھوڑوں کو باندھا جائے وہ اگر املاک خالصہ کے نزدیک ہو تو مذکورہ بالا اشیا وہاں سے فراہم کی جائیں۔ ورنہ جن امرا کے پرگنے میں ڈاک چوکیاں واقع ہوں وہ اس ذمّے داری سے عہدہ برآ ہوں۔[۳۶] چقماق اور شاہی محرر اسی دن آگرہ سے روانہ ہو گئے۔ یہ کروہ ان میلوں کے مطابق متعیّن کئے گئے جس کا ذکر مبیّن میں آ چکا ہے۔

تورت مینک دور قدم بیله بیر میل   بیر کروه آنی هندایلی دیر بیل

(چار ہزار قدم ایک میل کے برابر ہوتا ہے۔ اہل ہند اس کو کروہ کہتے ہیں)

دیدیلارا زبیریا ریم قاری بیر قدم   هر قاری بیل که بار دوالتی تو تام

(ہر قدم ڈیڑھ ہاتھ، ہر ہاتھ چھ مٹھی اور ایک مٹھی چار انگلیوں کے برابر ہوتی ہے)

هر تو تام تورت ایلیک یته هر ایلیک   آلتی جو عرضی بولدی بیل بو بیلیک[۳۷]

(ہر انگلی کی چوڑائی چھ جو کے برابر ہوتی ہے)

ایک طناب کی پیائش چالیس ذراع کے برابر تھی جس میں ہر ذراع کی لمبائی جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ڈیڑھ ہاتھ رکھی گئی تھی۔ جسے نو مٹھی کے برابر مانا گیا ہے۔ اس طرح سو طنابیں ایک کروہ برابر ہوتی ہیں۔ (ورق ۳۲۹)

۳۶۔ ڈاک وراستے کا انتظام۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں صولت شیر شاہی کے حوالے سے لکھا ہے کہ شیر شاہ سوری پہلا حکمراں ہے جس نے ڈاک کا انتظام سواروں کے ذریعہ کیا (ج ۱۱ص ۸۸۳)، بابر کے مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بابر نے پہلے ہی اس طرف توجہ دے دی تھی اسی کام کو بعد میں شیر شاہ نے زیادہ بڑے اور عمدہ پیمانے پر منظم کیا۔

۳۷۔ مبین ص ۴۷

ضیافت

ضیافت مہینے کی چھ تاریخ کو ہفتے کے دن آراستہ کی گئی۔ میری نشست گاہ اس ہشت پہلو خس کے ایوان میں تھی۔ جو شمالی ضلعے کی جانب حال ہی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ میری دائیں جانب چھ گز کے فاصلے پر توختہ بوغہ سلطان، عسکری، حضرت خواجہ عبدالشہید، خواجہ کلاں عبیداللہ کی اولادو افراد خاندان، خواجہ چشتی، خلیفہ اور سمرقند سے آئے ہوئے خواجہ کے تابع حفاظ وملایان بیٹھے۔ میری بائیں جانب پانچ چھ گز کے فاصلے پر محمد زمان مرزا، تانگ اتمش سلطان، سید رفیع، سیّد رومی، شیخ ابوالفتح، شیخ جمالی، شیخ شہاب الدین عرب اور سیّد دکنی کی نشست تھی۔ اس ضیافت میں قزلباش ازبک اور ہندو حکمرانوں کے ایلچی دائیں جانب ستر اسّی گز کے فاصلے پر اس شامیانے کے نیچے بیٹھے جو وہاں نصب کیا گیا تھا۔ حکم دیا گیا کہ یونس علی قزلباشوں کے ساتھ بیٹھے۔ اسی ترتیب سے بائیں جانب اوزبک حکمرانوں کے ایلچیوں کو بٹھایا گیا۔ عبداللہ کے لئے یہ حکم دیا گیا کہ وہ ان کے ساتھ بیٹھے۔ اس سے پہلے کہ دسترخوان بچھایا جائے تمام خواتین، سلاطین، اکابر وامرانے سونے چاندی، تانبے کے سکّے پارچہ جات اور دیگر تحائف میرے روبرو حاضر کئے۔ میں نے حکم دیا کہ میرے سامنے فرش بچھایا جائے جس پر سونے چاندی کے سکّے ڈال دیے گئے۔ گرانبہار پارچہ جات، سفید وسرخ تھانوں کو سونے اور چاندی کے سکّوں کے ساتھ چن دیا گیا دسترخوان لگنے تک مست اونٹوں کو اس جزیرے پر جو ہمارے روبرو تھا لڑوایا گیا۔ کچھ مینڈھوں کو بھی اس لڑائی میں اتارا گیا۔ اس کے بعد پہلوانوں نے کشتی کے داؤ دکھائے۔ دسترخوان بڑھائے جانے کے بعد خواجہ عبداللہ شہید اور خواجہ کلاں کو سمور کے کامدانی دارجبوں کے علاوہ مناسب خلعتیں پہنائی گئیں۔ ملا فرخ، حافظ اور اس کے ساتھیوں کو عبائیں پہننے کے لئے دی گئیں۔ کوچوم خاں کے ایلچی راس کے برادر خورد حسن چلبی کو ان کے مرتبے کے مطابق سمور کے کامدانی دارچغے جن پر تکمے ٹکے ہوئے تھے عنایت کئے گئے۔ ابوسعید سلطان، مہربان خانم اس کے فرزند پولاد سلطان کے ایلچیوں اور شاہ حسن کے ایلچی کو تکمہ دار عبائیں اور ریشمی لباس بطور انعام دئے گئے۔ اور خواجگان اور دو بڑے ایلچیوں کو جو کوچوم خاں کے ملازم اور حسن چلبی کے برادر خورد تھے سونے کی وہ تعداد جو چاندی کے باٹوں سے تولی گئی تھی اور وہ چاندی جو سونے کے باٹوں سے وزن کی گئی تھی بطور انعام دے دی گئی۔ سونے کا باٹ پانچ سو مثقال یعنی کابل کے سیر کے برابر اور چاندی کا باٹ ڈھائی سو مثقال یعنی کابل کے نیم سیر کے برابر ہوتا ہے۔ خواجہ میر سلطانی اس کے لڑکوں، حافظ تاشقندی، ملا فرخ اس کے ساتھیوں خواجہ اور دیگر ایلچیوں کو سونا اور چاندی معہ ترکش انعام میں دیئے گئے۔ یادگار ناصر کو کمر خنجر عطا کیا گیا۔ میر محمد جالہ بان (بیڑا ساز) کو دریائے گنگا پر عمدہ پل باندھے رکھنے کی بنا پر کرم وعنایت کا مستوجب قرار دیا گیا۔ (ورق ۳۳۰) میر محمد کے ساتھ ہی پہلوان حاجی محمد، پہلوان پہلول اور ولی پارچی (چیتے کا نگہبان) میں سے ہر ایک کو خنجر بطور انعام عطا کیا گیا۔ سیّد داؤد گرم میری کو سونے اور چاندی کے سکّے میری بیٹی معصومہ اور ہندال کے ملازمین کو تکمے دار عبائیں اور ریشمی خلعتیں بطور انعام دیں۔ وہ لوگ جو اندجان سے آئے تھے، جو بے خانماں وبے وطن سرگرداں پھر رہے تھے اور سوخ اور ہشیار نامی جگہوں کے باشندے جو یہاں آئے تھے انہیں عبائیں، ریشمی خلعتیں، سونے چاندی کے سکّے، بیش قیمت پارچہ جات اور دیگر اشیا انعام میں دی گئیں۔ قربان وشیخی کے ملازمین اور کہمرد کی رعیّت کے لوگوں کو اسی دستور کے مطابق انعام سے نوازا گیا۔

بازی گر اور تماشے

دسترخوان اٹھائے جانے کے بعد حکم دیا گیا کہ ہندوستانی بازیگر آئیں اور تماشا دکھائیں۔ چنانچہ نٹ

آگرہ کے باغ زرافشاں کی باقیات میں چوبرج کی عمارت جہاں بابر کی لاش امانتاً سپرد خاک کی گئی تھی
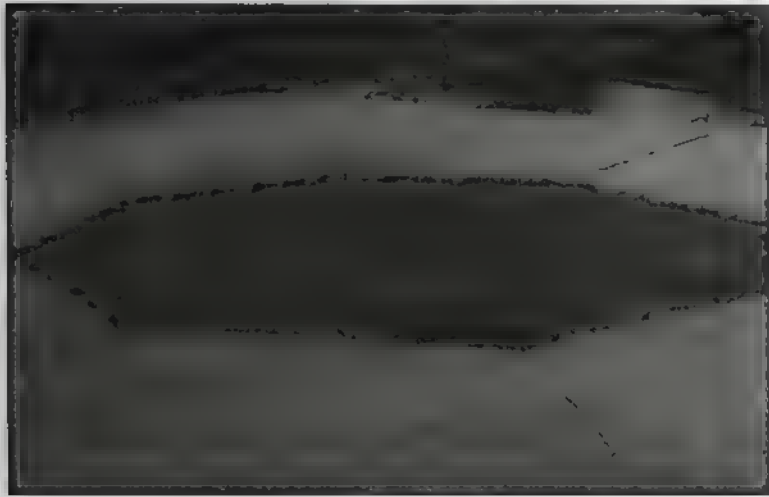
دھولپور کے باغ نیلوفر کا ہشت پہلو حوض
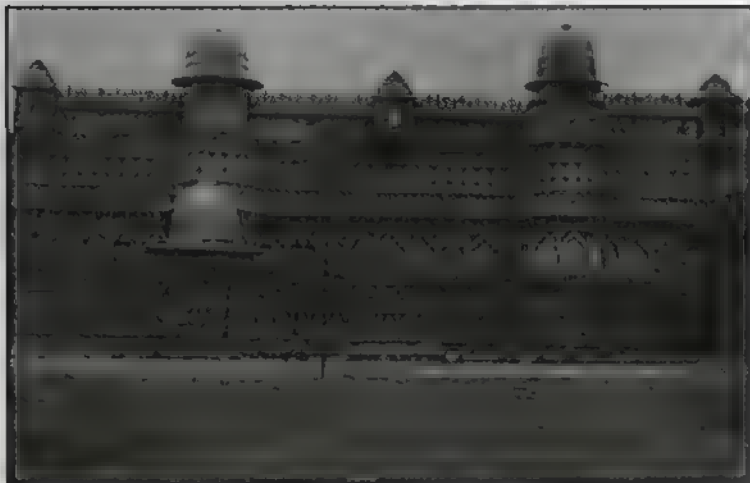
وکرماجیت کے محل کا بیرونی رخ۔ گوالیار

آئے اور کھیل کے کرتب دکھائے۔ بعض ہندوستانی مداریوں نے ایسے کرتب دکھائے کہ ہم نے اپنی ولایت میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ان میں سے ایک تماشا یہ تھا کہ انہوں نے سات حلقے لئے جن میں سے ایک کو پیشانی پر رکھا۔ دو کو اپنی رانوں پر، باقی چار میں سے دو کو دونوں پیروں اور ہاتھوں کی انگلیوں پر رکھ کر انہیں تیزی سے گھمانا شروع کر دیا ایک اور تماشے میں مور کی طرح ایک ہاتھ زمین پر رکھا اور دوسرے ہاتھ اور دونوں رانوں کو اوپر اٹھالیا اور اوپر اٹھے ہوئے ہاتھ اور پیروں سے تین حلقے تیزی سے گھمانے لگے۔ ہماری ولایات کے بازیگر دونوں ٹانگوں پر دو بلّیاں باندھ لیتے ہیں اور ان پر چلتے ہیں۔ ہندوستان کے نٹ ایک بلی پر ہی چلتے ہیں اور بلی کو پیر سے باندھتے تک نہیں۔ ہماری ولایات میں دو بازیگر ایک دوسرے کو پکڑ کر دو قلا بازیاں لگاتے ہیں لیکن ہندوستان کے نٹ ایک دوسرے کو پکڑ کر تین چار قلا بازیاں لگا جاتے ہیں۔ ان کا ایک کرتب یہ ہے کہ ایک نٹ چھ سات گز کی بلی کے سرے کو اپنی کمر پر ٹکا کر اسے سیدھی کھڑی کر لیتا ہے۔ دوسرا نٹ اس بلی پر چڑھ کر اپنے کرتب دکھاتا ہے۔ ان کا ایک اور کرتب یہ ہے کہ ایک نٹ بچہ کسی بڑے نٹ کے سر پر چڑھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ س کے بعد وہ نٹ جس کے سر پر وہ بچہ کھڑا ہوتا ہے کرتب کرتا ہوا ادھر سے ادھر چکر لگاتا ہے وہ نٹ بچہ جو اس کے سر پر ہوتا ہے سیدھا کھڑا رہتا ہے اگرچہ وہ اپنی جگہ سے ذرا بھی جنبش نہیں کرتا مگر کرتب دکھاتا ہے۔ بہت سی کنچنیاں آئیں اور انہوں نے ناچ دکھایا۔

شام کے وقت بہت سے سونے، چاندی اور تانبے کے سکّے نچھاور کئے گئے۔ جنہیں لوٹنے کے لئے بڑا ہنگامہ برپا ہوا۔ مغرب و عشا کے درمیان میں پانچ چھ مخصوص لوگوں کو میں نے اپنے سامنے بٹھایا۔ جو ایک پہر سے زیادہ عرصے تک بیٹھے رہے۔ اگلے دن دو پہر کے وقت کشتی میں بیٹھ کر ہم ہشت بہشت باغ میں پہنچے۔

پیر کے دن عسکری جو سفر کے لئے تیار تھا آیا۔ میں اس وقت حمام میں تھا۔ وہاں اس نے مجھ سے رخصت لے کر مشرق کی جانب کوچ کیا۔

دھولپور میں معائنہ

دھولپور میں حوض، باغ اور عمارات کی تعمیر کے سلسلے میں منگل کے دن (ورق ۳۳۱) میں ان کا معائنہ کرنے کے لئے گیا۔ میں اوّل پہر کی پہلی گھڑی میں باغ سے سوار ہوا۔ جس وقت میں دھولپور کے باغ میں پہنچا تو رات کے پہلے پاس کی پانچویں گھڑی گزر چکی تھی۔

جمعرات کے دن مہینے گیارہ تاریخ کو چاہ سنگین، چھبیس پتھروں میں کاٹے گئے نالوں اور ان نہروں کی تیاری مکمل ہو چکی تھی جو چٹانوں کو کاٹ کر بنائی جا رہی تھیں چنانچہ اس دن کے تیسرے پہر میں کنویں سے پانی کھینچنے کا کام شروع ہو چکا تھا۔ سنگتراشوں، بڑھیوں اور تمام مزدوروں کو اسی دستور کے مطابق انعام دیا گیا جیسا کہ آگرہ کے کاریگر استادوں اور مزدوروں کو دیا گیا تھا۔ اس احتیاط کے پیش نظر کہ پانی میں باس نہ رہے حکم دیا کہ دو ہفتے تک دن رات لگاتار رہٹ چلا کر اس کا پانی کھینچتے رہیں۔

بروز جمعہ پہلے پہر جس وقت آخری گھڑی رہ گئی تو میں دھولپور سے گھوڑے پر سوار ہوا۔ ابھی آفتاب غروب نہیں ہوا تھا کہ ہم نے دریا پار کر لیا۔

جام میں جنگ کی تفصیل

منگل کے دن مہینے کی سولہ تاریخ کو وہ شخص جو قزلباشوں اور ازبکوں کی جنگ میں دیو سلطان کا کارندہ تھا آن پہنچا۔ اس نے بتایا کہ جام اور خرگرد کے نواح میں ترکمانوں اور ازبکوں کے درمیان بروز عاشورہ جنگ ہوئی۔ جو فجر کے وقت سے ظہر کے وقت تک جاری رہی۔ اس نے بتایا کہ اس جنگ میں تین لاکھ ازبک اور ترکمان چار یا پانچ لاکھ ہوں گے۔ اگرچہ اس نے تو تعداد لاکھوں میں بتائی تھی مگر ازبکوں کا کہنا تھا کہ ان کی تعداد ایک لاکھ پانچ

ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ قزلباشوں نے رومیوں کے قواعد جنگ کے مطابق فوجی گاڑیوں، توپوں اور تفنگ اندازوں کی مدد سے جنگ کی صفوں کو ترتیب دیا اور اس طرح خود کو مستحکم کر کے انہوں نے جنگ کی۔ ان کے ساتھ دو ہزار فوجی گاڑیاں تھیں اور چھ ہزار تفنگ انداز۔ شہزادہ طہماسپ بذات خود بیس ہزار کار آمد جوانوں کے ساتھ فوجی گاڑیوں کے درمیان موجود تھا۔ دیگر امرا نے فوجی گاڑیوں سے باہر خود کو برانغار اور جوانغار دستوں میں ترتیب دے لیا تھا۔ ازبکوں نے میدان کارزار میں پہنچتے ہی ان لوگوں کو جو فوجی گاڑیوں سے باہر تھے زیر کر لیا اور دشمن کی سپاہ کو ان کے گھوڑوں پر سے اتار کر ان کے گھوڑے اپنے ساتھ لے گئے۔ جب دشمن کے سپاہی پسپا ہوئے تو ازبکوں نے ان کے اونٹوں اور ساز و سامان کو بطور مال غنیمت لوٹ لیا۔ بالآخر وہ لوگ جو فوجی گاڑیوں کے درمیان تھے انہوں نے گاڑیوں کی زنجیریں کھول دیں اور خود باہر نکل آئے۔ یہاں بھی سخت جنگ ہوئی۔ انہوں نے تین مرتبہ ازبکوں کو مار بھگایا۔ آخر عنایت الٰہی سے انہوں نے ازبکوں کو زیر کر لیا۔ نو سلطان جن میں کوچم خاں و عبید خاں سعید سلطان جو بطور سردار لشکر میں شامل تھے گرفتار ہوئے۔ انہوں نے ابو سعید سلطان کو تو زندہ رہنے دیا باقی آٹھ سلاطین کو قتل کر دیا۔ عبید خاں کا سر ان کے ہاتھ نہ لگا البتہ اس کا جسم مل گیا ازبکوں کے پچاس ہزار آدمی مارے گئے اور ترکمانوں کے بیس ہزار قتل ہوئے۔

غیاث الدین قورچی [۳۸] جو اس قول و قرار کے ساتھ گیا تھا کہ سولہ دن میں جونپور سے واپس آ جائے گا، آج پہنچ گیا۔ سلطان جنید اور دیگر سردار چونکہ اپنے لشکروں کو لے کر خرید سے نکل چکے تھے اس لئے وہ وقت مقرر پر نہ کر آ سکا۔ سلطان جنید نے زبانی (ورق ۳۳۲) یہ پیغام بھجوایا تھا کہ خداوند تعالیٰ کا شکر ہے کہ یہاں ایسی کیفیت نظر نہیں آتی کہ جو اس امر کی متقاضی ہو کہ خود بادشاہ سلامت اس طرف کا رخ کریں۔ البتہ سلاطین، خواتین اور ان امرا کو جو یہاں کے گرد و نواح میں موجود ہیں حکم دیا جائے کہ وہ سلطان جنید کے ساتھ رہیں تو امید ہے کہ تمام کام آسانی سے پورے ہو جائیں گے۔ اگرچہ سلطان جنید کی جانب سے اس طرح کا جواب تو آ گیا لیکن ہم ملا محمد مذہب کے آمد کے منتظر تھے۔ کیونکہ اسے رانا سانگا کافر کے ساتھ دینی جنگ کے بعد بنگال کی جانب ایلچی بنا کر بھیجا گیا تھا اور اس کے بارے میں یہ کہا جا رہا تھا کہ بس ایک دو دن میں وہ پہنچنے والا ہی ہے۔

انیس تاریخ کو بروز جمعہ معجون کی چسکیاں لے کر ہی خلوت خانے میں چند مخصوص آدمیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ شام کے وقت یعنی جو آنے والے ہفتے کی شام تھی وہ (ملا مذہب) آن پہنچا اور خدمت بجالایا۔ اس طرف جو کیفیت تھی اس کے بارے میں معلوم ہوا کہ بنگال کے فرمانروا کا رویہ اطاعت پذیری اور اتحاد و یکجہتی پر مشتمل تھا۔

اتوار کے دن امرائے ترک و ہند کو خلوت خانے میں مشورے کے لئے طلب کیا گیا اور یہ بات درمیان میں آئی کہ بنگال کے فرمانروا نے جو اپنا ایلچی بھیجا ہے اس کے اطوار سے ظاہر ہے بنگال کا فرمانروا فرمانبرداری اور یکجہتی کے حق میں ہے۔ اس بنا پر بنگال کی جانب رخ کرنا مناسب نہیں اور اگر بنگال کی جانب رخ نہ کیا جائے تو اس کے نواح میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں خزانہ ہو اور اس سے اہل لشکر کو مدد دی جائے۔ البتہ مغرب میں بعض جگہیں ایسی ہیں جو نزدیک بھی ہیں اور وہاں خزانہ بھی موجود ہے۔

مال وافر ایلی کافر یول و یاووق   شرقساری کریراق تور اول یاووق

(مال وافر ہے لوگ کافر اور راستہ قریب، مشرق دور ہے اور یہ نزدیک)

بالآخر یہ بات قرار پائی کہ مغرب چونکہ نزدیک ہے اس لئے ہمیں اس طرف جانا چاہئے۔ ہم نے چند روز رو وقف اس بنا پر کیا کہ ہمارا دل مشرق کی طرف سے مطمئن ہو جائے تا کہ اس کے بعد ہی ہم اس (مغرب) کی جانب رخ کریں۔ چنانچہ غیاث الدین کو بیس دن کی میعاد دے کر دوبارہ اس فرمان کے ساتھ مشرق کے امرا

۳۸۔ قورچی۔ توپ خانے کا منتظم (شاہ، فرہنگ ترکی، ص ۱۵۴)

کی طرف دوڑایا گیا کہ تمام سلاطین، خوانین اور امرا جو دریائے گنگا کے اس پار ہیں عسکری کے گرد جمع ہو کر دشمنوں کی جانب روانہ ہوں۔ اسے یہ ہدایت کی گئی کہ ان فرامین کو پہنچا کر اور جو واقعات وہاں رونما ہو رہے ہیں ان کی خبر معلوم کر کے وقت مقررہ پر پہنچ جائے۔

بلوچوں کی سرکشی سے متعلق انتظامات

اسی اثنا میں محمدی کوکلداش کی یہ عرضداشت موصول ہوئی کہ بلوچوں نے ایک مرتبہ پھر آگے بڑھ کر تاخت وتاراج شروع کر دی ہے۔ اس مصلحت کے پیشِ نظر چین تیمور اس کام کے انجام دینے کے لئے مقرر کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی شہرند اور سمانہ کی دوسری جانب عادل سلطان، سلطان محمد دولدائی خسرو کوکلداش، محمد علی جنگ جنگ، عبدالعزیز میر آخور، سیّد علی، ولی قزیل، قراچہ، ہلاہل، عاشق بکاول، شیخ علی کتہ، گجر خاں اور حسن علی سواتی جیسے امرا کو یہ فرامین بھیجے گئے کہ وہ چین تیمور سلطان کے گرد جمع ہوں اور جب اس کے پاس اس قدر اسلحہ مہیا ہو جائے جو چھ ماہ کے لئے کافی ہو تو وہ (ورق ۳۳۳) بلوچوں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوں اور سلطان کی معیّت میں اس کے حکم پر گوش بر آواز رہیں۔ اس فرمان کو پہنچانے کے لئے عبدالغفار تواچی کو متعیّن کیا گیا۔ قرار یہ پایا کہ پہلے یہ فرمان وہ چین تیمور سلطان کو پہنچائے۔ اس کے بعد وہ اس کے پاس سے ہو کر مذکورہ بالا امرا کو وہ فرمان دکھائے اور جس جگہ چین تیمور سلطان نے مورچہ بندی کے لئے جگہ مقرر کی ہو وہ وہاں اپنے لشکروں کو لے کر حاضر رہیں اور خود عبدالغفار بھی اس لشکر میں شامل رہے۔ اگر کسی شخص کی طرف سے سستی اور بے اہتمامی ظاہر ہو اس بارے میں وہ عرضداشت پیش کرے تا کہ مقرر آدمی کو اس کے منصب و مقام سے اتار کر اسے اس کی ولایت اور پرگنے سے نکال باہر کر دیا جائے۔ یہ فرامین عبدالغفار کے سپرد کر کے اور زبانی باتیں سمجھا کر اسے رخصت ہونے کی اجازت دی گئی۔

اٹھائیس تاریخ کو اتوار کی رات تین پہر اور چھ گھڑی وقت گزر جانے کے بعد دریائے جمنا کو عبور کر کے دھولپور میں واقع باغ نیلوفر کی جانب ہم نے رخ کیا۔ اتوار کے دن تیسرے پہر کا وقت نزدیک ہی تھا کہ ہم باغ میں آ پہنچے۔ باغ کے اطراف و جوانب میں امرا اور مقربین کے لئے مکانات بنانے کے لئے جگہیں متعیّن کی گئیں۔ تا کہ وہ وہاں اپنے لئے باغات و عمارات کی تعمیر کریں۔

بتاریخ سوم ماہ جمادی الاوّل باغ کے جنوب مشرق میں حمام کے لئے جو جگہ متعیّن کی گئی تھی اسے ہموار کر لیا گیا۔ میں نے حکم دیا کہ جس جگہ کو ہموار کیا گیا ہے وہاں حمام کی کرسی اٹھانے کے بعد حمام کی طرح اندازی ونقشہ کشی کریں۔ میں نے حکم دیا کہ حمام کے ایک کمرے میں دس گز لمبا اور دس گز چوڑا حوض بنائیں۔

مشرق پر حملے کا ارادہ

اسی دن خلیفہ نے آگرہ سے قاضی جیا اور سنگھ دیو کی عرضداشتیں روانہ کیں کہ بہار پر سکندر کے لڑکے محمود نے قبضہ کر لیا ہے۔ جیسے ہی مجھے یہ خبر ملی میں نے لشکر کے ہمراہ گھوڑوں پر سوار ہو کر روانہ ہونے عزم کر لیا۔ چنانچہ اگلے دن صبح بروز جمعہ چھٹی گھڑی کے وقت میں باغ نیلوفر سے سوار ہوا اور مغرب کے وقت آگرہ پہنچ گیا۔ محمد زمان مرزا دھولپور کی جانب جا رہا تھا۔ راہ میں میری اس سے ملاقات ہوئی۔ چین تیمور سلطان کے اسی دن آگرہ پہنچنے کی خبر تھی۔ اگلے دن صبح بروز ہفتہ میں نے امرا کو مشورے کے لئے طلب کیا۔ یہ قرار پایا کہ دس تاریخ کو بروز جمعرات پورب کی طرف سوار ہو جانا چاہئے۔

ہمایوں کا سمرقند پر حملہ

ہفتے کے دن ہی کابل سے خط کے ساتھ یہ اطلاع حاصل ہوئی کہ ہمایوں نے اطراف کے لشکروں کو جمع

(۳۹) باغ زرافشاں۔ دیکھیں نوٹ ۱۲۹ سال ۹۳۲ھ

کر کے اور سلطان ویس کو اپنے ہمراہ لے کر چالیس پچاس ہزار لوگوں کے ساتھ سمرقند پر چڑھائی کر دی ہے۔ سلطان ویس کا برادر خورد شاہ قلی حصار میں داخل ہونے کے بعد وہاں سے واپس آ گیا ہے۔ ترسون محمد سلطان نے ترمذ سے روانہ ہو کر قبادیان پر قبضہ کر لیا ہے اور کمک مانگی ہے۔ (ورق ۳۳۴)۔ ہمایوں نے تو لک کوکلداش اور میر خورد کو بہت سے لوگوں نیز ان تمام مغلوں کے ساتھ جو وہاں موجود تھے ترسون محمد سلطان کی مدد کے لئے بھیج کر خود بھی ان کے عقب میں اس طرف کا رخ کیا۔

مشرق پر لشکر کشی

جمعرات کے دن بتاریخ دس جمادی الاوّل تین گھڑی گزر جانے کے بعد پورب کی طرف سفر کرنے کا عزم کیا گیا۔ جلیسر نامی گاؤں سے ذرا اوپر کشتی میں سوار ہو کر ہم نے دریائے جمنا کو عبور کیا اور باغ زرافشاں [39] پہنچ گئے۔ حکم دیا گیا کہ پرچم، نقارہ، شاہی اصطبل، اور لشکر کے تمام لوگ دریائے کے اس پار باغ کے روبرو پہنچ جائیں اور جو لوگ کورنش کے لئے آنا چاہیں وہ کشتی پر سوار ہو کر آئیں۔

ہفتے کے دن بنگال کا ایلچی اسمٰعیل میتا اپنی پیشکش لے کر حاضر ہوا اور ہندستانی دستور کے مطابق آداب بجالایا اور ایک تیر کی دوری کے فاصلے سے تعظیم کر کے واپس چلا گیا۔ مروّجہ خلعت جسے سیر مونیہ کہتے ہیں پہنا کر اسے میرے سامنے لایا گیا۔ ہماری رسوم کے مطابق وہ تین مرتبہ زانو پر بیٹھا اور نصرت شاہ [40] کی عرضداشت پیش کی۔ اس کے ساتھ ہی جو پیشکش وہ ساتھ لایا تھا وہ میری نظر کر کے واپس چلا گیا۔

پیر کے دن حسن چلپی حاضر ہوا اور آداب بجالایا۔ لشکر پہنچنے کے انتظار میں ہم نے چند روز چار باغ میں توقف کیا۔

سترہ تاریخ کو جمعرات کے دن تین گھڑی وقت گزر جانے کے بعد ہم نے کوچ کیا۔ میں کشتی پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ آگرہ سے سات کروہ کے فاصلے پر انوار نامی گاؤں میں ہم نے قیام کیا۔

اتوار کے دن ازبک ایلچیوں کو رخصت ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ کوچوم خاں کے ایلچی امین مرزا کو کمر خنجر، زربفت کا پٹکا اور سات ہزار ٹنکا بطور انعام عطا کئے گئے۔ ملّا طغائی ملازم ابوسعید سلطان، مہربان خانم کے ملازمین اور اس کے لڑکے پولاد سلطان کو تکمے دار چکموں کے علاوہ ریشمی خلعتیں پہنائی گئیں۔ انہیں بھی ان کی حیثیت سے مطابق انعام سے نوازا گیا۔ اگلے دن صبح خواجہ عبدالحق کو آگرہ میں قیام کرنے اور خواجہ یحیٰی کے پوتے خواجہ کلاں کو جو ازبک خواتین و سلاطین کی جانب سے بحیثیت سفیر آیا تھا سمرقند جانے کی اجازت دے دی گئی۔

ہمایوں کو فرزند نرینہ کی ولادت اور کامران کو رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کی مناسبت سے مبارکباد دینے کے لئے مرزا تبریزی اور مرزا بیگ طغائی کے ذریعہ دس ہزار شاہرخی بطور تحفہ دے کر روانہ کیا۔ ایک پوشاک جو میں پہن چکا تھا اور پٹکا شاہزادوں کو بھیجے گئے۔ ہندال کو ملا بہشتی کے ذریعے کمر خنجر مرصّع، دوات مرصّع، سیپی کے کام کی کرسی اپنی پہنی ہوئی صدری و تنگ بند بھیجے [41] گئے۔ اس کے علاوہ خط بابری میں ابجد و قطعات لکھ کر بھی ان کے لئے روانہ کئے گئے (ورق ۳۳۵)۔ ہمایوں کو ترجمہ [42] اور ان اشعار کا مجموعہ جو میں نے ہندوستان میں کہے تھے [43] بھیجا گیا۔ ہندال اور خواجہ کلاں کو بھی ترجمہ اور اشعار کا مجموعہ بھیجا گیا۔ مرزا بیگ طغائی کے ہاتھ کامران کو بھی ترجمہ اور ان اشعار کا مجموعہ جو میں نے ہندوستان میں وارد ہونے کے بعد کہے تھے ان خطوط کے ہمراہ جو خط بابری میں تحریر کئے گئے تھے روانہ کئے گئے۔

منگل کے دن ان لوگوں کو جو کابل جا رہے تھے خط لکھ کر روانہ ہونے کی رخصت دی گئی۔ ملّا قاسم، استاد شاہ محمد سنگتراش، میر غیاث کے لڑکے میرک، میر سنگتراش اور شاہ بابا بیلدار کو آگرہ اور دھولپور میں عمارات تعمیر

۴۰۔ نصرت شاہ۔ اس کا اصل نام نصیب شاہ تھا۔ نصرت شاہ تخت شاہی پر بیٹھ کر لقب اختیار کیا۔ اس کا زمانہ حکومت گیارہ سال ہے۔ بابر کے ابراہیم لودھی کو شکست دینے کے بعد افغان امیروں نے نصرت شاہ کے پاس پناہ لی تھی۔ ان سب کو اس نے حتی المقدور جاگیریں دیں اور اس نے سلطان ابراہیم کی لڑکی سے شادی بھی کی تھی۔ اس کا قتل ۹۴۳ھ/ ۷-۱۵۳۶ میں ہوا (خواجہ نظام الدین، طبقات اکبری ج ۳، ص ۲۷۴)۔

۴۱۔ تنگ بند۔ کمر بند، وہ پیٹی جو ریشمی یا اونی ہو اور اس میں گھنڈی یا تکمہ لگا ہوا ہو یا بکسوئے لگانے کا سوراخ ہو (اردو لغت ج ۵ ص ۴۱۰)

۴۲۔ ترجمہ۔ اس سے مراد ترجمہ رسالہ والدیہ معلوم ہوتا ہے۔

(۴۳) دیوان۔ یہ دیوان ہندی وہ ہے جو رام پور کے کتب خانے میں موجود ہے۔

کئے جانے کے بارے میں ہدایات ذہن نشین کرائی گئیں اور تعمیرات کا کام ان کے سپرد کر کے انہیں جانے کی اجازت دی گئیں۔

پہلا پہر شروع ہوا ہی چاہتا تھا کہ ہم انوار سے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ظہر کا وقت گزر جانے کے بعد چندوار سے ایک کروہ دور اباپور نامی گاؤں میں قیام پذیر ہوئے۔

جمعرات کی رات عبدالملوک قورچینی کو حسن چلپی کے ہمراہ شاہ (طہماسپ) کے پاس اور چابوق کو ازبک ایلچیوں کے ساتھ خواتین وسلاطین کی جانب بطور ایلچی روانہ کیا گیا۔شام ہونے میں ابھی چار گھڑی وقت باقی تھا کہ ہم نے اباپور سے کوچ کیا۔صبح کے وقت چندوار سے گزر کر کشتی میں سوار ہوا اور نماز عشا کے وقت راپڑی کے سامنے کشتی سے اتر کر لشکر گاہ میں پہنچ گیا۔جو اس وقت فتحپور میں (ورق ۳۳۵) تھی۔ہم نے وہاں ایک روز قیام کیا۔ہفتے کے دن بوقت سحر وضو کر کے ہم سوار ہوئے اور راپڑی کے نزدیک با جماعت صبح کی نماز ادا کی۔فرض امامت مولانا محمود فارابی نے انجام دیا۔طلوع آفتاب کے وقت ہماری کشتی راپڑی پر بڑی اونچی ڈھلان سے گزری۔

وہ ترجمہ جو میں کیا تھا اسے خط ترکیب [۴۴] میں لکھنے کے لئے اس دن میں نے کاغذوں پر مسطر [۴۵] سے گیارہ سطری خط کشی کی۔اسی دن اہل اللہ کے اقوال سے میرے دل کو تنبیہ وآگاہی ہوئی۔راپڑی کے پرگنات میں ایک پرگنے کا نام جاکین ہے۔اس پرگنے کے سامنے ہم نے اپنی کشتیاں کنارے پر لگائیں۔اس رات ہم کشتی میں ہی رہے۔اگلے روز صبح سے قبل نماز فجر کے بعد انہیں وہاں سے روانہ کیا۔میں کشتی میں ہی تھا کہ سلطان محمد بخشی، خواجہ کلاں کے ملازم شمس الدین محمد نامی شخص کو اپنے ساتھ لے کر میرے پاس آیا۔وہ خطوط جو وہ لے کر آیا تھا اور جو کچھ اس نے زبانی بتایا ان سے کابل کے حالات معلوم ہوئے۔میں کشتی میں ہی تھا کہ مہدی خواجہ وہاں تشریف لائے۔ظہر کے وقت اس باغ میں جو دریا کے اس پار اٹاوہ کے سامنے بلندی پر واقع ہے اترے۔

دریائے جمنا کے پانی میں میں نے غسل کر کے نماز ظہر ادا کی۔جس جگہ نماز ادا کی گئی تھی وہاں سے ہم اٹاوہ پہنچے۔اسی باغ میں درختوں کے زیر سایہ اس بلند جگہ پر جو دریا سے ملحق ہے ہم بیٹھ گئے اور جوانوں کے ساتھ ہنسی مذاق شروع کر دیا۔وہ کھانا جس کے لئے مہدی خواجہ نے حکم دیا تھا اس کا دستر خوان یہیں بچھایا گیا۔(ورق ۳۳۶) مغرب کے وقت ہم نے دریا کو عبور کیا اور عشا کے وقت لشکر گاہ میں پہنچ گئے۔لشکر کے جمع ہونے اور کابل کے لوگوں کو خط لکھنے کے لئے تاکہ انہیں شمس الدین محمد کے ہاتھ بھیجا جا سکے ہم نے اس منزل پر دو تین دن تک توقف کیا۔

بدھ کے دن آخری جمادی الاوّل اٹاوہ سے کوچ کر کے ہم نے آٹھ کروہ سفر طے کیا۔موری دوسہ نامی مقام پر پڑاؤ ہوا۔کابل بھیجنے کے لئے جو خط لکھنے باقی رہ گئے تھے۔وہ اسی منزل پر لکھے گئے۔ہمایوں کو اس مضمون کا خط لکھا گیا؛ اگر اب تک حسب خواہش کام انجام نہیں دے سکے ہو تو قزاقوں اور لٹیروں کا سدباب کرو تاکہ امن وصلح وہاں برقرار رہے اور اس میں خلل واقع نہ ہو۔اس خط میں دوسری بات یہ لکھی کہ میں نے کابل کو زمین خالصہ میں شامل کر لیا ہے۔میرے فرزندوں میں سے کوئی اس کے لئے طمع نہ کرے۔میں نے ہندال کو بھی طلب کیا۔کامران کو میں نے لکھا کہ وہ شہزادہ (طہماسپ) کے ساتھ پیغام سلام برقرار رکھے اور ولایت ملتان اسے عطا کرنے کے بارے میں مطلع کیا اور یہ بھی بتایا کہ ولایت کابل کو زمین خالصہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔میں نے اس کو اپنے اہل وعیال کے روانہ کرنے کے بارے میں بھی لکھا۔

خواجہ کلاں کو خط

خواجہ کلاں کو جو خط میں نے لکھا اس سے جو کیفیات واضح ہیں اس کی نقل بے کم وکاست یہاں درج کی

۴۴۔خط ترکیب۔یعنی دیوان رام پور، رسالہ والدیہ خط ترکیب میں ہے۔

۴۵۔مسطر۔خط کشی کرنے کا آلہ،مثلاً(اردو لغت،ج ۱۸ص ۴۵)

جارہی ہے۔ خواجہ کلاں کو بعد از سلام معلوم ہو کہ شمس الدین اثادہ پہنچا۔ اس سے حالات کے بارے میں آگاہی ہوئی۔ اُن ولایات میں پہنچنے کی میرے دل میں تمنا و آرزو بے انتہا ہے۔ ہندستان میں حالات سازگار ہوتے جا رہے ہیں۔ خداوند تعالیٰ سے امید ہے کہ یہاں حالات جلد ہی قابو میں آ جائیں گے۔ انشاء اللہ۔ خداوند تعالیٰ کے فضل سے یہاں جیسے ہی حالات انجام پذیر ہو جائیں گے میں فوراً ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ ان ولایات کے عیش و آرام کو میں بھلا کیسے بھول سکتا ہوں۔ بالخصوص وہ شخص جس نے آب حرام سے توبہ کر لی ہو وہ وہاں کے سردوں اور انگوروں کے لطف کو کیسے فراموش کر سکتا ہے۔ حال ہی میں میرے لئے وہاں سے سردہ لایا گیا تھا۔ میں نے اس کی قاشیں کیں اور اسے کھایا۔ جس نے مجھے بیحد متاثر کیا میں اسے کھاتا جاتا تھا اور آنسو میری آنکھوں سے رواں تھے۔

کابل میں جو بدنظمی اور ابتری پھیل رہی ہے اس کے بارے میں مجھے لکھ جا چکا ہے۔ میں نے وہاں کے امور کے بارے میں غور و فکر کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ جس ولایت میں سات آٹھ حاکم ہوں وہ ولایت کس طرح مربوط و مضبوط رہ سکتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی بہن اور خواتین حرم کو ہندستان آنے کی ہدایت کی ہے۔ میں نے ولایت کابل اور اس کے نواحی علاقوں کو زمین خالصہ میں شامل کر لیا ہے۔ میں نے ہمایوں اور کامران کے لئے جو خط لکھ کر تیار کئے ہیں۔ ان میں اس امر کی وضاحت کر دی ہے۔ جب کوئی قابلِ اعتماد آدمی مل جائے گا تو یہ خطوط انہیں روانہ کر دیئے جائیں گے۔ اس سے پہلے بھی میں اس دونوں فرزندوں کو اس مضمون پر مشتمل خطوط روانہ کر چکا ہوں۔ جس کے بارے میں تمہیں خود بھی علم ہوگا۔ (ورق ۳۳۷) اس کے بعد ان ولایات کے نظم و نسق اور کے بارے میں کوئی عذر و جواز نہیں سنا جائے گا۔ اس کے بعد اگر حصار شہر مضبوط نہ رہے۔ رعیت آباد و خوشحال نہ ہو ذخیروں میں انسانوں کے لئے سامان خوراک اور جانوروں کے لئے چارہ نہ ہو، خزانوں میں مال نظر نہ آئے اگر مال ہو بھی تو اتنا نہیں کہ خزانے مالا مال اور معمور نظر آئیں تو ان سب کی وجوہات تمہاری اپنی نااہلی ہوگی۔

وہ امور جو تمہیں وہاں انجام دینے ہیں ان کی تفصیل ذیل میں درج کی گئی ہے۔ لوگوں کو اس سے متعلق احکام صادر بھی کئے جا چکے ہیں۔ سب سے پہلا کام یہ ہے کہ قلعے کی مرمت کرائی جائے، خزانہ معمور رکھا جائے۔ آنے اور جانے والے ایلچیوں کے لئے ضروریات زندگی اور قیام کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔ جائز و مشروع طریقوں سے خراج وصول کیا جائے۔ اسے عمارات و مسجد جمعہ پر خرچ کیا جائے۔ قلعے میں جو عمارات استاد حسن علی کی زیرِ نگرانی تعمیر کرائی جا رہی تھیں اور مکمل نہ ہو سکی تھیں ان کی تکمیل پختہ اینٹوں سے کرائی جائے۔ استاد سلطان محمد سے مشورہ کر کے محلات کی تعمیر کا مناسب نقشہ تیار کیا جائے اگر نقشہ جو استاد حسن علی نے تیار کیا تھا محفوظ ہو تو اس کے مطابق عمارات کی تکمیل ہو اور اگر نقشہ موجود نہ ہو تو باہمی اتفاقِ رائے سے عمارت عمدہ نقشے کے مطابق تعمیر کرائی جائے۔ اس عمارت کا صحن اتنا ہی وسیع و کشادہ ہو جتنا دیوانخانے کا ہے۔ کابل خورد کے لئے بند دریائے بتخاک پر بنایا جائے، اس جگہ جہاں سے دریا تنگ وادی سے نکل کر کابل خورد میں داخل ہوتا ہے۔ غزنی بند، خیابان اور باغ خیابان کی مرمت کرائی جائے۔ باغ خیابان میں پانی کی مقدار کم ہے۔ اس کے لئے ایک پن چکی پانی اس طرف منتقل کر کے اس کا رخ اس جانب کیا جائے۔ میں نے توتوم درّہ کا پانی خواجہ بستہ کے جنوب مغرب میں پشتے کی اونچائی تک پہنچا کر وہاں حوض تعمیر کرایا تھا اور وہاں پودے لگوائے تھے۔ کیونکہ یہ جگہ ایک گزرگاہ کے روبرو واقع ہے۔ اور یہاں کا منظر بھی دلکش ہے۔ اس لئے میں نے اس جگہ کا نام نظر گاہ رکھا تھا۔ یہاں بھی کچھ عمدہ پودے لگائے جانے چاہئیں۔ سبزہ زار میدانوں کو قطعات کی شکل میں ترتیب دیا جائے اور ان کے حواشی پر خوش رنگ و خوشبو والے گل بوٹے لگائے جائیں۔ سید قاسم کو تمہارا معاون و مددگار مقرر کیا گیا ہے۔

استاد محمد امین جبہ چی[۴۶] اور تفنگداروں کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ جیسے ہی یہ خط تم تک پہنچے میری بہن اور بیگمات حرم کو میری طرف روانہ کر کے ان کے ساتھ نیلاب تک مشایعت کرو۔ وہ روانہ ہونے میں خواہ کتنی ہی لیت و لعل کریں لیکن جیسے ہی یہ خط ملے انہیں ایک ہفتے میں روانہ کر دو کیونکہ وہ سپاہی جو ہندستان سے ان کی معیت کے لئے گئے ہیں وہ کسی دشوار گزار جگہ پر مشکلات سے دوچار ہیں اور وہاں پر وہ ولایات کو تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ وہ خط جو عبداللہ کو بھیجا گیا تھا اس میں میں نے یہ لکھا تھا کہ (ورق ۳۳۸) یہ میری انتہائی آرزو ہے کہ اس صحرا زار سے نکل کر میں کسی طرح ذہنی اعتدال کی وادی میں پہنچ جاؤں۔ چنانچہ یہ رباعی میں نے حسب حال کہی ہے۔

می ترکینی قیلغالی پریشان دورمین ‏ ‏ ‏ بیلمان تیلور ایشمینی و حیران دورمین
ایل بارچہ پشیمان بولو رو توبہ قیلور ‏ ‏ ‏ مین توبہ قیلیب مین و پشیماند ورمین

(میں شراب سے توبہ کر کے حواس باختہ و پریشان ہوں۔ میں اس قدر آشفتہ سر و پریشان حال ہوں کہ نہیں جانتا کہ کیا کروں۔ لوگ مے نوشی سے پریشان ہو کر توبہ کرتے ہیں۔ مگر میں بادہ آشامی سے توبہ کر کے پریشان ہوں)

یہاں مجھے بنائی کا ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک دن بنائی نے علی شیر کی موجودگی میں مذاق کیا۔ علی شیر بیگ اس وقت تکمے[۴۷] دار عبا پہنے ہوئے تھا۔ علی شیر نے کہا کہ تم نے بہت عمدہ مذاق کیا ہے اس کے عوض میں تجھے یہ عبا بطور انعام دینا چاہتا ہوں۔ مگر اس میں یہ تکمے مانع ہیں۔ اس پر بنائی نے جواب دیا کہ بھلا تکمے عبا کو بطور انعام دینے میں کیسے مانع ہو سکتے ہیں۔ اس کا یہ کاج[۴۸] اس راہ میں مانع ہے دروغ وراست برگردن راوی۔ اس بارے میں مجھے معاف رکھو۔ یہ مذاق ہوا اسی طرح تھا۔ یہ رباعی میں نے گذشتہ سال کہی تھی۔ فی الواقع دو سال قبل محفل بادہ پیمائی آراستہ کرنے کی آرزو مجھ پر ایسی غالب تھی کہ نزدیک تھا کہ آنسو میری آنکھوں سے چھلک جائیں۔ الحمدللہ اس سال وہ آرزو میرے ذہن سے بالکل ہی محو ہو گئی ہے۔ غالباً یہ فیض اس برکت کا ہے جو مجھے رسالہ والدیہ کا منظوم ترجمہ کرنے سے نصیب ہوئی ہے۔ تو بھی اس بات کی قسم کھا کے کر میانہ روی سے کام لے گا دراصل محافل عیش و نوش ہم صحبت و ہم کاسہ یاروں کے ساتھ ہی لطف دیتی ہیں۔

کیم بیلہ صحبت توتقانی سیز ‏ ‏ ‏ کیم بیلہ چاغیر ایجکا یسیز

(تم کس کے ساتھ محفل آراستہ کر رہے ہو اور کس کے ساتھ تم بادہ نوشی کر رہے ہو)

اگر تیرے ہم نوالہ و ہم پیالہ شیر احمد اور حیدر قلی ہیں تو میانہ روی کی قسم کھانا بہت زیادہ مشکل نہیں ہونی چاہیے۔

صحت و سلامت کا آرزومند، مورخہ اول جمادی الآخر بروز جمعرات

جس وقت میں یہ نصیحت آمیز باتیں لکھ رہا تھا تو مجھ پر بھی ان کا بہت گہرا اثر ہو رہا تھا۔ خطوط لکھ کر شمس الدین کے سپرد کئے اور زبانی بھی بہت سی باتیں اس کے ذہن نشین کرا کے جمعہ کی شب اسے رخصت کیا گیا۔

بلخ سے خطوط

بروز جمعہ ہم آٹھ کروہ سفر کر کے جو مندنا پہنچے اور وہاں قیام پذیر ہوئے۔ کیتن سلطان کا ملازم حاضر خدمت ہوا کیتن قرا سلطان نے اپنے ملازم کمال الدین قناق کو اپنا ایلچی بنا کر اس کے ہمراہ روانہ کیا تھا۔ کیتین قرا سلطان نے جو خط قناق کو لکھا تھا اس میں اس نے امرائے سرحد (بلخ) کی طرزِ معاش اور بدسلوکی کا گلہ کیا تھا اور یہ شکایت کی تھی کہ وہ لوگ کس طرح راہزنی و غارتگری کا بازار گرم کئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ قناق اس ایلچی کو میرے پاس لے کر پہنچا۔ قناق کو تو روانہ ہونے کی رخصت دی گئی اور امرائے سرحد کو فرامین جاری کئے گئے کہ وہ

۴۶۔ جبہ چی۔ داروغۂ زرہ بکتر خانہ۔

۴۷۔ تکمے۔ بٹن یا گھنڈیاں

۴۸۔ کاج۔ یہاں بابر لفظ مادگی استعمال کرتا ہے۔ جس کے معنی زنانہ پن ہوتے ہیں (ریڈ ہاؤس، ترکی انگلش لیگزی کون ص ۱۶۵۳)

راہزنی اور غارتگری سے باز رہیں اور کپتان قرا سلطان کے ساتھ حسنِ سلوک دعمدہ طرزِ معاش کا رویہ اختیار کریں۔ یہ فرامین کپتان قرا سلطان کے نمائندے کے سپرد کر کے اسے بھی اسی منزل سے رخصت ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ شاہ قلی نامی شخص حسن چلبی کی جانب سے حاضرِ خدمت ہوا اور جنگ کی کیفیات کے بارے میں اس نے کچھ باتیں عرض کیں۔ اس شاہ قلی کے ہاتھوں شاہ کو خط لکھ کر بھیجا گیا۔ جس میں شاہ قلی کے دیر سے پہنچنے کی وجہ سمجھائی گئی۔ بروز جمعہ مہینے کی دو تاریخ کو اسے رخصت ہونے کی اجازت دی گئی۔

ہفتے کے دن ہم نے آٹھ کروہ سفر طے کیا۔ کاکورہ اور چچولی جو کالپی[49] کے پرگنات میں ہیں، قیام پذیر ہوئے۔

اتوار کے دن اس مہینے کی چار تاریخ کو ہم نے نو کروہ سفر طے کیا۔ کالپی کے پرگنات میں ہی ڈیرہ پور نام کا پرگنہ ہے یہاں میں نے اپنے سر کے بالوں کو ترشوایا (ورق ۳۳۹)۔ کیونکہ دو ماہ سے میں نے سر کی حجامت نہیں بنوائی تھی۔ اور پھر دریائے سنگر میں غسل کیا۔

پیر کے دن ہم نے چودہ کروہ فاصلہ طے کیا۔ چپر گڑھ بھی کالپی کے پرگنات میں سے ایک ہے، ہم وہاں قیام پذیر ہوئے۔

اگلے دن صبح بروز منگل مہینے کی چھ تاریخ کو قراچہ کا ہندستانی نوکر فرمان لے کر آیا جو ماہم بیگم نے قراچہ کو اپنے آنے سے متعلق لکھا تھا۔ یہ پروانہ ویسا ہی تھا جیسا کہ میں اپنے ہاتھ سے لکھا کرتا تھا۔ انہوں نے بھیرہ لاہور اور ان جگہوں کے نواح میں آباد لوگوں میں سے اپنے لئے پاسبانوں اور راہنماؤں کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ فرمان انہوں نے ماہ جمادی الاوّل کی سات تاریخ کو لکھ کر روانہ کیا۔

سات کروہ کا سفر طے کر کے ہم پرگنہ آدم پور میں قیام پذیر ہوئے۔ اسی دن طلوع فجر سے قبل گھوڑے پر سوار ہو کر میں اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہو گیا اور نصف روز تنہا رہ کر گزارا اور تنہا ہی دریائے جمنا تک پہنچ گیا اور اکیلا ہی اس کے کنارے چلتا چلا گیا۔ جس وقت میں آدم پور کے مقابل پہنچا تو وہاں ایک جزیرے پر لشکر گاہ کے نزدیک شامیانہ نصب کر دیا گیا تھا۔ اس جگہ پہنچ کر میں معجون سے لطف اندوز ہوا۔

کشتی

اسی دن میں نے صادق اور کلال کی کشتی کروائی۔ کلال فتح کے دعوے کے ساتھ آگرہ سے آیا تھا۔ اسے بیس دن کی مہلت دی گئی کہ اس عرصے میں وہ راستے کی کوفت دور کر لے۔ اس وقت سے اب تک چالیس پچاس دن گزر چکے تھے۔ چنانچہ آج ضروری ہو گیا کہ اس کی کشتی کرائی جائے۔ صادق نے کشتی کے عمدہ داؤ دکھائے اور اس نے اپنے حریف کو آسانی سے پچھاڑ دیا۔ اسے دس ہزار تنکے، زین دار گھوڑا، سر و پا اور تکمہ دار عبا بطور انعام دیئے گئے۔ اگرچہ کلال کشتی ہار گیا تھا۔ لیکن اس خیال کے پیشِ نظر کہ وہ آزردہ خاطر نہ ہو اسے بھی تین ہزار تنکے کے ساتھ سر و پا عطا کیا گیا۔ حکم دیا گیا کہ فوجی گاڑیوں اور توپوں کو کشتیوں پر سے اتار لیا جائے۔ ہم نے یہاں تین چار دن قیام کیا تا کہ اس عرصے میں راستہ بنا کر اور زمین کو ہموار کر کے فوجی گاڑیوں اور توپوں کو ان پر سے گزارا جا سکے۔

پیر کے دن مہینے کی بارہ تاریخ کو ہم بارہ کروہ کا فاصلہ طے کر کے کڑہ نامی مقام پر قیام پذیر ہوئے۔ آج میں پالکی میں سوار ہوا اور کڑہ سے بارہ کروہ چل کر کریہ میں جو کڑہ کا ہی ایک پرگنہ ہے قیام پذیر ہوا۔ کریہ سے آٹھ کروہ چل کر ہم فتح پور ہسوہ پہنچے اور وہاں قیام پذیر ہوئے فتح پور سے آٹھ کروہ راستہ طے کر کے سرائے منڈا

۴۹۔ کالپی۔ کان پور سے جنوب مغرب دریائے جمنا پر ہے۔

میں آئے اور وہاں ہم نے پڑاؤ کیا۔ جس وقت ہم یہاں قیام کئے ہوئے تھے جلال الدین حاضرِ خدمت ہوا۔ اس کے دو کم عمر لڑکے اس کے ساتھ تھے۔

اگلے دن صبح بروز ہفتہ مہینے کی سترہ تاریخ کو ہم نے آٹھ کروہ فاصلہ طے کر کے دریائے گنگا کے کنارے دوکدی نامی مقام پر جو کڑہ کے پرگنات میں سے ایک ہے قیام کیا۔

اتوار کے دن محمد سلطان مرزا، قاسم حسن سلطان، بے خوب سلطان اور تردیکہ اسی منزل پر حاضرِ خدمت ہوئے۔

پیر کے دن عسکری بھی اسی منزل پر حاضر ہو کر خدمت بجالایا۔ یہ سب دریائے گنگا کی مشرق سے آئے تھے۔ اس قسم کا حکم دیا گیا کہ تمام لشکر عسکری کے ہمراہ دریائے گنگا کے اس پار واپس چلے جائیں اور جس جگہ ہمارا لشکر قیام پذیر ہو اس کے روبرو دریا کے اس پار پڑاؤ کریں۔

جن دنوں (ورق ۳۴۰) ہم وہاں کے گرد و نواح میں تھے تو یہ خبریں بار بار چلی آ رہی تھیں کہ سلطان محمود کے گرد ایک لاکھ افغان جمع ہو گئے ہیں۔ اس نے شیخ بایزید[50] اور بِبّن[51] کو عظیم لشکر کے ہمراہ سروار کی جانب روانہ کر دیا ہے اور خود فتح خاں سروانی کے ساتھ دریائے گنگا پر قبضہ کر کے دریا کے کنارے کنارے چنار کی طرف پیشقدمی کر رہا ہے۔ شیر خاں سور[52] جس کے ساتھ میں نے سال گزشتہ بہت سے مراعات کی تھیں اور بہت سے پرگنے عطا کر کے اس علاقے میں اسے قائم کیا تھا۔ نو وارد افغان کا طرفدار ہو گیا ہے۔ انہوں نے شیر خاں اور چند دیگر امرا کو دریا عبور کروا دیا ہے۔ سلطان جلال الدین کے آدمی بنارس پر اپنا قبضہ برقرار نہ رکھ سکے اس لئے وہ وہاں سے فرار ہو کر چلے گئے ہیں۔ اگرچہ ان کا کہنا یہ تھا کہ انہوں نے قلعہ بنارس میں بہت سی سپاہ مقرر کر دی ہے اور خود دریائے گنگا کے کنارے پہنچ کر سلطان محمود کے ساتھ نبرد آزمائی کر رہے ہیں۔ ہم نے دگدگی سے کوچ کر کے چھ کروہ فاصلہ طے کیا اور کڑہ سے تین چار کروہ دور کسار میں قیام پذیر ہوئے۔ میں نے یہ سفر کشتی کے ذریعے کیا تھا۔ اس منزل پر ہم دو تین دن تک سلطان جلال الدین کی ضیافت کے باعث قیام پذیر رہے۔ اس نے ہماری خوب خاطر و تواضع کی اور عمدہ کھانوں سے دسترخوان سجایا۔ بروز جمعہ ہم سلطان جلال الدین کے ان محلات میں فروکش ہوئے جو کڑہ کے قلعے میں واقع ہیں۔ اس نے مہمان داری کا حق ادا کیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اسے اور اس کے لڑکوں کو اکہری عبائیں اور صدریاں پہنائی گئیں۔ اس کی درخواست پر اس کے بڑے لڑکے کو سلطان محمود کے خطاب سے نوازا گیا۔ کڑہ سے روانہ ہو کر ہم نے ایک کوس کا سفر طے کیا اور دریائے گنگا کے کنارے قیام پذیر ہوئے۔ شہرک بیگ کو ماہم نے بھیجا تھا۔ وہ اس جگہ حاضرِ خدمت ہوا جہاں ہم نے دریائے گنگا کے کنارے پہلا پڑاؤ کیا تھا۔ اسی دن خط لکھ کر اسے اسی منزل سے رخصت ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ خواجہ یحیٰی کے پوتے خواجہ کلاں نے مجھ سے وہ واقعات مانگے جو میں قلمبند کر رہا تھا۔ میں نے ان کی کتابت کرا کے اسے شہرک کے ذریعے روانہ کیا۔

اگلے دن صبح کے وقت ہم نے کوچ کیا اور چودہ کروہ راستہ طے کر کے قیام پذیر ہوئے۔ میں نے مثل سابق کشتی سے ہی سفر کیا۔ جس منزل پر ہمیں اترنا تھا وہ قریب ہی تھی اسی لئے ہم وہاں جلد ہی پہنچ گئے چنانچہ کافی دیر تک ہم کشتی میں ہی بیٹھے رہے اور وہیں بیٹھے بیٹھے ہم معجون سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ خواجہ عبدالشہید جو نور بیگ کی حویلی میں قیام فرماتے تھے، کو اپنے پاس آنے کی دعوت دی۔ ملا محمود کو ملا علی خان کے گھر سے بلایا گیا۔ ہم کچھ عرصے تک کشتی میں ہی بیٹھے رہے اس کے بعد دریا کو عبور کر کے دوسری جانب پہنچ گئے۔ وہاں ہم نے پہلوانوں کی کشتی کرائی۔

۵۰۔ بایزید فرملی۔ ابراہیم لودھی کا امیر جس کے پاس ابراہیم کی مشرقی فوج کی کمان تھی۔ ابراہیم لودھی کی وفات کے بعد یہ بھی بابر سے مل گیا تھا اور اس کو جاگیر عطا ہوئی تھی (ورق ۲۷۲) لیکن بعد میں یہ بابر سے الگ ہو گیا اور بِبّن کے ساتھ مل کر سلطان محمود بن سلطان سکندر کے لئے بڑی فوج جمع کر کے اس کی سلطنت کو استحکام پہنچانے کی کوشش میں لگ گیا۔ اس کا انتقال دورہ کی لڑائی میں ہوا (تذکرۃ الواقعات ص ۱۰، تاریخ خاں جہانی ص ۳۳۴، بدایونی ص ۳۷۱)۔

۵۱۔ بِبّن ولد اتا لودھی سلطان ابراہیم کا افغان امیر جو سلطان ابراہیم سے باغی ہو گیا تھا۔ بابر کے پاس سمانہ و سنام میں اطاعت کے لئے آیا۔ لیکن بعد میں بابر کو بھی چھوڑ کر مشرقی افغانوں سے مل گیا۔ بِبّن اور بایزید نے سلطان محمود بن سلطان سکندر کو جس نے ابراہیم لودھی کی شہادت کے بعد سے رانا سانگاہ کے ہاں پناہ لے رکھی تھی اور قلعہ چتوڑ کے نواح میں گزر اوقات کر رہا تھا، بلا کر تخت شاہی پر بٹھایا اور رسم تاج پوشی ادا کی۔ سلطان محمود کی سلطنت کا سارا دار و مدار بِبّن و بایزید کی عقل و ہمت پر ہی تھا ہندوستان کے گوشے گوشے سے افغان امیروں نے ان کے جھنڈے تلے جمع ہونا شروع کر دیا تھا۔ سلطان محمود کے ایک اور سردار شیر خاں کو بِبّن کی سرداری کھلتی تھی۔ سلطان محمود کی جنگ جب ہمایوں سے جونپور پر ہوئی اور شیر خاں ہمایوں سے مل گیا تو اسی جنگ میں بِبّن کا انتقال ہوا (تاریخ خان جہانی ص ۲۲۵، ۳۳۴، تاریخ شاہی ص ۱۸۷، تذکرۃ الوقعات ص ۱۰، بدایونی ج ۱ ص ۳۳۹، ۳۷۱)

۵۲۔ شیر خاں سور۔ یہ آئندہ کا شیر شاہ سوری ہے۔ اس کا نام فرید خاں تھا۔ شروع سے ہی آزاد منش تھا۔ پہلے اپنے باپ کو چھوڑا اور کئی مرتبہ اپنے آقا بدلے۔ امیر دولت خاں (سلطان ابراہیم کا امیر)، محمد خاں سور (چوندا)، بہار خاں نوحانی (بہار) اور سلطان جنید برلاس (مانکپور) سب کے پاس تھوڑے تھوڑے عرصے کے لئے نوکری کی۔ فرید خاں کا تعارف سلطان جنید برلاس نے بابر سے کرایا تھا۔ بابر نے اس کو انعامات و سرپرستی سے نوازا۔ کچھ عرصہ بابر کے پاس رہنے پر بابر کی مردم شناس نگاہوں نے اس کو پہچان لیا تھا۔ بابر نے کہا۔ "اس افغان کی آنکھیں فتنہ و فساد کی غمازی کرتی ہیں" (خواجہ نعمت اللہ ہروی۔ تاریخ خان جہانی و مخزن افغانی ص ۲۲۰)۔

پہلوانوں کی زور آزمائی

دوست یسٰین خیر کو حکم دیا گیا کہ وہ پہلوان صادق کے علاوہ کسی سے بھی زور آزمائی کرے۔ یہ جو حکم دیا گیا تھا وہ خلاف قاعدہ تھا کہ سب سے زیادہ طاقتور پہلوانوں کو پہلے کشتی کے لئے اتارا جائے۔ اس نے آٹھ پہلوانوں سے زور آزمائی کی۔ ظہر کے وقت سلطان محمد بخشی کشتی کے ذریعے دوسرے کنارے سے اس طرف آیا اور یہ خبر لایا کہ سلطان سکندر کے لڑکے محمود خاں کو جسے یہ باغی سلطان محمود کے لقب سے پکارتے تھے شکست ہوئی ہے۔ ظہر کے وقت وہ جاسوس جو وہاں مخبری کے لئے گیا تھا یہ خبر لے کر آیا کہ باغی بھی شکست کھا گئے ہیں۔ ظہر و عصر کے درمیان تاج خاں سارنگ خانی نے بھی اس خبر سے اتفاق کیا جو یہ جاسوس لے آیا تھا۔ ان تمام کیفیات کو سلطان محمد نے بھی آ کر بیان کیا۔ اس نے بتایا کہ باغیوں نے چنار کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ وہاں ان کی کچھ چپقلش بھی ہوئی۔ لیکن انہیں جیسے ہی اس خبر کی تصدیق ہوئی کہ ہم وہاں پہنچ گئے ہیں تو ان میں ایسی ابتری پھیلی کہ انہوں نے وہاں سے اپنا محاصرہ ختم کر دیا (ورق ۳۴۱)۔ وہ افغان جو دریا کو عبور کر کے بنارس میں داخل ہو گئے تھے۔ سراسیمہ ہو کر دریا پار کر کے واپس چلے گئے۔ ان کی دو کشتیاں غرقاب ہوئیں اور کچھ لوگوں کو دریا کی روانی بہا لے گئے۔

اگلے دم صبح ہم نے چھ کوس کا سفر طے کیا اور پیاگ ۵۳ میں سراولی پر قیام پذیر ہوئے۔ اگلے دن صبح میں کشتی کے ذریعے روانہ ہوا۔ ایشان تیمور سلطان اور توختہ بونما سلطان آدھے ہی راستے پر کورنش بجالانے کی خاطر حاضر ہوئے۔ وہ وہاں میری آمد کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے۔ سلطان کو تو میں نے کشتی میں ہی بلا لیا۔ توختہ بونما سلطان ابھی دس کروہ کے فاصلے پر ہی تھا کہ تیز ہوا چلنے لگی اور بارش شروع ہو گئی۔ موسم نے وہ طور اختیار کیا اور ہوا اس امر کا باعث ہوئی کہ معجون سے لطف اندوز ہونے کو دل چاہا۔ اگرچہ گزشتہ روز اس کی چسکیاں لی جا چکی تھیں۔ چنانچہ آج بھی ہم نے اس کا لطف لیا اور منزل گاہ پر پہنچ گئے۔ اگلے روز صبح ہم نے اسی منزل پر قیام کیا۔ منگل کے دن ہم نے کوچ کیا۔ ہماری لشکر گاہ کے سامنے ایک بڑا جزیرہ تھا جس پر ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ ہم کشتی کے ذریعے اس تک پہنچ گئے اور اس کا معائنہ گھوڑے پر سوار ہو کر کیا۔ پہلے پہر میں ہم کشتی میں آ گئے۔ وہاں جس وقت میں گھوڑے پر سوار بے خبر گشت کر رہا تھا، دریا کے کنارے ایک پشتے پر سے گزرا جیسے ہی میں اس پر سے گزر رہا تھا کہ اچانک اس میں شگاف پڑ گیا اور وہ گرنا شروع ہو گیا۔ میں نے فوراً گھوڑے پر سے چھلانگ لگائی۔ اگر میں گھوڑے پر سوار رہتا تو امکان تھا کہ گھوڑے کے ساتھ گر جاتا۔ میں نے اس دن دریا کو تیرتے ہوئے۔ پار کیا۔ میں نے تینتیس (۳۳) مرتبہ ہاتھ چلائے۔ اس کے بعد دم لئے بغیر پھر تیرتا ہوا واپس پہلے کنارے پر آیا۔ میں اس سے پہلے بھی اس طرح تیر کر دریا پار کر چکا ہوں۔ بس دریائے گنگا ہی پار کرنے سے رہ گیا تھا۔ جس وقت ہم دریائے گنگا اور جمنا کے سنگم پر پہنچے میں نے ناؤ پیاگ کی طرف لے جانے کو کہا۔ ایک پہر اور چار گھڑی گزر جانے کے بعد میں واپس لشکر گاہ میں آ گیا۔

بدھ کے دن دوپہر کے وقت لشکر نے دریا جمنا عبور کرنا شروع کیا اس وقت ہمارے پاس چار سو بیس (۴۲۰) کشتیاں تھیں۔

یکم رجب بروز جمعہ میں نے دریا کو عبور کیا۔

پیر کے دن مہینے کی چار تاریخ کو ہم نے دریائے جمنا کے کنارے کنارے بہار کی جانب جانے کے ارادے سے کوچ کرنا شروع کیا۔ پانچ کروہ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم لواہن میں قیام پذیر ہوئے۔ میں بدستور سابق کشتی سے ہی سفر کرتا ہوا یہاں پہنچا۔ اس دن بھی لشکر کے لوگ دریا پار کر رہے تھے۔ میں نے حکم دیا کہ وہ توپ گاڑیاں جو آدم پور پر کشتیوں سے اتار لی گئی تھیں اب دوبارہ پیاگ سے کشتیوں پر انہیں لاد کر لائیں۔

جب ہم منزل گاہ پر پہنچے تو پہلوانوں کی کشتی کرائی گئی۔ دوست یسئین خیز کی جوڑ لاہور کے اس ملاح کے ساتھ چھوٹی جو پہلوان بھی تھا۔ دوست نے بہت زور لگایا اور بمشکل تمام اسے چت کیا۔ دونوں ہی پہلوانوں کو انعام اور سروپا سے نوازا گیا۔

اب ہمارے سامنے وہ دلدل تھی جو دریائے توس کہلاتی ہے۔ یہاں سے گزرنے اور راستہ بنانے کے لئے ہم نے دو روز قیام کیا۔ گھوڑوں اور اونٹوں کو یہاں سے ذرا اوپر جا کر دریا کے پار پہنچا دیا گیا۔ لیکن ساز و سامان سے لدی ہوئی گاڑیوں کو (ورق ۳۴۲) وہاں سے اس بنا پر نہیں گزارا جا سکتا تھا کہ راستے میں چٹانیں تھیں۔ میں وہاں گھوڑے پر سے اتر گیا۔ ساز و سامان سے لدی ہوئی گاڑیوں کے لئے حکم دیا گیا کہ انہیں اس جگہ سے دریا کے اس پار لے جایا جائے۔

جمعرات کے دن ہم نے وہاں سے کوچ کیا۔ میں نے اس جگہ تک جہاں دریا کا پانی دلدل سے جا ملتا ہے، کشتی سے سفر کیا اور جس جگہ دلدل کا دریا کے پانی سے اتصال ہوتا ہے میں وہاں کشتی سے اتر گیا۔ وہاں سے گھوڑے پر سوار ہو کر دلدل تک جا پہنچا۔ دلدل سے اوپر پہنچ کر لشکر نے دریا کو عبور کیا اور پار اتر کر وہاں خیمے نصب کئے۔ عصر کے وقت میں واپس لشکر گاہ میں پہنچ گیا۔ اس دن ہم نے چھ کروہ کا سفر طے کیا۔ اگلے دن صبح ہم اسی منزل پر قیام کئے رہے۔ ہفتے کے دن کوچ کیا اور بارہ کروہ چل کر دریائے گنگا کے کنارے نیلا بار پہنچ گئے۔ وہاں سے کوچ کر کے ہم نے چھ کروہ کا راستہ طے کیا اور اس جگہ قیام پذیر ہوئے جس کے نیچے کوئی گاؤں آباد تھا۔ وہاں سے ہم سات کروہ چل کر نا پور آ گئے۔ اسی منزل پر باقی خاں اپنے لڑکوں کے ہمراہ چنار سے آ کر خدمت بجالایا۔ اسی اثنا میں محمد بخشی کی عرضداشت موصول ہوئی۔ اس نے اس امر کی تصدیق کی کہ میری خواتین اور ان کی ملازمین کابل سے روانہ ہو چکے ہیں۔ بدھ کے دن ہم اس منزل سے روانہ ہوئے اور قلعہ چنار کا معائینہ کیا یہاں سے ایک کروہ کا فاصلہ طے کر کے ہم پھر قیام پذیر ہوئے۔ جس وقت ہم پیاگ سے گزر رہے تھے اس وقت میرے جسم پر پھوڑے نکل آئے۔ اس منزل پر ایک دن میرے معالج نے میرا علاج اس طریقے سے کیا جیسا کہ ارض روم میں کیا جاتا ہے۔ اس نے مٹی کی ہانڈی میں پانی کے ساتھ مرچوں کو ابالا اور اس کی میرے پھوڑوں کو بھاپ دی۔ جب بھاپ کی حرارت کم ہونے لگی میں دو گھنٹے تک ان پھوڑوں کو گرم پانی سے دھوتا رہا۔[۵۴] اسی منزل پر کسی نے بتایا کہ لشکر گاہ کے پہلو میں جو جزیرہ ہے وہاں شیر اور گینڈے نظر آتے ہیں۔ اگلے دن صبح ہم نے جزیرے کے گرد نرغہ لگایا۔ ہم ہاتھی بھی لے کر وہاں پہنچے۔ وہاں نہ کوئی شیر تھا اور نہ ہی گینڈا۔ البتہ اس کے کنارے سے ایک جنگلی بھینسا بھاگ نکلا اس روز بڑی تیز آندھی چلی جس کے باعث گرد و غبار سے سخت تکلیف ہوئی۔ یہاں سے ہم کشتی پر سوار ہو کر واپس لشکر گاہ میں پہنچ گئے۔

لشکر گاہ کے خیمے بنارس سے دو کروہ اوپر نصب کئے گئے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ چنار کے گرد و نواح میں جو جنگل ہے وہاں ہاتھی بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ میں اس منزل سے اس ارادے سے روانہ ہوا کہ ہاتھیوں کو پکڑا جائے گا۔ اسی اثنا میں باقی خاں یہ خبر لے کر آیا کہ محمود خان نے دریائے سون کے کنارے پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔ چنانچہ امرا کو طلب کیا گیا ان کے ساتھ دشمن پر یلغار کرنے کے لئے مشورہ کیا گیا۔ بالآخر بات یہ طے پائی کہ جلد از جلد ہمیں کوچ کر کے جتنی بھی آگے جا سکیں چلا جانا چاہئے۔ چنانچہ ہم نے وہاں سے کوچ کیا اور نو کروہ فاصلہ طے کر کے بلوا گھاٹ پہنچ کر ہم وہاں قیام پذیر ہوئے۔ اس جگہ سے پیر کے رات مہینے کی اٹھارہ کو طاہر آگرہ کی جانب روانہ ہوا۔ اس نے وہاں پہنچ کر ان روپوں کو وصول کرنے کی رسید دی جو عام طور پر کابل سے وارد ہونے والوں کے قیام و طعام کے لئے بطور انعام دیئے جاتے ہیں اور واپس آ گیا۔ اسی دن میں کشتی کی جانب روانہ ہوا اور فجر سے پہلے اس میں سوار ہو گیا۔ جس جگہ دریائے گومتی (جو جونپور سے آتا ہے) اور گنگا کا سنگم ہوتا

۵۴۔ پھوڑے اور پھنسی میں اگر معالج کے خیال میں پیپ بن گئی ہو تو گرم بھاپ سے پیپ کو سطح پر لانے کے لئے یہ عمل کیا جاتا ہے۔

ہے۔ میں وہاں تک پہنچ کر دریائے گومتی کی طرف ذرا آگے نکل گیا اور واپس آ گیا۔ اگرچہ یہ دریا بہت چوڑا نہیں لیکن وہاں ایسی کوئی جگہ نہ تھی جہاں سے دریا کو پار کیا جا سکے۔ لشکر کے وہ سپاہی جو دریا کے کنارے پر تھے انہوں نے کشتیوں کے ذریعے اور گھوڑوں کو تیرا کر دریا عبور کیا۔ گزشتہ سال جس منزل سے گزر کر (ورق ۳۴۳) ہم نے جونپور کا سفر کیا تھا۔ میں نے اس جگہ کا معائنہ کیا۔ موافق ہوا پانی کے بہاؤ کی طرف چلنے لگی۔ بادبان ناؤ کو کھینچنے لگے۔ چنانچہ بڑی کشتی کو اس چھوٹی بنگالی ناؤ کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ ناؤ بڑی تیزی سے روانہ ہوئی۔ لشکرگاہ کو مدن بنارس سے ایک کروہ بلندی پر نصب کیا گیا۔ جہاں ہم قیام پذیر ہوئے جب دو گھڑی دن رہ گیا تو ہم اپنی منزل پر پہنچے اور توقف کیا۔ وہ کشتیاں جو ہمارے عقب میں آ رہی تھیں وہ ذرا دیر سے عشا کے وقت پہنچیں۔ چنار سے یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ مغل بیگ ایک منزل سے دوسری منزل تک طناب کے ذریعے سیدھے راستے کی پیمائش کرے اور جس وقت میں کشتی میں سفر کروں تو لطفی بیگ ساحل دریا پیمائش کرتا چلے۔ سیدھے راستے کی پیمائش گیارہ کوس نکلی اور ساحل دریا اٹھارہ کوس۔

اگلے روز صبح ہم نے اس منزل پر توقف کیا۔ بدھ کے دن بھی ہم نے کشتی سے ہی سفر کیا اور غازی پور سے ایک کروہ نیچے پہنچ کر ہم وہاں قیام پذیر ہوئے۔ محمود خاں نوحانی اس منزل پر حاضرِ خدمت ہوا۔ اسی دن جلال خاں ولد بہار خاں بہاری، فرید خاں ولد نصیر خاں، شیر خاں سور، علاول خاں سور اور دیگر افغان امرا کی عرضداشتیں موصول ہوئیں۔ اسی روز عبدالعزیز میر آخور کی عرضداشت لاہور سے پہنچی جو اس نے بتاریخ ہشتم ماہ جمادی الآخر لکھی تھی۔ جس دن یہ عرضداشت لکھی گئی تھی اسی دن قراچہ کا وہ ہندستانی ملازم جسے کالپی کے نواح سے روانہ کیا گیا تھا، لاہور پہنچ گیا۔ عبدالعزیز نے مذکورہ عرضداشت میں لکھا تھا کہ وہ اپنے چند آدمیوں کے ہمراہ بتاریخ نو جمادی الآخر نیلاب میں میری خواتین حرم کی خدمت میں حاضر ہو جائیگا۔ عبدالعزیز ان کی معیت میں دریائے چناب تک آیا اور اس جگہ سے علیحدہ ہو کر ان سے قبل لاہور پہنچ کر اس نے وہ عرضداشت وہاں سے روانہ کی۔

بروز جمعہ کوچ کیا گیا۔ میں مثلِ سابق کشتی پر سوار ہو کر اس منزل پر پہنچا۔ جہاں اس وقت پچھلے سال سورج گرہن لگا تھا اور روزہ رکھا گیا تھا۔ چوسہ کے مقابل پہنچ کر اس جگہ کا معائنہ کیا اس کے بعد میں واپس کشتی پر سوار ہو گیا۔ محمد زمان مرزا پیچھے کشتی میں آ رہا تھا اس کے اصرار پر ہم نے معجون کی چسکیاں لیں۔ دریائے کرمناس کے کنارے لشکرگاہ کے خیمے نصب کئے گئے اور وہاں ہم قیام پذیر ہوئے۔ اس دریا کے بارے میں ہندوؤں میں طرح طرح کے توہمات ہیں۔ جس کے باعث وہ اس کو عبور کرنے سے گریز کرتے ہیں اور جو ہندو دین دھرم کو مانتے ہیں وہ اس دریا کو پار نہیں کرتے۔ البتہ وہ کشتی پر سوار ہو کر اس کے کنارے کنارے دریائے گنگا کے دہانے تک پہنچ جاتے ہیں اور وہاں سے اسے پار کرتے ہیں۔ ان کا یہ ماننا ہے کہ اگر کسی کے جسم کو اس دریا کا پانی چھو جائے تو اس کے سارے اچھے کرم ناس ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس دریا کی وجہ تسمیہ وہ یہ بتاتے ہیں اس کے پانی سے کرموں کا ناس ہو جاتا ہے۔ ہم کشتی پر سوار ہو کر دریا کی روانی کے خلاف تھوڑی دور تک گئے اور واپس آ گئے۔ دریائے گنگا کی شمالی جانب گزر کر ہم نے اس کے ساحل پر اپنی کشتیاں لگا دیں ہمارے جوانوں میں سے کچھ تو آپس میں شوخی و شرارت کرنے لگے اور بعض کشتی کرنے لگے۔ ساقی محسن کا تو یہ دعویٰ بھی تھا کہ میں چار پانچ آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کروں گا۔ ابھی اس کی پہلے ہی آدمی کے ساتھ پکڑ ہوئی تھی کہ چت ہوتے ہوتے رہ گیا۔ دوسرا آدمی شادمان تھا اس نے محسن کو چت کر دیا۔ جس کے باعث وہ جھینپ کر رہ گیا۔ اس کے علاوہ دوسرے پہلوانوں نے بھی کشتی کے داؤ پیچ دکھائے۔ اگلے دن ہفتہ تھا۔ ہم نے اس روز صبح کے وقت اس بنا پر پہلے پہر تک کوچ نہیں کیا کہ (ورق ۳۴۴) کچھ آدمیوں کو بھیج کر دریائے کرمناس کے گھاٹ کی کیفیت معلوم کر لی جائے۔ چنانچہ پہلے پہر کے ختم ہونے سے کچھ قبل ہی ہم نے کوچ کیا۔ ہم گھاٹ کی طرف پانی کے بہاؤ کے

خلاف ایک کروہ تک چلتے رہے لیکن ابھی چونکہ گھاٹ دور تھا اسی لئے میں کشتی سے واپس لشکر گاہ میں پہنچ گیا۔ لشکر کے خیمے چوسہ سے ایک کروہ آگے نکل کر نصب کر لئے گئے تھے۔ آج پھر میں نے مرچوں کا بھپارا لیا۔ اس مرتبہ مجھے بھاپ زیادہ گرم لگی۔ اور میرے بدن پر چھالے پڑ گئے۔ جس کے باعث سخت تکلیف ہوئی۔ اب ہمیں ایک چھوٹے مگر دلدلی دریا سے گزرنا تھا۔ اس پر سے گزرنے کے لئے چونکہ راستہ بنانا تھا اسی لئے ہم نے اس منزل پر توقف کیا۔

عبدالعزیز کا جو ہندوستانی پیادہ خط لے کر آیا تھا اس کا جواب میں نے پیر کی رات کو لکھ کر روانہ کیا۔ پیر کی صبح میں کشتی میں سوار ہوا۔ ہوا چلنے کے باعث کشتیوں کو بادبان اتار کر کھینا پڑا۔ گزشتہ سال اس منزل پر جو بکسر کے روبرو تھی اور جہاں کافی عرصہ تک قیام رہا تھا میں نے اس منزل کے مقابل جگہ کا معائنہ کیا۔ نیچے اترنے کیلئے دریا کے کنارے زینے لگائے گئے۔ جن کے ڈنڈے چالیس سے زیادہ اور پچاس سے کم تھے۔ ان کے دو بالائی ڈنڈے تو رہ گئے۔ باقی کو دریا کا پانی بہا کر لے گیا۔ کشتی میں پہنچ کر معجون کی چسکیاں لی گئیں۔ لشکر گاہ سے ذرا اونچی جگہ ایک جزیرے کے کنارے کشتی کو روکا گیا اور پہلوانوں سے کہا گیا کہ کشتی کے داؤ پیچ دکھائیں۔ جس جگہ ہم اس وقت قیام کئے ہوئے تھے گزشتہ سال اسی جگہ ہم نے پڑاؤ کیا تھا اور اسی جگہ سے میں نے دریائے گنگا کو تیر کر پار کیا تھا۔ کچھ لوگوں نے گھوڑوں پر اور کچھ نے اونٹوں پر سوار ہو کر اس جگہ کا معائنہ کیا (ورق ۳۴۴)۔ اس روز میں نے افیون بھی کھائی۔

اگلے روز صبح منگل کے دن کریم بردی، محمد علی حیدر رکابدار اور شیخ جیسے سرداروں کے ہمراہ دو سو عمدہ جوانوں کو روانہ کیا گیا تاکہ وہ دشمن کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں۔ اسی منزل پر بنگال کے ایلچی کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنے حکمراں کے سامنے تین باتیں رکھے۔[۵۵]

بہار پر قبضہ

بدھ کے دن یونس علی کو محمد زمان مرزا کے پاس روانہ کیا گیا کہ وہ بہار کے متعلق اس کی رائے معلوم کرے۔ جس کا جواب وہ حوصلہ شکن لے کر آیا۔ شیخ زادگان بہار کے نمائندے جو خط لے کر آئے تھے اس سے علم ہوا کہ دشمن بہار کو خالی کر کے خود کسی جانب چلا گیا ہے۔

بروز جمعرات امرائے ترک و ہند کے دو ہزار جوانوں اور ترکش برداروں کو محمد علی جنگ جنگ کے لڑکے تردی محمد کے ہمراہ کر دیا گیا اور اسے بہار کی جانب ایسے فرامین کے ساتھ جانے کے لئے رخصت کیا گیا جن سے وہاں کے لوگوں کی دلجوئی ہو سکے۔ خواجہ مرشد عراقی کو سرکار بہار کا دیوان مقرر کر کے اسے بھی تردی بیگ کے ہمراہ روانہ کیا گیا۔

اگلے دن صبح محمد زمان نے بہار کی طرف جانا قبول کر لیا۔ اس نے شیخ زین اور یونس علی کے ذریعہ بعض عرضداشت پیش کیں۔ جس میں اس نے مدد کے لئے درخواست کی تھی۔ بعض جوانوں کو اس کے تحت نافذ کیا گیا اور بعض کو اس کا ملازم مقرر کیا گیا۔

پہلی شعبان بروز ہفتہ ہم نے اس منزل سے جہاں تین چار دن تک ہمارا قیام رہا تھا کوچ کیا۔ اور میں اس دن گھوڑے پر سوار ہو کر بھوج پور اور بہیہ کا معائنہ کرنے کے لئے نکلا اور واپس لشکر گاہ میں پہنچ گیا۔ محمد علی اور وہ سردار (ورق ۳۴۵) جنہیں خبر گیری کے لئے روانہ کیا گیا تھا۔ راستے میں کفار کی ایک جماعت سے دوچار ہوئے جسے انہوں نے زیر کر لیا اور اُس جگہ پہنچ گئے جہاں سلطان محمود کی قیام گاہ تھی۔ سلطان محمود کے ساتھ دو ہزار آدمی تھے۔ جب اسے قراول دستے کی پیش قدمی کا علم ہوا تو اس کے لشکر میں ابتری پھیل گئی۔ چنانچہ پہلے تو اس نے اپنے

۵۵۔ تین باتیں کون سی ہیں یہ تفصیل کہیں نہیں۔ شاید یہ بھی وقائع کا ضائع شدہ حصہ ہے۔ صرف ایک شرط کا ذکر ورق ۳۴۶ میں آئے گا۔

ہاتھیوں کو مار گرایا اور اس کے بعد وہ وہاں سے کوچ کر گیا۔ اس نے اپنے ایک سردار کو وہاں بطور قراول رہنے دیا تھا۔ جب ہمارے جوانوں میں سے بیس آدمی اس کے پاس پہنچے تو وہ ان کی تاب نہ لا سکا اور فرار ہو گیا۔ اس کے آدمیوں میں سے چند کو ان کے گھوڑوں پر سے اتار لیا گیا۔ ایک کا سر کاٹ کر اور دو عمدہ جوانوں کو زندہ لایا گیا۔

اگلے دن ہم نے وہاں سے کوچ کیا اور میں کشتی میں سوار ہوا۔ اس منزل پر محمد زماں مرزا کو سروپا خاصہ، کمر خنجر، شمشیر اور چھتر عنایت کر کے ولایت بہار سے نوازا گیا۔ سرکار بہار کی آمدنی میں سے ایک کروڑ پچیس لاکھ کی رقم بطور خالصہ مخصوص کی گئی اور عہدہ دیوانی مرشد عراقی کے سپرد کر دیا گیا۔

بروز جمعرات اس منزل سے کوچ کیا گیا اور میں کشتی میں سوار ہوا۔ تمام کشتیوں کو روک لینے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو حکم دیا کہ کشتیوں کو روانہ کر کے انہیں ایک دوسرے سے متصل رکھا جائے۔ اگرچہ تمام کشتیاں وہاں جمع نہیں ہوئی تھیں۔ مگر جتنی بھی تھیں دریا کی چوڑائی سے زیادہ تھیں۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ دریا میں بعض جگہیں پست تھیں، بعض گہری، کچھ جگہوں پر پانی کی روانی تھی اور کچھ جگہوں پر ٹھہراؤ، اسی باعث ان کے ذریعے بہت دور تک جایا جا سکتا تھا۔ وہاں ایک گھڑیال بھی نظر آیا۔ اس نے ایسی اونچی جست لگائی کہ ایک کشتی میں آن گرا۔ اس کو پکڑ کر میرے سامنے لایا گیا۔

آسائش، آرائش و گنجائش

جس وقت ہم منزل پر پہنچے تو کشتیوں کے نام رکھے گئے۔ وہ بڑی "بابری" کشتی جس کی تکمیل رانا سانگاہ کے ساتھ دینی جنگ سے قبل ہوئی تھی اب اس کا نام "آسائش" رکھا گیا۔ اسی سال آرائش خان نے ایک کشتی بنوائی تھی جو اس نے لشکر روانگی سے پہلے مجھے پیش کر دی تھی۔ اس پر میں نے عرشہ بنوایا اور حکم دیا گیا کہ اس کے اوپر مزید ایک عرشہ بنایا جائے۔ اس کا نام "گنجائش" رکھا گیا۔ ایک چھوٹی چوکھنڈی دار کشتی جو ہر کام اور مہم کے لئے بھیجی جاتی تھی اس کا نام "فرمائش" رکھا گیا۔

اگلے دن صبح بروز جمعہ کوچ کیا گیا۔ جب محمد زمان مرزا کے تمام کار و امور تکمیل پذیر ہو گئے۔ وہ بہار کی جانب جانے کے ارادے سے ہماری لشکر گاہ سے ایک دو کروہ دور ہو کر قیام پذیر ہوا۔ اسی دن وہ حاضر خدمت ہوا اور رخصت ہونے کی مجھ سے اجازت چاہی۔ دو جاسوس بنگال کے لشکر سے آئے انہوں نے بتایا کہ بنگالیوں نے مخدوم عالم کی زیر قیادت دریائے گندک[56] پر چوبیس جگہ مدافعتی رکاوٹیں اٹھالی ہیں۔ جو افغان اپنے اہل و عیال کو دریا کے دوسرے کنارے پر بھیجنا چاہتے تھے۔ وہ ان کے دریا عبور کرنے میں مانع ہوئے اور انہیں اپنا ہموا کر لیا ہے۔ جیسے ہی یہ خبر پہنچی جنگ کے امکان کے تحت میں نے محمد زمان مرزا کو جانے سے روکا اور شاہ سکندر کو تین چار سو افراد کے ہمراہ بہار کی (ورق ۳۳۶) جانب روانہ کیا۔

ہفتے کے دن ایک شخص دودو بی بی[57] اس کے بیٹے جلال خان ولد بہار خان کی طرف سے آیا۔ بنگالی انہیں آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ اس نے مجھے بتایا کہ انہوں نے بنگالیوں کے ساتھ جنگ کے بعد خود کو علیحدہ کر لیا ہے۔ وہ دریا کو پار کر کے بہار کے نواح میں پہنچ گئے ہیں اور میرے پاس آ رہے ہیں۔

اسی دن سفیر بنگال اسماعیل میتا کو یہ فرمان دیا گیا:

"اس سے قبل لکھ کر بھیجا جا چکا ہے کہ تین شرطیں ہیں ان کا جواب آنے میں تاخیر ہو رہی ہے"۔

وہ خط لکھ کر بھیجے اور یہ معلوم کرے کہ اگر بنگالی اخلاص و اتحاد کی راہ پر ہیں تو اس کا جواب وہ جلدی دیں۔

اتوار کی رات ایک شخص تردی محمد اور جنگ جنگ کی جانب سے آیا اور اس نے بتایا کہ بدھ کے دن پانچ

۵۶۔ دریائے گندک۔ یہ دریا پٹنہ پر گنگا سے آکر ملتا ہے۔

۵۷۔ دودو بی بی۔ بہار خاں نے سلطان محمد کا لقب اختیار کر کے بہار پر حکومت کی تھی۔ اس کے انتقال کے بعد اس کی بیوی اور بیٹے جلال خاں کے سرپرست فرید خاں (شیر شاہ) ہو گئے تھے (حسین خاں، شیر شاہ سوری ص ۶۸) یہ پانسا بھی فرید خاں کا پھینکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

شعبان اس وقت جب کہ ان کے قراول بہار پر پیشقدمی کر رہے تھے تو بہار کا شقدار دوسرے دروازے سے نکل کر فرار ہو گیا۔

اتوار کے دن اس منزل سے کوچ کر کے ہم پرگنہ آری میں قیام پذیر ہوئے۔ اس منزل پر معلوم ہوا کہ دریائے گنگا اور گھاگر کے سنگم پر پرگنہ خرید کے لشکر کو سو سے ڈیڑھ سو کشتیوں نے اس پار پیشقدمی سے روک دیا ہے۔ چونکہ بنگالیوں کے ساتھ مصالحت پسندانہ مراسم تھے اسی لئے اس قسم کے معاملات میں صلح کو پہلو کو ہی پیش نظر رکھا گیا۔ اگرچہ اس نے راستہ روک کر گستاخی کی تھی لیکن جو دستور ہمیشہ سے چلا آ رہا تھا اسے ملحوظ رکھ کر بنگال کے ایلچی اسمٰعیل میتا کو ملا محمد مذہب کے ساتھ روانہ کیا گیا اور ان پہلی تین باتوں کو بتایا گیا جو پہلے مقرر ہو چکی تھیں اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایلچی کو رخصت ہونے کی اجازت دی جائے۔ پیر کے دن بنگال کا ایلچی حاضر خدمت ہوا اسے رخصت ہونے کی اجازت دی گئی۔ اس سے یہ بھی کہلوا دیا گیا کہ دشمن کی سرکوبی کے لئے دریا کے اس پار ہو یا اس پار میں رخ کروں گا۔ اس خطۂ زمین اور پانی کو جو تجھ سے متعلق ہے اسے کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ جو تین شرطیں رکھی گئی تھیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ خرید کے لشکر سے کہدے کہ وہ راستے سے ہٹ جائے اور واپس خرید چلا جائے۔ اس کے لشکر کے ساتھ ہم چند ترک بھی ہمراہ کریں گے تا کہ وہ خرید کے لوگوں کو تسلّی اور دلاسا دے سکیں اور انہیں ان کے ٹھکانوں پر پہنچا دیں۔ اگر وہ گھاٹ کو خالی نہیں کرے گا اور ان انہونی باتوں سے باز نہیں آئے گا تو جو بلا بھی اس کے سر پر آئے گی اس کا وہ خود ہی ذمہ دار ہوگا اور جو ناخوشگوار حادثہ رونما ہوگا۔ اس کا سبب اس کا اپنا ہی قول ہوگا۔

بدھ کے دن بنگال کے ایلچی اسماعیل میتا کو مروّجہ خلعت پہنا کر اور انعام سے نواز کر رخصت ہونے کی جازت دی گئی۔ جمعرات کے دن شیخ جمالی کو دو دو بی بی اور اس کے بیٹے جلال خان کی دلجوئی کی خاطر فرامین اور زبانی پیغام لطف و عنایت کہلوا کر روانہ کیا گیا۔ اسی روز ماہم کا ملازم بھی حاضر ہوا۔ باغ صفا کی دوسری جانب واقع وارلی[58] سے روانہ ہوا تھا اور خطوط لے کر آیا تھا۔

پیر کے دن عراق (عجم) کے ایلچی مراد قورچی قجر سے ملاقات کی گئی۔

اتوار کے دن ملا محمد مذہب کو یادداشتیں دے کر رخصت ہونے کی اجازت دی گئی۔

پیر کے دن خلیفہ اور بعض امرا کو بھیجا گیا کہ دیکھیں کہ دریا کو کس جگہ سے عبور کرنا ہے۔

بدھ کے دن خلیفہ کو دوسری مرتبہ دوآبہ دیکھنے کے لئے بھیجا گیا۔ (ورق ۳۴۷)

کنول کے باغ

آری کے نزدیک جنوبی سمت کنول کے باغ کا معائینہ کرنے کے لئے گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ جس وقت میں کنولوں کا معائینہ کر رہا تھا تو شیخ گھورن کچھ کنول کے بیج لے کر حاضر ہوا۔ جو شکل میں پستے سے مشابہ تھے۔ وہ گلشن بھی کتنا حسین ہے جہاں کنول ہوں۔ اس ڈنٹھل کو جس پر کمل کھلتا ہے ہندوستان میں کمل ککڑی کہتے ہیں، بیج ڈوڈا کہلاتا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ دریائے سون[59] نزدیک ہی ہے۔ چنانچہ اس جگہ تفریح کرنے کے لئے ہم روانہ ہوئے۔ دریائے سون میں کچھ آگے کافی درخت دکھائی دیئے۔ لوگوں نے بتایا کہ اس جگہ کو منیر کہتے ہیں۔ شیخ شرف الدین منیری[60] کے والد شیخ یحییٰ کی قبر اسی جگہ ہے۔ ہم اس کے نزدیک دریائے سون کو عبور کر کے دو تین کروہ نیچے چل کر منیر پہنچ گئے۔ میں نے اس جگہ کا معائینہ کیا۔ وہاں کے باغات سے گزر کر مزار کا طواف کیا۔ دریائے سون کے کنارے پہنچ کر غسل کیا اور نماز ظہر قبل از وقت ادا کر کے لشکر گاہ کی جانب رخ کیا۔ کچھ گھوڑے اتنے موٹے ہو گئے تھے کہ ان میں سے کچھ تو پیچھے رہ گئے اور کچھ تھک گئے انہیں جمع کر کے لانے

۵۸۔ وارلی۔ کسی مخطوطے میں بھی یہ لفظ صاف لکھا ہوا نہیں ہے۔

۵۹۔ دریائے سون۔ یہ دریا جنوب کی طرف سے آ کر پٹنہ سے پہلے گنگا میں ملتا ہے۔

۶۰۔ شیخ شرف الدین منیری۔ آپ ہندستان کے مشہور مشائخ میں شامل ہیں۔ آپ کے ''مکتوبات'' لطافت و شیرینی کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ آپ خواجہ نظام الدین سے بیعت کے لئے دہلی جا رہے تھے کہ خواجہ نظام الدین کا انتقال ہو گیا۔ وہاں شیخ نجیب الدین موجود تھے جن سے آپ بیعت ہوئے۔ واپسی میں آگرہ کے جنگلوں میں کئی برس عبادت الٰہی میں مشغول رہے (پیدائش ۶۸۵/۱۲۸۶ وصال ۷۵۶/۱۳۵۵) (شیخ عبدالحق محدث، اخبار الاخیار ص ۲۵۱)

آپ بہار کے مشہور و معروف صوفی ہیں۔ آپ کا مطالعہ وسیع تھا۔ اپنے فتاویٰ میں عوام کی آسانی کا خاص خیال رکھتے تھے آپ کا سلسلہ فردوسی کہلاتا ہے (اقتدار حسین صدیقی، درٹرول، مسلم شرائنزان انڈیا ص ۲۶۲)

آپ کا مزار بہار شریف میں ہے۔ منیر میں آپ کے والد شیخ عیسیٰ منیری کا مزار ہے جو بڑی درگاہ کہلاتا ہے۔ ایک چھوٹی درگاہ بھی منیر میں ہے جو عمارتی لحاظ سے بڑی ہے اور شیخ کے جانشین شاہ دولت کی ہے جن کا انتقال ۱۰۱۷/۱۶۰۹ میں ہوا (جیکسن، درٹرول، مسلم شرائنزان انڈیا ص ۹۸)

لئے کچھ لوگوں کو پیچھے چھوڑ دیا اور کہا کہ ان کو ستانے اور دم لینے کے بعد آنے میں عجلت سے کام نہ لیں۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو بہت سے گھوڑے تلف ہو جاتے۔ منیر سے آتے ہوئے میں نے حکم دیا کہ ایک شخص دریائے سون کے کنارے لشکرگاہ تک کا فاصلہ گھوڑوں کے قدموں سے ناپے۔ تیئیس ہزار ایک سو (۲۳۱۰۰) قدم گنے گئے جس کے دگنے چھیالیس ہزار دو سو (۴۶۲۰۰) قدم[۶۱] اور ساڑھے گیارہ کروہ کے برابر فاصلہ ہوا اور منیر سے سون تک آدھ کروہ۔ اس بنا پر ہمارے واپس آنے کا راستہ بارہ کروہ ہوا۔ معائنہ کرتے وقت اِدھر اُدھر جانے کا اتفاق ہوا۔ گویا پندرہ سولہ کروہ ہم نے سفر کیا۔ اس اعتبار سے اس دن ہمارا سفر تیس کروہ ہوا۔ رات کے اوّل پہر کی اس وقت چھٹی گھڑی تھی جبکہ ہم لشکرگاہ میں پہنچے۔

اگلے دن صبح جمعرات جونپور سے سلطان جنید برلاس اور وہ جوان جو اس طرف گئے تھے واپس آ گئے۔ وہ چونکہ وہاں بہت عرصے تک رہے تھے اس لئے میں ان کے ساتھ درشتی سے پیش آیا اور انہیں باریاب نہیں ہونے دیا۔ قاضی جیا سے مل لیا۔

جنگ کا لائحہ عمل

اسی دن میں نے امرائے ترک و ہند کو مشورے کے لئے طلب کیا اور ان کے ساتھ دریا عبور کرنے کے بارے میں مشورہ کیا گیا۔ بات یہ طے پائی کہ استاد علی قلی ان بلند مقامات پر جو دریائے گنگا اور گھاگر کے درمیان ہیں توپیں، منجنیق، اور غلیلیں نصب کر کے تفنگ اندازوں کی مدد سے میدان کارزار گرم کرے۔ سنگم سے ذرا نیچے اس جزیرے کے مقابل جہاں ایک ہاتھی اور بہت سی کشتیاں جمع ہیں وہاں بہار کی جانب مصطفیٰ آلات جنگ فراہم کر کے جنگ میں مشغول ہو جائے۔ اس کے ساتھ کثیر تعداد میں تفنگ انداز بھی رہیں۔ محمد زمان مرزا اور وہ سپاہی جن کے نام اس مہم کے لئے درج کئے گئے ہیں وہ مصطفیٰ کے عقب میں پہنچ کر گھوڑوں پر سے اس کی مدد کے لئے آ جائیں اور اس طرح اتر کر وہ استاد علی قلی اور مصطفیٰ کے مددگار معاون ثابت ہوں۔ استاد علی قلی اور مصطفیٰ (ورق ۳۴۸) سنگ انداز اور توپیں نصب کرنے کے لئے مورچہ لگائیں۔ جگہ تیار کرنے کے لئے بیلداروں اور کہاروں پر بہت سے کارندے مقرر کئے گئے جو ساز و سامان اور مال اور اسباب جمع کرنے کے کام میں لگ گئے۔ عسکری اور سلاطین و خوانین جن کے نام اس کام کے لئے درج کئے گئے تھے انہیں ہدایت کی گئی کہ دریائے گھاگر کو اس وقت جب کہ مورچہ بندی کا سامان مکمل و مستعد ہو جائے تو تیزی کے ساتھ عبور کر کے دشمن کے سر پر آن پہنچیں۔

اسی اثنا میں سلطان جنید اور قاضی جیا نے عرض کیا کہ یہاں سے آٹھ کروہ اوپر ایک گھاٹ ہے۔ چنانچہ روے زرد نامی شخص کو اس کام کے لئے مقرر کیا گیا کہ وہ بیڑہ بانوں میں سے ایک دو آدمیوں کو ساتھ لے کر جائے اور اس گھاٹ کا جائزہ لے۔ اگر وہ گھاٹ قابل گزر ہوا تو وہاں سے دریا عبور کر لیا جائے۔ ہمارے آدمیوں کے درمیان یہ چرچا ہو رہا تھا کہ بنگالیوں کا ارادہ ہے کہ وہ ہلدی گھاٹ پر اپنے آدمی متعین کریں کہ اسی اثنا میں محمود خاں شقدار کی یہ عرضداشت سکندرپور سے موصول ہوئی کہ میں نے ہلدی گھاٹ پر پچاس کشتیاں جمع کر لی ہیں۔ لیکن کشتی بان یہ افواہ سن کر کہ بنگالی آ رہے ہیں بہت زیادہ سراسیمہ ہو گئے ہیں۔

دریائے گھاگر پر گھاٹ تلاش کرنے میں چونکہ دقت پیش آ رہی تھی اس لئے ان لوگوں کی آمد کا انتظار کئے بغیر جو گھاٹ کی تلاش میں گئے تھے میں نے بروز ہفتہ امرا کو مشورے کے لئے طلب کیا اور ان سے کہا کہ سکندرپور میں واقع چترکھ سے اودھ اور بہرائچ تک دریائے گھاگر پر بہت سے گھاٹ ہیں۔ ہم یہاں بیٹھے بیٹھے ہی بہت سی فوج اس مقصد کے لئے متعین کر سکتے ہیں۔ وہ ہلدی گھاٹ سے گزر کر دشمن پر حملہ آور ہو جائے۔ تاکہ

۶۱۔ گھوڑے کے قدم۔ یعنی گھوڑے کا ایک قدم انسان کے دو قدم کے برابر ہوتا ہے۔

ان کے پہنچنے تک استاد علی قلی اور مصطفیٰ توپ وتفنگ، ضرب زن اور سنگ انداز کے ذریعے انہیں جنگ میں لگائے رکھیں اور اس طرح دشمن کو میدان میں نکال لائیں اور ہم دریائے گنگا عبور کر کے استاد علی قلی کو کمک پہنچا کر اور مکمل طور پر مستعد و آمادہ ہو کر اپنی جگہ قائم رہیں اور جب فوج گھاٹ پر سے گزر کر دشمن کے نزدیک پہنچ جائے تو ہم بھی اس طرف سے پوری قوت سے زور آزمائی کر کے جنگ شروع کر دیں۔ محمد مصطفیٰ مرزا اور وہ لوگ جو دریائے گنگا کے نزدیک ہیں۔ نبرد آزما ہو جائیں۔

جب یہ بات متفقہ طور پر منظور ہو گئی تو اس لشکر کو جو دریائے گنگا کے شمال میں تھا چار حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ عسکری کو سردار فوج مقرر کر کے اسے ہلدی گھاٹ کی جانب روانہ کیا گیا۔ عسکری کی ایک فوج کو اس کے ملازمین کے ہمراہ، دوسری کو سلطان جلال الدین شرقی کی زیر نگرانی، ایک فوج کو سلاطین ازبک قاسم حسین، بیخوب سلطان، تانگ اتمش سلطان، محمود خاں نوحانی غازی پوری، کوکی باباتشقہ، قرمیش ازبک، قربان چرخی اور حسین خاں دریاخانی کی زیر قیادت اور ایک فوج کو موسیٰ سلطان اور جنید سلطان برلاس کی تحویل میں دیا گیا۔ اس کے ساتھ تقریباً بیس ہزار کارندے اس کام کے لئے مقرر کئے گئے کہ اسی رات یعنی اتوار کی رات کو وہ سارے لشکر کو گھوڑوں پر سوار کرا دیں۔

اتوار کی صبح لشکر دریائے گنگا سے گزرنا شروع ہوا۔ میں نے پہلے پہر کے وقت کشتی میں سوار ہو کر دریا کو عبور کیا۔ سہ پہر کا وقت تھا (ورق ۳۴۹) کہ روئے زرد اور وہ لوگ جو گھاٹ کا معائینہ کرنے گئے تھے واپس آ گئے۔ انہیں گھاٹ تو نظر نہیں آیا البتہ وہ یہ خبر لے کر آئے کہ انہوں نے دشمنوں کی کشتیوں اور معینہ فوج کو راستے میں دیکھا ہے۔

منگل کے دن دریا پار کر کے جس جگہ ہم اترے تھے وہاں سے ہم نے کوچ کرنا شروع کیا اور میدان کار زار سے ایک کروہ کے فاصلے پر جو سنگم کے نزدیک تھا قیام پذیر ہوئے۔ میں نے خود جا کر استاد علی قلی کے تیار کردہ سنگ انداز اور ضرب زن کو ملاحظہ کیا۔ اسی دن اس نے سنگ اندازی کے ذریعے دو کشتیوں کو توڑ کر انہیں غرقاب کر دیا۔ وہ بڑی توپ کو میدانِ جنگ میں لے کر پہنچ گیا۔ اس کے نصب کرنے کیلئے اس نے ملاّ غلام نامی کارندے کو مقرر کر کے کچھ ہرکاروں اور چست جوانوں کو مدد کے لئے متعین کیا اور واپس آ گیا اور اس جزیرے میں پہنچ کر جو لشکرگاہ کے مقابل تھا ہم معجون کی چسکیوں سے لطف اندوز ہونے لگے۔ اس رات میں معجون کے نشے میں مسرور تھا۔ کشتی کو لے کر اپنے خیمے کے نزدیک لا کر وہیں ٹیک لگا کر سو رہا۔

کشتی میں حملہ آور

اس رات عجیب واقعہ پیش آیا۔ تیسرے پہر کا وقت تھا کہ کشتی میں شور وغوغا بپا ہونے لگا۔ پیادہ جوانوں میں سے ہر ایک نے اپنے ہاتھ میں کشتی کے تختے اٹھا رکھے تھے اور چلا رہے تھے کہ "مارو، مارو"۔ اس وقت میں "فرمائش" نامی کشتی میں سو رہا تھا۔ یہ کشتی اس وقت "آسائش" نامی کشتی کے پہلو میں ہی تھی۔ رات کا چوکیدار اس وقت فرمائش کشتی میں تھا۔ اس کی سوتے سوتے جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ کسی شخص نے آسائش کشتی پر ہاتھ ڈالا ہے اور اس میں گھس آنا چاہتا ہے۔ چوکیدار نے اس کے سر پر پتھر مارا اور وہ شخص غوطہ لگا کر پانی میں اتر گیا اس کے بعد اس نے پھر سر ابھارا اور چوکیدار کے سر پر تلوار سے وار کیا جس کے باعث اس کے سر پر ہلکا سا زخم آ گیا۔ وہ پھر پانی میں چھلانگ لگا کر بھاگ نکلا۔ اس تمام شور وغوغا کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس رات جب ہم مانیر سے آ رہے تھے ایک دو چوکیداروں نے ہماری کشتی کے پاس سے کچھ ہندوستانیوں کو پرے بھگا دیا تھا اور ان کی تلواریں اور خنجر چھین لئے تھے۔ خداوند تعالیٰ نے محفوظ رکھا۔

اگر تیغ عالم بجنبد ز جای | نبرد رگی تا نخواهد خدای
گر تیغ عالم چلتی چلی جائے | رگ بھی نہ کٹے گر خدا نہ چاہے

جنگ کی تفصیلات

اگلے دن صبح بروز بدھ میں ''گنجائش'' نامی کشتی کی طرف گیا اور اس جگہ پہنچا جہاں سے پتھر پھینکے جا رہے تھے۔ اس کے قریب پہنچ کر ہر شخص کو کسی نہ کسی کام پر لگا دیا۔

اوغان تردی مغل کی زیر قیادت ایک ہزار کی تعداد میں جوان روانہ کئے گئے۔ دو تین کروہ دریا کے بہاؤ کے خلاف چل کر انہوں نے کسی نہ کسی طرح دریا کو پار کر لیا۔ جس وقت وہ عسکری کی لشکر گاہ کے مقابل سے گزر رہے تھے تو انہوں نے بیس تیس بنگالیوں کی کشتیاں دیکھیں۔ جب کشتیاں دوسرے کنارے پر لگ گئیں تو ان میں سے بہت سے بنگالی اترے اور چاہا کہ غارتگری اور راہزنی کریں کہ اسی اثنا میں ہمارے جوان پہنچ گئے اور چونکہ یہ گھوڑوں پر سوار تھے اس لئے انہیں مار بھگایا۔ جن میں سے کچھ کو انہوں نے پکڑ کر ان کے سر کاٹ لئے۔ بہت سے لوگوں پر تیر اندازی کر کے ان سے سات آٹھ کشتیاں چھین لیں۔ اسی دن بنگالی کچھ کشتیاں ساتھ لے کر محمد زمان مرزا کی جانب بڑھے اور جنگ کرنے کو تیار ہوئے۔ اس طرف سے ہمارے آدمیوں نے زور آزمائی کر کے بنگالیوں کو بھگا دیا اور آدمیوں سے بھری ان کی تین کشتیوں کو غرق کر دیا۔ ایک کشتی کو وہ گھیر کر میرے سامنے لائے (ورق ۳۵۰)، یہاں بابا چھورہ نے خوب مردانگی کے جوہر دکھائے اور اچھی زور آزمائی کی۔

حکم دیا گیا کہ ان سات آٹھ کشتیوں کو لے کر جو اوغان تردی اور اس کے آدمیوں نے پکڑی تھیں محمد سلطان، یکہ خواجہ، یونس علی، اوغان تردی اور وہ دستہ جسے اس سے پیشتر دریا عبور کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا رات کی تاریکی میں بہاؤ کے خلاف لے جا کر دوسرے کنارے پر پہنچ جائیں۔

اسی دن عسکری کی طرف سے آدمی آیا جس نے یہ بتایا کہ عسکری نے دریا پار کر لیا ہے اور کوئی چیز پیچھے نہیں چھوڑی ہے۔ اگلے دن صبح یعنی بروز جمعرات وہ دشمن پر حملہ آور ہوگا۔ حکم دیا گیا کہ وہ لوگ جو دریا عبور کر چکے ہیں عسکری کے ہمراہ ہو کر دشمن پر یلغار کریں۔ ظہر کے وقت استاد علی قلی کی جانب سے ایک شخص آیا اور بتایا کہ گولے تیار کئے جا چکے ہیں۔ بس حکم کی دیر ہے۔ یہ حکم دیا گیا کہ ان گولوں کو تو وہ برسا دے اور میرے پہنچنے تک وہ مزید گولے تیار رکھے۔ ظہر کے وقت میں بنگالی ڈونگی میں سوار ہوا اور اس جگہ پہنچ گیا جہاں مورچہ بندی کی گئی تھی۔ استاد علی قلی نے ایک مرتبہ تو بڑا گولہ پھینکا۔ اس کے بعد اس نے چند غلولے برسائے۔ بنگالی تو آتش بازی کے لئے مشہور رہے ہیں۔ جس کا ہمیں اب تجربہ ہوا۔ ایک جگہ نشانہ نہیں بناتے بلکہ اٹکل پچو پھینکتے رہتے ہیں۔ اسی دن ظہر کے وقت یہ حکم دیا گیا کہ کچھ کشتیاں لے کر دریائے گھاگر کے اس پار چلے جائیں اور انہیں اسی جگہ لگا دیں جہاں وہ پہلے تھیں۔ کشتی بانوں نے بلاخوف و خطر بیس کشتیاں دریا کے اس پار پہنچا دیں۔ حکم دیا گیا کہ ایشان تیمور سلطان، توختہ بوغا سلطان، بابا سلطان، آرائش خاں اور شیخ گھورن اس جگہ پہنچ جائیں جہاں یہ کشتیاں لے جائی گئی ہیں اور ان کی حفاظت کریں۔ وہاں سے واپس آ کر پہلے پہر میں لشکر گاہ میں پہنچ گیا۔ نصف شب کے قریب ان کشتیوں کی جانب سے جو بہاؤ کے خلاف اوپر لے جائی گئی تھیں یہ خبر آئی کہ وہ فوج جو اس مہم پر متعین کی گئی تھی آگے روانہ ہو گئی ہے۔ ہم بھی اپنی کشتیوں کو بہاؤ کے خلاف اوپر کی جانب رکھے رہے کہ بنگالیوں کی کشتیوں نے ہمیں اک تنگ جگہ گھیر لیا اور جنگ شروع کر دی۔ ایک کشتی بان کی ٹانگ پر پتھر آ کر لگا اور اس کو توڑ دیا۔ ہم دریا عبور نہ کر سکے۔

جمعرات کے دن صبح کے وقت مورچے کے آدمیوں کی طرف سے یہ خبر آئی کہ وہ کشتیاں جو بہاؤ کے خلاف اوپر آرہی تھیں سب پہنچ گئی ہیں۔ ان کے تمام گھڑسوار اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوگئے اور ہماری فوج کے روبرو آگئے جو پیشقدمی کر رہی تھی۔ میں بھی تیزی سے سوار ہوا اور ان کشتیوں کی جانب پہنچ گیا جنہیں گزشتہ شب پار پہنچا دیا گیا تھا۔ ایک شخص کو دوڑایا گیا کہ وہ محمد سلطان مرزا اور اس دستے کو جسے دریا پار کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا جا کر یہ بتائے کہ بلا توقف دریا کو عبور کر کے عسکری کے ساتھ جا ملیں۔ ایشان تیمور سلطان اور توختہ بوغا سلطان جن کشتیوں پر مقرر تھے انہیں حکم دیا گیا کہ وہ دریا پار کرنے میں لگ جائیں۔ بابا سلطان کو جس جگہ مقرر کیا گیا تھا وہ وہاں نہیں پہنچا۔

ایشان تیمور سلطان نے ایک کشتی میں اپنے تیس چالیس آدمیوں کو سوار کیا اور اس کے پہلو میں اپنے گھوڑوں کو رکھ کر اسی طرح دریا کے پار پہنچے۔ ان کے عقب میں مزید ایک کشتی روانہ ہوئی جب بنگالیوں نے انہیں دیکھا تو ان کے بہت سے پیادہ آدمی ان کی جانب بڑھے۔ ایشان تیمور سلطان کے سات آٹھ آدمی گھوڑوں پر سوار ہوئے اور ان پیادہ لوگوں کے مقابل (ورق ۳۵۱) پہنچ گئے۔ جب تک وہ اپنے گھوڑوں پر سوار ہوں انہوں نے ان کے ساتھ چپقلش شروع کر دی اور انہیں دھکیلتے ہوئے سلطان کی طرف لے آئے۔ اس وقت تک ایشان تیمور سلطان بھی گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا اور دوسری کشتی بھی دریا کے اس پار پہنچ گئی تھی۔ اس نے اپنے تیس پینتیس آدمیوں کے ساتھ پیادہ لوگوں پر حملہ کر کے انہیں بھگا دیا۔ یہ واقعی ایک نمایاں کام تھا جو اس نے انجام دیا۔ مرحلۂ اوّل جو اس نے سر کیا وہ یہ تھا کہ بڑی پھرتی اور چالاکی سے بلا خوف و خطر وہ سب سے پہلے دریا کے پار پہنچ گیا اور دوسرا یہ مرحلہ اس نے سر کیا کہ اپنے چند لوگوں کی مدد سے بہت سے لوگوں کو اس نے بھگا دیا۔ توختہ بوغا سلطان نے بھی دریا عبور کر لیا۔ کشتیاں بھی پے در پے گزرنے لگیں۔ لاہوری اور ہندوستانی جہاں بھی تھے ان میں سے بعض ہاتھ مار کر تیرتے ہوئے اور بعض بانسوں کا گٹھا بنا کر اس کے سہارے دریا کے پار پہنچنے لگے۔

جب بنگالیوں نے یہ کیفیت دیکھی تو انہوں نے مورچے کے سامنے اپنی کشتیوں کا رخ پانی کے بہاؤ کی طرف کر کے بھاگنا شروع کر دیا۔ درویش محمد ساربان، دوست ایشک آغا۔ نور بیگ اور دیگر جوانوں نے دریا کو مورچے کے سامنے سے عبور کیا۔ میں نے سلطان کے پاس آدمی دوڑایا اور اسے ہدایت کی کہ جو لوگ دریا کے اس پار پہنچ گئے ہیں وہ انہیں اچھی طرح جمع کرے اور وہ فوج جس نے پیشقدمی کی ہے جب آگے آجائے تو اس کے پہلو سے گزر کر دشمن پر یلغار کر دے۔ چنانچہ سلاطین نے ان لوگوں کو جو دریا کے پار پہنچ گئے تھے اپنے گرد جمع کیا اور تین چار گروہوں میں تقسیم ہو کر دشمن کی جانب روانہ ہوئے۔ جیسے ہی یہ نزدیک پہنچے تو غنیم نے اپنی پیادہ فوج کو آگے بڑھایا۔ جو راستے میں آرام کئے بغیر ہی مسلسل آگے بڑھتی رہی۔ جو فوج عسکری کے ہمراہ مقرر کی گئی تھی اس میں سے کوکی اپنے دستے کو لے کر وہاں پہنچ گیا اور اس طرف سے سلاطین نے وہاں پہنچ کر دست بدست جنگ شروع کر دی انہوں نے دشمن کے آدمیوں کو ان کے گھوڑوں پر سے اتارا اور انہیں گرفتار کر کے آگے روانہ ہوگئے۔ کوکی نے بسنت راؤ کافر کو جس کا شمار معتبر لوگوں میں ہوتا تھا پکڑ لیا اور اس کو اس کے گھوڑے پر سے اتار کر اس کا سر کاٹ لیا اس کے دس پندرہ آدمی کوکی پر ٹوٹ پڑے اسے اسی جگہ انہوں نے مار ڈالا۔ توختہ بوغا سلطان اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا دشمن کے مقابل پہنچ گیا۔ جہاں اس نے تلوار کے خوب جوہر دکھائے۔ دوست ایشک آغا نے بڑھ کر خوب تلوار کے وار کئے۔ مغل عبدالوہاب اور اس کے برادر خورد نے بھی شمشیر زنی کی۔ مغل کو اگرچہ تیرنا نہیں آتا لیکن وہ زرہ بکتر پہنے پہنے ہی اپنے گھوڑے کی ایال [۶۲] پکڑ کر دریا پار کر گیا۔ میری کشتیاں عقب میں تھیں۔ میں نے ایک شخص کو کشتیوں کی طرف روانہ کیا۔ فرمائش نامی کشتی سب سے پہلے آگے آئی۔ میں اس پر سوار ہوا۔ دریا کے اس پار پہنچ کر بنگالیوں کے ٹھکانوں کا معائنہ کر کے گنجائش نامی کشتی میں پہنچ گیا اور اسے

۶۲۔ ایال۔ گھوڑے کی گردن کے بال۔

بہاؤ کے خلاف کھینچنے کے لئے کہا۔ جس پر میر محمد مانجھی نے عرض کیا بہتر یہی ہے کہ اسی جگہ سے دریا کو پار کیا جائے۔ حکم دیا گیا کہ لشکر کے لوگ اس جگہ سے دریا کو عبور کریں جہاں سے اس نے دریا پار کرنے کو کہا ہے۔ جس وقت محمد سلطان مرزا اور سرداران لشکر کو دریا پار کرنے کا حکم دیا گیا اور وہ اس پار جا رہے تھے کہ اچانک خواجہ یکہ کی کشتی ڈوب گئی اور خواجہ غریق رحمت ہوا۔ اس کے ملازمین اور ولایت اس کے برادر خورد قاسم کو عنایت کر دی گئی۔

ظہر کے وقت جب کہ میں غسل کر رہا تھا سلاطین حاضر خدمت ہوئے۔ میں نے ان کی تعریف و ستائش کے بعد انہیں انعام و اکرام کا امیدوار قرار دیا۔ عسکری بھی اسی اثنا میں وہاں پہنچ گیا۔ اس نے یہ معرکہ پہلی مرتبہ سر کیا تھا اور یہ اس کے لئے ایک نیک شگون تھا۔ (ورق ۳۵۲) لشکر گاہ کے خیمے چونکہ ابھی دریا پار نہیں پہنچے تھے اسی لئے میں نے ایک جزیرے کے کنارے ''گنجائش'' کشتی میں رات بسر کی۔ بروز جمعہ دریائے گھاگر کے شمال میں خرید کے تابع پرگنہ نرہن کے کونڈیہ نامی گاؤں میں ہم قیام پذیر ہوئے۔

شاہ محمد بن معروف

اتوار کے دن کوکی ایک دستے کے ہمراہ معلومات کے لئے حاجی پور بھیجا گیا۔ شاہ محمد بن معروف کو جب وہ گزشتہ سال آیا تھا میں نے بہت مراعات دی تھیں اور ولایت سارن عطا کی تھی۔ جس وقت سلطان محمود نے بہار پر قبضہ کیا تو بتن اور شیخ بایزید اس کی سرکوبی کے لئے گئے مگر وہ ان کے ساتھ ہو گیا ان چند دنوں کے دوران اس کی عرضداشتیں کئی مرتبہ موصول ہوئیں۔ اگرچہ لوگ اس کے بارے میں اول فول باتیں بنا رہے تھے لیکن جیسے ہی عسکری نے ہلدی گھاٹ پار کیا وہ اپنے دستے کے ساتھ اس سے ملاقات کرنے کے لئے پہنچ گیا اور اس کے ہمراہ بنگالیوں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہو گیا۔ وہ حاضر ہوا اور خدمت بجا لایا۔ ان دنوں بتن اور شیخ بایزید کی طرف سے متواتر خبریں آ رہی تھیں کہ ان کا ارادہ دریائے گھاگر کو عبور کرنے کا ہے۔

حکیم و مریض ایک دن میں رخصت

انہی دنوں سنبھل سے عجیب خبر آئی۔ علی یوسف جو وہاں نظم و نسق انجام دینے کے لئے مقیم تھا اور اس کا ایک مصاحب جو طبیب بھی تھا ایک ہی دن میں خدا کو پیارے ہو گئے۔ وہاں کا نظم و نسق برقرار رکھنے کے لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ عبداللہ کو وہاں بھیجا جائے۔

پانچ رمضان بروز جمعہ عبداللہ کو سنبھل کی طرف جانے کی رخصت دی گئی۔ اسی دوران چین تیمور کی یہ عرضداشت موصول ہوئی کہ جن امرا کو اس کے ہمراہ آنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا وہ اس بنا پر نہ آسکیں گے کہ ان کے افراد خاندان کابل سے آ گئے ہیں۔ محمدی اور بعض امرا نے سلطان کے ساتھ سو کروہ کا سفر طے کر کے بلوچوں پر یلغار کر دی اور انہیں اچھی طرح زیر کر لیا۔ عبداللہ یمین کے ہاتھوں تیمور سلطان، سلطان محمد دولدی، محمدی اور وہاں کے دیگر امرا تیز جوانوں کو فرامین روانہ کئے گئے کہ وہ چین تیمور سلطان کے ہمراہ آگرہ میں جمع ہو کر آمادہ و مستعد رہیں اور جس طرف سے بھی دشمن سر اٹھائے اس جانب وہ رخ کریں۔

دریا خاں کے پوتے جلال خاں کے پاس شیخ جمالی گیا ہوا تھا۔ ہفتے کے دن مہینے کی سات تاریخ کو وہ جلال خاں اور تمام معتبر امرا کے ساتھ حاضر ہوا اور خدمت بجا لایا۔ یحییٰ نوحانی جو اپنی آمد سے قبل اظہار اطاعت اور بندگی کی خاطر اپنے برادر خورد کو روانہ کر چکا تھا۔ جس کے عوض اسے فرمان خوشنودی و اطمینان بھیج دیا گیا تھا، وہ بھی آج ہی حاضر ہوا اور خدمت بجا لایا۔ چونکہ سات آٹھ ہزار نوحانی افغان امید لے کر میرے پاس آئے تھے میں نے انہیں

ناامید نہ کرتے ہوئے بہار کی آمدنی میں سے ایک کروڑ زمین خالصہ کے لئے مخصوص کر کے پچاس ہزار محمود خاں نوحانی کو عطا کر دیئے اور باقی جو رقم رہ گئی تھی وہ جلال خاں کی تحویل میں دے دی گئی۔ اس نے اقرار کیا کہ ایک کروڑ کی رقم وہ بطور خدمتانہ پیش کیا کرے گا۔ یہ رقم وصول کرنے کے لئے ملا غلام یساول کو بھیجا گیا۔ محمد زمان کو ولایت جونپور عطا کی گئی۔

٦٣۔ سکندر پور۔ پٹنہ اور گورکھ پور کے درمیان گھاگر دریا کے جنوب میں واقع ہے۔

نصرت شاہ سے صلح

غلام علی، ملازم خلیفہ، ابوالفتح ملازم شاہزادہ منگیر کے ہمراہ اسماعیل متا سے پہلے (ورق ۳۵۳) تین شرطیں لے کر گیا تھا۔ ابوالفتح شاہزادہ منگیر کے خطوط اور وہ خط جو حسن خان لشکر وزیر کو خلیفہ نے لکھا تھا لے کر حاضر ہوا۔ وہ تین شرطیں قبول کر لی گئی تھیں۔ اس نے نصرت شاہ کو اپنا ہمنوا مقرر کر کے صلح کی بات کو پیش کیا۔ یہ یورش چونکہ سرکش افغانوں کی سرکوبی کے لئے کی گئی تھی۔ اس لئے ان میں بعض تو روپوش ہو گئے، بعض نے حاضرِ خدمت ہو کر اطاعت و بندگی قبول کر لی۔ باقی جو چند رہ گئے تھے وہ چونکہ بنگال نصرت شاہ کے دستِ نگر تھے، اس نے انہیں اپنی زیرِ سرپرستی لے لیا۔ اس کے علاوہ برسات کا موسم بھی نزدیک آچلا تھا۔ چنانچہ ہم نے بھی مذکورہ شرائط پر صلح کے بارے میں لکھ کر بھیج دیا۔

ہفتے کے دن اسماعیل جلوانی، علاول خاں نوحانی اور اولیا خاں اشراقی پانچ چھ امیروں کے ساتھ حاضر ہوا اور خدمت بجالایا۔

آج ہی کے دن ایشان تیمور سلطان اور توختہ بونما سلطان کو انعام میں کمر شمشیر، کمر خنجر، جبّوں، خلعتوں اور تپچاق گھوڑے، ایشان تیمور سلطان کو تیس لاکھ پرگنہ نارنول سے، توختہ بونما سلطان کو پرگنہ شمس آباد سے تیس لاکھ عنایت کئے گئے اور دونوں کو ہی زانو کے بل بیٹھ جانے کے لئے کہا گیا اور وہ حکم بجالائے۔ پیر کے دن مہینے کی پانچ تاریخ کو بنگال کی طرف سے خاطر جمع ہو کر ہم نے دریائے گھاگر کے کنارے کی منزل گاہ سے گونڈنہ دیہات کے نواح کی طرف بٹن اور شیخ بایزید حرام خور کے شر کو رفع کرنے کے ارادے سے کوچ کیا۔ منزلوں کو ایک کرتے ہوئے بدھ کے دن گھاگر دریا کے پار چوپارہ چتر موکھ گھاٹ پر جو سکندر پور[٦٣] میں واقع ہے، ہم قیام پذیر ہوئے۔ اس دن بھی لوگ دریا کو پار کر رہے تھے۔ ان دونوں حرام خوروں کے بارے میں متواتر یہ خبریں ملنے لگیں کہ وہ دریائے سردا اور گھاگر پار کر کے لکھنؤ کی طرف چلے گئے ہیں۔ ان پر گھاٹوں کی ناکہ بندی کرنے کے لئے امرائے ترک و ہند میں سے سلطان جلال الدین شرقی، علی خاں فرملی، تردیکہ، نظام خاں بیانی، تولمیش ازبک، قربان چرخی، حسن خاں بن دریا خاں (بھیرہ) جیسے سرداروں کو متعین کیا گیا اور شب جمعرات انہیں رخصت ہونے کی اجازت دی گئی۔

آندھی، طوفان اور وقائع کے منتشر اوراق

اسی رات بعد از تراویح جبکہ ایک پہر اور پانچ گھڑی وقت گزر چکا تھا برساتی گھٹائیں امنڈنا شروع ہو گئیں۔ اچانک ایسا شدید طوفان اٹھا اور تند ہوائیں چلیں کہ کم ہی خیمے ایسے رہ گئے تھے جو گرنے سے بچ گئے۔ میں اس وقت خیمے میں لکھنے لکھانے کا کام کر رہا تھا۔ اتنا موقع نہ مل سکا کہ اوراق و اجزائے کاغذ جمع کر سکوں۔ خیمہ بارگاہ نے پیشخانہ کو ایسا گرایا کہ وہ میرے سر پر آرہا۔ خیمۂ بارگاہ کا شوائی ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ بس خدا نے ہی محفوظ رکھا اور کوئی آفت نہ آئی۔ تحریر شدہ اجزا اور اوراق پانی میں ڈوب کر بھیگ گئے۔ بڑی مشکل سے ان اوراق پریشان کو جمع کیا۔ خشک کرنے کے لئے انہیں ریشمی کپڑے سقرلاط میں لپیٹ کر تختے کے نیچے رکھ کر اوپر

سے کمبل بچھا دیئے گئے۔ دو گھڑی گزر جانے کے بعد یہ طوفان رکا۔ بستر خانے کے خیمے کو کھڑا کر کے شمع روشن کی گئی اور بمشکل تمام آگ جلائی گئی صبح تک میں سونہ سکا بس (ورق ۳۵۴) اوراق و اجزا کو خشک کرنے میں ہی لگا رہا۔[۶۴] جمعرات کے دن ہم نے دریا کو عبور کیا۔

بروز جمعہ میں گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس روز میں نے خرید اور سکندر پور کا معائنہ کیا۔ اسی روز عبداللہ اور باقی نے لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے بارے میں لکھا۔

ہفتے کے دن کوکی کو اس کے دستے کے ساتھ آگے روانہ کیا گیا تا کہ وہ باقی کے پاس پہنچ کر اس کے ہمراہ ہو جائے۔ اتوار کے دن سلطان جنید برلاس۔ حسن ولد خلیفہ، ملا اپاق کا دستہ اور مومن آتکہ کے برادران خورد و کلاں کو اس ہدایت کے ساتھ جانے کی جازت دی گئی کہ وہاں پہنچ کر باقی کے ہمراہ ہو جائیں اور میرے پہنچنے تک وہ جو بھی کام انجام دیں اس میں کوتاہی نہ کریں۔

عصر کے وقت بادشاہ محمد ولد معروف کو خلعت خاصہ اور تپچاق گھوڑے سے نواز کر رخصت ہونے کی اجازت دی گئی۔ سال گزشتہ کی طرح اس مرتبہ بھی اسے سارن کا علاقہ اس کے اپنے خرچ کے لئے، کندلہ کا علاقہ ترکش برداروں کے خرچوں کے لئے عنایت کر کے رخصت ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ آج ہی اسمٰعیل جلوانی کو سروار کی ۷۲ لاکھ کی آمدنی اور تپچاق گھوڑا عنایت کر کے رخصت ہونے کی اجازت دی گئی۔ علاول خاں نوحانی اور دستے کو جو اس کے ہمراہ آیا تھا۔ مخارج فراہم کرنے کے بعد رخصت ہونے کی اجازت دی گئی۔ یہ مقرر کیا گیا کہ ان میں سے ایک کا بیٹا اور دوسرے کا برادر خورد ہمیشہ آگرہ میں حاضر خدمت رہا کریں گے۔ کشتی آرائش و گنجائش اور دو وہ کشتیاں جو اس مرتبہ بنگال سے ہمارے ہاتھ آئی تھیں منتخب کر کے بنگالیوں کے حوالے اس ہدایت کے ساتھ کر دی گئیں کہ وہ انہیں ترمہانی کے راستے سے غازی پور لے جائیں۔ آسائش و فرمائش کشتیوں کے لئے یہ حکم دیا گیا کہ انہیں لشکر گاہ کے خیموں کے ہمراہ دریائے گھاگر کے بہاؤ کے خلاف لے کر چلیں۔ بہار اور سروار کی طرف سے خاطر جمع ہو کر ہم نے بروز ہفتہ چوپارہ چیز موکھ گھاٹ سے دریائے گھاگر کے کنارے کنارے کوچ کرنا شروع کیا اور دس کروہ راستہ طے کرنے کے بعد فتح پور کے تابع کلیرہ نامی گاؤں میں جو گھاگر کے پہلو میں ہی واقع ہے قیام پذیر ہوئے۔

اگلے دن جن لوگوں نے صبح سویرے کوچ کیا تھا وہ راستہ بھٹک گئے اور فتح پور کی بڑی جھیل کی طرف نکل آئے۔ چند آدمیوں کو دوڑایا گیا کہ جو لوگ ابھی دور تک نہ گئے ہوں انہیں واپس لے آئیں۔ اس کے ساتھ ہی کچک خواجہ کو روانہ کیا گیا کہ وہ رات جھیل کے کنارے بسر کرے اور جو لشکر پڑاؤ کرنے کے لئے وہاں آئے اگلے دن صبح اس کو اپنے ساتھ لے کر لشکر گاہ تک اس کی ہمراہی میں روانہ ہو۔ اگلے دن علی الصبح ہم نے وہاں سے کوچ کیا۔ نصف راہ طے کرنے کے بعد میں آسائش کشتی میں سوار ہو گیا۔ جسے دریا کے بہاؤ کے خلاف منزل گاہ تک کھے کر لایا گیا۔

راستے میں شاہ دیوانہ کے لڑکے کے ہمراہ خلیفہ حاضر خدمت ہوا۔ وہ باقی کے پاس سے آیا تھا۔ جس سے لکھنؤ کے بارے میں اس خبر کی تحقیق ہوئی کہ انہوں (بتن اور بایزید) نے ہفتے کے دن بتاریخ تیرہ رمضان نبرد آزمائی کی۔ لیکن اس جنگ سے ان کی مطلب برآری نہ ہو سکی۔ دوران جنگ گھاس کی بوریوں اور چھپروں میں آگ لگ گئی۔ قلعہ کے اندر تنور بن گیا وہ فیصل کے مورچوں پر رک نہیں سکے اور قلعے پر قبضہ ہو گیا۔ اس بنا پر وہ قلعے کے اندر داخل ہو گئے۔ دو تین دن بعد جب انہیں یہ خبر ملی کہ ہم واپس چلے گئے ہیں تو وہ دلمؤ کی جانب کوچ کر گئے۔ اس دن ہم نے دس کروہ سفر کیا اور چکسر گاؤں جو سگری پرگنہ میں ہے قیام کیا۔

بدھ کے دن جانوروں کے ستانے کے لئے ہم نے اس منزل پر قیام کیا۔ شیخ بایزید اور (ورق ۳۵۵)

۶۴۔ یہ عین ممکن ہے کہ وقائع کے ضائع شدہ حصے یہاں ہی گم ہوئے ہوں۔

بتن کے بارے میں بعض لوگوں نے بتایا کہ وہ دریائے گنگا عبور کر کے جوند اور چنار کے نواح میں آگئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنی قوم و قبیلے کے لوگوں میں پہنچ جائیں۔ چنانچہ امرا کو مشورے کے لئے طلب کیا گیا اور یہ اقرار پایا کہ محمد زمان مرزا اور سلطان جنید برلاس کو چونکہ جونپور کے عوض چنار اور بعض دیگر پرگنات دے گئے ہیں۔ اس لئے محمود خاں نوحانی، قاضی جیا اور تاج خاں سارنگ خانی چنار پہنچ کر دشمن کی ناکہ بندی کریں۔

اگلے دن علی الصبح بروز جمعرات ہم نے کوچ کیا اور دریائے گھاگر سے علیحدہ ہو گئے۔ گیارہ کروہ راستہ طے کر کے ہم نے پرسرو عبور کیا اور اس کے کنارے قیام پذیر ہوئے۔

اس منزل پر امرا کو مشورے کے لئے طلب کیا گیا۔ ایشان تیمور سلطان، محمد سلطان مرزا، توختہ بوغا سلطان، قاسم خواجہ، میر جعفر خواجہ، زاہد خواجہ، جان بیگ اور اس کے ملازمین، عسکری کے ملازم کچک خواجہ اور امرائے ہند میں سے عالم خان، ملک داد کرارانی اور راؤ ولی جیسے امرا کے لئے متعین کیا گیا کہ وہ لشکر سے علیحدہ ہو کر بتن و بایزید کے عقب میں دلمؤ کی جانب تیزی سے روانہ ہوں۔

جس وقت میں رات کو دریائے پرسرو کے کنارے طہارت کر رہا تھا تو شمع کی روشنی میں بہت سی مچھلیاں جمع ہو کر سطح آب پر آگئیں۔ میں نے اور وہ لوگ جو میرے ساتھ تھے انہوں نے بہت سے مچھلیاں ہاتھوں سے پکڑیں۔ دریائے پرسرو سے ایک نالہ نکلتا ہے بروز جمعہ ہم نے اس کے کنارے قیام کیا۔ اس میں پانی بہت ہی کم تھا۔ اس خیال کے پیشِ نظر کہ لشکر کی آمد و رفت کے باعث پانی کی روانی میں خلل واقع نہ ہو۔ میں نے کہا کہ یہاں سے بالاتر جا کر پانی کو ۱۰×۱۰ جگہ بنا کر روک لیا جائے۔ جو طہارت کے لئے کافی ہے۔ چنانچہ ایسی جگہ بنائی گئی۔ ستائیس تاریخ کی رات اسی منزل پر بسر کی گئی۔ اگلے روز صبح ہم اس نالے سے دور چلے گئے اور دریائے توس عبور کر کے قیام پذیر ہوئے۔

اتوار کے دن بھی ہم اسی دریا کے کنارے قیام پذیر ہوئے۔

پیر کے دن مہینے کی نو تاریخ کو بھی دریائے توس کے کنارے ہی قیام رہا۔ اسی رات اگرچہ مطلع پوری طرح صاف نہ تھا۔ چند لوگوں نے چاند دیکھا۔ انہوں نے قاضی کے روبرو رویت ہلال کی گواہی دی اور ماہ رمضان کا اختتام ثابت ہو گیا۔

اگلے دن صبح نمازِ عید ادا کر کے ہم گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ دس کروہ راہ طے کر کے دریائے گومتی کے کنارے میانگ سے ایک کروہ کے فاصلے پر قیام پذیر ہوئے۔ ظہر کے وقت معجون کی چسکیاں لینے کا بھی ہم نے ارتکاب کیا۔ شیخ، ملا شہاب اور خواند امیر کو یہ بیت لکھ کر بھیجی اور بلایا گیا:

شیخ و ملا شہاب و خواند امیر   کیلینک اوچ اوچ ایکی ایکی بیر بیر

(شیخ و ملا شہاب و خواند امیر آؤ   تینوں دو دو یا اکیلے ہی تشریف لاؤ)

درویش محمد، یونس علی اور عبداللہ بھی وہاں موجود تھے۔ عصر کے وقت پہلوانوں نے کشتی کی۔ بدھ کے دن اسی منزل پر ہم قیام پذیر رہے۔ قریب چاشت معجون کو منہ لگایا گیا۔ آج ملک شرق آیا جو تاج خاں کو لانے کے لئے چنار سے روانہ کیا گیا تھا۔ آج پہلوانوں نے کشتی گیری کے داؤ دکھائے۔ اودے نامی پہلوان نے جو اس سے پہلے بھی یہاں آچکا تھا ایک ہندستانی پہلوان سے جو اس وقت وہاں موجود تھا کشتی کی اور اسے چت کر دیا (ورق ۳۵۶)۔ یحییٰ نوحانی کو پندرہ لاکھ کی رقم اس کے اخراجات کے لئے سردار پرگنہ دے کر اور سروپا پہنا کر رخصت ہونے کی اجازت دی گئی۔

اگلے دن صبح ہم نے گیارہ کروہ کا فاصلہ طے کیا اور دریائے گومتی کو عبور کر کے اس کے کنارے قیام پذیر ہوئے۔ وہ سلاطین اور امرا جو یلغار کرنے کے لئے روانہ ہوئے تھے ان کی طرف سے اس طرح کی خبر موصول ہوئی

کہ وہ دلموٴ تو پہنچ گئے ہیں مگر انہوں نے ابھی تک دریائے گنگا کو عبور نہیں کیا ہے۔ ان کے اس اقدام پر میں نے اپنی برہمی کا اظہار کرتے ہوئے یہ فرامین جاری کئے کہ تم میں سے کوئی ایک دریائے گنگا کو عبور کر کے دشمن کا تعاقب کرے۔ ساتھ ہی دریائے جمنا کو عبور کر کے اور عالم خان کو اپنے ساتھ لے کران پر غلبہ حاصل کرے۔ اس دریا سے دو منزلوں کو ایک کر کے ہم دلموٴ پہنچ گئے۔ دریائے گنگا کے گھاٹ سے اس دن لشکر کے لوگوں نے دریا کو عبور کیا۔ جس وقت لشکر گاہ کے خیمے دریا سے گزر گئے تو گھاٹ سے ذرا نیچے ایک جزیرے میں پہنچ کر معجون کا لطف لیا گیا۔

دریا کو عبور کرنے کے بعد ہم لشکر کے باقی لوگوں کی آمد کے انتظار میں اسی منزل پر قیام پذیر ہو گئے جہاں دریا پار کیا تھا۔ باقی تاشقندی لشکر اودھ کے ساتھ یہاں آیا اور اطاعت کا اظہار کیا۔ گنگا کو چھوڑ کر ہم ایک رات سفر کے بعد کوراره جو آرندی کے پاس ہے اتر پڑے۔ دلموٴ سے کوراره اکیس کروہ کا فاصلہ ہے۔

بروز جمعرات اس منزل سے ہم نے علی الصبح کوچ کیا اور پرگنہ آدم پور کے مقابل پہنچ کر قیام پذیر ہوئے۔ اس سے قبل کہ ہم دشمن کا تعاقب کرنے کے لئے دریا (جمنا) کو عبور کریں ایک دو بیڑہ بانوں کو کالپی کی جانب اس مقصد کے تحت روانہ کر دیا گیا کہ وہاں جتنی بھی کشتیاں موجود ہوں ان کو لے آئیں۔ جس منزل پر ہم رات کو قیام پذیر ہوئے تھے اسی رات کچھ کشتیاں وہاں پہنچ گئیں اور دریا کا گھاٹ بھی مل گیا۔

اس منزل پر چونکہ گرد و غبار بہت تھا اس لئے ہم ایک جزیرے میں اترے اور کئی شب و روز وہاں بسر کئے گئے۔ دشمن کے بارے میں چونکہ صحیح خبر موصول نہیں ہو رہی تھی اسی لئے باقی شقاول کو چند سیانے جوانوں کے ساتھ دریا کے اس پار روانہ کیا گیا تاکہ وہ باغی لوگوں کے بارے میں خبریں معلوم کر سکیں۔

اگلے دن بروز جمعہ عصر کے وقت باقی کا ملازم آیا اور یہ خبر لایا بایزید اور بتن کے قراول دستہ کو زیر کر لیا گیا ہے۔ ان کے مبارک خاں جلوانی جیسے عمدہ سردار اور دیگر چند لوگوں کو قتل کر کے بہت سے سر اور ایک زندہ آدمی کو روانہ کر دیا ہے اس نے دشمن کے زیر کئے جانے اور وہاں کی کیفیت کو تفصیل سے بیان کیا۔

اتوار کی رات مہینے کی تیرہ تاریخ کو دریائے جمنا کے پانی میں ایسی طغیانی آئی کہ صبح کے وقت تک وہ جزیرہ جس میں قیام تھا بالکل پانی میں ڈوب گیا۔ چنانچہ وہاں سے ایک تیر کی پرواز کے فاصلے پر پانی کے بہاؤ کی طرف دوسرے جزیرے میں پہنچ کر خیمے نصب کئے گئے اور وہاں قیام کیا۔

پیر کے دن سلاطین و امرا جو دشمن پر یلغار کرنے کے لئے گئے تھے ان میں سے جلال تاشقندی آیا اور یہ خبر لایا کہ بتن اور شیخ بایزید یلغار کی خبر پاتے ہی پرگنہ مہوبہ کی جانب فرار ہو گئے ہیں۔

برسات کا موسم چونکہ شروع ہو چکا تھا اور پانچ چھ ماہ تک لشکر کشی کرتے ہوئے سپاہی اور چوپائے سست ہونے لگے تھے۔ اسی لئے ان سلاطین و امرا کو جو یلغار پر گئے ہوئے تھے۔ یہ فرمان بھیجا گیا کہ جب آگرہ اور اس کے نواح سے تازہ دم یلغاری لشکر نہ پہنچ جائے وہ (ورق ۳۵۷) جس جگہ ہیں وہیں مقیم رہیں۔ اسی دن عصر کے وقت باقی کو اس لشکر کے ہمراہ رخصت ہونے کی اجازت دی گئی۔ جس وقت لشکر واپس آتے ہوئے دریائے گھاگر کو عبور کر رہا تھا تو موسیٰ ولد معروف فرملی حاضرِ خدمت ہوا۔ اس کے لئے پرگنہ امروہہ کی آمدنی میں سے تیس لاکھ کی رقم مقرر کر کے اسے سروپائے خاصہ و زین دار گھوڑا عطا کیا گیا اور اسے امروہہ کی جانب جانے کی اجازت دے دی گئی۔

واپسی

اس طرف سے خاطر جمع ہو کر منگل کی رات تین پہر اور ایک گھڑی گزرنے کے بعد ہم نے بطریق یلغار آگرہ کی جانب رخ کیا۔ اگلے دن ہم نے سولہ کروہ کا فاصلہ طے کر کے کالپی کے تابع بلادار نامی پرگنے میں دوپہر کا وقت گزارا اور گھوڑوں کو کھانے کے لئے چھوڑ دیا۔ مغرب کے وقت ہم وہاں سے گھوڑوں پر سوار

۶۵۔خواجہ عبدالحق۔خواجہ عبداللہ احرار کے پوتے ہیں۔

ہوئے۔اس رات ہم نے تیرہ کروہ راستہ طے کیا اور تیسرے پہر کالپی کے پرگنات میں سے پرگنہ سوگند پور میں بہادر خاں سروانی کے مقبرے پر قیام پذیر ہوئے اور سو گئے۔نماز فجر ادا کرنے کے بعد ہم وہاں سے روانہ ہوئے اور سولہ کروہ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد دوپہر کے وقت اٹاوہ پہنچ گئے۔یہاں مہدی خواجہ ہمارے استقبال کے لئے آیا۔رات کا پہلا پہر گزر جانے کے بعد ہم گھوڑوں پر سوار ہوئے اور راستے میں تھوڑی دیر کے لئے سو گئے۔یہاں سے سولہ کروہ راستہ طے کرنے کے بعد دوپہر کے وقت فتحپور راپڑی میں فروکش ہوئے۔ظہر کے وقت فتحپور سے گھوڑوں پر سوار ہو کر ہم نے سترہ کروہ راستہ طے کیا اور رات کے دوسرے پہر میں آگرہ کے باغ ہشت بہشت میں قیام پذیر ہوئے۔

اگلے دن صبح یعنی بروز جمعہ محمد بخشی اور بعض دیگر لوگ حاضر ہوئے اور خدمت بجالائے۔ظہر کے نزدیک ہم نے دریائے جمنا کو عبور کیا اور خواجہ عبدالحق [۶۵] کی خدمت میں حاضری دی اور قلعے میں داخل ہو کر بیگمات سے ملاقات کی جو رشتے میں میری پھوپیاں ہوتی تھیں۔

سردے اور انگور ہندُستان میں

بلخ کے ایک کسان کو سردے کی فصل تیار کرنے کا کام پر لگا دیا گیا تھا۔اس نے کچھ سردے اپنے پاس بچا لئے تھے۔انہیں لے کر وہ حاضر ہوا۔بہت اچھے تھے۔انگور کی بھی ایک دو بیلیں میں نے باغ ہشت بہشت میں لگوائی تھیں اس میں بھی چھوٹے چھوٹے انگور آ گئے تھے۔شیخ گھورن نے بھی انگوروں کو ایک ٹوکری بھیجی تھی۔وہ انگور بھی برے نہ تھے۔ہندوستان میں سردے اور انگور کی فصل ہو جانے کے باعث واقعی خوشی ہوئی۔

اتوار کی رات گزرنے میں ابھی دو پہر باقی تھے کہ ماہم آن پہنچیں۔عجیب اتفاق تھا کہ میں دس جمادی الاوّل اپنے لشکر کے ہمراہ گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہوا تھا اور وہ بھی اسی دن کابل سے روانہ ہوئی تھیں۔پہلی ذیقعدہ بروز جمعرات بڑے دیوان خانہ میں جب میں نے وہاں دیوان کیا تھا۔ہمایوں اور ماہم کی اشیا جو بطور پیشکش لائی گئی تھیں ترتیب دی گئیں۔اسی دن مغفور نامی دیوان کی زیر نگرانی ڈیڑھ سو کہار کابل سے سردے اور انگور لانے کے لئے روانہ کئے گئے۔ان کو تنخواہیں بھی دی گئیں۔

ہفتے کے دن مہینے کی تین تاریخ کو ہندو بیگ جو خواتین کے ہمراہ کابل سے آیا تھا اور جسے ولی یوسف کی وفات پر سنبھل کی جانب روانہ کیا گیا تھا۔حاضر ہوا اور خدمت بجالایا۔حسام الدین، علی خلیفہ بھی اسی دن الور سے آن پہنچا اور خدمت بجالایا۔

عبداللہ کو علی یوسف کی وفات پر ترمہانی سے روانہ کیا گیا تھا۔اتوار کے دن صبح کے وقت (ورق ۳۵۸) وہ آن پہنچا۔جو لوگ کابل سے آئے تھے ان سے سنا گیا کہ شیخ شریف قراباغی نے عبدالعزیز کے ورغلانے پر یا اپنی مرضی سے مجھ سے ایسے مظالم منسوب کر کے جن کا میں مرتکب نہیں ہوا اور ایسی بدعتوں کو مجھ سے نسبت دے کر جن کا مجھ سے واسطہ نہ تھا ایک محضر نامہ تیار کر لیا اور اس پر زبردستی آئمہ لاہور کے دستخط کرا کے اس کی نقلیں مختلف شہروں میں بھیج دیں۔اس کا ارادہ ہے کہ ان باتوں کے بارے میں وہ حجت کرے اس کے علاوہ عبدالعزیز نے بھی احکام شاہی کو نظر انداز کیا ہے اور اس کی زبان سے ناشائستہ اقوال صادر اور قابل مذمت افعال سرزد ہوئے ہیں۔ان اسباب کی بنا پر دس تاریخ کو اتوار کے دن قنبر علی ارغون کو روانہ کیا گیا کہ وہ شیخ شریف، آئمہ لاہور اور عبدالعزیز کو گرفتار کر کے بارگاہ میں پیش کرے۔

مہینے کی پندرہ تاریخ جمعرات تجارہ سے چین تیمور سلطان حاضر خدمت ہوا۔اسی دن پہلوان صادق کی اودے جیسے بڑے اور پختہ کار پہلوان کے ساتھ کشتی ہوئی۔صادق نے اسے زمین پر گرا دیا۔جس کا اسے بہت

قلق ہوا۔

پیر کے دن مہینے کی نو تاریخ کو قزلباش ایلچی کو کمر خنجر کے ساتھ مناسب خلعت پہنائی گئی اور اسے دو لاکھ ٹنکے عنایت کر کے رخصت کی اجازت دی گئی۔

رحیم داد کی سرکشی

اسی عرصے میں سیّد مشہدی گوالیار سے آیا۔ اس نے رحیم داد کے غرور تکبر کے بارے میں اپنی عرض داشت پیش کی۔ چنانچہ خلیفہ کے ملازم شاہ محمد مہرداد کو اس کے پاس روانہ کیا گیا جو اس کے لڑکے کو اپنے ساتھ لے کر آیا۔ کیونکہ اس کا اپنا ارادہ آنے کا نہ تھا۔ اس کی بدگمانی کو دور کرنے کے لئے نور بیگ کو منگل کے دن بتاریخ پنجم ماہ ذی الحجہ گوالیار کی جانب روانہ کیا گیا۔ چند روز بعد نور بیگ واپس آ گیا اور جو درخواست رحیم داد نے کی تھی وہ اس نے آ کر عرض کی۔ اس کی منشا کے مطابق فرامین تیار کئے گئے اور قریب تھا کہ انہیں روانہ کر دیا جائے کہ اس کا ملازم آیا اور اس نے عرض کیا کہ وہ اپنے لڑکے کو نجات دلانا چاہتا ہے اور خود بھی حاضر دربار ہونے کا ارادہ نہیں۔ یہ خبر ملتے ہی میں چاہتا تھا کہ فوراً ہی سوار ہو کر گوالیار کی طرف روانہ ہو جاؤں مگر خلیفہ نے عرض کی کہ میں ایک بار پھر سے نصیحت آمیز خط لکھتا ہوں۔ شاید راہ راست پر آ جائے۔ اس مصلحت کے پیش نظر شہاب الدین خسرو کو روانہ کیا گیا۔ مہینے کی سات تاریخ بروز جمعرات اٹاوہ سے مہدی خواجہ آیا۔ عید کے دن ہندو بیگ کو سروپائے خاصہ، کمر خنجر، شمشیر مرصع اور تپچاق گھوڑا عنایت کیا گیا۔ حسن علی کو جو ترکمانوں میں چغتائی مشہور ہے کو سروپا، کمر خنجر، مرصع اور سات لاکھ کی آمدنی کا پرگنہ عطا کیا گیا۔

واقعات ۹۳۶ھ

(۵ ستمبر ۱۵۲۹ء ۔ ۲۵ اگست ۱۵۳۰ء)

منگل کے دن بتاریخ تین محرم رحیم داد کی سفارش کرنے کے لئے شہاب الدین خسرو کے ہمراہ شیخ محمد غوث تشریف لائے ۔ درویش منش قابلِ عزت واحترام شخص ہیں[۱] ۔ ان کی سفارش پر رحیم داد کا قصور معاف کر دیا گیا، شیخ گھورن اور نور بیگ کو گوالیار بھیجا گیا کہ گوالیار ان کے سپرد کر دیا جائے۔ ۔ ۔؟

۱۹ ستمبر ۲۰۰۴

۱۔ شیخ محمد غوث گوالیاری۔ شطاری سلسلے کے بزرگ گوالیار میں دفن ہیں۔ آپ کا شاندار روضہ اکبر نے تعمیر کرایا تھا۔ مقبرے کے چاروں طرف عمدہ پتھر میں تراشیدہ جالیاں ہیں جو آج بھی بہترین ہیں۔ آپ کے احاطے میں ہی تان سین کا روضہ بھی ہے۔

بابَر، بابِر یا بابُر

عربی، فارسی، ترکی اور اردو میں بابر عام طور پر اعراب کے بغیر لکھا جاتا ہے۔ اس کا تلفظ دوسری، ب، پر، زبر زیر یا پیش تینوں طرح کیا جاتا ہے۔ مغربی مصنفین نے جب بابر کو اپنایا تو ان کو بھی تہجے اور تلفظ کے اختلافات کی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اُن کے پچھلے دو سو سال کے علمی اشاعتوں کے دوران بابر کا انگریزی تلفظ اور تہجے بدلتے رہے ہیں۔

ارسکن نے بابر نامے کا ترجمہ ۱۸۲۶ء میں شائع کیا تھا اس میں اس نے ''بابَر'' لکھا[1]۔ روسی مصنفین کہر اور اسمرنو کے بابر نامے کو المنسکی نے ۱۸۵۷ء میں شائع کیا، اور اس میں ''بابَر'' لکھا ہے[2]۔ فرانسیسی مصنف ڈی کورٹل نے المنسکی کی اشاعت سے فرانسیسی میں ترجمہ کرکے ۱۸۷۱ء میں چھاپا اور اس نے بھی ''بابَر'' ہی رقم کیا[3]۔

ہنری اور اینٹ بیورج جو اسکاٹ میاں اور انگلش بیوی ہیں، نے جب اس میدان میں قدم رکھا تو دونوں نے اس کا تلفظ ''بابُر'' کیا۔ یہ انہوں نے اپنے ہندستان کے قیام میں سُن اور دیکھ کر کیا ہوگا، چنانچہ یہ ہنری کے مضامین میں دیکھا جاسکتا ہے[4]۔ اینٹ نے حیدر آباد دکن کے ترکی مخطوطے کا عکس کتابی صورت میں ۱۹۰۵ء میں لندن سے شائع کیا اس میں بھی ''بابُر'' ہی طبع ہوا ہے[5]۔ ایک اور ترکی مخطوطہ جو ہمایوں کے زیر استعمال تھا اور بعد میں ارسکن نے بھی اس کو اپنے ترجمے میں استعمال کیا آج کل سکاٹ لینڈ کی قومی لائبریری، ایڈنبرا میں ہے۔ اس میں مخطوطے سے پہلے اینٹ بیورج کے ہاتھ سے لکھے ہوئے نوٹس بھی شامل ہیں اس میں مسلسل ''بابُر'' ہی لکھا ہوا ہے[6]۔ لیکن جب اینٹ نے اپنا ترجمہ (۱۹۲۱-۱۹۱۲ء) شائع کیا تو اس میں ''بابُر'' لکھا ہے[7]۔ اس کی بظاہر وجہ ڈینی سن رَوس کا مضمون ہے (۱۹۱۰) جو اس نے دیوان بابر کے ساتھ شامل کیا ہے[8]۔ اس مضمون میں اس نے ''بابُر'' کی املا کی حمایت میں جو دلائل دیئے ہیں وہ بہ آسانی رد کیے جاسکتے ہیں جیسے اس نے کہا کہ فیوگل نے اس کو کسی مخطوطے میں ''بابُر'' لکھا دیکھا یا ایک دوسرے صاحب ایلیس نے بھی ''بابُر'' ہی دیکھا ہے۔ لیکن قوی ثبوت جو ڈینی سن رَوس نے دیا وہ ہنری بیورج کا ہے جس نے متین ۹ میں یہ شعر دیکھ کر پیش کیا:

اوشبو لار کیم باریں دیدی بابر　　　بیلـکـا سین کیم مفصل ایماندور

یا حبیب السیر[10] میں اس شعر میں:۔

خـدیـو کـا مـران پـر تـودر　　　مـلاو مـلک مـلـت شـاه بـابـر

مولوی عبدالولی نے (۱۹۱۸ء) میں ''بابُر'' کو بھی جائز کہا اور ثبوت میں مولانا قنبر نیشاپوری کا قصیدہ جو انہوں نے ابوالقاسم بابر کی شان میں لکھا تھا پیش کیا ہے[11]۔ ابوالقاسم بابر ظہیرالدین بابر کے رشتہ کے دادا تھے۔ اس قصیدے میں قنبر نیشاپوری نے بابُر کو بُر اور زُر کے ساتھ جوڑا ہے۔

نـر مـجـره بلدر بر کردار میزانی بود　　　کـش عـمـوداز سیم خام و کفّه از زُر کرده اند
آب خشـک ایـن آسـمـان و آتـش اخـتـرن　　　بر خلاف او آب خشـک این آتش تَر کرده اند
شـاهـدان و مـطـربان چرخ زنگاری نقاب　　　ایـن غـزل رادرمـدیـح شاه بابر کَرده اند

ماہنامہ معارف میں مولوی سید نجیب اشرف ندوی نے اگست ۱۹۲۲ میں ایک مضمون میں بابُر کو صحیح کہا

۱۔جون لیڈن اور ولیم ارسکن۔ میمو آئرس اوف ظہیرالدین بابر، امپرر اوف ہندستان ،لونگ مین ،ریز اورم براؤن اینڈ گرین ۱۸۲۶۔

۲۔نکولائی المنسکی، بابر نامہ، کازن ۱۸۵۷۔

۳۔ایبل پاوٹ ڈی کورٹیل۔ میمو آئرس ڈی بابر۔ پیرس ۱۸۷۱۔

۴۔ہنری بیورج۔ دی امپریل اینڈ ایشیاٹک کوارٹرلی ریویو جولائی۔ اکتوبر ۱۹۰۰، ۱، ۲۔

۵۔اینٹ بیورج۔دی بابر نامہ، چغتائی ترکی، لندن ۱۹۰۵۔

۶۔بابر نامہ ترکی، ہمایونی مخطوط، ایڈنبرا، ارسکن کا پیش کردہ۔

۷۔بیورج ،اینٹ، بابُر نامہ ان انگلش، لندن لوز یک ۱۹۱۲۔۱۹۲۱۔

۸۔رَوس، ڈینی سن، اے کلکشن اوف پوئمس بائی دی ایمپرر بابُر۔ جرنل اوف ایشیاٹک سوسائٹی، اکتوبر ۱۹۱۰ء۔

۹۔بابر کی فقہ حنفی کے احکام پر نظم۔ استانبول ۲۰۰۴، ورق ۱۱۔

۱۰۔حبیب السیر۔خواندامیر کی تاریخ۔ ہارورڈ سے ۱۹۹۴ میں کچھ چھپ گئی ہے۔ یہ شعر مولوی سید نجیب اشرف نے بھی لکھا ہے، دیکھیں حواشی نمبر ۱۲۔

۱۱۔عبدالولی، مولوی، دی اسپیلنگ اوف بابُر س نیم، جرنل اوف ایشاٹک سوسائٹی اوف بنگال۔۱۹۱۸، ۴۵۳۔۴۵۵

ہے،[۱۲] اور ثبوت وہی ڈینی سن رَوس والے دیئے ہیں، لیکن ساتھ میں یہ بھی مانا کے فارسی شاعری میں قافیے میں ردو بدل ہوسکتا ہے اور بابر کا یہ شعر بطور ثبوت کے دیا ہے:۔

تا بزلف سیہش دل بستم　　　از پریشانی عالم رُستم

بابر خود کہتا ہے کہ ''ترکی شعری ضرورت کے تحت حرف ''تا'' اور ''دا'' نیز ''غا''، ''کا'' و ''قا'' ایک دوسرے کا متبادل ہوسکتے ہیں۔[۱۳]

آج بھی ہندو پاکستان اور افغانستان میں ہم اگر ایک کونے سے دوسرے کونے تک سفر کریں تو ہر جگہ بابَر ہی سنائی دیتا ہے۔ عالم اور تاریخ داں بھی گفتگو کے دوران بابَر ہی کہتے ہیں چاہے لکھتے وقت کچھ بھی لکھیں۔ ڈینی سن رَوس اور اشرف ندوی صاحب یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے ترکی عالموں سے بابُر سنا ہے۔ میں نے اپنے سفر ازبکستان، تاجکستان اور کرغیزستان کے دوران محسوس کیا کہ وسط ایشیا کے ترکی بولنے والے حضرات اور عالم الف کا تلفظ 'ؤ' کی طرح کرتے ہیں۔ ان کے یہاں اَندجان نہیں ''اُوندجان'' ہے بابَر نہیں ''بُوبر'' ہے۔ اس سلسلے میں تاشقند کے انصار الدین ابراہیمو جو اردو اور ترکی جانتے ہیں اور تاشقند میں اورینٹل اسکول میں اردو پڑھاتے ہیں، کا کہنا یہ ہے۔

''تلفظ کرنے میں زور الف پر آتا ہے۔ اس لئے دوسری ب پر پیش اتنا صاف سنائی نہیں دیتا اور اس پر زور بالکل نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دوسری ب پر زیر ہو یا پیش اتنا فرق نہیں پڑتا''[۱۴]

الفاظ کے تلفظ کا مسئلہ سیدھا سادہ نہیں۔ کسی بھی لفظ کا تلفظ وقت اور فاصلے کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ ہندستان میں تو یہ مشہور ہے کہ ہر پانچ/دس کوس پر زبان بدل جاتی ہے۔ برصغیر میں ہر شخص بابَر ہی کہتا ہے۔ عالم اور قابل لوگوں کی خواہش تلفظ کی اصلاح کے لئے کم ہی کام کرتی ہے۔ انگلش زبان دنیا کی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ امریکی انگلش، انگریزی انگلش، سکاٹ انگلش مختلف لہجوں میں بولی جاتی ہیں۔ اگر جنوبی انگلینڈ والے شمالی انگلینڈ والے لہجوں کا مذاق اڑاتے ہیں تو اس کی وجہ سے شمالی لہجے ختم نہیں ہوئے۔ یہاں کے مشہور ٹیلی ویژن پروگراموں میں جو انگلش بولی جاتی ہے وہ لکھی نہیں جاتی۔ اب بھی یہاں لہجوں پر اختلافات اٹھتے ہیں۔ اب بھی عوامی لہجوں پر پڑھے لکھے زیرِ لب مسکراتے ہیں۔ ایک آواز جو ''ای'' پر مشتمل ہے کو یہاں سات مختلف لہجوں کے ساتھ ادا کیا جا سکتا ہے، غرض انگلش لکھنے کا طریقہ صوتی نہیں ہے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ صوتی اصولوں کی ضد ہے۔ یہاں جس قصبہ میں میں رہتا ہوں اس کا اسکاٹ ''کریکوڈی'' کہتے ہیں لیکن انگریز اس کو ''کریکالڈی'' تلفظ کرتے ہیں جس پر یہاں ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے[۱۵]۔

ہندستان میں ''بُر'' کا لفظ گالی میں شمار ہوتا ہے اور کچھ علاقوں میں اندام نہانی کے لئے، جس طرح ہندستان میں ''پادشاہ'' رائج نہیں کیونکہ 'پاد' غلیظ ہے اس لئے ''بادشاہ'' کہا جاتا ہے اسی طرح بابَر رائج ہے اور بابُر نہیں۔ بابَر لفظ کہنا بھی آسان ہے کہ یہ ہونٹوں سے ادا کیا جاتا ہے، بار بار دہرانے میں سہل ہے، جبکہ ''بابُر'' کی ادائیگی تالو سے کی جاتی ہے اس میں روانی نہیں، بار بار ادا کرنے کے لئے ٹھہراؤ پیدا کرنا پڑتا ہے اس لئے بابَر بولنا ہی آسان اور درست ہے۔

۱۲۔ ندوی، سید نجیب اشرف، بابَر یا بابُر، معارف، اگست ۱۹۲۲، ۱۲۶۔۱۲۹۔

۱۳۔ وقائع ورق ۸۳۔

۱۴۔ انصار الدین ابراہیمو۔ ذاتی گفتگو ونامہ۔

۱۵۔ بل ون بریگ۔ دی ایڈونچر اوف انگلش۔ سیپٹر لندن ۲۰۰۳ ص ۲۲، ۹۲، ۱۳۶، ۱۳۸، ۲۳۴۔

بابر کے امراض کا طبی تجزیہ

بابر نے اپنی یادداشتوں کو قلم بند کرنے کے ساتھ جہاں دیگر واقعات کا ذکر کیا ہے وہاں کسی لاگ لپٹ کے بغیر ان عوارض کا بھی ذکر کیا ہے، جن میں وہ مبتلا رہا۔ ایک معالج جب بابرنامے کے صفحات الٹتا ہے تو اس کو بیماریوں کی علامات ان کی نوعیت ان کا وقفہ اور ان سے متعلق مختلف طریقہ علاج کا بھی علم ہوتا ہے۔ اگر اس کو چوٹ لگی تو اس کی تفصیلات اور اس سے صحت یابی کے متعلق تفصیل ہے۔ بعض جگہ بیانات مختصر اور سرسری ہیں، وہاں آگے پیچھے کی مصروفیات میں کمی بیشی سے اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں معالج کا تجسس اور طبی معلومات کا پس منظر بیماری کی نوعیت اور مرض کی تشخیص میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ امراض کا ذکر پڑھنے کے بعد آج سے تقریباً ۲۵ سال قبل بابر کے امراض کے متعلق میں نے ایک مضمون لکھا تھا[1]۔ جو اس ضمیمے کا ماخذ ہے۔

ایک چوتھائی صدی گزرنے کے بعد بھی اس مضمون میں معمولی رد و بدل کے علاوہ میں کوئی بڑی تبدیلی ضروری نہیں سمجھتا۔

بابر کی پیدائش ۶ محرم ۸۸۸ھ (۱۴ فروری ۱۴۸۳ء) کو فرغنہ میں ہوئی تھی۔ بابر کے مطابق اس علاقے میں آنکھیں سوج آنے کا مرض عام تھا۔[2]

گیارہ سال کی عمر سے پہلے کے حالات بابر نے تحریر نہیں کیے۔ خواندامیر کی ''حبیب السیر'' میں لکھا ہے کہ پیدائش پر بابر کے والد عمر شیخ مرزا بہت خوش تھے۔ پیدائش کا جشن کئی روز جاری رہا[3]۔ بابر کی ایک پانچ سالہ بڑی بہن تھی۔ بابر نہ صرف اولاد نرینہ بلکہ ولیعہد بھی تھا اس لئے اس کی پیدائش دوہری خوشی کا موجب تھی۔ بابر پر کئی دائیاں مقرر کی گئی تھیں۔ بچپن سے ہی بڑائی کے آثار نمایاں تھے۔ بابر کے عقیقے کے وقت والد اور نانا دونوں نے جشن منایا تھا۔ مرزا حیدر دوغلت کے مطابق بابر میں شجاعت، و مروت کے آثار شروع ہی سے نمایاں تھے[4]۔ شاید اسی لئے اس کے نام میں بابر کا اضافہ کیا گیا۔

پہلا مرض جس کا ذکر بابر کرتا ہے وہ معیاری بخار (ٹائیفائیڈ) تھا[5] اس کی عمر پندرہ سال تھی (۹۰۳/۱۴۹۷)۔ یہ بخار ۲۰/۲۵ دن تک رہا۔ بخار شروع ہونے کے چار پانچ روز بعد کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ بابر نے جلدی کی، بستر چھوڑ دیا۔ اس کو اندجان پہنچنے کی جلدی تھی۔ عجلت مہلک ثابت ہوئی۔ چنانچہ بخار عود کر آیا۔ وہ اس قدر کمزور ہو گیا کہ چار دن تک اس کی زبان بند ہو گئی۔ روئی کے پھائیوں سے اس کے منہ میں پانی ٹپکایا جاتا تھا۔ اس کے مصاحب اور رشتہ دار اس کی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ اوزون حسن کا سفیر آیا ہوا تھا اس نے بابر کو اس حال میں دیکھ لیا اور واپس جا کر یہ حال سنا دیا جس پر دشمنوں نے اندجان پر قبضہ جما لیا۔ لیکن چند دن کے بعد بخار اترنا شروع ہوا اور اسے صحت ہوئی۔ اس قسم کا تیز بخار اور اس کا دوبارہ عود کر آنا بخار میں مکمل آرام نہ کرنے کا لازمی نتیجہ تھا۔

۹۰۴/۱۴۹۸ء میں بابر خجند سے قصبہ زامن گیا تو اس پر بخار نے پھر حملہ کیا۔ اس وقت اس کی عمر سولہ سال تھی۔ یہ بخار مختصر تھا چند دن تک رہا۔ بابر کیونکہ جسمانی طور پر مضبوط و توانا تھا اس نے بخار کی پرواہ کئے بغیر قصبہ رباط خواجہ پر حملہ کیا، لیکن وہاں کامیابی نہیں ہوئی یوں بے نیل و مرام واپس لوٹا اور پشاغر تک ستر میل کے قریب سفر کیا[6]۔ یہ مختصر لیکن تکلیف دہ بخار وائرس کے حملے کا نتیجہ تھا۔

سترہ سال (۹۰۵/۱۴۹۹۔۱۵۰۰) کی عمر میں بابر کو ایک بازاری لڑکے، کہ جس کا نام بابری تھا سے انس ہو گیا۔ یہ عارضی فریفتگی بڑھتی گئی۔ بابر اتنی ہمت نہیں کر سکا کہ اس لڑکے سے نظریں ملائے یا بات کرے لیکن اس

۱۔ ظہیر الدین محمد بابر۔ میڈیکل ہسٹری۔ ایم ایچ اے بیگ۔ جرنل آف پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن، مئی ۱۹۸۱ ص ۱۱۴۔ ۱۱۷

۲۔ ورق ۳ اور ۴

۳۔ حبیب السیر۔ خواندامیر، ترجمہ تھیکسٹن، ہارورڈ ۱۹۹۳ ورق ۲۲۶

۴۔ مرزا حیدر دوغلت، تاریخ رشیدی (فارسی) ہارورڈ ۱۹۹۶ ص ۱۱۸

۵۔ ورق ۴۵

۶۔ ورق ۵۰

۷۔ ورق ۶۴

کی محبت میں اشعار لکھتا۔ ایک دن اچانک بازار میں اس کا سامنا بابری سے ہوگیا۔ شرم وحیا کے باعث اس کی نظریں جھکی رہیں اور رابطے کی ہمت نہیں ہوئی۔ یہ جوش وجنون اس قدر بڑھ گیا کہ بعض اوقات وہ برہنہ سر وبرہنہ پا بازاروں و باغوں میں دیوانہ وار سرگرداں رہتا[۷]۔ یہ کیفیت کچھ عرصے قائم رہی۔ یہ جذبات وہم جنس پرستی کے اثرات ہارمون کے اس عمر میں ردوبدل سے عام طور پر پائے جاتے ہیں، یہی حال بابر کا بھی تھا۔

۸۔ ورق ۹۰

بیس سال کی عمر میں (۱۵۰۲/۹۰۸) بابر کا احمد تنبل سے دوبدو مقابلہ ہوا۔ اس معرکے میں بابر زخمی ہوا۔ ایک تیر اس کی ران کے پار ہوگیا اور سر میں سخت چوٹ آئی[۸]۔ بابر اس وقت سر پر خود کے نیچے ایک دوپلی ٹوپی پہنے ہوئے تھا جس کا ایک دھاگہ بھی نہیں کٹا لیکن چوٹ کی ضرب سے دماغ کھوپڑی کے اندر جھنجھنا گیا۔ اس قسم کی چوٹ سے دماغ عارضی یا مستقل طور پر مفلوج ہوسکتا ہے۔ بابر کا نقصان عارضی تھا اور یہ جلد ٹھیک ہوگیا۔

۹۔ ورق ۱۳۶

ران کے زخم کو مندمل ہونے میں وقت لگا۔ بابر کے ماموں کچک خاں نے بابر کو لنگڑاتا دیکھ کر اپنے جراح آتکہ بخشی کو علاج کے لیے بھیجا۔ بخشی نے بابر کو نہ صرف کھانے کی دوا دی جو ایک سخت جڑ پر مشتمل تھی، اس کے علاوہ لومڑی کی کھال زخم پر باندھی۔ اس علاج سے بابر کو فائدہ ہوا اور زخم آہستہ آہستہ ٹھیک ہوگیا۔

تیئیس سال کی عمر میں (۹۱۱/ ۱۵۰۵۔۱۵۰۶) میں بابر پر انفلوئنزا کا حملہ ہوا۔ یہ مرض چار پانچ دن تک رہا۔ بخار میں شدت تھی اس قدر شدت کا بخار تھا کہ بابر پر غنودگی طاری رہی[۹]۔ لیکن جلد ہی اس سے نجات ملی۔ یہ وہ وقت تھا جب کابل فتح ہوچکا تھا اور بابر قندھار حاصل کرنا چاہتا تھا، لیکن اس فلو کی وجہ سے اس کو یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

۱۰۔ ورق ۱۳۹

اسی سال رمضان کے مہینے میں بابر کو عرق النسا کا عارضہ لاحق ہوا[۱۰]۔ درد کمر سے شروع ہوا اور ٹانگ تک گیا۔ اس کے لیے کروٹ لینا بھی ناممکن تھا۔ اس وقت وہ ہزارہ کی مہم پر نجراؤ میں مقیم تھا۔ اس کے مصاحبین نے اس کے لیے ایک ڈولی تیار کی جس پر لٹا کر اس کو دریائے باران کے کنارے کنارے بستان سرائے لے جایا گیا۔

۱۱۔ ورق ۱۴۰

اس سے پہلے کہ عرق النسا کا درد کم ہوتا اس کے الٹے گال پر ایک پھنسی نکل آئی، جس پر چیرا لگا کر پیپ نکالنی پڑی[۱۱]۔ اس وقت کے معالجین کا خیال تھا کہ پھوڑے پھنسی جسمانی گرمی کی وجہ سے نکلتے ہیں۔ اس وجہ سے بابر کو جلاب بھی دیا گیا تا کہ اس قسم کی شکایت آئندہ نہ ہو۔

۱۲۔ محمود الحسن صدیقی نے تاریخ معصومی پر اپنے تحقیقی مقالے کے آخر میں ضمیمہ اے میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ ہسٹری اوف ارغونس اینڈ ترخانس اوف سندھ۔ یونیورسٹی اوف سندھ ۱۹۷۲ ص ۲۰۸

پینتیس سال (۹۲۳۔ ۱۵۱۶۔ ۱۵۱۷) کی عمر میں بابر قندھار کی مہم پر تھا کہ وہاں بیمار ہوا۔ اس سال کے حالات وقائع میں نہیں ہیں اور اس کی تفصیلات ہم تک نہیں پہنچیں۔ تاریخ داں اس پر متفق ہیں کہ بیماری کی وجہ سے صلح ہوئی[۱۲]۔

۹۲۵ ہجری (۱۵۱۹ء) میں بابر کو مسلسل بخار کا سامنا کرنا پڑا جو اسے بار بار آتا رہا اور قبیح شکل اختیار کر گیا۔ جمعہ ۲۹ جمادی الاول بخار شروع ہوا[۱۳]۔ اس کا علاج فصد کھول کر کیا گیا۔ بخار بار بار دو تین دن کے بعد آتا۔ جب تک پسینہ نہ آجاتا بخار نہ اترتا۔ ٹھنڈے پسینے ٹی بی کی ابتدائی علامات ہیں۔

۱۳۔ ورق ۲۱۰

بارہ دن بخار رہا۔ ملا خواجہ نے شراب میں گل نرگس حل کر کے ایک دو مرتبہ پلایا۔ لیکن افاقہ نہیں ہوا۔ تین جمادی آلاخر کو اس نے جلاب لیا، اس کے علاوہ دارو کار (؟) بھی آزمائی۔ بیماری کے دوران بابر کو ڈولے میں لٹا کر لیجایا جاتا تھا۔ ۲۵ جمادی آلاخر کو اس نے قرآن شریف کی تلاوت سنی کہ اس کی برکت سے صحت یاب ہو۔ اس بیماری کے دوران معمول کی مصروفیات جاری رہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیماری بحرانی نہیں تھی بلکہ مرض کہن کا آغاز تھا۔

اسی سال ۱۳ رمضان المبارک کو کابل میں یوسف زئی افغانوں کے ساتھ ملاقات کے دوران باباجان

سائیس نے بابر کے لیے ایک گھوڑا تیار کیا جس کی زین کسی ہوئی نہیں تھی[14] بابر نے غصے میں اس کو گھونسہ مارا۔ بابر کا خیال تھا کہ اس چوٹ سے اس کا پنجا اتر گیا ہے، لیکن اس قسم کی چوٹ ہتھیلی کی چوٹ تھی اسمیں ہتھیلی کی کوئی ہڈی عام طور پر ٹوٹ جاتی ہے۔ یہ ایک معروف چوٹ ہے۔ اس تشخیص کی تصدیق اس وجہ سے اور ہو جاتی ہے کہ وقتی طور پر بابر کو درد نہیں ہوا لیکن بعد میں سوجن آجانے کی وجہ سے بابر کچھ لکھ نہیں سکا۔ بابر کہتا ہے کہ ۳۲ دن بعد اس نے لکھنا شروع کیا جو کہ اس ٹوٹی ہوئی ہڈی کے جڑنے کا صحیح وقفہ ہے۔ اگر جوڑ اترا ہوتا تو صحت یابی جلد ہونا چاہیے تھی۔

اڑتیس سال کی عمر میں (۹۲۶/۱۵۱۹۔۱۵۲۰) بابر کو ایک اور حادثہ پیش آیا۔ علی سنگ اور النگار پہاڑوں کے بیچ میں شکار کیا۔ کافی ہرن ہاتھ آئے۔ النگار کے ملک کے گھر پر دعوت ہوئی جہاں شکار کا گوشت استعمال ہوا ہوگا۔ کھانا کھاتے ہوئے بابر کا اگلا دانت ٹوٹ گیا۔ وہ لکھتا ہے کہ آدھا دانت پہلے ہی ٹوٹا ہوا تھا۔ آدھا اب ٹوٹ گیا۔[15]

۹۳۲/۱۵۲۵۔۱۵۲۶ میں بابر نے ہندستان کا رخ کیا۔ ہندستان فتح کرنے کا عزم و ارادہ تھا۔

صفر کے مہینے میں گندمک کے مقام پر اس کو سخت نزلہ ہوا۔ شیخ زین جو اس سفر میں بابر کے ساتھ تھا، نے اس مرض کو نزلہ کہا ہے[16] یہ جاڑے کے موسم کا آغاز تھا نومبر کی ۲۴ تاریخ جب کہ نزلہ زکام شروع ہو جاتا ہے۔ موسم بھی کچھ کم سرد نہیں کہ گندمک کابل میں باغ وفا سے ایک دن کے سفر کی دوری پر تھا۔ یادداشتوں میں ایک ہفتے کا وقفہ ہے۔ اس عرصے میں نزلے کے عارضے سے نجات ملی تھی۔

اسی مہینے ۲۲ صفر کو بیگرام میں ٹی بی کی علامات زیادہ واضح ہونے لگیں۔ مرض کا پہلا اثر ۹۲۵ ہجری، سات سال پہلے ہوا تھا اب مرض اس سے زیادہ ہو گیا نہ صرف بخار آیا بلکہ اس کے ساتھ کھانسی اور کھانسی میں خون آنا شروع ہوا۔[17] پہلے دن خون آیا اور جلد ہی بند ہو گیا۔ لیکن دو دن بعد پھر کھانسی کے ساتھ خون آیا اور مسلسل تین دن تک آتا رہا۔ بابر لکھتا ہے کہ میں خوف زدہ ہو گیا۔ لیکن جلد ہی جسمانی قوت مدافعت کام آئی اور مرض دب گیا۔ اس وقت اس کی عمر چوالیس سال تھی۔

شمال مغربی ہندستان فتح کرنے کے بعد بابر آگرہ میں ہی قیام پذیر ہو گیا۔ یہ ۹۳۳ (۱۵۲۶۔۱۵۲۷) کا ذکر ہے۔ اس کو یہاں ایک سازش کا شکار ہونا پڑا۔ سلطان ابراہیم لودھی کی ماں نے باورچی کے ساتھ سازش کر کے بابر کو زہر دلوادیا۔ نماز جمعہ کے بعد بابر کھانے پر بیٹھا۔ خرگوش کا گوشت، گاجر کا سالن کھایا کسی بھی کھانے کا مزا ناگوار نہ تھا۔ جب اس نے خشک گوشت کے ایک دو لقمے لئے تو لقمہ بدمزہ محسوس ہوا، متلی اور قے شروع ہو گئی۔ آبدست خانے میں جا کر اس نے خوب قے کی۔ یہ زہر ایک کتے اور دو نوکروں کو بھی کھلایا گیا۔ بیان کردہ کیفیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ زہر معدے کی سوزش پیدا کرنے کا سبب ہوا۔ بابر نے اس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے دودھ اور گل مختوم (چکنی مٹی) کا استعمال کیا۔ تین چار دن میں سب انسان و جانور صحت یاب ہو گئے۔ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک ہلکا زہر ہوگا۔ بابر نے اس کی نوعیت پر کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔ اس سے کسی مستقل خرابی کے آثار نہیں ملتے۔

اسی سال ۲۳ جمادی الاول کو بابر نے شراب سے توبہ کی۔ اس کے تین سو مصاحبوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔[19]

اسی سال ذیقعد کے مہینے میں ٹی بی کی علامات پھر ظاہر ہوئیں۔ مرض پرانا ہو چکا تھا۔ اس دفعہ خون نہیں آیا بخار کے ساتھ ساتھ کمزوری بڑھتی گئی۔ بخار کا زور سترہ دن تک رہا۔[20] پھر دس دن افاقہ رہا پھر نو دن تک بخار آیا۔ بخار کا دوسرا حملہ ۲ ذوالحجہ سے شروع ہوا اور اگلے سال (۹۳۴) میں بھی جاری رہا،[21] ۱۶ محرم (۳۶ دن بعد)

۱۴۔ ورق ۲۱۷

۱۵۔ ورق ۲۲۶

۱۶۔ شیخ زین، طبقات بابری ترجمہ سید حسن عسکری۔ ادارہ ادبیات، دلی ۱۹۸۲، ص ۳

۱۷۔ ورق ۲۲۸

۱۸۔ ورق ۲۸۱

۱۹۔ ورق ۲۹۶

۲۰۔ ورق ۳۰۷

۲۱۔ ورق ۳۰۸

پھر بخار ہوا اس کے ساتھ کمزوری بڑھ گئی جو ۲۵/۲۶ دن تک جاری رہی۔ وہ انتہائی لاغر ہو گیا، درد اور پیاس بڑھ گئی۔ رات کو نیند نہ آئی نیند کے لئے اس کو خواب آور دوائیں دی گئیں۔ آہستہ آہستہ افاقہ ہونا شروع ہوا لیکن افاقہ پائیدار نہ تھا۔

اسی سال جمادی الاول کے مہینے میں دریائے گومتی کو پار کرتے ہوئے لکھنؤ کے پاس بابر کے کان میں نہاتے ہوئے پانی چلا گیا[۲۲]۔ کان میں پانی جانے سے کان کا میل پھول جاتا ہے، کان کی نالی بند ہو جاتی ہے۔ بابر کا کان بھی بند ہو گیا اور کان میں درد شروع ہو گیا۔ بابر نے یہ نہیں لکھا ہے کہ اس کا کیا علاج کیا لیکن جلد ہی اس تکلیف سے شفا ہو گئی۔

۹۳۴ (۱۵۲۷۔۱۵۲۸ء) کے پچھلے نصف حصہ میں ٹی بی کے عارضے نے پھر آدبوچا۔ بابر کی یادداشتوں میں چھ مہینے کا وقفہ ہے جو ۹۳۵ھ کے اوائل تک کا ہے۔ یہ وقفہ بیماری کی وجہ سے ہی تھا۔ اس مرض کے دورانیہ کا وقفہ بابر نے اگلے سال کے ذکر میں تیس چالیس روز لکھا ہے[۲۳] اس دوران دماغی طور پر بابر مستعد رہا۔ اینٹ بیورج کا خیال ہے کہ اس بیماری کے دوران ہی بابر نے اپنا دیوان لکھا جو بعد میں دیوان رام پور مشہور ہے۔[۲۴]

۹۳۵ھ (۱۵۲۸۔۱۵۲۹ء) میں جب بابر کی عمر ۴۷ سال تھی اور وہ گوالیار میں تھا بروز ۱۱ محرم اس کے کان میں درد ہوا۔ درد شدید تھا، اس قدر شدید کہ اس کے لئے بابر کو افیون کا سہارا لینا پڑا۔[۲۵] اس نے افیون کافی مقدار میں لے لی جس کی وجہ سے درد کم ہوا لیکن صرف تھوڑے عرصے کے لئے نیند آئی۔ قے بھی ہوئی اور کمزوری بھی۔ یہ درد کان کے درمیانی حصے میں سوجن کی وجہ سے ہوا ہوگا۔ بابر کے اس کان کے درد سے متعلق گوالیار میں ایک نظم مشہور ہے

صیح کان کی پیڑا بھئی	دینی خبر شیخ کون صیح
دکھت کان ہماروآہی	شیخانی دعا دیمی روچی پائی
گنگونے کچھو حکمت کری	اچھو کان بھیو تبھی گھڑی

اس کے علاوہ یہ بھی مشہور ہے کہ یہ شیخ گوالیاری تھے جنہوں نے بابر کے لیے دعا کی۔ لیکن بابر نے اس سلسلے میں کچھ نہیں لکھا۔

محرم ہی کے مہینے میں گوالیار سے واپسی پر سیکری کے مقام پر کان میں درد رہا۔ اس میں بھی کافی شدت تھی۔ بابر کا کہنا ہے کہ یہ نزلے کے بعد ہوا[۲۷]۔ یہ اسی پہلے کان کی سوجن کا تسلسل ہے۔ اس پر بھی بابر رکا نہیں دوسری صبح سیکری سے روانہ ہو کر دھولپور پہنچ گیا جہاں بابر ایک باغ لگا رہا تھا۔

صفر کی ۲۳ تاریخ کو بابر پھر اُسی موذی مرض کی لپیٹ میں آیا[۲۸]۔ پچھلے سال کے چالیس روزہ بیماری سے وہ مکمل صحت یاب نہیں ہوا ہوگا۔ یادداشتوں میں گیارہ دن کا وقفہ ہے جب دوبارہ لکھنا شروع کیا تو کہتا ہے کہ سیماب (پارہ) استعمال کر رہا ہوں۔ سیماب طب میں کشتوں میں استعمال کرایا جاتا ہے اس کا مقصد دل ودماغ کی کمزوری کو دور کرنا ہے۔ یہ یقیناً بیماری سے صحت یابی کے لیے ہوگا۔ اس دفعہ بخار ۱۵/۲۰ دن تک رہا۔ اسی دوران بابر نے رسالہ والدیہ کو ترکی میں نظم کیا۔

اسی سال ۱۳ رمضان المبارک کو بابر کے جسم پر پھوڑے نکل آئے جو کافی تکلیف دہ تھے۔ اس کے معالج نے ترکی طریقے پر ان کا علاج مرچوں کی بھاپ سے کیا۔[۲۹] یہ علاج ۲۳ رمضان تک جاری رہا۔ پھوڑے اس بھاپ سے پھوٹ گئے ہونگے اور پیپ کے اخراج کے بعد صحت یابی ممکن ہوئی ہوگی۔ بابر جلد ہی اس قابل ہو گیا کے گنگا میں نہا سکے اور اپنی پسندیدہ معجون سے لطف اندوز ہو سکے۔ یہ آخری بیماری ہے۔ جس کا ذکر بابر نے کیا ہے۔

۲۲۔ ورق ۳۱۵

۲۳۔ ورق ۳۲۲

۲۴۔ بیورج، اینٹ۔ بابرنامہ۔ سنگ میل پبلیکشنز، ۱۹۷۹، ص ۶۰۲

۲۵۔ ورق ۳۱۷

۲۶۔ فضل علی، کلیات گوالیاری، موہن کمار ماتھر، ڈاکٹر ہری نواس دیویدی ریسرچ فاؤنڈیشن۔ گوالیار، ۲۰۰۰، ص ۲۱

۲۷۔ ورق ۳۲۱

۲۸۔ ورق ۳۲۳

۲۹۔ ورق ۳۳۴

اس عرصے میں بابر کی صحت مسلسل گر رہی تھی ۱۹۳۶ اور ۹۳۷ ہجری کے خودنوشت حالات موجود نہیں۔ مرض الموت کا راوی بھی کوئی نہیں۔ قریب ترین افراد گلبدن بیگم اور مرزا حیدر دوغلت ہیں۔ مرزا حیدر کہتے ہیں کہ ''سال ۹۳۷ھ میں بادشاہ کو کئی امراض کہن نے گھیر لیا تھا۔''[۳۰] گلبدن بیگم کا بیان زیادہ تفصیلی ہے۔ بابر کے انتقال کے وقت اس کی عمر آٹھ سال تھی۔ ان کا بیان سنی ہوئی باتوں پر مشتمل ہے۔ وہ بیان کرتی ہے کہ اپنی زندگی ہمایوں پر قربان کرنے کے بعد بھی بابر ۲/۳ ماہ تک صاحب فراش رہا اور مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی' اس دوران ہمایوں صحت یاب ہو کر چلا گیا۔ اس کو بابر کی بیماری بڑھتا دیکھ کر واپس بلا لیا گیا۔ جب اس نے باپ کو دیکھا تو کہا

یہ اتنے کمزور کیسے ہو گئے؟[۳۱] اس آخری بیماری کے دوران بابر دماغی طور پر مستعد رہا۔ اس نے اپنی بیگم سے بیٹیوں گلرنگ و گل چہرہ کی شادی کرنے کو کہا۔ بیماری کے آخری دنوں میں بابر کو پیٹ میں تکلیف ہو گئی تھی یہ کیفیت اس بات کی علامت تھی کہ ٹی بی پیٹ تک پھیل چکی تھی اور آنتیں اس سے متاثر ہو گئی تھیں۔ اس کے تین دن کے بعد بابر کی روح قفس عنصری کو پرواز کر گئی انا للہ وانا الیہ راجعون۔

گلبدن بیگم نے یہ بھی لکھا ہے کہ بابر کی صحت آہستہ آہستہ پچھلے پانچ سال سے گر رہی تھی اور اس کے خیال میں یہ زہر خورانی کی وجہ سے تھا۔ لیکن طبی نقطہ نظر سے زہر کا اثر وقتی تھا۔ بابر کا مرض شاید ۹۲۴ ہجری میں شروع ہوا۔ لیکن کیونکہ اس بیماری کے حالات خودنوشت میں موجود نہیں' ۹۲۵ھ کی بیماری مسلسل بخار ضرور اس کی شروعات ہیں۔ بابر قد و قامت میں عام انسان سے بڑا اور توانا تھا۔ کھیلوں اور شکار کا شوقین تھا۔ تلوار بازی اور تیر اندازی نے اس کو جسمانی طور پر مضبوط بنا دیا تھا۔ وہ آگرے کی فصیل پر دو آدمیوں کو بغل میں دبا کر دوڑ سکتا تھا اور ساتھ ساتھ بیچ میں اگر دیوار میں خلا ہوتا تو اس پر سے بھی پھلانگ جاتا تھا[۳۲] ۹۰۷ھ میں دریائے سیر پر جس کے کنارے برف جمی ہوئی تھی اور جس وقت کئی لوگ سردی سے سکڑ کر انتقال کر گئے تھے اس نے یخ بستہ پانی میں سولہ مرتبہ ڈبکیاں لگائیں اور نہایا۔ ایسے مضبوط جسم کے حامل شخص کی موت اگر ۴۹ سال میں ہو جائے یہ طبی طور پر اس طرح سمجھ میں آ سکتا ہے کہ بار بار بخار آنے کھانسی ہونے کھانسی میں خون کو ایک تسلسل سے دیکھا جائے۔ وسط ایشیا جہاں کا موسم سرد اور انسان توانا ہوتے ہیں جب ان کا واسطہ جنوبی گرم ممالک سے پڑتا ہے جہاں موسم خراب، بیماریاں زیادہ، صحتیں کمزور اور زندگی کا اوسط کم ہو تو اس قسم کی بیماریاں آدمی کو گھلا کر رکھ دیتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ بابر لمبی عمر نہ پاتا

۳۰۔ مرزا حیدر دوغلت۔ تاریخ رشیدی (فارسی) ہارورڈ ۲۰۰۲ ورق ۱۶۱۔

۳۱۔ گلبدن بیگم۔ ہمایوں نامہ (فارسی) اینٹ بیورج۔ سنگ میل ۱۹۷۴، ورق ۱۷

۳۲۔ طبقات اکبری۔ نظام الدین احمد ترجمہ محمد ایوب قادری۔ اردو سائنس بورڈ، لاہور۔ ۱۹۹۰ ج ۲ ص ۵۲

زبان یارمن ترُکی۔۔۔۔

بچپن سے سنتے چلے آئے ہیں کہ اردو زبان ہندی، فارسی عربی اور ترکی کے ملاپ سے وجود میں آئی ہے۔ ساتھ میں یہ بھی باور کرایا گیا کے فارسی کا اثر زیادہ ہے۔ فارسی عرصہ دراز تک ہندستان کی سرکاری، دفتری اور کسی حد تک عام بول چال کی زبان بھی رہی ہے، یعنی اردو زبان فارسی کی بہن ہے۔ عربی کا اثر زیادہ تر مذہبی اور سائنسی کتب میں نظر آتا ہے۔ ہندی نے روزمرہ کے معاملات اور رابطے کا کام کیا، بے شمار تحائف اردو کو دیئے، لیکن ترکی کا کیا اثر ہے یہ ہمیں نہیں بتایا گیا۔ عام تاثر یہ ہے کہ یہ دور پرے کی زبان ہے جس کا معمولی اثر اردو زبان پر پڑا۔ لیکن اس بیان سے زیادہ غلط بیانی نہیں ہو سکتی۔

ترکی وسط ایشیا کے ایک بڑے علاقے کی زبان ہے۔ یہ علاقہ منگولیا سے شروع ہوتا ہے اور بحر شرق الاوسط تک پہنچتا ہے۔ شمال میں قزاقستان اور جنوب میں افغانستان، ایران اور شام تک یہ زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے چنگیز خاں اور منگولوں نے اس کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ہندو پاکستان کے علاقوں میں زیادہ تر حملہ آور وسط ایشیا سے ہی آئے ان کے ساتھ ترکی زبان بھی آئی۔ اگر موجودہ اردو زبان میں فارسی کے چالیس فیصد الفاظ ہیں تو تیس فیصد الفاظ ترکی کے بھی ہیں، ہمیں اس کا اندازہ ازبکستان پہنچ کر ہوا۔ شہر ہو، قصبہ ہو کہ قریہ ہر جگہ دہقان بازاری موجود ہے۔

آپ کہاں رہتے ہیں؟

جی میں فلاں کوچے میں رہتا ہوں۔

ہر گلی کے نکڑ پر گوشت دکانی موجود ہے۔ اب بھی وہاں کھانے میں "شوربہ" خوب چلتا ہے۔

ترکی زبان بولنا اور سمجھنا فارسی کے مقابلے میں اگرچہ مشکل ہے اس میں کچھ ہماری عدم توجہی کچھ نظام تعلیم ترتیب دینے والوں کی نا اہلیت کو داخل ہے۔ آپا، باجی، بیگم۔ خاں اور خانم سب ترکی الفاظ ہیں[1]۔ ازبکستان میں سفر کے وقت آپ کو ہر شہر میں داخلے اور اخراج کے وقت دستاویزات دکھانی پڑتی ہیں۔ ہمارا ڈرائیور قزاق اور چالاک تھا ایک دو دفعہ کے تجربے کے بعد اس نے کہنا شروع کر دیا "تم ازبک" گاڑی تلاش گاہ سے تھوڑی دور روکتا۔ خود اتر کر سپاہیوں کے پاس جاتا۔ ترکی میں سرگوشی میں کچھ کہتا اور ہم ازبک بن کر گزر جاتے۔ اس امتحان کے بعد دیکھیئے زبان ہی نہیں شکل بھی ترک ہو گئی۔ یعنی ترک، ہندو کی جو روایت مغلیہ ہندستان میں تھی آج بھی قائم ہے۔[2]

اتنے بڑے علاقے کی زبان کا کیا حشر ہوا یہ انتہائی افسوس ناک کہانی ہے۔ یہاں بے شمار مسلمان قبائل آباد تھے۔ اوغوز، ترک، ازبک، قزاق اور کرغیز سب کی زبان ترکی تھی۔ جس وقت روس نے ان پر قبضہ کیا اور دوسری طرف مصطفیٰ کمال پاشا نے اپنی اصلاحات زبان تک بڑھائیں تو زبان کا حلیہ ہی بدل گیا۔ اب لوگ مختلف زبانوں کی بات کرتے ہیں۔ میں کرغیز بولتا ہوں۔ یہ ترکمانی زبان میں بات کرتا ہے۔ اس کے اظہار خیال کے لئے آذربائی جانی زبان ہے، فلاں نے قزاقی زبان سے استعداد پیدا کی ہے۔

رسم الخط کا بھی بیڑا غرق ہو گیا۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے رومن رسم الخط کو اپنا لیا۔ وسط ایشیا کی ریاستوں کو روس نے مجبور کیا کہ وہ کریلیک خط اپنائیں۔ ازبکستان اب کریلیک سے بیزار آ گیا ہے اور وہ اس کو چھوڑ کر رومن رسم الخط اپنانا چاہتا ہے، یعنی سونے پر سہاگہ، ہزاروں سال کی تاریخ، مضامین، کتب و تحقیق سب سے تعلق

[1] ۱۔ ایچ مارس عمل۔ وسط ایشیا۔ کراچی یونی ورسٹی کراچی ۱۹۹۹ص ۲۰۷

[2] ۲۔ ایچ مارس شمل۔ مغلوں کی سلطنت۔ ری ایکشن بکس ۲۰۰۴ص ۲۳۶

منقطع۔ ایک چکر سے نکل کر دوسرے چکر میں پھنس جانا کون سی عقلمندی ہے۔ جدید ترکی زبان میں رومن رسم الخط اس لئے اپنایا گیا تھا کہ ترکی پڑھنا آسان ہو جائے اور ترکی زبان یورپین زبانوں کے قریب ہو جائے۔ اس سلسلے میں ایک امریکی ترکی مستشرق کیا کہتا ہے، "جدید ترکی الفاظ کا املا اس قدر انوکھا ہے کہ الفاظ (مثلاً اریسیس (ای آر سی آئی ایس) سے ان لوگوں کو جو ترکی نہیں جانتے قطعاً کوئی اندازہ نہیں ہوتا کہ صحیح تلفظ کیا ہے۔ اس لئے ترکی مقامات کے نام کے ہجے (میں نے) ترکی الفاظ کے بجائے انگریزی الفاظ میں دیئے ہیں (ارجیش)۔[3]
قوموں کی ترقی رسم الخط سے نہیں ہوتی۔ اس کی روشن مثالیں موجود ہیں جاپان کو دیکھ لیں چین نے کون سا رسم الخط بدل لیا جو اس قدر آگے ہے؟

ترکی زبان سے ہندو پاکستان کے تاریخی رشتے قدیم ہیں۔ اردو یا اور دو خود ترکی لفظ ہے جس کے معنی لشکر کے ہیں۔ جب سلطان محمود غزنوی ۱۰۰۱ء میں ہندستان آیا[4] اور ہندستان کے پھلوں سے لطف اندوز ہوا تو اس کو آم بہت پسند آیا، پوچھا یہ کیا ہے؟ عرض کیا آم۔ (آم ترکی زبان میں اندام نہانی کو کہتے ہیں۔) بہت جز بز ہوا۔ بولا اتنا اچھا اور میٹھا پھل اور نام اتنا فحش ہم آج سے اس کو نغزک کہیں گے۔[5] چنانچہ امیر خسرو فرماتے ہیں۔[6]

نغزک خوش، نغزک بوستاں — نغز ترین میوہ ہندوستاں

محمود غزنوی کے علاوہ البتگین، سبکتگین اور التمش تو ترک مشہور ہی ہیں۔ لیکن خواجہ نظام الدینؒ، خواجہ بختیار کاکیؒ بھی ترک ہیں۔ دکن کے بہمنی بادشاہ بھی ترکی بولا کرتے تھے۔ نظام حیدر آبادی بھی تورانی ہیں۔

جب بابر کا ذکر آتا ہے تو ترکی زبان و بیان سے رشتے مضبوط ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بابر ترکی بولتا تھا۔ وہ جس علاقے میں پیدا ہوا وہ ترکی کا گڑھ تھا اور آج بھی وہاں ترکی رواں ہے۔ پڑھے لکھے ہوں یا جاہل بابر کے مطابق کوئی ایسا نہیں جو ترکی نہ جانتا ہو۔ بابر نے اپنی سوانح ترکی میں لکھی۔ یہ ترکی انشاپردازی کا شاہکار ہے۔ اس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ اس کے علاوہ بابر نے ترکی زبان کی شاعری اور اس کے نظام پر ایک کتاب عروض لکھی۔ بابر نے ہی اپنے بیٹے کامران کی مذہبی تعلیم کے لئے دو ہزار ترکی اشعار پر مشتمل نظم مبین لکھی جس میں اس نے فقہ حنفی کے احکامات نظم کئے ہیں۔ یہ نظم ابھی روس کے وسط ایشیا پر قبضے سے پہلے مدرسے کے بچے قرآن کے بعد ازبر کیا کرتے تھے۔ بابر کا اپنا دیوان بھی نوے فیصد ترکی زبان میں ہے۔ بابر اپنے ترکی تعلق پر ہندستان کے ایک امیر کو لکھتا ہے۔[7]

نہ جھگڑ ترک سے، اے میر بیانہ — چلاکی و مردانگی ترک ہے عیاں
تو گر نہ آیا اور نصیحت نہ سنی — جو ہو گا اس کی نہیں ضرورت بیاں

ہمایوں بھی ترکی سے واقف تھا اور کئی جگہ اس ترک مخطوطے پر جو بابر نے اس کو بھیجا تھا اور جواب ایڈنبرا میں محفوظ ہے اپنے ہاتھ سے اس نے نوٹ لکھے ہیں[8]۔ ہمایوں کا سپہ سالار اور اکبر کا اتالیق بیرم خاں ترکی زبان کا شاعر تھا۔ اس کا دیوان ترکی و فارسی دو دفعہ شائع ہو چکا ہے۔[9] ہمایوں کے بھائی کامران مرزا کا دیوان ترکی اب تک خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔ بیرم خاں کے بیٹے عبدالرحیم خان خاناں ترکی زبان کے عالم تھے۔ اکبر نے ان کو بابر کی سوانح کا ترکی سے فارسی میں ترجمے کا کام سونپا تھا۔[10]

ظہیر الدین مرزا ایک مغل شاہزادے تھے جو انیسوں صدی میں لال قلعے سے ہجرت کر کے پہلے لکھنؤ

۳۔ تھیکسٹن، ڈبلیو۔ حبیب السیر (انگریزی ترجمہ) ہارورڈ ۱۹۹۳ء ص گیارہ (رومن)

۴۔ رام پرشاد کھوسلہ، من موہن، تاریخ ہندستان، نئی دہلی ۱۹۹۳ء ص ۹۰۔

۵۔ سید احمد دہلوی۔ فرہنگ آصفیہ۔ ج ۱ ص ۲۲۱

۶۔ امیر خسرو۔ قران السعدین۔ علی گڑھ ۱۹۱۸ء ص ۹۱

۷۔ ظہیر الدین بابر۔ اینٹ بیورج۔ سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور ۱۹۷۹ء ص ۵۲۹

۸۔ وقائع۔ ترکی مخطوطہ۔ ایڈنبرا

۹۔ دیوان بیرم خاں۔ کراچی یونیورسٹی ۱۹۷۱ء

۱۰۔ واقعات بابری۔ مرزا عبدالرحیم خان خاناں۔ مخطوطہ ۲۴۴۱۶ برٹش لائبریری لندن

پھر پٹنہ اور آخر میں مدراس پہنچے۔ ساری عمر ترکی پڑھانے میں بسر کی۔ ترکی زبان کی گرامر لکھی۔[11]

مرزا غالب تو اپنے آپ کو ترک اور افراسیاب کی اولاد بتاتے تھے جو کے شاہنامہ فردوسی کا افسانوی کردار ہے۔ وہ بہادر شاہ ظفر سے اپنی درخواست میں ترک اور فوجی تعلق ظاہر کرتے ہیں۔

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری

آج سے تقریباً اسی، سو سال پہلے تک ہمارے ہاں ترکی بولنے والے اور پڑھنے والے مل جایا کرتے تھے۔ چنانچہ مرزا نصیر الدین حیدر جنہوں نے وقائع بابری کا اردو ترجمہ کیا، مولوی سید آفندی اور چند شہزادگان تیموریہ چاندنی محل دہلی میں جمع ہو کر ترکی میں مجلس کیا کرتے تھے۔[12]

اب بھی ایسے حضرات موجود ہیں جنہوں نے ترک و برصغیر کے رشتے کو قائم رکھا ہوا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس جنہوں نے کئی سال ازبکستان میں اردو پڑھائی اور حال ہی میں بابر کی شاعری کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ یہ ترجمہ بابر کی شاعری میں سے انتخاب ہے[13]۔ انصار الدین ابراہیمو جنہوں نے لکھنو میں اردو سیکھی، تاشقند میں رہتے ہیں، وہاں یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔ ان کی پی ایچ ڈی کا مقالہ بابر نامے کے ہندی اردو الفاظ پر ہے۔[14] ڈاکٹر محمد صابر نے پاکستان میں یہ میدان سنبھالا ہوا ہے علی شیر نوائی پر ان کا کام ہے اور بیرم خاں کے دیوان کی ترتیب بھی انہی کی ہے۔

۱۱۔ اظفری گورگانی۔ معروف اللغت، مخطوطہ برٹش لائبریری آئی او ۳۳۷

۱۲۔ تزک بابری، مرزا نصیر الدین حیدر۔ دہلی ۱۹۲۴ ص ۳

۱۳۔ قمر رئیس، ظہیر الدین بابر شخص و شاعری۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۲ ص ۵۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر محیہ عبدالرحمانووا کی مدد سے ترکی سے روسی اور پھر اردو کیا گیا ہے۔

۱۴۔ انصار الدین ابراہیمو۔ بابر نامے کے ہندی اردو الفاظ۔ تاشقند ۲۰۰۲۔

شاہ ودرویش

شاہان ترک ومغل حملے کے وقت ایک طرف سپاہ رکھتے تھے اور ان کے جلو میں درویش وفقرا ہوتے تھے کہ اِن کا وجود باعث برکت اور ان کی دعائیں ذریعہ کامیابی ہوں۔ اس کی ایک عمدہ مثال خواجہ زادگان اور شاہان وسط ایشیا کے تعلقات میں ملتی ہے

سلسلہ خواجگان جو خواجہ بہاء الدین نقشبند کے بعد سلسلہ نقشبندیہ کہلایا وسط ایشیا کا قدیم سلسلہ صوفیہ ہے[1] خواجہ عبیداللہ احرار اس کے درخشاں ستارے ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۴۰۴/۸۰۶ میں ہوئی۔[2] تیمور کے پڑپوتے، سلطان ماوراء النہر ابوسعید مرزا سے ان کے گہرے اور قریبی تعلقات تھے۔ ابوسعید اپنے آپ کو خواجہ احرار کا مرید بتاتے تھے۔ ایک دفعہ تو سلطان ابوسعید عقیدت اور احترام کے طور پر خواجہ احرار کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ پیدل چلے تھے۔ خواجہ کے کہنے پر ہی ابوسعید نے شریعت نافذ کی تھی اور غیر شرعی ٹیکس معاف کر دیئے تھے۔[3] سمرقند میں حکومتی امور میں خواجہ احرار کا بڑا عمل دخل تھا۔ کسی کو خواجہ کے حکم سے انکار کی مجال نہ تھی۔

جب ابولقاسم بابر نے سمرقند پر حملہ کیا (۱۴۵۴/۸۵۸) اس وقت ابوسعید نے ہمت ہار دی تھی لیکن خواجہ کی ترغیب پر ہی ابوسعید نے حفاظت کا انتظام کیا۔ مرزا محمد جوکی نے شاہ رخیہ میں بغاوت کی (۱۴۶۲/۸۶۷) اس پر ابوسعید نے شاہ رخیہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ ایک سال تک جاری رہا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مرزا محمد جوکی نے خواجہ احرار کے پاس آدمی بھیجا اور معاہدہ کرانے کی درخواست کی۔ چنانچہ خواجہ وہاں تشریف لائے اور صلح کرائی۔[4]

اسی طرح بابر کے چچا اور ماموؤں کی آپس کی لڑائیوں میں بھی خواجہ احرار نے بیچ بچاؤ کرایا تھا۔ ایک دفعہ بابر کے باپ عمر شیخ مرزا نے اپنے بھائی سلطان محمود مرزا کے ساتھ مل کر اپنے بڑے بھائی سلطان احمد مرزا پر حملہ کر دیا، عین جنگ کے وقت خبر آئی کہ خواجہ تشریف لا رہے ہیں۔ تینوں بھائیوں کے درمیان جنگ رک گئی۔ خواجہ نے آ کر اپنا خیمہ عین میدان جنگ میں فوجوں کے درمیان گاڑ دیا۔ تینوں بھائیوں کو اپنے خیمے میں بلا کر قالین پر بٹھایا اور نصیحت کر کے صلح کرا دی۔

بابر کے نانا یونس خاں مغلستان کے حکمراں تھے۔ آپ نے بہتر سال عمر پائی۔ آخر عمر میں مے نوشی سے توبہ کی۔ اور خواجہ کے مرید ہو گئے۔ خواجہ نے مرغینان میں ان سے ملاقات کی تھی اور ان کے عادات واطوار کی تعریف بھی کی۔ خواجہ کے کہنے کے بعد ہی ترکستان میں لوگوں نے مغلوں کو غلام بنانا چھوڑ دیا تھا۔[5]

بابر کے والد عمر شیخ مرزا بھی خواجہ احرار کی بہت عزت کرتے تھے اور ملاقات کے لئے انہیں بلاتے رہتے تھے۔ بابر کی پیدائش کے جشن میں بھی خواجہ تشریف لائے تھے۔

بابر نے تحریر کیا ہے کہ بابر کے چچا سلطان احمد مرزا خواجہ کی محفل میں ادب سے بیٹھا کرتے تھے اور یہاں تک کے پہلو بھی نہیں بدلتے تھے۔ ایک مجلس میں جب سلطان احمد مرزا نے پہلو بدلا تو خواجہ کو تعجب ہوا۔ خواجہ کے نوکروں نے اس جگہ کو دیکھا تو وہاں ایک ہڈی پڑی تھی۔[6]

بابر آٹھ سال کا تھا جب خواجہ احرار کا انتقال ہوا (۱۴۹۱/۸۹۶)۔ بابر نے ہمیشہ ان کی قدر و منزلت کی۔ برے حالات کے زمانے میں جب بابر سمرقند کو فتح کرنے کا سوچ رہا تھا اس وقت اس نے خواجہ کو خواب میں

۱۔ ریاض السلام۔ صوفی ازم ان ساؤتھ ایشیا آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۲۰۰۲ ص ۱۲۴

۲۔ حامد الگار۔ انسائیکلوپیڈیا اسلام۔ دوسری اشاعت

۳۔ کیمرج ہسٹری اوف ایران ج ۶ ص ۱۱۷

۴۔ خواند امیر۔ حبیب السیر۔ ہارورڈ ۱۹۹۴، حصہ ۳ ج ۲ ورق ۸۲

۵۔ مرزا حیدر دوغلت، تاریخ رشیدی (ترجمہ انگریزی) ہارورڈ ۱۹۹۶ ص ۵۲

۶۔ ورق ۷ب

دیکھا، انہوں نے بابر کو یہ پیغام پہنچایا کہ شیخ مصلحت نے تمہیں بخش دیا (سمرقند)۔ [7] شیخ مصلحت خجند کے معروف ولی ہیں۔

خواجہ مولانا قاضی بابر کے نائب اور معتمد تھے اور اندجان میں بابر کے احکامات کی تکمیل میں مصروف عمل تھے۔ بابر کے مخالفین نے مولانا قاضی کو شہید کر دیا۔ بابر نے ان کو ولی کہا ہے۔ مولانا قاضی خواجہ احرار کے شاگرد و مرید تھے۔ [8]

اپنی بیماری سے صحت یاب ہونے کے لئے بابر نے خواجہ احرار کا رسالہ والدیہ فارسی زبان سے ترکی میں نظم کیا۔ اس میں یہ خواہش شامل تھی کہ جس طرح قصیدہ بردہ کا مصنف قصیدہ لکھنے کی برکت سے فالج سے صحت یاب ہو گیا تھا اسی طرح مجھے بھی تندرستی نصیب ہو[9]۔ خواجہ کا مزار سمرقند میں ہے۔ قبر چبوترے پر ہے۔ اوپر کوئی چھت وغیرہ نہیں۔ [10]

خواجہ احرار کے دونوں بیٹوں خواجہ خواجکا اور خواجہ یحییٰ کا ذکر وقائع میں ہے۔ ۹۰۱/۶-۱۴۹۵ میں سمرقند کی بادشاہت پر دو بھائیوں میں جھگڑا ہوا۔ خواجکا خواجہ بڑے بھائی بایسنغر مرزا کے طرف دار اور خواجہ یحییٰ چھوٹے بھائی علی مرزا کے حمایتی ہو گئے[11]۔ خواجہ یحییٰ علی مرزا کی طرف سے بابر کے پاس معاہدہ کرنے بھی آئے تھے۔ اس کے اگلے سال بابر اور علی مرزا نے مل کر سمرقند پر حملہ کیا[12]۔ خواجہ یحییٰ اور ان کے دو بیٹوں کو شیبانی خاں نے قتل کروا دیا تھا۔ بڑے بھائی خواجکا خواجہ شیبانی خاں سے بچ کر اندجان آ گئے تھے۔ ان کی قبر اندجان میں ہے[13]۔ خواجکا خواجہ کے بیٹے خاوند محمود (خواجہ نورا) کا ذکر حیدر مرزا دوغلت نے تفصیل سے کیا ہے۔ خاوند محمود خواجہ احرار کے انتقال کے وقت ۲۷ سال کے تھے۔ آپ نے طویل سفر کیے۔ عراق، اناطولیہ، مصر اور پھر حج کرتے ہوئے گجرات پہنچے۔ بابر اس وقت کابل میں تھا، یہ کابل آئے اور بابر کے ساتھ ہی سمرقند گئے۔ یہ بابر کا سمرقند پر تیسرا حملہ تھا۔ لیکن جب بابر سمرقند سے واپس لوٹا تو یہ وہیں رک گئے۔ ماوراء النہر پر اس وقت شیبانیوں کا قبضہ ہو چکا تھا جو خواجہ زادگان کو پسند نہیں کرتے تھے اس لئے یہ مشرقی ترکستان یعنی کاشغر و طرفان میں وہاں کے خاں سعید خاں کے پاس آ گئے۔ خاوند محمود کے کاشغر آنے کا قصہ مرزا حیدر نے یہ لکھا ہے کہ حاجی قاسم جو خواجہ احرار کے ملازم تھے، خاوند محمود کے پاس آئے اور کہا کہ خواجہ احرار نے کہا (خواب میں) ہے کہ یہ دو گھوڑے لو اور کاشغر چلے جاؤ۔ خاوند محمود اچھے طبیب بھی تھے۔ انہوں نے طب کی تعلیم شیراز میں حاصل کی تھی۔ مرزا حیدر نے ان کے علاج کے قصے لکھے ہیں۔ [14]

خواجہ یوسف خواجکا خواجہ کے سب سے چھوٹے بیٹے اور خاوند محمود کے سوتیلے بھائی تھے۔ یہ بھی کاشغر آ گئے تھے لیکن ان کی اپنے بڑے بھائی سے نہ بنی اس لئے خاوند محمود کاشغر سے بدخشاں اور پھر ہندستان آئے۔ ہندستان آنے کا مقصد ہمایوں سے بابر کی تعزیت کرنا تھا۔ ہمایوں اسوقت اپنی مشکلات میں گھرا ہوا تھا وہ پہلے خاوند محمود سے بیعت ہوا لیکن کچھ عرصہ کے بعد شیخ پھول سے متاثر ہو کر ان سے بیعت کر لی۔ خاوند محمود اس لئے واپس روانہ ہوئے، ہمایوں نے روکنے کی کوشش کی تو انہوں نے یہ شعر لکھ کر بھیجا۔ [15]

همای گو مفکن سایه شرف هرگز
در آن دیار که طوطی کم از زغن باشد

(اے ہما اس جگہ اپنا سایہ نہ کر کہ جہاں طوطی کی قدر کوے سے کم ہو)

خاوند محمود سمرقند میں مدفون ہیں۔ آپ کی یادگار طب کی ایک کتاب تحفہ خانی ہے۔ [16]

خاوند محمود کے چھوٹے بھائی خواجہ یوسف کاشغر میں ہی رہے۔ ان کے تعلقات سلطان سعید خاں اور

۷۔ ورق ۷۰

۸۔ ورق ۴۶

۹۔ ورق ۳۲۲

۱۰۔ کوثر چاندپوری نے حکیم اجمل خاں، (نسیم بک ڈپو، لکھنو ۱۹۷۳، ص ۲۰) میں یہ لکھا ہے کہ خواجہ کے مزار پر ان کے صاحب زادوں نے نہایت شاندار عمارت بنائی۔ یہ خلاف حقیقت ہے۔

۱۱۔ ورق ۳۲

۱۲۔ ورق ۳۴

۱۳۔ عارف نوشاہی۔ احوال و سخنان خواجہ عبید اللہ احرار۔ مرکز دانشگاہی تہران، ۱۳۸۰، ص ۶۷

کوثر چاندپوری (حواشی ۹، ص ۲۱) نے ان کی قبر تاشقند میں بتائی ہے جو صحیح نہیں۔

۱۴۔ مرزا حیدر دوغلت، تاریخ رشیدی (انگریزی ترجمہ) ہارورڈ ۱۹۹۶، ص ۲۴۶

۱۵۔ مرزا حیدر دوغلت، تاریخ رشیدی (فارسی) ہارورڈ ۱۹۹۶، ص ۳۳۶

۱۶۔ عارف نوشاہی۔ احوال و سخنان خواجہ عبید اللہ احرار۔ مرکز دانشگاہی تہران، ۱۳۸۰، ص ۷۰

مرزا حیدر سے قریبی تھے۔اس زمانے میں سلطان سعید خاں کے من میں سمائی کے تخت سے دست بردار ہو کر درویشی اختیار کرلوں۔اس کا ذکر انہوں نے خواجہ یوسف سے کیا۔اس پر خواجہ یوسف نے ان کو یہ نصیحت کی [17]

تو بر تخت سلطانی خویش باش
با خلاق پاکیزہ درویش باش
تاج بر سر نہ وعلم بر دوش
درعمل کوش وہرچہ خواہی پوش

(تم اپنے تخت پر ہی براجمان رہو، پاکیزہ اخلاق اپناؤ۔تاج اپنے سر پر اور علم کندھوں پر، اپنے عمل میں کوشش کرو اور جو چاہو پہنو)

سلطان سعید خاں کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا (۱۵۲۴/۹۳۰) خواجہ یوسف نے اس کو اپنا بیٹا بنانا قبول کیا۔اس کا نام ابرہیم رکھا گیا۔خواجہ محمد یوسف کا انتقال کاشغر میں ہی ہوا، مرزا حیدر نے اس کا مادہ تاریخ طائر بہشتی (۹۳۷) سے نکالا۔[18]

خواجکا خواجہ کے ایک اور بیٹے خواجہ عبدالحق بھی ہندستان آئے۔بابر جب بہار کو فتح کر کے واپس آگرہ پہنچا تو دوسرے دن ہی ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔[19] (۹۳۵/۹-۱۵۶۸)۔

خواجہ کلاں بن عبدالباقی بن محمد یحییٰ کو بابر نے ۹۳۵ھ میں بابر نامے کا ایک قلمی نسخہ آگرہ سے سمرقند بھجوایا تھا۔[20]

خواجہ محمد امین بن خواجہ محمد یحییٰ شیبانی خاں سے بچ گئے تھے یہ خواجہ یحییٰ کے چھوٹے بیٹے تھے، یہ بابر کے ساتھ اس کے معرکوں میں شامل رہے ہیں اور بابر نے ان کا ذکر سال ۹۱۰، ۹۱۳ اور ۹۲۵ میں کیا ہے۔[21]

اس کے علاوہ بھی بہت سے احراری باقی مغل بادشاہوں کے زمانے میں ہندستان آئے۔ان کا مختصر تعارف عارف نوشاہی نے کیا ہے۔[22] یہاں ان کے ذکر کا موقع نہیں۔

احراریوں کے ماوراء النہر سے ہجرت میں تین وجوہات کارفرماں تھیں، بابر اور اس کے خاندان کا قرب، ماوراء النہر میں شیبانیوں کا عروج اور کاشغر کے مغل خانوں کا ان کی طرف جھکاؤ اور قدر دانی۔
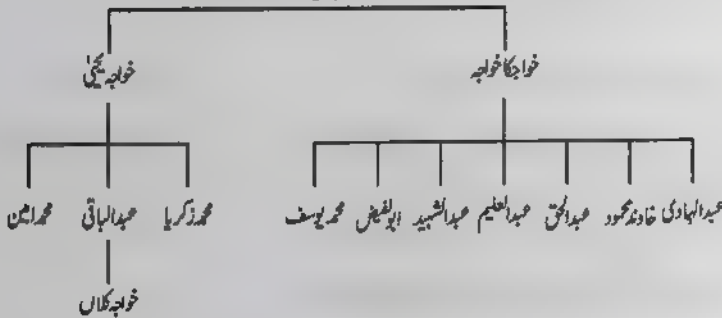
خواجہ اور ان کی اولاد جن کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔

۱۷۔مرزا حیدر دوغلت۔تاریخ رشیدی (فارسی) ہارورڈ ۱۹۹۶ ص ۲۴۴ خواجہ یوسف کے متعلق حقائق تاریخ رشیدی میں کوثر چاند پوری کی نظر سے نہیں گزرے ورنہ وہ ان کے علمیت وخانہ بدوشی کے متعلق ناواقف نہ ہوتے (حکیم اجمل خاں، نسیم بکڈپو، لکھنؤ ۱۹۷۳ ص ۲۲، ۵۸)

۱۹۔ورق ۳۰۴

۲۰۔ورق ۳۰۴
کوثر چاندی پوری (حکیم اجمل خاں ص ۵۷) نے ان خواجہ کلاں کو خواجہ کلاں بن مولانا صدر الدین سمجھ لیا ہے۔مولانا صدر الدین عمر شیخ مرزا کے مصاحب تھے انکے ساتوں بیٹے بابر کے ساتھ معرکوں میں شریک ہے۔خواجہ کلاں بن صدر الدین کی بابر سے دوستی تھی اور ۹۲۵ میں بابر نے اس کی جدائی پر ایک رباعی کہی تھی (ورق ۱۹۳)

۲۱۔ورق ۱۲۵، ۱۹۰، ۲۲۳

۲۲۔عارف نوشاہی۔احوال سخنان خواجہ عبیداللہ احرار، مرکز دانشگاہی تہران

بابر اور ایودھیا کی مسجد

ایودھیا کی مسجد کا تنازعہ بھارت کی تاریخ کا سب سے بڑا سانحہ ہے اس کی وجہ سے اب تک ہزاروں جانیں ضائع ہو چکی ہیں جو فسادات ۱۸۵۳ء میں شروع ہوئے تھے وہ وقفہ وقفہ سے آج بھی جاری ہیں۔

بنارس متھرا اور ایودھیا ہندوؤں کے تین مقدس مقامات ہیں ایودھیا کا شہر قدیم ہے اس کا تعلق رام سے بتایا جاتا ہے روایت کے مطابق رام کی پیدائش ایودھیا میں ہی ہوئی تھی۔ ۴۲۶ قبل مسیح کے بعد ایودھیا بالکل تباہ ہو گیا تھا، ہر طرف جنگل پھیل گیا تھا ڈیڑھ ہزار سال بعد اس کو دوبارہ آباد کیا گیا۔[1] کہا جاتا ہے کہ بکرماجیت نے اندازے سے اس کو دوبارہ آباد کیا اسی سبب اب کا ایودھیا اور اس کا محل وقوع متنازعہ ہے[2]۔ ایودھیا کی کھدائی تقریباً ۲۵ سال پہلے ہوئی تھی اس میں آبادی کے نشانات چار سو قبل مسیح سے زیادہ پرانے نہیں ملے۔

ستمبر ۲۰۰۵ کے ہمارے سفر کے دوران ہم نے دیکھا کہ ایودھیا کا علاقہ بہت سرسبز و شاداب ہے فیض آباد و ایودھیا جڑواں شہر ہیں دریا گھاگرا ایک بڑا دریا ہے جس کی ایک نہر پر خوبصورت یاترا کے گھاٹ اور اشنان ہیں شہر میں، بہت مندر قائم ہیں۔ فیض آباد میں کئی ہوٹل ہیں مسافر اور یاترا کرنے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں یہاں آس پاس کوئی آبادی نہیں۔ مسجد سے کافی پہلے پر ہی راستہ بند کر دیا گیا ہے۔ ہر وقت پہرہ رہتا ہے۔ کسی بھی قسم کی فوٹو گرافی منع ہے اور لوگ شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ خاموشی دراصل سطح سمندر کے اس سکون کے مترادف ہے جو کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔

بابر اس علاقہ میں ۹۳۴/۱۵۲۸ میں آیا تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے "ہفتہ سات رجب اودھ سے دو تین کروہ گھاگرا اور سردا کے سنگم پر ہم قیام پذیر ہوئے"[3] علاقے کے نظم و نسق کو درست رکھنے اور افغان باغیوں کی سرکوبی مقصود تھی اس موقع پر اسے بتایا گیا کہ اس جگہ سے سات آٹھ کروہ اوپر شکار کی اچھی جگہ ہے۔ دریا پار کرنے کی جگہیں تلاش کرنے کے لئے میر محمد کو وہاں بھیجا گیا جس نے گھاگرا اور سردا کے گھاٹوں کا معائنہ کیا۔ شکار کرنے کے لئے بارہ تاریخ کو وہ یہاں سے روانہ ہوا، یعنی یہاں کل قیام پانچ دن رہا۔ اس سال کے بقیہ حالات وقائع میں نہیں ہیں۔ یہ گم شدہ حصہ ہے۔ جو حالات موجود ہیں اس میں کہیں یہ ذکر نہیں کہ بابر خود ایودھیا گیا یا وہاں کے متعلق اس نے کوئی حکم دیا۔

بابری دور کی کئی مساجد شمالی ہندستان میں ہیں، سنبھل، پانی پت، روہتک، پلکھوا، ماہم اور سونی پت کی مسجدیں بابر سے منسوب ہیں۔ لیکن بابر خود ان میں سے کسی مسجد کا ذکر نہیں کرتا۔ یہ مساجد بابری طرز تعمیر سے مختلف ہیں۔ ایودھیا کی مسجد بھی بابری طرز تعمیر سے جدا ہے اور پٹھان طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔[4]

ہندستان کے مغل دور حکومت اور شروع نوابی دور لکھنو میں ایودھیا میں کوئی تنازعہ نہیں تھا۔ واجد علی شاہ کے دور میں جب انگریز ان پر حاوی ہو گئے تو یہ تنازعہ شروع ہوا۔ ایودھیا کے ۱۸۵۳ کے فسادات میں انگریز فوج نے خاموش تماشائی کا کردار ادا کر کے حالات بگاڑے۔ انگریزوں نے یہ سوچ رکھا تھا کہ ان کی حکومت اسی وقت قائم رہ سکتی ہے کہ یہاں کی مختلف قوموں میں باہم نفرت پیدا کی جائے۔ چنانچہ کارنیگی (۱۸۷۰) اور لنکھم (۱۸۷۱ء) کی رپورٹیں اس کی شہادت فراہم کرتی ہیں[5] جس میں مختلف مذاہب کے درمیان تفریق پیدا کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ اس معاملے میں اینٹ بیوریج کا رویہ بھی اپنی قوم کے دیگر اہل قلم سے مختلف نہیں۔ وہ لکھتی ہے

۱۔ صباح الدین عبدالرحمٰن۔ بابری مسجد، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۱۹۹۰، ص ۴۳

۲۔ حمیرا اطہر۔ بابری مسجد، رب پبلشرز۔ کراچی ۱۹۹۰ ص ۱۴، ۱۷

۳۔ ورق ۳۱۶

۴۔ رام ناتھ۔ دی بابری مسجد اوف ایودھیا۔ دی ہسٹاریکل ریسرچ ڈوکیومینٹشن پروگرام۔ جے پور ۱۹۹۱ ص ۲۱، ۲۲

۵۔ صباح الدین عبدالرحمٰن۔ بابری مسجد، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ ۱۹۹۰ ص ۳۵۔۳۹

"یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ مسجد بنانے کا حکم اودھ کے قیام کے دوان ۹۳۴ھ میں دیا گیا ہوگا، جب اس نے مندر کی شان وتقدس کو محسوس کرتے ہوئے (کم ازکم جزوی) طور اس کو ہٹایا، بطور محمدؐ کے اطاعت گزار پیروکار کی حیثیت سے اس کے لئے دوسرا مذہب نا قابل قبول ہوگا، وہ مندر کو مسجد میں تبدیل کرنا مناسب اور اپنا فریضہ سمجھتا ہوگا۔[6]

یہ ایک ایسی خیالی توجیہہ ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں۔ آیا بابر اس قسم کی سوچ رکھتا تھا؟ یہ کون جان سکتا ہے لیکن اس کی رواداری، انصاف پسندی اور پچھلے اطوار اس قسم کے لچر خیالات کی نفی کرتے ہیں۔ یہ متنازعہ سیاسی اور انتہا پسندانہ سوچ پر مبنی ہے۔ ہندستان کے ۱۹۰۴ء کے قومی یادگاروں کے تحفظ کے قانون کے مطابق اس یادگار کو بھی محفوظ رکھنا ضروری ہے۔[7]

۶۔اینٹ بیورج ۔بابر نامہ (ترجمہ انگریزی) سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور۔۱۹۷۹۔ضمیمہ یو ص۸۸ نوٹ ۱

۷۔رام ناتھ، دی بابری مسجد اوف ایودھیا۔دی ہسٹاریکل ریسرچ ڈوکیومینٹشن پروگرام۔جے پور ۱۹۹۱ ص ۷۵۔

بابر کی تلاش میں........

۱۔ازبکستان

ترجمہ محمد اختر مسلم

۱۔ورق ۶۷

۲۔ورق ۶

اگر آج ظہیرالدین محمد بابر زندہ ہوتو مجھے یقین ہے وہ اپنی جنم بھومی جانا پسند نہیں کرے گا۔آج کل بابر کا ملک ازبکستان کہلاتا ہے۔وہاں کے باسی اپنے آپ کو ازبک کہتے ہیں۔بابر کے مطابق ازبک غیرملکی اور غاصب تھے جو دشت قپچق سے حملہ آور ہوئے۔سلطان محمود مرزا جو حاکم سمرقند تھے کے انتقال کے بعد ان کے وارثوں میں جو روایتی جنگ حصول اقتدار کے لئے ہوئی اس میں ایک وارث سلطان علی مرزا نے ازبک سردار شیبانی خاں کو آنے کی دعوت دی۔بابر کہتا ہے کہ یہ اس کی کم عقل ماں کی شہ پر ہوا[۱]۔اس کا نتیجہ پورے تیموری وارثوں کے ماوراءالنہر سے ۹۰۷/۱۵۰۱ میں اخراج میں نکلا۔

ازبکستان پر روس کا شکنجہ عرصے تک قائم رہا ہے۔اس دوران ہیرو اسٹالین ولینن ہی تھے کسی ترکستانی کا قومی ہیرو کے طور پر ذکر ممکن نہیں تھا،لیکن ۱۹۹۱ء میں ازبکستانی آزادی کے بعد ان کا خودی کا دبا ہوا احساس جاگ اٹھا ہے۔اب ازبکستان میں امیر تیمور،امیر شیر علی نوائی،الغ بیگ اور بابر وہاں کی قومی شخصیتیں ہیں۔

فرغنہ اور ماوراءالنہر کی تاریخ میں بابر کے دس سال کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ہمیں ان کے متعلق تفصیل بھی معلوم نہ ہوتی اگر ہمارے پاس "وقائع" نہ ہوتے۔بابر فطری طور پر ایک عملی انسان تھا۔اس نے محسوس کیا کہ ایک نوعمر و ناتجربہ کار کا مقابلہ عمر رسیدہ اور گھاگ سرداروں سے ہے،جب کہ چاروں طرف عقاب منڈلا رہے ہیں تو ایک ناتواں کبوتر کہاں بسیرا کر سکتا ہے،اس لئے ہجرت کر کے نئی سبز وادیوں کو ترجیح دی۔

ازبکستان کے لوگ آج بابر کو بطور مصنف،شاعر اور مذہبی دانشور کے طور پر جانتے ہیں لیکن جنگجو اور بادشاہ کی حیثیت سے نہیں۔بابر کے لئے فرغنہ اپنا گھر اور ماوراءالنہر اس کی آنکھ کا تارا تھا۔

بابر کا عظیم نثر پارہ اس کی اپنی خودنوشت سوانح "وقائع" ہے۔دنیا کے کسی بادشاہ نے اس قدر حقیقت پسندی سے اپنی سوانح نہیں لکھی۔حالانکہ ہم نے اس کو بھلا دیا لیکن دنیا کی بڑی زبانوں نے اس کو اپنایا۔ترکی،انگریزی،فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں بابر سے متعلق کتابوں کا ایک مسلسل سلسلہ اب بھی جاری ہے۔پچھلے دس سال میں بابرنامے کی دو اشاعتیں ہارورڈ اور کیوٹو سے شائع ہو چکی ہیں اور ابھی ایک تنقیدی سوانح نیدرلینڈ سے شائع ہوئی ہے اور اس کے مقابلے میں اردو میں ایک قابل اعتماد اور تحقیقی ترجمہ تک نہیں۔

بابر کو اپنے وطن سے بے پناہ محبت تھی۔اس حب الوطنی کا اثر ہے کہ وہ اپنے ملک کا تذکرہ بار بار کرتا ہے۔یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ حسن اور خوبیاں اب بھی موجود ہیں؟ کیا ہم آج بھی فرغنہ کے رسیلے پھلوں اور خوبانیوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔اسی تحریک کے زیر اثر میں نے فرغنہ کی وادیوں کو کھنگالنے کا فیصلہ کیا۔

بابرنامہ کا آغاز دلچسپ ہے۔بغیر کسی تمہید کے آغاز یوں ہوتا ہے "میں عمر کے بارھویں سال میں بادشاہ ہوا"۔وہ کہاں پیدا ہوا،بچپن کیسے گزرا،کچھ ذکر نہیں۔بابر کے والد عمر شیخ مرزا کا دارالحکومت اخسی دریائے سیر کے شمالی کنارے پر تھا۔بابر اتنی سی عمر میں بادشاہ کیسے بنا اس کا ذکر دلچسپ پیرائے میں ہے۔بابر کے والد کو کبوتر بازی کا شوق تھا۔ان کا کبوتر خانہ قلعہ اخسی کے کنارے کھائیوں کے اوپر تھا۔عمر شیخ کبوتر خانے میں تھے۔جب کبوتر خانہ گرا اس کے ساتھ مرزا بھی اڑ کر راہی ملک عدم ہوئے۔[۲]

فرغنہ میں بابر جن مقامات کا ذکر کرتا ہے وہ اب بھی قائم ہیں۔

اخسی

اخسی اب مٹی کا ڈھیر ہے۔ یہ تباہی کیسے ہوئی اس کے متعلق تفصیلات معلوم نہیں۔ اس جگہ کو اب اخسی کنت کہتے ہیں۔ قلعہ کے آثار میں جگہ جگہ اینٹیں اور برتن پڑے ملتے ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ کے لئے ایک خزانہ ہے۔ اگر ازبک حکومت اس پر توجہ دے۔ یہاں سیر دریا کے اوپر ایک پل تعمیر کیا گیا ہے جو اخسی کو عمودی طور پر دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف مٹی کے تودے ہیں جس میں سنگ وخشت بکھرے پڑے ہیں۔ بابر کی مشہور مترجم اینٹ بیورج کا خیال ہے کہ یہ تباہی دریا سیر کی وجہ سے ہوسکتی ہے، لیکن اس کے اثرات واضح نہیں۔ یہاں ایک ندی کاسان سے آ کر دریائے سیر سے منسلک ہوتی ہے، دونوں دریاؤں کی جگہ میں کچھ زیادہ ردوبدل نہیں ہوا ہے۔ یہ علاقہ زلزلوں کی آماج گاہ ہے، یہ ہوسکتا ہے کہ زلزلے ہی نے اخسی کو مٹا دیا ہو۔

کاسان

دریائے کاسان کے ساتھ ساتھ اگر شمال کی طرف سفر کریں تو مرکزی سڑک سے ۴۵ کلومیٹر پر کاسان کا شہر آباد ہے۔ یہ وہی شہر ہے جس کی خوبصورتی کا بابر مداح تھا۔ یہ اب ''کاسان سوئے'' کہلاتا ہے۔ سڑک دریا کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ بابر اس ندی کو ''آب کاسان'' کہتا ہے۔ اس کے کنارے پر باغات ہی باغات تھے۔ بابر اس کو ''پوستین پیش برا'' کا نام دیتا ہے،[۳] یعنی جیسے کوٹ کی سجاوٹ۔ علاقہ صاف ستھرا اور خوبصورت ہے لیکن باغات کا کہیں نام ونشان نہیں۔ یہ عمدہ قصبہ ہے۔ اس میں بے شمار چائے خانے دریا کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے ہیں جہاں ہم نے بیٹھ کر سبز چائے کا لطف اٹھایا۔ اوپر نیلا آسمان اور نیچے ٹھنڈا رواں پانی۔ یہاں ایک سولھویں صدی کی مسجد ہے جس کے دروازے مقفل ہیں۔ ابھی تک ازبک حکومت کو اپنی مرضی کا مولوی امامت کے لئے نہیں ملا ہے۔

اندجان[۴]

بابر اپنے والد کے انتقال کے وقت اندجان میں تھا۔ اندجان فرغنہ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس وقت بابر کی جان خطرے میں تھی اس لئے اس کو نماز گاہ لے جایا گیا۔ یہ اس خیال سے کہ باہر ہی باہر ازکند سے کاشغر اس کو ماموں کے پاس روانہ کر دیا جائے۔

مجھے یہ پڑھ کر تعجب ہوا کہ بابر لفظ نماز گاہ استعمال کرتا ہے، مسجد نہیں جو ہم کہتے ہیں یا مچیت جو ترکوں میں مستعمل ہے۔ لیکن ازبکستان کے سفر کے دوران اندازہ ہوا کہ نماز گاہ کسی بھی نماز پڑھنے کی جگہ کو کہا جاتا ہے، جامع مسجد جہاں جمعہ کی نماز ہو اور عیدگاہ شہر سے باہر عیدین کی نماز کے لئے۔

بابر کہتا ہے کہ اندجانی تمام ترک ہیں۔ یہ اب بھی صحیح ہے یہ سیدھے سچے دین دار، مذہبی ذہن اور راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ ترک جب بھی کسی سے ملتے ہیں تو سلام مسنون کرتے ہیں۔ احترام کے اظہار کے لئے دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر سر کو تھوڑا سا نیچے کی جانب خم کرتے ہیں۔ اور آپ کو تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ وہ آپ کو اپنی تقاریب میں ساتھ لے جائیں۔ جیسے کے ہم کو ایک برسی میں لے گئے۔ جہاں فاتحہ کے بعد ترکی پلاؤ اور دوسری انواع واقسام کے کھانے، پھل اور میوے نظر آئے۔

بابر اندجانیوں کے خوبصورت نقوش، صاف رنگ اور ستواں جسم کی بھی تعریف کرتا ہے۔ بابر یوسف اندجانی کی موسیقی کی بھی تعریف کرتا ہے۔ وہ بایسنغر کے دربار میں گویا تھا۔ اس کی مدھر آواز دلوں کو مسحور کر دیتی تھی۔ شاہ رخ نے کئی مرتبہ بایسنغر کو لکھا کہ یوسف اندجانی کو بھیج دے لیکن بایسنغر کے کان پر جوں نہ

۳۔ ورق ۵

۴۔ ورق ۴

فرغنہ میں بہار کی آمد

اوش کا براکوہ

چوراہہ بابر اندجان

رینگی۔ آخر شاہ رخ نے ایک لاکھ شاہ رخی سکہ رائج الوقت اس کے لئے بھیجے، جس پر بایسنغر نے جواب لکھا کہ ''ہم یوسف کو نہیں بیچتے، اپنی کالی چاندی اپنے پاس رکھو''۔

پھل اب بھی یہاں کافی ہوتے ہیں۔ انگور، خربوزہ، انار اور خوبانی عمدہ اور ذائقہ دار۔ بابر کے زمانے میں اس قدر خربوزہ وتربوز تھے کہ وہ کھیتوں کے کنارے لگے رہتے تھے۔ جو چاہے توڑ کر کھائے۔ فصل پران کو بیچنے کا رواج نہیں تھا۔ اب بھی یہاں گھروں کے آگے انگور کی بیلیں لگی ہوتی ہیں۔ روسیوں نے کپاس کی فصل بڑھانے پر اس قدر زور دیا کہ اس کی وجہ سے دوسری سب فصلیں متاثر ہوئی ہیں۔ اب ہر جگہ کپاس ہی کپاس نظر آتی ہے۔ اندجان کا قلعہ سمرقند اور کش کے بعد تیسرے نمبر پر تھا۔ ایک زلزلے نے اس کو تباہ کر دیا۔ پرانا شہر باقی نہیں رہا۔ بابر کی یاد میں ایک حویلی نئی بنادی گئی ہے۔ جس میں پھاٹک سے داخلے پر صحن ہے ایک طرف بابر کا مجسمہ اور فوارہ اور اطراف میں دالان اور حجرے ہیں۔

ایک باغ بھی شہر کے جنوب مشرق میں دو ایکڑ احاطے پر بنایا گیا ہے۔ یہاں ایک ہال بھی ہے۔ جس پر ایک گنبد ہے اور اندر بابر نامے کے مناظر کی نقاشی کی گئی ہے۔ ہال کی الماریوں میں بابر سے متعلق شائع شدہ کتب کا ذخیرہ ہے۔ یہ سب کتب ذکر جان مشرب کی محنت سے جمع ہوئی ہیں جو اندجان کے میئر رہ چکے ہیں اور بابر شناس ہیں۔

بابر یہاں کے شکار کی بھی تعریف کرتا ہے۔ اس کے مطابق یہاں کا مرغ زریں خوب فربہ ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ایک مرغ زریں کا سالن چار آدمی بھی ختم نہیں کر سکے۔ مرغ زریں اب کہیں خال خال ہی نظر آتا ہے۔ ہاں یہاں میوزیم میں ہم نے اس کو ضرور دیکھا۔ فرغنہ ازبکستان کا ایک ایسا علاقہ ہے جہاں اسلام کی نشاۃ الثانیہ ہو رہی ہے۔ ۲۰۰۴ء میں تاشقند میں بم پھٹنے کے بعد جو قتل عام ہوا اس کا الزام فرغنہ کے اسلام پسندوں پر ڈالا گیا تھا۔ اس سال بھی اندجان میں بہت لوگ جیل کے ہنگاموں کے بعد شہید کئے گئے۔ فرغنہ میں ایک سولھویں صدی کی مسجد ہے جو یہ کہہ کر بند کر دی گئی ہے کہ یہ وہابیوں کی مسجد ہے۔ دوسری مسجد اندر محلے میں چھوٹی ہے جہاں مجھے نماز جمعہ پڑھنے کی سعادت ہوئی۔ مسجد پوری بھر گئی۔ مسجد کی گلی کے علاوہ بڑی سڑک پر بھی نمازی جمع ہو گئے۔ سڑک کا ٹریفک رک گیا۔ زیادہ تر نمازی نوجوان تھے۔

فرغنہ کے حصے بخرے

روس کی کمیونسٹ حکومت نے وسط ایشیا کے حصے بخرے کر دیے تھے۔ فرغنہ کی وادی ترک، ازبک، تاجک، کرغیز اور مغل آبادیوں پر مشتمل تھی اور یہ وادی ترکستان کا حصہ تھی۔ کمیونسٹوں نے فرغنہ کو تین ریاستوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک ازبکستان، دوسرا کرغیزستان اور تیسرا تاجکستان۔ تقسیم مصنوعی تھی اور اس منصوبے کے تحت کی گئی تھی کہ مسائل جاری رہیں۔ تینوں ریاستوں میں اقلیتیں اب بھی مسائل کا شکار ہیں۔ مسلمانوں کی تقسیم روس کی ضرورت تھی۔ اس طرح اس خوبصورت وادی کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا۔ ریل کا راستہ بند ہو گیا۔ سڑکیں دوسری ریاستوں میں چلی گئیں۔ وادی فرغنہ کا ازبکستان سے راستہ بند ہو گیا۔ ازبکستان نے اب پہاڑوں میں سے کچک پاس سے گزار کر ایک نئی سڑک بنائی ہے جس کی اونچائی ۲۲۶۷ میٹر بلند ہے۔ سردیوں میں آمد و رفت کے لئے برف مسلسل ہٹانا پڑتی ہے۔

اوش [۵]

بابر اپنی خود نوشت میں اوش کی خوبصورتی کی تعریف کرتا ہے۔ اوش اب کرغیزستان کا حصہ ہے۔ اندجان والے بھی اب یہاں کا ویزا حاصل کر کے ہی آ سکتے ہیں۔ اوش بے شک ایک خوبصورت پہاڑی

شہر ہے۔اس کے عین وسط سے ایک دریا گزرتا ہے۔ بابر اس دریا کو "اندجان رود" کہتا ہے۔اب اس کا نام "آک برا" ہے۔دریا کا بہاؤ اندجان کی طرف ہے۔سڑک کے دونوں طرف کپاس کے کھیت ہیں۔ مارچ کا مہینہ کپاس کی بوائی کا ہوتا ہے۔دونوں طرف عورتیں اور بچے کھیتوں میں کام کرتے نظر آتے ہیں۔کپاس کے بیج قطار در قطار بو کر ان کو پولی تھین کی چادروں سے ڈھک دیا جاتا ہے تاکہ سرد ہواؤں سے بچاؤ رہے۔ان چادروں میں تھوڑی تھوڑی دور پر سوراخ کر دیئے جاتے ہیں تاکہ ہوا اندر داخل ہوتی رہے۔

بابر کے مطابق اوش اندجان سے چار یگاش کے فاصلے پر ہے۔ایک یگاش کتنا فاصلہ ہے یہ کہیں نہیں ملتا۔خان خاناں عبدالرحیم نے اپنے ترجمے میں یگاش کا ترجمہ فرسنگ کیا ہے۔فرسنگ ایران میں اب بھی استعمال ہوتا ہے اور یہ چھ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔اینٹ بیورج کے حساب سے ایک یگاش ۴ سے ۸ میل تک ہوسکتا ہے۔اب اندجان سے اوش کا فاصلہ پچاس کلومیٹر ہے (۳۰ میل) اس طرح ایک یگاش ۱۲ کلومیٹر (۷.۵ میل) ہوا۔

پرانے شہر اوش کے جنوب مغرب میں ایک پہاڑ ہے جو براہ کوہ کے نام سے مشہور ہے۔ بابر کے ماموں سلطان محمود خان نے اس پہاڑ کے اوپر ایک حجرہ بنوایا تھا۔ ۱۴۹۶ء میں بابر نے خود اس پہاڑ پر ایک بارہ دری تعمیر کروائی تھی۔ میں نے پہاڑ کے گرد چکر لگایا کہ اس پر یہ عمارات نظر آئیں، لیکن حجرے یا بارہ دری کا کوئی نشان نہیں۔ پہاڑ کے جنوب مشرقی کونے پر ایک نئی عمارت تعمیر کی گئی ہے جو تخت سلیمان کہلاتی ہے۔ یہاں ایک نماز گاہ بنی ہوئی ہے۔ سیاحوں کے کتابچے کے مطابق یہی بابری بارہ دری کی جگہ ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ بابر کا کہنا ہے کہ اس کے ماموں کا حجرہ پہاڑ کی چوٹی پر تھا اور بارہ دری اس سے نیچے لیکن بہتر جگہ پر کہ جہاں سے پورے شہر کا نظارہ عمدہ تھا۔ یہ نماز گاہ کافی بعد یعنی ۱۸۸۹ کی بنی ہوئی ہے۔

روایتی طور پر یہ پہاڑ حضرت سلیمان بن داؤد کا تخت کہلاتا ہے۔ ایک آکسل (سفید داڑھی والے) نے جو ایک عقلمند بزرگ کا یہاں روایتی نام ہے، بتایا کہ حضرت داؤد یہاں عبادت کیا کرتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ پہاڑ اڑ کر حضرت محمدؐ کے پاس بھی گیا تھا اور براق کے سم کے نشانات اس پہاڑ پر کندہ ہیں۔ ایک مقامی روایت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی اس پہاڑ پر دو دفعہ چڑھ کر عبادت کرے تو اس کا ثواب ایک عمرے کے برابر ہے۔ حضرت سلیمان کی دولت وطاقت کا کتابوں میں ذکر ملتا ہے[۶]۔ یہ بھی علم ہے کہ ان کے پاس ایک تخت تھا جس پر بیٹھ کر وہ سفر کیا کرتے تھے۔ ان کی حکومت انسانوں کے علاوہ پرندوں اور جنوں پر بھی تھی۔ اس کے علاوہ دنیا میں کئی اور جگہ بھی تخت سلیمان پائے جاتے ہیں جیسے کشمیر میں[۷]۔ یہ سب باتیں بعد کی پیدا کی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ بابر اس سلسلہ میں کوئی ذکر نہیں کرتا۔ اتنی اہم معلومات بابر سے چھپ نہیں سکتی تھیں۔ بابر کا اوش سے متعلق بیان تفصیلی ہے اور اس سے پہلے اور بعد اوش کے متعلق اس قدر تفصیلی بیان نہیں ملتا۔ بابر کے ماموں کا حجرہ سترھویں یا اٹھارویں صدی میں گرا دیا گیا تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ کس کے حکم سے ایسا ہوا۔ تخت سلیمان کی نماز گاہ ۱۸۲۹ء میں بنی اور ۱۹۶۳ء تک قائم رہی۔ اس سال یہ کمیونسٹ حکومت کی انتظامیہ کے حکم سے شہید کی گئی اور دوبارہ ۱۹۸۹ میں تعمیر کی گئی۔

اوش میں بابر مسجد جوزا کا بھی ذکر کرتا ہے جو پہاڑ کے دامن میں تھی۔ اس جگہ ایک نئی تعمیر کردہ مسجد بنی ہوئی ہے۔ رواں پانی جس کا ذکر بابر کرتا ہے وہ ایک چھوٹے چشمے سے قائم ہے اس کے آس پاس کا علاقہ سیاحوں کے لئے بند ہے۔ یہاں دوسری صدی عیسوی کے کچھ آثار پائے گئے ہیں اور یہاں کھدائی ہو رہی ہے۔ یہاں بابر کے مطابق ایک سبزہ زار تھا جو سیاحوں کے آرام کی جگہ تھی۔ اوش کے بدمعاش ان سوتے سیاحوں پر پانی انڈیل کر ان کو پریشان کرتے تھے۔

۶۔ قصص الانبیاء
جہانگیر بک ڈپو لاہور۔ سال اشاعت دیا نہیں ہے۔ ص ۳۲۸

۷۔ برنیر نے اپنے سفر کشمیر میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس نے یہ سفر اورنگزیب کے ساتھ کیا تھا۔ ٹریولس ان مغل ایمپائر ص ۳۹۹۔

مرغینان

اس قصبہ کا اب نام مرغیلان ہے۔ یہ اندجان سے ۲۷ کلومیٹر جنوب مغرب میں واقع ہے۔ انار اور خوبانی یہاں کا عمدہ پھل ہے۔ ناشتہ میں بھی آپ کو جام خوبانی کا ہی ملے گا۔ یہاں کا انار بھی عمدہ ہوتا ہے۔ اس کی ایک قسم جس کا دانہ بڑا ہوتا ہے کلاں دانہ کہلاتا ہے [8]۔ اسی طرح خوبانی میں سے بیج نکال کر اس میں بادام رکھ دیتے ہیں، اس کو سبحانی کہتے ہیں۔

یہاں سے ۴۵ کلومیٹر مغرب میں رشدان کا قصبہ ہے یہ شیخ برہان الدین (۱۱۹۷-۱۱۵۲) علی کی پیدائش ہے۔ شیخ البدایہ کے مصنف ہیں جو فقہ حنفی کی جداعلیٰ تصنیف ہے۔ کیونکہ یہ کافی تفصیلی ہے اس لئے انہوں نے اس کا ایک مختصر نامہ الہدایہ کے نام سے بھی شائع کیا۔ الہدایہ فارسی میں ترجمہ ہوئی اس کے بعد وارن ہیسٹنگز ویسرائے ہند نے اس کا انگریزی ترجمہ چارلس ہیملٹن سے کروایا تھا جو لندن سے ۱۷۹۱ء میں شائع ہوا۔ الہدایہ کا ایک مخطوطہ تاشقند کی ایک لائبریری میں موجود ہے۔ شیخ برہان الدین کا مقبرہ رشدان میں ہے۔ یہ مختصر مقبرہ ہے جس میں آپ کی قبر ہے، اوپر گنبد تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کے اطراف باغ لگایا جا رہا ہے۔ عمارت اور باغ سب نیا بنایا جا رہا ہے۔

مرغینان میں بھی ایک باغ نیا تعمیر کیا گیا ہے جو برہان الدین کے نام پر ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک مجسمہ کھلی کتاب کا بنایا گیا ہے جس پر ایک چھتری بنائی گئی ہے۔ کتاب کا ماڈل آہنی ہے اور اس کے نیچے الہدایہ تحریر ہے۔

یہاں سے ۶۰ کلومیٹر فاصلے پر اسفرہ ہے جس کا ذکر بابر نے کیا ہے۔ لیکن یہاں سے اسفرہ نہیں جایا جاسکتا کہ وہ تاجکستان میں ہے۔ وہاں جانے کے لئے ۵۶۲ کلومیٹر کا سفر کرنا پڑے گا۔ تاجکستان میں داخل ہو کر الٹے بانس بریلی کا سفر۔ ازبکستان اور تاجکستان کے حالات کشیدہ ہیں، اس کی وجہ سیر دریا کا پانی ہے۔ سیر دریا کرغیزستان میں شروع ہوتا ہے، ازبکستان میں داخل ہو کر پھر تاجکستان پہنچتا ہے اور پھر دوبارہ ازبکستان کا رخ کر کے آخر میں قزاقستان میں داخل ہو کر ختم ہوتا ہے۔

خجند

خجند کا شہر اب تاجکستان میں ہے۔ حالانکہ یہ شہر تین طرف سے ازبکستان سے گھرا ہوا ہے لیکن وہاں جانے کے لئے صرف ایک بارڈر ہی کھلا ہوا ہے جس کا نام اوے بیک ہے۔ یہ تاشقند سے سو کلومیٹر جنوب مشرق میں ہے۔ یہاں پہنچنے میں دو گھنٹے لگتے ہیں اور دو ہی گھنٹے دونوں کسٹم سے فارغ ہونے میں۔ ازبک کسٹم کے حکام سخت لیکن تاجک حکام اپنے میں مگن اور مسافروں سے لاپرواہ۔ یہاں سے فارغ ہو کر خجند کے لئے ۶۲ کلومیٹر کا فاصلہ پہاڑی اور خراب سڑک پر مشتمل ہے، لیکن جب مینوغل پہاڑ پر پہنچتے ہیں جس کے گرد چکر لگا کر سیر دریا کی خوبصورت وادی میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ وادی اتنی ہی خوبصورت ہے جتنا ازبک فرغنہ۔ سیر دریا یہاں زیادہ چوڑا نہیں لیکن اس میں پانی کی رفتار تیز ہے۔ خجند پہنچنے کے لئے دو پل ہیں۔ تاجکستان میں سڑکیں خراب ہیں اور سب سے خراب سڑک اوے بیک سے خجند کی ہے۔

خجند کی زیادہ آبادی تاجیک ہے۔ جس کو بابر سارٹ کہتا ہے [9]۔ چنگیزی نقوش عام ہیں۔ خجند تاجکستان کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ یہاں کی سیر با آسانی ایک دن میں پیدل کی جاسکتی ہے۔ یہاں پہنچ کر عجب طرح کا احساس ہوتا ہے۔ لوگ مسلمان ہیں، فارسی بولتے ہیں لیکن ایک بورڈ یا اخبار پڑھا نہیں جاسکتا کیونکہ رسم الخط کریلیک ہے۔ یہ خط روسیوں نے مسلط کیا تھا۔ اب آزادی کے بعد بھی یہی جاری ہے۔ یہاں کی جامعہ جانے کا اتفاق ہوا۔ علمی کام ہو رہا ہے لیکن مشرقی دنیا اس سے ناواقف ہے کہ رسم الخط معروف نہیں۔ بابر یہاں کی دو معروف

۸۔ ورق ۳

۹۔ ورق ۴

۱۰۔ امیر تیموران ورلڈ ہسٹری تاشقند ۲۰۰۱ء ص ۶۱

شخصیتوں کا ذکر کرتا ہے۔ شیخ مصلحت، ایک معروف صوفی جن کا اصلی نام شیخ بدی الدین نوری ہے، یہ بارھویں صدی عیسوی کے بزرگ ہیں۔ ان کا مقبرہ شہر کے عین وسط میں ہے۔ ان کے برابر کی مسجد نئی تعمیر کردہ ہے۔ اس مقبرے کی مرمت کے لئے امیر تیمور نے بھی عطیہ دیا تھا[۱]۔ بابر نے یہاں رہتے ہوئے ایک خواب دیکھا تھا کہ شیخ نے اسے سمرقند دیا۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد بابر نے سمرقند دوبارہ فتح کرلیا۔ یہ ۱۵۰۰ء کا واقعہ ہے۔

خجند کی دوسری بڑی شخصیت کمال خجندی ہیں جو فارسی کے شاعر ہیں۔ یہاں ان کا ایک مجسمہ شہر کے بیچ میں بنا ہوا ہے۔ مجسمے کے آگے فرش پر ان مقامات کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں کا سفر کمال خجندی نے کیا تھا۔

۹۸۔۱۴۹۷ء میں بابر خجند میں رہا تھا۔ اس کی نظر میں خجند کے وسائل کم تھے اور بابر یہاں خوش نہیں رہا۔ اس نے خجند کے پھلوں کی تعریف کی ہے، خاص طور پر انار کی۔ رات ہمارے میزبان نے کھانے کے بعد پھل پیش کئے جس میں کیلے، سیب، انگور اور نارنگیاں شامل تھیں۔ سیب بڑے اور رسیلے تھے جس کی میں نے تعریف کی، لیکن معلوم ہوا کہ یہ ایران سے آئے ہوئے ہیں، کیلے یہاں بالکل نہیں ہوتے۔

پرانا شہر سیر دریا کے جنوبی کنارے پر آباد ہے جیسا کے بابر نے بیان کیا ہے۔ شہر کی فصیل مٹی کی ہے۔ یہاں کا قلعہ اب یونسکو کے زیر انتظام مرمت کیا جارہا ہے۔ اس کے اندر ایک عجائب گھر بھی ہے۔

کند بادام

فرغنہ کا ایک اور قصبہ جس کا ذکر بابر نے کیا ہے کند بادام ہے۔ بابر یہاں کے بادام کی تعریف کرتا ہے۔ اب اس قصبہ کا نام کنی بادام ہے۔ اب بھی یہاں کا بادام کاغذی ہوتا ہے۔ یہ قصبہ خجند سے ۸۰ کلومیٹر مشرق میں واقع ہے۔ سڑک صاف ہے سوائے ایک دو جگہ کے، یہاں پولیس جگہ جگہ گاڑیوں کی رفتار جانچتی رہتی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف خوبانی، سیب، بادام، انار اور شہتوت کے کھیت ہیں۔ سڑک کے داہنی طرف کرغیزستان ہے اور بائیں طرف تاجکستان۔ راستہ میں ایک میل کا ٹکڑا ایسا ہے جہاں کرغیزستان سڑک کے الٹی طرف آگیا ہے۔ اس لئے سڑک کو چھوڑ کر ایک کچے راستے میں اتر کر آگے جانا پڑتا ہے۔ ریل اور سیر دریا الٹے ہاتھ پر ہیں۔ یہاں ایک ڈیم تعمیر کیا گیا ہے جو قراقم ڈیم کہلاتا ہے۔ اس کی وجہ سے ایک بڑی جھیل بن گئی ہے۔ کپاس اور دوسری فصلیں یہاں بڑھ گئی ہیں۔ بابر کے زمانے میں یہاں ریگستان تھا جس کو بابر "ہادرویش" کہتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہاں چند درویش ریگستان کی آندھی میں پھنس گئے تھے، ایک دوسرے سے بچھڑ گئے اور ایک دوسرے کو تلاش کرتے کرتے لاپتہ ہوگئے۔ یہاں اب ہوا کے جھکڑ نہیں۔ جھیل نے علاقے کو سرسبز وشاداب کردیا ہے۔

کند بادام کا شہر سب نیا ہے۔ پرانا شہر زلزلے میں تباہ ہوگیا تھا۔ پرانی عمارتوں میں سے دو مدارس باقی ہیں۔ لڑکوں کا مدرسہ میر رجب خاں دوتہ جہاں اب عجائب گھر ہے، جس میں ایک آٹھ دس فٹ اونچی نقش کی ہوئی تصویر میں کلہ مینارد کھایا گیا ہے۔ یہ کسی روسی مصور نے ۱۹۳۰ء میں بنائی تھی۔ لڑکیوں کا مدرسہ آئم کہلاتا ہے۔

اسفرہ

فرغنہ میں یہ آخری شہر ہے جو بابر نے بیان کیا ہے۔ یہ کند بادام سے ۳۰ کلومیٹر جنوب مشرق میں ہے۔ جیسے ہی کند بادام سے نکلیں پہاڑی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ پہاڑیاں بیچی اور رنگ برنگی ہیں۔ یہاں کوئی سبزہ نہیں۔ پہاڑیوں کا رنگ پیلا، کالا، اور کچھ اودا ہے۔ اسفرہ سے پہلے سڑک کے دونوں طرف فیکٹریاں ہیں جو بند پڑی ہیں۔ بیروزگاری زیادہ ہے۔ روسی دور میں ہر شخص کو کام مل جاتا تھا۔ شہر کے بیچ سے ایک دریا گزرتا ہے جس کا نام بھی اسفرہ ہے۔ اس کے دونوں طرف چائے خانے ہیں۔ اسفرہ کا پلاؤ پورے تاجکستان میں مشہور ہے۔ پلاؤ کا چاول چھوٹا اور بیچ میں سے چوڑا ہوتا ہے اور کچھ سرخی مائل۔ پلاؤ میں آلو، گاجر اور کابلی چنے پڑے

ہوتے ہیں۔ گھی میں چاول تر ہوتے ہیں۔ بابر نے یہاں سے دو میل دور ایک پہاڑی دیکھی تھی جو آئینے کی طرح عکس دیتی تھی، بابر اس کو "سنگ آئینہ" کہتا ہے۔ اب اس کی کوئی نشاندہی نہیں کرسکتا۔ شہر کی آبادی ساٹھ ہزار ہے۔ یہاں ایک بازار بھی ہے۔ روسیوں نے بازار کی ہیت بدل دی ہے بازار شہر کے بیچ سے نکال کر شہر کے باہر قائم کردیئے ہیں اور ان کے چاروں طرف دیوار کھڑی کردی گئی ہے کہ بے تحاشہ نہ پھیلیں۔

اسفرہ کے آس پاس کے پہاڑی علاقوں میں بابر نے ایک سال سوخ اور ہشیار گاؤں میں بسر کیا تھا۔ فرغنہ اور سمرقند اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ یہ سال انتہائی غربت و تنگدستی سے گزرا، یہیں رہ کر اس کے وطن کو خیر آباد کہنے اور کابل کا رخ کرنے کی ٹھانی جہاں سے اس کی قسمت پلٹی۔

اس علاقہ میں ایک دلچسپ رواج سڑک کے کنارے قبریں اور مقبریں ہیں جو ٹریفک کے حادثات میں گزر جانے والوں کے ہیں۔ لوگ ان پر پھول رکھتے اور موم بتیاں روشن کرتے ہیں۔

بابر کا فرغنہ واقعی اب بھی حسین ملک ہے اور بابر کا بیان اس کے متعلق اب بھی حقیقت پر مبنی ہے۔ پچھلے پانچ سو سال میں کتنے لوگ یہاں آئے اور گئے۔ اس سلسلے میں یہاں تاریخ کے پروفیسر نے فارسی کا یہ شعر پڑھا جو وقت و زمانے پر صحیح لاگو ہوتا ہے۔

دنیا یک سرائیے و دو در است
درایں سرائیے ہر روز قوم دیگر است
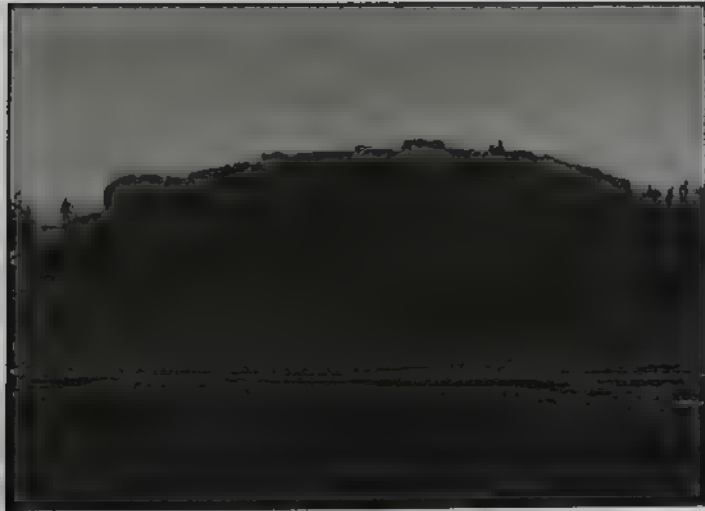
بلخ کے کھنڈرات

بابر کی تلاش میں........

۲۔افغانستان

ترجمہ: محمد اختر مسلم

بابر نے ۵/۱۵۰۴ء میں ایک سال کا عرصہ فرغنہ کے جنوبی پہاڑوں میں بسر کیا۔ یہ سال بابر کے اوپر بہت کٹھن تھا۔ عزیز واقارب، دوست ورشتہ دار، سب نے منہ موڑ لیا تھا۔ تنگ آ کر بائیس سالہ بابر نے ایک جرأت مندانہ فیصلہ کیا اور فرغنہ کو خیر آباد کہا۔ وہ ایک مملکت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اس کا رخ خراساں کی طرف تھا جہاں اس کے چچا سلطان حسین مرزا کی حکومت تھی۔ اس سال (۹۱۰ ہجری) کے محرم میں اس کا پڑاو حصار (حال دوشنبہ، تاجکستان) کی ایک چراہ گاہ میں تھا[1]۔ وہ غریب اور مفلوک الحال تھا۔ دوسو سے زیادہ اور تین سو سے کم افراد اس کے ساتھ تھے۔ اکثر کے پاس اپنی سواری کے لئے گھوڑے اور اپنی حفاظت کے لئے اسلحہ تک نہیں تھا۔ زیادہ تر کے پاس ہاتھوں میں لاٹھیاں اور پیروں میں چپلیں تھیں۔ بابر کے پاس کل دو خیمے تھے۔ پڑاؤ کرنے پر یہ خیمے اس کے گھر والے استعمال کرتے تھے۔ بابر خود ہنگامی طور پر تیار کردہ چھپر میں آرام کرتا۔

۱۔ورق ۱۰۱

۲۔اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۱۵۲۸ء

مشکلات ومصائب کی سیاہ رات ختم ہونے والی تھی۔ حصار کا حکمراں خسرو شاہ ایک ظالم وسفاک انسان تھا۔ حصار، قندوز اور افغاں ترکستان اس کے زیرنگین تھے۔ وہاں کے عوام اس کے ظلم وستم سے پریشان تھے۔ یہ افراد بابر کے پاس آتے اور اپنا حال بیان کرتے، ساتھ ہی بابر کے لشکر میں شامل ہو جاتے۔ خسرو شاہ بابر کے چچا سلطان محمود مرزا کا امیر ہوا کرتا تھا۔ اس نے بابر کے چچازاد بھائیوں کو راستے سے ہٹا کر قوت حاصل کی تھی۔ ایک بھائی کو قتل کر دیا اور دوسرے بھائی کی آنکھیں نکلوادیں۔ تیسرا بھائی مرزا خاں بابر کے ساتھ تھا۔ بابر نے حصار سے ترمذ (حال ازبکستان) کا راستہ لیا جہاں خسرو شاہ کا چھوٹا بھائی باقی حاکم تھا۔ باقی ہوشیار آدمی تھا۔ حالات کو سمجھتے ہوئے اس نے دونوں فریقوں کے درمیان سلسلہ جنبانی شروع کیا۔

دریائے آمو

بابر نے ترمذ کے پاس سے ہی دریائے آمو کو پار کیا ہوگا یہ گھاٹ ہی وہ مشہور راستہ ہے جہاں سے افواج وسالار آتے رہے ہیں۔ عہد حاضر میں روسی فوجیں (۱۹۷۹ء) بھی یہیں سے دریا پار کر کے افغانستان میں داخل ہوئیں تھیں۔ اس وقت سے اس پل کو "پل دوستی" کہا جاتا ہے حالانکہ یہ کھلی روسی لشکر کشی تھی۔

یہ پل اب بھی قائم ہے۔ تجارتی آمدورفت اس پر ہے۔ اس پل پر نہ صرف روڈ ہے بلکہ اس پر ریلوے لائن بھی ہے۔ روس نے ریلوے کے ذریعہ فوجی ساز وسامان وافر وجلد ترسیل کے لئے ریلوے بچھائی اور ایک سرحدی شہر بھی بسایا جس کا نام حیراتان ہے۔ یہ عجیب اداس شہر ہے۔ یہاں ریلوے یارڈ، ریلوے کے کارندے اور فوجیوں کی رہائش گاہ ہے۔ نئے شہر ہونے کی وجہ سے افغانستان کے دستیاب نقشوں میں بھی اس شہر کی نشاندہی نہیں کی گئی۔ پل پر جانے کی جازت نہیں یہ افغان ازبکستان سرحد ہے۔ وہاں متعین محافظ نے ہمیں وہ راستہ بتایا جہاں سے پل اور دریا کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ پل لوہے کا تعمیر کردہ ہے۔ اس پر زرد رنگ کیا گیا ہے۔ آمو ایک بڑا دریا ہے۔ عرب مورخ اس کو "نہر" کہتے ہیں۔ اور اس کے پار علاقے کو "ماوراء النہر" کے خوبصورت نام سے یاد کرتے ہیں[2]۔ ریل حیراتان سے اور پیچھے نہیں جاتی۔ افغانستان کی سرزمین کا صرف یہی ایک علاقہ ہے جہاں ریل موجود ہے۔ یہ روسی تاریخی یادگار ہے۔

بابر لکھتا ہے کہ اس نے آمو کو بیڑے کے ذریعہ پار کیا۔ دوسرے کنارے پر اس کو وسیع بیاباں نظر آئے

ہونگے۔ یہ افغان ترکستان کا علاقہ میدانوں پر مشتمل گرم علاقہ ہے جو افغانستان کے وسطی اور جنوبی پہاڑی علاقوں کے مقابلے میں گرم ہے۔ دریاؤں کے ساتھ کی زمینیں کاشت کے لئے عمدہ ہیں۔ اس کے مشرقی طرف گھاس کے میدان ہیں جہاں آج بھی گھوڑوں کی پرورش کی جاتی ہے۔

بابر نے جیسے ہی یہاں قدم رکھا خسرو شاہ کے امرا کی زیادہ تعداد بابر کے پاس آنے لگی۔ یہ صورت حال دیکھ کر بابر نے اپنا رخ خراساں سے پھیر کر قریبی پہاڑی سلسلے کے علاقے بامیاں کی طرف کر لیا۔ اس کا ارادہ اپنے افراد خاندان کو یہاں کے ایک قلعے آجر میں محفوظ رکھنے کا تھا۔

ایبک

بابر نے خسرو شاہ کے دو امیروں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جو اس سے آن ملے تھے اس میں ایک قنبر علی سلاخ اور دوسرے یار علی بلال تھے۔ بابر ان کے ساتھ شامل ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو قوی محسوس کرتا تھا۔ یار علی بلال بابر کو ایبک کے مقام پر ملے تھے۔

ایبک ایک گرد سے اٹا ہوا قصبہ ہے۔ یہاں ایک بدھ متبرک مقام ابھی تک موجود ہے۔ یار علی کی وجہ سے نہ صرف بابر نے اپنے آپ کو طاقتور محسوس کیا بلکہ ایک ایسی دوستی کا رشتہ بھی قائم کیا جو تاریخی ہے، اور رشتہ داری میں بدل گیا۔ یار علی بلال بیرم خاں، جو اکبر کے اتالیق تھے کے پردادا ہیں۔ دونوں گھرانوں کی رفاقت سات پشتوں تک چلی۔ تاریخی کتب اورنگزیب کے زمانے میں بیرم خاں کے اخلاف محمد منعم کا ذکر کرتی ہیں جو حاکم احمد نگر تھے[3]۔

بابر وقائع میں رقم طراز ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا دن ہو کہ خسرو شاہ کے مخالف بابر کے پاس نہ آتے ہوں۔ جب یہ خبریں خسرو شاہ تک پہنچیں تو وہ آگ بگولہ ہو گیا۔ اس دوران بابر کی قسمت ایک اور بالواسطہ طریقے سے بھی چمکی خسرو شاہ کا دارالحکومت قندوز تھا جس کو اس نے اپنے سمجھ کے مطابق اس قدر مستحکم کر لیا تھا اور اس قدر ذخیرہ واجناس جمع کر لیا تھا کہ بیس سال کا محاصرہ بھی برداشت کر سکے لیکن جونہی شیبانی خاں نے فرغنہ پر قبضہ کیا اور اس کے بعد قندوز کا ارادہ کیا خسرو شاہ کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس نے فوراً قندوز کو خیر آباد کہا اور کابل کا رخ کیا۔ ظاہر ہے بابر سے صلح میں بہتری ہے اس کے بجائے کہ شیبانی خاں گردن اڑا دے۔ آج بھی افغانستان میں یہ محاورہ مشہور ہے کہ "افغان کا غصہ اور ازبک کی رحمدلی برابر ہیں" جس سے ازبکوں کے طور طریقے پر روشنی پڑتی ہے۔

قندوز

قندوز اب ایک بڑا فوجی اڈا ہے، جہاں آج کل امریکی فوج کی چھاونی ہے۔ امریکن فوجی قافلے بنا کر دورے کرتے ہیں۔ ان کی اپنی بڑے بڑے پہیوں والی خاص گاڑیاں ہیں۔ ان کی سڑک پر رفتار پچاس کلومیٹر فی گھنٹہ مقرر ہے۔ وہ کسی دوسری گاڑی کو اپنے سے آگے نہیں نکلنے دیتے۔ ہم ان کے پیچھے پیچھے پچاس کلومیٹر تک چلتے رہے۔ پھر وہ پہاڑ کے پاس رک گئے اور گاڑیوں سے چھلانگیں لگا کر باہر اٹینشن کھڑے ہو گئے اور دوسری سب گاڑیوں کو، جن کی اب ایک لمبی قطار تھی آگے نکل جانے کا اشارہ کیا۔ امریکن فوج صرف سڑکوں پر ہی نہیں بلکہ دلوں اور دماغوں کو بھی متاثر کرنا چاہتی ہے۔ وہ ایک ماہانہ رسالہ صدائے آزادی بھی شائع کرتے ہیں جو دری، پشتو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے اور امریکی اچھائیوں پر رطب اللسان ہے۔

قندوز میں ہم نے خسرو شاہ کا مٹی کا قلعہ دیکھا۔ بابر بھی بعد کے زمانے میں سمرقند کے تیسرے حملے کے بعد واپسی میں یہاں قیام کر چکا تھا اور یہیں اس کی اپنی بڑی بہن خانزادہ بیگم سے دس سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔ یہ قلعہ اب انتہائی خطرناک ہے۔ اس میں جگہ جگہ بارودی سرنگیں بچھی ہوئی ہیں۔ وہاں پر موجود ایک

۳۔ ماثرالامراء ج ۳ ص ۴۸۹

چرواہے نے ہم سے کہا کہ اگر قلعہ میں جانا ہے تو صرف وہ پگڈنڈیاں لیں جو بھیڑوں نے بنائی ہیں۔ اس قلعہ میں کوئی عمارت باقی نہیں۔ مٹی کے چند تودے ہیں جو دیواروں کے ڈھینے کے بعد باقی رہ گئے ہیں۔

خسرو شاہ نے اپنے داماد یعقوب کے بابر کے پاس بھیجا۔ اس کا بھائی باقی پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ دونوں نے خسرو شاہ سے معاہدے کے لئے راہ ہموار کی۔ طے ہوا کہ خسرو شاہ اطاعت کرے اس کی جاں بخشی ہو اور وہ جو ساز و سامان چاہے اپنے ساتھ لے جائے۔ بابر نے سرخاب دریا کے پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ سفر کیا۔ اندراب و سرخاب دریاؤں کے سنگم پر قیام کیا۔ یہ ایک پُر افزا مقام دوشی ہے۔ یہاں آج کل بھی ایک بازار ہے۔ چائے خانے میں قابلی پلاؤ اور کباب سے ہم بھی لطف اندوز ہوئے۔ بازار اور دوکانوں میں زیادہ تر لوگ اس وقت قیلولے کے مزے لے رہے تھے۔

اندراب دریا کا پانی صاف شفاف ہے یہ مشرق سے آتا ہے اور مقابلتاً بڑا دریا ہے۔ سرخاب اس کے برعکس چھوٹا ہے اس میں گدیلا پن کی وجہ سے پانی سرخی مائل ہے یہ مغرب سے آتا ہے۔ دونوں دریا دوشی پر مل کر شمال کی طرف بہنے لگتے ہیں اور قندوز کے پاس سے گزر کر آمو میں مل جاتے ہیں۔

دوشی

بابر اس ملاقات و اطاعت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے

''دوسرے دن میں نے اندراب کو پار کیا اور ایک بڑے چنار کے نیچے بیٹھ گیا''[4]

چنار ایک بڑا اور گھنا درخت ہے۔ اس کے پتے ہتھیلی جتنے چوڑے ہوتے ہیں جس کے پانچ کنارے ہیں۔ یہاں اب بھی کئی چنار کے درخت موجود ہیں۔ دوسری طرف سے خسرو شاہ اپنی شان و شوکت کے ساتھ آیا اور اطاعت گزاری کی یہ تقریب گھنٹوں تک جاری رہی جس میں خسرو شاہ بے اندازہ دفعہ بابر اور اس کے امرا کے سامنے دوزانوں ہوا۔ بابر کی قسمت بغیر کسی جنگ و جدل کے پلٹی۔ بابر نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

''کہو خدایا ملک کے مالک تو جسے چاہے عزت دے اور جس سے چاہے چھین لے''

(قرآن ۳:۲۶)

بابر کی زندگی میں یہ وہ شاندار لمحہ ہے جب مفلسی و در بدری کے دن بیت گئے اور روز بروز اس کی قوت میں اضافہ ہونے لگا۔ اور یہ سب بغیر کسی جنگ و جدل بابر کے سیاسی تدبر سے ہوا کچھ ساتھ قسمت نے دیا۔

اسی دوران بابر نے سہیل ستارہ دیکھا جو جنوبی آسمان کا ایک چمکدار ستارہ ہے اور خوش قسمتی کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ جس پر باقی نے ایک شعر پڑھا

''تیری (سہیل کی) نظر جس پر بھی پڑ جائے وہ اس کے لئے دولت کی علامت ہے''

بابر کی وسیع القلبی

بابر نے معاہدے کو حرف بہ حرف پورا کیا۔ اگر وہ چاہتا تو کچھ بھی خسرو شاہ سے چھین سکتا تھا۔ مرزا حیدر تاریخ رشیدی میں لکھتا ہے ''خسرو شاہ نے کوشش کی کہ بابر کو تحائف دے، حالانکہ بابر کے پاس صرف ایک گھوڑا تھا اور وہ بھی اس کی ماں کے استعمال میں تھا لیکن اس نے کوئی مال ضبط نہیں کیا اور خسرو شاہ کو اجازت دی کہ جو چاہے وہ اپنے ساتھ لے جائے''[5]

اب تک بابر کا سفر حصار، آمو، ایبک اور پھر قلعہ اجار، کہمرد سے دوشی تک تھا جہاں اطاعت گزاری کی تقریب ہوئی۔ اب فیصلہ کرنا تھا کہ آئندہ کیا لائحہ عمل ہوگا۔ کابل زیادہ دور نہیں تھا۔ کابل پر بابر اپنا حق سمجھتا تھا کیونکہ کابل پر دو سال پہلے تک بابر کے ایک اور چچا الغ بیگ کی حکومت۔ حال ہی میں اس کے بیٹے کو اس کے امرا نے معزول کر دیا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے ہی بابر نے غور بند کا رخ کیا۔

۴۔ ورق ۱۰۴

۵۔ تاریخ رشیدی، تھیکسٹن، ص ۱۰۵

غور بند ہندوکش کے جنوب میں واقع ہے۔ یہ ایک اونچا پہاڑی سلسلہ ہے جس کے نام کی وجہ تسمیہ ان ہندوؤں کی وجہ سے پڑی ہوگی جن کے لئے جنوب سے آتے ہوئے اتنے اونچے پہاڑ مشکل ثابت ہوئے ہونگے اور وہ یہاں حادثے کا شکار ہوئے ہونگے۔

بابر نے اس پہاڑی سلسلے کو کس درے سے پار کیا یہ درج نہیں کیا ہے۔ لیکن کابل کے بیان میں یہ ذکر کیا ہے کہ اس سلسلے میں سات درے ہیں۔ یہ سب درے گرمیوں کے زمانے میں اس وقت کھلے ہونگے۔ آج کل سب سے زیادہ استعمال ہونے والا درہ سلانگ پاس ہے جو روسیوں نے تعمیر کیا۔ ہم اس درے سے گزرے یہ تین ہزار تین سو تریسٹھ میٹر اونچا اور دو اشاریہ سات کلومیٹر لمبا ہے۔ مارچ کے مہینے میں جب ہم گزرے تو یہاں برف پڑی ہوئی تھی۔ اونچائی پر سب پہاڑ برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ عمدہ نظارہ تھا۔ سڑک کھلا رکھنے کے لئے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ چھجے اور پہاڑوں کے اندر سرنگیں بنائی گئی ہیں جگہ جگہ مشینیں اور آدمی برف ہٹانے میں لگے ہوئے تھے۔ اس پاس کی تعمیر ۱۹۵۸ء میں شروع ہوئی تھی اور یہ ۱۹۶۴ء میں مکمل ہوا۔

بابر قراباغ پہنچا۔ یہ کابل سے ۳۵ کلومیٹر شمال میں ہے۔ بابر کہتا ہے کہ یہاں اس نے امرا کی مجلس بلائی اور مشاورت کے بعد کابل لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ کابل پر اُس وقت مقیم ارغوں کی حکمرانی تھی۔ ارغوں قبیلہ دور کے تیموریوں کے رشتہ دار بھی تھے۔ لیکن بابر کا کابل پر دعویٰ اپنے چچا الغ بیگ کی وجہ سے تھا جن کے بیٹے عبدالرزاق مرزا سے مقیم نے یہ حکومت لی تھی۔ شاید اسی لئے وہ کابل پر اپنا حق ارغونوں سے زیادہ سمجھتا تھا۔

مقیم نے بابر کے آنے کا سنا تو اپنے بڑے بھائی شاہ بیگ حاکم قندھار کے پاس آدمی مدد کے لئے دوڑایا۔ دوسری طرف بابر سے وقت گزاری کے لئے پیغام وسلام شروع کیا۔ لیکن جلد ہی اس کو اندازہ ہو گیا کہ کوئی مدد آنے والی نہیں چنانچہ اس نے بھی بابر سے صلح اور اطاعت گزاری کو ترجیح دی۔ لیکن یہ اطاعت جلدی حاصل کرنے کے لئے بابر کو فوجی قوت کا مظاہر کرنا پڑا۔ بابر کے لشکر نے قلعہ کابل کے باہر جمع ہو کر حملہ کرنے کا اظہار کیا جس سے ایک خوف سا طاری ہو گیا، اور اس طرح معاہدہ جلد ہی طے ہوا۔ مقیم قلعے سے باہر آ گیا۔ بابر نے مقیم کو جو مال وہ لیجانا چاہتا تھا لے جانے دیا۔

کابل

بابر وقائع میں رقم طراز ہے:

''کابل ایک مضبوط قلعہ ہے۔ دشمن یہاں آسانی سے حملہ نہیں کر سکتا، کابل میں گھاس کے میدان ہیں، دریا ہیں، رواں پانی ہے اور سب سے زیادہ چاروں طرف پہاڑ ہیں، یہ شمال اور ہندوستان سے تجارت کا مرکز بھی ہے، یہاں کا موسم عمدہ ہے اور پھلوں کے درخت بے شمار ہیں'' اب اس کابل کا یہ حال ہے کہ چاروں طرف خشک پہاڑ ہیں، درخت و گھاس اجڑ چکے ہیں، دریائے کابل اب ایک گندہ نالہ زیادہ ہے، تجارت کے راستے معدود ہیں پھلوں کی مقدار کم ہے۔ بابر کے مطابق کابل میں مختلف اقوام آباد تھیں جو مختلف زبانیں بولا کرتے تھے۔ بابر یہاں آیا تو اس نے اس قدر بولیاں سنیں کہ اس سے پہلے اس نے اس تعداد میں بولیاں ایک جگہ نہیں سنی تھیں۔

بابر کابل میں کوئی بائیس قمری سال مقیم رہا وہ شہر و نواح کو بیان کرتے ہوئے سڑکوں، دروں، پرندوں، جانوروں، پھلوں اور پھولوں کی تعریف کرتا ہے۔ کسی اور بادشاہ نے اس تفصیل سے کابل کو بیان نہیں کیا۔ وہ شہر اور اس کے نواح کو بہت پسند کرتا تھا۔ اس نے اپنے چچا الغ بیگ کی تقلید میں یہاں دس باغ لگائے۔ اب ان میں سے کسی باغ کا نام ونشان نہیں، یہ سب جنگوں میں تباہ برباد ہو چکے ہیں سوائے اس باغ کے جہاں بابر خود دفن ہے۔ یہ باغ باغِ بابر کہلاتا ہے، لیکن باغ کی طرح کی کوئی چیز اس وقت وہاں موجود نہیں۔

ازبکستان اورافغانستان کو تقسیم کرنے والا دریائے آمو اور اس پر پل دوستی

دریائے کابل
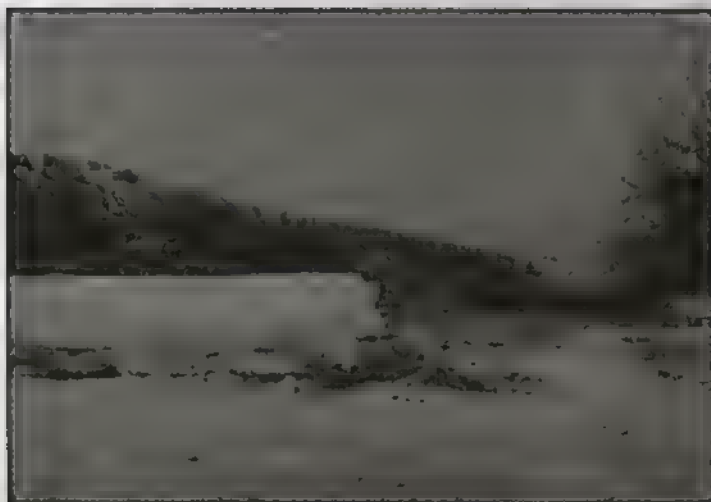
قندوز کا مٹی کا قلعہ

باغ بابر

باغ کے چاروں طرف چار دیواری ہے۔ گھاس کا کہیں نام نہیں چار باغ کی طرز نہیں، رواں پانی نہیں فوارے نہیں۔ پرانے درختوں میں صرف چنار کا ایک سوکھا تنا باقی ہے جو عبدالرحمٰن پویلین کے پاس ہے۔ باقی سب پودے نئے لگائے جا رہے ہیں موجودہ حکومت باغ بابر کو تازہ کرنے میں دلچسپی لے رہی ہے۔ آغا خاں ٹرسٹ کے پاس ٹھیکہ ہے جنہوں نے ایک ہندستانی ارکیٹیکٹ کو انچارج بنایا ہوا ہے۔ روشیں اور طبقات ترتیب دیئے جا رہے ہیں نئے درخت بوئے جا رہے ہیں۔ بابر اور اس کے رشتے داروں کی قبروں کے اطراف ایک احاطہ بنا دیا گیا ہے۔ خوش قسمتی سے قبر کا کتبہ جو جہانگیر نے لگوایا تھا سلامت ہے لیکن قبر کو خود مرمت کی ضرورت ہے۔ شاہ جہاں کی تعمیر کردہ سنگ مرمر کی مسجد دوبارہ تعمیر کر دی گئی ہے۔ ارکیٹیکٹ نے مجھے بتایا کہ پورے باغ میں بے تحاشہ بارودی سرنگیں تھیں جو ہٹا دی گئی ہیں اطراف پہاڑ پر اب بھی سرنگیں موجود ہیں اور سیاحوں کو وہاں جانے کی اجازت نہیں۔ بارودی سرنگیں صاف کرنے کے دوران باغ کے احاطے سے سنگ مرمر کے ٹکڑے ملے جن کو جوڑ کر مسجد کی مرمت کی گئی ہے۔ مرمت کے معیار انتہائی گھٹیا ہے۔ جگہ جگہ جوڑ بدنما ہیں، شاہ جہاں کی روح بے چین ہو رہی ہوگی۔ پورے باغ میں سب سے بدنما اور غلط جگہ عبدالرحمٰن کا پویلین ہے جس نے قبور اور مسجد کو چھپا دیا ہے۔ اس کی عمارت بابری دور کی نمائندہ نہیں، انگریزی طرز تعمیر ہے۔ اس کو یہاں سے ہٹانے کی ضرورت ہے۔

امید ہے کہ اگر کام اسی طرح جاری رہا تو شاید باغ پھر ہرا بھرا ہو اور اس کی شان پھر عود کر آئے۔

زیارات کابل

بابر کابل کی تین زیارتوں کا ذکر کرتا ہے[6]۔ یہ تینوں انتہائی خستہ حالت میں ہیں اور توجہ کی محتاج ہیں۔ سب سے مشہور چشمہ خواجہ خضر ہے۔ یہ باغ بابر کے پہاڑ کے پچھلی طرف ہے۔ یہاں ایک چشمہ اب بھی جاری ہے، اور مراقبے کے لئے ایک غار بھی۔ بابر یہاں ایک قدم شریف کا بھی ذکر کرتا ہے جس کا اب یہاں نام و نشان نہیں۔ دوسری زیارت بھی ایک چشمہ ہے جو بابر کے مطابق خواجہ شمو کا مزار بھی ہے۔ اس کو دوسرے لوگ خواجہ شمس الدین جانباز کا نام دیتے ہیں۔ راورٹی نے ان کو جہاں باز لکھا ہے، مقامی تاریخ داں عبدالحئی حبیبی ان کو خواجہ ہمو کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کابل کی سیاحوں کی کتاب میں اس کو زیارت عاشقان اور عارفاں کا نام دیا گیا ہے۔ تیسری زیارت خواجہ روشنائی ہے جو پہاڑ میں کافی اوپر ہے جہاں چاروں طرف اب بھی بارودی سرنگوں کا راج ہے۔

تخت بابر

ایک جگہ جس کا بابر وقائع میں کوئی ذکر نہیں کرتا تخت بابر ہے۔ یہ پہاڑ کی ڈھلان پر پتھر کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ اس کے نیچے ایک پیالہ نما حوض بھی تھا۔ بابر یہاں تخت پر رونق افروز ہو کر پیالے کو پینے پلانے کے لئے استعمال کرتا تھا۔ بابر کے پڑپوتے جہانگیر نے اس کو ۱۶۰۷ء میں دیکھا تھا۔ اس نے تزک جہانگیری میں لکھا تھا کہ اس پر ۹۱۴ھ کی تاریخ کندہ تھی۔ جہانگیر نے خود بھی اس کے برابر ایک تخت اور پیالہ کھدوایا تھا اور اس پر اپنا نام کندہ کروایا[7]۔ روسی جنگ سے پہلے عبدالحئی حبیبی[8] اور نینسی ڈپری نے بھی اس کو دیکھا تھا لیکن اس وقت یہ پہاڑ سے گر چکا تھا اور ابن سینا اسپتال کے پیچھے دریائے کابل کے دائیں کنارے پر پڑا ہوا تھا[9]۔ ہم نے وہاں جا کر اس کو تلاش کیا لیکن کچھ نظر نہ آیا۔

۶۔ ورق ۱۰۸

۷۔ تزک جہانگیری (راجرس) ج ا ص ۱۰۸

۸۔ ظہیر الدین محمد بابر شاہ ص ۱۰۹

۹۔ کابل ص ۷۵

استالیف

بابر نے کابل کے قریب شمال میں استالیف اور استرغچ کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ خوبصورت پہاڑی قصبے دامن کوہ میں واقع ہیں۔ دونوں جگہیں آج بھی موجود ہیں۔ ہم استالیف گئے۔ یہ کابل سے چالیس کلومیٹر شمال مغرب میں ہے۔ ایک خوبصورت علاقہ ہے جانے کی سڑک کچی ہے۔ پورا قصبہ دامن کوہ کا باغ ہے۔ ایک ہموار جگہ کے نیچے ایک ندی رواں ہے۔ کئی چنار کے بڑے بڑے درخت اطراف واکناف موجود ہیں۔ بابر یہاں بیٹھ کر منظر سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ یہ پورا علاقہ اس انگریز فوج نے تباہ کر دیا تھا[۱۲] جو سکندر برنس کی موت کا بدلہ لینے کے لئے جنرل میکاسکل کی سربراہی میں کلکتہ کے حکم کے بموجب یہاں آئی تھی۔

باغ وفا

بابر اس باغ کا ذکر بار بار کرتا ہے۔ یہ اس کا لگایا ہوا سب سے خوبصورت باغ تھا۔ یہ ننگر ہار صوبے میں ادینہ پور شہر کے پاس تھا[۱۱]۔ ادینہ پور ننگر ہار کا دارالخلافہ تھا۔ اکبر کے زمانے میں جلال آباد قائم ہونے کی وجہ سے ادینہ پور کی اہمیت کم ہوگئی۔ اب ادینہ پور کا نام ونشان نہیں ملتا۔ باغ وفا کا محل وقوع بابر نے تفصیل سے دیا ہے اس لئے ہم اس علاقہ میں گئے۔ کابل جلال آباد روڈ پر جلال آباد سے پہلے جنوب کی طرف تیس کلومیٹر کچے راستے پر ہچکولے کھاتے ہوئے جائیں تو بالا باغ پہنچتے ہیں۔ یہاں قلعے اور سرخ رد دریا کے بیچ میں یہ باغ ہوا کرتا تھا۔ یہاں ایک اجڑے ہوئے قلعے کے اثرات باقی ہیں اور سرخ رد دریا بھی رواں ہے سب سے قابل شناخت حقیقت یہاں نارنج اور ترنج کے کھیت ہیں جو آج بھی موجود ہیں۔ ایک علاقے میں ان پھلوں کے پکنے کی وجہ سے بھینی بھینی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں کے لوگوں کو بابر کے اس باغ کا علم تھا لیکن اصل محل وقوع بتایا نہیں جاسکا۔ سرخ رود دریا ایک نالہ کے برابر تھا اس کا پانی یک دم ٹھنڈا تھا ساتھ ہی بڑے دریا کے اثرات بھی نمایاں تھے۔ گرمیوں میں اس کا پاٹ واقعی چوڑا ہوگا۔

افغان

ایک اعزاز جو اور بابر کو دیا جانا چاہئے وہ یہ حقیقت ہے کہ تاریخی طور پر بابر پہلا مصنف ہے جس نے افغان قبائل کی تفصیلات کو بیان کیا۔ سب سے پہلے افغانوں کا ذکر سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں البیرونی نے یہ کہہ کر کیا ہے کہ یہ قبائل سندھ تک آباد ہیں[۱۲] لیکن کوئی تفصیل نہیں فراہم کی۔ بابر تفصیل میں جاتا ہے۔ قبیلوں کے نام ان کی عادات ان کا رہن سہن ان کے رہنے کی جگہیں سب کا ذکر کرتا ہے کچھ سرداروں کا نام بھی لیتا ہے۔ اولف کیرو نے اپنی کتاب پٹھانس میں اس کو اجاگر کیا ہے اور بابر کے اس اعزاز کو تسلیم کیا ہے[۱۳]۔

خط سرطان

بابر کی قوت مشاہدہ زبردست تھی۔ کابل اور ہندستان کے سفر کے دوران اس نے محسوس کیا کہ ماحول اور منظر ادینہ پور پہنچنے سے پہلے بدل جاتا ہے۔ درخت زیادہ گھنے ہو جاتے ہیں ان کا ہرا رنگ گہرا ہو جاتا ہے اور موسم زیادہ گرم ہو جاتا ہے، انسانوں کی عادات مختلف ان کا رہن سہن جدا ہو جاتا ہے۔ بابر کی تقلید میں ہم نے یہ محسوس کیا کہ یہ کیفیات سروبی نامی جگہ پر ہوتے ہیں جو کابل اور جلال آباد کے درمیان ہے۔ یہاں عوام کی جلد بھی زیادہ گندمی ہو جاتی ہے۔

۱۰۔امپیریل گزیٹیرص ۶۶

۱۱۔ورق ۱۱۲

۱۲۔البیرونی ص ۲۷۹

۱۳۔اولف کیروص ۱۵۱

بابر کی تلاش میں........

۳۔ پاکستان کے علاقے

ظہیر الدین محمد بابر نے کابل میں ۱۵۰۴ء سے ۱۵۳۰ء تک حکومت کی۔ موجودہ افغانستان کا جنوبی علاقہ اس کے ماتحت تھا۔ یہ اس کو بے انتہا پسند بھی تھا لیکن مالی طور پر وہ مطمئن نہیں تھا۔ علاقے کی آمدنی اور وسائل بابر اور اسکے قبائل کے لئے ناکافی تھے۔ اس کے علاوہ وہاں خراج وصول کرنا آسان نہ تھا۔ چنانچہ بابر لکھتا ہے کہ کابل میں خراج تلوار سے وصول کیا جاتا تھا، لکھ لکھا کر کچھ حاصل نہ ہوتا تھا[1]۔ ۱۵۰۴ء (۹۱۰ھ) میں جب اس نے کابل کی حکومت حاصل کی تو اس مالی کمی کو محسوس کرتے ہوئے جنوب کی جانب حملے کئے۔

بابر نے موجودہ پاکستانی علاقوں پر کل پانچ حملے کئے۔ ان حملوں میں پاکستانی علاقوں کی سیاست کے متعلق معلومات، ان میں دخل اندازی، جوڑ توڑ اور فتوحات شامل تھیں۔ پاکستان اس وقت عالم وجود میں نہیں تھا لیکن بابر کے مدنظر ہندوستان تھا اور پاکستانی سرزمین اس کا راستہ تھا۔ راستہ کی حفاظت، اپنے پیچھے کی خبر گیری کا بابر کو خوب اندازہ تھا۔ یہ پانچ حملے پاکستانی سرزمین تک محدود تھے۔ صرف آخری حملہ کے بعد جو ۱۵۲۵ء میں ہوا بابر موجودہ سرزمین ہند میں داخل ہوا۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بابر نے ۲۱ سال کی تیاری کے بعد ہندوستان میں دراندازی کی اور یہ اکیس سال پاکستانی سرزمین میں راستہ صاف کرنے، دوستیاں قائم کرنے، شادی کرنے اور فتوحات کرنے میں گزارے۔ جب یہ سب تیاریاں مکمل ہوگئیں تو پھر ۱۵۲۵ء میں ہند میں داخل ہو کر بہار تک فتوحات کیں۔

بابر نے اپنی زندگی کے حالات ''وقائع'' میں درج کئے ہیں۔ شوقین لوگوں کے لئے یہ ایک مسحور کن کتاب ہے کیونکہ یہ صرف جنگی روزنامچہ نہیں بلکہ بابر نے ایک فراغ دل و بالغ نظر انسان کی طرح دنیا زمانے کی چیزوں کا اُس میں ذکر کیا ہے۔ لیکن افسوس کے کچھ سالوں کے حالات غائب ہوگئے اور کتاب نامکمل صورت میں ہم تک پہنچی ہے۔

مختلف تاریخ داں جب بابر کا ذکر کرتے ہیں تو ہندوستان کے بیان میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ بابر کے پاکستانی علاقوں کی سرگرمیوں کا ذکر نہیں کرتے، لیکن پاکستانی علاقوں پر اس کی گرفت انتہائی ضروری تھی۔ اس کے بغیر ہندوستان کو محکوم کرنا ناممکن تھا۔ اس لئے میں یہاں بابر کی پاکستانی علاقوں کی سرگرمیوں کا ایک مختصر جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ یہ جائزہ وقائع، مختلف کتابوں اور میرے حالیہ سفر کے نچوڑ پر مشتمل ہے۔

باجوڑ

بابر کا پاکستانی علاقوں پر سب سے کامیاب سفر ۱۵۱۹ء (۹۲۵ھ) کا ہے پہلی محرم ۹۲۵ھ (۳ رجنوری ۱۵۱۹ء) کو ہم بابر کو باجوڑ میں پاتے ہیں[2]۔ اس سے پہلے سال (۱۵۱۸ء) کے خود نوشت حالات ہمیں نہیں ملتے۔ کہا نہیں جاسکتا کہ بابر کس راستے سے کابل سے باجوڑ آیا تھا۔ انگریزوں کی مصنوعی ڈیورنڈ لائن کو سرحد بنانے سے پہلے باجوڑ سے کابل ایک عام راستہ تھا۔ اب بھی ایک پگڈنڈی اسد آباد (افغانستان) کو نکلتی ہے اور ایک دوسرا راستہ خار سے نواگئی اور سرکانی جاتا ہے سرکانی افغانستان میں دریائے کنار پر واقع ہے جہاں سے یہ سڑک دریائے کنار کے ساتھ ساتھ جلال آباد پہنچتی ہے۔ ان دونوں راستوں پر آج بھی قبائلی مسلسل آمد و رفت

۱۔ ورق ۱۴۲

۲۔ ورق ۱۹۱

رکھتے ہیں۔ بابر نے خود اسی راستے سے بھاری سامان کابل بھیجا تھا اور اسی راہ سے سکندر مقدونی بھی آیا تھا۔ باجوڑ آج کل ایک آزاد قبائلی علاقہ ہے۔ پاکستانی حکومت کے قانون وہاں لاگو نہیں ہوتے۔

پہلی محرم کو یہاں ایک قصبے جندول میں زلزلہ آیا جو آدھے گھنٹے تک رہا۔ بابر باجوڑ کے قلعے خار پر حملہ کرنے آیا تھا۔

خاریوں نے اس کی بالا دستی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور حیدر علی باجوڑی نے بابر کو بے ہودہ جواب لکھ بھیجا تھا۔

باجوڑ آج بھی ایک دشوار گزار، چاروں طرف پہاڑوں سے گھرا ہوا علاقہ ہے۔ ہمارا سفر باجوڑ صبر آزما اور تکلیف دہ تھا۔ پشاور سے مردان وہاں سے مالا کنڈ درہ جو آجکل انتہائی خستہ حالت میں ہے۔ بٹ خیلہ شہر کے بعد سوات والی سڑک چھوڑ کر اگر الٹے ہاتھ دریائے سوات کو عبور کریں تو دیر والی سڑک پر آ جاتے ہیں۔ اس سڑک پر ایک قصبہ تیمر گڑھ ہے۔ یہاں دریائے پنج گورہ کو پار کر کے دریائے باجوڑ کے ساتھ ساتھ سڑک جاتی ہے۔ اس پر ایک گاؤں منڈا آتا ہے جو خود دریائے باجوڑ کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ یہاں سے سیدھے جائیں تو جندول اور اگر دریا کو عبور کر کے دریا کے ساتھ ساتھ سفر کریں تو باجوڑ کے مرکزی شہر خار تک پہنچتے ہیں۔ خار اب ایک بڑا شہر ہے جس کی آبادی پانچ لاکھ ہے اور یہاں ایک ڈگری کالج بھی ہے۔ خوبصورت علاقہ ہے۔ ساتھ دریا اور اسکے پیچھے کوہ مور۔ آزاد منش لوگ ہیں مہمان نواز اور تصویر کھنچوانا بغیر کلاشنکوف کے معیوب سمجھتے ہیں۔ وہ ان کے ہاں "ماشین" ہے۔ یہاں ایک مغلیہ مسجد اور ایک علاقہ دشت بابر ہے۔ دشت بابر میں ایک صاحب نے قلعہ نما عمارت بنائی ہوئی ہے اور یہ ان کی رہائش گاہ ہے۔ مسجد کے آثار چار سو سال پرانے ہیں، اور بابر کے بعد کی تعمیر کی ہوئی ہے۔ بابر کی یہاں آمد سے پورا ہجوم جو ہمارے گرد جمع ہو گیا تھا واقف ہے۔

انگریز مصنف راورٹی بابر کے لفظ باجوڑ (بجور) کے استعمال پر اطمینان کا اظہار نہیں کرتا لیکن آج بھی سب لوگ اس علاقے کو باجوڑ سے ہی جانتے ہیں اور خار اتنا معروف نہیں[3] اور اسی وجہ سے حیدر علی بھی باجوڑی مشہور ہیں۔ ایک اور مصنفہ مسز بیورج جنہوں نے "وقائع" کا ترجمہ ترکی سے انگریزی میں کیا ہے اپنے حواشی میں یہ فیصلہ نہیں کر سکیں کہ آیا 'خار' مہمند والا ہے یا مالا کنڈ والا[4]۔ ان کے حواشی انگلستان میں نقشوں کی مدد سے لکھے گئے تھے لیکن یہاں پہنچ کر اس میں شک نہیں رہتا کہ بابر خار باجوڑ ہی آیا تھا۔

بابر نے اس قلعے کو ایک رات رک کر دوسرے دن چند گھنٹوں میں فتح کر لیا تھا۔ بابر لکھتا ہے کہ ہمیں سیڑھیاں اور مچان کی تیاری کے لئے ایک رات وہاں رکنا پڑا۔ بابر کی فتح کی اصل وجہ اس کی ترقی یافتہ جنگی ساز و سامان تھا۔ باجوڑیوں نے کبھی تفنگ (بندوق) نہیں دیکھی تھی۔ پہلے تو وہ اس کے سامنے آتے ہوئے بالکل گھبراتے نہیں تھے بلکہ اس کو دیکھ کر منہ چڑاتے اور بے ہودہ اشارے کرتے تھے، لیکن جب استاد علی قلی نے پانچ اور ولی خازن نے دو باجوڑی مار گرائے تو وہ ہوشیار ہو گئے۔ اسی طرح فرنگی (توپ) کا بھی وہاں استعمال ہوا جو اس علاقے کے لئے نئی تھی۔

فرنگی کے استعمال پر انگریز مورخین یہ جتاتے ہیں کہ یہ یورپ سے آئی تھی۔ اصل میں بارود چین میں دریافت ہوا تھا۔[5] یہ وسط ایشیا سے ہوتا ہوا ترکوں تک پہنچا اور وسط ایشیا سے ہی مسلمان فاتحین کے ساتھ ہندوستان آیا۔[6] امیر تیمور نے جب ترکی کے بایزید کو ۱۴۰۱ء میں شکست دی تو ہاتھیوں پر سے آگ کے شعلے پھینکے تھے۔ تاریخ داں گبن کہتا ہے کہ ترکوں نے جب قسطنطنیہ کو ۱۴۲۲ء میں فتح کیا تو انہوں نے دھات کی توپیں استعمال کی تھیں[7] لفظ فرنگ اور رومی کا استعمال انگریزوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے بھی ہوتا تھا۔ اس سے مراد مغرب اور شمال مغرب کے لوگ تھے جن میں کئی مشرقی یورپ کے عیسائی ہوتے تھے۔ چنانچہ بابر نے لفظ

۳۔ راورٹی، میجر ہنری۔ نوٹس اون افغانستان اینڈ بلوچستان، سنگ میل لاہور، ۲۰۰۱ء ص ۱۱۴، ۱۱۶۔

۴۔ بیوریج، اینٹ، بابر نامہ (ترجمہ) سنگ میل، لاہور، ۱۹۷۹ء ص ۳۶۷ نوٹ ۴۔

۵۔ کیلی، جیک، گن پوڈر، اٹلانٹک بکس، لندن ۲۰۰۴ء ص ۱۔

۶۔ خان، اقتدار عالم، گن پاؤڈر اینڈ فائر آرمس۔ اوکسفورڈ، نئی دہلی ۲۰۰۴ء ص ۱، ۲۔

۷۔ گبن، ڈکلائن اینڈ فال اوف رومن ایمپائر۔ فولیو سوسائٹی ۱۹۸۶ء ج ۸ (رومن) ص ۲۱۴۔۲۲۲

رومی بطور طریقہ جنگ کے استعمال کیا ہے۔اس نے رومی طریقے سے توپوں کو ایک دوسرے کے ساتھ گائے کی کھال کی رسیاں بنا کر باندھ دیا تھا۔[8]

باجوڑ کو فتح کرنے کے بعد خواجہ کلاں کو یہاں کا مختار بنا کر بابر سوات کی طرف روانہ ہوا۔خواجہ کلاں مولانا محمد صدرالدین کے بیٹے تھے۔مولانا بابر کے باپ عمر شیخ مرزا کے قریبی مصاحب تھے۔خواجہ کلاں کے چھ بھائی تھے جو سب بابر کی خدمت میں رہے۔[9] خواجہ کلاں سے بابر کی یاری تھی۔خواجہ کلاں کی روانگی کے وقت بابر نے یہ قطعہ کہا جو اس کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔یاد رہے کہ بابر باجوڑ کو ہمیشہ ''بجور'' ہی لکھتا ہے۔

نہ تھا ایسا عہدہ وپیماں بہ یار آخر　　جدا ہو کر کر گیا بے قرار آخر
خلاف قسمت،ہتھیار کیا آزماؤں　　یار کو کردیا جدا بجور،بہ یار آخر[10]

بابر کے بقیہ سفر باجوڑ کے متعلق ہمیں معلومات میجر منہاج سے ملیں جو چکدرہ کے قلعے میں فرنٹیر کور کے کپتان ہیں جن کے پاس ایک فائل میں تفصیلات درج ہیں۔بابر جندول آیا پھر پنجکورہ دریا کو جہاں وہ باجوڑ دریا سے ملتا ہے عبور کیا اور چکدرہ میں اپنی افوج کو جمع کیا اور پھر سوات کی طرف روانہ ہوا۔ہم نے اپنے سفر میں دیکھا کہ چکدرہ میں قلعہ کے علاوہ ایک عجائب گھر بھی ہے۔چکدرہ قلعہ کے سامنے ایک پہاڑ ہے جو دامکوٹ کہلاتا ہے۔اس کے اگلے حصہ پر ایک کمین گاہ ہے جہاں چرچل اپنی مالاکنڈ فورس کی نوکری کے دوران پہرہ دیا کرتے تھے۔پہاڑی پر ایک ضرورت سے زیادہ بڑا بورڈ لگا ہوا ہے جس پر اس واقعہ کی نشاندہی کی گئی ہے لیکن بابر سے متعلق کوئی معلومات درج نہیں۔چکدرہ قلعے کے گیٹ کے اندر ایک پتھر پر بابر کی آمد سے متعلق نشاندہی کی گئی ہے۔

شاہ منصور یوسف زئی سوات کی طرف سے بابر کے پاس بطور سفیر آیا ہوا تھا۔بابر نے سوات کے حکمرانوں کے لئے پیغامات دیئے۔اگلے پڑاؤ پر شاہ منصور بابر کے لئے نشہ آور گولیاں لے کر آیا جو بابر نے خود بھی استعمال کیں اور دوسروں کو بھی دیں۔کیونکہ اسی مقام پر سواتیوں کی طرف سے اطاعت گزاری کے پیغامات آئے۔بابر نے شاہ منصور سے اس کی بیٹی کا ہاتھ مانگا۔شاہ کا بھائی طاؤس خاں بابر کی دلہن کو لے کر آیا۔یہ بابر نے نہیں لکھا کہ اس کا نکاح کہاں ہوا لیکن یہ ضرور درج کیا ہے کہ اگلا پڑاؤ دریائے باجوڑ اور پنجکورہ کے سنگم پر تھا۔اس سنگم پر ہی آجکل تیمر گڑھ کا قصبہ آباد ہے۔

کیونکہ سواتیوں نے بابر کی اطاعت قبول کر لی تھی اور بابر نے اس رشتہ کو مضبوط بھی کر لیا تھا اس لئے سوات جانا ملتوی ہوا اور بابر نے اپنا رخ دوسری مشہور آبادی بھیرہ کی طرف کر لیا۔

صوابی

اس کے بعد بابر صوابی (سواتی) کا ذکر کرتا ہے جہاں اس نے گینڈے کا شکار کیا۔صوابی کے لئے کئی راستے ہیں مالاکنڈ پاس اور کاکڑ پاس تو بڑے راستے ہیں اس کے علاوہ شاہ کوٹ پاس اور مور پاس بھی پہاڑی درے ہیں جن سے گزرا جاسکتا ہے لیکن جس طرح بابر نے راستہ بیان کیا ہے کہ درہ اونچا تھا اور اس پر اطراف وجوانب کی وادیاں بہت خوب نظر آتی تھیں۔اس کے علاوہ پہاڑ کی چوٹی پر ایک ملحد شہباز قلندر کی قبر تھی۔اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ بابر کا راستہ زیادہ آمدورفت والا مالاکنڈ پاس ہی تھا۔مالاکنڈ سے مردان اور پھر صوابی۔بابر کہتا ہے کہ صوابی میں گھنا جنگل تھا اور اس کو کرگ خانہ کہتے تھے کیونکہ اُس وقت وہاں کافی گینڈے پائے جاتے تھے گینڈوں کو جنگل سے نکالنے کے لئے آگ لگانی پڑی۔[11]

دریائے سندھ

صوابی کے جنوب مشرقی گھاٹ پر دریائے سندھ کو عبور کیا گیا۔یہ تربیلا جھیل کا جنوبی کونہ ہوگا جہاں

۸۔ورق ۲۳۹

۹۔ابوالفضل،اکبرنامہ(ترجمہ،بیورج)لو پرائس پبلیکیشنز،دہلی ۱۹۸۹ءج اص ۲۳۶۔

۱۰۔ورق ۱۹۳

۱۱۔ورق ۱۹۷

خار، باجوڑ کا منظر

باغ صفا کی باقیات کلر کہار میں
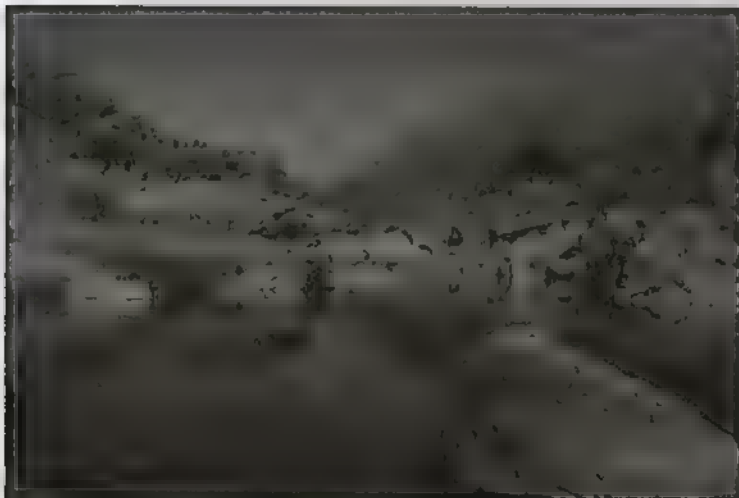
دریائے سون نزد راول پنڈی

دریائے سندھ تنگ ہے۔ لشکر کو دریا عبور کرتے کرتے ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ اس رات قیام کچھ کوٹ گاؤں میں دریائے ہرو پر ہوا۔

دریائے ہرو کو عبور کرنے کے بعد بابر نے اپنا رخ جنوب کی طرف کر لیا تا کہ جلد از جلد بھیرہ پہنچا جا سکے۔ اس لئے کافی طویل اور تھکا دینے والا سفر کر کے اسلام آباد و راولپنڈی کے جنوب سے گزر کر دریائے سون کو پار کیا۔ اس رات قیام دریائے سون کے کنارے رہا۔ اس علاقے کی حکمرانی ملک ہست کی تھی۔ بابر نے اپنے ساتھی لنگر خاں کو ملک ہست کے پاس بھیجا۔ ملک ہست ایک گھوڑا اور دوسری نظریں لیکر حاضر ہوا۔ دوسرے آس پاس کے علاقوں جیسے خوشاب، چنیوٹ اور بھیرہ میں بھی سفیر روانہ کئے گئے۔

اب کوہ نمک پاس ہی تھا۔ بابر نے امیر تیمور کی تقلید میں کوہ نمک کو کوہ جود کہا ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہاں دو قبیلے جود اور جنجوعہ اس علاقے میں بستے ہیں۔ جودھ (جود) تو اب ایک معدوم قبیلہ ہے۔ جنجوعہ آجکل کوہ نمک کے وسطی اور مشرقی حصوں میں ہیں۔ گکھڑوں اور اعوانوں نے جنجوعوں کو شمال اور مغرب کی طرف دھکیل دیا ہے۔ جنجوعہ کے راجے کھیوڑا کی کانوں کے مالک اور منتظم تھے، جب تک کہ انگریزوں نے ان کانوں پر قبضہ نہ جما لیا۔

کلر کہار

بابر کا اگلا پڑاؤ کلر کہار (کلدہ کہار) تھا۔[۱۲] یہ کوہ نمک کے مغربی حصہ میں ہے۔ یہ عمدہ اور خوبصورت وادی ہے یہاں سیاحت کے فروغ کے عمدہ امکانات ہیں لیکن ابھی تک تو محکمہ سیاحت کو اس طرف توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ چاروں طرف پہاڑ ہیں اور بیچ میں خوبصورت جھیل۔ ایک پہاڑی پر بابر نے چبوترہ بنوایا تھا۔ بابر یہاں سے اپنے لشکر کا معائنہ کیا کرتا تھا اور اسی پر سے ان کو خطاب کیا کرتا تھا۔ یہ اب بھی قائم ہے اور تخت بابری مشہور ہے۔ اس سے نیچے اور جنوب مغربی طرف بابر نے بڑے شوق سے ایک باغ لگوایا تھا اور اس کا نام باغ صفا رکھا تھا۔ اس کے اثرات کچھ گھنے درختوں کی صورت میں موجود ہیں لیکن اس کی دیکھ بھال و بندوبست کی انتہائی ضررت ہے۔

بھیرہ

کلر کہار سے بھیرہ جانے کے لئے بابر نے وہ سڑک لی ہوگی جو آجکل چوہا سیدن شاہ اور پنڈ دادن خاں سے گزرتی ہے۔ اس زمانے میں بھیرہ دریائے جہلم کے داہنے کنارے پر آباد تھا۔ بھیرہ بابر کے زمانے میں بڑا شہر اور ہندستان کی سرحد تھا۔ بھیرہ کا آجکل کا شہر جہلم کے بائیں کنارے پر آباد ہے۔ یہ شیر شاہ نے آباد کیا تھا۔ بھیرہ سے متعلق ایک کتابچے 'تذکرہ' میں صاحبزادہ ابرار احمد بگوی تحریر کرتے ہیں کہ بھیرہ سنسکرت کے دو لفظوں بھے اور ہرہ سے مل کر بنا ہے۔[۱۳] بھے کے معنیٰ ڈر و خوف کے ہیں اور ہرہ سے مراد پاک کے ہیں۔ گویا بھیرہ نام کا مطلب ایسی جگہ جہاں خوف وڈر نہ ہو۔ بابر یہاں پرانے شہر کے مشرق میں ایک کھیت میں اترا۔ بھیرہ کا ایک وفد اطاعت گزاری کے لئے آیا۔ اس طرح بھیرہ کے لوگوں کا خوف دور ہوا۔ بھیرہ کے لوگوں پر چار لاکھ شاہ رخی کا خراج لگا۔ بابر نے یہاں اپنے کچھ سپاہیوں کو حکم عدولی پر سزا دی کہ انہوں نے بھیرہ کے لوگوں کو لوٹنے کی کوشش کی تھی۔

بھیرہ میں بابر نے ایک قلعے ''جہاں نما'' کا ذکر کیا ہے۔ نئے بھیرہ میں تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن جہلم کے مغربی کنارے پر جا کر ہم نے آثار دیکھنے کی کوشش کی۔ وہاں کچھ پہاڑیاں ہیں جن میں جہاں نما ہو سکتا ہے۔ اس کو تلاش کرنا محکمہ آثار قدیمہ کے ذمے۔ اس طرف آبادی نہیں ہے لیکن ایک غیر تربیت یافتہ کے لئے بھی قلعے کے اثرات نظر آتے ہیں۔

بابر نے یہاں سے ملا مرشد کو اپنا سفیر بنا کر سلطان ابراہیم کے پاس دہلی روانہ کیا۔ ایک جمعہ کے دن

۱۲۔ ورق ۱۹۸

۱۳۔ صاحبزادہ ابرار احمد بگوی، تذکرہ، مجلس مرکزیہ حزب الانصار، بھیرہ ۱۴۲۴/۲۰۰۳ ص ۳۔

بابر نے دریائے جہلم کو پار کر کے تفریح کے لئے باغات کا دورہ کیا۔ یہاں گنے کے کھیت کافی تھے۔ ان کھیتوں کے درمیان بابر نے رہٹ سے پانی کھینچتے ہوئے دیکھا۔ کیونکہ بابر نے پہلے رہٹ نہیں دیکھا تھا اس لئے بار بار پانی نکلوا کر دیکھا۔ فرغنہ و کابل وغیرہ میں یہ طریقہ رائج نہیں۔

بھیرہ اور آس پاس کے علاقوں پر اطمینان ہو جانے کے بعد بابر نے واپسی کا ارادہ کیا۔ بھیرہ لینے پر اسے یہ تسلی تھی کہ وہ ہندستان کی سرحد میں داخل ہو گیا ہے آگے جانے کی ابھی تیاری نہیں تھی۔

پرہالہ

واپسی پر پھر پہلا پڑاؤ کلر کہار میں تھا۔ یہاں بابر کے پاس اطلاعات پرہالہ اور اس کے حکمراں ہاتھی گکھڑ کے متعلق آرہی تھیں۔ وہ بدکردار ہے، مسافروں کو لوٹ لیتا ہے۔ اس کو سزا دی جانی چاہیے۔ کچھ ہی عرصے پہلے اس نے اپنے چچازاد بھائی تاتار گکھڑ پر حملہ کر کے اس کو قتل کیا اور پرہالہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ پرہالہ راول پنڈی کے شمال مشرق میں دریائے سون پر ایک مضبوط قلعہ ہے، یہ بابر کے راستے میں ہی تھا اس لئے بابر نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا بابر کے مطابق پرہالہ کا قلعہ کھائیوں کے درمیان ہے۔ آجکل پرہالہ جانے کے لئے پنڈی ائر پورٹ کے سامنے سے جو سڑک لہتر کو جاتی ہے اس پر بیس کلومیٹر دور دریائے سون پر ایک پل ہے۔ اس سے دو تین کلومیٹر آگے ایک پگڈنڈی سیدھے ہاتھ پر کھیتوں کے بیچ سے گزرتی ہے۔ اگر اس راستہ پر پانچ کلومیٹر پیدل چلیں تو پرہالہ آتا ہے۔ لہتر روڈ پر جب ہم سون پل کے آگے چند دکانوں پر پہنچے اور پکوڑے کھاتے ہوئے اپنا مقصد بیان کیا تو وہاں سب نے مشورہ دیا کہ یہ خطرناک علاقہ ہے۔ بیچ میں ڈاکوں کا راج ہے۔ وہاں سب گکھڑوں کی آبادی تھی چنانچہ دکان داروں کی پنچایت بیٹھی سب نے مشورہ کیا اور دو آدمی ہمارے ساتھ کئے جو ہمیں دوسرے راستے سے بیس کلومیٹر ایک تنگ اور مشکل سڑک سے لے کر گئے جہاں سے سامنے پرہالہ کا قلعہ نظر آتا تھا۔ اس تک پہنچنے کے لئے نیچے دریائے سون میں اتر کر اس کو پار کرنا پڑا اور پھر دوسرے کنارے پر چڑھ کر وہاں پہنچے۔ قلعہ آدھا پہاڑی پر اور آدھا اس کے نیچے ہے۔ اس کی فصیل کے کچھ حصے اور تین دروازے ابھی باقی ہیں۔ قلعہ کے اندر گاؤں آباد ہے جس کا نام بھی پرہالہ ہے۔ یہاں کسی قسم کی معلومات کنندہ نظر نہ آئیں۔ بابر کلر کہار سے چاشت کے وقت روانہ ہوا۔ ظہر کے وقت رک کر گھوڑوں کو دانہ دیا۔ عشا کے وقت تیز رفتاری سے رات بھر سفر کرتے ہوئے صبح صادق کو پھر رکے۔ جب روشنی ہوگئی تو پھر سوار ہو کر ناشتے کے وقت پرہالہ پہنچے۔ حملہ کیونکہ اچانک تھا اس لئے ہاتھی گکھڑ کچھ مقابلہ نہیں کر سکا۔ اس نے جلد ہی ہار مان لی اور بابر کی اطاعت قبول کر لی۔[۱۴]

یہاں سے بابر کا واپسی کا سفر دریائے سون کو پار کر کے شروع ہوا۔ پہاڑی علاقہ شروع ہونے پر رکنے کا فیصلہ کیا گیا۔ بابر پہاڑ پر او پر گیا اور حکم دیا کہ قافلے کے اونٹوں کی گنتی کی جائے۔ یہ اونٹ کل پانچ سو ستر نکلے۔ اونچی زمین پر بابر نے دیکھا کہ سنبل کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ یہاں یہ اکا دکا تھے لیکن آگے پہاڑوں کے ساتھ ان پھولوں کی بہار چھائی ہوئی تھی۔ یہ موسم بہار تھا مارچ کا مہینہ تھا کہیں زرد پھول تھے کہیں ارغوانی اور کہیں ملے جلے۔

دریائے سندھ پر کابل دریا کے سنگم سے نیچے پہنچے اور دریا پار کرنا شروع کیا۔ لشکر کو دریا پار کرتے کرتے تین دن لگے۔ دریا کے اس طرف بھی پھولوں کی بہار تھی۔ یہاں راستے میں ایک جگہ شیر آ گیا جس کا شکار کیا گیا۔

پشاور

۲۶ مارچ بابر پشاور (بگرام) کے نواح میں پہنچ گیا۔ کیونکہ بابر گورک چھتری کا ذکر سن چکا تھا اور اپنے ۱۵۰۴ء کے سفر میں اس کو دیکھ نہیں سکا تھا اس لئے یہ موقعہ ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ گورک چھتری آج کل پشاور شہر کے بیچ میں ہے۔ یہ پرانی عبادت گاہ ہے۔ پہلے یہاں بدھوں کے مندر ہوا کرتے تھے۔ لیکن بابر کے

زمانے میں یہ ہندوں کا مقدس مقام تھا۔ ہندو سادھو پورے ہندوستان سے یہاں آتے اور اپنے داڑھی مونچھوں اور سر کے بال ترشواتے تھے۔ بابر نے دیکھا کہ یہاں چھوٹے چھوٹے ہجرے بنے ہوئے تھے جن میں اندھیرا تھا اور بالوں کے ڈھیر جگہ جگہ جمع تھے۔ بابر لکھتا ہے کہ اگر میں اس کو نہ دیکھتا تو بھی مجھے افسوس نہ ہوتا[15]۔ آج کل گورک چھتری کا حال برا ہے۔ مغل دور میں یہاں ایک سرائے تعمیر کی گئی تھی جس کے کچھ در باقی ہیں۔ سکھوں کے دور کا گردوارہ بھی ٹوٹی پھوٹی حالت میں موجود ہے۔ برابر میں کچھ نئی عمارات تعمیر کی جا رہی ہیں جن کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ مغل دور کا اگلا اور پچھلا دروازہ کچھ قائم ہے۔

۱۵۔ ورق ۲۰۷

۱۶۔ کیرو، اولف، پٹھانس، اوکسفورڈ کراچی، ۱۹۵۸، ص ۱۵۶

علی مسجد

اس کے بعد بابر کا اگلا پڑاؤ علی مسجد تھا۔ یہ درہ خیبر میں تنگ ترین جگہ ہے۔ بابر کا لشکر یہاں نیچے وادی میں رکا کرتا تھا اور بابر خود اونچی جگہ پہاڑ پر اپنا خیمہ نصب کرواتا تھا۔ رات جب لشکر میں شمعیں روشن ہوتیں تو عجب دلفریب منظر ہوتا تھا۔ یہاں سیدھے ہاتھ پر پہاڑ کے کنارے ایک چھوٹی مسجد اب بھی موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت علی (کرم) یہاں تشریف لائے تھے۔ مسجد کے برابر ایک ہجرہ ہے جو حضرت علی (کرم) کی زیارت کے طور پر مشہور ہے۔ جب ہم یہاں گئے تو مسجد میں تالا پڑا ہوا تھا۔ اندر سے مسجد کو دیکھنے کے لئے اس کو کھلوانا پڑا۔ مسجد کے سامنے تھوڑا داہنی طرف پہاڑ پر ایک بڑا پتھر اوپر سے لڑھک کر آدھے راستے پر رکا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت علی (کرم) نے انگشت شہادت سے روک دیا تھا۔

اس کے بعد بابر کا اگلا پڑاؤ کابل کی حدود میں تھا۔

پاکستانی علاقوں میں بابر کا پہلا سفر ۱۵۰۴ء (۹۱۰ ہجری) میں ہوا تھا۔ کیونکہ یہ سفر جن علاقوں میں ہوا وہ پچھلے بیان کردہ سفر سے مختلف ہے اس لئے اس کا بیان بھی یہاں مناسب ہوگا۔

کوہاٹ

اس میں پہلا پڑاؤ جمرود (جام) تھا اور دوسرا پشاور (بگرام)۔ پشاور میں یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ آگے کہاں جایا جائے باقائدہ مجلس بیٹھی۔ بابر کے ایک مصاحب باقی چغانیانی نے کوہاٹ کا مشورہ دیا اور کابلیوں کو پیش کیا کہ یہ سفر سود مند ہوگا۔ کوہاٹ سے گائیں بھینسیں اور غلہ کافی ہاتھ آیا لیکن اور کچھ نہیں جس پر باقی چغانیانی کو شرمندگی ہوئی۔ اس کے بعد بنوں اور بنگش کے علاقوں کی طرف روانگی کا فیصلہ کیا گیا۔ کوہاٹ سے ہنگو کا راستہ لیا گیا۔ ویسے تو یہ علاقہ زیادہ سرسبز نہیں لیکن کوہاٹ اور ہنگو کے بیچ میں ایک خوبصورت وادی ہے جو دونوں طرف پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے۔ کیرو کے مطابق یہ وادی استر زئی اور ریسن گاؤں کے درمیان ہے۔[16]۔ یہاں کے مقامی باشندوں نے بابر پر حملہ کیا۔ بابر کے ساتھ ملک بوسعید کماری تھا جو مقامی علاقہ سے واقف تھا۔ ملک بوسعید نے مشورہ دیا کہ اگر تھوڑی دور پر جو پہاڑی ہے اس طرف حملہ آوروں کو دھکیل دیا جائے تو ان کو چاروں طرف سے گھیرا جا سکتا ہے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اور انہوں نے جلد ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ بابر کے مطابق اس نے پہلے دفعہ دیکھا کہ یہ لوگ جب ہار جاتے ہیں تو منہ میں تنکے دبا کر آجاتے ہیں۔ یعنی پناہ کے طالب ہوتے ہیں۔ دوسری چیز جو بابر کو معلوم ہوئی یہ تھی کہ جب یہ لوگ پہاڑ پر اپنا حفاظتی پشتہ بنا لیتے ہیں تو اس کو سنگر کہتے ہیں۔ ہنگو سے بنوں جانے کے لئے رہبر کی غلطی سے جو راستہ لیا گیا وہ عام سفر کرنے والی سڑک نہیں بلکہ چرواہوں والی پگڈنڈی تھی بابر اس کو گوسفند لیار کہتا ہے۔ انتہائی تنگ اور اس پر کافی ڈھلان۔ سب لوگ اس پر سفر کر کے تھک گئے اور جو مویشی ساتھ تھے سب راستے میں چھوڑنے پڑے۔

بنوں ایک میدانی علاقہ ہے۔ جب وہاں اترے تو معلوم ہوا کے دشت میں قبائل جنگ کی تیاریاں کر

رہے ہیں۔ بابر نے اپنے چھوٹے بھائی جہانگیر مرزا کو ان کا مقابلہ کرنے کے لئے روانہ کیا اور خود بنوں میں ایک سنگر کو مٹانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس سنگر کے خاتمے پر مقامی ملک شادی خاں دانتوں میں تنکہ دبا کر حاضر ہوا۔ بنوں سے ارادہ کابل واپسی کا تھا لیکن بنوں میں معلوم ہوا کہ دشت پاس ہی ہے۔ اس کے راستے بھی صاف ہیں اس لئے پہلے وہاں جانے کا فیصلہ ہوا۔ اگلا پڑاؤ عیسیٰ خیل کے گاؤں پر تھا جو دریائے کرم کے کنارے ہے۔ یہاں عیسیٰ خیل نے شب خوں مارا۔ کیونکہ لشکر میں چوکیداری کا مستقل نظام تھا اس لئے کچھ زیادہ نقصان نہ ہو سکا۔ بابر کے مطابق لشکر کے چھ حصے تھے اور ہر حصہ کا اپنا چوکیداری نظام تھا۔ جو چوکیدار تھوڑی بھی غفلت برتتا اس کی ناک میں شگاف لگایا جاتا اور اس کو لشکر میں گھمایا جاتا تھا تا کہ شرمندہ اور اپنی غفلت پر نادم ہو۔

بابر جب دشت میں اترا تو وہاں ایک مسئلہ پانی کی کمیابی تھا۔ لشکریوں کو اپنے اور جانوروں کے لئے پانی کا انتظام خود کرنا پڑتا تھا۔ بابر کہتا ہے کہ دشت میں اس کا طریقہ یہ تھا کہ خشک دریا کی زمین کو اگر ایک ڈیڑھ گز کھودا جائے تو پانی نکل آتا تھا۔ بابر کے مطابق اللہ تعالیٰ نے یہ کتنا اچھا انتظام کیا تھا ورنہ خشک سالی اور پیاس سے بہت تکلیف ہوتی۔ دشت میں مختلف چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں سوار روانہ کئے گئے جو مویشی گھوڑے اور کپڑا لے کر واپس آئے

عید

یہاں پر ابھی یہ فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ کس راستے سے واپس کابل جایا جائے کہ صبح روانگی کے لئے نقارہ بجا دیا گیا۔ اور گڑبڑ میں لشکر روانہ ہو گیا۔ یہ عید کا دن تھا۔ نماز عید دریائے گومل کے کنارے ادا کی گئی۔ اس سال عید اور نوروز پاس پاس ہی آئے تھے اس پر بابر نے مندرجہ ذیل قطعہ وقت کی مناسبت سے کہا:

ہلال ویار ہوں ساتھ، اس سے بہتر عید نہیں
میں غم زدہ ہوں کہ ماہ رخ کی شنید نہیں
خوش قسمتی پر ناز کر جب وہ مکھڑا سامنے ہو
سکیڑوں ہوں پر اس سے بہتر دید نہیں [۱۷]

دشت میں کوہ سلیمان کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے بابر تین دن کے بعد ایک گاؤں میں پہنچا جو ملتان کے تابع تھا۔ قل بایزید نے یہاں بہادری سے بہت سے مقامی لوگوں کا پیچھا کیا۔ اکیلے دریائے سندھ میں چھلانگ لگا دی اور ان سب کو دریا پار کرنے پر مجبور کر دیا۔ بابر نے اس کی یہ بہادری دیکھ کر اس کا رتبہ بڑھا دیا۔ قل بایزید باورچی خانے کا ملازم تھا لیکن اب وہ نمک چش ہو گیا یعنی دستر خوان شاہی پر کھانا چکھنے والا۔ لشکر بابری میں اسی طرح زیادہ تر سوار سپاہی ہونے کے علاوہ دوسرے کام بھی کرتے تھے۔

سخی سرور

یہاں سے بابر واپسی کے لئے مغرب کی طرف مڑ جاتا ہے۔ اور پہلی منزل پیر کانو کا مزار ہے۔ یہ مزار سخی سرور پر ہے جو ڈیرہ غازی خاں سے تیس کلومیٹر پر واقع ہے۔ پیر کانو کا سال وفات ۱۱۷۴ء یا ۱۱۸۱ء ہے۔ آپ کا مزار آج بھی مرجع خاص و عام ہے اور کئی سالانہ میلے آپ سے متعلق ہیں [۱۸]

بابر کا باقی سفر واپسی دکی سے آب ایستادہ کی طرف تھا۔ دکی اس زمانے میں قندھار کے تابع تھا آب ایستادہ غزنی کے تحت۔ سخی سرور تا دکی کا سفر کافی تکلیف دہ اور پریشان کن تھا۔ گھوڑوں کے لئے چارہ نہیں ملتا تھا۔ بے تحاشہ گھوڑے راستے میں چھوڑنے پڑے۔ ایک رات اتنی بارش ہوئی کہ پوری رات بابر نے توشک پر بیٹھ کر گزاری۔ تین چار دن کے سفر کے بعد آب ایستادہ پہنچے۔

۱۷۔ ورق ۱۳۹

۱۸۔ حامد، حامد خاں، حضرت سخی سرور۔ محکمہ اوقاف، پنجاب ۲۰۰۱ ص ۱۱۔۱۳۔

پرھالہ میں مالٹے کا باغ

بہلول پور

پاکستانی علاقوں میں بابر کی آخری آمد ہندستان فتح کرنے کے لئے ۱۵۲۵ء کے آخری حصہ میں ہوئی۔ بابر درہ خیبر سے بگرام دریائے سندھ و دریائے ہرو کو پار کر کے جہلم تک پہنچا۔ اس کے آگے کے علاقے میں بابر کا یہ پہلا سفر تھا۔ دریائے جہلم کو شہر جہلم کے نیچے سے عبور کیا اور چناب کے کنارے قیام کیا۔ یہاں اس وقت ایک مشہور شہر بہلول پور آباد تھا۔ بہلول پور مال خالصہ تھا یعنی خاص بابر کی خود کی ملکیت تھا اس لئے بابر اس کا معائنہ کرنے پہنچا۔ یہاں اس وقت ایک قلعہ ہوا کرتا تھا جو کھائیوں کے درمیان تھا۔ بابر کو یہ اس قدر پسند آیا کہ اس نے یہ ادارہ کیا کہ سیالکوٹ کی آبادی کو یہاں لا کر بسایا جائے۔ جب ہم اس کی تلاش میں گجرات و جلال پور سے ہوتے ہوئے بھگوال پہنچے وہاں سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر چناب کے سیدھے کنارے پر بہلول پور گاؤں ہے لیکن یہاں کسی قلعے کے کوئی آثار نہیں۔ دریا کے اس کنارے پر کھائیاں بھی ہیں۔ وہاں معلوم ہوا قلعے کا ناندہ سے راستہ ہے جب دہاں پہنچے تو وہ قلعہ سورن سنگھ نامی گاؤں ہے جہاں ہوسکتا ہے کسی زمانے میں قلعہ رہا ہو۔ اب تو یہاں چودھری شجاعت کے صاحب زادے کی کوٹھی بن رہی ہے۔

بہلول پور پر دریائے چناب کو عبور کر کے بابر سیالکوٹ پہنچا۔ ۱۴ ربیع الاول ۹۳۲ (۲۹ دسمبر ۱۵۲۵) کو بابر کا پڑاؤ سیالکوٹ میں تھا۔ یہاں سے جنوب مغرب میں ایک قصبہ سید پور (حال امین آباد) ہے۔ وہاں جو لوگ گرفتار ہوئے ان میں سکھ مذہب کے بانی بابا گرونانک بھی تھے۔ گرونانک نے اپنی نظم بابر وانی میں اس حملے کا ذِکر کیا ہے۔ سکھوں کی مذہبی کتاب گرو گرنتھ، جنم ساکھی میں ذکر ہے کہ بابا گرونانک کی رہائی بابر کی مداخلت سے ہوئی[19]۔ بابر اس سلسلے میں کوئی ذکر نہیں کرتا۔ وہ خود سید آباد نہیں گیا[20]۔ بابر کا اس سے اگلا پڑاؤ پسرور اور پھر کلا فور تھا کہ یہ سب اب پانی پت کی تیاری کے لئے تھا۔

۱۹۔ خوش ونت سنگھ ص ۳۳ نوٹ ۲۱

۲۰۔ بخشیش سنگھ نجار (ص ۷۸) یہاں بابر کے سید آباد جانے کا ذکر کرتا ہے۔ اس علاقے میں بابر کا سفر ۱۵۲۵ میں تھا۔ وقائع میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔

بابر کی تلاش میں........

۴۔ہنڈستان

''میں نے ولایت کابل ۹۱۰ھ (۱۵۰۴/۵ء) میں حاصل کی تھی۔ اس زمانے سے میری یہ آرزو چلی آرہی تھی کہ ہنڈستان فتح کروں۔ کبھی امرا کی سست روی اور کبھی بھائیوں کی ناچاقی کی وجہ سے ہنڈستان پر یورش کا موقعہ نہیں مل سکا تھا، اوران ممالک کی تسخیر نہ ہوسکی بالا آخر اس قسم کی رکاوٹیں دور ہوئیں اور ادنی سے امرا تک کوئی شخص ایسا نہ رہا جو اس مقصد کے خلاف ایک لفظ بھی کہہ سکتا۔'' ''اس سال (۹۱۰/۱۵۰۴۔۵) سے اب (۹۳۲/۱۵۲۵۔۶) تک میں سنجیدگی سے ہنڈستان میں دلچسپی لیتا رہا، سات آٹھ سال میں اس پر پانچ مرتبہ یورش کی۔''[۱]

بابر کے مندرجہ بالا تحریر سے یہ واضح ہے کہ ہنڈستان پر حملہ سوچ بچار وغور فکر کے بعد کیا گیا تھا۔ بابر ہندستان پر اپنا حملہ جائز سمجھتا تھا کہ اس کے سگڑ دادا (پردادا کے دادا) امیر تیمور ہندستان کو فتح کر چکے تھے۔ بابر کئی جگہ کہتا ہے کہ یہ ترکوں کی وراثت ہے۔[۲]

امیر تیمور کی کتاب ''ظفر نامہ'' بابر کے ساتھ تھی۔ بابر کا ہنڈستان پر آخری حملہ ۹۳۲/۱۵۲۵۔۶ء میں ہوا۔ وہ خیبر پاس سے نیلاب (دریائے سندھ) آیا۔ یہ دریا پار کرنے سے پہلے اس نے لشکریوں کو شمار کرنے کا حکم دیا۔ بخشیوں نے ان کی تعداد گن کر بارہ ہزار بتائی۔[۳]

راستہ

سندھ پار کرنے کے بعد فیصلہ کرنا تھا کہ ہندستان کس راستے سے جایا جائے۔ معمول کا راستہ لاہور تا دہلی میدانوں سے ہوکر گزرتا ہے ان میدانوں میں اس سال بارش نہیں ہوئی تھی، اس لئے لشکر کے لئے پانی اور اناج کی کمی ہوسکتی تھی۔

بابر نے پرحالہ (نزد راول پنڈی) کلر کہار (کلدہ کہار) سیالکوٹ اور کلانور (نزد گرداسپور) کا راستہ پسند کیا۔ اس کے علاوہ یہ خبر بھی آئی کہ دولت خاں نے بیس تیس ہزار لشکر کلانور میں جمع کرلیا ہے اور لاہور لینا چاہتا ہے۔ ظاہراً یہ خبر بھی اس فیصلے پر اثر انداز ہوئی ہوگی۔ دولت خاں لاہور کا مختار تھا لیکن بابر کے لاہور فتح کرنے (۹۳۰/۱۵۲۴) کے بعد اس کو معزول کردیا گیا تھا۔

بابر نے تیزی سے دریائے جہلم کو شہر جہلم کے جنوب سے پار کیا۔ چناب کو بہلول پور کے پاس سے پار کرکے دریائے بیاس کے پار دولت خاں پر حملہ کردیا۔ جو اس وقت قلعہ ملوٹ میں تھا۔ دولت خاں زیادہ مقابلہ نہ کرسکا۔ اس کا بیٹا غازی خاں پہاڑوں کی طرف سدھارا اور دولت خاں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

یہاں غازی خاں کا کتب خانہ تھا جو بابر کے لئے دلچسپی کا باعث تھا۔ اس کا خیال تھا کہ عمدہ کتب دستیاب ہوں گی۔ لیکن چند ایک کتب کے علاوہ کوئی اچھی کتب دستیاب نہ ہوسکیں۔ یہ کتب ہمایوں اور کامران کو روانہ کردی گئیں۔

یہاں سے آگے ہندستان کے وسیع میدان تھے جو بنگال تک پہنچتے ہیں۔ راستے کی رکاوٹوں میں سب سے بڑی رکاوٹ سلطان ابراہیم لودھی کی تھی جو والی ہنڈستان تھا۔ وہ اس وقت آگرہ میں تھا۔ ابنالہ کے جنوب میں سرساوہ کے مقام پر مشورے کے بعد کارزار کے لئے پانی پت کو مناسب سمجھا گیا۔

۱۔ وقائع ورق ۲۴۴

۲۔ ا۔ وقائع ورق ۲۰۰

۳۔ ا۔ وقائع ورق ۲۲۹

پانی پت

یہ ایک وسیع میدان ہے جہاں جمنا سے وافر مقدار میں پانی دستیاب ہوسکتا تھا۔ اس وقت یہاں حویلیاں اور مکانات تھے جو لشکر کی حفاظت کا کام دے سکتے تھے۔ بابر نے حکم دیا کے دوسری طرف خندقیں کھودی جائیں اور درختوں کے بڑے بڑے تنے ڈالے جائیں تا کہ لشکر کی دوسری طرف سے بھی حفاظت رہے۔ بابر نے لشکر کو جوانغار، برانغار اور غول میں تقسیم کیا۔ قراول دستے کو آگے رکھا اور محفوظ دستے کو پیچھے جانے کا حکم دیا۔

لشکر کے سامنے آرابہ یعنی توپ ڈھونے والی گاڑیوں چمڑے کی رسیوں سے باندھ دی گئی تھیں۔ گاڑیوں کے بیچ میں اتنی جگہ چھوڑ دی گئی تھی کہ چھ تفنگ چی کھڑے ہوسکیں۔ لشکریوں کے پروں کے درمیان تیر کی پرواز کی دوری تک کی جگہ چھوڑ دی گئی تھی کہ آمدورفت و مدد کے لئے گزرا جا سکے۔

ابراہیم لودھی کی فوج نظر آئی۔ وہ بے تحاشہ دوڑے چلے آرہے تھے۔ جب انہوں نے بابر کے منظم و منقسم لشکر کو دیکھا تو حیران رہ گئے۔ بابری لشکر ان کو ٹھوس دیوار کی طرح نظر آئے، ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کدھر حملہ کریں۔ کیونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اس لئے آگے بڑھتے چلے آئے اور ان کا رخ برانغار کی طرف رہا۔ بابر نے محفوظ دستے کو برانغار کی مدد کا اشارہ کیا۔ بابری لشکر نے دونوں طرف سے بڑھ کر ابراہیم کے لشکر کو بیچ میں لے لیا اور تیروں کی بارش کردی۔ جنگ کا عمدہ اور مہلک ہتھیار بابر کے مطابق تیراندازی ہی تھا جس سے بابر کو فتح حاصل ہوئی۔ ابراہیم خود بھی جنگ میں مارا گیا۔ یہ ایک نایاب واقعہ ہے کیونکہ سردار عام طور پر پہلے ہی نکل لیتے ہیں۔ ابراہیم کا دفاع انتہائی جانبازی پر مشتمل تھا۔

کالا آم

پانی پت اب ایک بڑا شہر ہے۔ کھلے میدان چاروں طرف موجود ہیں۔ شہر میں کاروبار زوروں پر جاری تھا۔ یہاں پر جنگوں کی یادگار قائم کردی گئی ہے۔ یہاں تین جنگیں ہوچکی ہیں بابر اور ابراہیم لودھی (۱۵۲۵ء)، بیرم خاں اور ہیمو (۱۵۵۶ء) اور ابدالی و مرہٹے (۱۷۶۱ء)۔ ان یادگاروں کو آج کالا آم کہا جاتا ہے کیونکہ آخری جنگ ایک آم کے درخت کے پاس ہوئی تھی جو خون سے کالا ہوگیا تھا۔ یہ یادگار شہر سے پانچ کلومیٹر ہے۔ اس کے اطراف پتھر کا ایک نیچہ سا احاطہ کھینچ دیا گیا ہے۔ ایک طرف دیوار میں دو کتبے پہلی اور دوسری جنگ کی یاد میں اور ایک ستون پر کتبہ تیسری جنگ کی یاد میں موجود ہے۔ ایک چھوٹا سا میوزیم بھی یہاں پر ہے۔ ابراہیم لودھی کا مزار پانی پت شہر میں ہے۔ یہ لال اینٹ کے ایک دو تہی چبوترے پر ہے۔ یہاں صرف ایک ہی قبر ہے جو چبوترے کے وسیط سے داہنی طرف ہے۔ قبر پختہ ہے۔ اوپر کوئی سایہ یا چھت نہیں۔ ایک معمولی کتبہ دیوار میں نسب ہے جو اردو میں ہے۔ چبوترے کے اطراف مٹی اور ریت کے ڈھیر جمع ہیں۔ معلوم ہوتا ہے عرصہ سے صفائی نہیں کی گئی ایک قریب رہنے والے نے بتایا کے کبھی کبھی کوئی مسافر فاتحہ پڑھنے کے لئے آجاتا ہے۔ شہر میں مسلمان نظر نہیں آتے پنجابی سکھ ہر طرف نمایاں ہیں۔

کابلی باغ مسجد

وقائع میں اس مسجد کا ذکر نہیں ہے لیکن بابری لشکریوں نے پانی پت میں ایک مسجد تعمیر کی تھی۔ لشکر اور بازار لشکر قریب ہی کہیں رکا ہوگا۔ ہندستانیوں کے لئے یہ غیر ملکی ظاہر ہے سب کابل سے آئے تھے اسی لئے یہ کابلی باغ کہلایا۔ باغ یہاں اب موجود نہیں، میدان ہے اور ایک طرف مسجد۔ مسجد کا بایاں دالان شہید ہوگیا ہے۔ مسجد کی عمارت، محرابیں، گنبد سب پر پٹھان طرز تعمیر نمایاں ہے۔ لال پتھر کا استعمال نہیں جو بابری عمارتوں

ابراہیم لودھی کی قبر، پانی پت

پانی پت میں بابر اور ابراہیم لودھی کی جنگ کی یادگار

حضرت غوث گوالیاری کا مزار۔ گوالیار

وکرم جیت کا محل۔ گوالیار

وکرم جیت محل گوالیار میں پتھر کو کاٹ کر نقش و نگار بنائے گئے ہیں
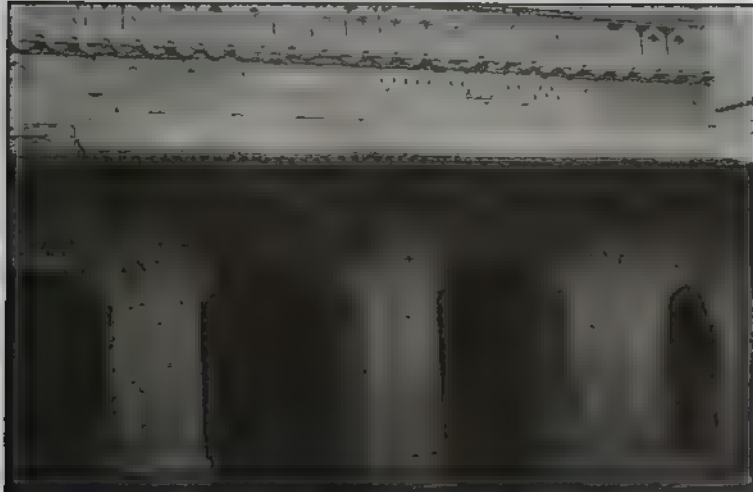
ارواہ وادی میں جینی بتوں کے مجسمے، گوالیار

میں عام استعمال ہوا ہے۔ پروفیسر رام ناتھ نے اس کی تفصیل بیان کی ہے[۴]۔ گنبد پر مرمت کا کام جاری تھا۔ کچھ دوائیں لگا کر جھڑتے ہوئے مسالے کو گرنے سے روکا جارہا تھا۔ نماز اس مسجد میں نہیں ہوتی۔

پانی پت سے بابر اسی کلومیٹر سفر کر کے دہلی میں جمنا کے کنارے رکا۔ اس کا قیام یہاں دو دن رہا۔ وہ درگاہ نظام الدین و درگاہ قطب صاحب گیا۔ حوض شمسی اور حوض خاص کو ملاحظہ کیا۔ بلبن، خلجی اور سکندر لودھی کے مزارات دیکھے لیکن کسی کو تفصیل سے بیان نہیں کیا۔ جمعہ کے دن اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ وہ ہمایوں کو پہلے ہی آگرہ روانہ کر چکا تھا۔ اس کو حیرت تھی کہ ہندستان کتنا بڑا ملک ہے۔ قرب و جوار کے علاقے ابھی تک اس کے پورے قابو میں نہیں تھے۔

شاعرانہ تنبیہ

بیانہ آگرہ کے جنوب مغرب میں ایک مضبوط قلعہ تھا۔ وہاں کے امیر نظام خاں نے ابھی تک بابر کی اطاعت نہیں کی تھی۔ امیر کے مطالبات کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تھے۔ کچھ سفیر آئے اور گئے جب بات نہ بنی تو بابر نے ایک تنبیہ رباعی کے ذریعہ بھیجی[۵]۔

نہ جھگڑ ترک سے اے میر بیانہ — چالاکی و مردانگی ترک ہے عیاں
تو گر نہ آیا اور نصیحت نہ سنی — جو ہوگا اس کی نہیں ضرورت بیاں

لشکر میں نااتفاقی

اپنے سے پہلے حملہ آوروں کی طرح بابر کو بھی اپنے لشکر میں نااتفاقی سے دوچار ہونا پڑا۔ منطقہ حارہ کی گرمی کو برداشت کرنا ہر کسی کے لئے ممکن نہ تھا۔ زمانہ بھی گرمی کا تھا۔ الیگزینڈر مقدونی اور امیر تیمور دونوں کو یہاں سے واپس ہونا پڑا تھا۔ لیکن بابر نے اپنے آپ کو ان سے بہتر ثابت کیا۔ اس نے ان کے سامنے تقریر کی، اور ان کو ہمت دلائی۔ ایک امیر خواجہ کلاں نے اپنی بیزاری کا اظہار ایک شعر میں کیا تھا:

اگر (دریائے) سندھ سے بخیریت گزر جاؤں؟
میرا منہ کالا جو میں ہندستان کی آرزو کروں

اس کو جواب میں بابر نے لکھا:

ہزار شکر ادا کر بابر کے غفور رحیم نے تجھے سندھ، ہند اور بہت سے دوسرے ملک عطا کیے۔ اگر تجھے گرمی کی برداشت نہ تھی اور یہ کہتا تھا کہ تجھے سردی کا چہرہ دیکھنا ہے تو تیرے لئے غزنی موجود ہے[۶]۔

بابر کی ظرافت

پانی پت کی جنگ کے بعد بابر نے مال غنیمت کو اپنی اولاد، بیویوں، امیروں، لشکریوں اور اپنی رعایا میں تقسیم کیا۔ کابل اور وارسک میں ہر فرد کو ایک شاہ رخی بھیجی گئی۔ اس کے علاوہ تحائف سمرقند، خراساں، مکہ اور مدینہ بھی بھیجے گئے۔ اس نے اس قدر مال تقسیم کیا کہ لوگ اس کو بابر قلندر کے نام سے پکارنے لگے۔ اس سلسلے میں بابر کی فراغ دلی اور ظرافت کی ایک مثال اس نے اپنے ایک پرانے ملازم عسس کے ساتھ کی۔ بابر نے خود اس سلسلے میں کچھ نہیں لکھا۔ گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ میں اس کو تحریر کیا ہے[۷]۔ بابر نے خواجہ کلاں کے ہاتھ عسس کو ایک اشرفی بھجوائی۔ جب عسس کو اس کا علم ہوا تو وہ تین دن تک بہت بیزار رہا۔ ادنیٰ تحفے پر اس کو افسوس تھا۔ کابل کے تحائف کی تقسیم کے وقت بموجب حکم عسس کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر لایا گیا اور اشرفی اس کے گلے میں لٹکا دی گئی جس سے اس کی گردن جھک گئی۔ اس اشرفی کا وزن پندرہ سیر تھا۔ اب آپ اس واقعہ کا مقابلہ ملکہ

۵۔ وقائع ورق ۲۷۳
۶۔ وقائع ورق ۲۷۳
۷۔ گلبدن بیگم۔ ہمایوں نامہ۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷۴ء، ورق ۱۰ب
۸۔ ڈیوڈ، سول۔ وکٹوریاز وارس، واکنگ لندن ۲۰۰۶، ص ۳۷

شاہانہ قیصر ہند وکٹوریہ کے اس واقعہ سے کریں۔ ملکہ بھی ایک ملازمہ سے بہت خوش ہوئیں تو اس کو انعام میں پچاس پونڈ عطا کیے[۸]۔

ابھی اقتدار کے خواہاں چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے ان میں سے دو فوری توجہ کے مستحق تھے۔ رانا سانگا آگرہ کے جنوب مغرب میں اور ابراہیم لودھی کے باغی افغان امیر مشرق میں موجود تھے۔ افغان امیروں نے بغاوت ابراہیم لودھی کے زمانے میں ہی کر دی تھی لیکن یہ امیر ابھی کافی دور بہار و بنگال میں تھے لیکن رانا سانگا قریب آ پہنچا تھا اور اس سے خطرہ فوری تھا۔

۹۔ رام ناتھ، بابرس جل محل ایٹ فتح پور سیکری، اسٹڈیز ان اسلام، نئی دہلی ۱۹۸۰:۱۵۳......۱۶۰

۱۰۔ گلبدن بیگم، ہمایوں نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۴

رانا سانگاہ

رانا ۹۳۳/۷۔ ۱۵۲۶ میں چتوڑ سے پیش قدمی کر کے اور خشک میدانوں کو تیزی کر کے عبور کر کے آگرہ کے پاس بیانہ میں پڑاؤ کیا ہوا تھا۔ بابر بھی آگرہ سے سیکری پہنچ گیا اور وہاں ایک جھیل کے کنارے خانواہ پر سیکری کے مغرب میں خیمہ زن ہو گیا۔ بابر کے لشکری اس بات پر حیران تھے جس تیز رفتاری سے رانا یہاں تھا۔ وہ اس بات سے بھی خوف زدہ تھے کہ محمد شریف منجم نے نتائج اچھے نکلنے کی پیشین گوئی نہیں کی تھی۔ یہ پہلی دفعہ تھی کے بابر کے مقابل ایک ہندو طاقت تھی چنانچہ اس نے بھی مسلم جہادی کردار اپنایا۔ اس نے پینے پلانے سے توبہ کر لی، مسلمانوں پر ٹیکس معاف کرنے کا وعدہ کیا اور ایک چاہ بنانے کا اعلان کیا تا کہ صدقہ جاریہ ہو۔ اس چاہ کے نزدیک وہ شراب کے کوپے بہا دیئے گئے جو اونٹوں کی تین قطاروں پر لدے ہوئے تھے۔ یہ بابا دوست کابل سے لے کر آیا تھا۔ سب ظروف اور پینے پلانے والے برتن پاش پاش کر دیئے گئے۔

جنگ خانوہ

جنگ کی رات بابر نے لشکریوں سے خطاب کیا۔ اس کی ہمت بڑھائی، ان کو آخری دم تک لڑنے کی تلقین کی، یہ باور کرایا موت و زندگی صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔

لشکر کی ترتیب پانی پت کی طرز پر تھی، لیکن یہ تفصیلات بابر نے شیخ زین کو لکھنے کے لئے دیں، شیخ زین فارسی عالم تھے۔ شیخ زین فارسی مروجہ انشا کے مطابق لفاظی کو انتہا تک پہنچا کر انتہائی مقفی و مسجع فارسی تحریر کی۔ حقیقتیں الفاظ میں گم ہو جاتی ہیں۔ اس تحریر سے انداز ہوتا ہے کہ رانا کا زور بابر کے برانغار پر تھا۔ بابر نے برانغار کی مدد کے لئے محافظ دستے کو روانہ کیا اور رانا کے لشکر کو چاروں طرف سے گھیر کر رانا کے قلب کی طرف اپنا رخ کیا۔ اس وجہ سے رانا کے لشکر میں افراتفری مچ گئی۔ وہ یہ حملہ برداشت نہ کر سکے۔ رانا کے آدمی پیچھے ہٹنے لگے اور رانا خود زخمی ہو کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

باغ فتح

خانواہ سے واپسی پر بابر نے ایک باغ ترتیب دینے کا حکم دیا۔ یہ سیکری میں ترتیب دیا گیا۔ اس باغ کے کچھ حصے آج بھی موجود ہیں۔ یہ بابر کی تین منزلہ باؤلی کے پاس ہے۔ اس میں پانی رہٹ سے کھینچا جاتا تھا۔ یہ باؤلی اب بھی سیکری میں پشتے کے پیچھے موجود ہے۔ اس کا راستہ نگر گاؤں سے ہے، جہاں سے گزر کر موتی جھیل آتی ہے۔ باغ کی اصل جگہ متعین نہیں شاید اجمیری گیٹ کے آس پاس تھا۔ اس باغ کی ایک بارہ دری لال پتھر کی بنی ہوئی باقی ہے۔ وہاں ایک جھیل بھی ہے جو بابر کے وقت میں زیادہ بڑی ہو گی۔ اس جھیل کے درمیان ایک جل محل بھی تعمیر کیا گیا تھا جس کا کچھ حصہ باقی ہے۔ اس میں ایک گول دالان باہر کی طرف اور ایک ہشت پہلو چھتری اس کے اندر ہے۔ پوری عمارت مقامی لال پتھر کی بنی ہوئی ہے۔ دونوں عمارتوں کے درمیان اس وقت

پانی ہوگا اور چھتری تک پہنچنے کے لئے کشتی استعمال کی جاتی ہوگی۔ اب بھی یہ سیر و تفریح کی بری جگہ نہیں لیکن آج کل عام ٹورسٹ اس طرف کم ہی آتے ہیں۔ رام ناتھ نے اس کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں [9]۔ گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ میں لکھا ہے کہ بابر یہاں بیٹھ کر اپنی کتاب لکھا کرتا تھا [10]

خانوہ سے فارغ ہو کر بابر کو کچھ فرصت کے لمحات ملے۔ وہ آگرہ میں قیام پذیر رہا لیکن اس دوران بھی اس کے لئے نچلا بیٹھنا ناممکن تھا۔ ہندستان میں کئی دفعہ اس کو بیماریوں نے آگھیرا۔

اس کو ہندستان میں بہتے پانی کی بہت کمی محسوس ہوتی تھی۔ ترکستان وافغانستان میں ہر جگہ چھوٹے چھوٹے ندی نالے مل جاتے ہیں لیکن ہندستان میں بڑے دریا کے علاوہ رواں پانی نہیں ملتا۔ ہندستان کے تصور کو بہتر کرنے کے لئے اس نے یہاں باغوں کی طرح ڈالی۔ اس کو باغوں کا جنون تھا۔ باغوں میں ہی اس کی زیادہ زندگی گزری۔

بابری باغات

آگرہ واطراف میں بابر نے کئی باغات لگائے۔ ان میں سے باغ ہشت بہشت، زر (نور) افشاں، نیلوفر، گل افشاں معلوم ہیں۔ آخری باغ کا نام اب رام باغ ہے۔ جہانگیر نے اس کا نام گل افشاں سے بدل کر آرام باغ کردیا تھا۔ لیکن حال کے ہندوتوا اثرات کے زیراثر اس میں سے الف ہٹ گیا اور یہ رام باغ مشہور ہے۔ یہ آگرہ واٹرورکس کے سامنے اور آگرہ بائی پاس کے جنوب میں ہے۔ اصل طرح اندازی کا کچھ اندازہ ہوتا ہے اس کی تفصیل رام ناتھ نے لکھی ہے [11]۔ وقت کے ساتھ ساتھ دیکھ بھال کی گئی ہے، یہاں پر مرمت کا کام جاری ہے۔ اس کی طرز چار باغ کی ہے۔ باغ کے مربع تختوں کے درمیان راہداریاں ہیں۔ رواں پانی ایک ٹنکی سے آتا ہے۔ جس میں پانی دورہٹ کے ذریعہ جمنا سے اوپر کھینچا جاتا تھا۔ پانی تین جھرنوں سے باغ کے تین طبقوں میں جاتا ہے۔

ہشت بہشت باغ کا کچھ حصہ اب مہتاب باغ کے نام سے باقی ہے۔ یہ شاہجہاں نے ترتیب دیا تھا۔ یہ تاج محل کے پیچھے جمنا کے دوسرے کنارے پر ہے۔

بابر کا ایک اور باغ ہم نے دھولپور میں ڈاکٹر رام ناتھ کے ساتھ دیکھا۔ دھولپور آگرہ سے ۶۸ کلومیٹر پر ہے۔ یہ گوالیار جانے والے روڈ پر ہے۔ اصل روڈ سے اندر گورگاؤں کی طرف جانا پڑتا ہے۔ یہاں ہشت پہلو حوض باقی ہے جو پتھر کے اندر کاٹ کر بنایا گیا۔

سال ۹۳۴/۸-۱۸۲۷ چندیری کو فتح کرنے میں گزرا۔ چندیری کے باسی جی دار طریقے سے لڑے۔ بابر نے یہاں پہلی دفعہ جوہر دیکھا جو راجپوت طریقہ جنگ ہے جس میں اپنے بیوی بچوں کو ختم کر کے اپنے جان کی بازی لگادی جاتی ہے۔

بابر ابھی چندیری میں ہی تھا کہ اس نے ایک لشکر مشرقی ہند ابراہیم لودھی کے باغی امرا سے نبٹنے کے لئے روانہ کیا۔ وہاں سے خبر ملی کے امیروں نے قنوج کو خیرآباد کیا اور پسپا ہو رہے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی بابر نے مشرق کا رخ کیا۔

ایودھیا کی مسجد

مشرق جاتے ہوئے بابر لکھنو سے گزر کر گھاگرا اور سرد دریاؤں کے سنگم پر اودھ سے دس کلومیٹر پہلے خیمہ زن ہوا۔ اودھ (ایودھیا) کی مسجد ہندستان میں متنازعہ ہے جس پر انگریزوں کے زمانے سے اور ان کی شہہ پر ہنگامے ہوتے رہے ہیں۔ بابر اودھ نہیں گیا۔ وہ اس سے پہلے کچھ دن رکا تا کہ کچھ مقامی انتظامات باغی امرا

۱۱۔ رام ناتھ باغ گلفشان اوف بابر ایٹ آگرہ، اٹھ وایانیکا، کلکتہ ۱۹۷۰:۱:۳۳...۸۰

کے سلسلے میں کئے جاسکیں۔ اس جگہ خبر آئی کے یہاں سے کچھ اوپر اچھی شکارگاہ ہے چنانچہ وہ شمال مغرب شکار کے لئے روانہ ہوگیا۔ اگر اودھ جاتا اور مسجد کے سلسلے میں کچھ احکام دینا ہوتا تو وہ دریاؤں کے سنگم پر ہی دیا جاتا۔ اس کا کوئی ذکر وقائع میں نہیں ہے۔

تعمیری طرز کے لحاظ سے مسجد بابری نہیں ہے۔ اس میں پٹھان طرز تعمیر کی جھلک ہے۔ وہ بابر کے ایک امیر باقی تاشقندی نے تعمیر کے بعد بابر کے نام کی تھی۔ اسی طرح کئی مساجد ہندستان میں موجود ہیں جیسے سنبھل، پانی پت، روہتک، پالم، ماہم، سونی پت اور پیل خانہ۔ یہ سب بابری دور میں تعمیر کی گئی ہیں۔ ان سے بابر کا تعلق نام سے ہے۔ اس سلسلے میں دیکھیں ڈاکٹر ناتھ کی کتاب [۱۲]۔

ہمارا سفر ایودھیا مایوس کن تھا۔ ہم فیض آباد رکے جو ایودھیا کا جڑواں شہر ہے۔ ہم نے ایودھیا جانے کا ذکر کیا۔ یہاں ایک پھٹپھٹی ہمیں وہاں لے جانے کے لئے ملی اس کے ڈرائیور نے ہمیں کیمرہ لے جانے سے منع کردیا۔ مسجد کے آس پاس بھی جانا منع ہے۔ پولیس مسجد سے میلوں پہلے سیاحوں کو روک دیتی ہے۔ شہر انتہا پسندوں سے بھرا ہوا ہے۔ شہر پسماندہ ہے۔ شہر میں کوئی فوٹو گرافر کی دکان بھی نہیں۔ شہر میں بے شمار اور منادر ہیں جہاں یاتری آئے ہوئے تھے۔ گھ گر دریا کا علاقہ سرسبز وشاداب ہے۔ یہاں کئی گھاٹ ہیں جہاں اشنان کیا جاسکتا ہے۔ یہ گھاگر کی ایک نہر پر بنے ہوئے ہیں۔ ان کا محل وقوع عمدہ ہے۔ شہر میں انتہا پسند آنے جانے والوں پر نظر رکھتے ہیں۔ ہم کو دو جگہ روکا گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو پولیس یا سرکاری کارندے نظر نہیں آتے تھے۔

گوالیار

بابر کو کچھ فرصت کے لحات ۹۳۵/۹۔۱۵۲۸ میں میسر آئے۔ اس نے ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گوالیار کی سیر میں گزارے۔ بابر کے امیر رحیم داد نے گوالیار فتح کیا تھا۔ بابر کو یہ مشہور قلعہ دیکھنے کا شوق تھا۔ اس نے گوالیار کے متعلق عمدہ تاثرات وقائع میں درج کئے ہیں۔ گوالیار اب بھی سیاحوں کے لئے پرکشش ہے۔ قلعہ شہر کے بیچ میں ہے اور ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ چاروں طرف سے اس کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ قلعہ کافی علاقے میں پھیلا ہوا ہے۔ قلعہ کی فصیل چاروں طرف قائم ہے۔ قلعہ کے اندر کافی بنجر اور پہاڑی میدان ہے زیادہ تر عمارات تباہ ہو چکی ہیں۔ بابر کا بیان شمال مشرقی علاقے سے متعلق ہے جہاں مان سنگھ اور وکرماجیت کے محلات ہیں۔ مان سنگھ کے محلات بابر کو پسند آئے یہ چار منزلہ ہیں، پتھر سے تعمیر شدہ ہیں۔ ان میں کچھ حصے تنگ وتاریک ہیں۔ وکرماجیت کی عمارت کو بابر نے زیادہ پسند نہیں کیا۔ اب تو یہ عمارات خستہ ہو کر ڈھے رہی ہیں۔ بابر اروا ہ وادی کی بھی تعریف کرتا ہے۔ یہ مغربی طرف درمیان میں ہے۔ یہاں دیوہیکل جین بت آج بھی موجود ہیں۔ ان بتوں کے ننگے اعضا بھی نمایاں تھے جو بابر کو پسند نہ آئے۔ اس نے ان کو توڑ دینے کا حکم دیا۔ اب یہ سب دوبارہ بنادیئے گئے ہیں۔ اس وادی کے تین طرف مختلف پیمائش کے بت ہیں جس میں سے کچھ دیوہیکل ہیں۔ قلعہ کے اندر اور بھی منادر ہیں۔ سب سے مشہور ساس بہو کا مندر ہے۔ اصل میں یہ دو مندر ہیں۔ ساس کا بڑا اور بہو کا چھوٹا۔ روایتی حریف عبادت بھی ایک جگہ نہیں کرسکے۔ ان مندروں کی طرز تعمیر تراشیدہ پتھر کی اور جنوبی ہندستانی ہے۔

گوالیار شہر میں ایک صوفی درگاہ بھی مشہور ہے۔ بابر غوث گوالیاری کا ذکر کرتا ہے جو سلسلہ شطاری کے بزرگ ہیں۔ انہوں نے رحیم داد امیر بابر کی مدد کی تھی [۱۳] جس کی وجہ سے قلعہ فتح کرنے میں مدد ملی۔ جب رحیم داد بغاوت پر تلا ہوا تھا یہ اس کی طرف سے معافی مانگنے کے لئے بھی آئے تھے [۱۴]۔

۱۲۔ رام ناتھ۔ دی آرکی ٹیکچر اوف دی بابری مسجد اوف ایودھیا، دی سٹوریکل ریسرچ ڈوکیومنٹیشن پروگرام، جے پور ۱۹۹۱

۱۳۔ وقائع ورق ۳۸۰

۱۴۔ وقائع ورق ۳۵۸

۱۵۔ گلبدن بیگم۔ ہمایوں نامہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۴ ورق ۲ب

یہ درگاہ اکبر کے زمانے میں تعمیر ہوئی تھی۔ یہ عمدہ عمارت ہے جہاں چاروں طرف تراشیدہ جالیاں عمارت میں نسب ہیں۔غوث گوالیاری کے مقبرے کے احاطے میں اکبر کے گویے تان سین کی بھی قبر ہے جس پر ایک چھتری بھی ہے۔

یہاں سے قریب ہی بابر نے ایک آبشار جنوب کی طرف بیان کیا ہے۔ہم نے اس جھرنے سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ہمیں بتایا گیا کہ اب یہاں کوئی آبشار موجود نہیں۔لیکن اس جھرنے کو تلاش کرتے ہوئے مغل دور کے ایک عظیم تاریخ داں و مداح خواں اکبر علامی ابوالفضل کا مقبرہ ملا۔ یہ جھانسی روڈ پر گوالیار سے تیس میل جنوب میں ہے۔ یہ حال ہی میں تعمیر کردہ ایک مربع کمرہ ہے۔ چاروں طرف نیچی چار دیواری اور احاطے کے اندر گھانس کا تختہ ہے۔اب یہاں کتبے بھی لگائے گئے ہیں۔ یہ وہ شخصیت تھی کہ جس سے اکبر بھی متاثر تھا۔ان کی تاریخ نویسی کی مدد کے لئے دوسرے تاریخ نویسوں نے کتابیں لکھ کر بنیادی مواد فراہم کیا تھا،ان میں عبدالرحیم خان خاناں اور گلبدن بیگم دونوں ہی شامل ہیں [15]۔

بہار و بنگال

سال ۹۳۵/۹-۱۵۲۸ کا زیادہ زمانہ بابر نے اپنے امیروں کی حوصلہ افزائی کے لئے ان کے پیچھے پیچھے گزارہ جو ابراہیم لودھی کے باغی امرا کو قابو میں کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے یہ امرا بہار اور بنگال میں منتشر تھے۔ بابر اس وقت تک شہنشاہ کے مرتبہ پر پہنچ چکا تھا۔خود قریب ہی رہتے ہوئے اپنے امیروں اور نائب امرا کو ان مہمات پر روانہ کر چکا تھا۔افغان امیر کھل کر جنگ کے بجائے گوریلا جنگ کر رہے تھے۔ وہ مانیر (قرب پٹنہ) تک گیا جہاں مقامی صوفی بزرگ شیخ عیسیٰ مانیری کی زیارت کی۔ جلد ہی بہار بھی قابو میں آ گیا۔اس وقت بنگال نصرت شاہ کے تحت تھا۔نصرت شاہ نے معاہدے پر آمادگی ظاہر کی جو سفرا کی آمدورفت کے بعد طے پا گیا۔ اس معاہدے میں بابر کی بالادستی کو قبول کر لیا گیا۔ یہاں سے بابر واپس آگرہ روانہ ہوا۔

بابر نے اپنی یادداشتیں زیادہ تر ہندستان میں ہی تحریر کیں۔ وہ سفر میں اس کے ساتھ رہتی تھیں۔ آگرہ واپسی کے دوران گھاگر دریا کے پاس ایک آندھی آئی جس کی وجہ سے اس کا خیمہ گر گیا، کاغذات اڑ گئے اور سب چیزیں پانی سے شرابور ہو گئیں۔ بابر نے پوری رات کاغذات کو سکھانے میں بسر کی۔

اسی دوران بابر نے اپنے بیٹوں اور امیروں کو خطوط بھی تحریر کئے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کو املا، زبان، اصول و قواعد صحیح استعمال کرنے کا کس قدر خیال تھا۔ انہی خطوط میں حکومت کرنے کے طریقے اور دوسروں سے تعلقات کی بہتری پر بھی زور ہے۔

اسی دوران اس نے کابل اور آگرہ کے درمیان راستے کی پیائش، ڈاک چوکی بنانے، ان کی دیکھ بھال کرنے کے احکام بھی جاری کئے اور اس کے خرچے کے اصول قائم کئے۔

ماخذ

ابرار احمد بگوی، دیکھیں، تذکرہ

ابراہیم نعمت اللہ، ٹریولس اوف ابن بطوطہ ان سنٹرل ایشیا، اتھاکا پریس، ریڈنگ ۱۹۹۹

ابوالفضل، دیکھیں اکبرنامہ و آئین اکبری

ابوالقاسم زہراوی، التصریف لمن عجز عن التالیف، اردو ترجمہ مطبع نامی، لکھنو ۱۹۰۸

اٹلس اوف دی یونیورس، فلپس، پیٹرک مور، چانسلر پریس، لندن ۱۹۹۷

آثار الصنادید۔ سید احمد خاں، معین الحق، پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۶۶

اجمل، محمد، حاذق، مدینہ پبلشنگ، کراچی ۱۹۸۳

احمد ابن عرب شاہ، تمرلین یا تیموردی گریٹ امیر، ترجمہ جے ایچ سینڈر، لوزیک اینڈ کو، لندن ۱۹۳۶

احمد حسن دانی، پشاور، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۲

احوال وسخنان خواجہ عبید اللہ احرار، دیکھیں عارف

نوشاہی

اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۶۸

اردو شت، فیروز اللغات، فیروز الدین، فیروز سنز، لاہور، سال طباعت دیا ہوا نہیں

ارسکن، ولیم، تاریخ بابر۔ اے ہسٹری اوف انڈیا انڈر بابر، اوکسفورڈ، کراچی ۱۹۷۴

ارسکن، ولیم، لیڈن، جون۔ مے موآئرس اوف ظہیر الدین محمد بابر، لونگ مین ریز اورم براؤن اینڈ
گرین لندن ۱۸۲۶

آرنا تھو، ربعت یا پرشین وہیل۔ جنرل اوف دی ایشاٹک سوسائٹی ۱۹۷۰، ۱۲: ۱-۴

انجریتھ پیلو۔ انسائیکلوپیڈیا اوف ہورس، ہیملن، لندن ۱۹۹۸

اسٹنڈرڈ ڈکشنری، اردو انگریزی، بشیر احمد قریشی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۳

اسٹائین گاس، ایف، فرہنگ انگریزی فارسی، نقل مطابق اصل سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۱

اسلامک میڈیسن، دیکھیں فریڈ اولمین

استیب لی وا۔ عروض رسالہ سی، ناوکا نشریاتی، شرق ادبیاتی باش رہ دا کتسیہ سی، موسکو ۱۹۷۲

اصطلاحات پیشہ وراں، ظفر الرحمن، انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۷۵

اقتدار حسین صدیقی، مسلم شرائنز ان انڈیا، کرسچین ٹرول، اوکسفورڈ یونیورسٹی، نئی دہلی ۱۹۸۹

اکبرنامہ، ابوالفضل، ترجمہ بیورج، ایچ، لو پرائس پبلی کیشنز، دہلی ۱۹۸۹

اکمل ایوبی۔ رسالہ والدیہ ترجمہ ظہیر الدین محمد بابر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۶۸

البیرونی، کتاب الہند، انگریزی ترجمہ ایڈورڈ سچاؤ، گورنمنٹ اوف ویسٹ پاکستان، لاہور ۱۹۶۲

الفنسٹن، ماؤنٹ اسٹورٹ، این اکاؤنٹ اوف دی کنگڈم اوف کابل، اوکسفورڈ، کراچی ۱۹۷۴

امپیریل گزیٹیر دیکھیں گزٹ

انسائیکلوپیڈیا اسلام۔ نیو ایڈیشن، ای جے برل۔ لائیڈن ۱۹۷۹

انصار الدین ابراہیموو۔ بابرنامے کے ہندوستانی الفاظ، تاشقند ۲۰۰۲

اولف کیرو، پٹھانس، اوکسفورڈ کراچی ۱۹۵۸

آئی جی مانو۔ بابرنامہ، کیوٹو ۱۹۹۵

آئی جی مونو۔ کلیکٹڈ ورکس اوف بابر (سلطنتی لائبریری) تہران، ٹویو بنکو، ٹوکیو ۱۹۹۹

اے لیٹریری ہسٹری اوف پرشیا۔ براؤن، ای جے، کیمبرج ۱۹۵۱

ایرین، دی کمپینز اوف الگزینڈر، پنگوئین، لندن ۱۹۸۱

ایلیٹ اینڈ ڈاسن، ہسٹری اوف انڈیا۔ اسلامک بک سروس لاہور ۱۹۹۷

ایمبسی ٹو تمرلین، کلاجیو، انگریزی ترجمہ گائی لی اسٹرینج، جارج رٹ لیج اینڈ سن لمیٹڈ ۱۹۲۸

اینٹ بیورج۔ دیکھیں بیورج اینٹ، بابرنامہ

اینی ماری شمل۔ دی ایمپائر اوف دی گریٹ مغلز۔ انگریزی ترجمہ ری ایکشن بکس، لندن ۲۰۰۴

آئین اکبری، ابوالفضل، اردو ترجمہ محمد فدا علی طالب۔ سنگ میل پبلی کیشنز نقل مطابق اصل۔ لاہور،
سال اشاعت دیا ہوا نہیں۔

بابر، ظہیر الدین محمد، اوزان، کلیکٹڈ ورکس (مانو، آئی جی)، ٹوکیو ۱۹۹۹

بابر، ظہیر الدین محمد، بابرنامہ، ترکی مخطوطہ، ایڈنبرا

بابر، ظہیر الدین محمد، بابرنامہ ترکی مخطوطہ، سالار جنگ، حیدرآباد، دکن

بابر، ظہیر الدین محمد، بابرنامہ موسوم بہ تزک بابری، مرزا محمد شیرازی، بمبئی ۱۳۰۸ (۱۸۹۰)

بابر، ظہیر الدین محمد، دیوان استنبول، بالا یوسل، انقرہ ۱۹۹۵

بابر، ظہیر الدین محمد، دیوان رام پور، رضا لائبریری

بابر ظہیر الدین محمد، رسالہ عروض، اوستہ بلوا، ماسکو ۱۹۷۲

بابر، ظہیر الدین محمد، رسالہ والدیہ، اکمل ایوبی، علی گڑھ

بابر، ظہیر الدین محمد، فقہ بابری، موسوف نا معلوم، کتاب خانہ گنج بخش مخطوطہ ۸۲۲۸، اسلام آباد

بابر، ظہیر الدین محمد، فتاوہ بابری، مخطوطہ، نور الدین قطب الدین (مولف) کتابت ۱۰۲۵ کتاب خانہ گنج
بخش، اسلام آباد

بابر، ظہیر الدین محمد، متین، اورل سیہان اچگری یا نیلاری استنبول ۲۰۰۴

بابر ظہیر الدین محمد، رسالہ والدیہ، اکمل ایوبی، جامعہ علی گڑھ ۱۹۶۸

بابر ظہیر الدین محمد، واقعات، مخطوطہ ۲۴۳۲۶ برٹش لائبریری

بابر، ظہیر الدین محمد، وقایع، سلطنتی کتب خانہ، مخطوطہ ۲۲۴۹ تہران

بارتھولڈ، ڈبلیو، دیکھیں ترکستان

بدایونی، عبد القادر، دیکھیں منتخب التواریخ

بخارا، نقشہ و معلوماتی ورقے، نقشہ سازی کا محکمہ، ازبکستان ۲۰۰۲

براؤن، ای جے، دیکھیں اے لیٹریری ہسٹری اوف پرشیا

بیلو، ایچ ڈبلیو، ریس اوف افغانستان، دیکھیں ریس

بہاالدولہ، لائف اینڈ کنٹری بیوشنز، بیگ ایم ایچ اے، پاکستان جنرل اوف اوٹولے
رنگالوجی ۱۹۸۷: ۳۸

برنیر، ٹریولس ان مغل ایمپائر، البیرونی، لاہور ۱۹۷۶

بری لیتیکا، وی نیو، شکاگو ۱۹۸۶

بیرم خاں، سوکمار رے، ایم ایچ بیگ، انسٹیٹیوٹ اوف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹیڈیز،
جامعہ کراچی ۱۹۹۲

بیورج، اینٹ، بابرنامہ ترجمہ انگریزی، لوزیک اینڈ کمپنی لندن ۱۹۲۲

بیورج، ہنری، اوری اینٹل کراس بوز، اے کیو آر ۱۹۱۱: ۱۳۴۴

بیورج، لارڈ، انڈیا کالڈ دیم، جارج ایلین اینڈ انون، لندن ۱۹۴۷

بیورج، ہنری، واز عبد الرحیم دی ٹرانس لیٹر اوف بابرس مے موآئرس ان تو پرشین، دی امپیریل اینڈ
ایشیاٹک کواٹرلی ریویو، جولائی ۱۹۰۰: ۱۱۴-۱۲۳، ۱۱ اکتوبر ۳۱۰-۳۱۷

بیلہ بتالیہ۔ اودے پور، لسٹر پریس پرائیویٹ لمیٹڈ، دہلی ۱۹۹۷

پاکستان کے دلچسپ پرندے۔ ذکیہ خانم، منظور احمد، جامعہ کراچی ۱۹۸۷

پال رت چنیکی، چنگیز خاں، ہز لائف اینڈ لیگیسی، بلیک ویل اوکسفورڈ ۱۹۹۱

پٹھانس دیکھیں اولف کیرو

پنت، جی این، مغل وے پنس ان بابرنامہ، اجام کالا پرا کاشن، دہلی ۱۹۸۹

پنجاب انڈر گریٹ مغلز، بخشیش سنگھ نجار۔ ٹھیکر اینڈ کمپنی بمبئی ۱۹۶۸

تاریخ جہاں گشا، ترجمہ چنگیز خاں، دیکھیں عطا ملک جیوانی

تاریخ خاں جہانی و مخزن افغانی، خواجہ نعمت اللہ ہروی، اردو سائنس بورڈ، لاہور ۱۹۸۶

تاریخ رشیدی، مرزا حیدر دوغلت، ترجمہ تھیکسٹن، ڈبلیو ایم، ہارورڈ، ۱۹۹۶ دیکھیں رشیدی

تاریخ شاہی۔ احمد یادگار، نذیر نیازی، اردو سائنس بورڈ لاہور ۱۹۸۵

تاریخی رپورٹس۔ ہسٹاریکل رپورٹس اون عرب ہورس بریڈنگ اینڈ عرب ہورس، کارل ولہلم آمون،
زیورچ ۱۹۹۳

تذکرہ، ابرار احمد بگوی مجلس مرکزیہ حزب الانصار، بھیرہ ۱۴۲۵ (۲۰۰۴)

تذکرۃ الواقعات، جوہر آفتابچی، اردو ترجمہ سید معین الحق، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی ۱۹۵۵

ترکستان، بارتھولڈ، ڈبلیو، انڈس پبلی کیشنز، کراچی ۱۹۸۱
ترکمانستان گائیڈ، بے ون لی ہورسس، اشک آباد ۱۹۹۸
ترکی انگلش ڈکشنری دیکھیں کتاب معانی لہجہ
تزک جہانگیری، ترجمہ راجرس، انگیز بنڈر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷۴
تھیکسٹن، وہیلر، ایم، اے سینچری اوف پرنسیس، دی آغا خاں پروگرام فور اسلامک آرکی ٹیکچر،
کیمبرج میساچوسٹس ۱۹۸۹
تھیکسٹن وہیلر ایم، البم پری فیسس اینڈ ڈوکیومنٹس اون دی ہسٹری اوف کیلی گرافرس اینڈ پینٹرس،
برل، لائیڈن ۲۰۰۱
تھیکسٹن وہیلر ایم، بابرنامہ ترکی (لاطینی) متن فارسی ترجمہ (خان خاناں) اور انگریزی ترجمہ
تین جلد، ہارورڈ ۱۹۹۳
تھیکسٹن وہیلر ایم، دی بابرنامہ، انگریزی ترجمہ، اوکسفورڈ ۱۹۹۶
توریت، ہولی اسکرپچرس، واچ ٹاور بائبل اینڈ ٹریکٹ سوسائٹی، نیو یارک ۱۹۸۴
تیمور، دی گریٹ امیر، ترجمہ سونڈرس جے ایچ، لوزیک اینڈ کمپنی لندن ۱۹۳۶
تیمور ملک، دیکھیں نذیر جان
ٹم مے کن ٹوش اسمتھ۔ دی ٹریولس اوف ابن بطوطہ، پی کاڈور لندن ۲۰۰۴
جسٹین مروزی، تمرلین، ہارپر کولنس، لندن ۲۰۰۴
جون سمپسن، سٹرینج پلیسیس کوئسچن ایبل پیوپل، پان بکس، لندن ۱۹۹۸
جہاں آرا حبیب اللہ، زندگی کی یادیں۔ اوکسفورڈ کراچی ۲۰۰۳
جیکسن، پال، دیکھیں اقتدار حسین صدیقی، مسلم شرائنز
چنگیز خاں، ہز لائف اینڈ لگیسی، پال ایچ نے دکی، بلیک ول اوکسفورڈ ۱۹۹۱
حالی، الطاف حسین، حیات سعدی، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۹۵
حامد، دیکھیں حضرت سخی سرور
حدود عالم، ترجمہ منورسکی وی، انڈس پبلی کیشنز کراچی ۱۹۸۰
حسن اللغات، فارسی اردو، اوری اینٹل بک سائٹی، لاہور، سال طباعت دیا ہوا نہیں
حسن عزیز جاوید، عبدالرحیم خان خاناں اوران کے دوہے، شائستہ ادب کراچی ۱۹۶۸ ص ۳۶
حسین خاں، شیر شاہ سوری، فیروز سنز لاہور ۱۹۹۴
حضرت سخی سرور حامد خاں حامد، محکمہ اوقاف پنجاب، لاہور ۲۰۰۱
حیدر مرزا دوغلت، دیکھیں تاریخ رشیدی
خاں، اقتدار عالم، گن پاؤڈر اینڈ فائر آرمس، اوکسفورڈ، نئی دہلی ۲۰۰۴
خان خاناں نامہ، منشی دیبی پرشاد، مرزا حسن علی بیگ انسٹی ٹیوٹ اوف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز
جامعہ کراچی ۱۹۹۱
خواجہ نظام الدین، طبقات اکبری ترجمہ محمد ایوب قادری اردو سائنس بورڈ، لاہور ۱۹۹۰
دلی کے بائیس خواجہ، ظہور الحسن شارب، تاج پبلی شرز، دہلی ۲۰۰۰
دولت شاہ، تذکرۃ الشعرا، مذکور از تھیکسٹن سنچری
دی پلیسس ان بٹوین، روری اسٹوارٹ، پکاڈور ۲۰۰۴
دی کراس بو، دیکھیں رالف پین گالوے
دی لائف اوف عبدالرحمٰن، سلطان محمد خاں۔ اوکسفورڈ کراچی ۱۹۸۰
دیوان حافظ، شمس الدین محمد، مطبع کریمی، بمبئی ۱۹۱۱
دیوان غالب، اسد اللہ خاں، فیروز سنز، لاہور ۱۹۹۹
ڈپری، ایچ، این، کابل، افغان ٹورسٹ اورگنائی زیشن، کابل ۱۹۷۲
ڈل، سٹیون، دی گارڈن اوف ایٹ پیراڈائی زز، برل، لائیڈن ۲۰۰۴
ڈیوڈ ایالون، دی گریٹ یاسا اوف چنگیز خاں، آوٹ سائی ڈرس ان دی لینڈ اوف اسلام، مملوکس،
منگول اینڈ ایونکس، ولے ری یورم، ری پرنٹس، لندن ۱۹۸۸
ذاتوں کا انسائی کلو پیڈیا، میکلیگن، ای ڈی، بک ہوم، لاہور ۲۰۰۴
ذکیہ خانم دیکھیں پاکستان کے دلچسپ پرندے
ذوق دہلوی، شیخ محمد ابراہیم، ذوق ایک مطالعہ، شاہد ماہلی غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۲۰۰۰
رالف پین گالوے۔ اوری اینٹل بوز، دی کراس بو، ہالینڈ پریس ۱۹۵۸
رام ناتھ، بابرس جل محل ایٹ فتح پور سیکری، اسٹیڈیز ان اسلام، ۱۹۸۱: ۱۵۳-۱۶۰
رام ناتھ باغ گل افشاں اوف بابر ایٹ آگرہ، انڈو ایرانیکا کلکتہ، ستمبر ۱۹۷۰
رام ناتھ، دی ٹومب اوف بابر ایٹ آگرہ، اسلامک کلچر، حیدر آباد، جولائی ۱۹۷۴
رام ناتھ، ہسٹری اوف مغل آرکی ٹیکچر، ج ۱، ابھی ناو پبلی کیشنز دہلی ۱۹۸۲
راورٹی، میجر ہنری، نوٹس اون افغانستان اینڈ بلوچستان، سنگ میل لاہور ۲۰۰۱
رائز اینڈ رول اوف تمرلین۔ بیاترس فوربس، کیمبرج، کانٹو ۱۹۹۹
رحیمی، ماثر، عبدالباقی نہاوندی، بیپٹس مشن کلکتہ ۱۹۲۴ ج ا ص ۴۸۸
رشیدی، تاریخ، مرزا حیدر دوغلت، ترجمہ ڈینی سن روس، این الیاس، بک ٹریڈرس لاہور،
سال طباعت دیا ہوا نہیں
روری اسٹوارٹ دیکھیں دی پلیسس ان بٹوین
روبرٹ سن، پیٹر، اے نیچرل ہسٹری اوف دی فیزنٹ، سوان پریس، لندن ۱۹۹۷ ص ۴۰، ۱۱۳
روضۃ السلاطین وجواہر العجائب، سلطان محمد فخری ہروی، بہ تصحیح حسام الدین راشدی، سندھی ادبی بورڈ،
حیدر آباد ۱۹۶۸
ریڈ ہاؤس، جیمس۔ ترکی انگلش لیکزی کون، جیمس ریڈ ہاؤس، ریڈ ہاؤس یاینی نیوی، استنبول ۱۹۶۸
ریڈ ہاؤس، جیمس اے ترکش لیکزی کون، مکتبہ لبنان، بیروت ۱۹۹۶
ریاض السلام، صوفی ازم ان ساؤتھ ایشیا۔ اوکسفورڈ کراچی ۲۰۰۲
ریسز اوف افغانستان، بیلو، ایچ ڈبلیو، کلکتہ ۱۸۸۰ نقل دراصل سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،
سال طباعت دیا ہوا نہیں۔
زہراوی، دیکھیں ابوالقاسم
زین خاں، دیکھیں طبقات بابری
سعادت نامہ غیاث الدین علی یزدی۔ ایرج افشار، میراث مکتوب، تہران ۲۰۰۲
سعید بیگ حسن، بابرنامہ (کریلیک) تاشقند ۲۰۰۲
سفینۃ الاصفیہ۔ شیخ عبدالقادر جیلانی، سفینۃ الاصفیہ، غلام سرور، لاہوری کان پور مذکور از تھیکسٹن
بابرنامہ
سفرنامہ فرنگ۔ مرزا ابو طالب اصفہانی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۱۹۹۹
سکندر برنس، کابل، نقل مطابق اصل نیشنل کالج اوف آرٹس، لاہور ۲۰۰۳
سمرقند، ازبکستان کا سرکاری معلوماتی کتابچہ، تاشقند ۱۹۸۶
سنٹرل ایشیا بریڈ لے ے میو، رچرڈ پلنکٹ سائمن رچٹر، لونلی پلینٹ لندن ۲۰۰۰
سنٹرل ایشین ریویو، مذکور از ظہیر الدین محمد بابر شاہ، مولفہ عبدالحئی حبیبی، بیہقی کتاب خیرونہ
کابل ۱۳۵۱ شمسی
سنگھ، خوش ونت، اے ہسٹری اوف سکھس، اوکسفورڈ، دہلی ۱۹۹۱
سوکارائے، دیکھیں بیرم خاں
سی رل ایل گڈ۔ صفوی سرجری، انالیٹیکا میڈی کو ہسٹوری کا، پرگامن پریس، اوکسفورڈ ۱۹۶۶
سید احمد دہلوی، رسوم دہلی، خلیق انجم، اردو اکادمی ۱۹۸۶
سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ۔ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۷
سید حسن عسکری، دیکھیں طبقات بابری
شاہ، رابرٹ بارکلے، ترکی زبان کی فرہنگ، جرنل اوف ایشیاٹک سوسائٹی اوف بنگال کلکتہ ۱۸۸۰
شبلی نعمانی، علامہ، شعر العجم، الفیصل ناشران، لاہور ۱۹۹۹
شیخ سعدی، مصلح الدین۔ گلستان، ترجمہ غلام عباس ماہو، مکتبہ دانیال لاہور ۲۰۰۱
شیخ عبدالحق محدث، اخبار الاخیار ترجمہ محمد فاضل، ادبی دنیا، دہلی ۱۹۹۴
شیخ محمد اکرم، رود کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۹۲

صحیح بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری، جہانگیر بک ڈپو لاہور، سال طباعت دیا ہوا نہیں
طبقات بابری، شیخ زین خوافی، ترجمہ سید حسن عسکری، ادارہ ادبیات دہلی ۱۹۸۲
طبقات ناصری، قاضی منہاج سراج، ترجمہ غلام رسول مہر مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۵
عارف نوشاہی، احوال و سخنان خواجہ عبیداللہ احرار، مرکز دانشگاہی تہران ۱۳۸۰
عارف نوشاہی۔ والدیہ رسالہ، خواجہ عبیداللہ احرار، تحقیقات اسلامی، تہران ۱۳۷۳ شمسی ۶۵۔۷۷
عبدالحلیم شرر، لکھنو، پرنٹ لائن پبلیشرز، لاہور ۲۰۰۰
عبدالحی حبیبی، ظہیر الدین محمد بابر شاہ، ذیقعی کتاب خیبر دلو موسسہ، کابل ۱۳۵۱ شمسی
عبیداللہ قدسی (نصیرالدین حیدر) بابر نامہ، بک لینڈ، کراچی ۱۹۶۲
عبیداللہ قدسی (نصیرادین حیدر) بابر نامہ، الفیصل، لاہور ۲۰۰۶
عرب ہورس ان یورپ، دی، اریکا شیل، جورج جی ہارپ اینڈ کمپنی، لندن ۱۹۶۷
عطا ملک جیوانی، تاریخ جہاں گشا ترجمہ چنگیز خاں، یونیسکو جامعہ مانچسٹر ۱۹۹۷
فارسی لغت، دی کنسائز انگلش پرشین ڈکشنری، عباس اریان پور امیر کبیر پبلی کیشنز، تہران ۲۰۰۰
فرشتہ، محمد قاسم، ترجمہ ہسٹری اوف دی رائز اوف محمدن پاوران انڈیا، جون برگز نقل برائے اصل سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷۷
فرہنگ آصفیہ، دیکھیں سید احمد دہلوی
فضل علی، کلیات گوالیاری، موہن کمار مادھر، ہری نواس دیویدی ریسرچ فاؤنڈیشن، گوالیار ۲۰۰۰
فن تاریخ گوئی، فرمان فتح پوری، الوقار پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۴
قریشی اے اے، توکل اے بی یوٹی فل برڈ، ڈان ۲۱ اگست ۲۰۰۳ دی ری ویو ص ۲۰۔۲۱
قصص الانبیا۔ قاری محمد یاسین، ترجمہ جہانگیر بک ڈپو، لاہور سال طباعت دیا ہوا نہیں
قمر رئیس، یحییٰ عبدالرحمانوو، ظہیر الدین بابر، شخص، شخصیت و شاعری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۲
کتاب معانی لہجہ، ترکی انگریزی لغت، جیمس رڈہاؤس، مکتبہ لبنان ۱۹۹۶
کلاجیوہ، ایمیسی تو تمرلین، ترجمہ گائی لی اسٹرینج، جارج رٹ لیج، لندن ۱۹۲۸
کلی، جیک، گن پاؤڈر اینڈ فائر آرمس، اوکسفورڈ، نئی دہلی ۲۰۰۴
کلیم الدین احمد، اردو زبان اور فن داستان گوئی، نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور ۱۹۹۰
کشوری سرن لال، ٹوئی لائٹ اوف دی سلطنت، منشی رام منوہر لال پبلشرز دہلی ۱۹۸۰
کے این چودھری، ایشیائی فور یورپ، کیمبرج یونیورسٹی ۱۹۹۰
گبن، ڈکلائن اینڈ فال اوف رومن ایمپائر۔ فولیو سوسائٹی۔ لندن ۲۰۰۴
گروس، جوائن۔ دی لیٹرز اوف خواجہ عبیداللہ احرار اینڈ ہز اسوسی ایٹز، برل، لائیڈن ۲۰۰۲ ورق ۴ الف
گزٹ، امپیریل، افغانستان اینڈ نیپال، نقل مطابق اصل سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۹
گلبدن بیگم، ہمایوں نامہ، ترجمہ اینٹ بیورج نقل مطابق اصل سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۴
گلستان، دیکھیں شیخ سعدی شیرازی، مصلح الدین
لغت اردو، اردو لغت تاریخی اصولوں پر، ترقی اردو بورڈ، کراچی ۱۹۷۷
لیٹریری ہسٹری اوف پرشیا، براؤن ای جی، کیمبرج 1951
ماثر الامرا، محمد ایوب قادری، مرکزی اردو بورڈ، لاہور ۱۹۷۰
مارکوپو، دی ٹریولس، ہیرون بکس، سال طباعت دیا ہوا نہیں
ماٹر بیاٹرس فوربز، دی رائز اینڈ رول اوف تمرلین، کیمبرج ۱۹۹۹
مبین در فقہ، بابر، ظہیر الدین محمد، تصحیح اورل سیہان، چاغری یاشلاری استنبول ۲۰۰۴
محمد بداعی، ہدایت الرامی، دیکھیں بیورج ہنری
محمد حسین آزاد، آب حیات، نقل مطابق اصل سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور سال طباعت دیا ہوا نہیں
محمد حسین آزاد، دربار اکبری، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی ۲۰۰۰ ص ۶۴۹
محمد رضی الاسلام ندوی، حکیم اجمل خاں کی علمی خدمات، خدا بخش لائبریری پٹنہ ۲۰۰۴
محمد صابر، بابر ایک دانشور، ماہ نو ستمبر ۱۹۶۵
محمد صابر، بابر کی زبان میں اردو الفاظ کا املا، یونیورسٹی اسٹڈیز کراچی ستمبر ۱۹۶۵
محمد عبداللہ، کنز المجربات، جیسم بک ڈپو، دہلی ۱۹۹۲
ملا واحدی، دلی جو ایک شہر تھا، اوکسفورڈ کراچی ۲۰۰۳
محمد معین، فرہنگ فارسی، موسسہ انتشارات امیر کبیر، تہران ۱۳۷۱ شمسی
مخزن الجواہر، غلام جیلانی، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، لاہور، سال طباعت دیا ہوا نہیں
مرزا حیدر، دیکھیں تاریخ رشیدی
معین الشعرا، غلام حسین خاں بنارسی، نقل مطابق اصل سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۳
منتخب التواریخ، عبدالقادر بدایونی، اکیڈمیکا ایشیاٹیکا، پٹنہ ۱۹۷۳
مہذب اللغات، مہذب لکھنوی، لکھنو ۱۹۷۸
مورگن ڈی او، ابن بطوطہ اور منگول، جے آر اے ایس، لندن ۲۰۰۱
مورگن ڈی او، گریٹ یاسا اوف چنگیز خاں، بی ایس او اے ایس لندن ۱۹۸۶: ۳۹، ۱۶۳۔۱۷۶
مومن خاں مومن ایک مطالعہ، شاہد ماہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی ۲۰۰۰
میر دولت شاہ سمرقندی، تذکرۃ الشعرا، دیکھیں تھیکسٹن ہنچری
میسن، چارلس، نریٹو اوف ویریس جرنیز ان بلوچستان، افغانستان اینڈ پنجاب، اوکسفورڈ کراچی ۱۹۷۴
میکلیکن دیکھیں ذاتوں کا انسائیکلو پیڈیا
مین فریڈ اولمین، اسلامک میڈیسن، ایڈنبرا یونیورسٹی پریس ۱۹۷۸
میوزیکل انسٹرومینٹس، ہورنی مین میوزیم اینڈ لائبریری، لندن ۱۹۷۰
نا معلوم، فقہ بابری، مخطوطہ ۸۲۲۸، کتاب خانہ گنج بخش اسلام آباد
نجار، بخشیش سنگھ، پنجاب انڈر گریٹ مغلو، ٹھاکر اینڈ کو بمبئی ۱۹۶۸
ندوی، رشید اختر، تزک بابری ترجمہ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سال طباعت دیا ہوا نہیں
نذیر جان، تیمور ملک، خردن بجنور ۲۰۰۳
نصیرالدین حیدر مرزا، تزک بابری ترجمہ، مطبع محمدن پرنٹنگ پریس، دہلی ۱۹۲۴
نظامی گنجوی، معین فر، انتشارات زرین، سال طباعت دیا ہوا نہیں
نظیری، دیکھیں سید اظہر علی، مرزا عبدالرحیم خان خاناں غیر شائع شدہ مخطوطہ، کوئنز کالج، کیمبرج ۱۹۳۲، ص ۲۳۵
نعیم قریشی، گوالیار کے آس پاس، چنبل پوسٹ پراکاشان، گوالیار ۲۰۰۴
نفحات الانس، مولانا عبدالرحمٰن جامی، پروگریسو بکس لاہور ۱۹۸۶
نورالدین قطب الدین، فتاوہ بابری، مخطوطہ ۱۳۹۲۸، کتاب خانہ گنج بخش، اسلام آباد
وحید مرزا، امیر خسرو، نیشنل امیر خسرو سوسائٹی دہلی ۱۹۸۶
ہارلان، جوسیا دی گریٹ، بین مے کن ٹائر، ہارپر کولنس لندن ۲۰۰۴
ہارون رشید، ہسٹری اوف دی پٹھانس، اسلام آباد ۲۰۰۲
ہری رام گپتا، موہن لال کشمیری، بیکن بکس لاہور ۲۰۰۳
ہمایوں کاترکی مخطوطہ بابر نامہ، نیشنل لائبریری، اسکاٹ لینڈ، ایڈنبرا
ہمایوں نامہ دیکھیں گلبدن بیگم
ہندی اردو لغت، راجہ راجیسور راؤ اصغر، انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۹۷
ہیوز، کلیات گوالیاری، دیکھیں فضل علی کلیات گوالیری

اشاریہ

یہ فہرست ان ناموں اور واقعات پر مشتمل ہے جن کے متعلق بابر نے کچھ بیان کیا ہے۔ وہ نام جو ضمنی طور پر آگئے ہیں اگر ان کو شامل کیا جائے تو ایک مجمل کتاب چاہیے۔
جہاں لفظ "ح" صفحہ نمبر سے پہلے درج ہے، ان مضامین کے لئے اُس صفحہ پر حواشی دیکھیں۔

الف

بخط۔ حاجی نوردین (سنکیانگ چین)

نہ جانے کے لئے اپنے میسر ہے کوئی مامن
نہ رہنے کے لئے اپنے مقرر ہے کوئی مسکن (۹۰۴ھ)

میری طرح کوئی برباد، عاشق و رسوانہ ہو
کوئی محبوب تیری طرح بے رحم و بے پروانہ ہو (۹۰۵ھ)

اپنی جان کے علاوہ کوئی یار وفادار نہیں
اپنے دل کے علاوہ کوئی محرم اسرار نہیں (۹۰۷ھ)

ہلال و یار ہو ساتھ، اس سے بہتر عید نہیں
میں غم زدہ ہوں کہ ماہ رخ کی شنید نہیں
خوش قسمتی پر ناز کر جب وہ مکھڑا سامنے ہو
سیکڑوں ہوں پر اس سے بہتر دید نہیں (۹۱۰ھ)

نہ جھگڑ ترک سے اے مرزا نہ
چالاکی و مردانگی ترک ہے عیاں
تو گر نہ آیا اور نصیحت نہ سنی
جو ہوگا اس کی نہیں ضرورت بیاں (۹۳۲ھ)